سہ ماہی

اسلام آباد

ادبیات

بچوں کا ادب

جلد: سوم قومی ادب، حصہ نثر

اکادمی ادبیات پاکستان

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

* * *

پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

سہ ماہی

ادبیات

شمارہ نمبر 99، اپریل تا جون 2013

بچوں کا ادب

(جلد سوم: قومی ادب، حصہ نثر)

نگران: **عبدالحمید**
مدیرِ منتظم: **ظہیرالدین ملک**

مدیر اعلیٰ: **محمد عاصم بٹ**
مدیر: **اختر رضا سلیمی**
معاون: **سیدہ تعظیم عمران**

اکادمی ادبیات پاکستان
پطرس بخاری روڈ، H-8/1، اسلام آباد

ضروری گزارشات

- ☆ مجلّے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن کی اشاعت پر شکریے کے ساتھ اعزازیہ بھی اہلِ قلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔
- ☆ شاملِ اشاعت نگارشات کے نفسِ مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ ان کی آراء کو اکادمی ادبیات پاکستان کی آراء نہ سمجھا جائے۔
- ☆ نگارشات اِن پیج فارمیٹ میں بذریعہ ای میل اس ایڈریس پر بھیجی جا سکتی ہیں:

asimbutt99@yahoo.com

قیمت موجودہ شمارہ: 300/- روپے
قیمت فی شمارہ: 100/- روپے (اندرون ملک) 40 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
سالانہ (4 شماروں کے لیے) 400/- روپے (اندرون ملک) 160 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
(رسالہ اندرون ملک بذریعہ رجسٹری اور بیرون ملک بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا جاتا ہے۔ ڈاک خرچ ادارہ خود ادا کرتا ہے)

طباعت: اختر رضا سلیمی 051-9250342
ترسیل: میر نواز سولنگی 051-9250578
مطبع: کلاسیک۔ 42، دی مال، لاہور

ناشر: اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
website: pal.gov.pk

اداریہ

سہ ماہی ادبیات کے خصوصی شمارے 'بچوں کا ادب' کی تیسری جلد ''پاکستانی ادب: حصہ نثر'' پیش خدمت ہے۔ اس سے پیشتر جلد اول میں بچوں کے بین الاقوامی ادب سے، جب کہ جلد دوم میں پاکستانی شاعری سے انتخاب پیش کیا گیا تھا۔

موجودہ خصوصی شمارے میں پاکستانی زبانوں میں بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں، ڈراموں اور مضامین سے انتخاب کے ساتھ ساتھ پاکستان کے مختلف علاقوں کی لوک کہانیاں بھی شامل کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں حسبِ سابق براہوی، بلوچی، پشتو، سندھی، بلوچی، ہندکو، پنجابی، سرائیکی، پوٹھوہاری، پہاڑی، شنا اور کشمیری زبانوں میں بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کے اردو تراجم بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ماضی میں بچوں کے لیے لکھے گئے ادب سے انتخاب کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کے ممتاز اہل قلم سے بھی خصوصی طور پر بچوں کے لیے نگارشات حاصل کی گئی ہیں۔

یوں ہم اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ تین جلدوں پر مشتمل یہ خصوصی نمبر اس موضوع پر اردو میں شائع ہونے والی پہلی سب سے ضخیم کاوش ہے۔

میں ڈاکٹر افتخار کھوکھر، ابصار عبدالعلی، محمد شعیب مرزا اور ریاض عادل کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ہمارے مدیران کے ساتھ اس شمارے کی تیاری میں تعاون کیا۔

عبدالحمید

فہرست

کہانیاں

آغا عبدالحمید	بولتی مچھلی	13
احمد داؤد	امانت	18
اشفاق احمد	جان کی بازی	24
اکبر حمیدی، پروفیسر	ایک طالب علم کی سچی کہانی	30
بنت الاسلام	مچھلی کی تقسیم	34
حفیظ ہوشیارپوری	مہمان کی عزت	37
حمید اختر	پیسے کمانے کی انوکھی ترکیب	38
حنیف رامے	پریشانی کا علاج	40
خدیجہ مستور	بدلہ	45
رحمٰن مذنب	دھان کے کھیت	48
سر شیخ عبدالقادر	یہ کہانی مجھے بہت پسند تھی	58
سعادت حسن منٹو	شیر آیا شیر آیا دوڑنا	61
سید جاوید امتیازی	فطرت سے دور نہ جائیں	64
شوکت تھانوی	جب میں ننھا سا تھا	66
صلاح الدین احمد	محفل کے آداب	68
عبدالحق، مولوی	خوب چھپے	73
عزیز اثری	دو دوست	74
عطا شاد	میاں بیوی ۔ شیر اور گیدڑ	78
غلام عباس	عرب بچے	80
فرخندہ لودھی	بہن بھائی	84
معراج	بارش برسانے والی	89
میرزا ادیب	نواب صاحب کا قالین	96
میرا جی	بولا اور مارا گیا	100
ن ۔ م راشد	وفاداری	102

نذر سجاد حیدر	چوری کھل گئی	103

ابصار عبدالعلی	ندیدہ	108
احسان اکبر، ڈاکٹر	شہزادے کے چھ ہتھیار	110
احمد رشید	مگرمچھ اور رحمدل بچے	114
اسلم فرخی، ڈاکٹر	معصوم عزم	116
اشتیاق احمد	زندگی کے کسی موڑ پر	128
الطاف فاطمہ	نئے سال کا تحفہ	135
بانو قدسیہ	صرف دو آنے	140
بپسی سدھوا	سات دموں والا چوہا	146
توصیف تبسم، ڈاکٹر	کہانی کیسے بنی	148
ثاقبہ رحیم الدین	عقاب	151
جبار توقیر	جن کی خواہش	155
حسن منظر	گھبرائیم	160
حسینہ معین	شہزادی	168
خالد فتح محمد	بھولا	176
رضوانہ سید علی	ریشم	181
رضیہ فصیح احمد	پیٹو بلی	195
رئیس فاطمہ، پروفیسر	سرمد کی کہانی	200
زار ممتاز	چاند اور سورج	211
ستار خان	ایک اندھیری رات	213
سجاد شیخ، پروفیسر	نوشیروان عادل	215
سعدیہ نوشین جان	کالے بلے کی غلطی	216
سعید لخت	چور کون	218
سعیدہ گزدر	مسکرانے والا درخت	223
سلطان سکون	کام کی بات	226
شاہد زبیر	بہترین استاد	228
شعیب ہاشمی	دلہن کی کہانی	230

شمع خالد	ننھی پری	233
شیما مجید	خرگوش اور خلاباز	236
صابرہ اعظم	جو کچھ ہونا ہے، ہو کر رہے گا	241
طاہر نقوی	لائبریری	244
طاہرہ مظہر	محبت کا پیمانہ	246
ظفر اقبال	بُھوکی لومڑی اور چالاک کوا	247
ظفر اقبال	خرگوش اور کچھوا	249
عذرا اصغر	غرور کا سر نیچا	251
عزیز صدیقی	آخری قربانی	255
عطش درانی، ڈاکٹر	پتھروں میں سیب	258
عنایت علی خان، پروفیسر	درختوں نے کہا	261
فریدہ حفیظ	نیکی کی تلاش	264
فقیر حسین ساگا، ڈاکٹر	راجہ رسالو	266
محسن مگھیانہ، ڈاکٹر	مجھے معاف کردو	269
محمد اسلام نشتر	چاندی کی لکیر	272
محمد افتخار کھوکھر، ڈاکٹر	اندھیروں کی شکست	280
محمد علی چراغ	شیطان کی انگلی	294
مسعود مفتی	سماجی بھلائی	297
مشتاق گزدر	کشتی اور محافظ	308
نجم الحسن رضوی	دھرتی پہ آیا چاند	309
نصیر انور	تحفے	314
نیلوفر اقبال	ڈُورے کا سکول	316
یونس جاوید	صبح کا بھولا	319

اسماء ہارون	روحوں کے رشتے!	323
امرت	پلا	328
حافظ مظفر محسن	چڑیا گھر کے مزدور	331
حماد الرحمٰن گورایہ	میں لوٹ کے آؤں گا	335

خواجہ مظہر صدیقی	زندگی کی لہر	338
ذیشان بن صفدر	بچانے والا ہاتھ	342
رضوان ثاقب	سب سے بڑی دولت	347
زمرد سلطانہ	لالچ کی سزا	351
سید اشرف بٹھوی	ذہانت کا انعام	354
سید نظر زیدی	لکھ پتی	356
سیدہ تعظیم عمران	شیر اور خرگوش	362
شعیب خالق	چالیس روپے	364
صداقت حسین ساجد	آب حیات کا درخت	370
علی اکمل	غلامی	375
علی عمران ممتاز	جاگو اور جگاؤ	382
غلام محی الدین ترک	روشنی	391
فاروق حسن چانڈیو	عید مُبارک	395
فوزیہ طاہرہ	زرد پتھر	399
فوزیہ عباس	بقا کا راز	407
قانتہ رابعہ	اب دکھ پھر سکھ	414
کہف الوریٰ رانا	چھڑی کا جادو	419
مالک اشتر، انجینئر	ٹیکسلا کی روایتی کہانی	421
مجیب ظفر انوار حمیدی، پروفیسر	گرم گرم روٹیاں	426
محمد امتیاز عارف	گھر آباد رہے گا	431
محمد زبیر ارشد	پاکستان زندہ باد	435
محمد شعیب مرزا	بھول	438
محمد عاصم بٹ	عقل مند کسان	440
محمد نوید مرزا	مقدر کا ستارہ	446
نازیہ انور شہزاد	رقم کا معما	450
نجمہ معراج	باپ پہ پوت	455
نذیر انبالوی	ایک تھی شانی	461
نگہت سلیم	ایک تھا شہزادہ	467

کہاوت کہانیاں

سید وقار عظیم	کہاوتوں کی کہانیاں	473

توصیف تبسم، ڈاکٹر	ایک اکیلا، دو گیارہ	479
توصیف تبسم، ڈاکٹر	دودھ کا دودھ، پانی کا پانی	481
زاہد حسن	جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے	483

ڈرامے

مجتبیٰ حسین	پہاڑ اور بچہ	487
میرزا ادیب	گمشدہ فریادی	498

ابصار عبدالعلی	دھواں	501
احسان اکبر، ڈاکٹر	اپاہج	514
ارشد چہال	مکڑی	518
سید صفدر رضا رضوی	اقرار	529
صائمہ الٰہی	پانی ابالنا ضروری ہے	533

مضامین

سید احمد بخاری پطرس	لندن کی ٹیوب	543
شفقت تنویر مرزا	احمد خان کھرل	545
طالب ہاشمی	ایک درویش وزیر	548
عبدالحق، مولوی	املی کا درخت	552
عبدالسلام خورشید	طلبہ کی سرگرمیاں	554
مقبول انور داؤدی	پہلا موحد بچہ	555
نیاز فتح پوری	زندگی کا بوجھ	558

آئی اے رحمان	نیولے کی تلاش	560
محمد نسیم صدیقی، ڈاکٹر	جانور ہمارے دوست	562
نذیر احمد، پروفیسر	زمین	567

ذوالفقار احمد تابش	سخاوت	579

میرا بچپن

احمد ندیم قاسمی	بچپن مجھے عزیز ہے!	583
اصغر ندیم سیّد	دُعا کا پلّو	585
اقبال اے سیّد	بیتے ہوئے دنوں کی یاد	589
انور سدید، ڈاکٹر	میری زندگی کی کہانی	591
توفیق رفعت	کیا یہ ایک بھوت تھا!	596
حسن عابدی	کڑوی گُلاب جامن	597
خواجہ محمد زکریا	میری ابتدائی زندگی	602
رفیق احمد رفیکا	ایک بالغ کہانی	606
فیض احمد فیض	اسکول میں پہلا دن	609
محمد باقر، ڈاکٹر	بچپن کی یادیں	611
مسعود حسن	ایک سنسان سڑک پر ہونے والا واقعہ	615
مظفر علی سید	ہری بانو اور حیرت انگیز درخت	617
منیر علی دادا	مائی پھوا اور دریا	619
میاں بشیر احمد	میری یادیں	620

مزاح

ظفر اقبال	اچھو میاں کا جاگنا	625
محمد ادریس قریشی	کھیر کا دیگچہ	627
محمد فہیم عالم	چچا تیز گام نے آم کھائے	632

……

پاکستانی زبانوں کے تراجم

براہوی

افضل مراد	احساس	639
نورینہ سائل/نورینہ سائل	دوستی	651

لوک

عجب خان سائل	اُونٹ اور مگرمچھ	653

بلوچی

میر عاقل مینگل/مہناز غنی بلی اور بڑھیا 655

لوک

مہناز غنی ملکہ اور مالکن 657
نادیہ ہاشم جھگڑالو عورت اور ہوشیار شوہر 659
نادیہ ہاشم عقل مند وزیر زادی 660
واحد بخش بُزدار تین دُعائیں 661
واحد بخش بُزدار خونِ ناحق 663

پشتو

حافظ محمد ادریس/سید ولی خیال مومند ابن سعود کا انصاف 665
حافظ محمد ادریس/سید ولی خیال مومند تین اور پانچ 666

لوک

سید ولی خیال مومند چالاک ریتو 667

پنجابی

اشرف سہیل/اختر رضا سلیمی کوؤں کی اصلی بولی 673
الیاس گھمن/الیاس گھمن ڈھول 676
فرخندہ لودھی/خالد مصطفیٰ خوبصورت پرندہ 679
فرخندہ لودھی/اختر رضا سلیمی بانسری والا 682

لوک

زاہد حسن سات پریوں کی کہانی 684
زاہد حسن نیک بادشاہ اور چڑیل ملکہ 687

پوٹھوہاری

قمر محمود عبداللہ/شیراز طاہر کالی سویٹر 697

پہاڑی

صغیر خان، ڈاکٹر/شیراز طاہر عرفان کی کہانی 702

سرائیکی

حمزہ حسن شیخ/حمزہ حسن شیخ مچھلی کا شکار 707

خدیجہ کبریٰ/خورشید ربانی	چالاک گیدڑ	709
خدیجہ کبریٰ/خورشید ربانی	مال، جان کا صدقہ ہوتا ہے	712
شوکت مغل/خورشید ربانی	حرام، حلال کو کھا جاتا ہے	716
عصمت اللہ شاہ/خورشید ربانی	باتوں کے زخم	717
عصمت اللہ شاہ/خورشید ربانی	پانی، پھل، روشنی اور سونے کی جگہ	720

لوک

نسیم اختر	کڑبل خان اور راموں دیہہ	722
نسیم اختر	کھلونا	724

سندھی

فضل الرحمٰن میمن/فہیم شناس کاظمی	عقل اور بخت	725
فضل الرحمٰن میمن/فہیم شناس کاظمی	کامیابی کا راز	729
لیلا رام روچندانی/فہیم شناس کاظمی	عقل مند بادشاہ	732
محمد ابراہیم جویو/فہیم شناس کاظمی	کوا اور چڑیا	735
نبی بخش خان بلوچ، ڈاکٹر/فہیم شناس کاظمی	بخت آور بادشاہ	739

شنا

حبیب الرحمان مشتاق	اما پرست راجا	743
حبیب الرحمان مشتاق	چڑیل	745

کشمیری

شاہد ندیم	جادو کا پیالہ	749

ہندکو

لوک

انجم جاوید	گنجے کی کہانی	751
بشیر احمد سوز	ہیرا مانک کی ڈھیری	759
بشیر احمد سوز	پتھر کے انسان	762

☆☆☆☆

آغا عبدالحمید

بولتی مچھلی

محمود ندی کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھا تھا، گرمی کا موسم تھا، ہوا چل رہی تھی، سورج دور پہاڑوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا، ندی پر اِدھر اُدھر بھونرے اور پتنگے اُڑ رہے تھے۔ ندی خاصی گہری تھی اور اس کا پانی بلور کی طرح صاف شفاف تھا، اس لیے اس میں تیرتی ہوئی مچھلیاں صاف نظر آتی تھیں۔ محمود بڑی دلچسپی سے ان مچھلیوں کو اِدھر اُدھر اچھلتے کودتے دیکھ رہا تھا، کہ اتنے میں ایک اچھی خاصی موٹی سی مچھلی اس کے قریب آ کر اُچھلی اور ایک اڑتے ہوئے بھونرے کو لپک کر منہ میں لے لیا۔ جب مچھلی اُچھلی تو محمود نے اس کی گردن پر سبز اور سرخ رنگ کے گلپھڑے دیکھے، جو بہت خوب صورت نظر آتے تھے۔ بھونرا کھا کر مچھلی نے کہا:

”دیکھا بھونرا اس طرح پکڑا جاتا ہے!“

محمود حیرانی سے اُچھل پڑا اور اپنا وزن برقرار نہ رکھ سکنے کی وجہ سے پتھر سے گر پڑا۔ پھر تعجب سے چلا اٹھا:

”ایں۔ یہ مچھلی تو باتیں کرتی ہے!“

مچھلی محمود کے پاؤں کے قریب آ گئی اور بولی: ”ہاں میاں لڑکے! مچھلیاں بہت سی ایسی باتیں جانتی ہیں جو تم نہیں جانتے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ صاف اور سلیس اُردو بول سکتی ہیں، بلکہ آج کل کی پڑھی لکھی تو انگریزی بھی بول لیتی ہیں۔ برسوں پہلے ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک بہت بڑی عالم فاضل مچھلی نے ایک بہت بڑے علمی جلسے میں مچھلی کی قابلیت پر ایک مضمون لکھا تھا۔ کیا تمھارا خیال ہے کہ ہم تعلیم سے بالکل کورے ہیں؟ اپنے ابا جان سے پوچھنا۔ وہ تو بہت بڑے تجربہ کار ماہی گیر ہیں اور ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اگر میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کی ہوتی تو کبھی کی شکار ہو گئی ہوتی۔ یہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے ہی کی برکت ہے کہ میں وزن میں سیر بھر ہو گئی ہوں۔“

محمود حیرانی سے بول اٹھا۔ ”وہ کیوں کر؟“

مچھلی نے ایک اور بھونرا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

بات دراصل یہ ہے کہ جو مچھلیاں تعلیم سے بے بہرہ اور بے وقوف ہوتی ہیں۔ انھیں یا تو بگلے کھا جاتے

ہیں اور یا وہ مچھیروں کے جال وغیرہ میں پھنس جاتی ہیں۔ ایک ہوشیار عقل مند مچھلی اپنی عقل مندی کی بدولت ہر وقت خطرے سے آگاہ رہتی ہے۔ اس کے علاوہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ خوراک کہاں سے ملے گی۔ مثال کے طور پر مجھے ہی دیکھو میں اس وقت یہاں آ گئی ہوں۔ کیوں کہ شام کے وقت اس بلوط کے درخت سے بہت سے عمدہ پروانے اور بھنورے نکلتے ہیں۔ جو کھانے میں بہت لذیذ ہیں۔ بارش کے بعد ندی کے چڑھاؤ کی طرف چلی جاتی ہوں۔ بھلا جانتے ہو کیوں؟

محمود مچھلی پر اپنی بے علمی ظاہر کرتے ہوئے جھینپ سا گیا، اور دھیمی آواز سے بولا:

”نہیں میں نہیں جانتا۔“

مچھلی: لاحول ولاقوۃ۔ ماشاءاللہ تم سات آٹھ سال کے ہو چکے ہو لیکن اتنا بھی نہیں جانتے۔ لو سنو! میں اس لیے وہاں جاتی ہوں کہ بارش کے بعد وہاں زمین سے بہت سے کیچوے اور کیڑے مکوڑے وغیرہ نکلتے ہیں۔

محمود: (نفرت سے ناک چڑھا کر) توبہ! توبہ! تم کیڑے کس طرح کھا لیتی ہو؟

مچھلی: منہ سے اور کس طرح! شاید تمھارا مطلب یہ ہے کہ میں کیڑے کیوں پسند کرتی ہوں؟

محمود نے کہا: ہاں میرا مطلب یہی تھا۔

مچھلی نے جواب دیا:

اچھا یہ بتاؤ ۔۔۔ تم مچھلی، گوشت، پنیر اور کھانے کی اور چیزیں پسند کرتے ہو نا؟

محمود: بے شک۔

مچھلی نے ایک اور بھنورا پکڑتے ہوئے کہا:

بس تو اب سمجھ لو۔ کہ ہر جان دار اپنی خوراک کیوں پسند کرتا ہے۔ کسی دن جب ندی کا پانی ذرا گدلا ہو گا تو تم بنسی کی ڈور پر ایک کیچوا لگا کر مجھے دھوکا دینے کی کوشش کرو گے لیکن مجھے اُمید ہے کہ تم کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ میں کوئی چیز دیکھے بھالے بغیر منہ میں نہیں ڈالتی۔

محمود: بڑے ہو کر اگر میں نے کبھی تمھیں پکڑ بھی لیا تو پھر اسی پانی میں چھوڑ دوں گا۔

مچھلی محمود کے بالکل قریب آ گئی اور بولی:

مہربانی میاں اگر واقعی پکا وعدہ کرتے ہو تو میں کچھ دیر ٹھہر کر تم سے باتیں کرتی ہوں۔ ذرا ٹھہرنا ایک بھنورا آتا ہے۔ یہ کہہ کر چالاک مچھلی ہوا میں اچھلی اور نہایت پھرتی سے بھنورا پکڑ کر کھا گئی اور پھر ہونٹ چاٹتی

ہوئی آ گئی۔

محمود نے نفرت سے کہا:

بھنورے پکڑنا بہت بڑا ظلم ہے۔

یقیناً لیکن کیا مچھلی پکڑنا ظلم نہیں۔ میرا خیال ہے تم اسکول میں فلسفہ نہیں پڑھتے۔ ہر ایک کو دُنیا میں زندہ رہنا ہے۔ اور میری ایک سہیلی کو دریائی کتے نے پکڑتے وقت یہی کہا تھا۔

محمود: دریائی کتے کا کیا قصہ ہے؟

مچھلی نے اداس لہجے میں ایک سرد آہ بھر کر کہا:

یہ ایک افسوس ناک واقعہ ہے۔ خیر چوں کہ ہم سب کو کسی نہ کسی طرح مرنا ہے۔ اس لیے افسوس کرنا بے فائدہ ہے۔ اب سنو۔ کوئی ایک ہفتے کا ذکر ہے کہ میں اور میری ایک سہیلی ایک رات کو یہیں پھر رہے تھے، ہم نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھا رکھا تھا، اس کی وجہ سے میری سہیلی پر کچھ سُستی سی چھائی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ پانی پر ایک سایہ سا پڑا۔ میں نے اپنی سہیلی سے کہا۔ ہوشیار ہو جاؤ۔ دریائی کتا آ گیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میری سہیلی بھاگ سکے۔ دریائی کتے نے اس کو پکڑ لیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری سہیلی کو نگل گیا۔

محمود نے کہا:

میں دریائی کتے سے نفرت کرتا ہوں۔

مچھلی کہنے لگی۔

ہاں مجھے بھی اس سے نفرت ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم اس کی خوراک ہیں اور آخر اُسے بھی زندہ رہنا ہے اس کے علاوہ ہمارے اور بھی کئی دشمن ہیں۔ مثلاً شارکیں، جانتے ہو شارک کیا ہوتی ہے؟

محمود بولا: نہیں۔

مچھلی نے کہا:

شارک بھی ایک قسم کی مچھلی ہے لیکن بڑی ظالم ہوتی ہے، آدمی پر بھی حملہ کر بیٹھتی ہے۔ چھوٹی مچھلیوں کی تو جانی دشمن ہے۔ ایک دن ایک شارک نے مجھ پر حملہ کیا اور میرے پیچھے تیزی سے بھاگی۔ میں اوپر اُچھل پڑی اور وہ آگے نکل گئی۔ میں دوڑ کر گھاس میں چھپ گئی۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ میرا دل کس قدر دھڑکتا ہوگا؟

محمود نے پوچھا: اچھا یہ بتاؤ: تم کبھی بنسی سے بھی پکڑی گئی ہو؟

مچھلی نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا:

ہاں ایک دفعہ ایک دن میں نے ایک خوب صورت سیاہ بھنورا پانی میں گرتا دیکھا، میں نے فوراً اُسے منہ میں ڈال لیا۔ لیکن وہ مجھے سُوکھا ہوا اور بے مزہ معلوم ہوا۔ میں نے اُسے منہ سے نکال دینا چاہا، لیکن کانٹا میرے منہ کے ایک طرف پھنس گیا۔ میں نے اسی وقت پانی سے سر باہر نکال کر دیکھا کہ مولو کسان ہاتھ میں ایک لمبی سی بنسی لیے بیٹھا ہے۔ میں نے اپنی کئی سہیلیاں پھنسی ہوئی دیکھی تھیں۔ اس لیے میں جانتی تھی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ لہٰذا میں پورے زور سے ندی کے چڑھاؤ کی طرف بھاگی۔ پھر ایک زبردست جھٹکا لگا اور آزاد ہو گئی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اب اس دن سے میں بہت ہوشیار رہتی ہوں۔

محمود نے مچھلی سے پوچھا: اس کے علاوہ تمھیں تو اور بھی بہت سے واقعات پیش آ چکے ہوں گے؟

مچھلی نے کہا: ہاں ہاں بے شمار واقعات ہیں۔ اتنے بہت کہ ایک اچھی خاصی دل چسپ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

ایک سیاہ مکھی مچھلی کے منہ کے پاس ہی کافی دیر سے اُڑ رہی تھی۔

محمو نے پوچھا: ”تم اس مکھی کو کیوں نہیں پکڑ لیتیں جو کافی دیر سے تمھارے منہ کے آگے اُڑ رہی ہے؟“

مچھلی نے نفرت سے برا سا منہ بنایا اور بولی:

جس طرح تم دسترخوان پر پلاؤ، زردہ، پنیر وغیرہ دیکھ کر چپاتیاں کھانے سے انکار کر دیتے ہو۔ اسی طرح مجھے آج بھنورے مل رہے ہیں۔ میں ان سیاہ مکھیوں کو بھلا کیسے پسند کر سکتی ہوں۔

محمود نے کہا: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں کھانے کو اچھی اچھی چیزیں مل جاتی ہیں۔

مچھلی نے جواب دیا۔

بعض اوقات تو جو کچھ بھی مل جائے غنیمت ہوتا ہے۔ لیکن سردیوں کے شروع میں تو ہر روز ضیافتیں اُڑتی ہیں۔ سب سے اچھا وقت مئی کا مہینہ ہے۔ ان دنوں ایک خاص قسم کے بھنورے اُڑتے ہیں جو بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ ایک دن مولو کسان اسی قسم کے بہت سے بھنورے لے کر آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کافی شکار ہاتھ لگے گا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ بس تھوڑی سی بے وقوف مچھلیاں ہی اس کے ہاتھ آئیں۔

محمود نے کہا:

تم بہت اچھی مچھلی ہو۔ میں تمھیں بہت پسند کرتا ہوں۔

مچھلی ہنس دی: بُھنی ہوئی یا تیل میں تلی ہوئی؟

محمود بھی ہنس دیا اور بولا:

نہیں۔ میرا مطلب کھانے سے نہیں بلکہ تمھیں دیکھنا اور تم سے باتیں کرنے سے ہے۔ بھلا تم کس قدر اچھل سکتی ہو؟

مچھلی نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا:

میرا خیال ہے کہ تقریباً دو فُٹ تک اُچھل سکتی ہو، اگر تمھاری خواہش ہو تو اُچھلوں، لو ایک دو تین۔

تین کہہ کر مچھلی پانی سے اُچھلی اور ہوا میں ایک قلابازی کھا کر دھڑام سے پانی میں آ رہی۔ جیسے ہی وہ پانی میں گری اُس نے ”خدا حافظ“ کہا۔

محمود حیران ہو کر چلا اُٹھا ”تم کہاں ہو“ لیکن بولتی مچھلی پانی میں غائب ہو چکی تھی اُس وقت رات ہو چکی تھی، تاروں کا عکس شفاف پانی میں پڑ رہا تھا، اور محمود کے ابا جان اُسے آوازیں دے رہے تھے، محمود ہرے بھرے میدان سے ہوتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔

☆☆☆☆

احمد داؤد

امانت

فالتو اور بے کار چیزیں جمع کرنے کے لیے انھوں نے علاقے بانٹ رکھے تھے۔

محمد جان شہر کے اندرونی علاقے میں چکر لگاتا اور فقیر علی کوٹھیوں والے علاقے میں گھوم پھر کر کباڑ جمع کرتا۔ جو چیز دوسروں کے لیے بے کار ہوتیں خاص طور پر امیر لوگوں کے لیے جو سامان استعمال ہونے کے بعد فضول سمجھا جاتا۔ ان دونوں کی روزی کا وسیلہ تھا۔ شام کی روٹی، چیزوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کر کے شیخ مطلوب کے کباڑ خانے پر پہنچانے کے بعد ملتی تھی۔

فالتو اور بے کار چیزوں میں پلاسٹک اور شیشے کی بوتلیں، برتن، کانچ کی کراکری گتہ اور ردی کاغذ، چمڑے اور ریکسین کے پرس۔ بجلی کا ناقص سامان پولی تھین کے بیگ بچوں کے خراب کھلونے پرانے پھٹے ہوئے کپڑے جانوروں کی ہڈیاں غرض یہ کہ ایسی بے شمار چیزیں جنہیں استعمال کرنے کے بعد پھینک دیا جاتا ہے۔ ان دونوں کے لیے بہت قیمتی ہوتیں۔

دونوں تقریباً ہم عمر تھے۔ محمد جان ابھی پچھلے مہینے دس سال کا ہوا تھا اس کا باپ ان پڑھ تھا اس لیے اس کی پیدائش کا دن اور سال لکھ نہ سکا۔ لکھتا کیا محمد جان کے پیدا ہونے کے چھ مہینے بعد ٹریفک کے حادثے میں مر گیا۔

فقیر علی اس سے دو مہینے بڑا تھا اس کی ماں کو سال اور مہینہ زبانی یاد تھا۔ اس سال سیلاب آیا تھا اور لوگ روزے رکھ رہے تھے۔

دونوں ایک ہی بستی میں رہتے تھے انہوں نے چیزیں جمع کرنے کے لیے علاقے بانٹ رکھے تھے پہلے وہ اپنے بڑوں کے ساتھ ردی تلاش کرتے سال بھر سے وہ اکیلے اس کام پر لگے ہوئے تھے۔ ان میں حوصلہ اور اعتماد آ چکا تھا، سارا دن وہ اپنے اپنے علاقے میں گھومتے کندھے پر بوری رکھے رنگ برنگی ردی کی اشیا جمع کرنے اور شام کو شیخ مطلوب کے سٹور پر جا کر ان چیزوں کو الگ الگ کرتے، ان کا وزن کراتے اور پھر دس پندرہ بیس پچیس جتنے روپے بنتے، شیخ مطلوب کے منشی سے وصول کر کے گھر آ جاتے۔ شیخ مطلوب اپنے کمرے میں بیٹھا ان کو تکتا رہتا وہ بہت کم ان سے بات کرتا۔ ان کو بھی معلوم نہیں تھا کہ شیخ مطلوب کہاں رہتا ہے وہ

صرف اتنا جانتے تھے کہ یہ شیخ ان کا ردی سامان خرید کر چند روپے دے دیتا ہے ایک آدھ مرتبہ مطلوب نے ان سے بات بھی کی تھی تو صرف اتنی کہ کسی شے کو بے کار سمجھ کر مت چھوڑو اُٹھا کر لے آیا کرو۔

صبح جب وہ ردی چیزیں اکٹھی کرنے نکلتے تو بچے سکول جا رہے ہوتے صاف ستھرے کپڑے پہنے مختلف سرکاری اور پرائیویٹ سکولوں کے بچے رنگ برنگ کی یونیفارم میں خوبصورت پرندوں کی طرح نظر آتے کبھی کبھی ان دونوں کے دل میں بھی سکول جانے کی خواہش پیدا ہوتی لیکن یہ سوچ کر کہ اگر ہم نے سکول جانا شروع کر دیا تو شام کو روٹی کون دے گا اور وہ اپنی خواہش کو دل میں دبا دیتے۔ سکول جانے والے بچوں کے خوبصورت بیگ دیکھ کر وہ سوچتے کہ اگر اتنے ڈھیر سارے بیگ ان کو مل جائیں تو شیخ مطلوب بہت سے پیسے دے دے گا۔

فقیر علی: اگر یہ لڑکے اپنے بستے نالے میں پھینک دیں تو میں اُٹھاؤں گا یا تم لو گے؟

محمد جان نے اِدھر دیکھا جدھر فقیر علی نے اشارہ کیا یہ جگہ شہر اور کوٹھیوں کے درمیان تھی محمد جان نے جواب دیا۔

یہ جگہ تمھارے علاقے میں ہے اور نہ میرے علاقے میں۔

فقیر محمد بولا: اس کا مطلب ہے آدھے آدھے پیسے ہوں گے۔

سکول جاتے بچوں نے بیگ تو نہ پھینکے لیکن ایک موٹے سے بچے نے منہ بنا کر ان دونوں کا مذاق ضرور اُڑایا۔

محمد جان کو شہر کے اندر بعض اوقات لوگوں کا غصہ بھی برداشت کرنا پڑتا۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ اس نے کسی چیز کو فالتو اور بے کار سمجھ کر اُٹھایا تو اس شے کے مالک نے اس کو بُرا بھلا کہا اس لیے کہ وہ چیز کسی خاص مقصد کے لیے وہاں رکھی گئی تھی۔

فقیر علی کی موج تھی۔ کوٹھیوں کے باہر اکثر چیزیں پولی تھین کے بیگ میں بند مل جاتیں ایک دفعہ اس کو سارے کھلونے سفید رنگ کے تھیلے میں پڑے ہوئے ملے تو وہ بہت خوش ہوا۔ ان کھلونوں میں تالیاں بجانے والا بندر، چابی سے چلنے والی موٹر، لیکن اس کی چابی نہیں تھی۔ آنکھیں مارنے والی گڑی۔ ڈرم بجانے والا بھالو اور ایک سیٹی بھی تھی۔ اس دن محمد جان اور فقیر علی کی بستی میں بہت رونق تھی اس لیے کہ فقیر علی وہ سارے کھلونے لے کر پہلے اپنے گھر گیا اور بستی کے بچوں میں بانٹ کر شیخ مطلوب کے کباڑ خانے پر واپس آیا۔

آج تم نے دیر کر دی کدھر چلے گئے تھے۔ منشی نے پوچھا اور پھر شیخ مطلوب کی طرف دیکھا جو اپنے

کمرے سے نکل کر ان کے پاس آ گیا تھا۔

آج مجھے کھلونوں کا ڈھیر مل گیا تھا.......... فقیر علی خوشی سے بولا۔ میں اپنی بستی کے بچوں میں کھلونے بانٹ کر ادھر آیا ہوں۔

اوئے بیوقوف۔۔۔ شیخ مطلوب کہنے لگا۔ تمھاری بستی کے بچوں نے کھلونوں کا کیا کرنا۔ ادھر لاتے چار پیسے مل جاتے۔

فقیر علی نے بوری میں سے استعمال شدہ چیزوں کا ڈھیر نکالتے ہوئے کہا۔

پیسے تو روز مل جاتے ہیں۔ کھلونے کبھی کبھی ملتے ہیں۔

کیا کیا تھا کھلونوں میں۔ شیخ مطلب نے پوچھا۔ فقیر علی نے دماغ پر زور دیا۔ اسے سارے کھلونوں کے نام نہیں آ رہے تھے۔ سوچ سوچ کر، رُک رُک کر اس نے اپنے انداز سے کھلونوں کے بارے میں بتایا شیخ مطلوب نے فقیر علی کی بات سن کر کہا۔ آئندہ اگر ایسی چیزیں ملیں تو ادھر لایا کر۔۔۔ پیسے ملیں گے۔

ایک دن فقیر علی کو ایسی چیز مل گئی۔

سردی کا موسم تھا سورج نکل آیا تھا لیکن دھوپ نہیں نکلی تھی ہر طرف سردی کی دھند پھیلی ہوئی تھی گھاس پر کہرا جما ہوا تھا۔ سڑکوں پر لوگوں کی آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ صبح سویرے سکول جانے والے بچے بس سٹاپ پر گاڑیوں کے انتظار میں کھڑے تھے۔ فقیر علی اور محمد جان اس چوک میں پہنچے، جہاں سے ان کو الگ ہونا تھا۔

فقیرے۔۔۔ آج دوپہر کا کھانا اکٹھے کھائیں گے۔ محمد جان نے اونچی آواز میں کہا۔

کھانا کہاں کھائیں گے۔ فقیر محمد نے پوچھا۔

تم کوٹھیوں کا چکر لگا کر اسٹیشن پر آ جانا، میں شہر کا مال ڈھونڈ کر آ جاؤں گا اسٹیشن کے باہر کھوکھے پر روٹی کھائیں گے۔

تو پھر جلدی کرو۔ خدا حافظ!

چوک میں دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ محمد جان شہر کے گنجان علاقے میں چلا گیا اور فقیر علی نے کوٹھیوں کا رُخ کیا۔

خوبصورت کوٹھیوں والا یہ علاقہ شہر کے امیر ترین لوگوں پر مشتمل تھا بڑی بڑی کوٹھیاں جن میں سنگِ مرمر، سنگِ سرخ، سنگِ سیاہ کے علاوہ پتلی اینٹ اور خوبصورت رنگ اس طرح لگائے گئے تھے کہ ہر کوٹھی اس بچے کی

طرح سجی نظر آتی جس کی سالگرہ منائی جا رہی ہو۔

فقیر علی زمین پر نگاہیں دوڑاتا۔ کوٹھیوں کے گیٹوں اور پچھواڑے کے ارد گرد متلاشی نظروں سے ٹہلتا ٹہلتا جب ایک سفید رنگ کی محل نما کوٹھی کے سامنے پہنچا تو اس کی نظر لوہے کے گیٹ کے باہر رکھے پولی تھین کے بیگ پر پڑی جسے ملازم نے رات کے وقت باہر رکھ دیا تھا۔ اس علاقے میں لوگ دن بھر کی گندگی اور استعمال شدہ چیزیں مومی لفافوں میں ڈال کر باہر رکھ دیتے تاکہ سرکاری خاکروب صبح ان کو اُٹھا کر لے جائیں۔ فقیر علی سرکاری خاکروب نہیں تھا اس لیے بہت صبح صبح وہ اپنے کام پر نکلتا تھا۔

فقیر علی کی نظر بند لفافے پر گئی تو اس نے جھٹ اس کو اُٹھا کر ٹٹولا اور کھولنا چاہا لیکن کوٹھی کے اندر ٹہلتے کتے نے بھونک کر اس کو ڈرا دیا۔ فقیر علی نے جلدی سے بھاری لفافے کو بوری میں ڈالا اور آگے بڑھ گیا۔ دوپہر تک اس نے پلاسٹک کے تین ڈبے پانچ ٹوٹی ہوئی شیشے کی بوتلیں اور ایک ٹوٹی ہوئی ایش ٹرے کاغذوں کا ڈھیر اور مومی لفافے اور پھٹے ہوئے کپڑے جمع کر لیے۔ ایک ڈرم میں اس کو بکری کے دو سینگ بھی ملے جو اس نے بوری میں ڈال لیے۔ اب اس کو محمد جان سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔ بھوک لگی اس نے ردی سامان کی بوری کندھے پر رکھی اور اسٹیشن کی طرف چل دیا۔

اسٹیشن کے باہر کھوکھے پر محمد جان اس کا انتظار کر رہا تھا دونوں نے تندور سے روٹیاں اور دال کی پلیٹ لے کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد دونوں نے اپنا اپنا سامان فٹ پاتھ پر کھول کر مختلف چیزوں کو الگ الگ کیا۔ اچانک فقیر علی کو اس سفید پولی تھین بیگ کا خیال آیا۔ جلدی سے بوری کے اندر سے نکال کر اس نے بیگ کھولا اور چیزیں دیکھنے لگا۔ بیگ سے ٹوٹا ہوا آئینہ، بچے کے دودھ پینے کی بوتل، ٹشو پیپر کے ٹکڑے، کنگھی اور ایک ہار نکلا۔ فقیر علی نے ہار کو غور سے دیکھا اور محمد جان سے پوچھا:۔

یہ ہار تو بالکل نیا لگتا ہے۔ نیا ہوتا تو ان چیزوں کے ساتھ نہ ہوتا۔ لاؤ مجھے دکھاؤ محمد جان نے فقیر محمد کے ہاتھ سے ہار لیا اور پھر بغیر سوچے سمجھے، اسے فقیر علی کے گلے میں ڈال دیا۔

’’یہ تم پہنا کرو۔ بالکل لڑکیوں والا ہار ہے۔‘‘

’’میں یہ اماں جی کو دوں گا۔‘‘ فقیر علی بولا۔

’’کباڑیئے کو دے دینا دو تین روپے مل جائیں گے۔‘‘

’’نہیں یار! یہ گھر لے کر جاؤں گا۔ اُٹھو دیر ہو رہی ہے۔‘‘

دونوں نے اپنا اپنا سامان سمیٹا اور شیخ مطلوب کے کباڑ خانے کی طرف چل دیئے۔ شیخ مطلوب اپنے

کمرے میں موجود نہیں تھا۔ اس کے منشی سے دونوں نے پندرہ پندرہ روپے لے کر گھر کا رُخ کیا۔

رات کو فقیر علی کی جھگی میں بڑی رونق تھی۔ اس کی ماں نے ہار ملنے پر محمد جان کے بابا اور بہن کو بلا لیا تھا۔ سارے لوگ اس ہار کو ٹٹول ٹٹول کر اُچھال اُچھال کر دیکھ رہے تھے۔

‘‘اصلی سونے کا ہار ہے’’ فقیر علی کی ماں بولی ‘‘صبح ہوتے ہی جہاں سے اُٹھایا وہاں پھینک آنا۔’’

‘‘تا کہ کوئی اور اُٹھا لے۔’’ فقیر علی بولا

‘‘نہیں نہیں۔ یہ ہم ان کو واپس کریں گے جن کی چیز ہے۔’’ محمد جان کا بابا بولا۔

فقیر علی کی ماں نے زور سے سر ہلایا اور کہا:۔

‘‘جس کی چیز ہے اس کے گلے میں اچھی لگتی ہے۔ خدا ہمیں حرام کھانے سے بچائے۔’’

محمد جان کی بہن نے ہار پر انگلیاں پھیریں، سونے کا خوبصورت ہار، جس میں جگہ جگہ سبز رنگ کے چھوٹے چھوٹے پتھر لگے تھے، اس کے دل کو بہت اچھے لگے۔ فقیر علی کی ماں نے ہار لے کر ایک ڈبے میں بند کیا ڈبے کو کپڑے میں لپیٹ کر اپنے سرہانے کے نیچے رکھ لیا اور صبح کا انتظار کرنے لگی۔

صبح کی پہلی نشانی مرغ کی اذان تھی۔ پھر پرندے بولنے لگے اور سورج دھند کے پیچھے سے جھانکنے لگا۔ فقیر علی اور محمد جان نے بوریاں کندھے پر رکھیں اور اپنے سفر پہ نکلے لیکن اس دفعہ ان کے ساتھ دو بڑے بھی تھے۔ محمد جان کا بابا اور فقیر علی کی اماں۔

فقیر علی ان کو اپنے ساتھ اس محل نما کوٹھی پر لے آیا، جہاں سے کل صبح اس نے بند لفافہ اُٹھایا تھا۔ انہوں نے گیٹ پر زور زور سے ہاتھ مارے اور جب اندر سے کوئی نہ نکلا تو دروازے کے ساتھ لگی گھنٹی پر فقیر محمد نے انگلی رکھ کر زور سے دبایا دو تین مرتبہ گھنٹی بجانے کے بعد اندر سے ایک بوڑھا ملازم باہر نکلا اور غصے سے بولا۔

سارے گھر والے سوئے ہوئے ہیں۔ صبح ہی صبح مانگنے آ جاتے ہیں۔ محمد جان کا بابا زور سے بولا۔

ہم مانگنے والے نہیں ہیں۔ حق حلال کی کمائی کھاتے ہیں۔

‘‘کیا بات ہے کس سے ملنا ہے؟’’ ملازم نے پوچھا۔

‘‘گھر کا مالک کون ہے؟’’ فقیر علی کی ماں بولی۔

‘‘وہ اس وقت سو رہے ہیں۔’’

‘‘اسی کو دے دیتے ہیں۔ ہار مالک کو پہنچا دے گا۔’’ فقیر محمد بولا۔

‘‘ناں ناں اس کو نہیں دینا۔’’ فقیر علی کی ماں بولی۔ محمد جان کے بابا نے اونچی آواز میں کہا: ‘‘جاؤ جا کر

اپنے مالک کو بلاؤ۔ ان کا ہار واپس کرنا ہے۔"

"ہار واپس کرنا ہے، ہار آپ کے پاس ہے۔ اوہ میرے خدایا شکر ہے۔ سارا گھر پریشان تھا، چوکیدار زور زور سے بولنے لگا۔ مالک نے تو ہار گم ہونے پر بڑی بیگم کو رات بھر سونے نہیں دیا۔ چھوٹی بیگم کا رو رو کر بُرا حال ہے۔"

"بہت قیمتی ہار ہے؟" محمد جان بے تابی سے بولا۔

"جی ہاں۔ بہت قیمتی پورے تیس ہزار کا ہے۔" "ٹھہرو۔۔۔۔ میں ابھی مالک کو بلاتا ہوں۔"

"ناں۔ ناں۔ مالک کو نہ بلاؤ۔ یہ لیتے جاؤ۔" فقیر علی کی ماں بولی۔ اچانک اندر والے دروازے سے ایک آدمی خوبصورت نرم گرم قیمتی کمبل لپیٹے نکلا اور ان کی طرف آیا۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ نوکر اسے دیکھ کر جوش کے ساتھ بولا۔

"ہار مل گیا ہے جی۔"

فقیر علی کی ماں نے ہار اس آدمی کی طرف بڑھایا، جب وہ آدمی ہار لینے کے لیے آگے بڑھا اور ہاتھ کمبل سے باہر نکالا تو اس کا چہرہ دیکھ کر فقیر علی اور محمد جان حیران رہ گئے۔ وہ شیخ مطلوب کباڑیا تھا۔

ان دونوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ شیخ مطلوب نے ہاتھ جیب میں ڈال کر اپنے سامنے کھڑے ردی جمع کرنے والے لوگوں کو دیکھا۔ فقیر علی اور محمد جان کو پہچان کر اس نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور کہا:

"یہ لو۔ پانچ روپے۔ اگر کباڑ خانے پر آتے تو پانچ روپے ملتے گھر پر آنے کا پانچ روپیہ انعام دے رہا ہوں۔ شاباش۔"

محمد جان اور فقیر علی نے صبح صبح اتنی بڑی رقم دیکھ کر اپنے دل میں بہت خوشی محسوس کی اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اپنی محنت کا معاوضہ اور انعام لیتے فقیر علی کی ماں بولی۔

"ناں جی ناں۔ یہ تو ہم امانت واپس کرنے آئے ہیں۔"

"اوہو۔۔ رکھ لو۔۔۔ دے دو بچوں کو۔ اور ہاں، اگر آئندہ ایسی کوئی چیز ملے تو سب سے پہلے میرے کباڑ خانے پر آیا کرو۔۔۔۔ یہ لو۔۔۔ شاباش۔"

فقیر علی نے آگے بڑھ کر دس کا نوٹ لے لیا اور سارے لوگ باہر نکل آئے۔

☆☆☆☆

اشفاق احمد

جان کی بازی

اسکول میں سالانہ کھیل منعقد ہو رہے تھے۔ عمران عارف اور میں میدان کے قریب بیٹھے ہاکی میچ شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ اسکول میں گزشتہ ایک ہفتے سے صبح کے وقت جماعت لگ رہی تھی کیونکہ گیارہ بجے کے بعد کھیلوں کے مقابلے ہونے لگتے۔ گیارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے‘ ہاکی میچ شروع ہوا چاہتا تھا‘ لیکن زبیر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ہم اسے جماعت ہی میں چھوڑ آئے تھے کیونکہ اس کے سر میں درد تھا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد آنے کا کہا تھا مگر اب تقریباً آدھا گھنٹہ ہو چلا تھا ہم چاروں یعنی عارف‘ عمران، زبیر اور میں گہرے دوست تھے۔

زبیر تو کمرے میں بیٹھا رو رہا ہے‘ ایک لڑکے نے آ کر بتایا۔

”ہیں! ہم تینوں نے ایک ساتھ کہا اور کمرۂ جماعت کی طرف بڑھے۔ زبیر میز پر سر رکھے رو رہا تھا‘ میں نے بڑھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا‘ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے‘ میں نے اس کے آنسو پونچھے اور کہا ”یہ کیا بے وقوفی ہے؟ مرد ہو کر روتے ہو!“

”ہیں! کیا مطلب؟ عارف نے شرارتی انداز میں کہا ”کیا یہ کام صرف عورتوں کے کرنے کا ہے؟“

”تم چپ رہو۔“ میں نے عارف کو ڈانٹا ”دیکھ نہیں رہے، بے چارے کا رو رو کر برا حال ہے“۔

کچھ نہیں‘ کچھ بھی تو نہیں‘ زبیر نے جیب سے رومال نکال کر آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

”ہوں! تو اب ہم سے چھپاؤ گے‘ عمران اسے گھورتے ہوئے بولا ”کہہ دو کہ رونے کی مشق کر رہا تھا۔ کل ڈرامے میں جو حصہ لینا ہے “۔

”زبی! یہ بہت بُری بات ہے“ میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا‘ ہم اتنے اچھے دوست ہیں‘ بالکل بھائیوں کی طرح‘ پھر بھی ہم سے اپنا غم چھپا رہے ہو“۔

جواب میں زبیر خاموش رہا۔ عارف نے کرسی سرکائی اور قریب بیٹھ کر بولا ”کاشف میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ کیوں پریشان ہے؟“

یہ سنتے ہی زبیر کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔ میں سمجھ گیا کہ عارف نے درست اندازہ لگایا' ہم جانتے تھے کہ اس کی امی بیمار رہتی ہیں' مناسب علاج نہ ہونے کی وجہ سے ان کی بیماری آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔

ہماری طرح زبیر کے والد بھی درمیانے درجے کے سرکاری ملازم اور بہت ایمان دار آدمی تھے۔ مہنگائی کے اس دور میں انہیں ملنے والی کم تنخواہ سے گھر کا خرچ ہی مشکل سے چلتا تھا' بیماری کا علاج کیسے ہوتا؟

''خالہ جان بہت بیمار ہیں کیا؟ میں نے زبیر سے پوچھا'' وہ ہسپتال میں داخل ہیں''۔ زبیر نے آہستہ سے بتایا ''ان کا آپریشن ہونا ہے اور اس کے لیے ڈاکٹر نے پانچ ہزار روپے مانگے ہیں۔ ابو نے رقم کا انتظام کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ابھی تک ایک سو روپے بھی جمع نہیں ہو سکے''۔

یہ سن کر ہمیں بہت افسوس ہوا مگر ہم بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ عارف اور عمران بھی یہ سن کر پریشان ہو گئے۔ میں دل سے چاہتا تھا کہ زبیر کی مدد کی جائے لیکن کیسے' یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ہمیں یوں سر جھکائے دیکھ کر زبیر اٹھا اور باہر چل دیا۔ ہم اداس نظروں سے اسے جاتا دیکھتے رہے۔

ہم نے ایسے کئی راستے سوچے جن سے زبیر کی مدد کی جا سکے۔ لیکن کوئی راستہ بھی ایسا نہ تھا جس پر چل کر ہمیں پانچ ہزار کی رقم مل سکتی۔ ہم تینوں بہت کوشش کرتے تو دو تین ہزار سے زیادہ رقم جمع نہیں کر سکتے تھے۔

شام کے وقت میں کسی ضروری کام کے لیے باہر نکلا تو دور سے عمران آتا نظر آیا۔ قریب پہنچتے ہی اس نے بڑے جوش سے کہا' ''لو بھئی پانچ ہزار روپے حاصل کرنے کا ایک طریقہ نظر آ گیا۔''

میں نے دل میں اطمینان کی ایک لہر اٹھتی محسوس کی' خوش ہو کر پوچھا' 'بہت خوب! وہ طریقہ کیا ہے؟

''وہ۔۔۔ اصل میں۔۔۔' 'عمران بولا' 'طریقہ ذرا خطرناک ہے''۔

کیا مطلب۔۔۔؟ ہم غلط اور خطرناک طریقے سے روپیہ حاصل کریں گے؟ میں بھڑک اٹھا۔

'' ارے نہیں۔۔۔ نہیں تم غلط سمجھے۔ یہ بات نہیں'' عمران نے بوکھلا کر میری بات کاٹی''۔ ادھر ریلوے گراؤنڈ میں سرکس والے آئے ہوئے ہیں''۔

''ہاں آئے تو ہوئے ہیں۔۔۔ پھر؟''

'' آج انہوں نے ایک اشتہار لگایا ہے کہ موت کے کنوئیں میں جو آدمی اُن کے ملازم سے زیادہ بلندی تک موٹر سائیکل چلائے گا اسے پانچ ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔

''مگر اس مقابلے سے ہمیں کیا فائدہ ہم اس میں حصہ نہیں لے سکتے؟'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''تم لے سکتے ہو' عمران نے ڈرتے ڈرتے کہا'' میں مگر کیسے؟ میں نے تو کبھی موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل نہیں چلائی؟''

''تم جو یہ سڑکوں پر موٹر سائیکل چلاتے ہوئے ہاتھ چھوڑ دیتے ہو اگلا پہیا اوپر اٹھا لیتے ہو' یہ سب کیا ہے؟ کرتب ہی تو ہیں''۔ عمران نے مسکرا کر کہا۔

اب میں سمجھا کہ وہ مجھے کس خطرناک کام پر آمادہ کرنا چاہتا تھا۔ ''ہم جانتے ہیں کہ اس کام میں کتنا خطرہ بلکہ سو فیصد خطرہ ہے''۔ میں تنگ کر بولا۔

''خطرہ تو وہاں بھی ہے۔۔۔ ہسپتال میں زبیر کی امی کو!'' عمران افسردہ لہجے میں بولا۔

یہ سن کر میں خاموش ہو گیا' میرے سامنے زبیر کا افسردہ چہرہ گھومنے لگا' اب میں عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھا' ایک طرف وہ خطرناک کام تھا' جس کا مجھے ذرہ بھر تجربہ نہ تھا' دوسری طرف ہمارے بھائیوں جیسے پیارے دوست کی بیمار ماں تھی۔

''کس سوچ میں پڑ گئے؟ عمران نے پوچھا' ٹھیک ہے تمھارا دل نہیں مانتا تو نہ سہی' تم مجھے موٹر سائیکل چلانا سکھا دو تم دیکھنا کہ میں جیتوں گا انشاءاللہ''۔

اس کی یہ بات سن کر میں انکار نہ کر سکا۔

''ٹھیک ہے عمران' میں اس مقابلے میں حصہ لوں گا''۔ میں نے کہا۔

''یہ ہوئی نا بات! آؤ چلیں تمھیں ایک خاص آدمی سے ملواؤں'' عمران بولا۔

'' خاص آدمی''؟ کیا مطلب'' میں نے پوچھا۔

''میرے محلے میں مقیم جمشید نور صاحب ایک زمانے میں موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتے تھے' آج کل ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں''۔ عمران نے بتایا'' میں ان کے ساتھ بات کر چکا ہوں' پہلے تو وہ مانتے ہی نہیں تھے' ان کے نزدیک اناڑی لڑکے کا موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانا موت کے منہ میں چھلانگ لگانا ہے''۔

''تو پھر وہ کیسے مانے؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

جب میں نے انہیں ساری صورت حال بتائی تو ان کا دل پگھل گیا' وہ بولے کہ تم ایک عظیم مقصد کے لیے اتنی بڑی قربانی دے رہے ہو' میں ضرور تمہاری مدد کروں گا''۔

''واہ! یہ تو ہماری غیبی امداد ہوگئی' میں نے خوش ہو کر کہا ''چلوان کے پاس چلتے ہیں'' عمران بولا۔

جمشید نور نے بڑی محبت سے ہمیں خوش آمدید کہا' انہوں نے ایک گھنٹے تک مجھے اس خطرناک کھیل کے گر بتائے اور موٹر سائیکل پر بٹھا کر اسے چلانا سکھایا۔ موٹر سائیکل کی رفتار اس پر قابو اور دائرے میں گھماتے ہوئے اپنے بائیں طرف جسم کا پورا زور لگانا' یہ اہم امور سیکھ کر مجھے محسوس ہونے لگا کہ اب میں موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلا سکوں گا۔

شام تقریباً سات بجے مقابلہ شروع ہوا' اس میں چار لوگ شریک تھے کیونکہ یہ کھیل ہر کسی کے بس کا نہیں تھا۔ موت کا کنواں بہت بڑا اور مضبوط تھا' اس کے باوجود موٹر سائیکل کے گھن گرج سے لکڑی کے تختے لرز رہے تھے' جمشید نور بھی تماشائیوں میں شامل تھے۔

اس کنوئیں کے اندر اوپر تین فٹ نیچے ایک لکیر لگائی تھی جو شخص اس لکیر پر سے گزرتا اسے فاتح قرار دیا جاتا۔ موت کے کنویں کا ملازم مہارت سے لکیر چھو کر نیچے اتر آیا۔ دوسرے دو آدمی چھونے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مقابلہ دیکھنے کے لیے تقریباً چار سو تماشائی سرکس میں موجود تھے۔ عمران اور عارف جمشید نور کے ساتھ اوپر کھڑے تھے۔ میں موٹر سائیکل پر بیٹھا یہ خطرناک کھیل کھیلنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ زبیر کو اس معاملے کی کچھ خبر نہ تھی' ہم نے اسے کچھ نہیں بتایا ورنہ وہ مجھے ایسا جان جوکھوں کا مقابلہ کبھی نہ کرنے دیتا۔

لیکن یہ ہماری غلط فہمی تھی' جب زبیر ہم تینوں کے گھر گیا تو عمران کی والدہ نے اسے بتا دیا کہ وہ دوستوں کے ساتھ سرکس دیکھنے گیا ہے' چنانچہ وہ بھی آ پہنچا۔ ادھر ادھر ڈھونڈنے کے بعد آخر اس نے ٹکٹ خرید ا اور موت کے کنویں پر چڑھ گیا کیونکہ وہیں سب سے زیادہ ہجوم تھا' اسے یقین تھا کہ اس کے دوست بھی وہیں موجود ہوں گے۔

دس منٹ بعد اس نے عارف اور عمران کو تلاش کر لیا۔ وہ دونوں اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ عمران بے اختیار بولا ''زبیر تم کیوں چلے آئے؟''

کیوں بھئی تم لوگ آ سکتے ہو تو میں نہیں آ سکتا' کاشف کہاں ہے؟''

یہ سن کر عارف اور عمران چونک اٹھے' اس دوران میں زبیر نے مجھے موٹر سائیکل پر بیٹھے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔

"یہ۔۔۔یہ کاشف۔۔۔۔وہاں کیا کر رہا ہے' وہ ہکلا کر بولا' پھر جیسے سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اس نے بھی وہ اشتہار پڑھ رکھا تھا' زبیر سمجھ گیا کہ کاشف اس کی امی کے آپریشن کے لیے پانچ ہزار روپے حاصل کرنے کی کوشش میں موٹر سائیکل چلانے لگا ہے۔ لیکن اتنا خطرناک کھیل' وہ تھرا گیا اور پوری قوت سے چلایا" کاشف ایسا مت کرنا۔"

لیکن لوگوں کا شور اتنا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی' وہ پھر چلایا" کاشف ایسا مت کرنا"۔

میں نے چونک کر اوپر دیکھا تو مجھے عمران اور عارف کے بازوؤں میں جکڑا ہوا زبیر نظر آیا' اس کے چہرے پر پھیلا دکھ اور آنکھوں میں آنسو دیکھ کر یوں لگا جیسے آنسو میرے دل میں سوراخ کیے دے رہے ہوں۔ وہ التجا بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا' ساتھ ساتھ کچھ کہہ بھی رہا تھا، لیکن شور میں مجھے کوئی فقرہ سنائی نہ دیا۔ اس کی بے چینی اور پریشانی دیکھ کر میرے آنسو بھی آنکھوں کی قید سے رہائی پانے والے تھے کہ میں نے سر جھکا کر موٹر سائیکل چالو کر دی۔

عارف اور عمران نے زبیر کے بازو پکڑے ہوئے تھے' وہ ان کی منتیں کر رہا تھا" عارف! دیکھو! کاشف کو روک لو اسے ایسا نہ کرنے دو۔" وہ اپنے آپ کو ان سے چھڑاتا اور کبھی منتیں کرتا۔ اس کی حالت دیکھ کر ان دونوں کے بھی آنسو نکل آئے۔ اردگرد کے لوگ انہیں تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ جمشید نور صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دلاسا دیا تو زبیر روتا ہوا بولا۔

"بابا جی! اسے روک لیں' وہ مر جائے گا۔ میری امی تو ٹھیک ہو جائیں گی"۔ وہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

جمشید نور صاحب نے تسلی کے ایک دو فقرے کہے اور اسے سینے سے لگا لیا' اب عارف اور عمران دل ہی دل میں پریشان تھے کہ کاش وہ مجھے اس کام پر آمادہ نہ کرتے۔

ادھر میں موٹر سائیکل بڑی کامیابی کے ساتھ لکڑی کے تختوں پر گھما رہا تھا ہر چکر مزید بلندی پر چڑھتا چلا گیا' میری آنکھوں میں روتے ہوئے زبیر کا چہرہ تھا' بس ایک شعلہ تھا جو میرے سینے میں لپک لپک جاتا۔ میں بڑے جذبے کے ساتھ مقررہ لکیر تک پہنچ رہا تھا' آخرکار میں نے اسے چھو ہی لیا' لوگوں نے تالیاں بجا کر مجھے خوب داد دی۔

اب میں لکیر سے بھی اوپر موٹر سائیکل چلا رہا تھا' لوگوں کا شور بتا رہا تھا کہ میں فتح کا حق دار ہو چکا ہوں۔

میں پھر موٹر سائیکل دھیرے دھیرے نیچے لے آیا' مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنا خطرناک مرحلہ پار کر چکا ہوں' جب میرے ہاتھ میں پانچ ہزار تھمائے گئے تو مجھے علم ہوا کہ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا۔

انعام پا کر باہر نکلتے ہی عمران اور عارف نے زوردار نعرہ لگا کر مجھے آغوش میں لے لیا۔ زبیر ایک طرف کھڑا تھا' اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے، میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''مجھے معاف کر دینا میرے دوست! ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور دوسرا راستہ نہ تھا۔

یہ سن کر زبیر مجھ سے لپٹ گیا اور رندھی ہوئی آواز میں بولا ''تم نے اچھا نہیں کیا کاشف! اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کر پاتا''۔

اسے کچھ نہیں ہو سکتا تھا'' یہ جمشید نور صاحب کی آواز تھی' وہ کہنے لگا ''اس کے دل میں محبت اور خلوص کی شمع جل رہی تھی' وہ اسے کبھی ناکام نہ ہونے دیتی' تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں اتنا پیار اور جان کی بازی لگانے والا دوست ملا''۔

جمشید نور صاحب کی بات سن کر زبیر نے اپنے آنسو پونچھے اور مسکرا کر مجھے گلے لگا لیا۔

☆☆☆☆

پروفیسر اکبر حمیدی

ایک طالب علم کی سچّی کہانی

پیارے بچو! آج میں آپ کو ایک ایسی کہانی سنانا چاہتا ہوں جو نہ صرف آپ کی اپنی یعنی ایک طالب علم کی کہانی ہے بلکہ سو فیصد سچی کہانی ہے۔ لطف یہ کہ بہت دلچسپ بھی ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بچہ لڑکپن میں یا نوجوانی کے زمانے میں اپنے والدین سے کسی بات پر روٹھ جاتا ہے۔ بظاہر وہ روٹھا ہوا نہیں لگتا مگر دل ہی دل میں روٹھا ہوا ہوتا ہے اور اکثر اسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ وہ والدین سے روٹھ کر والدین کو پریشان کرنا چاہتا ہے مگر حقیقت میں اپنے آپ کو پریشان کر رہا ہوتا ہے اور نقصان بھی خود اپنے آپ کو پہنچا رہا ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بے خبر ہوتا ہے۔

میں اسلام آباد کے ایک بہت اہم اور مشہور تعلیمی ادارے میں پڑھا رہا تھا۔ چونکہ درس و تدریس کا شعبہ میری پسند کا شعبہ تھا اور میں اپنی دلی خواہش کے مطابق یہاں آیا تھا اس لیے مجھے کلاسوں میں زور شور سے پڑھانے اور طلبا کے معاملات و مسائل میں دلچسپی لینے کا بھی شوق تھا۔ میں ضرورت کے مطابق طلبا کے ذاتی مسائل بھی پوچھتا رہتا اور جہاں ضرورت ہوتی، ان کے مسائل میں شامل بھی ہو جاتا۔ کالج میں اگر طلبا کا کوئی معاملہ انتظامیہ سے پڑتا تو میں ہمیشہ طلبا کی حمایت کرتا۔ کسی سٹوڈنٹ کو ضرورت ہوتی اور میں اس کے حالات سے آگاہ ہو جاتا تو اسے بتائے بغیر اس کی فیس معاف کروانے کے لیے اپنی رپورٹ اور سفارش تحریری طور پر خفیہ طریقے سے پرنسپل صاحب کو بھیج دیتا۔

مگر ایک مرتبہ تو بہت عجیب واقعہ پیش آیا۔

میں حسب معمول صبح کالج پہنچا۔ ان دنوں ایک بہت سینئر استاد وائس پرنسپل تھے۔ مجھے ان سے کوئی کام تھا چنانچہ میں سٹاف روم سے نکل کر سیدھا ان کے کمرے میں پہنچا۔ کالج لگے ابھی چند ہی منٹ ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا وائس پرنسپل صاحب جلدی جلدی کاغذات سمیٹ کر کہیں کمرے سے باہر جانا چاہتے تھے۔ میں نے اپنی بات کہنی چاہی مگر انہوں نے کہا کہ وہ ایک طالب علم کے ڈسپلن کیس کے سلسلے میں پرنسپل صاحب کے پاس جا رہے ہیں۔ مجھے انہوں نے چند منٹ انتظار کرنے کو کہا۔ پھر کہا کہ اس لڑکے نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔

طلبا کی طرف سے بھی اور اساتذہ کی طرف سے بھی اس کے بارے میں عرصے سے شکایات مل رہی ہیں۔ آج پرنسپل صاحب سے دستخط کروا کر اسے فارغ کر دیا جائے گا۔

چونکہ طلبا کے معاملات سے مجھے گہری دلچسپی تھی اس لیے میں نے پوچھا:۔

”سر یہ طالب علم کون ہے“

”عمران کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ سارے کالج کی ناک میں اس نے دم کر رکھا ہے۔ آج اسے فارغ کر رہے ہیں۔“

وائس پرنسپل صاحب بہت ہمدرد استاد تھے یہ میں جانتا تھا لیکن آج تو وہ بھی بہت غصے میں تھے۔ میں نے کہا۔

”سر آپ کو معلوم ہے میں عمران کی کلاس کا انچارج ہوں اور کالج کے ضابطے کے مطابق میری کلاس کا کوئی لڑکا میری رائے لیے بغیر کالج سے فارغ نہیں کیا جا سکتا اور میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ میری کلاس کے کسی لڑکے کو کالج سے فارغ کر دیا جائے۔“

”آپ درست کہتے ہیں مگر اس طالب علم کا معاملہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ ہم نے تمام متعلقہ سبجیکٹ ٹیچرز سے رائے لے لی ہے۔ اور سب کی ایک ہی رائے ہے۔“

”مگر سر میری رائے مختلف ہے۔ میں اس کلاس کا انچارج ہوں اور میری رائے لینا زیادہ ضروری ہے اور میں اس لڑکے کو کالج سے نکل کر آوارہ پھرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔“

وائس پرنسپل صاحب بہت مہربان اور بہت اچھے استاد تھے میری بات پر انہوں نے توجہ دی۔ اس لیے بھی کہ کالج کے ضابطے کے مطابق کلاس انچارج کی رائے کے بغیر کسی طالب علم کو کالج سے فارغ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

چنانچہ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ عمران سے متعلق تمام کاغذات ان کے ہاتھوں میں تھے۔ چند لمحے سوچ کر انہوں نے کہا:

”حمیدی صاحب آپ کیا چاہتے ہیں“

”میں چاہتا ہوں کہ عمران کو ایک موقع اور دیا جائے اور اس معاملے میں جلدی نہ کی جائے۔ وہ بہت اچھا بچہ ہے۔ بہت فرمانبردار۔ میں اسے ذاتی طور پر جانتا ہوں۔“

”کیا آپ اس کی ذمہ داری لے سکتے ہیں؟“

”جی ہاں میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ “

”ایسے نہیں تحریری طور پر۔ آیندہ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو ذمہ داری آپ کی ہوگی اور آپ بھی جواب دہ ہوں گے۔ “

”سر مجھے منظور ہے۔ لایئے میں لکھ کر دیتا ہوں۔ “

”آپ کو شاید معلوم نہیں وہ بڑا چاقو ساتھ لے کر کالج میں آتا ہے۔ سگریٹ کا پیکٹ بھی۔ نہ صرف طلبا پر حملہ آور ہوتا ہے بلکہ اساتذہ کے ساتھ بھی بدتمیزی کرتا ہے۔ آپ ان سب باتوں کے ذمہ دار ہوں گے۔ “

”جی میں پوری ذمہ داری لیتا ہوں آیندہ ایسا نہیں ہوگا۔ “

میں نے مختلف ذرائع سے اس کے بارے میں معلومات جمع کیں۔ معلوم ہوا کہ اس کی والدہ فوت ہوگئی تھیں۔ اس کے والد صاحب نے دوسری شادی کی ہے۔ عمران کے والد کسی بڑی سرکاری نوکری کے سلسلے میں کسی پاکستانی سفارت خانے میں ہیں۔ عمران کی دوسری والدہ پڑھی لکھی ہیں۔ عمران سے بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتی ہیں۔ لیکن عمران نے اپنی دوسری والدہ کو والدہ کے طور پر قبول نہیں کیا۔ اس لیے وہ اپنی دوسری والدہ اور والد کو پریشان کرنے کے لیے پڑھائی پر توجہ نہیں دیتا۔

میں نے عمران کو کلاس سے باہر بلایا اور اس سے تفصیلی گفتگو کی۔ وہ بہت سلجھا ہوا اور مؤدب بچہ تھا۔ کلاس میں بھی مجھے ایسا ہی لگتا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ میں نے تحریری طور پر تمہاری سب ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے اور اب میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔

اس نے کہا:۔ ”سر اب آپ کو کبھی شکایت نہیں آئے گی۔ “

میں نے کہا:۔ ”دیکھو تمہاری والدہ کے فوت ہونے میں کسی بھی انسان کا دخل نہیں ہے۔ تمہاری دوسری والدہ تمہاری خدمت کرنا چاہتی ہیں اور اس کے بدلے میں تم سے صرف پڑھائی پر توجہ چاہتی ہیں۔ اور دیکھو اس میں تمہارا اپنا ہی فائدہ ہے۔ اور اگر تم نے پڑھائی پر توجہ نہ دی اور آوارہ پھرتے رہے تو یاد رکھو تم اپنی والدہ اور والد سے نہیں اپنے آپ سے انتقام لو گے۔ انہیں تو صرف دکھ ہوگا مگر زندگی تمہاری برباد ہوگی۔ تم کسی اور کو نہیں اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہو“

عمران گردن جھکائے میری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے پھر کہا:۔

”سر آیندہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ملے گی“

میں نے کہا "چاقو اور سگریٹ کا پیکٹ مجھے دے دو"

"اس نے دونوں چیزیں مجھے دے دیں"

میں نے کہا "تم ایک شریف بچے ہو، یہ چیزیں تمہیں زیب نہیں دیتیں"

عمران نے مجھے یقین دلایا کہ آئندہ وہ اپنا رویہ تبدیل کرے گا"

میں نے ایک بار پھر اسے کہا: "عمران اب میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے اور میری نوکری بھی۔ خیال رکھنا" وہ رخصت ہونے لگا تو اس نے حسبِ معمول جھک کر مجھے سلام کیا۔ میں نے کہا: ۔"تم میرے ہی سیکٹر میں رہتے ہو میں تم سے ملوں گا"

وہ ہلکا سا مسکرایا اور چلا گیا۔

یہ کہانی ابھی اور آگے جاتی ہے۔ میں نے اس کے گھر کا ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر لے لیا تھا۔ ایک ہفتے تک میں نے کالج کے باہر اس کی سرگرمیوں کی نگرانی کی۔

کوئی ایک ماہ بعد اس کے والد صاحب کالج میں مجھے ملنے آئے۔ میرا شکریہ ادا کیا اور میرے بارے میں بہت سے اچھے کلمات ادا کیے۔ ایک استاد کے لیے یہ کلمات ہی اس کا انعام ہیں۔

انہوں نے کہا: ۔"حمیدی صاحب آپ نے میری بچے کی زندگی برباد ہونے سے بچالی۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں"

"اس ساری کارروائی میں جو کچھ میں نے کیا ظاہر ہے یہ میرے فرائض کا حصہ ہے۔ مجھے خوش اس بات کی ہوئی کہ عمران نے میری بات مان لی تھی۔" میں نے کہا تھا: ۔

"عمران یہ انتقام تم خود اپنے آپ سے لے رہے ہو اور کسی سے نہیں۔"

اکثر نوجوان چھوٹی عمر میں ان باتوں کو نہیں سمجھتے مگر میرا خیال ہے اگر انہیں سمجھایا جائے تو وہ سمجھ جاتے ہیں۔ آج کے نوجوان بے حد ذہین ہیں۔

☆☆☆☆

بنت الاسلام

مچھلی کی تقسیم

غریب لکڑہارا سارا دن جنگل میں لکڑیاں چیرا کرتا اور شام کو بڑا سا گٹھا باندھ کر بازار میں بیچنے لے جاتا ۔ اس سے جو پیسے ملتے، اُن سے آٹا، دال، نمک وغیرہ خرید لیا کرتا ۔

لکڑہارے کا ایک ہی بیٹا تھا، سلیم جو گاؤں کے سکول میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ کھانے پینے کی ضروری چیزوں کے علاوہ لکڑہارے کو اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے کاپی، پنسل، روشنائی وغیرہ بھی خریدنا پڑتی تھی ۔ کبھی کبھار تو سلیم کی ضروریات پوری کرنے کی وجہ سے لکڑہارے اور اُس کی بیوی کو فاقہ تک کی نوبت آ جاتی ۔

ایک دن کی بات ہے ۔ ظہر کا وقت تھا۔ لکڑہارے کی بیوی صحن کے ایک کونے میں کھانا پکا رہی تھی اور سلیم اپنے ہاتھ سے لگائی ہوئی کیاریوں کے پاس بیٹھا جغرافیہ کا سبق یاد کر رہا تھا کہ باہر سے کسی لڑکے نے آواز دی:

''بھائی سلیم!''

سلیم نے فوراً جواب دیا: ''جی ہاں، کون ہیں؟''

پکارنے والے نے کہا۔ ''ارے بھئی، ہم مچھلیاں پکڑنے جا رہے ہیں، آنا ہو تو جلدی چلو........!''

سلیم کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا کہ کیا جواب دے ۔ مچھلیاں پکڑنا اس کا خاص مشغلہ تھا، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ آج اُسے اپنا جغرافیہ کا سبق یاد کرنا تھا، کیوں کہ اگلے ہی دن اس مضمون کا امتحان تھا..... پھر اُس نے نفی میں جواب دے دیا۔

سلیم جغرافیہ کے مضمون میں کمزور تو نہ تھا، بس یونہی اس بات سے خائف تھا کہ فرض کرو فیل ہو گیا تو!..... وہ یقیناً اس بات کا گمان بھی نہ کر سکتا تھا کہ فیل ہو جانے کی صورت میں اس کا ابا کا کیا ہو گا جو پہلے ہی اس کے تعلیمی اخراجات کے بوجھ تلے دبے رہتے تھے ۔

پھر جب سلیم کے دوست نے اصرار کیا کہ وہ ضرور اس کے ساتھ جائے تو اس کی ماں نے بھی اُسے اجازت دے دی۔ ''چلے جاؤ بیٹے'' وہ ہنڈیا میں ڈوئی پھیرتی ہوئی بولیں صبح سے بیٹھے پڑھ رہے ہو۔ چلے جاؤ

گےتو ذرا تفریح ہو جائے گی۔ مگر دیکھو، آ جلدی جانا''!

سلیم نے کتاب بند کر کے رکھ دی اور باہر چل دیا۔ اس کے گھر سے نکلتے ہی اور لڑکے اُنھیں آ ملے اور سب دوست قہقہے لگاتے اور شور مچاتے ندی کی جانب چل دیے۔

شام ہونے سے پہلے پہلے سلیم اور اُس کے دوستوں نے بہت سی مچھلیاں پکڑ لیں۔ پھر وہ اُنھیں ایک جگہ پر جمع کر کے آپس میں بانٹنے لگے۔ چھوٹی مچھلیاں تو پوری پوری تعداد میں بانٹ لی گئیں مگر جب ایک بڑی سی مچھلی کی باری آئی تو سب لڑکوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ہر لڑکا یہ چاہتا تھا کہ بڑی مچھلی اُسے ملے۔ کیوں کہ اپنی اپنی جگہ سب کا دعویٰ یہی تھا کہ اُس نے سب سے زیادہ مچھلیاں پکڑی تھیں۔

جب لڑکے کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے تو سلیم نے ایک تجویز پیش کی۔ تجویز یہ تھی کہ مچھلی کے اُتنے ہی ٹکڑے کر لیے جائیں جتنے کہ لڑکے تھے، اور ہر لڑکا ایک ایک حصہ اُٹھا لے۔ گروہ کے نادار اور کمزور لڑکوں نے تو سلیم کی تجویز فوراً مان لی۔ مگر دو تین لڑکے جو عمر میں باقی لڑکوں سے بڑے تھے یا ''اونچے گھرانوں'' سے تعلق رکھتے تھے، اس تجویز پر سخت برہم ہوئے۔

''لو اور سنو''! بڑے چودھری صاحب کے لڑکے جمال نے کہا۔ حضرت کی تجویز بھی کیا خوب ہے، کہ مچھلی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں۔ اس کا فائدہ؟''

سلیم نے بات کاٹتے ہوئے کہا ''تو جمال صاحب، پھر یوں کیجیے، کوئی اپنے حصے کی چھوٹی مچھلیاں دے کر یہ مچھلی لے لے۔ اِس طرح جھگڑا ختم ہو جائے گا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' نمبردار صاحب کا بیٹا صادق بول اٹھا۔ ''چھوٹی مچھلیاں تو ہمارا پہلا حق ہیں۔''

سلیم پھر سوچ میں پڑ گیا۔ معاً اس کی آنکھیں کوشی سے چمک اُٹھیں۔ اُسے ایک ترکیب سوجھ گئی تھی۔ ایک نفیس ترکیب!

''تو پھر یوں کرو بھائی'' وہ خوشی سے بولا۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ بڑی مچھلی نہ لے۔ اسے ہم اپنی غریب ہمسائی مائی نوراں کو دے دیں گے۔ اِس بیچاری کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور جب سے اس کے خاوند کا انتقال ہوا ہے اس کا ایک بھی سہارا نہیں رہا.... جب وہ یہ مچھلی دیکھے گی، سوچو، کتنی خوش ہو گی اور ہمیں کتنی دُعائیں دے گی''؟

مگر جونہی سلیم نے دیکھا، جمال، صادق، اور نمبردار کا بھتیجا نور تینوں اس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہے

ہیں تو سلیم کے چہرے سے مسکراہٹ ایک دم غائب ہوگئی۔

پھر سلیم نے یہ سوچ کر کہ سب لڑکوں کے ذہن پر لالچ کا بھوت سوار ہے، اور وہ کسی طرح بھی ایک نتیجہ پر پہنچنے والے نہیں، اپنے حصے کی چھوٹی مچھلیاں اُٹھائیں اور بڑی مچھلی میں سے اپنے حصہ کی پروا نہ کرتے ہوئے گھر کو چل دیا۔

سلیم چلا تو دوسرے غریب بچوں نے بھی چلے جانے کا فیصلہ کر لیا، چناں چہ تھوڑی ہی دیر میں جمال، صادق اور انور کے علاوہ کوئی بھی وہاں نہ رہا۔ اب وہ تینوں آپس میں ہی جھگڑنے لگے۔

پہلے تو جمال اور انور میں ہلکی ہلکی تُو تُو میں میں ہوئی، پھر ''ناک پر مُکا مارنے''، ''گردن توڑ ڈالنے'' اور ''ہڈیاں پسلیاں الگ الگ کر دینے'' کی دھمکیاں دی گئیں۔ اِس کے بعد نوبت ہاتھا پائی تک آ پہنچی تو صادق بھی میدان میں آ گیا۔ ایک مچھلی کے باعث اس زور کی لڑائی ہوئی کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی!

اِدھر لڑائی جاری تھی کہ ایک مسافر گزرا اور تینوں لڑکوں کو جھگڑنے لڑنے میں مشغول دیکھ کر وہ مچھلی اٹھا کر چلتا بنا۔

اگلے دن سلیم کا امتحان ہوا، تو وہ اُس میں کامیاب ہوگیا۔ جمال، صادق اور انور کے متعلق پتہ چلا کہ وہ تینوں بُری طرح زخمی ہو جانے کے باعث امتحان میں بیٹھنے نہ آ سکے تھے۔

جس دن جمال نے سلیم کو ساتوں جماعت کے کمرہ میں قدم رکھتے ہوئے دیکھا، حسد سے جل ہی تو گیا۔ ''محض ایک مچھلی کی وجہ سے ہم اس گدھے سے پیچھے رہ گئے''! اُس نے کہا۔ اِس پر صادق بولا ''اور پھر وہ مچھلی بھی ہاتھ نہ آئی''! انور بھی تب ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا۔

☆☆☆☆

حفیظ ہوشیار پوری

مہمان کی عزت

ایک دفعہ گردوں کے ایک قبیلے کے لوگ ایران کے بادشاہ رضا شاہ پہلوی سے باغی ہو گئے جب بادشاہ نے یہ خبر سنی تو وہ اپنی موٹر کار میں سوار ہو کر بے دھڑک اس علاقے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں یہ لوگ رہتے تھے۔

اس قبیلے کا سردار شاہ کا سب سے بڑا دشمن تھا لیکن بادشاہ بالکل نہ گھبرایا اور مہمان بن کر سیدھا اس کے گھر پہنچا۔

مسلمان اپنے مہمان کی بہت عزت کرتے ہیں خواہ وہ اس کے دشمن ہی کیوں نہ ہوں گردوں کے سردار نے بھی ایسا ہی کیا اور بادشاہ کے سامنے اچھے اچھے کھانے لا کر چُن دیے، لیکن بادشاہ نے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا اور کہا میں باورچی ساتھ لایا ہوں اپنا کھانا اسی سے پکواؤں گا۔

گردوں پر اس بات کا بہت اثر ہوا اور شرم کے مارے ان سب کے سر جھک گئے رضا شاہ پہلوی ایک ہفتہ اس سردار کے خیمے میں مہمان رہا، جب وہاں سے واپس لوٹا تو بغاوت کا نشان تک باقی نہ تھا اور باغی گردوں کا سردار خود اسے تبریز تک چھوڑنے آیا۔

اگر رضا شاہ پہلوی اپنی تمام فوجیں بھی اس علاقے میں بھیج دیتا تو یہ لوگ بغاوت سے باز نہ آتے، لیکن اس نے بہادری اور عقل مندی کے ذریعے ایک معمولی سی بات سے اپنے دشمنوں پر فتح پائی۔

☆☆☆☆

حمید اختر

پیسے کمانے کی انوکھی ترکیب

میرا ایک نواسا ہے۔ وہ بہت ہوشیار ہے۔ اسے اپنے بڑوں سے پیسے اینٹھنے کا سلیقہ آتا ہے۔ وہ میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے۔ نانا آپ کی صحت اچھی نہیں ہے۔ آپ ہر روز سیر کے لیے کیوں نہیں جاتے اس سے آپ کو بہت فائدہ ہوگا۔ ہمیں آج ہی سے یہ شروع کر دینی چاہیے۔

اس کی عمر صرف چار سال ہے۔ لیکن اس کا رویہ اور طور طریقے بڑوں جیسے ہیں سیر کو جاتے ہوئے وہ عام طور پر مجھے کسی دکان میں لے جاتا ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ سال سے میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں اور اس کی پسند کی، چیزیں خرید کر دیتا ہوں۔

حال ہی میں میری مالی حالت پتلی ہو گئی۔ اب میں پہلے کی طرح اس کے مطالبات پورے نہیں کر سکتا میں ریٹائر ہو چکا ہوں۔ میری معمولی سی پینشن ہے۔ چیزوں کی قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ اب مجھ جیسے آدمیوں کے لیے زندگی مشکل ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے میں نے کل اپنے نواسے سے کہا، کہ تمہارے لیے کوئی چیز خریدنے کے لیئے اب میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ وہ پہلے کی طرح چیزیں مانگ رہا تھا۔ اس مرتبہ اس نے ایک کھلونا کار کا مطالبہ کیا۔ جو بہت مہنگی تھی۔ جب میں نے بتایا کہ میں اس کے لیے یہ نہیں خرید سکتا تو وہ پریشان ہوا۔ میرے واپس آتے ہوئے اس نے مجھے یہ ترغیب دینی شروع کی کہ مجھے کوئی کام کرنا چاہیے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ بے کار رہنا اچھا نہیں ہوتا۔ وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ اس نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ آپ کچھ کام کر کے پیسے کما سکتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا بوڑھے آدمیوں کو ملازمتیں نہیں ملتیں۔ ملازمتیں نوجوان اور صحت مند لوگوں کے لیے ہوتی ہیں۔ میری عمر کے لوگوں کو آرام کرنا چاہیے۔ اور زندگی کا لطف اٹھانا چاہیے۔ تو پھر آپ کے پاس پیسے کس طرح آ سکتے ہیں؟ میں نے کہا۔ مجھے نہیں معلوم، کیا تم کوئی راستہ تلاش کر سکتے ہو۔ وہ کچھ تجویز نہیں کر سکا لیکن خاموش رہ کر کچھ سوچنے لگا۔

ہم گھر پہنچ گئے۔ میں بہت تھکا ہوا تھا تھوڑا سا پڑھنے کے بعد میں سو گیا۔ وہ تھوڑی دیر بعد میرے کمرے

میں آیا۔ اور مجھے جگایا وہ میرا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ اور کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کیا بات ہے، میں نے اس سے پوچھا۔ نانا ابا ایک ترکیب سوچی ہے۔ وہ کیا ہے۔ میں نے پوچھا۔ اس نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔ نانا ابا آپ جنگل جا کر لکڑی کیوں نہیں کاٹتے، میں نے پوچھا۔ اس سے ہمیں کیا ملے گا، ہو سکتا ہے، وہاں آپ کو خزانہ مل جائے۔ اس طرح ہمارے پاس اتنے پیسے ہو جائیں گے۔ کہ آپ میرے لیے وہ کھلونا کار خرید سکیں۔ جو ہم نے کل شام دکان پر دیکھی تھی۔

☆☆☆☆

حنیف رامے

پریشانی کا علاج

کچھ دن سے جنگل کا بادشاہ بہت پریشان تھا۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں، قبر میں پاؤں ہیں۔ میرے بعد جنگل کا انتظام کون سنبھالے گا۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس کے یہاں اولاد نہ تھی، اسے تو اللہ نے ایک چھوڑ دو بیٹے دے رکھے تھے۔ سوال یہ تھا کہ دونوں میں سے کس کو بادشاہ بنایا جائے اور خدشہ یہ تھا کہ جسے بادشاہ نہ بنایا وہ ناراض یا بددل ہو کر جنگل میں فساد مچا دے گا۔

بڈھا شیر سوچ سوچ کر تھک گیا۔ آخر اس نے طے کیا کہ جنگل کے سمجھدار جانور سے مشورہ کرنا چاہیے۔ اس نے سفید گھوڑے کو بلوایا اور اسے حکم دیا کہ بھاگ کر جاؤ اور کالے ہاتھی، نیلے ریچھ، لنگڑے چیتے اور کانی لومڑی کو میرے پاس لے آؤ۔ سفید گھوڑا سرپٹ بھاگا اور جنگل کے چار کھونٹ سے انھیں ڈھونڈ کر بادشاہ کے پاس لے آیا۔ اس وقت بادشاہ کی تیمارداری کے لیے بہت سے جانور جمع تھے۔ لیکن بادشاہ نے تخلیے کی خواہش کی اور ان چاروں کو پاس بلا کر اپنے دل کی بات ان کے سامنے رکھی۔

چاروں سیانے جانور کچھ دیر سوچتے رہے، پھر کالے ہاتھی نے سر اُٹھایا اور کہنے لگا:

بادشاہ سلامت میں اس جنگل کا سب سے پرانا باسی ہوں۔ جب آپ کے والد صاحب فوت ہونے لگے تھے تو انھوں نے میرے ہی مشورے سے اپنے چار بیٹوں میں سے آپ کو ولی عہد چنا تھا۔ لیکن اس وقت میرے لیے بڑی آسانی تھی۔ آپ اپنے بھائیوں میں سب سے بہادر اور نیک تھے۔ دوسرے تینوں شہزادوں کی طبیعت میں بہت زیادہ شوخی اور شرارت تھی، انھیں جنگل کے جانوروں کو ستانے میں مزا آتا تھا، اس کے برعکس آپ ہماری حفاظت کرتے تھے۔

مگر جہاں تک آپ کے بچوں کا تعلق ہے تو وہ دونوں بہادر بھی ہیں اور نیک بھی۔ آپ نے ان کی تعلیم و تربیت پر بہت محنت کی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دونوں میں بے حد محبت ہے۔ دونوں ہمیشہ ایک ساتھ رہتے ہیں۔ دونوں مل جل کر جنگل کے جانوروں کی دیکھ بھال کرتے ہیں جسے بیمار دیکھتے ہیں اس کے علاج کی فکر کرتے ہیں جسے بے گھر دیکھتے ہیں، اس کے لیے سر چھپانے کی جگہ مہیا کرتے ہیں، کسی پر ظلم ہوتا

دیکھتے ہیں تو اس کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ کتنی ہی مرتبہ دونوں میرے گھر آ چکے ہیں کہ آپ ہمارے بزرگ ہیں، ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔ بہادر اتنے ہیں کہ دوسرے جنگل والوں کو ہماری جانب آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ کئی سال سے ہماری سرحدوں پر کوئی واردات نہیں ہوئی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم کس کے لیے کہیں کہ اسے ولی عہد بنایا جائے اور کس کے لیے کہیں کہ اسے محروم رکھا جائے۔ ہمیں دونوں عزیز ہیں اور دونوں ہمیں چاہتے ہیں۔

نیلے ریچھ، لنگڑے چیتے اور کانی لومڑی نے بیک زبان ہاتھی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ انھوں نے بھی دونوں شہزادوں کی تعریف کرتے ہوئے معذرت چاہی کہ وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ دونوں شہزادوں میں سے کون بہتر ہے۔

جب وہ رخصت ہوئے تو بادشاہ نے دل میں سوچا کہ یہ عجب مصیبت ہے، دونوں شہزادے نہ صرف ایک جیسے بہادر اور نیک ہیں بلکہ ہم عمر بھی ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بڑا ہوتا تو میں اسی کو ولی عہد بنا لیتا۔ یہ دونوں تو ایک ہی دن کی پیدائش ہیں۔ سفید گھوڑا جو پہرہ دے رہا اس نے بھی ساری باتیں سنی تھیں۔ بادشاہ کی پریشانی سے وہ پریشان ہو گیا۔

اگلے دن صبح صبح سفید گھوڑا بادشاہ کے حضور حاضر ہوا اور کہنے لگا:

جنابِ عالی مجھے خیال آیا ہے کہ کیوں نہ آپ خود شہزادوں سے مشورہ کر لیں اگر ان میں سے کوئی اپنی خوشی سے دوسرے کے حق میں دست بردار ہو جائے تو اُمید ہے کہ بعد میں کسی جھگڑے کی گنجائش نہ رہے گی۔

بادشاہ نے پیار سے کہا:

ہاں میرے براق تمھاری تجویز مجھے پسند آئی ہے، جاؤ شہزادوں سے کہو کہ باری باری مجھے آ کر مل جائیں۔

تھوڑی دیر میں دونوں شہزادے دربار میں آ پہنچے۔ سفید گھوڑے نے پہلے ایک شہزادے کو بھیجا۔

بادشاہ نے بیٹے سے کہا:

بیٹے تمھیں پتا ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور اب دنیا میں چند روز کا مہمان ہوں۔ سوچتا ہوں کہ میرے بعد جنگل کا انتظام کون سنبھالے گا۔

بات کرتے کرتے بادشاہ دَم لینے کو رُکا تو شہزادہ بول پڑا۔ ابا جان اوّل تو خدا سے دعا ہے کہ آپ ہمیشہ

سلامت رہیں، لیکن آخر سب کو اللہ کے پاس جانا ہے۔ پر آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟ بھائی جان، ماشاءاللہ نہایت سمجھدار اور بہادر شیر ہیں۔ وہ بڑی خوبی سے سارا کام سنبھال لیں گے۔ سارا جنگل ان سے محبت کرتا ہے اور ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ جنگل کے کسی چھوٹے سے چھوٹے جانور کو تکلیف ہوتی ہے تو وہ اسے اپنی تکلیف سمجھتے ہیں اور پھر میں بھی تو ہوں، انھیں مشورہ دوں، ان کا حکم مانوں گا۔ جس کام پر جہاں بھیجیں گے بہ سرو چشم جاؤں گا۔ آپ بھائی جان کو ولی عہد مقرر کر دیں، میری آپ سے یہی درخواست ہے۔

بادشاہ نے بیٹے کی باتیں سنیں تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے بیٹے کو تھپکی دی۔ اور محبت سے رخصت کیا۔ پھر دوسرے شہزادے کو طلب کیا۔

بادشاہ نے دوسرے شہزادے سے بھی وہی بات کی۔ اس پر شہزادے نے قریب قریب وہی جواب دیا جو اس کا بھائی دے چکا تھا۔ اس نے کہا: ۔

ابھی ابھی بھائی جان آپ سے مل کر گئے ہیں۔ وہ بہت خوش نظر آتے تھے۔ میری تو دلی خواہش رہی ہے کہ آپ انھیں ولی عہد مقرر کر دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ہمیشہ ان کا وفادار رہوں گا اور ان کے کسی حکم سے سرتابی نہ کروں گا۔

بادشاہ دل میں بہت خوش تھا کہ اس کے بچے ایک دوسرے کی قدر کرتے ہیں اور بادشاہت کا لالچ نہیں رکھتے، بلکہ ایک دوسرے کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ لیکن آخر اسے کسی نہ کسی طرح تو اس مسئلے کا حل ڈھونڈنا تھا۔ اس نے سوچا، چلو قرعہ ڈال کر فیصلہ کر لیں گے۔

اب کیا ہوا کہ رات کو بادشاہ جس درخت کے نیچے سوتا تھا اس صدیوں پرانے درخت پر ایک بے حد بوڑھا اُلو رہتا تھا۔ رات کو بادشاہ نے محسوس کیا کہ اُلو اس سے کچھ کہہ رہا ہے۔ بادشاہ نے غور سے سنا تو وہ کہہ رہا تھا:

میاں شیر: میں تمھیں کئی دن سے اُداس دیکھ رہا ہوں۔ میری بات سنو ہمارے جنگل سے کچھ فاصلے پر ایک ظالم شیر کی حکومت ہے۔ یہ شیر اپنے جنگل کے جانوروں کے لیے ایک عذاب بنا ہوا ہے۔ جانوروں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ان کی نظروں کے سامنے بے دردی سے چیرتا پھاڑتا ہے اور خواہ مخواہ شکار کرتا رہتا ہے۔ اس جنگل کے جانور اس تلاش میں ہیں کہ انھیں کہیں سے مدد ملے اور وہ اپنے بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دیں۔ شاید چند روز میں تمھارے یہاں ان کے نمائندے پہنچیں۔ تم اپنی سرحدوں پر پہرہ دینے والے جانوروں سے کہہ دو کہ وہ انھیں روکیں نہیں بلکہ سیدھا تمھارے پاس پہنچا دیں۔ تم اُنھیں تسلی دینا اور بتانا کہ کسی

روز تمھاری فوج ان کے جنگل میں داخل ہوگی تا کہ وہ بھی مناسب تیاری کر لیں۔ اس کے بعد اُس نے ایک اور بات بالکل بادشاہ کے کان میں کہی اور پھر چپ ہوگیا۔

بادشاہ نے صبح سویرے دونوں شہزادوں کو بلایا اور انھیں فوجی تیاری کا حکم دیا۔ دونوں بھائیوں نے تمام جنگ جو جانوروں کو جمع کیا اور اُنھیں اپنے دانت اور پنجے تیز کرنے کی ہدایت کی اور روزانہ پریڈ کا وقت بتایا۔ پھر کیا تھا، پورا جنگل جنگی نعروں سے گونجنے لگا۔

اگلے ہی روز سرحدی چوکیوں سے اطلاع ملی کہ چند اجنبی جانوروں کا ایک وفد بادشاہ سلامت سے ملنے کا خواہش مند ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ وفد کو فوراً اس کی خدمت میں پہنچا دیا جائے۔

اجنبی جانور دربار میں پہنچے تو بادشاہ نے بتایا کہ وہ ان کی آمد کے مقصد سے واقف ہے اور ان کی مدد کے لیے تیار ہے۔ حملے کی تاریخ طے کر کے باقی جانور تو واپس چلے گئے، بس ایک بارہ سنگھا رہ گیا تا کہ شہزادوں کو راستہ بتا سکے۔

مقررہ تاریخ سے ایک رات پہلے دونوں شہزادے باپ کی اجازت سے خدا کا نام لے کر اپنی فوج کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ راتوں رات منزلیں مار کر اگلے دن فوج دوسرے جنگل کے کنارے جا پہنچی۔ جب اس جنگل کے جانوروں نے دو نوجوان شیروں کی قیادت میں بڑھتی ہوئی ایک بہت بڑی فوج کو دیکھا تو خاص طریقے سے آہستہ آہستہ چیخنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کے جانور اُمڈ آئے اور پھر وہی جانور جو وفد کی صورت میں بادشاہ سے ملنے گئے تھے آگے بڑھے اور شہزادوں سے کہنے لگے ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ خدارا ہمیں ہمارے ظالم بادشاہ سے نجات دلائیے۔

یہ سن کر دونوں شہزادے اپنی پوری قوت سے دھاڑے اور ان کے پیچھے ان کے جنگ جو جانوروں کی فوج بھی دھاڑی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جنگل میں زلزلہ آ گیا ہے۔ اب آگے آگے شہزادے تھے اور ان کے پیچھے ان کی فوج اور اس کے پیچھے اس جنگل کے جانور۔

اتنے میں شہزادے کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے ایک ہیبت ناک شیر چلا آ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں سے غصے کے مارے گویا شعلے نکل رہے تھے۔ اچانک وہ زور سے دھاڑا گویا پوچھتا ہو کہ اس کی سلطنت میں گھسنے کی کسے جرأت ہوئی مگر جب اس نے غور سے دیکھا تو اس کے مقابل دو نوجوان شیر کھڑے تھے اور ان کے پیچھے درندوں کا ایک ہجوم صفیں باندھے چلا آ رہا تھا۔ شیر نے اپنے دائیں بائیں دیکھا تو اپنے آپ کو بے یار و مددگار پایا۔ اس نے پریشان سا ہو کر دو تین مرتبہ اپنے جنگلی جانوروں کو بلاوا دیا۔ لیکن اس کی دھاڑ کے جواب میں جو

آوازیں اُبھریں وہ شہزادوں کی فوج کے پیچھے سے اُٹھیں۔ شیر آخر بادشاہ تھا۔ سمجھ گیا کہ میرے جنگل والوں نے بغاوت کر دی ہے اور اپنی مدد کے لیے کسی دوسرے جنگل سے فوج بلوائی ہے۔ یہ سوچتے ہی وہ پلٹا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ مگر شہزادے اسے کہاں چھوڑتے تھے۔ کجا ایک بڈھا شیر، کجا دو جوان اور جیالے شیر۔ دونوں بھائی اس کے پیچھے یوں لپکے جیسے بجلی کوندتی ہے اور ایک لمحے میں اسے جا لیا۔ اب ایک کے پنجے اس کی پیٹھ میں گڑے تھے اور دوسرے کے جبڑوں میں اس کی گردن تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں نے اس ظالم کو تکا بوٹی کر کے رکھ دیا۔ ظلم سے نجات پانے والے جانوروں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وہ یوں ناچ رہے اور شور مچا رہے تھے جیسے ان کی عید ہو گئی ہو۔

اس وقت شہزادوں نے سفید گھوڑے کو فتح کی خوشخبری دے کر اپنے والد کے پاس بھیجا۔ یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی اور وہاں بھی خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ مگر بڈھے بادشاہ کو تو ابھی ایک کام کرنا تھا۔ اس نے جنگل کے تمام جانوروں کو رات کے کھانے کی دعوت دی اور جب سب کھا پی چکے تو اچانک انھیں بادشاہ کی آواز سنائی دی۔ وہ ایک اہم اعلان کر رہا تھا:۔

میرے پیارے جانورو!

”آج میں بہت خوش ہوں۔ آج مجھے میری ایک بہت بڑی پریشانی سے نجات مل گئی ہے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ میں بڈھا ہو گیا، میرے بعد تمھارا بادشاہ کون بنے گا؟ مجھے خدشہ تھا کہ میرے دونوں بیٹے کہیں بعد میں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے نہ رہیں۔ خیر یہ تو میرا وہم تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی تیار نہ ہوتا تھا کہ دوسرے کے مقابلے میں اسے بادشاہ بنایا جائے۔ آج خدا نے میری سن لی ہے۔ آج ہماری بہادر فوج نے ایک نیا جنگل فتح کر لیا ہے۔ اب ایک جنگل پر ایک شہزادہ اور دوسرے پر دوسرا حکمرانی کر سکتا ہے۔ تم بھی خوش ہونا!

تمام جنگل خوشی کے نعروں سے گونج اٹھا۔ سفید گھوڑا اسی وقت یہ خبر پہنچانے دوسرے جنگل کو ہو لیا۔

چند ہی دنوں میں بڈھا شیر اللہ کو پیارا ہو گیا اور اس کے دونوں نیک اور بہادر بیٹے دونوں جنگلوں پر انصاف کے ساتھ حکومت کرنے لگے۔ دونوں بھائیوں میں بے حد پیار تھا۔ دونوں ہر سال ایک دوسرے سے ملنے آتے اور اپنے ساتھ اپنے جنگل کی اچھی اچھی چیزیں تحفے کے طور پر لاتے اور کئی مہینے ساتھ ساتھ گزارتے۔ ایک بات اور وہ اپنے تمام معاملات باہمی مشورے سے طے کرتے اور جب بھی کوئی الجھن پیش آتی، بوڑھے اُلو سے درخواست کرتے کہ وہ ان کی رہنمائی کرے۔

خدیجہ مستور

بدلہ

یہ دوسری جنگ عظیم کی بات ہے اس وقت میں بھی ذرا بڑی قسم کی بچی تھی۔ مغرور اور اپنے آپ میں مگن رہنے والی۔ انھیں دنوں میں کان پور اپنے ایک چچا کے گھر جا رہی تھی۔ اس سفر کے لیے میں نے اپنا جیب خرچ جمع کیا تھا اور بڑے ٹھاٹ سے سیکنڈ کلاس میں سفر کر رہی تھی۔ اس کلاس میں میری ایک رشتے دار کے علاوہ سات آٹھ مسافر اور تھے مگر بڑا سکون اور آرام محسوس ہو رہا تھا۔ جی چاہتا کہ اوپر کی سیٹ پر خوب پھیل پھیل کر بیٹھوں، ہاں بھئی پیسے جو خرچ کیے تھے۔ ویسے تو ہمیشہ تھرڈ کلاس یا زیادہ انٹر کلاس میں سفر کرنا پڑتا۔

خیر بھئی، لیٹنے کا خیال چھوڑ کر میں کھڑکی سے لگی باہر دیکھتی رہی۔ ان دنوں لوگوں نے کسی قدر سفر کرنا شروع کر دیا تھا ورنہ جنگ کے کچھ دن پہلے تک یہ حال تھا کہ انٹر کلاس میں الو بولتا یا پھر اکا دکا مسافر ہوتا جو دن دہاڑے ٹھاٹ سے لیٹا خراٹے لیتا رہتا، پر ان دنوں تو جب گاڑی چھوٹے موٹے پلیٹ فارموں پر بھی کھڑی ہوتی تو جیسے بھگدڑ مچ جاتی۔ عورتیں گٹھڑیاں اور بچے اٹھائے پاگلوں کی طرح گاڑی پر جھپٹ پڑتیں۔ ان کے ساتھ کے آدمی ایسے ہونق لگتے کہ دیکھ کر قہقہے لگانے کو جی چاہتا۔

جب عورتیں سیکنڈ کلاس میں چڑھنے کی کوشش کرتیں تو سب سے پہلے میں دروازے کے پاس راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی۔ یہ سیکنڈ کلاس ہے، دکھائی نہیں دیتا؟ ادھر جاؤ تھرڈ کلاس میں۔

میری بات سنتے ہی وہ پھر منہ اٹھا کر بھاگنا شروع کر دیتیں۔ سیکنڈ کلاس کا نام سنتے ہی ان پر ایسا رعب طاری ہوتا کہ میرا جی خوش ہو جاتا اور بڑائی کا اتنا احساس ہوتا کہ بس کچھ نہ پوچھو۔

ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو ایک بُڑھیا اپنی گٹھڑی اٹھائے میری کلاس میں گھس آئی میں نے لاکھ روکا مگر اس نے نہ سنی۔

پھر کیا ہوا بیٹا! اللہ نے سب کو ایک جیسا بنایا ہے۔ میں اس کلاس میں بیٹھ جاؤں گی تو کون سی چھوت لگ جائے گی۔

اس نے اُلٹا مجھے سمجھانا شروع کر دیا۔ اور اپنی گٹھڑی غسل خانے کے دروازے کے پاس رکھ، مزے

سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

ارے مائی! ٹکٹ چیکر آ کر اتار دے گا، یہ سیکنڈ کلاس ہے ایک عورت نے نرمی سے کہا۔ مگر باقیوں نے دھیان بھی نہ دیا۔ بُڑھیا نے جواب دینے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔

ادھر گاڑی نے سیٹی دی اوررادھر میرا غصے سے بُرا حال ہوا میں نے تو اپنا جیب خرچ بچا بچا کر اپنی ان عزیز دار کے ساتھ سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ خریدا تھا اور بڑی بی صاحب کیا مزے میں، پیسے خرچ کیے بغیر سیکنڈ کلاس میں سفر کر رہی تھیں۔ وہ کم بخت کانٹے کی طرح میرے دل میں چبھنے لگی۔

اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو میں پوری گردن کھڑکی سے باہر نکال کر جھانکنے لگی کہ کہیں ٹکٹ چیکر نظر آ جائے تو بُڑھیا کو مزا چکھوا دوں۔ مگر جناب وہ کم بخت تو جیسے کہیں افیون کھا کر سو گیا تھا۔ ادھر بُڑھیا گاڑی کے جھٹکوں کے ساتھ ہل ہل کر آرام سے اوگھ رہی تھی۔

ادھر سرکو مجھے غسل خانے میں جانا ہے، میں نے رُعب سے کہا۔

وہ اپنی گٹھڑی ہٹا کر ایک طرف سرک گئی مگر جانے منہ ہی منہ کیا کہتی رہی۔ ایک بھی لفظ سمجھ میں نہ آیا۔

اس کے بعد تو مجھے ترکیب سوجھ گئی۔ بس ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد غسل خانے کی طرف منہ اٹھ جاتا۔ اور بڑھیا سرک سرک کر عاجز آ گئی۔

ایک بار جو میں اندر جانے لگی تو بُڑھیا نے جانے کیسی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

کیوں تنگ کرتی ہو بیٹا؟

ہم تو ادھر نیچے ایک کونے میں پڑے ہیں۔ یہ گاڑی تمھاری ہے نہ ہماری سب کو اتر جانا ہے۔

واہ ہمارے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔

میں اندر چلی گئی مگر جب باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھولا تو بڑھیا وہیں لیٹ کر سو گئی تھی۔ میں نے پہلے تو اسے جگانے کی کوشش کی، مگر جب نہ اٹھی تو اسے پھاند کر باہر آ گئی پھاندنے میں اس کا ایک ہاتھ میری چپل کے نیچے آ گیا۔

تم غریب ہوتیں تو پتہ چلتا اللہ کرے تم بھی ایک بار اسی طرح گاڑی میں سفر کرو۔ اس نے بڑی زخمی نظروں سے میری طرف دیکھا، میں جانے کیوں ڈر سی گئی۔

ہوش میں رہ بُڑھیا، ذرا سا لڑکی کا پاؤں لگ گیا تو باتیں بناتی ہے ایک تو اس نے بیٹھے رہنے دیا۔ اس پر

اتنا اونچا دماغ دکھاتی ہے۔ حد ہے بھئی میری عزیز دار زور سے غرائیں۔

نیکی کا زمانہ نہیں، ابھی ہاتھ پکڑ کر نیچے اتار دیں تو پتہ چلے۔ ایک **عورت** نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ غصہ تو مجھے بھی آ رہا تھا مگر کچھ کہا نہ گیا۔

بُوھیا نے کسی کو **جواب** نہ دیا ایسی مست ہو کے بیٹھی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اس کے بعد جو اسٹیشن آیا تو بُوھیا اتر گئی۔ ایک اسٹیشن کے بعد ہماری بھی منزل بھی آ گئی۔ چاچا جی اسٹیشن پر موجود تھے اور انٹر کلاس کے ہجوم میں مجھے تلاش کر رہے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے آوازیں دے دے کر انھیں اپنی طرف متوجہ کیا اور بڑے ٹھاٹ سے سیکنڈ کلاس سے اتر کر ان سے ملی۔

پاکستان بنا اور ہم لوگ بحری جہاز سے کراچی آ گئے۔ تین دن وہاں ٹھہرے اور پھر لاہور روانہ ہو گئے۔ نیا نیا پاکستان بنا تھا۔ بس یوں سمجھو کہ کسی چیز کا ٹھور نہ تھا۔ ہم لوگ بڑی مشکل سے جس ٹرین میں جگہ حاصل کر سکے ،اس میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اس پر مسافر بے لگام ہو رہے تھے۔ انھیں کوئی اصول یاد نہ تھا۔

ہم لوگ بڑی مشکل سے جب اپنے ڈبے میں پہنچے تو بیٹھنے کے لیے کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بڑی کوشش سے تھوڑی سی جگہ حاصل کی، وہاں !اماں کو بٹھا کر ہم سب بہنیں ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ غسل خانے کے قریب سامان کا انبار لگا ہوا تھا۔ جب میں تھک گئی تو ایک ٹرنک کھینچ کر وہیں غسل خانے کے پاس بیٹھ گئی۔ اس پر غضب یہ کہ رات کو جانے کیا گڑبڑ ہوئی جو ٹرین کی روشنی بھی غائب۔

رات غسل خانے میں جانے والوں کا تانتا بندھ گیا، مارے دھکوں کے میرا بُرا حال ہو گیا۔

ذرا آرام سے جائیے دھکے تو نہ ماریئے۔

واہ، پھر، ہوائی جہاز سے سفر کیا ہوتا بڑی **نازک** مزاج ہیں بے چاری۔

اور جب کوئی اس اندھیرے گھپ میں غسل خانے سے نکل رہا تھا تو میرا پاؤں اس کی چپل کے نیچے پچی ہو گیا۔ میں درد سے بلبلا اٹھی۔ فوراً مجھے وہ بُڑھیا یاد آ گئی۔

کئی سال گزرنے کے بعد اس بُڑھیا کی بد دعا نے پیچھا نہ چھوڑا تھا۔

☆☆☆☆

رحمٰن مذنب

دھان کے کھیت

پرانے وقتوں کی بات ہے۔ ایک بوڑھا کسان ملک جاپان میں رہتا تھا۔

اس کا نام ہاما گوچی تھا۔ ہاما گوچی کا گھر بڑا سادہ اور صاف ستھرا تھا۔ اس نے دیواروں پر طرح طرح کی رنگ برنگی تصویریں بنا رکھی تھی۔ چھت بھی گل بوٹوں سے سجائی تھی۔ جو بھی اس چھوٹے سے خوشنما گھر کو دیکھتا یہی چاہتا کہ یہ اسے مل جائے۔ پہاڑی کے دامن میں ہاماوچی کا گاؤں تھا۔ گاؤں والے جب اسے ملنے آتے تو اس کا گھر بڑے شوق سے دیکھتے اور جی کھول کر اس کی تعریف کرتے۔ کئی ایک نے اس کا گھر دیکھا تو اپنا گھر بھی سجا لیا۔

ہاما گوچی کے مکان میں ایک اور خوبی تھی۔ پہاڑی مکان تھا اس لیے خوا مخواہ خوبصورت لگتا تھا جب وہ کھڑکی میں آ کر کھڑا ہوتا تو اسے گاؤں بہت بھلا لگتا۔ دور سے ننھے ننھے گھروندے، ننھے ننھے گائے بیل اور ننھے آدمی بڑے انوکھے لگتے۔ وہ دیر تک انہیں دیکھتا رہتا۔

وہ بڑا اچھا طبیب تھا۔ اس کے خاندان میں بزرگوں کے بتائے ہوئے کتنے ہی صدری نسخے تھے۔ جب باپ دادا فوت ہوئے تو سارے صدری نسخے اسے مل گئے۔ ان نسخوں میں ہر بیماری کا علاج موجود تھا اور دور دور تک ہاما گوچی کے سوا کسی کے پاس ایسے تیر بہدف نسخے نہیں تھے۔ ہاما گوچی بہت ہی نیک دل تھا۔ اس کا جی نہ چاہا کہ ان نسخوں کو خلق خدا سے چھپائے رکھے۔ وہ ہر کسی کو یہ نسخے بتا دیتا۔ دوائیں تیار کرتا اور غریبوں کو مفت دیتا۔ اس کا مقولہ تھا کہ خدا نے انسان کو نیکی کے لیے پیدا کیا ہے۔ سب سے اچھا وہ آدمی ہے جو دوسروں کے دکھ درد کم کرے، دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ دنیا اچھوں کے لیے اچھی اور بروں کے لیے بری ہے۔ خدا کو وہی لوگ عزیز تھے جو فساد کی جڑ کاٹتے اور نیکی کرتے۔

ہاما گوچی ہر وقت مصروف رہتا۔ پہاڑی پر دنیا جہان کی جڑی بوٹیاں تھیں۔ وہ ان سے دوائیں تیار کرتا اور جو چیز یہاں سے دستیاب نہ ہوتی آدمی بھیج کر شہر سے منگوا لیتا۔ اس کا کتنا ہی روپیہ دواؤں پر اٹھ جاتا۔ لوگ دور دور سے آتے اور اس سے دوائیں لے جاتے۔ اس طرح وہ بہت مشہور ہو گیا اور اس کے نام لیوا دور دور

تک پھیل گئے۔

لوگ پھل مٹھائی اور پکوان لے کر آتے نقدی بھی پیش کرتے۔ لیکن وہ کوئی چیز اپنے پاس نہ رکھتا۔ آنے جانے والوں میں بانٹ دیتا۔

وہ بڑا خوشحال تھا۔ پہاڑی کے ایک طرف تھوڑی سی صاف اور ہموار زمین تھی۔ وہ اس میں دھان بو لیتا کچھ دور بڑے بڑے چشمے تھے۔ اس نے دن رات ایک کر کے چشمے سے کھیتوں تک نالی بنائی۔ یوں اسے کھیتوں کے لیے جی بھر کے پانی مل جاتا۔ فصل بہت اچھی ہوتی۔ پھر چشموں کے میٹھے پانی کی وجہ سے چاولوں میں بڑی لذت آ جاتی۔

دھان کی فصل پر اس کا اچھی طرح گزارہ ہو جاتا۔ مردِ قانع تھا، لالچ نہ کرتا، سال بھر خود بھی کھاتا اور دوسروں کو بھی کھلاتا۔ کئی لوگ تو صرف چاول ہی کھانے آتے۔ اتنے لذیز اور میٹھے چاول انہیں کہیں نہ ملتے۔ اس نے کبھی چاول بیچے تو نہیں البتہ ان کے عوض وہ کپڑا لتا اور گھر کی دوسری چیزیں ضرور لے لیتا۔ اس کی ضرورتیں ہی ایسی کون سی تھیں۔ دو جوڑے کپڑے اسے سال بھر کے لیے کافی تھے۔ چار برتن بہت تھے۔ ایندھن کی کمی نہ تھی۔ ایک دن جنگل میں سے جا کر لکڑیاں کاٹ لایا تو مہینہ بھر چولہا تپتا رہتا۔

جب وہ ابھی گاؤں میں رہتا تھا اور پہاڑی پر نہ آیا تھا تو اس نے ایک بھلی عورت سے بیاہ بھی کیا تھا۔ ان کے یہاں ایک لڑکا بھی ہوا تھا۔ لیکن اس کی قسمت کہ بیوی زیادہ دن نہ جی سکی۔ لڑکے کی پیدائش کے بعد بے چاری کو ہوا لگ گئی اور وہ سخت بیمار ہو گئی۔ ہاما گوچی نے بہت علاج کیا۔ ایک ایک خاندانی نسخہ برتا لیکن موت کا کون علاج کرے، یہ لاعلاج مرض ہے۔ بے چاری مر گئی۔ ہاما گوچی کے بچے کو ایک بیوہ نے پال لیا، وہی اسے دودھ پلاتی، وہی اس کی دیکھ بھال کرتی۔

لڑکا پل گیا اور باپ کے نقش قدم پر چلنے لگا۔ جیسا باپ ویسا بیٹا لیکن بالکل ویسا نہ تھا۔ باپ تو بالکل درویش تھا، نام کو لالچ نہ تھا اس میں۔ خود بھوکا رہ کر بھی دوسروں کو کھانا کھلاتا، خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کی تکلیف دور کرتا لیکن اس کا لڑکا کچھ کچھ لالچی تھا۔ وہ باپ کو اندھادھند سخاوت کرتے دیکھتا تو کبھی کبھی ٹوک دیتا۔

ایک دن کی بات ہے کہ ہاما گوچی نے دو مٹھی چاول بھونے اور چائے بنائی۔ باپ بیٹا چاول کھانے اور چائے پینے ہی کو تھے، کہیں سے کوئی فقیر نکل آیا۔ اس نے آتے ہی کھانے کا سوال کیا۔ ہاما گوچی نے عادت

کے مطابق مٹھی بھر چاول اور چائے کا پیالہ اس کے حوالے کر دیا۔ جب لڑکے نے یہ دیکھا تو وہ سب کچھ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور کچھ کھائے پیئے بغیر گھر سے باہر چلا گیا۔ اس روز وہ دن بھر گھر سے باہر ہی رہا۔ شام کو جب لوٹا تو ہاما گوچی بولا:

"بیٹا یامو! صبح جب وہ بھلا آدمی آیا اور میں نے اسے مٹھی بھر چاول دیے اور چائے کا پیالہ تھمایا تو تم اٹھ کر کیوں چلے گئے؟"

یامو بولا:

"باپو! تم نے تو غضب ہی کر دیا۔ کُل دو مٹھی چاول تھے اور دو پیالے چائے تھی۔ مشکل سے ہمارا ہی گزارا ہوتا تھا اس میں۔ گھر میں اور کیا دھرا تھا کھانے پینے کو جو تم نے یوں پیٹ کاٹ کر پردیسی کا پیٹ بھرا؟"

"اُسے بھوک جو لگی تھی یامو!" ہاما گوچی بولا۔

یامو نے جھلا کر کہا:

"اُسے بھوک لگی تھی تو ہمیں کیا؟ ہماری تو اپنی جان نکل رہی تھی۔"

"شاید ہماری طرح اس کی بھی جان نکل رہی تھی تم نے اسے اچھی طرح نہیں دیکھا۔ کس قدر رنڈھال ہو رہا تھا۔ اس سے تو چلا بھی نہ جاتا تھا۔ ہاما گوچی نے کہا۔

"تو اس میں ہمارا تو کچھ قصور نہ تھا۔"

"ہاں، ہمارا تو کچھ قصور نہ تھا لیکن اس کا بھی قصور نہ تھا۔ وہ کتنا بوڑھا اور ضعیف تھا۔ کما بھی نہیں سکتا تھا۔ دوسروں کے سہارے جیتا اور دوسروں کے ٹکڑوں پہ پلتا۔"

"ہم تو کسی کے سہارے نہیں پلتے باپو۔"

"خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے یامو کہ ہم کسی کے سہارے نہیں پلتے لیکن ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ محتاجوں اور مسکینوں کی مدد کریں۔ ابھی ابھی تم کہہ رہے تھے کہ تمھاری جان نکل رہی تھی لیکن یہ سوچو کہ اس بھوکے ضعیف آدمی کو کھانے کو کچھ نہ ملتا تو اس پر کیا گزرتی اس کی جان نہ نکل جاتی؟"

"باپو! آپ تو خواہ مخواہ دوسروں کا خیال کرتے ہیں۔ اپنا بھی تو خیال کرنا چاہیے۔"

"بیٹا یامو! ہم اپنا خیال تو روز کرتے ہیں کس دن ہمیں روٹی نہیں ملی اور کس دن ہم نے فاقہ کیا ہے؟ ہمیں تو روز روٹی ملتی ہے۔ پھر کبھی کبھی دوسروں کا خیال کر لیں تو اچھا ہی ہے۔"

"باپو! آپ کو کون سمجھائے؟ آپ تو کسی کی مانتے ہی نہیں۔ بس اپنی بات پر ہی قائم رہتے ہیں۔"

دیر تک یاموا اپنے نیک دل باپ سے الجھتا رہا، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ عادت بدل جائے تو بدل جائے سرشت کب بدلی ہے؟ ہاما گوچی کا مزاج کچھ اور تھا، یاموکا کچھ اور، اگرچہ یاموبرا لڑکا نہیں تھا۔ باپ کی ہر بات مانتا۔ ہر کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا۔ دھان کے کھیتوں میں جا کر دن رات کام کرتا۔ لکڑیاں کاٹ کر لاتا لیکن بس یہی ایک نقص تھا اس میں کہ ذرا لالچی تھا۔ یوں تو جب گھر میں کسی چیز کی ریل پیل ہوتی اور ہاما گوچی جی کھول کر فیاضی کرتا تو یامو چپ رہتا لیکن جب اپنی ہی ضرورت پوری نہ ہوتی اور ہاما گوچی سخاوت کرنے پر تل جاتا تو یاموکو باپ کی حرکت اچھی نہ لگتی۔

ہاما گوچی کے گھر میں بڑی برکت تھی۔ کبھی کسی چیز کیبھو کہیں آئی۔ اگر ایک آدھ بار بھوک آ بھی جاتی تو باپ بیٹے میں بہت بدمزگی پیدا ہو جاتی ورنہ کچھ نہ ہوتا۔

وہ پہاڑی جو شروع شروع میں بے رونق لگتی اور جہاں کوئی بھولا بسرا ہی آتا! ورنہ لوگوں کی زیادہ آمدورفت نہیں تھی۔ اب وہاں لوگ آتے ہی رہتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہاما گوچی نے پہاڑی میں جان ڈال دی۔ اسے لوگوں کی خدمت میں بڑا مزا آتا لیکن وہ سمجھتا تھا کہ اس نے آدمیوں کی کوئی خاص خدمت نہیں کی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ تن، من، دھن سب کچھ لٹا کر لوگوں کی خدمت کرے، اور پھر اسے زندگی کی سب سے بڑی خوشی حاصل ہو۔ وہ اپنا سب کچھ لٹانے کے لیے موقعے کی تلاش میں تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ اپنا سب کچھ کب لٹائے اور کیسے لٹائے؟

گیارہ مہینے اچھی طرح گزر جاتے۔ ایک مہینہ سختی کا آتا۔ اچانک پہاڑی کی دوسری جانب دریا میں طغیانی آتی اور گاؤں اس کی لپیٹ میں آ جاتا کھیتوں میں پانی بہنے لگتا اس سے فصلوں کو نقصان پہنچتا۔ پانی زیادہ زور پکڑتا تو گاؤں میں بھی آ جاتا۔ مکان ڈھے جاتے اور بھٹکتی ہوئی بھیڑ بکریاں بہہ جاتیں۔ مصیبت تو یہ تھی کہ دریا کے چڑھاؤ کی خبر نہ ہوتی۔ دریا پہاڑی کی پشت پر تھا اور گاؤں والوں کو نظر نہ آتا۔ البتہ ہاما گوچی اور یامو کو دریا خوب نظر آتا دن کو دریا میں پانی چڑھتا تو وہ یامو کو روانہ کر دیتا۔ یامو پہاڑی کے اونچے نیچے راستوں کو بڑی تیزی سے عبور کر کے گاؤں پہنچتا اور لوگوں کو خطرے سے آگاہ کر دیتا۔ لوگ اطلاع ملتے ہی مال مویشی سنبھال لیتے اور اپنی جان بچانے کی تدبیر کرتے۔ زیادہ خطرہ ہوتا تو گاؤں خالی کر دیتے اور جانوروں پر سامان لاد کر پہاڑی پر چلے آتے۔ جب تک سیلاب رہتا یہیں رہتے۔ مصیبت ٹل جاتی تو واپس چلے جاتے۔

ایک لحاظ سے ہاما گوچی گاؤں کا رکھوالا تھا۔ اس کے بھروسے گاؤں والے چین سے رہتے۔

سال کے سال جب دھان کے کھیت پک کر تیار ہو جاتے اور کٹائی کا وقت آ جاتا تو گاؤں والے خوشیاں مناتے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ گاؤں والوں کی فصلیں بہت ہی عمدہ ہوئیں۔ دھان کے کھیت اتنے بھرپور ہوئے کہ کبھی نہ ہوئے تھے۔ ایک ایک ٹکڑے میں چار چار گنا دانے اگے۔ انہیں دیکھ کر گاؤں والوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

کٹائی سے کچھ دن پہلے ایک سہ پہر کو مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے میدان میں جمع ہوئے۔

یامو کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ گاؤں والوں کو ہنستے کھیلتے دیکھ کر اس نے باپ کی طرف دیکھا جو پتھر کے صاف ستھرے فرش پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

یامو بولا:

''باپو! آج گاؤں والے کتنے خوش ہیں۔''

ہاما گوچی نے چائے کا سڑپا لگا کر کہا، ''یامو! وقت بے فکری سے گزرے، بجلی گرے نہ اولے پڑیں، کوئی آفت نہ آئے اور فصل بہت اچھی ہو تو لوگ کیوں نہ خوش ہوں؟ کیوں خوشیاں نہ منائیں؟''

''باپو! آج تو گاؤں والے اتنے خوش ہیں کہ پہلے کبھی نہیں ہوئے۔''

''اب کے فصل جو اتنی اچھی ہوئی ہے۔ خود ہمارے کھیت دھان سے لدے پھندے ہیں۔ ہر سال ایسی فصل کہاں ہوتی ہے؟''

یامو کھڑکی میں کھڑا گاؤں والوں کو دیکھتا۔ دور سے یوں لگ رہا تھا جیسے کھلونے کھیل کود رہے ہوں۔ آدمی، جانور بہت چھوٹے ہو کر رہ گئے تھے۔ پرانی داستانوں میں جن انگلی انگلی بھر بونوں کا تذکرہ ملتا وہ آج اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ باپ کی طرف دیکھ کر بولا:

''باپو! اس کھڑکی میں آ جاؤ۔ بونوں کے کھیل تماشے دیکھو!''

ہاما گوچی کو کھیل تماشے سے زیادہ اس وقت چائے اچھی لگ رہی تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے بولا:

''بس بیٹا! تم ہی دیکھو! میں نے ان بونوں کے کھیل تماشے کئی بار دیکھے ہیں۔ بلکہ میں تو ان میں رہ چکا ہوں اور ان کے ساتھ مل کر خود بھی کھیل تماشے کیے ہیں۔''

یامو پھر بولا:

”باپو! آج تو میرا جی مچلنے لگا ہے۔ جی چاہتا ہے گاؤں میں جا رہوں۔ ہم یہاں پہاڑی پر سب سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ کوئی پڑوسی ہے نہ ساتھی اپنے آپ لوگ آ جاتے ہیں اور سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے گھر لوٹ جاتے ہیں۔“

”یامو بیٹا! تم نہیں مانتے“۔ ہاما گوچی نے چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا:

”یہ بڑی اچھی جگہ ہے۔ کسی سے ہماری دوستی ہے نہ کسی سے ہم دشمنی مول لیتے ہیں۔ پھر یہ کہ ہر وقت خدا یاد آتا ہے۔ یہ جگہ خدا کی عبادت کے لیے بہت موزوں ہے۔“

ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ ساری پہاڑی پر لرزہ طاری ہو گیا۔ دیواریں بری طرح ہلنے لگیں جیسے انہیں کوئی جڑ بنیاد سے اکھاڑنے لگا ہو۔

یامو چلا کر بولا:

”باپو! گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی ہے۔ لڑکے! بالے لٹولیاں چھوڑ چھاڑ کر ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ ان کے ماں باپ انہیں پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ توبہ! کس بلا کا شور ہے۔“

ہاما گوچی نے کہا: ”یہ جاپان ہے۔ یہاں ایکا ایکی قیامت آتی ہے اور بیٹھے بٹھائے خوشی غم میں بدل جاتی ہے۔ تم نے دیکھا۔ ابھی ابھی لوگ ناچ کود رہے تھے اب سب کچھ بھول گئے۔ خدا نے جاپان بھی کیسا بنایا ہے؟“

یامو چلایا اور بد حواس ہو کر بولا:

”باپو! وہ ادھر پہاڑی سے نیچے زمین میں سخت دراڑ پڑ گئی ہے۔ اُفوہ! وہ گھنا پیڑ بھی اکھڑ کر گر پڑا۔“

ہاما گوچی پریشان تو ضرور ہوا لیکن اس نے آگے کے گرم سرد دیکھ رکھے تھے اس لیے اس نے دل پر قابو رکھا جب بھی کوئی مصیبت نازل ہوتی، وہ حوصلہ اور حواس رکھتا۔ پھر بھی اس نے جی کڑا کر کے کہا: ”مجھے آج کچھ نظر نہیں آ رہا۔ مکان تو مکان ساری دنیا ہل رہی ہے۔ ادھر پیڑوں کے جھنڈوں میں سخت ہلچل ہے۔ پیڑ پر پیڑ ٹوٹ رہے ہیں اور ایک دوسرے پر گر رہے ہیں۔“

بھونچال چلا گیا تو ہاما گوچی اور یامو گھر سے باہر نکل گئے۔ چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کتنے ہی تناور پیڑ گرے تھے اور کئی چٹانیں اکھڑ گئی تھیں۔ بڑا ہی زبردست بھونچال آیا تھا۔ وہ پہاڑی پر چلتے رہے اور بھونچال

کی تباہی کا نقشہ دیکھتے رہے۔ پہاڑی کے دوسرے سرے پر جا کر سامنے کے فلک بوس پہاڑوں کو دیکھنے لگے۔ ان پر پیڑوں کے جھنڈ تھے، سبزہ تھا اوران میں سے سفید لکیر کھنچتی چلی آئی تھی۔ یہ وہی ندی تھی جو دور سے اتنی مہین نظر آتی تھی اور گاؤں کے پاس سے گزر کر جاتی۔ ہاما گوچی کی نظر عقاب کی نظروں سے کم تیز نہیں تھی۔ عام طور پر یہ ندی ایک ہی انداز اور رفتار سے چلتی لیکن آج اس میں غیر معمولی شوخی آ گئی تھی۔ مہین لکیر بہت موٹی ہو گئی تھی اور وہ کچھ زیادہ اچھلتی کودتی چٹانوں پر سے گرتی چلی آ رہی تھی۔ ندی میں ہلچل مچی تھی۔ ندی کی موٹی لکیر کے طوفانی رویے نے اسے سخت پریشان کیا۔ پھر وہاں گھنے بادل چھائے تھے۔ ضرور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اوراسی لیے ندی کی لکیر اتنی موٹی ہو گئی تھی۔

وہ سمجھ گیا کہ ندی تباہی لائے گی۔ اس میں سیلاب آ رہا تھا۔ مصیبت تو یہ تھی کہ گاؤں والوں کو سیلاب کی خبر نہ تھی۔ انہیں تو اسی وقت سیلاب کا پتہ چلتا جب ندی کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی گاؤں میں داخل ہو جاتا اور وہ سب کچھ چھوڑ کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے۔ ندی پہاڑی کی پچھلی سمت سے آتی اور ہاما گوچی کے سوا کسی کو اس کا پتہ نہ چلتا۔

موت سر پر سوار تھی لیکن سوال یہ تھا کہ گنواروں کو آنے والے طوفان کی خبر کون دے۔

سیلاب پہاڑ سے نکل کر گھاٹیوں میں سے ہوتا ہوا تیزی سے ادھر آ رہا تھا۔ وقت کم تھا۔ یاموکو بھیجا نہیں جا سکتا تھا۔ جتنی دیر میں یامو گاؤں پہنچتا۔ اتنی دیر میں سیلاب گاؤں میں آ جاتا۔

دن ڈھل رہا تھا، شام پڑنے میں ابھی وقت تھا۔ رات پڑ گئی تو اندھیرے میں وہ اپنے آپ کو سنبھال سکیں گے اور نہ مال مویشی بچا سکیں گے۔ گھبراہٹ میں کوئی بات ان کی سمجھ میں نہ آئے گی۔ وہ کچھ بھی نہ کر پائیں گے۔

وہ لپک کر گھر آیا اوراس نے چلا کر کہا:

’’پانچ سو انسانوں کو یونہی موت کے منہ میں نہیں دھکیلا جا سکتا۔ کچھ بھی ہو انہیں بچانا ضروری ہے یہ ہمارے پڑوسی ہیں، ہمارے بھائی ہیں، ہمارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔‘‘

’’کیا ہوا ہے باپو؟‘‘ یامو نے گھبرا کر پوچھا۔

’’ندی میں سیلاب آ رہا ہے۔‘‘ ہاما گوچی نے کہا۔

’’لیکن گاؤں والوں کو کیسے خبر دی جائے۔ نیچے جانا بہت مشکل ہو رہا ہے۔ جگہ جگہ پیڑ گرے پڑے ہیں

ایک جگہ شگاف بھی آ گیا ہے پہاڑی پر۔“

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔“

ہاما گوچی چاہتا تھا کہ جو کچھ کرنا ہو شام سے پہلے پہلے جھٹ پٹ کر لیا جائے کیونکہ اندھیرا ہوا تو ہم کیا کریں گے تباہی مچے گی اور یہ رات گنواروں کی آخری رات ہو گی۔

ایک بات اس کی سمجھ میں آئی۔ اس نے یامو سے کہا کہ نیچے جا کر شگاف پر کھڑا ہو جائے۔ وہ کسی طرح گاؤں والوں کو اوپر بلا لے گا۔ جب شگاف کے پاس آئیں تو جو گھبرو جوان ہوں، ان سے کہے کہ ٹوٹے ہوئے پیڑ شگاف کے اوپر دیں اور بھونڈا سا پل بنا لیں۔ لوگ سی پر سے پہاڑی پر آ جائیں۔ سب سے پہلے اپنی جان بچائیں۔ پھر جتنا سامان آسانی سے لا سکیں لے آئیں۔ مال مویشی بھی لے آئیں۔

یامو کو رخصت کر کے ہاما گوچی کھیتوں میں آیا۔ دھان کی بالیں سوکھ رہی تھیں چار دن میں کٹائی ہونے کو تھی کہ نئی مصیبت پڑی۔

ہاما گوچی کو آج کے دن کا انتظار تھا اس نے چقماق پتھر کے دو ٹکڑے لیے اور انہیں آپس میں زور سے رگڑا۔ چنگاریاں اچٹ اچٹ کر بالیوں پر گرنے لگیں۔ دیکھتے دیکھتے آگ کے شعلے بلند ہوئے اور دھان کے کھیت جلنے لگے۔

یامو نے چلا کر کہا:

”باپو! کھیتوں کو آگ نہ لگاؤ ہم تباہ ہو جائیں گے۔ باپو! کھیت جل گئے۔

”بیٹا! تم نہیں سمجھتے، یہ موت اور زندگی کا سوال ہے۔ نیکی کرنا آسان نہیں۔“

اس پر یامو نے پھر چلا کر کہا:

”باپو ایسی نیکی کس کام کی جس سے اپنی جان پر بن جائے۔ باپو کھیت نہ جلاؤ۔“

”یہ کھیت جلنے ہی کے لیے تھے۔“

”یہ ظلم ہے باپو! اپنی جان کا نہیں تو میری ہی جان کا خیال کرو! ہم کیا کھائیں گے؟“

”نیکی کھائیں گے۔“

یامو نے جب یہ جواب سنا تو سر پیٹ کر رہ گیا وہ کر ہی کیا سکتا تھا؟ جانتا تھا کہ اس کا باپ دھن کا پکا ہے۔ دوسروں کے لیے تو وہ جان بھی قربان کر دے گا۔ اسے سمجھانا بے کار تھا۔ اس نے عمر بھر کچھ نہیں کیا بس

درویشوں کی سی زندگی بسر کی۔

ادھر آگ کے شعلے بلند ہوئے اور ادھر گاؤں کے لوگ گھروں سے نکلنے لگے۔ گویا آگ کا مطلب، بھونچال کی خبر ہے۔ ہر ایک نے جھٹ پٹ بوریا بستر اور جانوروں پر سامان لادا اور پہاڑی کی جانب آ گئے۔ ہر ایک نے صرف ضروری سامان لیا۔ ویسے بھی غریبوں کی بستی تھی سب کے پاس تھوڑا سامان تھا۔ انھوں نے اس میں کچھ چیزیں گھروں میں ہی رہنے دیں البتہ کوئی ضروری چیز نہ چھوڑی۔

لوگ گھروں سے نکل کر کچھ دور ہی گئے تھے کہ کھیتوں میں پانی آنے لگا۔ انہیں بھلے وقت پتہ لگ گیا۔ ذرا اور دیر لگتی تو سب کچھ دھرا کا دھرا رہ جاتا اور انہیں خالی ہاتھوں گھر سے نکلنا پڑتا۔

جس وقت لوگ پہاڑی کے اوپر چڑھ آئے اور شگاف تک آ پہنچے تو پورا گاؤں زیر آب آ گیا۔ گلیوں میں نالے بہنے لگے اور پانی گھروں میں بھی گھس آیا۔ اتنے میں دھان کے کھیت جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ ان میں دھواں اٹھ رہا تھا۔ سب لوگوں کو ہاما گوچی کے کھیتوں کا صدمہ تھا۔ ہر ایک ہاما گوچی کی تعریف کر رہا تھا اور اسے دعائیں دے رہا تھا۔

لوگ ابھی شگاف کی دوسری طرف آنے کی تدبیریں ہی کر رہے تھے کہ ہاما گوچی ایک لمبا اور موٹا سا رسا لے آیا۔ سب لوگوں نے اسے دیکھتے ہی سلاموں کی بوچھاڑ کر دی۔ جب یا مو نے دیکھا کہ لوگ ہاما گوچی کے کس قدر شکر گزار ہیں اور اسے کتنا اچھا سمجھتے ہیں تو اس کا سارا غصہ جاتا رہا۔

ہاما گوچی نے مسکرا مسکرا کر سب کے سلاموں کا جواب دیا اور جب لوگ خاموش ہوئے تو اس نے رسا دہرا کیا اور پھر ایک سرا دوسری طرف پھینک دیا اور ایک سرا خود پکڑ لیا۔ یا مو کو بھی ساتھ ملا لیا۔ پھر ایک ایک کر کے چار پانچ آدمی رسے سے لٹک لٹک کر شگاف کے پار آ گئے۔

ہاما گوچی کے کہنے پر سب لوگ کلہاڑے لے کر اس کے مکان پر پہنچے اور انھوں نے لکڑی سے بنا ہوا مکان جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ زمین پر مضبوط مضبوط تختوں اور شہتیروں کا ڈھیر لگ گیا۔ سب لوگ تختے اور شہتیر اٹھا اٹھا کر شگاف کے پاس لے گئے انھوں نے شگاف پر تختے اور شہتیر ڈال دیے اور ایک پل بن گیا۔ اب مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سبھی پل پر سے گزرنے لگے۔ لوگ باگ اپنے جانور اور سامان بھی حفاظت سے لے آئے۔

جب یہ لوگ بخیر و عافیت آ گئے تو ہاما گوچی کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اس کی بہت بڑی آرزو پوری ہوئی۔

کتنی ہی بار اس کا جی چاہے کہ وہ اپنا سب کچھ لٹا دے اور لوگوں کے کام آئے لیکن اس کا موقع نہیں ملا۔ آج ہی موقع ملا اور اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ دھان کے کھیت رہے نہ مکان رہا لیکن وہ پھر بھی بہت مطمئن تھا۔ اسے اپنے نقصان کا ذرا افسوس نہ تھا۔

پہاڑی پر ایک گاؤں آباد ہو گیا۔ لوگ ادھر ادھر بکھر گئے۔ انھوں نے اپنے لیے معمولی معمولی جھونپڑے بنا لیے لیکن ہاما گوچی کے لیے انھوں نے ایک شاندار مکان تعمیر کیا۔ یہ مکان پہلے مکان سے زیادہ بڑا اور زیادہ خوشنما تھا۔ ایک طرف انھوں نے گائے کا تھان بھی بنا دیا اور سب سے اچھی گائے وہاں باندھ دی۔ اول اول تو ہاما گوچی نے کوئی شے قبول نہ کی لیکن جب انھوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا تو اس نے مناسب نہ سمجھا کہ ان کی دل شکنی کرے۔

لوگوں نے شگاف بھی پُر کر دیا۔ اس میں پھل دار پیڑوں کے پودے لگا دیے۔

سیلاب چلا گیا تو کچھ لوگ وہیں رہ گئے واپس چلے گئے۔ ہاما گوچی کی نیکی کا بدلہ تو ادا نہ کیا لیکن لوگوں نے آپس میں تھوڑے اکٹھے کر کے زبردستی اس کی کوٹھی بھر دی۔ ہامو نے بہت منع کیا لیکن انھوں نے اس کی ایک نہ سنی، اس کا خیال تھا کہ یوں اس کی نیکی رایگاں جائے دھان کے بدلے دھان لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے اپنی نیکی بیچ دی لیکن گاؤں کے بزرگوں نے بتایا کہ اس کی نیکی اپنی جگہ قائم رہے گی اور اس کی نیکی کا پورا پورا صلہ ملے گا۔

پھر یامو نے بھی باپ کو سمجھایا اور لوٹا نے سے باز رکھا۔ پانی سوکھ گیا۔ لوگوں نے کچے دھان کاٹ لیے اور بڑی دھوم سے جشن منایا، ہاما گوچی کے اعزاز میں دعوت دی اور پھر اس کی شان میں نعرے لگائے۔

ہاما گوچی کو لوگ فرشتہ کہنے لگے۔ وہ اٹھ کر اس کے حق میں دعائیں مانگتے۔

آج تک لوگ ہاما گوچی کو یاد کرتے ہیں۔ ہاما گوچی اب اس دنیا میں نہیں لیکن اس کی نیکی دلوں میں موجود ہے آج بھی گاؤں والے اپنے بچوں کو اس کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔

☆☆☆☆

سر شیخ عبدالقادر

یہ کہانی مجھے بہت پسند تھی

مغربی ملکوں میں کتے پالنے کا بہت شوق ہے اور اس کے علاوہ بلیاں بھی پالی جاتی ہیں۔ ایک گھر میں ایک کتا تھا اور ایک بلی تھی۔ کتا ایک گدے پر آرام سے سو رہا تھا اور بلی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی کہ بلی کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم کیوں پیدا کیے گئے اور ہماری زندگی کا کوئی مقصد ہے یا نہیں۔ وہ کتے کے پاس گئی اور اُسے سوتے ہوئے کو جھنجوڑ کر کہا تم بھی عجیب سست جانور ہو۔ جب دیکھو سوئے ہوتے ہو۔ ذرا جاگو مجھے تم سے ایک ضروری بات پوچھنی ہے۔ کتے نے ذرا جھنجلا کر آنکھ کھولی۔ ''جلد پوچھو جو کچھ پوچھنا چاہتی ہو۔ مجھے بہت نیند آرہی ہے۔'' بلی نے جواب دیا۔ میں آج یہ سوچ رہی ہوں کہ ہم تم سب کیوں پیدا کیے گئے ہیں اور ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے۔ تم اپنی بات بتاؤ کہ تمھارے خیال میں تم، کس کام کے لیے بنائے گئے ہو۔ کتے نے پھر آنکھ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔ جاؤ مجھے سونے بھی دو۔ میں تو کبھی ایسی اُلجھن میں گرفتار نہیں ہوا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ گھر کی خاتون کا یہ کام ہے کہ میری بے حد خاطر کرے، مجھے صاف ستھرا رکھے۔ سونے کے لیے مجھے نرم گدا دے اور دو تین دفعہ اچھی طرح کھلائے پلائے۔ یہ کہہ کر کتا پھر سو گیا اور بلی اُس کے بے فکرے پن پر افسوس کرتی ہوئی اور مایوس سی ہو کر گھر سے باہر نکلی۔ تھوڑی دور جا کر اُسے ایک چڑیا نظر آئی جو اُونچے سے درخت پر پھدک رہی تھی۔

بلی نے درخت کے نیچے جا کر میاؤں میاؤں کی اور چڑیا سے کہنے لگی۔ بی چڑیا میں آج تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ ہم تم کسی مقصد کے لیے پیدا ہوئے ہیں چڑیا بولی بی بلی میں تمھارا مطلب سمجھ گئی۔ تم آج چکنی چپڑی باتوں میں لگا کر مجھے کھانے کے لیے گھات لگا رہی ہو۔ مگر میں تمھارے فریب کو جانتی ہوں اور تم سے بات کرنا نہیں چاہتی۔ یہ کہتے ہی چڑیا پھُر کر کے اُڑی اور فضا میں چکر لگانے لگی۔ بلی پہلے سے بھی زیادہ مایوس ہوئی کہ کتے نے اس کی بات تو سن لی تھی۔ گو مایوس کن جواب دیا تھا۔ لیکن چڑیا پر پرانے شبہے اس قدر غالب آئے کہ اس کی بات بھی پوری سننی گوارا نہ کی۔ اور بلی کو بدنیت سمجھ کر اُڑ گئی۔ بلی نے اب سوچا کہ جو کوئی اور راستے میں ملے گا۔ اس سے یہی بات پوچھوں گی۔ آگے جا کر کچھ فاصلے پر اسے ایک بیل ملا۔ بلی نے اس سے بھی وہی سوال کیا جو

پہلے کتے اور چڑیا سے کیا تھا۔ بیل بہت بڑا جانور تھا اور موٹا تازہ تھا۔ اس نے سمجھا کہ اس کا دماغ بھی اسی نسبت سے بڑا اور سوچنے والا ہوگا۔ مگر اسے پھر مایوسی ہوئی۔ جب بیل نے یہ جواب دیا کہ: میں تو اسی قدر جانتا ہوں کہ مجھے قدرت نے لدنے کے لیے بنایا ہے۔ جو آتا ہے بھاری بوجھ میری پیٹھ پر لاد دیتا ہے۔ میں وہ بوجھ کہیں لے جا کر اُتارتا ہوں تو میرے لیے دوسرا بوجھ تیار ہوتا ہے۔ بس جب سے ہوش سنبھالا ہے اسی طرح عمر گزاری ہے اور یونہی گزر جائے گی۔ اتنی بات ضرور ہے کہ اس محنت کے عوض میں مجھے گھاس اور چارہ پیٹ بھرنے کو مل جاتا ہے۔

بلی کا حوصلہ تو ان جوابوں سے پست ہوگیا تھا۔ مگر تھی مستقل مزاج۔ اس نے کہا ایک آدھ دروازہ اور کھٹکھٹانا چاہیے۔ اُس نے سن رکھا تھا کہ پرندوں میں اُلو سیانا سمجھا جاتا ہے۔ اُلو کے بارے میں مغرب کے لوگوں کے خیالات ہماے ملک سے اور کئی دوسرے مشرقی ملکوں کے خیالات سے مختلف ہیں۔ ہم تو اُلو کو بے وقوف کہتے ہیں۔ مگر مغربی لوگوں میں ملک یونان سے آئی ہوئی ایک روایت مشہور ہے کہ اُلو عقل کے دیوتا کے کندھوں پر بیٹھا تھا۔ اور اس طرح اسے اُس دیوتا کی عقل کا کچھ حصہ مل گیا۔ بلی کی نظر چلتے چلتے ایک اُلو پر پڑی۔ جو آنکھیں بند کیے یوں بیٹھا تھا۔ جیسے گیان دھیان میں مصروف ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ اُلو کو دن کی روشنی نہیں بھاتی۔ رات کو اسے خوب نظر آتا ہے اس لیے دن اُلو کے لیے بے کار ہے۔ ہمیں رات آرام کے لیے ملی ہے اور دن کام کے لیے اس کی جگہ اُلو کا دن آرام کے لیے ہے اور رات اِدھر اُدھر اُڑنے کے کام کے لیے۔

بلی درخت کی اس شاخ کے قریب گئی۔ جس پر اُلو صاحب بیٹھے اُونگھ رہے تھے اور ان سے بات شروع کی۔ کہیے جناب میں نے سنا ہے۔ آپ جانوروں میں دانا سمجھے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں آپ عقل کے دیوتا کے کندھوں پر بیٹھے تھے۔ اس لیے میں آپ سے ایک ضروری مسئلہ پوچھنے آئی ہوں۔ میں نے پہلے کئی جانوروں سے یہی سوال پوچھا ہے۔ مگر کسی سے خاطر خواہ جواب نہیں پایا۔ اب مزید روشنی کی تلاش میں آپ کی خدمت میں آئی ہوں۔ اُلو صاحب بلی کی اس گفتگو سے ذرا پھولے اور انھوں نے اپنے پر پھڑ پھڑا کر کہا بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ جس کا حل تم چاہتی ہو۔

بلی نے کہا میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ ہم سب کو قدرت نے کیوں پیدا کیا ہے؟ اُلو نے کہا۔ ہماری قوم نے مدّت ہوئی اس مسئلے کا حل معلوم کر لیا تھا۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ ہمیں سوچنے کی قوت دی گئی اور ہمیں سوچتے رہنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ بلی اس جواب سے بہت خوش ہوئی اور بولی آپ کا جواب مجھے بہت پسند آیا۔

حقیقت میں سوچنا بہت اچھی عادت ہے۔ میں آپ کا بہت شکر یہ ادا کرتی ہو کہ آپ نے مجھے یہ راہ دکھائی۔ مگر اتنا اور فرما دیجیے کہ آپ نے جو کہا ہے کہ آپ ہر وقت سوچتے رہتے ہیں۔ تو وہ کون سے مسئلے ہیں۔ جن پر لگاتار سوچنے کا آپ کو موقع ملتا ہے۔

اُلو نے جواب دیا: سب اُلو یہ سوچتے رہتے ہیں کہ اُلو پہلے پیدا ہوا یا انڈہ۔ کبھی ہم یہ کہتے ہیں کہ پہلے انڈا پیدا ہوا اور اس سے اُلو پیدا ہوا۔ مگر پھر یہ سوچتے ہیں کہ اُلو پہلے موجود نہ تھا تو انڈہ کیسے پیدا ہو گیا۔ یہ سن کر بلی نے سوال کیا کہ اتنی مدّت کے سوچ بچار کے بعد اُلو قوم نے آخر فیصلہ کیا کیا؟ الو کہنے لگا تم بے وقوفی کے درجے تک بھولی ہو۔ ہماری رائے بھی ایک طرف جھکتی ہے کبھی دوسری طرف۔ اسی طرح ہر نسل کی عمر گزر جاتی ہے اور اپنی متواتر سوچ کے لیے کوئی نیا مسئلہ تلاش نہیں کرنا پڑتا۔ وہ مسئلہ کیا ہوا، جو آسانی سے حل ہو جائے۔ بلی سوچنے کی خوبی کی تو خود بھی قائل تھی اور اُلو کے جواب سے اور بھی قائل ہو گئی تھی۔ مگر یہ سن کر کہ اُلو ایک ہی مسئلے پر سوچتے رہتے ہیں اور پہلے ایک رائے اور اس کے بعد دوسری رائے اس کے بالکل خلاف قائم کرتے ہیں۔

اُسے بہت مایوسی ہوئی اور سر جھکا کر گھر واپس آئی۔ دیکھا کہ کتے صاحب اب بھی سوئے پڑے ہیں۔ اُس نے کتے کا شانہ ہلایا اور اُسے جگایا اور چاہتی تھی کہ اس کو اپنی دن بھر کی داستان سنائے۔ مگر وہ نیند کا اتنا شوقین تھا کہ کہنے لگا۔ جا مجھ کو پریشان نہ کر۔ مجھے تو یہ گدا، اپنے آقا کی میم صاحب کا پیار اور اچھا کھانا پینا یہی زندگی کا مقصد کافی ہے۔

بلی چپ ہو کر بیٹھ گئی۔ مگر کتے کے جواب کو اس نے بے وقوفانہ سمجھا اور اپنے سوال کے جواب کی جستجو اس کے دل میں ہی رہی۔

☆☆☆☆

سعادت حسن منٹو

شیر آیا شیر آیا دوڑنا

ایک اُونچے ٹیلے پر گڈریے کا لڑکا دور گھنے جنگلوں کی طرف منہ کیے چلا رہا تھا۔ شیر آیا شیر آیا دوڑنا۔

بہت دیر تک وہ اپنا گلا پھاڑتا رہا۔ اُس کی بلند آواز، بستی میں بہت دیر تک گونجتی رہی، جب چلا چلا کر حلق سوکھ گیا تو بستی سے دو تین بوڑھے لاٹھیاں ٹیکتے ہوئے آئے اور گڈریے کے لڑکے کو کان سے پکڑ کر لے گئے۔

پنچایت بلائی گئی۔ بستی کے سارے عقل مند جمع ہوئے، اور گڈریے کے لڑکے کا مقدمہ شروع ہوا۔ اُس کا جرم یہ تھا کہ اُس نے غلط خبر دی اور بستی کے لوگوں کو خواہ مخواہ پریشان کیا۔

لڑکے نے کہا۔ میرے بزرگو، تم غلط سمجھتے ہو۔۔۔۔ شیر واقعی نہیں آیا تھا، پر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ آ ہی نہیں سکتا۔

بزرگوں نے کہا۔ وہ نہیں آ سکتا۔

لڑکے نے باادب پوچھا۔ کیوں؟

جواب ملا۔ جنگلوں کے محکمے کے بڑے افسر نے ہمیں لکھا تھا کہ شیر بوڑھا ہو چکا ہے۔

لڑکے نے کہا۔ لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں کہ وہ جوان ہونے کے لیے بہت سی جڑی بوٹیاں کھا رہا ہے۔

جواب ملا۔ یہ افواہ تھی۔۔۔۔ جنگلوں کے محکمے کے بڑے افسر سے ہم نے اس بارے میں پوچھا تو اس نے ہمیں یہ لکھا تھا کہ شیر نے تو اپنے رہے سہے دانت بھی نکلوا دیے ہیں، کیوں کہ وہ اپنی زندگی کے باقی دن خدا کی یاد میں گزرنا چاہتا ہے۔

لڑکے نے بڑے جوش کے ساتھ کہا۔ میرے بزرگوار! ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو۔

بزرگوں نے کہا۔ ہرگز نہیں۔۔۔۔ ہمیں جنگلوں کے محکمے کے بڑے افسر پر پورا بھروسہ ہے۔ اس لیے کہ وہ سچ بولنے کی قسم کھا چکا ہے۔

لڑکے نے پوچھا۔ کیا یہ قسم جھوٹی نہیں ہو سکتی۔

بزرگ غصے میں چلائے۔ ہر چیز جھوٹی کیسے ہو سکتی ہے۔ تم خود جھوٹے ہو۔ مکار ہو۔ چالباز ہو۔

لڑکا مسکرایا۔ میں سب کچھ ہوں، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں وہ شیر نہیں جو کسی وقت بھی یہاں آ سکتا ہے---جنگلوں کے محکمے کا بڑا افسر بھی نہیں جو سچ بولنے کی قسم کھا چکا ہے---میں-----

پنچایت کے ایک سفید بالوں والے بوڑھے آدمی نے لڑکے کی بات کاٹ کر کہا۔ تم اُسی گڈریے کی اولاد ہو، جس کی کہانی سالہا سال سے اسکولوں میں پڑھائی جاتی رہی ہے۔ کان کھول کر سن لو کہ تمھارا حشر بھی وہی ہو گا، جو اس کا ہوا تھا۔ شیر آئے گا تو تمھاری تکہ بوٹی اڑا دے گا۔

گڈریے کا لڑکا پھر مسکرایا۔ بزرگو!

میں تو اس سے لڑوں گا---مجھے تو ہر گھڑی اُس کے آنے کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ تم کیوں نہیں سمجھتے کہ شیر آیا دوڑنا، والی کہانی، جو اپنے بچوں کو پڑھاتے ہو، آج کی کہانی نہیں----آج کی کہانی میں تو شیر آیا شیر آیا دوڑنا، کا مطلب یہ ہے کہ خبردار رہو، ہوشیار رہو----شیر آئے نہ آئے، ہو سکتا ہے۔ کوئی گیدڑ ہی منہ اُٹھا کر ادھر چلا آئے، مگر اس حیوان کو بھی تو ہمیں اپنی بستی میں گھسنے سے روکنا چاہیے۔

بزرگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ کتنے ڈرپوک ہو تم---گیدڑ سے ڈرتے ہو۔

گڈریے کے لڑکے نے کہا۔ میں شیر سے ڈرتا ہوں نہ گیدڑ سے---مگر ڈرتا ہوں اس لیے کہ یہ حیوان ہیں---اور ان کی حیوانیت کا مقابلہ کرنے کے لیے میں اپنے آپ کو ہمیشہ تیار رکھتا ہوں---میرے بزرگو، زمانہ بدل چکا ہے، اپنے اسکولوں سے خدا کے لیے وہ کتاب اٹھا لو، جس میں شیر آیا، شیر آیا دوڑنا، والی پرانی کہانی چھپی ہے---اُس کی جگہ یہ نئی کہانی پڑھاؤ۔

ایک بڈھے نے کھنکارتے ہوئے کہا۔ بھائیو، یہ لڑکا ہمیں غلط راستے پر لے جانا چاہتا ہے---اس کا سر پھر گیا ہے۔

دوسرے بڈھے نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ اس کو فوراً قید کرو۔

گڈریے کے لڑکے کو فوراً جیل میں قید کر دیا گیا۔

اتفاق کی بات ہے اُسی رات شیر بستی میں داخل ہوا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ لوگ بستی چھوڑ کے بھاگ گئے۔ باقی شیر نے شکار کر لیے مونچھوں کے ساتھ لگا ہوا خون چوستا جب شیر جیل کے پاس سے گذرا۔ تو اس نے لوہے کی مضبوط سلاخوں کے پیچھے گڈریے کے لڑکے کو دیکھا۔

شیر نے اُس سے کہا۔ کون ہو تم؟

لڑکے نے جواب دیا۔ میں گڈریے کا لڑکا ہوں۔

شیر کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ افوہ---تم ہو گڈریے کے لڑکے--- وہی جو میرے آنے کی اطلاع دیا کرتے تھے---باہر آؤ میں تمھیں اس کی سزا دینا چاہتا ہوں۔

لڑکا مسکرایا۔ جنگلوں کے بادشاہ---- مجھے افسوس ہے۔ کہ میں باہر نہیں آ سکتا----میرے بزرگوں نے جو مجھے سزا دی ہے، اس نے مجھے تمھاری سزا سے محفوظ کر دیا ہے---اور شیر دانت پیس کر رہ گیا۔

☆☆☆☆

سیّد جاوید امتیازی

فطرت سے دور نہ جائیں!

”یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ سب لوگ گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں؟ دھوپ سر پر ہے، دس گیارہ یا شاید دوپہر کے بارہ بجنے کو ہیں اور یہ لوگ ہیں کہ ان کی آنکھ ہی نہیں کھل رہی ۔ نہ اللہ رسول کا خوف، نہ سجدے، نماز کی پرواہ، اجی کیا ہو گیا ہے انھیں؟“ بڑے ابا غصے میں بول رہے تھے ۔ امی جان نے چائے کا کپ دیتے ہوئے چپکے سے کہا ”آج اتوار ہے نا، چھٹی کی وجہ سے سو رہے ہیں!“ ”بہو! جگاؤ ان نحوست ماروں کو اور لے کر آؤ میرے سامنے!“ دادا جانی نے چھڑی کے اشارے سے کہا ۔ اتنے میں نعمان اور فرحان آنکھیں ملتے ہوئے چلے آئے اور چپکے سے ابو جان بھی ۔ ”ادھر آؤ نالائقو! میری بات سنو پہلے!“ فرحان اور نعمان کے ساتھ ساتھ خود ابو جان بھی شرمندہ شرمندہ سے دکھائی دے رہے تھے، پہلے تو سب نے بڑے ابا کو سلام کیا اور پھر چپکے سے پاس والی کرسیوں پر بیٹھ گئے ۔

دادا جانی جنھیں ہم سب بڑے ابا کہتے ہیں، گاؤں سے کل ہی ہمارے پاس آئے ہیں ۔ بڑے شفیق اور مہربان طبیعت کے مالک ہیں مگر غلط بات پر انھیں غصہ بھی بہت آتا ہے ۔ اب جو سب نے مل کر سلام کیا تو غصے کے باوجود چپ رہے اور اپنے لاڈلے پوتوں، نعمان اور فرحان کو پاس بٹھاتے ہوئے بولے: ”دیکھو بیٹا! صبح کا وقت بڑا سہانا اور نورانی ہوتا ہے ۔ اللہ کی ساری مخلوق صبح سویرے اٹھ کر اپنی اپنی زبان میں اللہ کی حمد بیان کرتی ہے ۔ یہ انسان کی فطرت کے خلاف ہے کہ وہ صبح سویرے اٹھنے کی بجائے دیر تک سوتا رہے ۔ اللہ پاک نے دن کام کاج کے لیے بنایا ہے اور رات آرام کرنے کے لیے ۔ یہ فطرت کا تقاضا ہے کہ ہم دن بھر خوب محنت اور دوڑ دھوپ کریں، سکول جائیں، دفتر جائیں، کھیتی باڑی یا کاروبار کریں اور پھر رات کو آرام کریں اور پوری نیند سوئیں ۔ اگر کھیل تماشے یا ویڈیو دیکھنے میں رات رات بھر جاگتے رہیں اور اس کے نتیجے میں دن چڑھے بیدار ہوں تو یہ عمل ہماری فطرت کے بالکل خلاف ہو گا اور ہمیں سست اور ناکارہ بنا کر رکھ دے گا ۔

سائنسی ترقی اور نت نئی آرام و آسائش کی چیزیں بنا لینے کے باوجود آج کا انسان ”آرام اور سکون“ کے مفہوم سے بیگانہ ہے ۔ سب جانور جب تھک جاتے ہیں تو رات بھر خوب آرام کرتے ہیں مگر انسان جو اشرف

المخلوقات ہے، ایک مشین کی طرح کام میں جتا رہتا ہے، نہ کھانے پینے کا ہوش نہ آرام کرنے کی فکر۔ اللہ، رسولؐ کی یاد سے مسلسل غفلت اور نماز سے لاپرواہی الگ ایک لمیہ ہے۔ بھلا سوچو تو جس شخص کو پورا آرام اور اچھی نیند میسر نہیں ہے اس کا نظام ہضم کس طرح درست رہ سکتا ہے؟ یاد رکھو! پوری اور بروقت نیند کے بغیر عمدہ سے عمدہ غذا کا استعمال بھی فائدہ مند نہیں ہو سکتا۔ افسوس! رات دیر تک جاگنا اور صبح دن چڑھے تک سوتے رہنا آج کے فیشن میں شامل ہو چکا ہے۔ یہ فطرت سے بغاوت نہیں تو اور کیا ہے؟

میرے بچو! رات کو جلد سونے اور صبح سویرے بیدار ہونے کی عادت ڈالو! اچھی اور گہری نیند صحت کے لیے بہترین ٹانک ہے۔ آپ اسی ٹانک کے ذریعے اپنے جسم کی ”بیٹری“ کو دوبارہ چارج کر سکتے ہیں۔ اس ترتیب کا خیال رکھیں۔ فطرت کے ساتھ چلیں۔ اس سے بغاوت کر کے خود کو اعصابی اور جسمانی بیماریوں اور نت نئی پریشانیوں سے محفوظ رکھیں۔ دیکھو، اب آئندہ ایسی بات نظر نہ آئے مجھے۔“

”بڑے ابا! ہم کل ہی سے آپ کی بات پر عمل شروع کر دیں گے“ فرحان اچھل کر بولا۔

”کل سے کیوں، آج ہی سے کیوں نہیں؟“ فرحان اور نائلہ نے یک زبان ہو کر کہا۔ اچھے بچو! آپ بھی ہمارے بڑے ابا کی باتوں پر ضرور عمل کیجیے گا۔

☆☆☆☆

شوکت تھانوی

جب میں ننھا سا تھا

جب میں ننھا سا تھا۔

بالکل پھول پڑھنے والے ننھوں کی طرح اُسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک مرتبہ میری امی جان نے مجھ کو ایک مرغے کی کہانی سنائی تھی۔ وہ مرغا ایک بادشاہ کا تھا بادشاہ اُس کو باسی روٹی کے ٹکڑے تو تڑوڑ کر نہیں کھلاتا تھا۔ یہ چیزیں تو غریب آدمی اپنے مرغوں کو دیا کرتے ہیں۔ بادشاہ تو اپنے اس مرغ کو انار کے دانے کھلایا کرتا تھا اور کبھی کبھی موتی بھی اس کے سامنے ڈالے جاتے تھے تا کہ وہ ان کو چُگ لے۔

اس مرغے کو سوہن حلوے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر کھلائے جاتے تھے اور اس کے لیے طرح طرح کی مٹھائیاں بنائی جاتی تھیں۔ شکر پارے اور بوندیاں۔

اس کہانی کو سُن کر میرا کئی مرتبہ یہ جی چاہا کہ میں مرغا بن جاؤں اور کوئی بادشاہ مجھ کو پال لے مگر میں نے یہ بھی سُن رکھا تھا۔ کہ بادشاہ مرغ کھانے کے بھی بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ اگر میں مرغا بن بھی گیا اور بادشاہ نے مجھ کو نہ پالا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کھالیا جاؤں بھون بھان کر۔

دو تین دن تک میں اسی بات پر سوچتا رہا۔ کہ مرغا بن جانے میں فائدہ ہے یا نقصان۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک مرغے کو بوانصیبن کی بلی نے دبوچ لیا۔ میں نے اُس دن سے توبہ کرلی۔ کہ اب میں کبھی مُرغا بننا نہ چاہوں گا۔

مگر اس توبہ کے بعد ہی میں ایک دم مرغ بن گیا۔ آپ اسے جھوٹ نہ سمجھیں، میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میں سچ مچ مرغا بن گیا تھا۔

سُن تو لیجیے کہ میں کیسے مرغا بنا۔

میں نے دیکھا کہ میری بڑی بہن نے سُرخ سُرخ دہکتا ہوا قندھاری انار خریدا۔ میں اپنے پیسوں کی ٹاٹی خرید کر پہلے ہی چٹ کر چکا تھا۔ اب میں انار کیسے کھاتا؟ میری سمجھ میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے اپنی بہن سے کہا۔ باجی آج تو تم بادشاہ نظر آرہی ہو۔

باجی نے کہا۔ بادشاہ! وہ کیسے؟

میں نے کہا۔ انار ہے تمھارے ہاتھ میں۔ جو بادشاہ اپنے مرغوں کو کھلاتے ہیں۔

باجی نے ہنس کر کہا۔ اچھا وہ کہانی والی بات۔ مگر میرے پاس تو صرف انار ہے، مرغا کہاں ہے؟

یہ کہہ کر میں نے ہاتھ سے چونچ بند کی اور اپنے منہ کے سامنے وہ ہاتھ لگا لیا۔ اور کہنیوں اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

باجی نے انار کے دانے فرش پر ڈالنا شروع کر دیے۔ اور میں اپنے ہاتھ کی چونچ سے وہ دانے کھاتا رہا۔

تھوڑی دیر میں سارا انار میں کھا چکا تھا اور اب جو باجی نے دیکھا تو نہ وہ بادشاہ تھیں نہ میں مرغا تھا۔ البتہ انار کا خالی چھلکا اُن کے ہاتھ میں تھا۔

☆☆☆☆

صلاح الدین احمد

محفل کے آداب

وہ بچے اس وقت میرے آس پاس جمع ہیں۔۔۔ اور وہ بچے بھی جو اپنے اپنے گھروں میں ہماری باتیں سن رہے ہیں ان میں سے غالباً ہر بچے کو کبھی نہ کبھی یہ موقع تو ضرور پیش آیا ہوگا کہ۔۔۔ اس کی امی جان یا بڑی آپا جان اچھے اچھے کپڑے اور زیورات پہن کر کسی تقریب میں شرکت کے لیے کسی جگہ جانے کو تیار ہوئیں تو اس بچے کا بھی بڑا جی چاہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ اچھے کپڑے پہن کر جائے۔۔۔ لیکن انھوں نے یہ کہہ کر اس بچے کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ہو۔

کہ نہیں نہیں ننھے۔ تم گھر پہ ہی رہو، تم ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے۔ کیوں کہ وہاں جا کر تم بہت تنگ کرو گے۔۔۔ اب یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا یہ جواب ہر موقعے پر ٹھیک ہوتا تھا، یا غلط؟ اور اگر ان کا یہ جواب ٹھیک ہوتا تھا تو اس صورت میں ننھا تو بہر حال قصور وار تھا ہی۔۔۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس کی امی جان یا آپا جان بھی کچھ کچھ قصور وار ہوتی تھیں یا نہیں؟ لیکن اتنی بات تو بالکل صاف اور واضح ہے۔۔۔ کہ بچے جان بوجھ کر بہت ہی کم بد تمیزی کرتے ہیں۔۔۔ اور اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ بات اچھی ہے اور یہ بات بری ہے اور اس طرح کرتے ہیں اور اس طرح نہیں کرتے۔۔۔ تو کون بچہ ہے جو اپنی کھلی بھی اڑوائے، اور مزے مزے کی محفلوں اور سہانی سہانی اور رنگین مجلسوں میں شریک ہونے کے لطف سے بھی محروم رہے؟۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ بہت دنوں کی بات ہے۔

شاید آج سے کوئی چالیس یا پینتالیس سال پہلے کی بات ہوگی۔۔۔۔ ہمیں بھی تمہاری طرح کبھی کبھار اپنی امی جانی یا آپا جان کے ساتھ بعض ایسی محفلوں میں شریک ہونے کا موقع ملتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ ہمارے محلے میں کسی لڑکی کی منگنی کی تقریب تھی اور منگنی کی اس خوشی کے موقع پر رت جگا بھی تھا اور شام کے وقت ایک پر تکلف دعوت کا اا ہتمام بھی تھا۔

رت جگا ایک ایسی محفل کو کہتے ہیں جو رات بھر جاری رہتی ہے اور اس محفل میں عورتیں ساری رات ہنستی ہیں اور بولتی ہیں، گاتی اور گواتی رہتی ہیں۔ اور سہیلیاں جو کہ مدت کی بچھڑی آپس میں ملتی ہیں تو پھر اس طرح

گھ کر باتیں کرنے بیٹھتی ہیں کہ رات ختم ہو جاتی ہے، لیکن ان کی باتیں کبھی ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ ہاں تو جناب: ہمارے محلے میں لڑکی کی منگنی کی تقریب کے موقع پر رت جگا بھی تھا اور شام کی دعوت بھی تھی۔ ہمیں بھی شرکت کی دعوت مل چکی تھی۔

جب ہم دعوت والے گھر پہنچے ہیں تو چراغ جل چکے تھے۔ اور محفل والا مکان اپنی رونق اور سج دھج سے پرستان کا کوئی ٹکڑا معلوم ہو رہا تھا۔

مکان کے صدر دروازے پر مہمان عورتیں کوئی تانگوں سے، کوئی ڈولیوں سے برابر اترتی چلی آتی تھیں۔ صاحبِ خانہ اور ان کی لڑکیاں بالیاں ڈیوڑھی ہی میں کھڑی ان کا استقبال اور پیشوائی کیے جا رہی تھیں۔ ہوا عود اور اگربتیوں اور بیبیوں اور بیگمات کے لباس کی بھینی بھینی خوشبو سے ایسی مہک اٹھی تھی کہ کیا کہوں؟

اتنے میں ہم نے دیکھا کہ ہماری جان پہچان کے پانچ سات بچے اپنی اپنی ماؤں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ ان میں میرزا صاحب کے دونوں لڑکے سعید اور عثمان بھی تھے اور چوہدری صاحب کے صاحبزادے نوری اور فضلی بھی اور ان کی ماموں زاد بہن چھمو اور اس کی سہیلی دولت بھی تھی۔

مرزا صاحب کا گھرانا محلے میں سب سے زیادہ سلجھا ہوا گھرانا سمجھا جاتا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ یہ لوگ کچھ زیادہ دولت مند تو نہیں تھے۔ لیکن سلیقے، چال چلن اور شرافت کی سچی دولت سے مالا مال تھے۔

چودھری صاحب بڑے بے پروا قسم کے آدمی تھے، ۔ اور چودھرائن کو بھی لے دے کے صرف ایک ہی فکر تھی اور وہ یہ کہ میرے بچوں کے پیٹ ہر وقت تنے رہیں۔ چوہدرائن سارا دن انہیں کوسنے دیتی رہتی تھیں کہ ارے کم بختو: کچھ کھا لو:

اس کے سوا انہیں کوئی بات نہ سمجھاتی تھیں۔۔۔ اور نہ سکھاتی تھیں۔

اور عجیب بات ہے کہ ان کے بچے بھی اس بارے میں ان کے بڑے فرماں بردار تھے۔ خوشی والے گھر میں ہر طرف شور مچا ہوا تھا، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔۔۔ ابھی کھانا شروع نہیں ہوا تھا۔۔۔ مزے مزے کا گانا ہو رہا تھا۔۔۔ ایک طرف ڈومنیاں گاتی تھیں تو دوسری طرف لڑکیوں کی ٹولی بیٹھی گا رہی تھی۔۔۔ جب مقابلے کا سماں بندھا ہوا تھا۔۔۔ بچوں نے بے پناہ شور مچا رکھا تھا، اور ادھر سے ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔

اس شور شرابے میں ہم کیا دیکھتے ہیں کہ چوہدری صاحب کے دونوں صاحبزادے نوری، فضلی ایک

دوسرے کے پیچھے بھاگ دوڑ رہے تھے اور نوری، فضلی، کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ زور زور سے چیخ بھی رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے ایک جگہ فضلی کا پاؤں اچانک ایک لڑکی کے غرارے میں پھنس گیا اور فضلی اس لڑکی کے اوپر گر گیا۔ اس کے پیچھے نوری بھاگ رہا تھا، وہ بھی دھم سے اس کے اوپر آن گرا۔ یہ دونوں اس جگہ ایک دوسرے پر گرے جہاں لڑکیاں ڈھولک بجا رہی تھیں اور گانا گا رہی تھیں۔ ان کے گرنے سے لڑکیوں میں ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔ اس بھاگ دوڑ میں کسی کا دوپٹہ پھٹ گیا۔۔۔ کسی کی قمیص۔۔۔ اور کسی کے گھٹنے پر چوٹ آئی۔۔۔ تو کسی کا ہاتھ کچلا گیا۔۔۔ اس افراتفری میں پان بکھر گئے۔۔۔ گلدان ٹوٹ گیا اور سفید دودھ جیسی چمکتی چاندنی کا تو ان کے لتھڑے ہوئے جوتوں نے ستیاناس ہی کر کے رکھ دیا۔

اس شور بدتمیزی کو دیکھ کر گھر والی خاتون خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔۔۔ مگر کیا کرتی، میزبان تھی۔۔۔ کسی کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتی تھی، جھوٹی ہنسی ہنس کر ٹال گئی۔

اتنے میں مہمانوں کے کھانے کے لیے دستر خوان بچھایا گیا تو سب سے پہلے وہی جانی پہچانی آواز کانوں میں آئی:

ارے کم بختو کچھ کھالو۔

مگر کم بخت کسی اور شغل میں مصروف تھے، سنی ان سنی کر گئے۔

چوہدری صاحب کی بیگم پھر چلائیں:

کم بختو! ادھر آ جاؤ۔

نوری اور فضلی دوڑتے ہوئے آ گئے:

ایک طرف تو یہ کچھ ہو رہا تھا۔۔۔ لیکن محفل کی دوسری جانب سعید اور عثمان اپنی والدہ کے ساتھ جب گھر میں داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں بیٹھی ہوئی تمام بزرگ عورتوں کو بڑے ادب اور احترام سے سلام کیا اور پھر اپنے جوتے اتار کر نہایت آرام سے چاندنی پر بیٹھ گئے۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ چھیمو اور دولت کلوں میں پان ٹھونسے، باچھوں کو دوپٹوں کے پلوؤں سے پونچھتی ہوئی، بہت سی گلوریاں ہاتھوں میں لیے دوڑتی آئیں اور ان دونوں کو بھی دو دو گلوریاں عطا کرنے لگیں، مگر سعید نے بڑی نرمی اور تمیز سے معذرت کرتے ہوئے انکار کر دیا کہ ہم پان کھانے کے عادی نہیں ہیں۔

اتنے میں کسی بڑی بی نے کہا:

سعید میاں؛ سنا ہے تمہیں بہت اچھی اچھی نظمیں یاد ہیں اور پڑھتے بھی بہت خوب ہو؛

بڑی بی کی بات سن کر سعید نہ تو گھبرایا، نہ ہی اس نے جھوٹ بولا۔

کہنے لگا:

جی ہاں؛ نظمیں تو مجھے پانچ سات ضرور یاد ہیں،، مگر یہ اور عثمان -----(یہ کا اشارہ میری طرف تھا)----- مجھ سے بہتر پڑھتے ہیں۔

میں نے سعید کے منہ سے جو اپنا نام سنا تو میرے کانوں کی لویں تک گرم ہو گئیں، اور میں ایک دم گھبرا گیا۔

بعد میں سعید نے مجھے بتایا کہ تمہارا رنگ اس وقت چقندر کی طرح سرخ ہو گیا تھا اور گھبراہٹ کی وجہ سے تمہاری پیشانی پر پسینہ آ گیا تھا۔

مگر وہ ---- مشکل ---- مجھ پر سے یوں ٹل گئی، کہ سعید کی امی جان نے میری گھبراہٹ اور حالت دیکھتے ہوئے عثمان کو اشارہ کر دیا اور پھر اس چھوٹے سے بہادر نے ---- مولانا ظفر علی خان کی مشہور نعت ---- وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں ---- ایسی خوبی اور ترنم سے سنائی کہ ساری محفل وجد میں آ گئی اور محفل میں موجود تمام عورتوں نے عثمان کو خوب داد دی۔

اتنے میں دسترخوان لپیٹا گیا تو دیکھا کہ اس کے نیچے چاندنی پر ایک جگہ تقریباً آدھ گز کا زرد دائرہ بنا ہوا تھا۔

ہم نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو تھوڑے ہی فاصلے پر نوری، فضلی اینڈ کمپنی کا پورا گروہ آمنے سامنے بیٹھا دکھائی دیا۔ اور وہ اب بھی آپس میں جھپٹ رہے تھے۔ اور شور مچا رہے تھے۔ ان کے شور کی وجہ سے کان پڑی آوز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ہمیں تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک دوسرے کی ضد میں شوربہ پی گئے ہیں اور اسی چھینا جھپٹی کے دوران ان حضرات نے یہ کارنامہ انجام دیا، اور یہ دائرہ اس کمپنی کی ایک ادنیٰ یادگار ہے۔ جب رات بھیگنے لگی اور ہم سب لڑکوں کی آپس کی باتیں بھی ختم ہوتی نظر آئیں تو ہماری اور سعید کی امی جان نے ہم سب کو آنکھوں ہی آنکھوں میں ہدایت بھرے لہجے میں کہہ دیا کہ اب رات کافی گزر چکی ہے، لہٰذا گھر چلے جاؤ اور جا کر آرام کرو۔ چنانچہ ہم نے سب بزرگ عورتوں اور مردوں کو نہایت ادب سے الوداعی سلام کیا اور باہر نکل آئے۔

چلتے چلتے ہم سب نے نوری صاحب سے بھی کہا کہ آؤ بھئی، اب گھر چلیں، مگر انہوں نے نہایت بزرگانہ انداز میں ہماری طرف دیکھتے ہوئے انتہائی بھونڈے طریقے سے مسکراتے ہوئے فرمایا:

ارے میاں: اتنی جلدی چل دیے۔۔۔ تمہیں اگر نیند آئی ہے تو بڑے شوق سے جاؤ اور سو جاؤ ہم تو اب ذرا تاش کے دو چار ہاتھ کھیلیں گے۔ نوری صاحب اتنا کہنے کے بعد الٹے ہو کر لیٹ گئے، اور تاش کی گڈی جیب سے نکال کر پھینٹنے لگے۔ اور پھر نوری میاں نے ایک نعرہ لگایا۔

ہے کوئی مائی کا لال جو ہم سے دو ایک بازیاں کھیلے؟

پاس ہی ایک بزرگ عورت بیٹھی ہوئی تھیں، وہ چونک کر اٹھیں اور قدم اٹھاتی ہوئی نیچے اتر گئیں۔

کوئی دو برس گزرنے کے بعد اسی لڑکی کی شادی ہوئی مگر نسیمہ کی ماں نے اس مرتبہ چوہدرائن کو کہلا بھیجا کہ آپ آئیں تو میری آنکھوں پر آئیں۔۔۔ مگر مہربانی کر کے نوری اور فضلی کو اپنے ساتھ نہ لائیں۔

☆☆☆☆

مولوی عبدالحق

خوب چھینے

ایک بچے نے ایک چھوٹا سا چوہے دان خریدا کچھ دن اس سے کھیلتا رہا اور پھر دوسرے کھیلوں اور نئے کھلونوں کے خیال میں اسے بالکل بھول گیا۔

گھر میں ایک ملازم لڑکا بھی تھا جسے یہ چھوٹا بچہ بودی کہہ کر بُلاتا تھا۔ شب برات کا دن آیا۔ تو بودی کو آوازیں دینے لگا۔ اتنے میں وہ بھی چھچھوندریں اور پٹاخے لیے آپہنچا بچے نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ بودی میرا چوہے دان کہاں ہے؟

بودی۔ میاں کون سا چوہے دان؟

بچہ۔ ارے وہی جو میں نے منگوایا تھا۔ کئی دن سے مجھے اس کا خیال نہ رہا تھا۔ کہاں ہے وہ؟

بودی۔ مجھے تو یاد نہیں، شاید کہیں گم ہو گیا۔

بچہ۔ تو نے اسے سنبھال کر کیوں نہ رکھا؟ اب لا میرے چوہے دان کے پیسے:

بودی۔ میاں میرے پاس پیسے کہاں؟

بچہ۔ بہت اچھا۔ تو میں ابھی تمھاری چھچھوندریں اور پٹاخے چھین لیتا ہوں۔

بودی۔ لیجیے، یہ تو میں آپ ہی کے لیے لایا ہوں۔

☆☆☆☆

عزیز اثری

دو دوست

عالی کی امی کا بخار تیز ہو رہا تھا۔ لیکن اُنھیں تو اس بات کی فکر تھی کہ عالی ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا، اُن کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔ دو تین گھنٹے انتظار کرنے کے بعد وہ بستر پر سے اُٹھیں اور آہستہ آہستہ چل کر دروازے میں آ بیٹھیں۔ وہ شام تک دروازے میں بیٹھی عالی کا انتظار کرتی رہیں۔ لیکن عالی نہیں لوٹا۔

وہ اپنے بیٹے کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگیں۔ پھر اُن سے صبر نہ ہو سکا۔ وہ گرتی پڑتی اپنی پڑوسن کے ہاں گئیں اور اپنی پریشانی ظاہر کی پڑوسن نے فوراً اپنے بھائی کو ڈاکٹروں کی دکانوں پر بھیجا۔ اُس نے واپس آ کر بتایا کہ عالی کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا۔ اب تو عالی کی امی اور بھی گھبرا گئیں۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ اتنے میں عالی کے ابا واپس آ گئے۔ اُن کے آتے ہی عالی کی امی نے اُنھیں عالی کے متعلق بتایا۔ عالی کے ابا بہت تھکے ہوئے تھے۔ لیکن بیٹے کی فکر نے اُنھیں بیٹھنے نہیں دیا۔ وہ فوراً اُسے ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ سب سے پہلے رفیق کے گھر گئے۔ رفیق کو عالی کے گم ہو جانے کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ وہ بچارا اُسی وقت عالی کے ابا کو ساتھ لے کر مکھی چوس کے ہاں پہنچا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ اس وقت تک مکھی چوس اور اُس کے دوست شہر سے واپس آ چکے تھے۔ جب رفیق اور عالی کے ابا مکھی چوس کے ہاں گئے تو وہ گھر پر تھا۔ وہ بولا:

میں نے تو عالی کو صبح سے دیکھا تک نہیں۔ رفیق نے مکھی چوس سے اُس کے آوارہ دوستوں کے پتے معلوم کیے اور عالی کے ابا کو ساتھ لے کر پہلے موٹے کے ہاں اور پھر لمبے کے گھر گیا۔ اُن دونوں نے کہا کہ آج عالی چھٹی کے بعد تو ایک طرف، سکول میں بھی ہمیں نہیں دکھائی دیا۔ عالی کے ابا اور رفیق دونوں مایوس ہو گئے۔

عالی کے ابا رفیق کو اس کے گھر چھوڑنے گئے۔ لیکن رفیق اپنے دوست کے لیے پریشان تھا۔ اس لیے وہ عالی کے ابا کے ساتھ ان کے گھر آ گیا۔ عالی کی امی اب زیادہ دکھی ہو گئیں۔ رفیق نے عالی کی امی کو ہر طرح تسلی دی اور کہا کہ عالی ضرور واپس آ جائے گا۔ لیکن امی کی بری حالت تھی۔ وہ بے چاری صبح تک جاگتیں اور رو رو کر

بیٹے کی سلامتی اور واپسی کے لیے دعائیں مانگتیں رہیں۔ لیکن عالی نہیں آیا۔

صبح اُٹھتے ہی عالی کے ابا قصبے کے تھانے میں گئے اور عالی کے گم ہونے کی رپورٹ لکھو دی۔ رپورٹ لکھوانے کے بعد وہ اپنے بیٹے کو تلاش کرنے لگے۔ اُنھوں نے سارا قصبہ چھان مارا، وہ صبح سے عالی کو ڈھونڈ رہے تھے اور چلتے چلتے تھک گئے۔ اس قدر چلنے کی وجہ سے بھوک تو لگی تھی۔ لیکن کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ عالی اُن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اُنھیں اپنے بیٹے سے بہت محبت تھی۔ پہلے تو کبھی وہ بیٹے کو ڈانٹ لیتے تھے اور اُس کی غلطی پر دو ایک بار اسے مار پیٹ بھی لیا تھا۔ لیکن اب ان کا دل بیٹے کی جدائی میں خون کے آنسو رو رہا تھا۔ جب عالی کی امی نے ان سے کھانا کھا لینے کو کہا تو ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بولے:

میں کیسے کھاؤں۔ معلوم نہیں میرا بیٹا کہاں ہے۔ کس حال میں ہے۔ معلوم نہیں اُسے کچھ کھانے کو ملا ہے یا نہیں۔ یہ سن کر عالی کی امی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ میرا بیٹا بھوکا ہوگا۔ میرے لال! تم کہاں چلے گئے ہو۔ تم کہاں ہو میرے بیٹے اُس وقت باہر دروازے پر کسی نے آواز دی۔ عالی کے ابا بھاگے گئے۔ ڈاکیا گھر تھا۔ وہ عالی کے ابا کو ایک خط دے کر چلا گیا۔ یہ خط ہوٹل کے مالک کا تھا۔ اُس نے لکھا تھا:

کل رات آپ کے بیٹے نے ہمارے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اُس کا بل تین روپے سوا بارہ آنے ہے۔ اُس نے بل ادا نہیں کیا۔ اس لیے آپ یہ بل ادا کر دیں۔ نہیں تو ہم کوئی اور کارروائی کریں گے۔

عالی کے ابا فوراً اندر آئے اور عالی کی امی کو خط پڑھ کر سنایا۔ وہ خوش ہو کر بولیں: ابھی شہر جائیے۔ اللہ نے چاہا تو میرا لال ضرور مل جائے گا۔ عالی کے ابا شہر پہنچے۔ ہوٹل کے مالک نے بتایا کہ آپ کے لڑکے نے شاید سینما دیکھا تھا۔ کیوں کہ شو ختم ہونے کے بعد ہمارے ہوٹل میں آیا اور اس کے ساتھ تین اور لڑکے تھے۔ ایک لمبا تھا، ایک موٹا اور ایک پتلا سا لڑکا۔

عالی کے ابا نے بل کی رقم ادا کر دی اور پھر قصبے میں لوٹتے ہی بھاگے بھاگے سکول پہنچے۔ ہوٹل کے مالک نے تینوں لڑکوں کے جو حلیے بتائے تھے، اُن سے عالی کے ابا کو پتا چل گیا تھا کہ یہ ضرور عالی کے آوارہ دوست ہوں گے۔ سکول آ کر عالی کے ابا نے رفیق کو ساتھ لیا اور ہیڈ ماسٹر سے ملے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے رفیق سے ان لڑکوں کے نام اور اُن کی جماعتیں پوچھیں۔ اور پھر مکھی چوس اور دوسرے دونوں لڑکوں کو بلوایا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے مکھی چوس، موٹے اور لمبے لڑکے سے پوچھا۔ پہلے تو وہ انکار کرتے رہے لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب جب مولا بخش کو حرکت میں لائے تو تینوں مان گئے اور صاف بتا دیا کہ عالی پانچ روپے لے کر آیا

تھا۔ اُنھوں نے مل کر تاش کھیلے۔ کھیلنے کے بعد سنیما دیکھنے گئے۔ وہاں ہوٹل میں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد وہ تینوں کھسک گئے اور عالی ہوٹل میں بیٹھا رہا۔ وہ سب اپنے گھر آ گئے۔ اُس کے بعد اُنھیں معلوم نہیں کہ عالی کہاں گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ان لڑکوں کو سخت سزا دی۔ پھر ان کے والدین کو اطلاع دی اور تینوں کو سکول سے نکال دیا۔ عالی کے ابا نے بار بار اُن لڑکوں سے پوچھا۔ اُنھیں پیار کیا۔ روپے پیسے کا لالچ بھی دیا کہ کسی طرح سے وہ عالی کے متعلق بتا دیں۔ لیکن وہ کچھ نہ بتا سکے۔ آخر عالی کے ابا نے تھانے میں اطلاع دے دی کہ یہ تینوں لڑکے عالی کو لے کر شہر گئے تھے اور وہیں اُسے غائب کر دیا۔ تینوں لڑکے تھانے بلوائے گئے۔ اُن کے والدین بھی۔ سب کے ماں باپ بہت پریشان تھے۔ تھانے میں بھی تینوں کو بہت مار پڑی۔ سارے قصبے میں ان کی بدنامی ہوئی۔ تھانے والوں نے بار بار اُنھیں پیٹا۔ بار بار پوچھا۔ لیکن وہ کچھ نہ بتا سکے کہ ہوٹل سے نکلنے کے بعد عالی کہاں گیا؟

عالی کے ابا مایوس ہو کر گھر لوٹے تو عالی کی امی کا بُرا حال تھا۔ پہلے تو اُنھیں یقین تھا کہ عالی کے ابا شہر گئے ہیں تو عالی ضرور ہوٹل میں یا کسی اور جگہ پر مل جائے گا۔ لیکن جب اُنھوں نے بتایا کہ ان کا بیٹا کہیں نہیں ملا اور نہ اُس کا کوئی پتا ہی چلا ہے تو امی جو پہلے ہی بیماری سے کمزور ہو چکی تھیں، بے ہوش ہو گئیں۔

جس وقت عالی کی امی بے ہوش ہوئیں، عین اُسی وقت عالی کو ہوش آ گیا۔ اس نے اپنے منہ سے میلی چادر ہٹا کر دیکھا۔ وہ ایک ویران جگہ پر پڑا تھا اس کے پاس بڑی بڑی مونچھوں والا ایک شخص بیٹھا تھا۔ پہلے تو عالی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کہاں ہے اور یہ شخص کون ہے۔ لیکن پھر اُس کو سب کچھ یاد آ گیا۔ پانچ روپے، لڑکوں سے تاش کھیلنا پھر شہر سینما دیکھنے جانا۔ ہوٹل میں کھانا۔ لڑکوں کا بھاگ جانا۔ پٹھان لڑکے اور ہوٹل کے مالک کی ڈانٹ، شہر کی سڑکوں پر پھرنا۔ اندھیرے میں ایک ویران جگہ پر جانا۔ ایک شخص کا آنا۔ مٹھائی کھلانا۔ نیند آنا اور ـــــ اور!

عالی کی خوف سے چیخ نکل گئی۔ اُس شخص نے فوراً عالی کی طرف دیکھا فوراً اُسے زور سے مکا مار کر بولا:

شور کرتا ہے تم ـــ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بڑا چاقو اپنی جیب سے نکالا اور بولا اب بولے گا تو ہم تم کو چاقو مارے گا۔ عالی نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں اور رونے لگا۔ وہ روتے روتے بولا:

مجھے چھوڑ دو۔ جی۔ مجھے چھوڑ دو۔ میری امی بیمار ہیں۔ میں ان کے لیے دوا لینے نکلا تھا۔ وہ بہت پریشان ہوں گی۔

منہ بند کرو۔ اس شخص نے عالی کی ماں کو گالی دے کر کہا۔

عالی چپ ہو گیا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا ایک دن مکھی چوس نے مجھے ماں کی گالی دی تھی تب میں نے اُسے بہت مارا تھا۔ لیکن اب یہ خوفناک آدمی مجھے گالیاں دے رہا ہے۔ اور میں کچھ نہیں کر سکتا۔۔۔۔ کچھ نہیں کر سکتا۔ عالی کا جی چاہتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ لیکن وہ شخص چاقو لیے بیٹھا تھا۔ عالی نے سوچا کہ رات کو اسی آدمی نے مجھے مٹھائی کھلا کر بے ہوش کر دیا تھا۔ اب یہ مجھے کہاں لے آیا ہے۔ اب یہ چاقو میرے پیٹ میں گھونپ دے گا اور مجھے مار ڈالے گا۔ یہ شخص اسی لیے مجھے یہاں لے آیا ہے۔ لیکن یہ جگہ کون سی ہے۔ عالی نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے اپنے اردگرد دیکھا۔۔۔۔ یہ تو جنگل ہے کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا۔ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔۔۔۔ یا اللہ! اب کیا ہو گا؟

ایک آواز سنائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی آدمی جلدی جلدی آ رہا ہے۔ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے پتوں پر اُس کے پاؤں پڑتے تھے تو سرسر کی آواز پیدا ہوئی تھی۔ عالی کے پاس بیٹھا ہوا خوفناک آدمی قدموں کی آواز سن کر خوش ہو گیا۔ اس نے عالی کی طرف دیکھ کر کہا:

اُٹھو!

عالی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

قدموں کی آواز بہت قریب آ گئی۔ اس شخص جیسا ایک اور آدمی درخت کے پیچھے سے ظاہر ہوا۔ دونوں نے ہاتھ ہلایا۔ پھر پہلے شخص نے عالی کو کھڑا کر دیا۔ آنے والے شخص نے اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے عالی کی ٹانگیں، کندھے، بازو اور ہاتھ ٹٹول کر دیکھے۔ پھر وہ آپس میں باتیں کرنے لگے، جنھیں عالی نہ سمجھ سکا۔ عالی کو یوں لگا جیسے وہ جھگڑ رہے ہیں۔ آخر آنے والے شخص نے اپنی میلی کچیلی بھاری بھرکم شلوار کے نیفے سے کچھ نوٹ نکال کر پہلے آدمی کو دیے۔ پہلے آدمی نے اپنا چاقو میلی چادر اور نوٹ سنبھالے اور چلا گیا آنے والے شخص نے جس کی صورت پہلے آدمی سے بھی زیادہ ڈراؤنی تھی، عالی کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا۔ پھر دھکا دے کر بولا:

چلو ہمارا ساتھ! عالی چپ چاپ ساتھ ہو لیا۔

☆☆☆☆

عطا شاد

میاں بیوی۔ شیر اور گیدڑ

ایک کسان تھا۔ اس نے جوار بوئی۔ جب فصل پک گئی ایک شیر آیا اور کھیت میں گھس گیا۔ کسان ایک چھپڑ پر بیٹھا ہوا تھا۔ شیر نے اسے کہا نیچے اُترو میں تمھیں کھا جاؤں گا۔

کسان نے کہا کہ ابھی تو میں دُبلا پتلا ہوں میں ذرا کھا پی کر موٹا ہو جاؤں تو مجھے کھا لینا۔

شیر روزانہ آتا اور کہتا میں تمھیں کھا جاؤں گا۔ کسان اس کے خوف سے لاغر ہوتا گیا، اس کی بیوی نے اس سے دریافت کیا کہ خوب کھا پی لیتے ہو مگر دُبلے ہوتے جا رہے ہو۔

کسان نے کہا ایک شیر روزانہ آتا ہے۔ مجھے ڈراتا ہے کہ میں تمھیں کھا جاؤں گا۔ میں اس لیے دُبلا ہو رہا ہوں۔ کسی نہ کسی دن شیر مجھے کھا ہی جائے گا۔ بیوی نے پوچھا شیر کس وقت آتا ہے۔ کسان نے کہا دوپہر کو۔

پھر اس کی بیوی نے مردانہ کپڑے پہنے گھوڑے پر سوار ہوئی، ہتھیار بھی اٹھا لیے۔ جوار کے کھیت میں آئی اس نے دیکھا کہ شیر اس چھپر کے نیچے کھڑا ہے بیوی نے آواز لگائی اے کسان!

کسان نے کہا جی مالک!

بیوی نے کہا بادشاہ نکلا ہے شیروں کے شکار کے لیے تم نے آس پاس شیر کے پاؤں کے نشان دیکھے ہیں۔ پچھلے سال کے یا اس سے بھی پہلے کے۔

کسان نے شیر سے پوچھا! اب بتاؤ کیا کروں تمھارے بارے میں بتاؤں یا نہ بتاؤں۔

شیر نے کہا، ہاں یہ بادشاہ کا وزیر ہے، شیر نے کہا اب مجھے ضرور بھگاؤ یہاں سے۔

کسان نے کہا تم چپ رہو۔ میں چادر تمھارے اوپر ڈال دیتا ہوں۔ شیر سو گیا اور کسان نے اس کے اوپر چادر ڈال دی پھر اس نے جواب دیا۔ اے سوار میں نے شیر کے پاؤں کے نشان نہیں دیکھے سوار نے پوچھا وہ موٹی کالی چیز کیا پڑی ہوئی ہے شال کے نیچے۔

کسان نے کہا یہ لکڑی ہے۔ میں نے اسے حقہ جلانے کے لیے رکھا ہوا ہے۔

بیوی نے کہا اس کا کچھ حصہ مجھے کاٹ دے دو۔ میں بادشاہ کے لیے لے جاؤں گا۔ وہ بھی حقہ پیتا ہے۔

کسان نے شیر سے پوچھا اب میں کیا کروں۔

شیر نے کہا، اب میرا کان کاٹ کر دے دو۔

کسان نے شیر کا کان کاٹ کر دے دیا۔

بیوی نے کہا اس سے ذرا بڑا ٹکڑا دے دو۔

شیر نے کہا اب دوسرا کان بھی کاٹ کر دے دو۔

کسان نے دوسرا کان بھی کاٹ کر دے دیا۔ بیوی نے غصے میں کہا اس سے بڑا ٹکڑا کیوں کاٹ کر نہیں دے دیتا اس لکڑی کے تنے سے۔ پھر شیر نے کہا اب میری دم کاٹ کر دے دو۔ دم بھی کاٹ کر دے دی۔

بیوی نے کہا تم تھوڑا سا کاٹتے ہو، تم چھوڑو میں خود کاٹ لوں گا۔ یہ سنتے ہی شیر بھاگ کھڑا ہوا، سامنے اس کے ایک گیدڑ آیا اس نے شیر سے پوچھا۔ تمھارے کان بھی کٹے ہوئے ہیں اور دم بھی۔ خون بہہ رہا ہے اور تم بھاگ رہے ہو۔ یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ شیر نے کہا کہ بادشاہ کی فوج نے مجھ پر حملہ کیا ہے۔ میرے کان کاٹ دیے ہیں اور دم بھی کاٹ لی ہے، بس خدا نے میری جان بچائی ہے۔

گیدڑ نے کہا اے بزدل تجھ کو ایک عورت نے ڈرایا ہے۔ نہ بادشاہ ہے نہ فوج ہے۔ ایک عورت نے تمھارے کان بھی کاٹ ڈالے اور دم بھی!

شیر نے کہا میں نے اپنی آنکھوں سے فوج اور وزیر دیکھا ہے، گیدڑ نے کہا یہ عورت تھی آؤ میں تمھیں دکھا دوں۔

شیر نے کہا تمھارے ساتھ چلتا ہوں ایک رسی تم اپنے گلے میں ڈالو اور اس کا ایک سرا میرے گلے میں بھی۔

پھر گیدڑ نے رسی اپنے گلے میں اور شیر کے بھی گلے میں ڈالی اور دونوں ساتھ ساتھ چلے۔ سوار نے دیکھا کہ شیر کو گیدڑ کھینچتا ہوا لا رہا ہے۔ اس نے گیدڑ سے پوچھا کہ تم نے بادشاہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں چودہ شیر تمھارے پاس لاؤں گا۔ اب صرف ایک لے کر آ رہے ہو۔ وہ بھی کان کٹا۔

یہ سنتے ہی شیر بھاگ کھڑا ہوا اور گیدڑ کو گھسیٹتا چلا گیا۔ گیدڑ کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ ٹانگیں بھی ٹوٹ گئیں اور مر گیا، شیر اپنے کٹے ہوئے کان اور دم کے بغیر بھاگا۔

کسان اور اس کی بیوی جوار کے کھیت میں خوشی خوشی رہنے لگے۔

☆☆☆☆

غلام عباس

عرب بچے

چاندنی رات ہے۔ ہر طرف سناٹا ہے۔ جہاں تک نظر کام کرتی ہے۔ ریت دکھائی دیتی ہے۔ ایسے میں عرب سوداگروں کا ایک قافلہ اونٹوں پر مال اسباب لادے ستاروں کو دیکھ دیکھ کر راستہ معلوم کرتا ریگستان میں چلا آرہا ہے دور سے دیکھنے سے یہ قافلہ ایسا نظر آتا ہے۔ جیسے کوئی بہت لمبا سانپ بل کھاتا ہوا جا رہا ہو۔

سوداگروں اور ان کے غلاموں کے نیزے چاندنی میں چمک رہے ہیں۔ سب نے سفید ڈھیلا ڈھالا لباس پہن رکھا ہے۔ سر پر سیاہ فیتوں سے رنگین رومال باندھ رکھے ہیں۔ سب سے اگلے اونٹ پر اس قافلے کا سردار شیخ ہے۔ اس کے اونٹ کی مہار ایک بدو عرب نے پکڑ رکھی ہے۔ اور ساتھ ساتھ پیدل چل رہا ہے۔ وہ اپنی زبان میں کوئی گیت بھی گاتا جاتا ہے۔ سب اونٹ اس کی آواز پر مست معلوم ہوتے ہیں۔ اور آپ سے آپ اس کے پیچھے پیچھے چلے آتے ہیں۔

شیخ کے اونٹ کے قریب ہی ایک اور اونٹ ہے۔ اس پر ننھا سا خیمہ تنا ہوا ہے۔ جسے کجاوا کہتے ہیں۔ اس میں آٹھ نو برس کا ایک عرب لڑکا بیٹھا ہے۔ یہ شیخ کا اکلوتا بیٹا علی ہے۔ اس نے بھی اپنے باپ کی طرح عربی لباس پہن رکھا ہے۔

علی ایک قصبے میں اپنی ماں کے پاس رہتا تھا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ میں باپ کے ہمراہ قافلے میں سفر کروں۔ مگر شیخ جانتا تھا۔ کہ ریگستان کے سفر میں قافلے والوں کو کیا کیا مصیبتیں پیش آتی ہیں۔ اس لیے وہ ہمیشہ ٹال دیا کرتا۔ اس دفعہ جب شیخ سوداگر کا سامان لے کر جانے لگا۔ تو علی نے ساتھ چلنے کے لیے بہت ضد کی۔ رویا گڑگڑایا۔ اتفاق سے یہ سفر زیادہ لمبا نہ تھا۔ اس لیے اس نے علی کو بھی ساتھ لے لیا۔

اس وقت علی کجاوے میں بیٹھا بڑے شوق سے آس پاس کے نظارے دیکھ رہا ہے ریت کے اونچے نیچے ٹیلوں پر چاندنی عجب بہار دکھا رہی ہے۔ اونٹ کے چلنے سے ہچکولے لگتے ہیں۔ تو اسے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے جھولے میں بیٹھا ہے۔ عرب کا گیت لوری کا کام دے رہا ہے۔ اور اس کی آنکھیں آپ سے آپ بند ہوئی جا رہی ہیں۔

ایکا ایکی بدو چلتے چلتے ٹھہر گیا۔ اس کا ٹھہرنا تھا کہ سارا قافلہ رک گیا۔ بدو غور سے ایک طرف دیکھ رہا تھا۔ شیخ نے پوچھا۔ حمزہ کیا بات ہے؟

بدو نے زبان سے تو کچھ نہ کہا۔ انگلی سے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ شیخ غور سے اس طرف دیکھنے لگا اور چاندنی میں اسے کچھ سائے سے ہلتے نظر آئے۔ انہیں دیکھ کر شیخ گھبرا سا گیا۔ یہ ڈاکو تھے۔ گو شیخ کے ساتھ کافی آدمی تھے، وہ خود بھی بہادر تھا اور ڈاکوؤں کا مقابلہ آسانی سے کر سکتا تھا۔ لیکن اسے علی کی فکر تھی کہ کہیں لڑائی میں اسے صدمہ نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ سب لوگ چپ چاپ کھڑے رہیں۔

حکم کی دیر تھی ایسا سناٹا ہو گیا کہ معلوم ہوتا تھا سانس تک نہیں لے رہے۔ سب کے سب پندرہ بیس منٹ تک یونہی بت بنے کھڑے رہے۔ شاید ڈاکوؤں کی نظر ان پر نہیں پڑی وہ شکار کی تلاش میں اور طرف نکل گئے۔ صبح کو قافلہ چلا جا رہا تھا تو ایک جگہ علی کو کچھ درخت نظر آئے۔ ان کے پتے انوکھی وضع کے تھے۔ اور ان پر سنہری گیندیں سی لگی تھیں۔ اس نے یہ عجیب و غریب درخت کبھی نہیں دیکھے تھے۔ باپ کو پکار کر کہا۔ ابا یہ کیا پھل ہیں؟ یہ نہ تو نارنگیاں ہیں، نہ لیموں، نہ انار۔ پھر ہیں کیا۔

شیخ نے اپنے ایک غلام کو اشارہ کیا۔ وہ جھٹ سے تین چار پھل توڑ لایا۔ علی نے خوشی خوشی ایک پھل کو کاٹا۔ تو اس کے اندر سے راکھ کے رنگ کی مٹی نکلی۔ یہ دیکھ کر شیخ نے قہقہہ لگایا اور علی نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔ پھر شیخ نے کہا۔ دیکھا یہ ہے نتیجہ ظاہری شکل و صورت پر پھول جانے کا۔

دوپہر کے قریب اچانک ہوا بند ہو گئی۔ علی بار بار ہائے گرمی ہائے گرمی پکارنے لگا۔ شیخ کے چہرے پر گھبراہٹ ہے۔ مگر وہ اسے چھپانے کے لیے مسکرا مسکرا کر علی کو تسلیاں دے رہا ہے۔ بیٹا گھبراؤ نہیں۔ تھوڑی دیر میں ہم نخلستان میں پہنچا چاہتے ہیں۔ وہاں چھوٹا سا گاؤں بھی آباد ہے اور گاؤں کے لڑکے کھجور کے پیڑوں کے سائے میں ٹھنڈے پانی کے چشمے کے کنارے مٹی کے کھلونے بنا بنا کر کھیل رہے ہیں۔ تم بھی ان کے ساتھ کھیلنا اور دو لڑکوں کی کمر میں رسی باندھ کر انہیں گھوڑے بنانا اور خوب دوڑانا، خوب دوڑاؤ گے نا؟

گرمی پل پل میں بڑھتی جا رہی ہے۔ اے لو۔ گرم گرم ریت کے بگولے اٹھنے شروع ہو گئے۔ ہر طرف ریت ہی ریت اڑنے لگی۔ اونٹ آپ سے آپ رک گئے۔ سوار بہتیرا ہانک رہے ہیں۔ مگر وہ ایک قدم نہیں چلتے۔ انہیں معلوم ہے کہ ہم پر کیا مصیبت آنے والی ہے۔ بات یہ تھی کہ ریگستان کی زہریلی آندھی جسے 'بادِ سموم' کہتے ہیں۔ اٹھنی شروع ہو گئی تھی۔

شیخ نے فوراً حکم دیا کہ، اسی وقت سب اونٹوں کو گھٹنوں کے بل بٹھا دیا جائے۔ اور ان پر سے تمام اسباب اتار لیا جائے یہ سنتے ہی شیخ کے غلام جلدی جلدی اونٹوں پر سے سامان اتارنے لگے۔ ریشمی کپڑوں کے تھان، قہوہ اور کھجوروں کے بورے۔ گٹھڑیاں جن میں سونے چاندی کے زیور، جواہرات، ہاتھی دانت کے کھلونے، شتر مرغ کے پر، خوشبو دار مصالحے ورایسی ہی سوداگری کی اور چیزیں تھیں، سب اتار لی گئیں اور ریت پر ان کا ایک بہت اونچا ڈھیر لگا دیا گیا۔ پھر شیخ علی کو گود میں لے کر اس کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ اور اسے اپنی چادر میں چھپا لیا۔ دوسرے لوگ بھی اسی ڈھیر کے پاس آ بیٹھے۔ اور سب نے اپنے اپنے سر اور منہ چادر میں لپیٹ لیے۔

بے زبان اونٹوں نے خود بخود اپنی گردنیں ریت پر پھیلا دیں اور اپنی آنکھوں اور نتھنوں کو بند کر لیا تا کہ گرم ریت کے ذرے اندر نہ گھسنے پائیں۔ آندھی ہے کہ دم بدم بڑھتی ہی جاتی ہے اور ریت ہے کہ ننھے ننھے چھروں کی طرح کپڑوں میں سوراخ کر کر کے بدن میں گھستی چلی جاتی ہے۔ لیکن علی باپ کی گود میں چادر کے نیچے اس سے بالکل محفوظ ہے۔

ہر طرف اندھیرا چھا گیا ہے۔ اسباب پر گز گز ریت کی تہہ جم گئی۔ یہ بڑی ہی زبردست آندھی ہے۔ سب لوگ دعائیں مانگ رہے ہیں کہ الٰہی اس مصیبت سے نکال۔ آخر خدا خدا کر کے دواڑھائی گھنٹے کے بعد یہ طوفان تھما تو سب نے شکر کا کلمہ پڑھا۔

علی نے باپ کی گود سے نکل کر ادھر اُدھر نگاہ جو ڈالی تو حیران رہ گیا۔ باپ سے پوچھنے لگا۔ ابا یہ وہی جگہ ہے جہاں ہم اترے تھے؟

سچ مچ یہاں کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ جس جگہ پہلے ٹیلے تھے۔ وہاں اب ان کا نشان تک نہ تھا۔ جہاں ڈھلوانیں تھیں وہاں اونچے اونچے ٹیلے تھے۔ شیخ جیسا تجربہ کار شخص بھی جس نے اپنی عمر اسی ریگستان میں گزاری تھی نہیں بتا سکتا تھا کہ شمال کس طرف ہے اور جنوب کس طرف۔ مشرق کس طرف اور مغرب کدھر۔ یہ سب آندھی کی کارسانی تھی۔

نئی مصیبت یہ پڑی کہ اونٹوں پر سے سامان اتارنے کی افرتفری میں پانی کے مشکیزوں کے منہ کھل گئے تھے۔ اور سارا پانی ریت پر گر کر ضائع ہو گیا تھا۔ گو نخلستان یہاں سے قریب ہی تھا۔ مگر شیخ آندھی کی وجہ سے راستہ بھول چکا تھا۔

شیخ خود تو وہیں ٹھہرا ۔ اور اپنے غلاموں کو اونٹ دے کر چاروں طرف دوڑایا ۔ کہ جا کر راستہ معلوم کرو ۔ اور کوئی اور قافلہ ادھر سے گزر رہا ہو ۔ تو اس سے پانی لاؤ ۔ پیاس کے مارے سب کے حلق سوکھ رہے تھے اور پھر علی تو بچہ ہی تھا ۔ تھوڑی ہی دیر میں پانی کے بغیر اس کی حالت بری ہونے لگی ۔ پانی پانی کی رٹ لگانے لگا ۔ شیخ بیٹے کی حالت دیکھ کر کڑھتا اور اسے تسلی دیتا کہ بیٹا صبر کرو ۔ پانی ابھی آیا ہی چاہتا ہے ۔ علی یہ سن کر پل بھر کو چپ ہو جاتا ۔ مگر جب آس پاس سے کسی کو آتا نہ دیکھتا تو پھر وہی رٹ لگانے لگتا ۔ اسے کچھ کچھ حرارت بھی ہوگئی تھی ۔ اور آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں ۔

یکا یک اس نے چلا کر کہا ۔ آہاہا! ابا وہ دیکھو سامنے دریا لہریں مار رہا ہے ۔ میں وہاں جاؤں گا ۔

شیخ نے کہا ۔ بیٹا یہ دریا نہیں ہے ۔ تمہاری نظر دھوکا کھا رہی ہے ۔ ریگستان میں کسی کو سخت پیاس لگے تو ایسا دھوکا ہو جاتا ہے ۔ مگر جب قریب پہنچ کر دیکھتے ہیں ۔ تو ریت کے سوا کچھ نہیں ہوتا ۔

مگر علی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی ۔ کیونکہ اس کی آنکھیں تو صاف صاف دریا کو دیکھ رہی تھیں ۔ ناچار شیخ اسے وہاں لے گیا ۔ علی نے دیکھا تو سچ مچ پانی کا نشان نہ تھا ۔ وہ مایوس ہوگیا ۔ اور اس کی حالت پہلے سے بھی زیادہ بری ہونے لگی ۔ یوں تڑپنے لگا جیسے مچھلی پانی سے نکل کر تڑپتی ہے ۔

ناگہاں شیخ کو ایک طرف ایک دھبہ سا دکھائی دیا ۔ جو پل پل میں بڑا ہوتا جاتا تھا قریب آیا تو معلوم ہوا کوئی سانڈنی سوار چلا آتا ہے شیخ کے غلام دوڑ کر اس کے پاس گئے اور پانی کا مشکیزہ لے آئے ۔ اس عرصے میں علی بے ہوش ہو چکا تھا ۔ شیخ نے اس کا منہ کھول کر پانی کی بوندیں اس کے حلق میں ٹپکائیں ۔ تو اسے کچھ ہوش آیا ۔ لیکن پانی پیتے ہی وہ سو گیا ۔ شام کو اس کی آنکھ کھلی تو نخلستان میں تھا، جہاں کھجوروں کے جھنڈ تھے ۔ اور ٹھنڈے پانی کے چشمے جاری تھے ۔ اور ان کے قریب ہی کچے مکانوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی ۔

شیخ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی جان بچ جانے پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور علی نے کان پکڑے کہ پھر کبھی قافلے کے ساتھ جانے کا نام نہ لوں گا ۔

☆☆☆☆

فرخندہ لودھی

بہن بھائی

کسی زمانے میں، کہیں دو بہن بھائی رہتے تھے۔ بھائی کا نام سورج اور بہن کا سحر۔ دونوں بہن بھائی آپس میں بے حد محبت کرتے تھے۔ سورج سیر کرنے باہر نکلتا تو سحر بھی ساتھ ضرور جاتی۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے گھومتے پھرتے، ہنستے کھیلتے۔ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے۔ غرض بہت مزے کرتے تھے۔ سحر ہمیشہ سورج کے آگے آگے چلتی تھی۔

ایک دن دونوں باغ میں کھیل رہے تھے۔ سحر خوشی سے چہکتی پھرتی۔ کبھی اس کونے میں، کبھی اس گوشے میں اور سورج اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ درختوں پر چڑیوں کے جھرمٹ نے سحر اور سورج کو آتے دیکھا تو چڑچوں، چڑچوں کا الاپ کرنے لگیں۔ آ گئے۔ آ گئے۔ آ گئے۔ بہن بھائی آ گئے۔ ہم کو جگانے آ گئے۔ گیت سنانے آ گئے۔ کسی جھاڑی سے تیتر بولا، سبحان تیری قدرت۔ سبحان تیری قدرت۔ کسی ڈال سے فاختہ پکاری۔ اللہ ہو اللہ ہو ہدہد نے کہا میں کیوں پیچھے رہوں۔ مجھے بھی کوئی نغمہ الاپنا چاہیے۔ سورج آیا۔ سحر آئی ہے۔ میں بھی گیت گاؤں گا۔ پورا باغ گا رہا ہے۔ سو ہدہد میاں اپنی کلغی پھیلا پھیلا کر ورد کرنے لگے۔ حق ہو۔ حق ہو۔ توتی کی آواز سب سے الگ ہی تھی۔ وہ صرف اتنا کہتی تھی۔ تو ہی تو ہی تو ہی تو۔

سحر نے دیکھا کہ پورا باغ ان کے آنے کی خوشی میں جھوم جھوم کر گا رہا ہے۔ مگر باغ میں بہت سے پھول ہیں۔ دیسی پھولوں میں گلاب، گیندا، لیزی ڈیزی، ڈوگ فلاور، بلیو بیل، تھیاسن ہیں۔ ان میں رنگ تو تھے مگر مست کر دینے والی مہک نہ تھی۔ سحر نے دیکھا کہ کچھ جھاڑیاں چپ سادھے کھڑی ہیں۔ وہ دبے پاؤں ایک جھاڑی کے پاس گئی اور جھک کر ہولے سے کہا:

چنبیلی میری سہیلی۔ چل سیر کو چلیں۔

چنبیلی کی جھاڑی میں ایک ایک کر کے سارے پھول کھل گئے۔ چنبیلی نے کھلکھلاتے ہوئے کہا۔ چلو ابھی چلو۔

سورج بھی بہن کے پیچھے تھا۔ بہن کو چنبیلی کے ہمراہ دیکھا تو وہ بھی ایک جھاڑی پر جھک گیا اور آہستہ

سے بولا:

موتیے: میرے لنگوٹیے۔ چل سیر کو چلیں۔

موتیے کے خوشی سے قہہ قہہ کرتے سارے پھول کھل اٹھے۔

ہاں ہاں چلو، ابھی، چلو۔

چنبیلی سے خوشبو نکلی، موتیے سے مہک، دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سورج اور سحر کے ساتھ ہو لیے اور باغ میں ہر طرف خوشبو پھیل گئی۔ سحر چنبیلی کو گلے لگا کر کہتی تھی۔

چنبیلی میری سہیلی ہے۔

سورج موتیے سے لپٹ کر کہتا۔

موتیا میرا لنگوٹیا ہے۔

چاروں ساتھی خوب گھومے، خوب سیر کی۔ سورج تیز تیز چلتا تھا۔ گرمی بڑھ گئی تو سحر بے چاری تھک گئی۔ چھوٹی سی جان اب پیچھے گھسٹتی ہوئی چلتی تھی۔ آخر بولی۔

بھیا۔ میں تو چلی اپنے گھر آپ انھیں سیر کرائیں۔

اتنا کہا اور گھر کی طرف چل دی۔ اس کا گھر اس باغ کے گوشے میں تھا۔ وہ جاتے ہی سو گئی۔

اب سورج تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔ اس نے دور سے جمائی لی اور ساتھیوں سے کہا۔

دیکھو بھئی، اب میں تھک گیا۔ تھوڑا سا ستا لوں۔ چاہو تو تم بھی سو رہو۔

نہ بھیا۔ تم سوتے ہو تو سو جاؤ۔ ہم تو گلی گلی گھوم کر دیکھیں گے۔ کوچے کوچے جائیں گے۔ دنیا کیسی ہے، ہماری بہار کیسی ہے، یہی تو مہکنے کا وقت ہے۔ اچھا سورج بھیا: ہمیں نیند سے جگانے اور سیر کرانے کا شکریہ۔ چلتے ہیں شب بخیر۔

سورج نے اونگھتے اونگھتے کہا۔ شب بخیر اور سو گیا۔ اب رات ہو چکی تھی۔ ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ لوگوں نے گھروں میں بتیاں روشن کر لیں۔ باغوں کی روشنیوں پر قمقمے جل اٹھے۔ موتیا اور چنبیلی مہکتے پھرتے تھے۔ چہکتے پھرتے تھے۔ اچانک چنبیلی کسی عورت کے جوڑے سے لپٹ کر چیخی۔

بھیا بھیا میں یہاں ہوں۔

موتیا کسی منے کے گلے میں ہار بن کر جھول رہا تھا۔ جواب میں چلایا:

میں یہاں ہوں گلاب بھائی میرے ساتھ ہیں۔

بھیا: مزے میں ہو؟ چنبیلی نے پوچھا۔

ہاں بہت مزے میں۔ اور تم؟

میں بھی۔

دونوں کھیلتے رہے۔ گھومتے گھومتے تھک گئے اور سو گئے۔ پھر موسم بدل گیا۔

اب سورج اور سحر کی سنیے۔ وہ بھی کچھ کم کھلنڈرے نہ تھے۔ رات کو سورج کی اچانک آنکھ کھلی تو بڑا پریشان ہوا۔ میں بھی کتنا مست ہوں۔ پڑا سوتا ہوں۔ مجھے چلنا چاہیے مگر کیسے؟

رات ہے اندھیرا ہے۔ اب نکلا تو قیامت آجائے گی۔ لوگ خوف سے پاگل ہو جائیں گے۔ یہ تو اچھا نہیں ہوگا۔ کتنا وقت گزر گیا۔ وہ سوچتا رہا۔ ایک بارگی اسے خیال آیا۔ کیوں نہ بھیس بدلا جائے۔ سورج نے بھیس بدلا اور چاند بن گیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ سحر یاد آ گئی۔ اور آوازیں دینے لگا۔

سحر۔ سحر۔ بہنا: آ تو چاندنی بن جا۔ چل سیر کو چلیں۔ سحر تو خود بڑی سیلانی تھی وہ جھٹ سے چاندنی بن گئی اور چاند کی گود سے نکل کر ہر طرف پھیل گئی۔ باغوں میں، گھروں میں، سڑکوں اور پگڈنڈیوں پر، کھیتوں میں، دریاؤں پر۔ رات چپ تھی۔ کہیں خوشبو نہ کوئی مہک۔ ان کے دوست موتیا اور چنبیلی نہ معلوم کہاں چلے گئے تھے۔ چاندنی ان کے بغیر اداس ہو گئی۔ پھر ایک جگہ بہت بڑا جھاڑ نظر آیا۔ دھندلی روشنی میں صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہاں کچھ کلیاں سی تھیں۔ چاندنی چپکے سے جھاڑ کے پاس اتر گئی اور پوچھا۔

کیوں جی آپ کون ہیں؟

میں۔۔۔ میں۔۔۔ رات کی رانی ہوں، جھاڑ نے جھوم کر جواب دیا۔ چاندنی یہ نام سن کر خوشی سے بولی:

واہ واہ رات کی رانی جی: میرے سنگ سیر کو چلتی ہو۔ ابھی بات چاندنی کے منہ میں تھی کہ رات کی رانی کھل اٹھی اور اس کی خوشبو چاندنی کے ساتھ ساتھ سارے باغ میں بکھر گئی۔

لو جی۔ اب چاند کیوں پیچھے رہتا۔ پھرتے پھراتے اس کو بھی ایک دوست مل گیا۔ اس دوست کا نام تھا موگرا۔ موگرا بے چارہ کئی دنوں سے چاند کے انتظار میں تھا اور آنکھیں موندے پڑا تھا۔ اسے ضد تھی کہ چاند یار آئے تو آنکھیں کھولوں گا نہیں تو چپکا پڑا رہوں گا۔ چاہے کتنی راتیں گذر جائیں۔ چاند نے موگرے کو آنکھیں موندے دیکھا تو ہولے سے چاندنی سے کہا۔ جا۔ میرے یار کو بھی جگا۔

اچھا بھیا۔ چاندنی نے جواب دیا۔ اور پیڑ پر اتر گئی۔ چاندنی کا پاؤں پیڑ پر کیا پڑا۔ موگرے کی ساری آنکھیں پھول بن کر کھل گئیں۔ ان سے بھینی بھینی، پیاری پیاری خوشبو آنے لگی۔ چاند نے ہنستے ہنستے پوچھا۔

’’کیوں یار موگرے اب تو خوش ہوا۔‘‘

موگرے نے ہاں ہاں کہتے ہوئے سر کو جھٹکا۔ کئی پھول جھڑ کر زمین پر بکھر گئے۔

نیچے کھڑے ننھے منے بچوں نے اٹھائے اور جھولیاں بھر لیں۔

اب چاروں دوست بہت ہی خوش تھے۔ چاند اور چاندنی۔ رات کی رانی کی خوشبو اور موگرے کی مہک ہر طرف پھیل گئی تھی۔

پھر موسم بدل گیا۔ پہلے تو راتیں ٹھنڈی تھیں۔ اب دن بھی ٹھنڈے ہو گئے۔ پہاڑوں پر برف گرنے لگی۔ برف میں بسی ہوائیں چلنے لگیں۔ رات کی رانی اور موگرے کے پھول سردی سے ٹھٹھر گئے۔ تیز ہواؤں اور موسلا دھار بارش نے درختوں سے پتے گرا دیے اور جھاڑیوں سے پھول۔ خزاں آ گئی زردی چھا گئی۔

ایک صبح کیا ہوا سحر اور سورج حسبِ معمول سیر کو نکلے۔ سحر باغ کی روشنیوں پر ٹہل رہی تھی کہ اسے ایک ہچکی سنائی دی جیسے کوئی رو رہا ہو۔ سحر ٹھٹھک گئی اور گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا ہچکی دوبارہ سنائی دی۔ اب تو اس سے رہا نہ گیا۔ وہ آواز کی طرف لپکی چلی گئی۔۔۔۔ چلتے چلتے ایک جگہ اس کے قدم اپنے آپ رک گئے۔ رونے کی آواز ایک کیاری میں سے آ رہی تھی۔ شاید یہ کیاری پیازوں کی تھی۔ ڈنٹھل اور پتے بالکل پیازوں جیسے ہی تھے اور یہ سچ مچ رو رہے تھے۔ شبنم کے سے آنسو ڈنٹھل پر موتیوں کی طرح اٹکے ہوئے تھے۔ انہیں روتا دیکھ کر سحر کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اس نے کیاری کے پاس جا کر پوچھا۔

تم کون ہو؟ کیوں روتی ہو؟

کیاری سے آواز آئی۔

میں نرگس ہوں اپنی قسمت کو روتی ہوں۔ سال ہو گیا مجھ میں کوئی پھول نہیں کھلا۔ تم جانو پھول ہی میری آنکھیں ہیں۔ وہ نہیں تو میں اندھی ہوں۔ ان کے انتظار میں کھڑے کھڑے میں ٹھٹھر گئی ہوں، نرگس کی کہانی سن کر سحر کا جی بھر آیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پکارا۔

سورج بھیا۔ سورج بھیا۔ ادھر آنا۔ بھیا تم دور دور پھرتے ہو۔ نرگس رو رو کر بے حال ہو گئی۔ بھیا کچھ کر کہ یہ چپ ہو جائے۔

سورج نے قریب سرکتے سرکتے جواب دیا۔

سحر: تو ہنس دے تو یہ بھی ہنس دے گی۔

سحر تو مسکرا دی۔ سورج نے بہن کی طرف دیکھا اور بولا۔

نہیں بہنا: ایسے نہیں۔ ایسے، اور پھر زور کا قہقہہ لگایا۔

ہا-ہا-ہا،

نرگس کے ڈنٹھلوں پر پھول کھل گئے اور حیرت سے سورج کا منہ تکنے لگے۔

اب سحر نے دیکھا کہ نرگس نے اپنے آنسو پونچھ دیے ہیں اور فضا میں سر اٹھائے کھڑی ہے۔ اس کی کٹورا سی آنکھیں کھلی ہیں آنکھوں کے کٹوروں میں سورج کی زردی بھری ہے۔ ارد گرد کیا ہے: ارد گرد ---اجالا ہے۔ سویرا ہے۔ میں ہوں لیکن مجھے تو نیند آ رہی ہے، سحر نے اپنے آپ سے کہا اور سونے کے لیے گھر کی طرف چل دی اسے پھر آواز سنائی دی۔

مجھے آنکھیں دینے والو---شکریہ--شکریہ---،،

یہ آواز نرگس کی تھی جو کئی دن تک باغ میں گونجتی رہی۔

☆☆☆☆

معراج

بارش برسانے والی

ہم بندروں کی فلم اتار کر اپنے گھر جا رہے تھے۔ میری بیوی رومانہ میرے برابر ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ گرمی بے حد شدید تھی۔ پسینے سے ہماری قمیص تر بتر ہو گئی تھی۔ مجھے تو یوں لگتا تھا کہ جیسے کسی نے میرے اوپر پانی کا جگ انڈیل دیا ہو۔ جہاں سے ہمارا ٹرک گزرتا، گرد و غبار کا بادل سا چھا جاتا۔ ہم نے زندگی میں پہلے کبھی اتنا گرم علاقہ نہیں دیکھا تھا۔ درختوں پر گرد و غبار کی تہیں جمی ہوئی تھیں اور جنگلی جھاڑیاں تو بالکل خشک ہو کر رہ گئی تھیں۔

رومانہ نے پسینا پونچھتے ہوئے کہا: ”شاید یہاں بہت دنوں سے بارش نہیں ہوئی۔“

ہم ایک گاؤں میں پہنچے۔ گھروں کی دیواریں کچی مٹی کی بنی ہوئی تھیں اور چھتوں کی جگہ گھاس پھونس کا چھپر تھا۔ ہم گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے تک گھوم پھر لیے، لیکن ہمیں کوئی شخص دکھائی نہ دیا۔ اللہ اللہ کر کے ایک بے حد ضعیف بڑھیا پر نظر پڑی جو ایک سائبان کے نیچے کھڑی تھی۔ رومانہ نے کہا:

”ذرا اس سے پوچھو تو سہی کہ گاؤں کے لوگ کہاں چلے گئے ہیں؟“

میں نے سواحلی زبان میں پوچھا۔ وہ میری بات سمجھ گئی اور بہت کم زور آواز میں بولی:

”میں کئی دنوں سے بھوکی ہوں اور بارش بھی نہیں ہوئی۔“

میں نے فوراً تھیلے میں سے ڈبل روٹی، بھنا ہوا گوشت اور قیمہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ بڑھیا کھانے پر ٹوٹ پڑی، جب اس کا پیٹ بھر گیا تو اس نے دو تین گلاس پانی پیا۔

میں نے اپنا سوال دہرایا: ”گاؤں کے لوگ کہاں چلے گئے ہیں؟“

بڑھیا خاموش رہی۔ میں سمجھ گیا کہ بڑھیا جان بوجھ کر میرے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی۔

اب رومانہ کی باری تھی۔ اس نے بڑھیا کے بازو کو نرمی سے پکڑا اور بہت محبت سے کچھ پوچھنے لگی:

میں ہنس کر بولا: ”اس کے بعد میرا اور تمھارا اللہ حافظ ہے۔ پتا نہیں کہ غضب ناک لوگ ہمیں دفن کر دیں یا بھون بھان کر کھا جائیں۔“

لیکن شوق کا کوئی مول نہیں ۔ ہم جان کی پروا کیے بغیر دریا کی طرف چلے ۔ ابھی ہم تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ایک لڑکا دوڑتا ہوا ہماری طرف آیا ۔ شاید بڑھیا نے اسے ہماری رہ نمائی کے لیے بھیجا تھا ۔ لڑکے کی ایک ٹانگ میں نقص تھا اس لیے وہ لنگڑا کر چل رہا تھا ۔ اس نے سہارے کے لیے ایک چھڑی لے رکھی تھی ۔ اس جسمانی معذوری کے باجود وہ بہت تیزی سے چل رہا تھا ۔

ہم کیلوں کے جھنڈ کے پاس سے گزرے ۔ یہ جھنڈ پانی نہ ہونے کی وجہ سے سوکھ کر خشک اور بے جان ہو رہا تھا ۔ ہم پسینے سے شرابور ہو گئے ۔ اوپر تانبے کی طرح زرد اور تپتا ہوا آسمان ، نیچے گرم ریت ہم ایک گھنٹے تک چلتے رہے ۔ آخر ہم دریا کے کنارے پہنچ گئے ۔

دریا بالکل خشک پڑا تھا ۔ اس کے کنارے کہیں کہیں سبز گھاس ضرور تھی ۔ لوگوں نے کھود کھود کر دریا میں گڑھے بنا رکھے تھے ۔ ان گڑھوں میں گدلا سا پانی جمع تھا ۔ یہی پانی یہ جنگلی لوگ پینے کے لیے میں استعمال کرتے تھے ۔

دریا کے کنارے ایک بہت بڑا انجیر کا درخت تھا جو آس پاس کے سب درختوں کے اوپر چھایا ہوا تھا ۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے بہت سے درختوں کو کسی دیو نے مروڑ کر ایک جان کر دیا ہے ۔ اس درخت کے نیچے گاؤں کے لوگ جمع تھے ۔ ان سے کچھ فاصلے پر عورتیں جھرمٹ بنائے بیٹھی ہوئی تھیں ۔ شاید عورتوں کو اس تقریب سے دور رکھا جاتا تھا ۔

جو لڑکا ہمیں لایا تھا وہ بھی ہمارا ساتھ چھوڑ کر چلا گیا ۔ میں نے جلدی سے رومال نکالا اور رومانہ کی آنکھوں پر باندھ دیا ۔

میں نے کہا: ”تم یہ ظاہر کرنا کہ تمھیں کچھ نظر نہیں آ رہا ہے ۔“

رومانہ کو رومال باندھ کر بھی ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی ۔ اس نے بہت اچھی اداکاری کی ، دو تین جگہ ٹھوکریں کھائیں اور ایک جگہ تو لڑکھڑا کر گرنے لگی ۔

جب ہم نزدیک پہنچے تو ڈھول بجنے کی آواز اور لوگوں کا شوروغوغا اتنا بڑھ گیا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ۔

لوگ حلقہ بنائے کھڑے تھے ۔ درمیان میں سات آدمیوں کا گروہ دائرے کی شکل میں گھوم رہا تھا ۔ انھوں نے مختلف قسم کے زیور پہن رکھے تھے ۔ پاؤں میں گھنگرو پہنے ہوئے تھے ۔ جب وہ ناچتے کودتے تو

گھونگرو اور جھانجھر بجنے سے ایک عجیب سا شور پیدا ہوتا۔

ان کے درمیان میں ایک بوڑھی عورت ہاتھ میں ''کالاباش'' یعنی موٹا سا سونٹا لیے ہوئے تھی۔ وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ ساتھ اچھل کود رہی تھی۔ یہی جادوگرنی گوگول تھی، بارش برسانے والی جوگن۔ پہلے وہ دو چار قدم آگے بڑھتی، پھر پیچھے ہٹ جاتی۔ اس نے ایک لمبی سی پھول دار چادر پہنی ہوئی تھی۔

ڈھول کی تھاپ کے ساتھ ساتھ بڑھیا گوگول کا جسم کبھی کبھی آگے کو جھک جاتا، کبھی وہ سیدھی کھڑی ہو جاتی، کبھی دائیں بائیں جھولنے لگتی۔

مجمع سے ایک آواز ہو کر بہت سے لوگ بولے: ''ڈانگا ڈو ماما..... ڈانگا مانما؟'' (یعنی بارش ہوگی ماں؟ بارش ہوگی؟)

بہت دیر تک سوال و جواب کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ مجمع میں موجود لوگ سوال کرتے اور بڑھیا چیختی ہوئی آواز میں انھیں یقین دلاتی کہ بارش ضرور ہوگی۔

میں بڑھیا کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس پر کوئی دورہ سا پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں۔ آنکھوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔ اس کا جسم تھرکنے لگا۔ آخر وہ زمین پر گر پڑی اور لوٹ پوٹ ہونے لگی۔

لوگوں کے لہجے میں تیزی آنے لگی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ان کا مطالبہ اب شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس وقت ہم دونوں بے حد خوف زدہ ہو گئے ہم نے اپنے گائیڈ کو ساتھ لیا اور گاؤں کی طرف واپس چلے۔

''وہ عورت کون تھی؟ کیا وہ کوئی جادوگرنی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ لڑکا بولا: ''وہ بارش برسانے والی ہے۔ وہ اپنے جنتر منتر سے بارش برساتی ہے۔''

رومانہ اور میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک ابر کا ٹکڑا دکھائی دیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی غائب ہو گیا۔

میں نے پوچھا ''اگر بارش نہ ہوئی تو پھر کیا ہوگا؟''

گائیڈ بولا: اگر بارش نہ ہوئی تو پھر ہم دوسری جادوگرنی کی خدمات حاصل کریں گے۔''

''اور اس جادوگرنی کا کیا ہوگا؟'' میں نے دریافت کیا۔

لڑکا بولا: ''اُسے جانا پڑے گا۔''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

لڑکے نے کندھے اچکا کر کہا: ''زمین کے اندر چھ فٹ نیچے یا پھر لوگ اسے بھون بھان کر کھائیں

گے۔''

دہشت کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر پھر گیا۔

اگلی صبح سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی ہم بیدار ہو گئے۔ زمین بالکل خشک پڑی تھی بلکہ دھوپ کی شدت سے چیخ گئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ پھر میں گاؤں کی سیر کو نکل گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ان جنگلی لوگوں نے جادوگرنی کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے، کیوں کہ اس کا جادو ابھی تک کارگر ثابت نہیں ہوا تھا۔

گاؤں کے لوگ اپنے اپنے کام کاج میں مصروف تھے۔ میں نے ایک لڑکی سے پوچھا: ''کیا تم مجھے جادوگرنی کی جھونپڑی تک لے جا سکتی ہو؟''

وہ لڑکی ساحلی زبان سے ناواقف نکلی۔ پھر ایک عورت دکھائی دی۔ وہ اپنے گھر کے سامنے جھاڑو لگا رہی تھی۔

میں نے پوچھا: ''کیا تم جانتی ہو کہ جادوگرنی اس وقت کہاں ہے؟''

اس عورت نے ایک جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔ میں جلدی سے دوڑتا ہوا اس جھونپڑی میں پہنچا، اندر اندھیرا تھا۔ میں فرش پر لیٹی ہوئی عورت سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ یہ جادوگرنی گوگول تھی۔ اس کا سانس ابھی تک چل رہا تھا۔ میں اس کی خیریت دریافت کر کے جلدی واپس لوٹا۔

رومانہ جاگ رہی تھی: ''کہاں گئے تھے؟''

میں نے کہا: ''ذرا گاؤں تک، جادوگرنی کی خیریت دریافت کرنے گیا تھا۔''

ناشتا کر کے ہم واپس لوٹے۔ رومانہ جنگلی ڈانس کی فلم بنانا چاہتی تھی۔ اس نے ایک بوڑھے شخص سے فرمائش کی۔

وہ بولا: بی بی جی! ناچ رنگ تو خوشی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بارش نہ ہونے سے قحط پڑا ہے۔ بارش نہ ہو گی تو ناچ گانا بھی نہیں ہو گا۔''

دو دن اور گزر گئے۔ بارش کا دور دور تک کوئی پتا نہیں تھا۔ جادوگرنی سے متعلق ہماری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ جادو ٹونے، جنتر منتر لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ہوتے ہیں جب جادو ناکام ہو جاتا ہے تو یہ لوگ ان جادوگروں کو جان سے مار ڈالتے ہیں۔

ہمارے ڈرائیور نے کہا: ''بابو صاحب! کل صبح سویرے ہم یہاں سے واپس روانہ ہو جائیں گے''

میں نے حیرانی سے کہا: ''ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ''

وہ بولا: ''یہ لوگ بہت وہمی ہیں۔ اگر بارش نہ ہوئی تو یہ لوگ اسے ہماری نحوست سمجھیں گے اور ممکن ہے کہ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ہماری قربانی پیش کر دیں۔ اگر کل تک بارش نہ ہوئی تو جادوگرنی کی موت تو یقینی ہے۔ ''

اس شام ڈھول کی آواز سنائی دی۔ یہ جنگلی لوگ عموماً اندھیری راتوں میں ڈھول بجاتے ہیں۔ اس بے وقت کی راگنی سے مجھے بے حد تشویش ہوئی۔ صاف ظاہر تھا کہ جادوگرنی گوگول اب کچھ دیر کی مہمان ہے۔ آدھی رات تک اگر بارش نہ ہوئی تو اس کی قربانی دے دی جائے گی۔

اچانک میرے چہرے پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور درد کی لہر محسوس ہوئی۔ میں اچھل پڑا اور بے اختیار چلایا: ''بارش..... بارش ہونے والی ہے۔ ''

شاید لوگ سمجھے ہوں گے کہ مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہے، لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا اور پھر زور سے چیخا:

''بارش ہونے والی ہے۔ ''

یہ کہہ کر میں باہر کی طرف دوڑا۔ میرے پیچھے پیچھے رومانہ، ڈرائیور اور میرے دو خدمت گار تھے۔

یہ کوئی جادو ٹونا نہیں ہے۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا علم ہر کسی کو نہیں ہوتا صرف جاننے والے لوگ آثار دیکھ کر آنے والے واقعات کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ مرے ساتھ یہ واقعہ ہوا تھا کہ ایک موٹر کار کے حادثے میں میرا رخسار بری طرح زخمی ہو گیا تھا جس کی وجہ سے چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ پلاسٹک سرجری سے چہرہ اپنی اصل شکل میں واپس آ گیا تھا، لیکن اس وقت سے لے کر اب تک جب بھی کبھی موسم میں نمی زیادہ ہوتی بارش کے آثار ہوتے مجھے یوں محسوس ہوتا کہ ہزاروں چیونٹیاں میرے چہرے پر رینگ رہی ہیں۔ میرا چہرہ نم دار موسم سے بے حد حساس ہو گیا تھا۔

میں گاؤں سے باہر دیو قامت انجیر کے درخت کے پاس پہنچا، وہاں لوگ ڈھول کی تھاپ پر ناچ رہے تھے۔ ناچنے والوں کے جسم آگ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ جادوگرنی گوگول ان کے درمیان ایک چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں سر کو ادھر ادھر پٹختی۔ کبھی اس کا جسم مچھلی کی طرح تڑپنے لگتا۔ کبھی

وہ پتھر کی طرح ساکت ہو جاتی۔ میں مجمع میں شامل ہو گیا اور ان کے ساتھ ناچنے کودنے لگا۔ میرا جسم، میرے ہاتھ پاؤں اب میرے اختیار میں نہیں رہے تھے بلکہ خود بخود ڈھول کی تھاپ کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہے تھے۔

میں آہستہ آہستہ بڑھیا کے نزدیک جا پہنچا۔ میں نے اس کے کان میں آہستہ سے کہا: ''اماں! بارش ہونے والی۔''

بڑھیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں سمجھا کہ شاید بڑھیا بے ہوش ہو گئی ہے۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر بڑھیا کی پیشانی پر تھپکی دی۔ عورت نے بہت آہستگی سے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ میں نے پھر کہا: ''اماں! بارش ضرور ہوگی۔''

وہ بھی جواب میں کچھ بڑبڑائی۔ میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ شاید اس نے بھی اپنی زبان میں بارش ہی کہا ہوگا۔

پھر وہ آہستہ سے اٹھی اور کھڑی ہو گئی۔ میں نے اسکی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے بھی مجھے گھور کر دیکھا۔ بڑھیا نے اپنی کبڑی کمر پر دو چار ہاتھ مارے۔ اسی وقت میں اس راز کو جان گیا۔ بڑھیا کی کمر میں درد ہو رہا تھا اور یہ درد بارش آنے کی اطلاع تھی۔

سب بڑے بڑے جادوگروں کی طرح وہ بھی دکھاوے کے فن میں ماہر تھی۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ میری کمر درد ہو رہا ہے اس لیے بارش ہونے والی ہے۔ جب وہ ناچ رہی تھی تو اس کے ساتھ ساتھ دو چار ہاتھ اپنی کمر پر بھی مار لیتی۔ لوگ سمجھے کہ یہ بھی ناچ کا حصہ ہے۔ ہم دیوانوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ گرمی اور شعلوں کی تپش سے ہم پسینے میں شرابور ہو گئے۔ ایڑی چوٹی تک میں پسینے میں بھیگ گیا۔ یہی حال میرے ان ساتھیوں کا بھی تھا جو ناچ رہے تھے۔

اچانک ایک گڑگڑاہٹ سنائی دی اور پھر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے بہت سی توپوں کے گولے داغے گئے ہوں۔ ناچنے والے، ڈھول بجانے والی، بوڑھے، مرد، عورتیں، بچے اور جوان سب خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ سب لوگ خوشی سے ہنس رہے تھے۔ چیخ رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے۔ بارش کا پہلا قطرہ گرتے ہی سب لوگ جادوگرنی کے سامنے سجدہ میں گر گئے۔ میں رومانہ اور تین چار لوگ وہاں سے پیچھے ہٹ گئے۔

ایک بوڑھا نفرت سے بولا: ’’اللہ کے سوا کسی بھی چیز کو سجدہ کرنا جائز نہیں۔ ‘‘

جب بارش تیز ہو گئی، سوکھی زمین سیراب ہو گئی، ریت اور مٹی کیچڑ میں بدل گئے تو ہم ان لوگوں کو جشن مناتا ہوا چھوڑ کر اپنے خیمے کی طرف واپس چلے گئے۔

رومانا اپنے بستر میں لیٹی ہوئی تھی۔ باورچی نے چائے تیار کی اور بڑے بڑے مگوں میں ڈال کر ہمارے سامنے پیش کی۔ عین اسی وقت جادوگرنی گوگول بھی خیمے کے اندر داخل ہوئی۔ وہ سر سے پاؤں تک پانی میں شرابور ہو رہی تھی۔

جادوگرنی نے مگ اٹھا کر چائے میں چار پانچ چمچے دودھ ملایا، بہت سی شکر ڈالی پھر اس میں ایک چمچہ کوکو پاؤڈر ملایا۔ وہ اس آمیزے کو چسکیاں لے لے کر پینے لگی۔ مجھے تو یہ دیکھ کر ہی گھن آ رہی تھی۔

میں نے بڑھیا کو شکر کا ڈبا، چائے کا پیکٹ اور خشک دودھ کی تھیلیاں دیں۔ اس نے مجھے نسوار کی ڈبیا دی۔ ایک چٹکی نسوار سونگھتے ہی مجھے چھینکیں آنے لگیں۔

آخر اس نے ہمیں الوداع کہا اور سونے کے لیے چلی گئی۔ اس کے جادو کا پردہ اٹھ چکا تھا۔ اس نے جو اداکاری کی تھی وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

☆☆☆☆

میرزا ادیب

نواب صاحب کا قالین

نواب احمد کمال بڑی جابر طبیعت کے آدمی تھے۔ کوئی بات بھی اپنی مرضی کے خلاف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ کسی میں بھی اتنی جرأت نہیں تھی کہ اُن کے حکم کو ٹال سکے۔ امیر و وزیر، سوداگر، بڑے آدمی۔۔۔ سب کے سب ان سے ہر وقت خوف زدہ رہتے تھے کیوں کہ اُن کی طبیعت بدلتے دیر نہیں لگتی تھی۔ ویسے خوش بیٹھے ہیں مگر جیسے ہی اُن کی طبیعت میں کچھ فرق پڑا سارا نظام ہی تہس نہس ہو گیا۔ نواب صاحب کو عمدہ اور خوب صورت قالینوں سے بڑی محبت تھی۔ دور دور سے قالین منگواتے تھے اور انھیں نہایت احتیاط کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ کسی قالین پر کوئی داغ پڑ جاتا تو وہ بے چین ہو جاتے اور جب تک نیا قالین اس قالین کی بجائے نہ بچھ جاتا انھیں لمحہ بھر کے لیے بھی سکون میسر نہ ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ سب درباری اور خدام قالینوں پر قدم بھی نہیں رکھتے تھے اور اگر رکھتے تھے تو انتہائی احتیاط کے ساتھ۔

ایک دفعہ اُن کے ہاں بخارا سے قالین آیا۔ نہایت شان دار اور رنگین۔ اتنا خوبصورت کہ انسان اسے دیکھتا ہی رہ جائے۔۔۔ یہ قالین انھوں نے اپنے خاص کمرے میں بچھا دیا اور نوکروں کو حکم دے دیا کہ خبردار کوئی شخص ننگے پاؤں کبھی ادھر نہ آئے۔ بھلا کسی کو کیا پڑی تھی کہ قالین پر قدم رکھ کر اپنی جان خطرے میں ڈالتا۔ مگر بدقسمتی کا کیا علاج۔ ایک دن کی بات ہے کہ ایک نوکر جس کا نام شیرو تھا۔ گھر کے دروازے پر بیٹھا دوات میں سیاہی گھول رہا تھا کہ اُسے اپنے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ پریشانی کے عالم میں اُدھر پہنچا جدھر سے آواز آ رہی تھی۔ اس کا بچہ نواب صاحب کے خاص کمرے میں کھڑا تھا۔ شیرو کو اس بات کا خیال ہی نہ رہا کہ اُسے قالین پر ہرگز قدم نہیں رکھنا چاہیے۔ خاص طور پر اس وقت کہ اُس کے ہاتھ میں سیاہی سے بھری ہوئی دوات بھی ہے۔ بچہ کمرے کے درمیان میں کھڑا تھا۔ شیرو اس کے پاس پہنچا اور اسے گود میں اٹھانے لگا۔ اچانک دوات چھلکی اور سیاہی کے چند قطرے قیمتی قالین پر گر پڑے۔ بچہ بتانے لگا کہ اس کی گیند اس کمرے میں کہیں کھو گئی ہے لیکن اس وقت اسے گیند کا خیال کیوں کر آ سکتا تھا اُسے تو اپنی زندگی خطرے میں نظر آ رہی تھی: اُسے اور تو کچھ نہ سوجھا جھٹ جیب سے رومال نکالا اور قالین کے داغ والے حصے کو چھپا دیا۔ آنے کو تو وہ اپنے

کمرے میں آ گیا مگر خوف سے اُس کا بُرا حال تھا۔ دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا کہ اب کیا کرے اور کس طرح جان بچائے۔ یہ تو ظاہر تھا کہ جیسے ہی نواب صاحب کو اس بات کا علم ہوتا ان کا بُرا حال ہو جاتا اور اس حالت میں نہ جانے کیا حکم دے دیتے۔ مار ڈالنے کا حکم بھی دے دیتے تو اُن سے کچھ اُمید نہیں تھا۔

آدمی کسی بات پر غور کرے تو کچھ نہ کچھ اُسے سوجھ ہی جاتا ہے۔ اُسے بھی سُوجھ گیا کہ شہر میں ایک ایسا ماہر شخص بھی رہتا ہے جو داغ دھبے صاف کرنے میں کمال رکھتا ہے۔ کیوں نہ اُس سے کھل کر بات کر لی جائے۔ ضرور اُس کے دل میں رحم آ جائے گا اور اُس کی جان بچ جائے گی یہ سوچ کر وہ اُس آدمی کے پاس گیا۔

جمیل آغا: شیرو نے بڑی عاجزی سے اُسے مخاطب کیا۔

کیا بات ہے شیرو: پریشان کیوں نظر آتے ہو؟''

شیرو نے سارا قصہ بیان کر دیا۔

جمیل آغا خاموش رہا اور ابھی کچھ دیر اور خاموش رہتا کہ شیرو کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ یہ دیکھ کر جمیل آغا کہنے لگا:

جانتا ہوں اس وقت تمھارے دل کی کیا کیفیت ہے۔ میں ضرور تمھاری مدد کروں گا۔

شیرو جمیل آغا سے وعدہ کے مطابق نواب صاحب کے خاص کمرے میں پہنچ گیا اور ابھی اس نے قالین کے داغ دار حصے سے رومال ہٹایا ہی تھا کہ اپنے سامنے وہ آگ برساتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر بے اختیار کانپ اُٹھا۔ نواب صاحب شعلہ ناک نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

ہمارے قالین کو کس نے داغ دار کیا ہے نواب صاحب نے گرج کر کہا۔

جمیل آغا نے عرض کی:

حضور! یہ داغ بھی مٹ جائے گا۔ اسی مقصد کے لیے ہی تو میں یہاں آیا ہوں۔

ہم پوچھتے ہے یہ داغ ڈالا کیس نے ہے۔

جمیل آغا خاموش رہا۔

نواب صاحب نے بڑے غصے سے اپنی بات دہرائی۔ اس پر جمیل آغا نے کہا محترم آقا:

میرا کام داغ دور کرنا ہے داغ لگانے والے کا نام بتانا نہیں۔

نواب صاحب کے سامنے اتنی گستاخی آج تک کسی نے نہیں کی تھی ان کی آنکھوں سے شرارے برس

رہے تھے۔ تیسری بار اُنھوں نے مجرم کا نام پوچھا مگر جمیل آغا نے وہی جواب دیا۔

نواب صاحب دو تین لمحے خاموش رہ کر گرجے:

اگر دوپہر تک تم نے مجرم کا نام نہ بتایا تو تمھیں داغ دار قالین میں لپیٹ کر آگ لگا دی جائے گی۔ یہ ہمارا پہلا اور آخری حکم ہے۔

یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی اور لوگ بڑی بے صبری سے نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔

بہتوں کا خیال تھا کہ جمیل آغا ضرور اصل حقیقت بتا دے گا لیکن اس کا ارادہ ذرا بھی ڈانوا ڈول نہ ہوا۔ اُس نے جو کچھ کہا تھا، اُس پر جم کر کھڑا تھا۔

جو خبر سارے شہر میں جنگل کی آگ طرح پھیل چکی تھی وہ بھا شیرو کو کیوں نہ معلوم ہوتی۔ اس نے یہ خبر سنی اور گھر سے باہر نکل گیا۔

شہر میں صرف دو شخصوں کو اصل حقیقت کا علم تھا۔ ایک تو شیرو تھا جو مجرم تھا اور دوسرا شخص تھا جمیل آغا جو شیرو کی خاطر اپنی جان قربان کر رہا تھا۔

نواب صاحب اکیلے بیٹھے تھے کہ شیرو وہاں پہنچ گیا اور اُس نے سارا قصہ بیان کر دیا ابھی دوپہر ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ نواب صاحب نے ساری باتیں سن کر پوچھا:

تمھیں کونسی چیز یہاں میرے پاس کھینچ لائی ہے؟ شیرو نے بلا تامل جواب دیا: حضور مجرم میں ہوں وہ تو بے گناہ ہے۔

ہاں مجرم تم ہو۔

سزا مجھے ملنی چاہیے۔

درست کہا ہے تم نے۔۔۔ یہیں ٹھہرو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔

نواب صاحب کمرے سے نکل گئے۔ دوپہر ہوئی تو محل کے سامنے ایک میدان میں قالین کو آگ لگا دی گئی۔ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ جتنے لوگ وہاں کھڑے تھے، جمیل آغا کی تعریف کر رہے تھے کہ اُس نے کسی کی خاطر اپنی جان قربان کر دی ہے۔

جب قالین جل چکا تو نواب صاحب محل کے بڑے دروازے سے باہر نکلے۔۔۔ مگر یہ کیا۔ وہ اکیلے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ جمیل آغا بھی تھا اور شیرو بھی۔ تو قالین خالی تھا؟

تماشائیوں کی نظریں حیرت میں ڈوب گئیں۔

نواب صاحب تماشائیوں کے سامنے آ گئے اور جب اُن کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی تو آج پہلی مرتبہ ایک گرجتی ہوئی غضب ناک آواز کی بجائے ایک میٹھی آواز گونجنے لگی۔

”بھائیو! آج مجھے معلوم ہوا ہے کہ قالینوں کے مقابلے میں انسانیت زیادہ قیمتی ہے کیوں کہ انسان اپنے وعدے پر قائم رہتا ہے اور دوسرے کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔ یہ سبق مجھے ان دو شخصوں نے دیا ہے اور اس کے لیے میں ان کا ہمیشہ ممنون رہوں گا“۔

لوگوں نے نواب صاحب کو پہلی مرتبہ ایک سچے انسان کے رُوپ میں دیکھا اور خوشی سے اُن کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

☆☆☆☆

میراجی

بولا اور مارا گیا

ایک تھا بادشاہ۔ اس کا ایک لڑکا تھا۔ جسے تمام رعایا، شہزادہ دلیر کے نام سے پکارتی تھی کیوں کہ اس نے بچپن ہی میں بہت سے بہادری کے کام کیے تھے۔

جب وہ دس سال کا ہوا تو بادشاہ نے اس کے پڑھانے کے لیے ایک اُستاد نوکر رکھا۔

اس شہزادے کو بے ضرورت اور بہت بولنے کی عادت تھی۔ کسی وقت چپ نہ رہ سکتا تھا۔ اس کے اُستاد نے اسے کہا، چپ رہا کرو۔ خاموشی میں بہت سے فائدے ہیں۔

اب شہزادہ ہر وقت چپ رہا کرتا۔ صرف اپنے اُستاد سے بولتا چالتا۔ یا کبھی سخت ضرورت کے وقت معمولی بات چیت کرتا۔

جب وہ اچھی طرح علم حاصل کر چکا تو اپنے محل کو واپس آ گیا۔ لیکن ہر وقت چپ چاپ بیٹھا رہتا بادشاہ، ملکہ، امیر، وزیر اور درباری سب حیران تھے کہ شہزادے کو اس کے استاد نے کیا تعلیم دی ہے کہ ہر وقت بت بنا بیٹھا رہتا ہے۔ طرح طرح کے طریقے کیے، مگر شہزادے نے بات چیت نہ کی۔

آخر کار وزیر نے سوچ بچار کر بادشاہ کو صلاح دی کہ شہزادے کو شکار کے لیے جنگل میں لے جائیں تو شاید وہاں قسم قسم کی چیزیں دیکھ کر خوش ہو جائے اور بولنے چالنے لگے۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ اگر چہ اُمید نہیں مگر ہر طرح کی کوشش کرنی چاہیے۔ چناں چہ وزیر امیر مل کر شہزادے کے ساتھ شکار کو گئے۔

سارا دن مارے مارے پھرے، مگر کوئی شکار نہ آیا اور نا کام واپس پھرے، شہزادہ راستے میں بھی تمام دن کسی سے نہ بولا۔

شام کا جھٹ پٹا تھا۔ دم بدم اندھیرا بڑھتا جاتا تھا۔ پرندے شہر سے جنگل میں آ کر اپنے گھونسلوں میں بیٹھ رہے تھے۔ اس وقت اس سنسان جنگل میں سے امیروں وزیروں کے ساتھ شہزادے کی سواری جا رہی تھی۔

اچانک ایک جھاڑی ہلی۔ سب کے کان اس طرف لگ گئے اور اس میں سے الو کی آواز سنائی دی۔

وزیر نے دل میں سوچا کہ شاید آج یہی شکار ملنا تھا اور تو کچھ نہیں ملا چلو الو ہی سہی، واپس جانے پر لوگ

یہ تو نہ کہیں گے کہ شہزادہ اور وزیر شکار کرنے گئے اور خالی ہاتھ لوٹ آئے۔

یہ سوچ کر بندوق لی اور جھٹ سے فائر کر دیا۔ گولی بندوق میں سے نکلی اور آن کی آن میں جھاڑی میں غریب بے قصور الو کو جا لگی۔ ایک ہلکی سی چیخ کی آواز آئی اور بے چارے جانور کا خاتمہ ہو گیا۔

شہزادہ یہ حال دیکھ کر یکا یک بول اُٹھا۔

"بولا اور مارا گیا"۔

اس کے بعد شہزادہ پھر چپ ہو گیا اور کبھی نہ بولا۔

تمام درباری اور امیر وزیر دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے کہ شہزادے کو اس کے استاد نے کیسی عجیب بات بتائی ہے۔

☆☆☆☆

ن۔ م۔ راشد

وفاداری

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ ایک گڈریا کسی جنگل میں بھیڑیں چرا رہا تھا۔ یکا یک اس نے ایک چیخ سی سُنی۔ اُس نے خیال کیا۔ کہ شاید کوئی کتا یا گیدڑ ہوگا۔ وہ ٹھہر گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد اسے نزدیک کی ایک جھاڑی میں ایک کتا نظر آیا جب گڈریے نے کتے کو غور سے دیکھا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ کتا نہ تو پہاڑی ہے نہ جنگلی، بلکہ شہری ہے اور ساتھ ہی اس نے سوچا کہ یہ جگہ بالکل ویران اور بستی سے بہت دور ہے۔ یہاں یہ کتا کیوں کر آ گیا۔

یہ سوچ کر گڈریا ذرا آگے بڑھا۔ چند قدم کے فاصلے پر اسے آدمی کا پنجر دکھائی دیا۔ پنجر کو بہت غور سے دیکھ کر گڈریا سمجھ گیا۔ کہ یہی آدمی اس کتے کا مالک تھا اور یہ اب سے تین مہینے پہلے اپنے کتے کو ساتھ لے کر یہاں آیا تھا۔ اتفاق سے مالک مر گیا۔ اور اس کا وفادار کتا اس کی لاش کی رکھوالی کے لیے وہیں بیٹھا رہا۔

وفاداری بہت اچھی چیز ہے۔ دیکھو کتے نے اپنے مالک سے وفاداری کی اور خدا اسے تین مہینے تک برابر روزی دیتا رہا۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے سب سے بڑے حاکم یعنی خدا تعالیٰ سے وفاداری کریں اور اس کے سارے حکم مانیں۔

* * * *

نذر سجاد حیدر

چوری کُھل گئی

صبح کے وقت ننھی آمنہ گُلاب کے درخت کے نیچے نہایت رنجیدہ بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کتاب تھی لیکن بند۔ وہ اسے پڑھ نہیں رہی تھی۔

اتنے میں اُس کی سہیلی رضیہ آئی۔

رضیہ نے پوچھا۔ ''پیاری آمنہ کیسی چُپ سے بیٹھی ہو سبق یاد کرلیا جو کتاب بند ہے؟''

آمنہ بولی۔

''رضیہ کیا بتاؤں مجھے کل سے بڑا غم ہے۔ میری پیار سہیلی ایلن نے کل مجھے کچھ چیزیں بھیجی تھی وہ کسی نے چُرالی ہیں۔''

رضیہ نے پوچھا۔

''کیا چیزیں تھیں اور کس نے چرالیں کچھ پتہ نہ لگا؟''

آمنہ نے جواب دیا۔

''وہ چیزیں کچھ قیمتی تو نہیں تھیں پر مجھے اس کے کھو جانے کا بڑا رنج ہے۔ اس لیے کہ وہ میری سہیلی ایلن نے بڑی محبت سے بھیجی تھیں۔ ایک خوبصورت سی ٹوکری میں اُس کا اپنا بنایا ہوا ریشمی پھولوں کا گلدستہ تھا اور ایک لونڈر کی شیشی تھی اور چار انڈے تھے، اور سب سے زیادہ افسوس مجھے انڈوں کا ہے۔ کیوں کہ وہ ایلن کی بہت پیاری خوبصورت بطخ کے انڈے تھے۔ ایلن کو ان کی بہت قدر تھی۔ اس کی چھوٹی بہنیں مانگتی اور روتی رہ گئیں، مگر اُس نے کسی کو نہ دیے اور مجھے بھیج دیے۔''

رضیہ بولی۔

''آمنہ تمھاری چیزوں کے کھونے جانے کا مجھے بھی افسوس ہوا۔ تم تلاش کرو۔ شاید مل جائیں گھر کے ہی آدمیوں میں سے کسی نے لی ہوں گی۔''

آمنہ نے کہا۔

''کل مَیں نے بہت تلاش کیا۔ اماں جان نے نوکروں کے بچوں کو مار کا ڈراوا بھی دیا۔ مگر کسی سے پتہ

ن لگا۔''

رضیہ بولی۔

''اچھا میں پتہ لگاؤں گی۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمھارا کس پر خیال ہے؟''

آمنہ کچھ دیر تک سوچتی رہی، پھر کہنے لگی:

''میرا شک انا اور مالی کی لڑکی پر ہے۔ کل جس وقت ایلین کے گھر کی آیا وہ ٹوکری لے کر آئی۔ اُس وقت نصیبن اور خوشحالی میرے کمرے میں تھیں۔ وہ دونوں ان چیزوں کی بہت تعریف کرنے لگیں۔ پھر میں تو اسکول چلی گئی اور وہ پیچھے کمرا صاف کرتی رہیں۔ ٹوکری میز پر رکھی تھی۔ میں جب اسکول سے واپس گھر لوٹی تو ٹوکری غائب تھی۔ مَیں نے ان سے پوچھا تو دونوں قسمیں کھانے لگیں کہ ہم نے نہیں لی۔''

رضیہ نے دریافت کیا:

''تم نے ان کی کوٹھڑیوں میں بھی جا کر دیکھا؟''

آمنہ نے جواب دیا:

''ان کے احترام اور لحاظ کی خاطر اس طرف تو میں نہیں گئی۔ ہاں البتہ مالی کی کوٹھڑی میں گئی تھی۔ خوشحالی کی گڑیاں وغیرہ دیکھ آئی۔ وہاں تو نہیں ملی۔''

رضیہ نے کہا۔

اچھا تم فکر نہ کرو۔ اب میں تمھاری چیزیں ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اپنے نقصان کی صورت میں کسی کا بھی لحاظ نہ کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے گھر کے نوکر بگڑ جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر میں اور اماں جان تو اپنے نوکروں کی خوب خبر لیتے ہیں۔''

یہ کہہ کر رضیہ آمنہ کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر چوری کا پتہ لگانے کے لیے کمرے سے باہر چلی گئی۔

آدھے گھنٹے بعد آ کر آمنہ سے کہا۔

''لو بھئی چوری کُھل گئی۔ دیکھو ہم نے چور کا پتہ لگا لیا۔ یہ دیکھو میرا ہاتھ۔ یہ انڈے کی زردی لگی ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ تو کیسے پتہ لگا، کھڑے ہو کر پوچھا کہ چور کا کیسے پتہ لگا، خدا کرے کہ میری ایلین کی چیزیں مل جائیں۔''

رضیہ پوری جاسوسہ بنی ہوئی تھی کہنے لگی:

''بھئی میں یہاں سے سیدھی مالی کے کوارٹر گئی۔ مالن تو باہر صحن میں بیٹھی موتیے کے ہار پرو رہی تھی اور

اندر خوشحالی جھاڑو دے رہی تھی۔

میں نے اسے کہا:

خوشحالی اپنی گڑیاں مجھے دکھاؤ! اس نے فوراً اُٹھ کر کوٹھڑی کا ایک دروازہ بند کر دیا تا کہ باہر سے اس کی ماں کی نظر نہ پڑے۔ پھر اس نے ایک بڑے صندوق کا ڈھکنا آہستہ سے کھول کر گڑیاں نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔

مالی بے چارے کے گھر صرف وہی ایک صندوق ہے۔ خوشحالی نے ایک ایک کر کے تمام کپڑے باہر نکالے اور نیچے سے گڑیوں کی بقچی نکالی تھی۔۔۔ پھر میں نے اس کوٹھڑی کے تمام اسباب میں ادھر اُدھر دیکھا۔ کہیں کچھ نظر نہ آیا۔ خوشحالی نے خود مجھ سے تمھاری ٹوکری کے گم ہونے کا ذکر کیا کہنے لگی۔

مجھ پر بھی سب کو شک ہے۔ کیوں کہ اُس وقت میں بھی نصیبن کے ساتھ چھوٹی بی بی کے کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔۔۔ مگر اصل میں جس نے چیزیں چُرائی ہیں اُس کا نام میں نہیں لے سکتی۔ بہتیرا پوچھا، مگر اُس نے نہ بتایا۔

”پھر میں وہاں سے انا کی طرف گئی۔ اچھا وقت ملا کہ اس وقت انا تمھارے بھائی کو لے کر باہر گئی ہوئی تھی۔ نصیبن بھی موجود نہیں تھی۔ میں کوٹھڑی میں جا کر اس کی گڑیاں دیکھنے لگی اور مکان کے سارے طاق اور کونے کھدرے بھی دیکھ ڈالے۔ مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ صندوق میں کھول نہ سکی۔ کیوں کہ اُس میں تالا لگا ہوا تھا۔ کھونٹی پر نصیبن کے کپڑوں کی گٹھڑی ٹنگی تھی۔ میں نے اُسے بھی کھول کر دیکھ لیا۔۔۔

”دیکھا تو کئی کپڑوں پر انڈوں کی زردی لگی ہوئی تھی اور کپڑے خوشبو سے مہک رہے تھے۔ بس پتہ لگ گیا کہ نصیبن نے انھیں چھپانے کے لیے اس گٹھڑی میں باندھا ہو گا لیکن کسی نہ کسی وجہ سے انڈے ٹوٹ کر کپڑوں پر لگ گئے اور وہ عطر والی شیشی یا تو ٹوٹ گئی یا اس کی ڈاٹ کھل گئی ہو گی اور عطر کپڑوں پر گر گیا، مگر مجھے افسوس ہے کہ ٹوکری اور گل دستہ اور دوسری چیزیں نہیں مل سکیں۔ شاید وہ کہیں صندوق میں رکھی ہوں گی۔

آمنہ نے خوش ہو کر کہا۔

”میری اچھی رضیہ، تم نے پتہ لگا لیا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ نصیبن چور نکلی۔“

رضیہ بولی:

”تمھاری چیزیں اب ملیں نہ ملیں مگر چور کا پتہ لگ گیا۔“

آمنہ نے کہا:

’’مجھے اُمید ہے کوئی نہ کوئی چیز بھی ضرور مل جائے گی۔ میری چیزیں انا کے صندوق میں نہیں ہوں گی۔ کیوں کہ نصیبن اپنی چیزیں یہاں نہیں رکھتی۔ ذرا ذرا سی چیز بھی اپنی نانی کے گھر رکھتی ہے۔ اب میں جا کر اماں جان سے اس بات کا ذکر کرتی ہوں۔‘‘

رضیہ جلدی سے بولی:

’’نہیں ابھی نہیں! جب تک کوئی اور چیز ثبوت کے طور پر نہ مل جائے۔ اپنی اماں جان سے نہ کہو۔ ہاں تم یہ بتاؤ کہ نصیبن کی نانی اماں کا گھر کہاں ہے اور یہاں سے کتنی دور ہے؟‘‘

آمنہ نے جواب دیا:

’’نصیبن کی نانی کا گھر تو پاس ہی ہے۔ پر وہ چیزیں اس نے کہیں چھپا کر رکھی ہوگی اور اگر کہیں وہ سامنے بھی ہوں گی تو تمھیں دیکھ کر اس کی نانی چھپا دے گی۔‘‘

رضیہ نے کہا:

’’اچھا یوں کرتے ہیں کہ خوشحالی کو اس کی نانی کے گھر بھیجتے ہیں۔ وہ انھیں جا کر کہے کہ تمھاری نواسی نے ٹوکری منگوائی ہے۔ خوشحالی نصیبن کی سہیلی ہے۔ اس لیے اس کی نانی اس پر بھروسہ کرتے ہوئے وہ ٹوکری اُسے دے دے گی۔ یہ موقع بھی اچھا ہے کیوں کہ نصیبن اس وقت تمھاری اماں جان کے پاس بیٹھی تمھارے بھائی کے کپڑوں کی سلائی کر رہی ہے۔ لہٰذا ہمیں فوراً خوشحالی کو نصیبن کے گھر بھیجنا چاہیے۔

آمنہ نے خوشحالی کو بلا کر سمجھاتے ہوئے کہا:

خوشحالی! میری بات غور سے سنو۔ تم فوراً نصیبن کی نانی اماں کے گھر چلی جاؤ۔ اور اُس سے کہنا کہ نصیبن نے وہ ٹوکری منگوائی ہے، جو صبح آپ کو دے گئی تھی۔

خوشحالی فوراً روانہ ہو گئی۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ خوشحالی ایک کپڑوں کی پوٹلی لے کر آ گئی۔ جب وہ پوٹلی کھولی گئی، تو اس میں سے ایک ٹوکری نکلی جو انڈے ٹوٹنے کی وجہ سے خراب ہو چکی تھی۔ اس میں گُل دستہ اور عطر والی شیشی رکھی تھی۔ عطر بھی آدھا ٹوکری میں گر چکا تھا۔

خوشحالی بولی۔

’’بی بی اب بتاؤ۔ کون چور ہے؟ آپ خوامخواہ مجھ پر خفا ہو رہی تھیں۔‘‘

آمنہ نے کہا۔

’’خوشحالی تو بہت اچھی ہے۔ اب ہم تجھ پر کبھی بھی شک نہ کریں گے۔ اچھا تم یہ تو بتاؤ کہ تُو نے اس کی نانی سے ٹوکری کس طرح مانگی؟‘‘

خوشحالی نے بتایا۔

’’مَیں نے جا کر بڑے ادب سے سلام کیا اور کہا کہ نصیبن نے ٹوکری منگوائی ہے۔‘‘

نانی بولیں:

بیٹی! لے جا مگر نصیبن کے کپڑوں میں باندھ لے۔ تا کہ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ گھر سے کپڑے آئے ہیں۔ کیوں کہ صبح نصیبن کہتی تھی کہ یہ چیزیں میں نے بی بی کی چُرائی ہیں۔‘‘

آمنہ نے کہا۔

’’اچھا نصیبن! تیری تو بعد میں خوب خبر لوں گی۔ خوشحالی اب تو مجھے سارا واقعہ سچ سچ بتا۔ کیوں کہ تجھے سب معلوم ہوگا۔‘‘

خوشحالی بولی:

’’بی بی! جب تم اسکول چلی گئیں تو نصیبن نے ٹوکری اٹھا لی۔ میں اُسے بہتیرا منع کرتی رہی۔ لیکن اُس نے میری بات نہ مانی اور اپنی کوٹھڑی میں چھپا دی۔ جب اسکول سے آ کر آپ نے ٹوکری کی تلاش کی تو ڈر کے مارے ٹوکری اپنی نانی کے گھر چھوڑ آئی۔ اسی گھبراہٹ میں انڈے ٹوٹ گئے۔

رضیہ نے کہا:

’’تو نے تو بڑی بے وقوفی کی سب تجھ پر ناراض ہوئے۔ لیکن تو نے تب بھی نہیں بتایا اور اپنے اوپر الزام لے لیا۔‘‘

پھر آمنہ وہ ٹوکری لے کر اپنی اماں جان کے پاس گئی اور سارا حال اُن سے کہا۔ نصیبن کو بہت مار پڑی اور اُس دن سے حکم ملا کہ وہ گھر میں نہ گھسے۔ اپنی نانی کے گھر رہا کرے۔ اب نصیبن کہتی تھی۔ کبھی چوری نہ کروں گی اور انڈے اور عطر کو تو کبھی ہاتھ نہ لگاؤں گی۔ ان ہی دو چیزوں نے میرا پتہ دیا۔

☆☆☆☆

ابصار عبدالعلی

ندیدہ

سلیم بڑا ندیدہ لڑکا تھا، اور اب تو اس کے ندیدے پن کی حد ہو گئی تھی۔ پرسوں آپا کی سہیلی کی شادی میں گیا تو اتنا ندیدہ پن دکھایا کہ امی اور آپا دونوں کو شرمندہ ہونا پڑا۔ اس کے اندر یہ بھی بری عادت تھی کہ وہ ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا اور گھر میں بھی ہمیشہ چھانٹ کر بڑی سے بڑی چیز لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی ننھی شارمین سے خوب ہاتھا پائی ہوتی۔

ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ پاپا بہت سے امرود لائے اور اس سے پہلے کہ ان کا حصہ لگتا۔ سلیم نے سارے بڑے بڑے امرود چھانٹ کر اپنے قبضہ میں کر لیے۔ ننھی شارمین کو بھی لالچ آیا۔ اس نے بھی ایک بڑا سا امرود اٹھا لیا اور بھاگنا چاہتی تھی کہ سلیم نے اس کی فراک اتنے زور سے پکڑ کر کھینچی کہ وہ چر سے پھٹ گئی اور پھر جب اس نے بھی غصے میں اس کے چھانٹے ہوئے بڑے بڑے امرود زمین پر گرا دیئے تو بس اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانا مل گیا اور پھر سلیم کا ہاتھ شارمین کے بالوں میں تھا اور شارمین کا ہاتھ سلیم کے گریبان میں۔ بھلا اس کا ننھا سا ہاتھ سلیم کے بالوں تک کہاں پہنچ سکتا تھا۔ جب چیخ پکار کی آواز امی تک پہنچی تو انھوں نے آ کر دونوں کو الگ کیا۔ آخر وہ بھی کہاں تک الگ کرتی رہتیں۔ سلیم کے ندیدے پن نے تو گھر بھر کو عاجز کر رکھا تھا۔

یہ تو سب کچھ جیسے تیسے برداشت کیا جا رہا تھا لیکن اب ننھی شارمین کی طرف سے بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بھی سلیم کو دیکھ کر ویسی ہی ندیدی ہوتی جا رہی تھی۔

آخر ان روز روز کے جھگڑوں اور سلیم کی عادتوں سے تنگ آ کر آپا نے اس کے لیے ایک علاج سوچ لیا، اور اس کی سالگرہ کے دن کا انتظار کرنے لگیں۔

اور پھر وہ دن آ گیا اس دن سلیم کی سالگرہ تھی، بڑھیا بڑھیا کپڑے پہنے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ ''آہا آج تو میں اتنا بڑا سا کیک کاٹوں گا اور پھر سارے کا سارا خود ہی کھا جاؤں گا۔ موہن، راشد اور شارمین دیکھ دیکھ کر منہ میں پانی بھریں گے، اور میں انھیں ٹھینگا دکھا دوں گا......اور کیا''۔

جب کیک کاٹنے کا وقت آیا تو اس نے جلدی سے کیک کاٹا اور کھانے کے لیے ایک بڑے سے ٹکڑے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ آپا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑے سے ٹکڑے کے بجائے ایک چھوٹا سا ٹکڑا اسے دے کر باقی بڑے بڑے ٹکڑے سب بچوں کو بانٹ دیئے۔ وہ منہ دیکھتا رہ گیا۔ تمام دوست ہنس ہنس کر ہال

میں اچھلنے کودنے لگے۔

رات ہوئی تو آپا نے کھانا اپنی نگرانی میں میز پر لگوایا اور سب بچے بیٹھ کر کھانے لگے۔ سامنے میز پر کوفتوں کی قاب رکھی تھی۔ اس میں سب کوفتے تو چھوٹے چھوٹے تھے بس ایک کوفتہ بڑا تھا۔ سلیم نے لپک کر سب سے پہلے اس بڑے کوفتے کو اپنی پلیٹ میں ڈال لیا۔ پھر نوالا بنا کر منہ میں رکھا اور دیر تک چباتا رہا، لیکن یہ کیا......؟ نہ تو کوفتے میں نمک مرچ تھا اور نہ اس کے اندر کچھ بھرا ہوا تھا۔ اس نے منہ بنا کر سب کی پلیٹوں پر نظر ڈالی تو پلیٹوں میں رکھے ہوئے کوفتوں میں انڈے بھرے ہوئے تھے......اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور جھنجلا کر اس نے نوالا تھوک دیا۔ سب بچے مسکرا دیئے، لیکن کوئی زور سے نہیں ہنسا۔

اب اس کے منہ کا مزہ خراب ہوگیا تھا اور پھر اس کے سب دوست اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا بھی رہے تھے، جیسے اس کا خاموشی سے مذاق اڑا رہے ہوں، اس لیے اس نے سوچا کہ وہ کھانے کی میز سے اٹھ کر بھاگ جائے، لیکن وہ بھاگتا بھی کیسے؟ ابھی تو کھیر کھانا باقی تھی۔ اس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے کھیر کے پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کی نظر برابر ہی رکھے ہوئے شارمین کے کھیر کے پیالے پر پڑی۔ اس کے منہ میں ڈھیر سا پانی بھر آیا......"ارے باپ رے باپ"......اس نے دل میں سوچا......"شارمین کا پیالہ اتنا بڑا اور ہم سب کا اتنا چھوٹا؟

اس کی لالچ اور بڑھ گئی اور آنکھ بچا کر اس نے اپنے چھوٹے پیالے سے شارمین کا بڑا پیالہ بدل لیا۔ پھر بڑے مزے سے چمچہ بھر کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ منہ سے کھیر کا فوارہ سا چھوٹ پڑا اور سارا دسترخوان خراب ہوگیا۔ چاروں طرف سے بچوں کے قہقہے اور تالیاں گونج اٹھیں۔ ان میں موہن، راشد اور شارمین کی آوازیں سب سے آگے تھیں۔ دراصل اس بڑے پیالے میں کھیر کی بجائے چاولوں سے نکلی ہوئی پیچ تھی اور اس میں بھی اچھی طرح نمک ڈالا گیا تھا۔

سلیم کھسیانا ہو کر رونے لگا اتنے میں آپا کھانے کے کمرے میں آ گئی تھیں۔ انھیں دیکھتے ہی وہ اور زور زور سے رونے لگا۔ آپا انگلی پکڑ کر اسے باغ میں لے گئیں اپنی گود میں بٹھا کر اس کے آنسو پونچھے اور کہنے لگیں......"ارے اس میں رونے کی کیا ضرورت ہے۔ تم نے ایسا کام ہی کیوں کیا جو دوسروں کو ہنسنے کا موقع ملا۔ تم تو بڑے اچھے بھیا ہو، بولو اب تو اس طرح ندیدہ پن اور ہوس نہیں کرو گے؟"

"نہیں"......سلیم نے بڑے سچے دل سے اقرار کیا۔ آپا نے اس کو شاباشی دی پاپا سے کہہ کر نیا کیرم بورڈ دلانے کا وعدہ کیا، خوب اچھی اچھی باتیں بتائیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ کھانے میں بغیر نمک مرچ اور بغیر انڈے کا بڑا سا کوفتہ اور نمکین کھیر خود آپا نے ہی بنوائی تھی۔

ڈاکٹر احسان اکبر

شہزادے کے چھ ہتھیار

پیارے بچو! آؤ تمھیں اپنے برصغیر ہی کی ایک قدیم کہانی سنائیں۔ برصغیر خشکی کے اس بڑے سلسلہ کو کہا جاتا ہے جو براعظم سے چھوٹا ہو۔ سو ہمارا پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش وغیرہ سب اسی ایک برصغیر کے علیحدہ علیحدہ ممالک ہیں۔

سو ایک بہت مشہور حکمران کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا۔ بچہ جب بڑا ہوا تو رسم کے مطابق بادشاہ نے درباری نجومی بلوائے تاکہ شہزادے کی قسمت کا جو حال وہ بیان کریں اس کی روشنی میں اس کی تربیت کی جا سکے۔ نجومیوں نے شہزادے کی ذہانت، علم دوستی اور رعایا میں مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات خاص طور سے بیان کی کہ شہزادہ کے عہد حکومت میں ملکی سپاہ کے پاس دفاعِ وطن کے لیے موجود پانچ ہتھیاروں کے علاوہ ایک چھٹا اہم اسلحہ بھی ہوگا جو ان سب ہتھیاروں پر بھاری رہے گا۔

عزیز بچو! اس زمانے میں تیر، تلوار، نیزے، کلہاڑے اور ڈھال کے سوا لڑائی میں کام آنے والا اور کوئی ہتھیار انسانوں کے استعمال میں آنا شروع نہیں ہوا تھا۔

''چھٹا اسلحہ؟'' بادشاہ حیران ہو کر رہ گیا مگر اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا کہ اس کا بیٹا کتنا بڑا حکمران بننے والا ہے۔ بادشاہ نے اسے ایک مشہور عالم کے پاس تمام علوم کے پڑھنے اور حکمرانی کے آداب کی تربیت لینے کے واسطے دور کے سفر پر بھیج دیا۔ شہزادہ جی لگا کر پڑھتا رہا۔ اس کے استاد یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ اس نے بہت کم عرصہ میں اعلیٰ تعلیم مکمل کر لی تھی۔ آخر ایک دن استاد نے اس کے سر پر فضیلت کی پگڑی باندھی اور سند بخشی۔ اس زمانے پر بچو! کامیاب طالب علم کے سر پر عالم فاضل ہو جانے کی نشانی کے طور پر فضیلت کی یا فاضل بن جانے کی پگڑی باندھا کرتے تھے۔ شہزادے سے مخاطب ہو کر استاد نے کہا کہ:

''بیٹا! اگر ہم تم قیامت کے دن تک بھی علم حاصل کرتے رہیں تو بھی علم حاصل کرنے کا فرض پورا نہیں ہو سکتا کیوں کہ علم ایک وسیع دولت ہے جس میں اضافہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ تم اسے حاصل کرنا سیکھ گئے ہو۔ اسے حاصل کرتے رہنا اور ہر چیز سے نتیجہ نکالنا اور سبق سیکھنا۔ علم تمھارے سینے میں ہے اور یہ بہت بڑی طاقت ہے۔ اتنی بڑی کہ یہ ساری دنیا کو اکیلے ہی مات دے سکتی ہے۔ جاؤ! اپنے علم پر شک نہ رکھنا۔''

شہزادہ واپسی پر منزلیں طے کرتا آ رہا تھا اسے ایک وسیع جنگل سے ہو کر گزرنا پڑا۔ ایک خوفناک آواز نے

پکار کر کہا:

’’خبردار! یہاں بھول کر بھی قدم نہ رکھنا۔ یہ جنگل لمبے بالوں والے بھوت کا ہے۔ یہاں کوئی نہیں گزرتا۔‘‘

شہزادے نے کہا ’’یہ تو میرے شہر کا رستہ ہے۔ اگر یہاں سے پہلے کوئی نہیں بھی گزرا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ بعد میں بھی کوئی نہ گزرے مجھے تو یہیں سے گزرنا ہے۔‘‘

یہ کہہ کر شہزادہ آگے بڑھتا گیا۔ چلتے چلتے وہ ایک بڑے چوڑے دریا کے کنارے تک جا پہنچا۔ جہاں سے اسے کشتی پر اپنے شہر کے لیے روانہ ہونا تھا۔ مگر گھاٹ سے پہلے ہی ایک عجیب اور ڈراؤنے سے جانور نے اس کا رستہ روک رکھا تھا۔ یہ جانور ایسا تھا جس کا قد کاٹھ بے حد بڑا اور مشکل تھا اس کے پورے جسم کو بالوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ شہزادے نے اسے جو رستہ روکے دیکھا تو کہا کہ:

’’میرا رستہ چھوڑ دو مجھے آگے جانا ہے۔‘‘

جانور نے نفرت اور مذاق سے کہا:

’’راستہ کیسا؟ اور کس کا راستہ۔ یہاں ہر رستہ ختم ہو جاتا ہے۔ آگے دریا دکھائی نہیں دیتا۔‘‘

میرا رستہ دریا کے پار جاتا ہے۔ شہزادے نے جواب دیا۔ ہم رستے دینے کے لیے نہیں آئے۔ تم نے یہاں رستہ کیوں بنایا اور کیوں ہماری جاگیر میں قدم رکھا۔‘‘؟ یہ جانور کا جواب تھا۔

شہزادے نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو جانور اسے کمزور سمجھ کر باقاعدہ حملہ آور ہو گیا۔ اب تو شہزادے کو غصہ آ گیا۔ اس نے اس پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی مگر ایک ۔۔۔ دو ۔۔۔ تین

شہزادے جیسا ماہر تیر انداز حیران تھا کہ تیر کہاں جا رہے ہیں کیوں کہ تیر اس جانور کو لگنے کے بعد غائب ہو جاتے۔ ننانوے تیر اسی طرح بے اثر گئے۔ تیر اس جانور کے گھنے بالوں میں رہ جاتے تھے۔

اب یہ خوفناک جانور شہزادے کے قریب آنے لگا۔ شہزادے نے نیزے سے کام لیا۔ مگر نیزہ بھی ان بالوں میں ایسا دھنسا کہ اس کے کنارے کا بھی نشان نہ ملا۔ اب شہزادے کو موت سامنے دکھائی دینے لگی۔ مگر حوصلہ نہ ہارنے کی تربیت اس کے کام آئی۔ اس نے جب دیکھا کہ وہ خطرناک جانور اس سے دو چار ہاتھ کے فاصلے پر آ گیا ہے تو اسے لمبے دستے والے کلہاڑے کا خیال آیا۔ اس نے کلہاڑے پر گرفت مضبوط کی اور اسے تول کر اس بلا کے سر پر دے مارا۔ مگر حد ہو گئی جب اس نے دیکھا کہ کلہاڑا اس کے سر کی ہڈی سے نہیں ٹکرایا اور بالوں میں ہی دھنس کر رہ گیا۔ اب وہ جانور شہزادے کی گردن دبوچنے کو اچھلا تو شہزادے نے پہلو بدل کر تلوار کا ایک بھرپور وار کیا۔ مگر کہاں ۔۔۔ تلوار بھی بے فائدہ رہی۔ بہت زور سے وار کرنے کی وجہ سے شہزادے کا پورا جسم ڈول سا گیا اور وہ گر پڑا۔ اس نے اس وحشی سے بچنے کے لیے ڈھال کو بائیں ہاتھ سے سنبھالا اور دائیں ہاتھ سے ایک زوردار مکا اس کے پیٹ پر جما دیا مگر نہ ڈھال حملہ کرنے کے

کام کی چیز تھی نہ انسانی مکہ۔ جانور نے اس کے دونوں بازو دبوچ لیے۔ شہزادے نے ہمت ہارنا نہیں سیکھا تھا۔ اس نے ایک پاؤں پر زور دے کر اندازے سے جانور کی آنکھ پر اپنا دوسرا گھٹنا ٹھک سے دے مارا مگر اب بیچارہ ہاتوں سے گھٹنے تک جڑ کے رہ گیا۔

عجیب جانور تھا۔ شہزادے کی آخری کوشش یہ تھی کہ دشمن پر سر ہی دے مارے اس نے یہ حربہ بھی آزما دیکھا مگر ہوا یہ کہ اب وہ جانور کی مکمل گرفت میں تھا۔ سست اور بے حس درندے میں تم سے ذرہ برابر نہیں ڈرتا۔ شہزادہ غرایا۔

“مگر تم مجھ پر اپنے پانچوں ہتھیار آزما چکے ہو جو سب کے سب فضول اور بے کار ثابت ہوئے۔ تم اپنی شکست تسلیم کرو اور پیشتر اس کے کہ میں اور کوئی کارروائی شروع کروں تم میرا حکم نہ ماننے پر معافی مانگو۔”

“میں نے نئی راہ پر قدم رکھا تھا اور علم کا تقاضہ ہے کہ نئے رستے دریافت کرو مجھے اپنے اس عمل پر خوشی ہے۔” شہزادے نے جواب دیا۔

“تم لڑائی ہار چکے ہو اور مجھے بھوک لگ رہی ہے” جانور نے کہا اور یہ کہہ کر شہزادے کو اپنے جسم سے جدا کیا۔

“ظالم اور طاقتور دلیل کو نہیں مانتے سو تم بھی اپنی مرضی کرو۔ مگر یاد رکھو کہ نہ ابھی لڑائی ختم ہوئی ہے اور نہ میں نے سارے ہتھیار ہی استعمال کیے ہیں۔ بہادروں کی لڑائی کے طریقے بہادرانہ ہوتے ہیں۔”

جانور نے کہا “مجھ سے بڑا بہادر کون ہوگا۔ لے آؤ اپنے اس ہتھیار کو بھی وہ ہتھیار میرے دماغ اور دل کے اندر چھپا ہوا ہے۔ میں ایسا انسان ہوں جس نے علم حاصل کیا اور اسے اپنے دل و دماغ کی روشنی کے لیے استعمال کیا۔ یہ ہتھیار دل اور دماغ سے باہر نکلے گا۔ تم آرام سے مجھے کھانا شروع کر دو۔ تم انسانیت کے دشمن ہو اس لیے میرا علم تمھارا دشمن بن کر تمھیں تباہ کر دے گا۔ کیوں کہ علم ہر صورت میں اور ہر جگہ ظلم، جہالت، اندھیرے انسان دشمن اور برائی کا خاتمہ کر دینے والا جوہر ہے۔”

“تم باتیں بہت کرتے ہو۔ جانور نے کہا۔ چلو یہ بھی بتا دو کہ یہ علم کیا چیز ہے۔”

یہ علم وہ ذریعہ ہے جس کی مدد سے میں اپنی زندگی کو تمھاری زندگی سے مختلف بنا چکا ہوں ورنہ میں بھی درندہ ہی تھا۔ اس علم سے میں پتھر توڑتا اور اس کے اوزار اور سامان بناتا ہوں۔ اور لوہے کو پگھلا کر اس سے استعمال کی چیزیں اور حفاظت کا سامان تیار کرتا ہوں۔ اس کی مدد سے تمھارے جیسے گھنے بالوں والے جانوروں کی کھال اتارنا میں نے سیکھا ہے جسے میں سردیوں میں اوڑھ کر جاڑے کی شدت سے جسم کو محفوظ کروں گا۔”

ہم انسان اتنے چھوٹے چھوٹے قد کاٹھ اور اتنے کمزور جسموں کے باوجود اس علم ہی کی وجہ سے دریا تیر جاتے ہیں۔ یہ کشتی اسی علم کی مدد سے بنی اور دریا میں بہہ کر آنے والے وہ بڑے بڑے درخت اسی کی مدد سے کاٹ کاٹ کر ہم ان سے شہتیر، بلیاں اور تختے بناتے ہیں جو خدا کے گھروں میں سجتے ہیں اور ہمارے گھروں کو سنوارتے ہیں۔”

جانور ایک لمحے کے لیے رکا ’’کیا میں علم سیکھ سکتا ہوں؟‘‘

تم علم سے حاصل ہونے والا موتی مجھ سے لے سکتے ہو۔ ’’شہزادے نے جواب دیا۔

’’علم کا موتی؟‘ ‘جانور کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

ہاں علم کا عمدہ نتیجہ اور اس کا قیمتی موتی ہے اچھا اخلاق اور وہ یہ ہے کہ تم خدا کی مخلوق سے نفرت مت کیا کرو۔‘‘

’’جاؤ شہزادے میں تمھاری بات پر ایمان لایا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آیندہ ایسا ہی کروں گا۔ میری وحشیانہ حرکتوں کو معاف کر دینا۔‘‘

میں نے تمھیں معاف کیا۔۔شہزادے نے کہا۔علم کینہ پروری نہیں سکھاتا علم غصّے کا دشمن ہے۔علم حوصلہ اور برداشت سکھاتا ہے۔جو پہچان میں نے علم کی بیان کی علم ان سب کی رُوح ہے۔علم دراصل ایک ایسی روشنی ہے جو ہمیں رستہ دکھاتی رہتی ہے مگر نظر نہیں آتی۔‘‘

’’شہزادے تم نے واقعی سب سے زیادہ طاقتور چیز کو اپنے ہاتھ میں کر رکھا ہے۔‘‘

یہ کہہ کر جانور نے شہزادے کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

شہزادہ اپنا سفر طے کرتا کرتا ایک دن جب اپنے والد کے حضور پہنچا تو اس نے وہاں ساری روداد سنائی۔اس جانور سے مقابلے کی بات سن کر بادشاہ کو اپنے بیٹے کی لیاقت اور ذہانت پر اور بھی اعتماد ہو گیا۔

بزرگ بادشاہ یوں بھی باقی عمر یادِ خدا میں گزارنا چاہتا تھا۔اس نے اگلے ہی دن امرا کا اجلاس طلب کیا۔اور دربار خاص میں شہزادے کو تخت نشین کر کے اپنی بادشاہت بھی اس کے سپرد کر دی۔

☆☆☆☆

احمد رشید

مگرمچھ اور رحمدل بچے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک چھوٹی سی خوبصورت بچی جس کا نام سارہ تھا اور اس کا بھائی رافا لاہور میں نہر کے قریب رہا کرتے تھے۔ ان کا چھوٹا سا گھر تھا۔ جس میں ایک باغیچہ تھا۔ ان کے باغیچے کی دیوار نہر کے بالکل قریب تھی اور جب وہ کھیلتے تو وہ نہر میں بہنے والے اور نہر کے نزدیک لگے ہوئے درختوں کی آواز سن سکتے تھے۔

ایک دن سارہ باغیچے میں جھولے پر اکیلی کھیل رہی تھی۔ وہ جھولا جھول رہی تھی کہ ایک دم بڑا سا مگرمچھ دیوار کے اوپر سے اندر آ گیا۔ وہ بہت بڑا تھا اور بھیگا ہوا تھا۔ اس کی کھال کیچڑ اور نہر کے پتوں اور دوسرے گند سے لتھڑی ہوئی تھی۔ سارہ نے زور سے چیخ کر کہا ”ماما“ رافا مجھے بچاؤ۔ ایک بڑا سا مگرمچھ باغیچے میں آ گیا ہے۔ رافا تیزی سے باہر نکلا اس نے دیکھا کہ سارہ جھولے پر بیٹھی ہے اور اس کے قریب ہی گھاس پر مگرمچھ موجود ہے۔ مگرمچھ نے کہا کہ چلایئے نہیں، اس بات پر ناراض نہ ہوں کہ میں یہاں آ گیا ہوں، میں بہت بیمار ہوں۔

سارہ اور رافا مگرمچھ کی باتیں سنتے رہے، انھوں نے اس سے پہلے مگرمچھ کو بولتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ مگرمچھ نے کہا کہ میں نہر میں تیرتا رہتا ہوں اور میں نے کوئی خراب چیز کھا لی ہے جس کی وجہ سے میرے پیٹ میں گڑبڑ ہے، میں بہت بیمار ہوں۔ مہربانی کر کے کچھ کیجیے۔ اس کی دائیں آنکھ سے ایک بڑا سا آنسو نکلا اور وہ چیخنے لگا۔ سارہ نے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم تمھاری مدد کریں گے۔ لیکن ہم یہ بات اپنی امی کو نہیں بتا سکتے کیوں کہ وہ بہت خوفزدہ ہوں گی۔

رافا گھر کے اندر گیا اور چپ چاپ کار کی چابی اور ایک کمبل لیا، اس نے مگرمچھ کو کمبل سے ڈھکا، اور اس سے کہا کہ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر آ جائے۔ اگرچہ رافا بہت چھوٹا تھا اور اس نے پہلے کبھی کار نہیں چلائی تھی، اس نے اپنی بہن سے کہا کہ وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ جائے۔ اس طرح وہ ڈاکٹر انور کی کلینک کی جانب روانہ ہوئے ڈاکٹر انور سارے شہر میں بہت اچھے اور خوش اخلاق ڈاکٹر کی حیثیت سے مشہور ہے، جو اپنے مریضوں کی اچھی طرح

دیکھ بھال کرتا ہے۔ وہ جب ڈاکٹر انور کی کلینک پر پہنچے۔ تو وہاں بیسیوں لوگ موجود تھے، جیسے ہی انھوں نے سارہ اور رافا کے پیچھے ایک مگرمچھ کو آہستہ آہستہ آتے ہوئے دیکھا، تمام بیگمات چیختی ہوئیں ویٹنگ روم میں اپنی سیٹوں سے اٹھ کر نکل بھاگیں۔ رافا خاموشی سے ڈاکٹر انور کے دفتر میں داخل ہوا لیکن اسے مگرمچھ دیکھ کے بہت صدمہ ہوا۔ لیکن جب اس کا، احساس دور ہوا تو اس نے توجہ سے مگرمچھ کی بات سنی اور اچھی طرح چیک کیا۔ ڈاکٹر انور نے کہا کہ میں تمھیں یہ دوائیں دے رہا ہوں، سارہ سے کہا کہ وہ پانچ دن تک دن میں دو مرتبہ تمھیں یہ دوائیں دے اور تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔

اس کے بعد سارہ، رافا اور مگرمچھ تینوں کار میں بیٹھ گئے، اور گھر جا کر بہت سارے بسکٹوں اور ٹوسٹ کے ساتھ چائے پی۔ انھوں نے مگرمچھ کو دوا دی اور کہا کہ کل آنا۔ اس کے بعد سے نہر میں رہنے والے تمام مگرمچھ سارہ اور رافا کے بہت اچھے دوست بن گئے ہیں اور جب بھی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی یا چائے اور ٹوسٹ کی خواہش ہوتی ہے وہ چپ چاپ دیوار سے کود کر باغیچے میں آ جاتے ہیں اور سارہ سے یہ چیزیں مانگتے ہیں۔

ڈاکٹر انور نے بھی اپنے کلینک میں ایک مخصوص حصہ مگرمچھوں کے علاج کے لیے کھول دیا ہے تا کہ وہ جب بھی وہاں آئیں، لاہور کی بوڑھی بیگمات ان سے نہ ڈریں۔ سارہ اور رافا باغیچے میں کھیلتے ہیں اور اس بات پر بہت خوش ہوتے ہیں کہ انھوں نے نہر کے مگرمچھوں کو زندہ رہنے میں مدد دی ہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر اسلم فرخی

معصوم عزم

شہر میں سائیکلیں تو بہت تھی مگر ان میں سے کوئی قلفی والے کی سائیکل کی طرح خاص نہیں تھی۔ یہ سائیکل بالکل سفید رنگ کی تھی اور اس کے اگلے پہیے کے اُوپر ایک بڑا سا دھات کا ڈبا لگا ہوا تھا جو فرج کی طرح کا تھا۔ جب برف کی ایک سل اس میں رکھی جاتی اور ڈھکنا بند کر دیا جاتا تو اندر قلفیاں ٹھنڈی رہتیں۔ قلفی والا سائیکل کے پیڈل چلاتا وہیں پہنچ جاتا تھا، جہاں لوگ کھڑے ہوتے۔ سب قلفیاں خریدتے۔ قلفیوں کے خریدار بہت ہوتے تھے، کیوں کہ یہ شہر افریقہ میں تھا۔ گرمی کے موسم میں یہاں کے لوگ ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے ٹھنڈی ٹھنڈی چیزیں تلاش کرتے رہتے تھے۔

یہ سائیکل می سی پو کے چچا کی تھی۔ چچا میاں می سی پو کے گھر کے پیچھے ایک کوٹھڑی میں رہتے تھے۔ آدمی ہنس مکھ تھے۔ بھتیجوں کے ساتھ فٹ بال کھیلنا انھیں اچھا لگتا تھا۔ ہمیشہ ہلکی ہلکی سیٹی بھی بجاتے رہتے تھے۔ چچا میاں روز صبح سائیکل شیڈ سے نکالتے، پہیوں کی ہوا دیکھتے اور پھر چل پڑتے۔ جاتے ہوئے می سی پو کو ہاتھ ہلا کر اللہ حافظ کہتے۔

می سی پو کا ایک دوست تھا سی پو۔ ایک بار وہ کہنے لگا: ”اگر ایک دن ہم لوگ بھی تمھارے چچا کے ساتھ چلیں تو کتنا مزہ آئے۔ تم ذرا ان سے پوچھ کے تو دیکھو۔“

می سی پو تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا۔ سی پو کی بات اسے بھی اچھی لگی۔

اسی شام جب چچا میاں پھیرا کر کے گھر آ گئے تو می سی پو نے ان سے پوچھا: ”کیا میں اور میرا دوست آپ کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ جب آپ ہفتے کو قلفی بیچنے جائیں تو ہمیں بھی ساتھ لے چلیں۔“

ہفتے کا دن قلفی والوں کے لیے بڑا مصروف دن ہوتا ہے۔ می سی پو نے سوچا کہ اس دن وہ اور سی پو چچا میاں کا ہاتھ بھی بٹا سکیں گے۔

چچا میاں می سی پو کی بات سن کر ہنسنے لگے اور بولے: ”مگر بیٹا! تم دونوں کو سائیکل پر نہیں لے جا سکتا۔ ایک لڑکا چل سکتا ہے دو نہیں۔ اچھا ٹھہرو۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے ایک بچہ پیچھے پیچھے دوڑے اور ایک بچہ

سائیکل پر میرے ساتھ بیٹھے۔ بس باریاں بدلتے رہنا۔ ’’

چچا میاں راضی ہو گئے تو می سی پو، سی پو کے گھر دوڑ گیا۔ اسے خوش خبری سنائی۔ سی پو بھی بہت خوش ہوا کہنے لگا: ‘‘میں ہفتے تک انتظار نہیں کرسکتا۔ کیا تم انتظار کر سکتے ہو۔ ’’

‘‘اوں ہوں، مَیں بھی انتظار نہیں کر سکتا۔ ’’

مگر انتظار کرنا پڑا۔ دونوں انتظار کرتے رہے۔ آخر ہفتے کی صبح آ پہنچی۔ چچا میاں نے سائیکل شیڈ سے باہر نکالی تو دونوں سامنے کھڑے ہوئے تھے۔

چچا میاں بولے: ‘‘دیکھو بھئی پہلا کام تو یہ ہے کہ فیکٹری چلیں گے۔ وہاں سے برف کی سلیاں اور قلفیاں خریدتے ہیں۔ تم دونوں ان چیزوں کو ڈبے میں رکھنے میں میرا ہاتھ بٹانا۔

‘‘اس کے بعد کیا ہوگا؟ ’’ می سی پو نے پوچھا۔

‘‘پھر ہم اپنا پھیرا شروع کر دیں گے۔ شہر کے بیچوں بیچ سے شروع کریں گے۔ ہفتے کی صبح وہاں بازار سے سودا خریدنے والوں کی بڑی بھیڑ ہوتی ہے اور لوگ خریداری کے بعد قلفیاں کھانا پسند کرتے ہیں۔ ’’

پہلے سی پو سائیکل پر بیٹھا۔ ڈنڈے پر بیٹھ کر اس نے ہینڈل مضبوطی سے پکڑا تا کہ گرے نہیں۔ پھر چچا میاں گدی پر بیٹھے۔ جی سی پو کو آواز دی اور تینوں چل کھڑے ہوئے۔

چچا میاں سائیکل تیز نہیں دوڑاتے تھے، اس لیے می سی پو ان کے پیچھے پیچھے آسانی سے دوڑتا رہا۔ ذرا ذرا سی دیر کے بعد چچا میاں ہینڈل پر لگی ہوئی بڑی سی سفید گھنٹی بجا دیتے۔ کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بس یوں ہی ہفتے کا دن تھا۔ وہ خوش تھے، اس لیے گھنٹی بجا دیتے تھے۔

دس منٹ بعد سائیکل پر بیٹھنے کی باری می سی پو کو ملی۔ یہ لوگ اب فیکٹری کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ذرا دیر بعد می سی پو کو سائیکل سے اترنا پڑا۔ اس نے برف کی سلوں اور قلفیوں کو ڈبے میں بھرتے وقت چچا میاں کا ہاتھ بٹایا اور پھر سب کے سب روانہ ہو گئے۔ اب کے سائیکل اور زیادہ آہستہ چل رہی تھی، کیوں کہ اس کے ڈبے میں اور مزے مزے کی قلفیاں بھری ہوئی تھیں۔

شہر کے بیچوں بیچ انھیں ایک سایہ دار جگہ مل گئی۔ ذرا دیر بعد پہلا گاہک بھی آ گیا، پھر تو گاہکوں کا تانتا بندھ گیا۔ ان میں سے اکثر چچا میاں سے باتیں کرتے اور ان کی ہنسی مذاق کی باتوں پر خوب ہنستے۔ می سی پو اور سی پو ڈبے سے قلفیاں نکالنے میں مدد کرتے رہے اور ذرا ذرا دیر بعد قلفیوں پر لپٹے ہوئے کاغذ اکھاڑ کر ایک

طرف رکھ دیتے تھے۔ دوپہر تک آدھی قلفیاں بک گئیں۔ چچا میاں کہنے لگے "چلو اب ریلوے اسٹیشن کے باہر کھڑے ہوں گے۔ تھوڑی دیر بعد ایک بڑی ٹرین آنے والی ہے۔ بہت سے مسافر اتریں گے اور اس گرمی میں فوراً قلفی کھائیں گے۔"

ریلوے اسٹیشن کے باہر یہ لوگ ایک بڑے سے آم کے درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ چچا میاں کی بات سچی نکلی۔ قلفیاں خوب بکیں۔ جلد ہی دو تین قلفیاں باقی رہ گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی بک گئیں۔

"چلو چھٹی ہوئی۔" چچا میاں ہنس کر کہنے لگے: "آج کا کام ختم۔" دونوں لڑکوں کو نا اُمیدی ہوئی۔ انھیں قلفیاں بیچنے میں اتنا مزا آ رہا تھا کہ وہ خوشی خوشی اس کام کو جاری رکھنا چاہتے تھے، مگر ساری خوشی ختم ہو گئی کیوں کہ انھیں گھر جانا تھا۔

چچا میاں نے کہا: "ذرا سا کام رہ گیا ہے۔ وہ سامنے جو اسٹور ہے اس میں ایک آدمی سے ملنا ہے۔ بس دس منٹ میں آتا ہوں۔ تم دونوں یہاں ٹھہرو اور سائیکل دیکھتے رہو۔"

چچا میاں سڑک پار کر کے اسٹور چلے گئے۔ دونوں لڑکے بھی پام کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے۔ اسٹیشن سے باہر آنے والوں کو دیکھتے رہے۔ بہت سے مسافر دور دراز سے آئے تھے۔ بہت سا سامان ساتھ تھا۔ دونوں مزے سے دیکھتے رہے۔

اتنے میں اسٹیشن کے اندر سے سیٹی کی زوردار آواز سنائی دی۔ می سی پو نے کہا: "شاید کوئی گاڑی جانے والی ہے۔ چلو ذرا اندر چل کر دیکھیں۔ بس ذرا سی دیر کے لیے چلیں گے۔"

می سی پو کی بات سن کر سی پو نے کہا: "چلو بس فوراً لوٹ آئیں گے۔"

دونوں لڑکے اندر گئے تو ٹرین اسٹیشن سے جانے والی تھی۔ دونوں کچھ دیر کے لیے پلیٹ فارم پر کھڑے رہے۔ بھاری بھرکم انجن سے دُھواں نکل رہا تھا۔ پھر گاڑی کو ایک ہچکولا سا لگا اور ڈبے تیزی سے گزرنے لگے۔ ان میں مسافر بھرے ہوئے تھے۔ کچھ مسافر ہاتھ ہلا ہلا کر اللہ حافظ کہہ رہے تھے اور پھر پلیٹ فارم بالکل سونا ہو گیا۔ دونوں لڑکے آم کے پیڑ کے نیچے اپنی جگہ پہنچ گئے۔ پہلے سی پو نے دیکھا۔ سائیکل وہاں نہیں تھی۔

"سائیکل! یہاں تو نہیں ہے۔" می سی پو کا دل بیٹھ گیا۔

دونوں دوست چاروں طرف دیکھنے لگے۔ اِدھر اُدھر دوڑے۔ سائیکل جہاں کھڑی تھی اسی جگہ کو غور سے دیکھا۔ ہر طرف ڈھونڈا، مگر سائیکل ہو تو نظر آئے۔

سی پو کہنے لگا: ’’شاید چچا میاں اسے گھر لے گئے ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ ہم سے پہلے یہاں آئے ہوں اور ہمیں یہاں نہ پا کر غصے ہوئے ہوں۔‘‘

می سی پو کا دل یہ بات ماننے کو تیار تھا، مگر اسے معلوم تھا کہ یہ سچ نہیں ہے۔ اس نے اپنے دوست سے کہا: ’’سائیکل چوری ہو گئی۔ ہم نے یہاں اسے چھوڑ کر غلطی کی۔ اتنے میں چچا میاں سڑک پار سے آتے دکھائی دیے۔ وہ اسٹور سے نکل کر اسی طرف آ رہے تھے جہاں پر پہلے سائیکل کھڑی تھی۔ وہ مسکرا رہے تھے، مگر جب لڑکوں کے قریب پہنچے اور دیکھا کہ سائیکل غائب ہے تو بھونچکے رہ گئے۔

انھوں نے لڑکوں سے پوچھا: ’’سائیکل کہاں ہے، کیا ہوا، کیا بات ہوئی؟‘‘

تینوں مل کر پولیس تھانے چلے۔ راستے میں می سی پو نے چچا سے کہا: ’’بڑی غلطی ہو گئی ہم دونوں ذرا دیر کے لیے اسٹیشن کے اندر گئے تھے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ اتنی سی دیر میں کوئی سائیکل اٹھا لے جائے گا۔‘‘

چچا میاں چپ رہے۔ می سی پو پھر بولا: ’’چچا میاں مجھے بڑا افسوس ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا۔‘‘

چچا میاں کہنے لگے: ’’بس بھائی چپ ہو جاؤ۔ ایسی بھول کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔‘‘ می سی پو نے پہلے کبھی چچا میاں کو بگڑتے نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنا غصہ برداشت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ می سی پو کو معلوم تھا کہ بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ چچا میاں سائیکل پر قلفیاں بیچ کر روزی کماتے ہیں۔ سائیکل نہیں ہو گی تو وہ بے کار ہو جائیں گے، یہ ساری گڑبڑ اس کی اور سی پو کی غلطی سے ہوئی ہے۔ وہ رہ رہ کے یہی سوچتا رہا۔

تھانے میں پولیس والے نے چچا میاں کی زبانی پوری بات غور سے سنی۔ وہ یہ جانتا تھا کہ سائیکل کیسی تھی، پھر اس نے ایک بڑی سی کتاب میں سائیکل کا پورا حال لکھا۔ لکھنے کے بعد اس نے کتاب بند کر دی اور اسے الماری میں رکھ دیا۔

چچا میاں نے پوچھا: ’’بھائی یہ بڑا شہر ہے۔ سینکڑوں سائیکلیں چوری ہوتی رہتی ہیں۔ ہمیشہ یہ ہوتا رہا ہے۔‘‘

چچا میاں کچھ دیر خاموش رہے۔

’’ہو سکتا ہے کچھ دن لگ جائیں، ممکن ہے ہفتے دو ہفتے لگیں۔‘‘ پولیس والے نے ان کی طرف مایوسی سے دیکھا۔

’’اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو اس سائیکل کے بارے میں سب کچھ بھول جاتا۔‘‘ پولیس والا پھر بولا۔

پولیس والے کی یہ بات سن کر می سی پو حیران رہ گیا، اگر یہ لوگ قلفی والی سائیکل کی چوری کا پتا نہیں لگا سکتے تو پھر ان کا کیا فائدہ۔ ایسے پولیس والے کس کام کے۔

پولیس والا سمجھانے لگا: ’’ہماری کوئی غلطی نہیں۔ ہم لوگ بہت کم ہیں۔ چور بہت زیادہ ہیں۔ ہم اپنی سی کوشش کرتے ہیں مگر........‘‘

چچا میاں نے دھیمے دھیمے انداز میں پولیس والے کا شکریہ ادا کیا۔ دونوں لڑکوں کو ساتھ لے کر تھانے سے باہر آ گئے اور یہاں سے گھر کے لمبے راستے پر پیدل چل کھڑے ہوئے۔

اگلے دن چچا میاں تھانے گئے۔ می سی پو بڑی بے صبری سے ان کا انتظار کرتا رہا۔ شاید سائیکل کی کوئی خبر ملی ہو، مگر کچھ نہ معلوم ہوا۔ اس سے اگلے دن اور پھر اس سے بھی اگلے دن یہی ہوا۔ پھر پولیس والے نے چچا میاں سے کہہ دیا: ’’تم مجھے روز روز تنگ کرنا بند کردو۔ سائیکل مل جائے تو تمھیں اطلاع دے دیں گے۔‘‘

می سی پو نے چچا میاں سے پوچھا’’اب آپ کیا کریں گے۔ دوسری سائیکل خریدیں گے؟‘‘

چچا میاں نے سر ہلا کر کہا: ’’نہیں، اتنا پیسہ کہاں ہے۔ اب قلفیاں بیچنے کا کام ختم۔ سوچتا ہوں مزدوری کروں۔ ایک بلڈنگ بن رہی ہے۔ وہاں مزدوروں کی ضرورت ہے۔‘‘

’’مَیں بھی کام کروں گا۔‘‘ می سی پو کہنے لگا: ’’پھر مَیں پیسے بچا کر آپ کو نئی سائیکل خرید دوں گا۔‘‘ چچا ہنس دیے: ’’بڑی مہربانی، مگر بیٹا تمھیں اسکول جانا ہے۔‘‘

می سی پو کو معلوم تھا کہ سچی بات یہی ہے، مگر اس نے دل میں ٹھان لی کہ ایک نہ ایک دن چچا میاں کو سائیکل ضرور دلائے گا۔ چاہے کتنے دن لگ جائیں، کچھ بھی ہو چچا میاں کے لیے سائیکل ضرور آئے گی۔

تین ہفتے گزر گئے۔ سب نے قلفی والی سائیکل کی اُمید چھوڑ دی۔ ایک دن صبح تڑکے سی پو، می سی پو کے گھر دوڑا آیا۔ جب وہ آیا تو می سی پو بستر ہی میں لیٹا ہوا تھا۔

وہ حیران رہ گیا اور سوچنے لگا کہ آخر یہ اتنے سویرے سویرے کیوں آیا۔

’’بڑی اچھی خبر ہے۔‘‘ سی پو نے زور سے کہا: ’’مَیں سمجھتا ہوں کہ مَیں نے قلفی والی سائیکل دیکھ لی ہے۔ کل رات کو دیکھی ہے۔‘‘

می سی پو کی اُوپر کی سانس اُوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔

’’کہاں؟‘‘ اس نے پوچھا۔

خاصی دور۔ سی پو کہنے لگا: ''یہ کسی کے شیڈ میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری ہی سائیکل ہے۔ چلو پولیس والوں کے پاس چلتے ہیں۔'' می سی پو بولا۔ ''انھیں بتاتے ہیں۔''

سی پو کچھ دیر سوچتا رہا۔

''ہاں مگر پہلے یقین تو ہو جائے۔ پہلے چل کر خود دیکھ لیں، اگر یقین ہو گیا کہ ہماری ہے تو چچا میاں کو بتا دیں گے۔ وہ پولیس والوں سے بات کر لیں گے۔''

می سی پو کو یہ بات اچھی لگی۔ اس نے جلدی سے اپنی اماں اور ابا سے کہا: ''مَیں ذرا سی پو کے ساتھ جا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے جوتے پہنے اور اپنے دوست کے ساتھ چل کھڑا ہوا۔ صبح سویرے کا وقت تھا۔ سڑکوں پر سناٹا تھا، مگر سارے شہر میں مکانوں کے پچھلے حصوں میں مرغے ککڑوں کوں، ککڑوں کوں بول رہے تھے اور کچھ مکانوں کی چمنیوں سے ہلکا ہلکا دُھواں نکلنا شروع ہو گیا تھا۔

سنسان سڑکوں سے گزرتے ہوئے سی پو نے می سی پو کو بتایا کہ اس نے سائیکل کیسے دیکھی۔ کل شام وہ ایک نئے راستے سے گھر آ رہا تھا کہ اچانک قلفی والی سائیکل اس کے پاس سے گزر گئی۔

مجھے یقین نہیں آیا۔ میں چپکا کھڑا ہو گیا۔ پھر سائیکل میرے سامنے سے سڑک پر مڑی اور کسی کے احاطے میں چلی گئی۔ مَیں نے ایک آدمی کو اس پر سے اترتے اور اسے مکان سے ملے ہوئے شیڈ میں کھڑی کرتے دیکھا۔ پھر اس نے اسے ٹاٹ سے ڈھانپ دیا اور اندر چلا گیا۔

جب وہ دونوں اس مکان پر پہنچے تو وہ مکان کے گرد لگی ہوئی باڑھ کے سہارے سہارے شیڈ کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ سی پو کی بات سچی تھی۔ ٹاٹ کا ایک بڑا سا ڈھیر تھا اور اس کے اندر کوئی ایسی چیز تھی جو بالکل قلفی والی سائیکل کی شکل و صورت کی تھی۔

''بالکل سناٹا ہے۔'' می سی پو نے چپکے سے کہا: ''ہم لوگ دبک دبکا کر اندر چلے چلیں اور ایک نظر دیکھ لیں۔''

دونوں چپکے چپکے باڑھ کے نیچے سے دبک کر نکلے۔ شیڈ اور باڑھ کے درمیاں جو کھلی زمین تھی دونوں نے اسے جھپٹ کر پار کر لیا۔ شیڈ کے پاس پہنچ کر انھوں نے بھاری ٹاٹ کا ایک کونا اٹھا کر اس کے نیچے جھانکا۔ انھیں اگلے پہیے پر لگا ہوا بڑا سا ڈبا نظر آیا۔ سفید چمکیلی گھنٹی بھی دکھائی دی۔ ایک موٹر نے دو تین مہینے پہلے پاس سے گزرتے ہوئے ڈبے کو رگڑ دیا تھا۔ ڈبے پر جو نشان پڑ گیا تھا وہ نشان بھی دکھائی دے رہا تھا۔ قلفی والی

سائیکل یہی تھی۔

اچانک ایک کتا بھونکنے لگا۔ می سی پو نے ناٹ کا کونا چھوڑ دیا اور گھوم کر سی پو کو دیکھا۔ سی پو۔ مکان کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

’’کتا اندر ہے۔‘‘ اُس نے چپکے سے کہا: ’’اس نے ہمیں بولتے سن لیا ہوگا۔‘‘

کتا اب زور زور سے بھونک رہا تھا اور دروازے پر پنجے مار رہا تھا۔ اتنے میں کسی کے پکارنے کی آواز آئی۔

’’جلدی کرو۔‘‘ می سی پو نے گھبرا کر کہا: ’’ہمیں یہاں سے فوراً اُڑن چھو ہو جانا چاہیے۔‘‘

لڑکے فوراً ہی شیڈ سے نکلے، نگران کے باڑھ تک پہنچنے سے پہلے مکان کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور ایک لمبا آدمی بھورے رنگ کے کام کرنے کے کپڑے پہنے ہوئے باہر نکلا۔

’’تم تم دونوں بس وہیں رُک جاؤ‘‘۔

لڑکوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ جلدی سے زمین پر لیٹے۔ باڑھ میں سے دبک کر نکلے اور سڑک پر دوڑ گئے۔

آدمی باڑھ کی طرف دوڑتا ہوا آیا اور چلایا: ’’مَیں نے تمھیں دیکھ لیا ہے۔ اب اگر تم دوبارہ آئے تو تم پر کتا چھوڑ دوں گا۔‘‘

لڑکے ہانپتے کانپتے مکان سے دور ہوتے گئے۔ جب ذرا سانس ٹھیک ہوئی، جان میں جان آئی تو دونوں نے می سی پو کے گھر کا راستہ لیا۔ چچا میاں کو بتانا جو تھا کہ انھوں نے کیا ڈھونڈ لیا ہے۔

چچا میاں نے پوچھا: ’’تمھیں پکا یقین ہے کہ وہ میری ہی سائیکل ہے۔‘‘

’’بالکل! قلفی والی سائیکل ہے۔‘‘

’’چلو پھر پولیس والوں کے پاس چلتے ہیں۔ تم ان کو جگہ دکھا دینا۔‘‘

’’یہ کون سی مشکل بات ہے۔‘‘

’’چلو پھر وقت ضائع نہ کرو۔‘‘

پولیس تھانے میں انھیں وہ پولیس والا ملا، جسے اِن لوگوں نے سائیکل چوری ہونے کے بارے میں پہلے پہل بتایا تھا۔

وہ کہنے لگا: ''مَیں بڑا مصروف ہوں۔ دیکھو اللہ کرے وہ تمھاری ہی سائیکل ہو۔''

''ارے صاحب وہی ہے۔'' می سی پو کہنے لگا: ''مجھ سے ایسی غلطی نہیں ہو سکتی۔'' اب کی دفعہ وہ بے کھٹکے مکان کے سامنے جا پہنچے۔

''وہ دیکھیں۔'' می سی پو نے ٹاٹ کے طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''قلفی والی سائیکل اسی ٹاٹ کے نیچے ہے۔''

پولیس والے نے ٹاٹ کو غور سے دیکھا اور مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور لمبا آدمی باہر نکلا۔ یہ وہی لمبا آدمی تھا جسے لڑکے پہلے دیکھ چکے تھے، مگر وہ اس وقت بالکل انجان بن گیا۔

پولیس والے نے پوچھا: ''اس ٹاٹ کے نیچے کیا رکھا ہے۔ ذرا ہمیں دکھائیں تو۔''

''کیوں؟'' آدمی نے کہا: ''یہ میرا احاطہ ہے۔ مَیں جو چاہوں رکھوں۔''

پولیس والا بگڑنے لگا: ''مجھے یقین ہے کہ تم نے ایک چوری کی سائیکل وہاں رکھ چھوڑی ہے۔''

''کیا؟'' آدمی بڑی زور سے چیخا: ''چوری کی سائیکل۔ وہاں تو میری سامان لانے لے جانے کی سائیکل رکھی ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔''

چچا میاں کہنے لگے: ''ثابت تو کیجیے، ذرا ہمیں دیکھنے دیجیے۔''

لمبو میاں نے چچا کو غصیلی نظروں سے دیکھا۔ مکان سے باہر نکلا اور کچھ کہے سنے بغیر انھیں ٹاٹ کے پاس لے گیا اور ٹاٹ ہٹا دیا۔ لال رنگ کی سامان لانے اور لے جانے کی سائیکل۔ قلفی کے ڈبے کی جگہ اس میں تاروں کی ایک بڑی سی ٹوکری لگی ہوئی تھی۔

پولیس والے نے دونوں لڑکوں کو غور سے دیکھا۔ پھر وہ لمبو میاں سے معافی چاہنے لگا: ''بڑا افسوس ہے آپ کو تکلیف دی۔ معاف کیجیے۔''

جب وہ سب گھر پہنچے تو می سی پو نے زور دے کر چچا میاں سے کہا: ''ہم جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ ہم نے قلفی والی سائیکل دیکھی تھی۔ مَیں کہتا ہوں۔''

''مگر بیٹا! وہ قلفی والی سائیکل کہاں تھی۔ تمھیں ایسے ہی خیال آ گیا ہوگا۔''

''جی نہیں خیال نہیں تھا۔'' می سی پو اپنی بات پر اڑا رہا: ''قلفی والی سائیکل وہاں تھی۔ مَیں نے بھی دیکھی ہے۔ سی پو نے بھی دیکھی۔''

”تو بھائی اب تو وہاں ہے نہیں۔ کیا سمجھے؟“

می سی پو چپ رہا۔ کہتا تو کیا کہتا، مگر اسے یقین تھا کہ سائیکل چور وہی ہے۔ اس نے صحیح پہچانا تھا اب اس نے سوچا کہ وہ خود ہی سائیکل کا پتا چلائے گا اور پکا ارادہ کر لیا کہ سائیکل ڈھونڈ کر ہی رہے گا۔ می سی پو جتنا سوچتا اس کا یقین بڑھتا جاتا۔

اس نے سی پو سے کہا: ”مَیں سمجھ گیا کہ ہوا کیا؟“

جب اس آدمی نے ہمیں دیکھا تو اسے ضرور شبہ ہو گیا ہو گا کہ ہم سائیکل ڈھونڈ رہے ہیں چوری کی سائیکل تھی۔ اس لیے وہاں سے ہٹنا ضروری تھا کہیں چھاپا نہ پڑ جائے۔“

”اچھا اچھا مَیں بھی سمجھ گیا۔“ سی پو نے سر ہلا کر کہا: ”اس نے ہماری سائیکل کہیں اور چھپا دی اور لال سائیکل اس کی جگہ رکھ دی۔“

”ہاں ایسا ہی ہوا ہے۔ اب اگر ہم دونوں اسی آدمی کو دیکھتے رہیں تو پتا چل جائے گا کہ اس نے قلفی والی سائیکل کہاں چھپائی ہے۔ ہو گی کہیں اس کے گھر کے آس پاس، کیوں کہ اتنی جلدی کہیں دور نہیں لے جا سکتا۔“

”تو پھر کب سے اس آدمی پر نظر رکھنا شروع کریں؟“

”کل سے۔“ می سی پو بولا ”ایسا کریں گے کہ باڑ کے پاس چھپ جائیں گے اور لمبومیاں کے باہر جانے کا انتظار کرتے رہیں گے۔“

”بہت دیر لگے گی، گھنٹوں لگ سکتے ہیں۔ پورا دن بھی لگ سکتا ہے“ سی پو کہنے لگا۔

”تو کیا ہوا۔ انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔

لمبومیاں کے گھر کے پاس چھپنے کے لیے جگہ مل گئی ہے۔ ایک جھاڑی کے نیچے چھپے رہنا آسان بات نہیں تھی مگر جگہ ایسی تھی کہ کوئی انھیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اور انھیں لمبومیاں کا مکان بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔

گھنٹوں انتظار ہوتا رہا۔ دوسرے مکانوں سے لوگ نکلتے اور سڑک پر جاتے رہے۔ دو ایک آدمی سائیکلوں پر بھی گزرے۔ ایک کچرا گاڑی دھیرے دھیرے چلتی ہوئی گزری، مگر لمبومیاں کے گھر میں سناٹا تھا۔

شام ہو چلی۔ دونوں لڑکے جھاڑی کے نیچے سکڑے سکڑائے گھبرا گئے۔ گرمی بھی لگ رہی تھی اور پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ می سی پو ہمت ہارنے لگا، مگر اسی وقت سی پو نے اس کا ہاتھ دبایا۔

”دیکھنا۔“ اس نے بڑے آہستہ سے کہا: ”وہ باہر آ رہا ہے۔“

می سی پو نے لمبو میاں کو گھر سے باہر آتے دیکھا۔ لمبو نے دروازے میں تالا لگایا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے، گیٹ سے ٹہلتا ہوا باہر نکلا اور سڑک پر چلنے لگا۔

“ذرا انتظار کرو۔ تھوڑا سا آگے بڑھ جائے تو پھر ہم اِس کا پیچھا کریں گے۔” دونوں لڑکے کافی پیچھے رہے۔ لمبو میاں آگے آگے چلتے رہے۔ چلتے چلتے وہ ایک ویران سے مکان کے سامنے پہنچے۔ اس مکاں کا احاطہ خوب بڑا سا تھا۔ لمبو نے دروازے پر جا کر کنڈی کھٹکھٹائی۔

لڑکے مسلسل دیکھتے رہے۔ دروازہ کھلا۔ لمبو گھر کے اندر چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔

“اب کیا کریں۔” سی پو نے پوچھا: “کیا یہی جگہ ہے۔”

“یہ بھی ہو سکتی ہے۔” می سی پو بولا: “دیکھتے ہیں۔”

دونوں لڑکے بڑی احتیاط سے احاطے میں اس طرح پہنچے کہ مکان کے اندر سے کوئی انھیں دیکھ نہ لے۔ گھر کے پیچھے شیڈ تھا۔ می سی پو اسی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ شیڈ میں پہنچنے کے لیے دونوں کو کھڑکی کے پاس سے پیٹ کے بل رینگنا پڑا۔ جیسے سانپ رینگتے ہیں۔ اگر اس طرح نہ رینگتے تو مکان کے اندر والے کھڑکی سے دونوں کو دیکھ لیتے۔

بہت آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے دونوں شیڈ میں پہنچے۔ دروازہ کھولا۔ اندر اندھیرا تھا اور شیڈ خالی سا تھا۔ انھیں کچھ لکڑی کی پیٹیاں نظر آئیں..... اور قلفی والی سائیکل۔

“چلو پولیس کے پاس چلیں۔” سی پو کہنے لگا: “چلو انھیں بتائیں ہم نے پہلے بھی غلط بات نہیں کہی تھی۔”

“وہ آئیں گے ہی نہیں، ٹال دیں گے۔ کہیں گے کہ ہم ایک بار بے وقوف بن چکے ہیں۔”

“تو پھر کیا کریں۔ ساری محنت برباد ہو جائے گی کیا یوں ہی چھوڑ دیں۔”

می سی پو کچھ دیر چپ کا رہا۔ پھر اس نے قلفی والی سائیکل کو گھما کر اس کا رخ شیڈ کے دروازے کی طرف کر دیا۔ سائیکل موڑ کر وہ کہنے لگا: “ہم اپنی سائیکل گھر لے جا رہے ہیں۔ مَیں جیسے ہی اشارہ کروں تم دروازہ کھول دینا۔ پھر تم جھپٹ کر قلفی والے ڈبے پر ٹک جانا اور میں پیڈل مار کر سائیکل نکال لے چلوں گا۔”

سی پو بڑی مشکل سے یہ بات سمجھ پایا، گھر والے انھیں دیکھ لیں گے پھر پیچھا بھی کریں گے۔ ہم لوگ بچیں گے کیسے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

جب می سی پو نے اشارہ کیا تو سی پو نے دروازہ کھول دیا اور دوڑ کر قلفیوں والے بکس پر ٹک گیا۔ می سی پو

نے پیڈل مارنا شروع کیا اور دونوں شیڈ سے نکل کر گھر کے گیٹ پر پہنچے۔ جب وہ گیٹ کے سامنے پہنچ گئے تو اندر سے چلانے کی آواز سنائی دی۔ یہ دونوں جیسے ہی دروازے سے نکلے، لمبومیاں اور ایک آدمی باہر نکلے اور ان کے پیچھے دوڑنے لگے۔

"چور! چور!" لمبومیاں چیخ رہے تھے: "ارے ان لڑکوں کو پکڑو، چور۔"

سڑک پر چلنے والے دو ایک آدمیوں نے تعجب سے دیکھا۔ ایک آدمی سائیکل پر جا رہا تھا۔ وہ فوراً رک گیا۔ لمبومیاں نے چلا کر اس سے کہا: "ان لڑکوں کو پکڑلو۔ انھوں نے میری سائیکل چرالی ہے۔"

سائیکل والا سائیکل پر بیٹھ کر ان کے پیچھے دوڑا اور چیختا رہا: "چور چور"۔

"تیز اور تیز۔" سی پو نے زور دے کر کہا۔ سائیکل والا ان کے قریب آپہنچا تھا۔

"نہیں بھئی میں اس سے تیز نہیں چلا سکتا۔ یہ سائیکل بڑی بھاری ہے۔"

می سی پو زور لگا رہا تھا، مگر قلفی والی سائیکل بہت بھاری تھی۔ تیز نہیں چل سکتی تھی۔ مگر سڑک پر ایک اتار آ گیا تو سائیکل خود بخود تیز ہوگئی۔ پیچھا کرنے والی سائیکل بھی تیز ہوگئی۔ اب وہ کچھ اور قریب آ گئی تھی۔ می سی پو نے گردن گھما کر دیکھا تو وہ آدمی پیچھے پیچھے آ رہا تھا اور اس کے کچھ پیچھے لمبومیاں اور اس کا دوست دوڑتے آ رہے تھے۔

اچانک سی پو چلایا: "ارے ذرا دیکھو کہاں جا رہے ہو؟"

مگر دیر ہو چکی تھی۔ می سی اپنے پیچھے دیکھنے میں آگے نہیں دیکھا۔ سڑک پر موڑ تھا۔ بڑے زور کا دھچکا لگا اور قلفی والی سائیکل سڑک سے پھسل کر کنارے لگی گھاس پر آ گئی۔ می سی پو نے بریک لگایا شاید سائیکل رک جائے۔ مگر سائیکل کیا رکتی۔ کنارے پر ایک باڑھ تھی بہت گھنی نہیں تھی۔ سائیکل اس میں سے تیر کی طرح نکلتی ہوئی سامنے کی ہموار زمیں پہنچ گئی، می سی پو گرتے گرتے بچا۔ بہت اچھا ہوا کہ وہ سائیکل پر جما رہا اور سی پو بھی تکلیف کے باوجود ٹکا رہا۔ می سی پو نے پھر بریک لگایا۔ اس بار کام بن گیا۔ سائیکل رک گئی اور بڑی آرام سے ایک طرف لڑھک گئی۔

دونوں لڑکے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کپڑے جھاڑے پھر انھوں نے سائیکل کو دیکھا۔ یہ بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔

"چلو کام بن گیا۔ سائیکل تو لے آئے۔"

اچانک ایک آدمی برابر کی بلڈنگ سے نکل کران کے پاس آ گیا اور بگڑ کر بولا: ''باڑھ کا تم نے ستیاناس کر دیا۔ کون ہو تم؟''

می سی پو نے دیکھا تو گھبرا گیا۔ وہ آدمی پولیس والا تھا اور بگڑ یوں رہا تھا کہ یہ دونوں لڑکے ایک پولیس تھانے کے پیچھے لگی ہوئی باڑھ سے اس طرح اندر گھس آئے تھے۔

ذرا سی دیر میں ساری باتیں ظاہر ہو گئیں۔ می سی پو پولیس تھانے میں رہا اور سی پو دوڑ کر چچا میاں کو بلا لایا۔ انھیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ سائیکل مل گئی ہے۔ بڑے غور سے اسے دیکھا۔ بڑی مشکل سے یقین آیا کہ اس بار کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ پھر ساری باتیں لکھی گئیں۔ پولیس والوں نے ساری باتیں لکھیں اور پھر چچا سائیکل لے کر چلے۔

می سی پو نے کہا: ''چلو اب گھر چلیں۔ مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔''

چچا کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ انھوں نے سر ہلایا: ''نہیں بھئی ابھی تھوڑا سا کام ہے۔''

دونوں لڑکوں کو حیران دیکھ کر چچا بولے: ''بیٹا! ابھی وقت ہے۔ فیکٹری چلتے ہیں وہاں سے کچھ قلفیاں لیں گے۔ بڑی سی قلفی سے تمھاری بھوک بھاگ جائے گی۔ کیوں بھئی؟''

می سی پو ہنس دیا۔ پھر اس نے سی پو کی طرف دیکھا۔ سی پو نے بھی سر ہلایا۔

اچھا تو چچا میاں! چلیے، ہم دونوں چلتے ہیں۔ بھوک ضرور بھاگ جائے گی۔

☆☆☆☆

اشتیاق احمد

زندگی کے کسی موڑ پر

اس عظیم الشان کوٹھی کے سامنے پہنچ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ اسے محسوس ہوا، وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا ہے۔ دل میں خوش گوار دھڑکنوں کے ساتھ اس نے گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ دور گھنٹی بجنے کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ اس کے تین منٹ بعد دروازہ کھلا۔ سادہ سے لباس والے ایک شخص کی صورت نظر آئی۔ اس نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا:

''جی جناب! فرمایئے۔''

اس کا انداز ایسا تھا کہ جی چاہا بغیر کچھ کہے واپس مڑ جائے، لیکن وہ ملازم تھا اور اسے ملنا کوٹھی کے مالک سے تھا۔ اس کے بارے میں تو وہ جتنا جانتا تھا، اتنا اپنے بارے میں بھی نہیں جانتا تھا، چنانچہ اس نے پر سکون لہجے میں کہا:

''مجھے سیٹھ فخر الدین صاحب سے ملنا ہے۔ وہ مجھے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''سیٹھ فخر الدین! غلط جگہ آ گئے ہو نوجوان۔ یہ کوٹھی سیٹھ فخر الدین کی نہیں، سیٹھ حاکم خاں کی ہے۔''

''سیٹھ حاکم خاں؟'' وہ حیرت زدہ انداز میں بڑبڑایا۔

''ہاں! سیٹھ حاکم خاں مالک ہیں اس کے۔''

یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑا، اسی وقت اس نے جلدی سے کہا:

''سیٹھ حاکم خاں، سیٹھ فخر الدین کے بیٹے ہوں گے، اگر ایسا ہے تو ان کے بچے بھی مجھے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ بس انھیں بتا دیں، عبداللہ بھائی آیا ہے۔''

''وہ کیسے بتا دوں! وہ مجھ پر بگڑیں گے، اس لیے کہ سیٹھ حاکم خاں کے والد محترم کا نام سیٹھ عالم خاں تھا اور وہ کب کے اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔''

''حیرت ہے، یہ سیٹھ حاکم خاں کب سے اس کوٹھی کے مالک ہیں؟''

''یہ مجھے معلوم نہیں۔''

یہ کہہ کر وہ پھر مڑنے لگا۔ ایسے میں اندر کار کا ہارن گنگنا اٹھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس نے فوراً گیٹ کھول دیا۔ اندر سے فوراً چم چم کرتی، ایک کار باہر نکلنے لگی۔ ملازم کا ہاتھ سلیوٹ کے انداز میں اٹھ گیا۔ کار چلانے والے کی نظر اس پر پڑی تو اس نے کار روک لی۔ شیشہ نیچے کرتے ہوئے اس نے کہا:

’’کیا بات ہے نوجوان؟‘‘

’’انھیں کسی سیٹھ فخر الدین سے ملنا ہے۔ غلط آ گیا ہے بے چارہ، میں نے بتا دیا ہے، یہاں سیٹھ فخر الدین نہیں، سیٹھ حاکم خاں رہتے ہیں۔‘‘

’’اوہ!!‘‘ سیٹھ حاکم خاں کے منہ سے نکلا، پھر بولے: ’’یہ ٹھیک ہے، یہ کوٹھی سیٹھ فخر الدین ہی کی تھی۔‘‘

’’جی ۔۔۔ کیا کہا آپ نے!‘‘ ملازم کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔ ادھر عبداللہ بھائی کے چہرے پر رونق آ گئی۔ وہ جلدی سے بولے: ’’اب پھر؟‘‘

’’مدت ہو گئی۔ وہ یہ کوٹھی فروخت کر کے یہاں سے چلے گئے۔‘‘

’’چلے کہاں گئے۔‘‘

’’شہر کے مضافات میں انھوں نے ایک چھوٹا سا مکان خرید لیا تھا۔ اب بھی وہیں رہتے ہوں گے۔

’’کیا ۔۔۔ کیا آپ ان کا پتا مجھے بتا سکتے ہیں! آپ کا احسان ہو گا۔‘‘

’’شام میں کسی وقت آ جائیں، میں پتا دیکھ کر بتا دوں گا۔‘‘

’’جی اچھا!‘‘ اس کے منہ سے نکلا۔

کار آگے بڑھ گئی، وہ وہیں ایک طرف کھڑا رہ گیا۔ جب وہ جانے کے لیے نہ ہلا تو ملازم نے کہا:

’’جاؤ میاں! کہہ دیا انھوں نے، شام کو آ جانا۔‘‘

’’جاؤں گا کہاں! میں تو اس شہر میں مسافر ہوں۔ یہیں دروازے کے ایک طرف بیٹھ جاؤں گا۔‘‘

دروازے کے باہر پودے لگے ہوئے تھے۔ گھاس بھی اگائی گئی تھی۔ وہ گھاس پر بیٹھ گیا۔ اب ملازم کو بھی اس پر ترس آ گیا۔ وہ بولا:

’’اگر ایسا ہے تو تم اندر آ کر بیٹھ جاؤ۔‘‘

’’شکریہ جناب! بہت بہت شکریہ۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اس کا دل بھر آیا۔

کوٹھی کے چاروں طرف پھول دار درخت اور پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ گھاس کی موٹی تہہ جمی تھی۔ وہ اندر آ کر گھاس پر بیٹھ گیا۔

’’پانی پیو گے میاں!‘‘

’’آپ کی مہربانی، اگر پلا دیں۔‘‘

ملازم اسے پانی کا گلاس دے کر چلا گیا۔ اسے تین گھنٹے تک انتظار کرنا پڑا۔ پھر کہیں جا کر کار کا ہارن سنائی دیا۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ ادھر ملازم کے باہر آنے میں قدرے دیر ہو گئی، لہٰذا اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سیٹھ

حاکم خاں کی نظر اس پر پڑی تو انھوں نے حیران ہو کر کہا:

''یہ کیا، آپ ابھی تک یہیں ہیں یا دوبارہ آئے ہیں؟''

''جی، میں یہیں ہوں۔ دراصل میں مسافر ہوں۔ کہاں جاتا، بس یہیں بیٹھ گیا۔''

''اچھی بات ہے۔ میں پتا لا کر دیتا ہوں۔''

''بہت بہت شکریہ۔''

''کچھ کھایا پیا!''

''جی۔۔۔جی ہاں۔'' اس نے جلدی سے کہا اور سیٹھ صاحب آگے بڑھ گئے۔

پندرہ منٹ بعد ملازم ایک کاغذ پر لکھا پتا لے آیا۔ کاغذ اسے دیتے ہوئے اس نے کہا:

''تمھارا شکریہ میاں!''

''جی۔۔۔کیسا شکریہ؟''

''تم نے سیٹھ صاحب کو بتایا کہ تم نے یہاں کچھ کھایا پیا، میں ان کی جھاڑ سے بچ گیا۔''

''اس میں کچھ جھوٹ بھی تو نہیں۔'' وہ مسکرایا۔

لکھے ہوئے پتے پر ایک نظر ڈال کر اس نے ملازم سے ہاتھ ملایا اور گیٹ کی طرف بڑھا۔ ایسے میں سیٹھ حاکم آتے نظر آئے۔ وہ رک گیا کہ ان کا بھی شکریہ ادا کرنا جائے۔ سیٹھ حاکم خاں نے نزدیک آنے پر کہا:

''جب سیٹھ فخر الدین یہاں سے گئے تھے تو اپنا پتا اسی نیت سے لکھوا گئے تھے کہ کوئی ان سے ملنے کے لیے آئے تو اسے پتا بتا دیا جائے۔ خاص طور پر انھوں نے کہا تھا، ایک نوجوان عبداللہ بھائی ملنے کے لیے آئے تو اسے تو ضرور پتا دیا جائے۔''

''جی۔۔۔جی۔۔۔میرا نام ہی عبداللہ بھائی ہے۔''

''اچھا۔۔۔اچھا۔۔۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ! اب میں چلتا ہوں۔''

''آپ کو ان سے کام کیا ہے؟''

''میرا ان سے بہت پرانا ملنا ملانا ہے۔ دراصل میرے والد ان کے ہاں مالی تھے۔ تمام زندگی وہ انھی کے ہاں ملازمت کرتے رہے، یہاں تک کہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔''

''ہوں! میں سمجھ گیا۔''

اس نے سیٹھ صاحب سے ہاتھ ملایا اور باہر نکل آیا۔ پتا پوچھتے پوچھتے، آخر کار وہ سیٹھ فخر الدین کے گھر پہنچ گیا۔

اس نے دیکھا، وہ ایک بالکل چھوٹا سا مکان تھا، وہ بھی شہر کے ایک سرے پر۔ اور یہاں تمام مکانات اسی قسم کے تھے۔ گویا بہت غریب لوگوں کی بستی تھی۔ اس کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر اس نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ دروازے پر دستک دے ڈالی۔ جلد ہی دروازہ کھلا اور ایک نوجوان باہر نکلا۔ اس کے جسم پر بہت معمولی قسم کا لباس تھا:

’’جی فرمائیے!‘‘

’’سیٹھ فخرالدین یہیں رہتے ہیں نا؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’فخرالدین ضرور یہاں رہتے ہیں، سیٹھ فخرالدین نہیں۔‘‘ نوجوان اداس انداز میں مسکرا دیا۔

’’میرا نام عبداللہ بھائی ہے۔‘‘

’’اوہ!‘‘ نوجوان کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا، پھر اس نے کہا:

’’ابا جان اکثر آپ کا اور آپ کے والد کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ میں انھیں بتاتا ہوں۔‘‘

’’بہت بہت شکریہ۔‘‘

تھوڑی دیر بعد نوجوان باہر نکلا۔ اس نے کہا: ’’آئیے۔‘‘

وہ اس کے پیچھے اندر داخل ہوا۔ مکان بہت چھوٹا سا تھا، اس کے صرف تین کمرے تھے۔ وہ سامنے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس نے دیکھا، سیٹھ فخرالدین بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ وہ بہت کمزور نظر آ رہے تھے۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ مشکل سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔

’’السلام علیکم سیٹھ جی!‘‘

’’عبداللہ بھائی! یہ تم ہو، اتنی مدت بعد آئے تو میں سمجھا تھا تم بھی مجھے بھول گئے ہو۔‘‘

’’میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ میرا سارا بچپن آپ کے پاس گزرا ہے۔ آپ کی عنایات، آپ کی نوازشات اور آپ کی مہربانیاں، سب مجھے اس طرح یاد ہیں، جیسے وہ بس کل کی بات ہے۔ لیکن سیٹھ جی! یہ ہوا کیا؟ آپ اور اس چھوٹے سے گھر میں۔ وہ کوٹھی کیوں بیچ دی آپ نے، وہ کارخانہ کیا ہوا؟‘‘

’’وہ۔۔۔ وہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ کاروبار میں اچانک نقصان شروع ہو گیا۔ میں نے اسے سنبھالا دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، لیکن گرتے ہوئے کاروبار کو سنبھال نہ سکا۔ یہاں تک کہ نقصان پہ نقصان نے اس حد تک پہنچا دیا کہ کارخانہ فروخت کر دیا۔ یہ سب نہ ہوتا اگر۔۔۔‘‘

’’اگر کیا؟‘‘

’’اگر میں نے اپنے بچوں کی تعلیم کی فکر کی ہوتی۔ میں نے ان کی تعلیم کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ ہمیشہ یہ سوچا، ہمارے پاس اتنی دولت ہے۔ انھیں کون سی ملازمت کرنی ہے۔ اپنا کاروبار سنبھالیں گے لہٰذا یہ واجبی تعلیم حاصل کر کے

رہ گئے ۔ لیکن جب کاروبار تباہ ہوا، کوٹھی فروخت ہوگئی تب پتا چلا، مجھے کہ کس قدر خوف ناک بھول ہوئی ہے ۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا ۔ چڑیاں کھیت چگ گئیں ۔ اب میرے چاروں بیٹے محنت مزدوری کرتے ہیں ۔''

''ن۔۔۔نہیں ۔'' وہ حیران رہ گیا ۔

''لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، عبداللہ بھائی کو اپنی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آ کر سنائی دی ۔

ادھر سیٹھ فخر الدین کہہ رہے تھے :

''تم نے اپنے بارے میں نہیں بتایا ۔ کیا کر رہے ہو ۔ اتنی مدت بعد میرا خیال کیسے آ گیا ۔''

''وہ بس خیال تو آتا ہی رہا ہے ۔ ان دنوں آپ کچھ زیادہ ہی یاد آنے لگے تھے ۔ اس لیے چلا آیا ۔ آپ کی کوٹھی پہنچا، وہاں آپ کے بجائے سیٹھ حاکم خاں سے ملاقات ہوئی ۔ ان سے پتا لے کر یہاں آنے میں کامیاب ہو سکا ۔''

''سچ پوچھو تو عبداللہ بھائی! اپنا پتا میں نے انھیں تمھارے لیے ہی دیا تھا ۔ میں جانتا تھا، کبھی نہ کبھی تم ضرور ملنے کے لیے آؤ گے ۔ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر تم سے ملاقات ضرور ہو گی ۔''

''ہاں سیٹھ جی!''

اسی وقت سیٹھ صاحب کا بیٹا ایک ٹرے میں چائے کے دو کپ اٹھائے اندر داخل ہوا ۔ اس نے ٹرے ان کے سامنے رکھ دی ۔ خالی چائے کو دیکھ کر عبداللہ بھائی کا دل بھر آیا ۔ یہ تو وہ سیٹھ صاحب تھے، چائے کے ساتھ کیک اور بسکٹ ضرور اس کے لیے منگواتے تھے ۔ اس کی ہر آن مدد کیا کرتے تھے ۔ اسے جب بھی کوئی مسئلہ پیش آتا، وہ ان کے پاس چلا آتا اور سیٹھ صاحب چٹکی بجاتے اس کا مسئلہ حل کر دیتے ۔ اسے تو تعلیم بھی انھوں نے ہی دلوائی تھی اور اب وہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا ۔ ایک دفتر میں ملازم تھا ۔ تنخواہ زیادہ تو نہیں تھی، لیکن اپنے پاؤں پر کھڑا تھا ۔ گھر کی گزر بسر اب اسی کے ذمے تھی اور وہ اس ذمے داری کو بہت خوبی سے نبھا رہا تھا ۔ اب وہ ان سے کہہ رہا تھا:

''سیٹھ جی! وہ دن بھی کیا خوب دن تھے، جب آپ مجھ پر احسانات کی بارش کیا کرتے تھے ۔ کسی سلسلے میں مجھے پریشان نہیں ہونے دیتے تھے ۔ آپ کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں، اتنے احسانات ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا ۔ کاش میں آپ کے کسی کام آ سکتا ۔ آج نہیں تو کل ان شاء اللہ اس قابل ضرور ہو جاؤں گا کہ آپ کی کچھ خدمت کر سکوں ۔''

''نہیں نہیں، تم اس طرح سے نہ سوچو ۔ ہمارا گزارہ بہت آسانی سے ہو رہا ہے ۔ کیا ہوا، جو وہ کوٹھی نہ رہی، وہ کارخانہ نہ رہا، عزت کی روٹی تو مل رہی ہے ۔ بس تم اس طرح سے نہ سوچو ۔''

''اچھی بات ہے ۔ میں اس طرح نہیں سوچوں گا ۔ بہر حال آپ کا مجھ پر بہت احسان ہے اور میں چاہتا ہوں، میں کسی نہ کسی صورت آپ کے کام آؤں ۔''

''میں نے کہا نا، بس تم ایسی باتیں نہ سوچو ۔'' وہ بولے ۔

''اچھا سیٹھ جی! میں اب چلوں گا۔''

''نہیں تم آج رات میرے ہاں رہو گے۔ صبح چلے جانا۔''

''آپ کو میری وجہ سے زحمت ہوگی۔''

''بالکل نہیں ہوگی۔ ہاں، بس میں نے کہہ دیا ہے۔''

اور وہ رات اس نے وہاں بسر کی۔ رات کھانے میں دال روٹی تھی۔ صبح ناشتہ بہت سادہ تھا۔ چائے اور خشک ڈبل روٹی کا ناشتہ۔ اس کے بعد وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم ایسے نہیں جا سکتے' انھوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''جی کیا مطلب؟''

''میں نے کہا تم ایسے نہیں جا سکتے۔'' وہ دھیرے سے مسکرائے۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔''

''تم بہت چھوٹے سے تھے، جب بھی اپنے بابا کے ساتھ کوٹھی آیا کرتے تھے تو یاد ہے میں کیا کیا کرتا تھا۔''

''یہ بھی کوئی بھولنے کی بات ہے، آپ کئی طرح کے پھل، میٹھی چیزیں اور کھلونے مجھے تحفے میں دیا کرتے تھے اور کتابوں اور کاپیوں کا خرچ بھی آپ دیتے تھے۔ یہ باتیں بھی کوئی بھولنے کی ہیں۔''

''بھولنے کی ہیں تو نہیں، لیکن تم بھلائے دے رہے ہو۔'' وہ پھر مسکرائے۔

''جی۔۔۔آپ۔۔۔آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''یہ کہ میں جاننا چاہتا ہوں، اتنی مدت بعد میری یاد کیسے آ گئی۔''

میں نے بتایا تو ہے،

''ملنے کو دل بہت چاہ رہا تھا۔ بار بار آپ یاد آ رہے تھے۔ ویسے سچ یہ ہے کہ آپ کو ہمیشہ ہی یاد کرتا رہا ہوں۔ زندگی کے کسی موڑ پر بھی میں بھول نہیں پایا۔ بس اسی لیے چلا آیا۔''

''نہیں تو۔'' وہ بولے: ''بے شک تم مجھے ہمیشہ یاد کرتے رہے ہو۔ اس وقت جو مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہوا تو اس کی وجہ کچھ اور ہے۔'' اس مرتبہ ان کی مسکراہٹ میں بہت اپنائیت تھی۔

''کیا۔۔۔کیا مطلب؟''

''یہ مطلب تو تم مجھے بتاؤ گے بھئی۔''

''میں کیا بتاؤں!'' اس کا انداز عجیب سا ہو گیا۔

''وہ بتاؤ! جو تم بتانے کے لیے آئے تھے۔ ہمارے حالات دیکھ کر بغیر کچھ بتائے جا رہے ہو۔ میں تمھیں تم سے

زیادہ جانتا ہوں۔ تم لاکھ چھپاؤ، میں تمھارے دل کی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں، لہٰذا جو بات ہے، بے دھڑک بتا دو۔‘‘

’’لیکن سیٹھ جی! اس کا کیا فائدہ۔‘‘

’’بھئی کوئی فائدہ ہو، نہ ہو، دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔‘‘

’’رہنے دیں، سیٹھ جی اور اب مجھے اجازت دیں۔‘‘ اس نے پھر اٹھتے ہوئے کہا۔

اسی وقت سیٹھ فخر الدین نے اس کی کلائی پکڑ لی، اور بولے:

’’میں تمھیں اس طرح نہیں جانے دوں گا۔ آخر میرا بھی تم پر کچھ حق ہے۔‘‘

’’میں بتا تو چکا ہوں سیٹھ جی! بس آپ سے ملنے کے لیے دل بے قرار رہا۔ میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔‘‘

میں اس بات کو نہیں مانتا۔ تم بے دھڑک بات بتا دو۔ ٹھیک ہے میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ کوئی بات نہیں۔ ایک دوسرے کے حالات تو معلوم ہو جائیں گے۔‘‘

’’اچھی بات ہے، آپ کی مرضی۔ امی جان نے چھوٹی بہن کی شادی کی تاریخ دے دی ہے۔ بس اس سلسلے میں کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔ یوں تو ہماری گزر بسر بہت اچھی طرح ہو رہی ہے۔ چھوٹے بھائی بھی اب بہت جلد سرکاری دفتر میں ملازم ہو جائیں گے۔ اس وقت ہمارے حالات اور بہتر ہوں گے یہ تو بس بہن کی وجہ سے ---‘‘ وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

’’میں پہلے ہی یہ اندازہ لگا چکا تھا۔‘‘ سیٹھ صاحب مسکرائے۔

’’اب مجھے اجازت دیں۔‘‘

’’نہیں بھئی۔ اس طرح تو میں تمھیں اجازت نہیں دوں گا۔ ٹھہرو، میں ابھی آیا۔‘‘

یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ جلد ہی ان کی واپسی ہوئی۔ ان کے ہاتھ میں سونے کے زیورات تھے۔ وہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے:

’’انھیں بیچ کر اپنا کام چلا لو۔ میری بیوی کے اچھے وقتوں کے زیور ہیں۔ حالات خراب سے خراب ہو گئے تھے، لیکن یہ زیور اس نے پھر بھی فروخت نہیں کرنے دیے تھے۔ وہ دروازے سے لگی ہماری باتیں سن رہی تھی، جوں ہی میں کمرے میں داخل ہوا، اس نے زیور اتار کر میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ مجھے اس سے کچھ بھی نہیں کہنا پڑا۔‘‘

یہ کہتے ہوئے سیٹھ صاحب کی آواز بھرا گئی۔

’’نن۔۔ نہیں، وہ چلا اٹھا۔‘‘ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

سیٹھ صاحب نے زیور اس کی جیب میں ڈال دیا اور وہ ان کے گلے سے لگ کر سسک سسک کر رونے لگا۔

☆☆☆☆

الطاف فاطمہ

نئے سال کا تحفہ

بوڑھے اور ہزاروں سال پرانے چندا ماموں شاید نئے سال کی اس رات کو کبھی نہ بھولیں گے، جب انھوں نے ایک بہت ہی انوکھا تماشا دیکھا تھا۔

ہاں بھئی؛ کم سے کم وہ تماشا چندا ماموں کے لیے تو بالکل ہی نیا تھا۔ اس لیے کہ ہر نئے سال کی رات تو پورا چاند نہیں نکلا کرتا ہے نا اور جو کبھی نکلا بھی ہو تو کبھی کبھی اس پر بادل بھی چھا جاتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ وہ رات تو پورے دس سال بعد آئی۔ جب دیس دیس کی پریاں، اپنے اپنے دیس کی طرف سے نئے سال کے تحفے لینے جاتی ہیں اور پھر صاف بات یہ ہے کہ اگر انھوں نے کبھی دیکھا بھی ہوگا تو وہ اتنی باتیں دیکھا کرتے ہیں کہ ان کو یاد بھی نہ رہا ہوگا۔

ہاں تو بھئی: وہ نئے سال کی پہلی رات تھی اور چاند کی چودہ تاریخ۔ ٹھنڈی اور سنسان رات میں نیلے آسمان پر ڈھیر سے ڈھیرے چاند کہیں اوپر سے اترا چلا آرہا تھا۔ کبھی کبھی ٹھٹک کر نیچے کو جھانک بھی لیتا تھا۔

چپ چاپ رات میں دریاؤں اور نیلی جھیلوں سے سجی ہوئی، پھولوں سے لدی ہوئی وادیوں والی یہ ہری بھری دنیا کتنی پیاری لگ رہی تھی اور یہی وقت تھا جب دیس دیس کی پریاں سج بن کر نئے سال سے تحفے لینے ہر طرف سے نکلیں۔

آسمان کے نیچے اور وادیوں کے اوپر رنگ رنگ کی تیتریاں سی اڑتی چلی آرہی تھیں۔ ارے ارے تیتریاں ہی تیتریاں: چاند نے خوش ہو کر نیچے کو دیکھا۔ پر یہ تو رات کو نکلا نہیں کرتیں۔ ضرور یہ پریاں ہی ہوں گی؛ چندا ماموں نے ٹھٹک کر سوچا اور تھوڑا سا نیچے کو اور کھسک آئے۔

سچ وہ پریاں ہی تو تھیں۔ دیس دیس کے لباس پہنے چھن من کرتی اوپر اور اوپر کی طرف چلی جارہی تھیں۔

اتنی سردی میں اور رات گئے کہاں چلی جا رہی ہیں۔۔۔ ضرور کوئی بات ہے۔ چاند نے سوچا اور چپکے سے بادل کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی آڑ میں ہو کر ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ سب کو دیکھ رہا تھا اور اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

چھوٹی چھوٹی گڑیوں کے برابر پریاں ایک حلقے کی شکل میں اڑ رہی تھیں۔ الٹی طرف کو جو پری تھی، وہ

جاپانی کمونو پہنے تھی اور ویسے ہی بال بنا رکھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک نازک سی پنکھیا تھی۔ اس سے تھوڑی دور چینیوں کی سی چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور ویسے ہی لباس والی پری تھی۔ وہ اور جاپانی پری ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں۔ چینی پری کے برابر گل اناری رنگ کی پشواز پہنے ہوئے پاکستانی پری تھی۔ اس کے بال کالے تھے اور رنگ بالکل سونے جیسا تھا۔ اس کے بالکل پاس، ماتھے پر بندیا لگائے، کالے بالوں اور سونے جیسی رنگت والی پری تھی۔ چاند نے سوچا ضرور یہ پری بھارت دیس کی ہے۔ بھارت کی پری کے برابر ایک اور پری تھی، جس کی صورت شکل جاپانی اور چینی پریوں جیسی تھی۔ وہ گہرے زرد رنگ کا تہمد باندھے تھی اور ایک ڈھیلی آستینوں والا کوٹ پہنے تھی۔ اس نے اپنے جوڑے میں پھول سجا رکھے تھے۔

اوہو! یہ کس دیس کی پری ہے۔ چندا ماموں نے ایک ذرا کی ذرا سوچا اور ان کو فوراً یاد آ گیا۔ ایسے کپڑے پہنے ہوئے پیاری پیاری لڑکیاں تو برما کے شہر رنگون میں دیکھی تھیں۔ اور پھر اس پری کے بعد ملتی جلتی شکلوں کی بہت سی پریاں بڑی پیاری فراکیں پہنے تھیں۔ ان کے بال سنہرے بھورے اور سرخ تھے۔ ان کے برابر جو پری تھی وہ تو بس بالکل ہی پری تھی۔ کوہ قاف سے کچھ فاصلے پر چپٹے اور چوڑے سے منہ والی ایک گڑیا سی سفید سمور کے کوٹ اور پاجامے کے علاوہ ایک ویسی ہی سفید ٹوپی پہنے تھی۔

اس کو دیکھ کر چندا ماموں نے رہ رہ کر یاد کیا کہ ایسے کپڑے کہاں کے لوگ پہنتے ہیں۔ لیکن ان کو یاد ہی نہ آیا اور وہ اس خیال میں ایسا کھوئے کہ اس کے پاس پاس اڑنے والی پریوں کے لباس بھی نہ دیکھ پائے اب پریوں اور چاند میں تھوڑا فاصلہ رہ گیا تھا۔ کتنی پیاری اور بھولی بھالی ہیں یہ پریاں۔ ایسا لگتا ہے کہ آج دنیا بھر کی ننھی منی لڑکیاں اپنی گڑیوں کی الماریاں بند کرنا بھول گئی ہیں اور ساری گڑیاں چاندنی رات کی سیر کو نکل پڑی ہیں۔ چاند نے سوچا۔ پر ایک بات تھی۔ وہ ساری پریاں روٹھی روٹھی تھیں نہ ہنس رہی تھیں اور نہ آپس میں بول رہی تھیں۔ سب کے منہ پھولے ہوئے اور لٹکے ہوئے تھے۔ بالکل ایسے جیسے سب نے آپس میں کٹی کر رکھی ہو۔

بھئی! یہ کیسی پریاں ہیں۔ چندا ماموں دل ہی دل میں حیران، چندا ماموں کو ان پریوں کی روٹھی روٹھی صورتیں اور لڑائی دیکھ کر بڑا مزا آ رہا تھا اور اب ان کو بھی مذاق کی سوجھی۔ دھیرے دھیرے وہ بادل کے ایک بالکل کالے ٹکڑے کے پیچھے ہو گئے اور ہر طرف گھپ اندھیرا ہوتے ہی پریاں ایک دوسرے کے قریب کھسک آئیں۔

اے بہن! ذرا میرا ہاتھ پکڑ لو نا! ایک فراک والی پری نے کالی پری سے کہا۔ چینی پری بھی کمونو والی جاپانی

پری کے بالکل پاس آ گئی تھی۔ باقی کی سب پریوں کا ڈر کے مارے برا حال تھا۔ پشواز والی اور ساڑی والی پریوں نے رونا بھی شروع کر دیا۔

یا اللہ! یہ چاند کہاں جا چھپا۔ نہ جانے کون سی پری روتی سی آواز میں بولی۔

میں تو کہیں بھی نہیں گیا۔ یہ کیا، بالکل تمھارے پاس تو ہوں بادل کے پیچھے سے چندا ماموں نے جھانکا اور اپنی بھاری بھاری آواز میں بولے شکر ہے کہ چاند ہمارے پاس ہے۔

ایک پری بولی۔

کیوں، کیا بات ہے؟ چندا ماموں نے پوچھا؟

کچھ نہیں ڈر لگ رہا تھا۔

چندا ماموں بولے ہتو یہ تم آدھی رات کو نکل کیوں پڑی ہو اور میں نے سنا ہے کہ پریاں ڈرا نہیں کرتیں۔

بھئی! پتا نہیں کیوں، ہمیں تو بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ پریوں نے جواب دیا۔ اچھے چندا ماموں! اب سامنے آ جایئے نا!

چندا ماموں نے جواب دیا۔ میں سامنے اس شرط پر آؤں گا کہ تم پہلے یہ تو بتاؤ کہ اس وقت تم کہاں جا رہی ہو اور دوسری بات یہ کہ۔۔۔ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ساری پریاں بول اٹھیں۔ ہم دنیا کی چھت یعنی تبت کے سب سے اونچے برف کے تودے کی طرف جا رہے ہیں۔

ارے! اس وقت! جنوری کی پہلی رات کو اتنی سردی میں وہاں جا رہی ہو؟ چندا ماموں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

ایک چھوٹی سی پری نے آنکھیں جھپکا کر کہا بھئی ہاں! اسی وقت تو ہم نئے سال کے سامنے جا کر ناچتے ہیں اور پھر وہ ہم میں سے ہر ایک کو اس کے دیس کے لیے تحفے دیتا ہے۔ ایک اور تیز سی پری نے مٹک کر کہا۔

بھئی! چندا ماموں! اب دوسری بات بھی پوچھ لیجیے اور جلدی سے سامنے آ جایئے۔ وہ بولی۔

دوسری بات یہ بتاؤ کہ یہ سمور والی پری کون ہے؟

ارے! اتنی سی بات! یہ تو لیپ لینڈ کی پری ہے۔ آپ اس کو اس کیمو پری کہہ سکتے ہیں۔ بس اب تو نکل آیئے۔

لو بھئی! نکل آیا!۔۔ اور چندا ماموں جھٹ سے سامنے آ گئے۔ اور پھر چاند کی کرنوں کے ساتھ پریاں تبت کے سب سے اونچے برف کے تودے پر پہنچیں۔

برف کی یہ دنیا کتنی خاموش اور مقدس تھی۔ اوپر نیلا آسمان تھا اور نیچے دودھیا شیشے کی سی ایک دنیا تھی، جس میں چاند تاروں کے عکس سے عجیب عجیب رنگ نظر آ رہے تھے۔ اس گلیشیر کے بیچوں بیچ ایک شمع جل رہی تھی۔ جس سے موم کی ایک ایک بوند پگھلتی آتی اور پھر نہ جانے کدھر چلی جاتی۔

پریوں نے چپکے سے کہا یہ دیکھو! اس شمع کا نام زمانہ ہے اور اس میں سے وقت کا ایک ایک قطرہ ٹپک رہا ہے اور اسی شمع کی لو میں سے نیا سال نکلے گا۔

گلیشیر کے پاس جا کر پریوں نے اپنے جوتے اتار دیے اور ننگے پیر چلتی ہوئی اس شمع کے چاروں طرف کھڑی ہو کر اس کے سامنے جھکیں اور چھم چھم ناچنا شروع کر دیا۔

یہ ناچ اتنا انوکھا اور اتنا پیارا تھا کہ چاند نے اس سے زیادہ خوب صورت چیز کبھی دیکھی ہی نہ تھی۔

ٹھیک بارہ بجے پریاں ایک بار پھر شمع کے آگے جھکیں اور پھر بڑی دیر گزر گئی۔ مگر نیا سال نظر نہ آیا۔

پریوں نے ایک بار پھر ناچنا شروع کیا۔ برفیلی زمین پر ناچتے ناچتے ان کے پیر نیلے پڑ گئے اور سن ہو گئے۔ اب وہ گرنے ہی کو تھیں کہ۔۔۔ شمع کی لو تھرتھرائی اور اس کے بیچ میں سے ایک بیمار اور اداس بوڑھا آہستہ آہستہ نکلا۔

ارے! ہائیں! یہ نئے سال کو کیا ہوا؟ سب پریوں کے منہ سے نکلا اور وہ اس کے سامنے جھک گئیں۔

جلتی ہوئی لو کے بیچ میں بوڑھا اور بیمار سال چپ چاپ ان کو گھورتا رہا اور پھر غصے سے تھرتھراتی آواز میں بولا:

سیدھی ہو جاؤ۔ آج میں تمھارے لیے کوئی تحفہ نہیں لایا۔ آج رات میں تم کو کوئی تحفہ نہیں دوں گا۔۔۔ معلوم ہے کیوں؟ پریوں نے بغیر جواب دیے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے کہتی ہوں تم ہی بتاؤ کہ کیوں؟

اور نیا سال گرج کر بولا۔ میں تم کو ہر سال خوشیاں، اناج اور خوش حالی دیتا ہوں کہ تم دنیا والوں کو ہنسنا اور خوش رہنا سکھاؤ اور تم اس کے بدلے ان کو غصہ اور نفرت سکھاتی ہو۔ ان میں بے چینی پھیلاتی ہو ان کو آپس میں لڑواتی ہو۔ تمھاری ان حرکتوں سے دنیا اداس ہوتی چلی جا رہی ہے۔

تو اس میں ہمارا کیا قصور! دنیا والے خود ہی لڑاکو ہیں۔ ان کو لڑنا بھڑنا اچھا لگتا ہے۔ پریوں نے آہستہ سے کہا۔

اور نیا سال اور بھی زور سے گرج کر بولا، تم جھوٹ کہتی ہو۔ دنیا والوں کو لڑائی اور تباہی نہیں پسند۔۔۔ وہ امن اور خوش حالی چاہتے ہیں۔۔ تم کو دکھاؤں۔۔۔!

یہ کہہ کر نئے سال نے اپنا چاندی کا ننھا سا ڈنڈا گھمایا اور سامنے دنیا ایک بڑے سے گولے کی شکل میں گھومتی نظر آنے لگی۔ وہ دیکھو، سامنے ملک ملک کا کسان اپنی تیار فصلوں کو کس پیار سے دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنی فصلوں کے لیے امن چاہتا ہے۔ اور دنیا کے کونے پر جگہ جگہ تیار فصلوں کے لہلہاتے کھیت نظر آنے لگے۔ اور وہ دیکھو، مائیں اپنے بچوں کو لوریاں دے دے کر سلا رہی ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی خاطر امن چاہتی ہیں۔ دنیا کے گولے کے چپے چپے پر مائیں اپنے بچوں کو گود میں لیے پیاری پیاری لوریاں دے رہی تھیں۔۔ اور دیکھو، استاد کن کن ارمانوں سے اپنے شاگردوں کو کل کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ دنیا کے گولے پر ہر ہر جگہ کلاسوں میں بیٹھے ہوئے پیارے پیارے بچے اور ان کو بڑی محنت سے پڑھاتے ہوئے استاد نظر آ رہے تھے۔ یہ استاد ان کل کے انسانوں کی خاطر امن چاہتے ہیں۔ انسان لڑنا بھڑنا نہیں چاہتے۔ یہ تم ہو جو خود بھی آپس میں لڑتی ہو اور ان کی بے خبری میں اپنی نازک نازک سی چاندی کی چھڑیاں گھما کر ان کے دلوں میں نفرت اور جھگڑے ڈالتی ہو۔۔! چلی جاؤ۔۔! میرے پاس تمھارے لیے کوئی تحفہ نہیں!

پریوں نے ایک زبان ہو کر کہا، پھر بھی کوئی تو تحفہ دیجیے۔ خالی ہاتھ جا کر ہم انسانوں کو کیا دیں گے!

یہ سن کر نئے سال کا سر جھک گیا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر کہا۔ میں انسانوں کی فکر میں اتنا بوڑھا اور بیمار نظر آ رہا ہوں۔ میرے پاس ان کے لیے صرف ایک تحفہ ہے۔ وہ تم لے جاؤ!۔ اور وہ ہے محبت!۔ اس سال تمھارا یہی کام ہے کہ تم دنیا والوں کو محبت کرنا سکھا دو اور دنیا کو تباہی سے بچا لو۔

یہ عجیب تماشا دیکھ کر چندا ماموں کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سب سے اونچے برف کے تودے کے پیچھے جا چھپے اور پھر انھوں نے دور سے دیکھا کہ دیس دیس کی پریاں اندھیرے میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے نیچے کی طرف جا رہی ہیں۔

☆☆☆☆

بانو قدسیہ

صرف دو آنے

سکول کے گراؤنڈ میں رنگا رنگ مینا بازار اب دم توڑ رہا تھا۔ اونچے اُونچے چرخ چوں چوں چرخ چوں چلنے والے پنگھوڑے اب چوکھونٹے پالنے بنے لٹک رہے تھے۔ بیڈمنٹن کے کورٹ کے پاس بورڈنگ ہاؤس کی بتی جل اٹھی تھی۔ اور شامیانے کی ڈھیلی قناتیں جن کے اندر صبح ہر طرف چہل پہل اور انتہائی ہما ہمی تھی۔ اب اپنے بوجھ سے ہی گرا چاہتی تھیں۔ اس مینا بازار کا تقریباً دو ماہ سے بڑی شدت سے انتظار تھا۔ لیکن جتنی جلدی دہی بھلے، تلی ہوئی مچھلی اور مزے دار اور لذیذ شامی کبابوں کے تسلے ختم ہوئے۔ اتنی ہی جلد رنگا رنگ مینا بازار کی رونق ختم ہو گئی۔ سنسان میدان میں سجی ہوئی لڑکیاں سارے دن کی دھما چوکڑی کے بعد اب بچی کھچی کبوتریاں لگ رہی تھیں۔

گیٹ کی طرف سے اسکول کا بس ڈرائیور مختلف پھیروں کا اعلان کر رہا تھا اور لڑکیوں کی ٹکڑیاں پنکھ چھڑاتی مینا بازار کی یاد کو گچھوں کی طرح بازو میں لٹکاتی پنڈال سے رخصت ہو رہی تھی۔ لیکن عذرا سیڑھیوں پر بیٹھی تھی!

اس دھول اٹی قناتوں میں جیسے اس کا دل حلول کر گیا تھا۔ گو اندر ہال میں جانے کی تمام راہیں اب مسدود ہو چکی تھیں۔ شیشوں پر خاکی کاغذ کی دبیز تہوں میں سے کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ لیکن ناہید کی آنکھ اسٹیج کو دیکھ سکتی تھی۔ فٹ لائیٹس جیسے اب بھی اس کی نظروں کو خیرہ کر رہی تھیں۔

میک اپ سے بھرے ہوئے چہرے اس کے سامنے ناچ رہے تھے۔

کبھی میں بھی بڑی ہو جاؤں گی۔

کبھی میں بھی ڈرامے میں حصہ لے سکوں گی؟

یہ حسرت اس کے دل میں کتنی گہری تھی!

کتنی پرانی !!۔۔

اندر گھنگھرو بج رہے تھے اور کبھی کبھی کسی بچے کے رونے کی آواز بھی آ جاتی تھی۔

لیکن وہ حرف بہ حرف ڈرامے کے مکالمے اپنے جی میں دوہرا رہی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے سنسان پنڈال تھا۔ دھندلکے میں ایک طرف مائکروفون ابھی بھی لگا ہوا تھا اور اس میں سے مس یاسمین کی آواز کہہ رہی تھی:

عذرا شیخ کے بھائی اسے لینے کے لیے آئے ہیں وہ جہاں کہیں بھی ہو، باہر پھاٹک پہ چلی جائے عذرا شیخ تو ہال کی سیڑھیوں پہ بیٹھی خالی خولی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ صبح اس کے پاس آٹھ آنے تھے۔ پورے آٹھ آنے۔ لڑکیوں سے بھری ہوئی قناتوں کی طرح کھنکتے مچلتے اور ابلتے ہوئے۔

اور اب؟

اسے صبح یاد آ رہی تھی کس طرح اس نے دو ماہ کی ضد کے بعد نیلا غرارہ اور کرن والا دوپٹہ بنوایا تھا۔ رات کی مہندی لگے ہاتھوں کو دیکھتی وہ سو گئی، تو خواب میں اس نے دیکھا کہ وہ انارکلی ہے اور اسٹیج پہ کھڑی فرفر ڈائیلاگ بول رہی ہے اور ہال میں بیٹھے لوگ اسے خوب داد دے رہے ہیں۔ تڑکے آنکھ کھلتے ہی اس نے سنگار شروع کر دیا تھا۔ آج کتنی آزادی تھی۔ اماں نے نہ تو اسے کریم کا لیپ منہ پہ کرنے سے روکا، اور نہ لپ اسٹک غارت کرنے پہ تنبیہہ کی!

اور پھر جب اس کی سہیلی ناہید نے نچلی منزل سے آواز دی تو وہ جلدی سے اماں کے ساتھ لپٹ گئی:

اماں پیسے --- پیسے اماں!

اماں نے بمشکل تمام دوپٹے کی گرہ کھولی اور ایک اٹھنی اس کے رومال میں باندھتے ہوئے بولیں:

دیکھ سنبھال کر رکھنا کھونا نہیں اٹھنی، اور ہاں اگر بچ جائیں تو واپس لے آنا اس وقت خوشی کے عالم میں سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی عذرا کا خیال تھا کہ اتنے سارے پیسوں کو وہ خرچ ہی بھلا کیسے کر پائے گی، زیادہ سے زیادہ چار آنے خرچ ہو جائیں گے۔ اور باقی وہ چونی بچے گی، وہ بڑی خوشی سے اپنی اماں کو لوٹا دے گی۔

لیکن ----

جب وہ ناہید کی بانہہ میں بانہہ ڈالے دو دہی بھلے کھا چکی تھی تو اسے احساس ہو گیا تھا کہ جلد ہی اس کا رومال خالی ہو جائے گا۔

گراؤنڈ میں رونق بھی تو کتنی تھی:

مچھلی کی گرم گرم کراری خوشبو!

کھٹے آلو چھولے!

اور مرچوں والے چٹنی لگے کباب!

ان سے پرے چکر لگاتی ٹرین اور اس سے ذرا ہٹ کر چو کور ہنڈولے!

کتنی گہما گہمی تھی۔

کیسی رونق تھی کیسا ہنگامہ تھا!

بھلا اس میں اٹھنی کی بساط ہی کیا تھی؟

پھٹی پھٹی بھدی سی آواز مائیکروفون سے آئی:

عذرا شیخ کو اس کے بھائی انجم شیخ بلا رہے ہیں۔ وہ جلد پھاٹک پر پہنچ جائیں۔

لیکن یہ پھٹی پھٹی اور بھدی سی آواز ہال سے اُٹھنے والے قہقہوں میں ڈوب کر رہ گئی۔

وہ پھر سے اپنی جگہ سے اٹھی اور خاکی کاغذ لگے شیشے سے ناک چپکا دی۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دروازہ کھلا، اور تین برقع پوش لڑکیاں ہال سے باہر نکلیں۔

ہائے اللہ! بہت زیادہ تھک گئے ہیں، ایسے بور ڈرامے کے لیے اپنی بس بھی گنوائی۔

دوسری لڑکی بولی:

اور انارکلی کا انتخاب بھی کیا بُرا ہے۔ سارے چہرے پر دانت ہی دانت۔

وہ لڑکیاں ڈرامے پر تبصرہ کرتی ہوئی آگے نکل گئیں۔

عذرا شیخ کو ایک لمحے کے لیے بورڈنگ ہاؤس کی بتی تلے ان تینوں لڑکیوں کے رنگین کپڑے نظر آئے!

اور اس ایک لمحہ میں عذرا کا جی چاہا کہ تینوں لڑکیوں کو گولی سے اڑا دے وہ انارکلی کے خلاف ایک لفظ بھی نہ سن سکتی تھی!

عذرا کی نگاہوں کے سامنے دسویں اے کی ناصرہ گھوم رہی تھی۔

جس میں چاہے حُسن نہ تھا،

صباحت نہ تھی!

لیکن وہ انارکلی تو تھی ہی نا؟

اور انارکلی ہونا کتنا بڑا احساس تھا۔

اسے وہ وقت یاد آ رہا تھا، جب وہ اور ناہید چھپ چھپ کر اس ناٹک کی ریہرسلیں دیکھا کرتی تھیں۔

پھر وہ کتنی حسرت سے ایک دوسرے سے کہتیں:

ہائے اللہ! ہم کب بڑے ہوں گے؟ کب بڑے ہوں گے؟

ان دونوں کو مس خان سے شدید نفرت تھی۔ کیوں کہ وہ ناصرہ آپا کو ہر وقت جھڑکا کرتی تھیں۔ بھلا ناصرہ آپا میں کسر ہی کہاں تھی کہ وہ انھیں اس طرح شرمندہ کرتی تھیں۔۔ بے وقوف مس خان!

اور ایک روز جب وہ کھڑکیوں میں سے جھانک رہی تھیں، تو ناصرہ آپا نے ہمیں دیکھ لیا اور پھر ان کی شکایت کرتے ہوئے کہا تھا:

جی مس، وہ دیکھیں، بچے ادھر دیکھ رہے ہیں، اور مجھے شرم آتی ہے۔

بس ڈیڑھ مہینے کی ریہرسل کے دوران میں میں انھیں ناصرہ آپا سے صرف یہی ایک شکایت پیدا ہوئی تھی۔ گو ناصرہ آپا نے ہماری شکایت کی تھی اور مس خان نے اس شکایت پر انھیں خوب ڈانٹا تھا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے تمام ریہرسلیں دیکھی تھیں کہ سارا ڈراما انھیں حفظ ہو چکا تھا۔

جب وہ دونوں ہنڈولے میں بیٹھی ناصرہ اور شمیم کے مکالمے دوہرا رہی تھیں، اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ کہ تین بجے والا شو دیکھیں گی۔

اس ڈرامے کا انھوں نے پورے دو ماہ تک بڑی شدت سے انتظار کیا تھا۔ بھلا اسے دیکھے بغیر وہ کیسے زندہ رہ سکتی تھیں ------؟

اور اب -----؟

اب بورڈنگ کی لڑکیاں اپنی چارپائیاں بچھانے کے ساتھ ساتھ مینا بازار کے رنگا رنگ پروگرام پر تبصرہ کر رہی تھیں۔

مائکروفون والے اپنی تاریں اکھاڑنے میں مصروف تھے اور قناتیں گرائی جا چکی تھیں!

ہال کے اندر سے اب شام کی گہری خاموشی میں آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

عذرا سوچ رہی تھی:

اگر مجھے آپا جی نے بغیر ٹکٹ کے اندر جانے دیا ہوتا، تو!

اگر اپنی سہیلی کی طرح مجھے بھی ٹکٹ کے بغیر ہی وہ ہال کے اندر دھکیل دیتیں تو؟

اس وقت ڈرامے کے پورے تین سین ہو چکے تھے۔

عورتیں اور لڑکیاں اندر جا چکی تھیں۔

پنڈال میں اب بھی بہت رونق تھی۔ لیکن ہال کی جانب زیادہ رش نہیں تھا۔

اس وقت عذرا آہستہ آہستہ آپا جی سکینہ کی طرف بڑھی وہ ٹکٹوں کی کاپیاں ہاتھ میں لیے ہال کے بند دروازے کے آگے کھڑی تھیں۔

آپا جی سکینہ نے پوچھا:

چار آنے ہیں؟

وہ خاموش رہی۔

اپا جی نے کہا:

اچھا۔۔۔ دو آنے ہیں۔۔۔؟

وہ اب بھی نیچی نگاہیں کیے خاموش رہی۔ آپا جی سکینہ پریشان ہو گئیں۔

کہنے لگیں:

بھئی کچھ تو بولو۔۔۔ خاموش کیوں ہو؟

عذرا شیخ نے آپا جی کی طرف دیکھا اور پھر اس نے اپنی نظریں ان کی خوب صورت سینڈلوں پر جما دیں۔

اسی وقت آپا جی سکینہ کی ایک بہت ہی بے تکلف اور گہری سہیلی آ گئی۔

کہنے لگی:

یہ لو بھئی تین روپے۔

اہا: آپا جی سکینہ خوشی سے آگے بڑھ کر سہیلی کو گلے لگاتے ہوئے بولیں۔ سہیلی نے ڈرامے کے بارے میں پوچھا:

کتنے سین ہو گئے ہیں؟

آپا جی نے جواب دیا:

تین!

اب پھر ان کی سہیلی نے روپے پیش کیے۔ لیکن آپا جی سکینہ نے ایک بہت ہی زوردار قہقہہ لگا کر اسے اندر

دھکیلتے ہوئے کہا:

چل۔۔۔تجھ سے بھی پیسے!

اور پھر آپا جی سکینہ کی سہیلی اندر چلی گئی۔

عذرا کی نگاہیں اس کے قدموں پر لپٹی رہ گئیں۔

اب وہ سیڑھیوں پر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کہ اگر وہ دہی بھلے نہ کھاتی تو شاید اس کی چونی بچ جاتی۔ اگر وہ ہنڈ ولا نہ جھولتی تو اکنی بچ جاتی اور۔۔۔اور اگر ناہید اسے سارے میں دوڑاتی نہ پھرتی اس کے جیب سے سُرخ رومال نہ گر جاتا اور آخری دونی اس کے پاس رہتی اور پھر یک دم اسے ناہید پر بڑا غصہ آ گیا۔۔۔اگر میں اس کی جگہ ہوتی تو اکیلی اندر چلی جاتی؟۔۔۔کیا اپنی سہیلی کو باہر چھوڑ جاتی؟

باہر رات کی سیاہی پھیلنے لگی تھی۔۔۔اندر ڈرامہ آخری سین پر پہنچ گیا تھا اور بچوں کے رونے کی آوازیں اونچی ہو رہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی مینا بازار کتنی جلدی ختم ہو گیا؟ دو ماہ سے جس دن کا انتظار تھا، وہ اتنی جلدی کیوں بیت گیا؟ وہ ڈرامہ جسے دیکھنے کے سپنے دو ماہ سے خواب بنے تھے۔ وہ ڈرامہ اندر ہو رہا تھا اور وہ اندر نہ جا سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ رہے تھے۔ جن میں بورڈنگ ہاؤس کی بتی جل بجھ رہی تھی اور دور کہیں کوئی چیخ رہا تھا۔۔۔عذرا شیخ۔۔۔چھٹی بی۔۔۔بھئی ڈھونڈ واسے کہاں گئی وہ؟

☆☆☆☆

بپسی سدھوا

سات دموں والا چوہا

میں جب چار یا پانچ سال کی تھی تو مجھے اپنے پاؤں کے کئی آپریشن کرانے پڑے تھے اکثر سخت درد ہوتا تھا۔ میری توجہ اِدھر اُدھر کرنے کے لیے میری ماں مجھے اُس چوہے کی کہانی سناتی تھیں جس کی سات دمیں تھیں۔

میں نے یہ کہانی کم از کم سو مرتبہ سنی ہوگی اور اکثر اوقات تو ایک دن میں دس مرتبہ سنی تھی۔ اس کے باوجود اس کی وجہ سے میرا ذہن درد کی طرف سے ہٹ جاتا تھا۔ کم از کم تھوڑی دیر کے لیے۔ میں چھوٹی سی تھی اور میرے چھوٹے ذہن کے مطابق جو کچھ اس چوہے کے ساتھ ہوا تھا وہ اتنا افسوناک تھا کہ اس کے سامنے میری تکالیف ماند پڑ جاتی تھیں۔

یہ وہ کہانی ہے جو میری ماں سنایا کرتی تھیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک چوہا تھا جس کی سات دُمیں تھیں۔ چوہا اکثر پوچھا کرتا امی امی آپ مجھے اسکول کب بھیجیں گی (اُس کی ماں ہر مرتبہ مسکراتی اور کہتی) تم ابھی بہت چھوٹے ہو، جب تم تین سال کے ہو جاؤ گے تو پھر میں تمھیں اسکول بھیجوں گی۔

آخر کار چوہا تین سال کا ہو گیا۔

اس کی سالگرہ کے چند دن بعد چوہے کی ماں نے اُسے اسکول کا بستہ اور ایک لنچ بکس دیا جس میں آملیٹ اور پراٹھا سینڈوچ رکھا ہوا تھا۔ وہ چوہے کا ہاتھ پکڑ کر لے گئی اور اپنے گھر کے باہر اسکول کی بس کا انتظار کرنے لگی۔ جب اسکول کی بس آ گئی تو چوہا خوشی کے مارے پھدکنے لگا اور اُس کی خوبصورت دُمیں دائرے کی شکل میں ایک مرغے کی دُم کی طرح لگنے لگیں۔ چوہے کی ماں اپنا ہاتھ ہلاتی رہی جب تک بس سڑک کے ایک موڑ پر جا کر نظروں سے اُوجھل نہ ہو گئی۔

لیکن جب چوہا واپس گھر آیا تو وہ بہت افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی ماں نے پوچھا کیا بات ہے، تم اتنے افسردہ کیوں ہو! اس نے کہا کہ اسکول میں چالاک چوہوں نے مجھے چھیڑا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ عجیب صورت والے چوہے جس کی سات دُمیں ہیں۔ تم کتنے عجیب و غریب چوہے ہو۔ چوہے نے اپنی ماں سے

کہا ۔ کہ وہ اس کی ایک دُم کاٹ دے ۔ اس کی ماں نے بڑے افسوس کے ساتھ دم کاٹ دی ۔ اس نے کہا کہ اب تمھیں کوئی نہیں چھیڑے گا اور اگلے دن اسے اسکول بھیج دیا ۔

لیکن چوہا اگلے دن پھر روتا ہوا آیا ۔ امی امی چوہوں نے اسکول میں پھر مجھے چھیڑا ہے وہ کہہ رہے تھے کہ عجیب صورت والے چوہے، جس کی چھ دمیں ہیں ۔ تم کتنے عجیب وغریب چوہے ہو ۔ اس نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ اس کی ایک اور دم کاٹ دے ۔ اس کی ماں نے بڑی افسردگی سے ایک دم کاٹ دی ۔

وہ چوہا پھر روتا ہوا آیا ۔

اس کی ماں نے پوچھا کہ اب کیا بات ہے ۔ اپنی آنکھیں ملتے ہوئے اس نے کہا کہ: چوہوں نے اسکول میں اسے چھیڑا ہے وہ کہ رہے تھے کہ عجیب صورت والے چوہے جس کی 5 دمیں ہیں تم کتنے عجیب وغریب چوہے ہو ۔

یہ سلسلہ چلتا رہا چوہا روتا ہوا گھر آتا اور اس کی ماں بڑے افسوس کے ساتھ اس کی دُم کاٹ دیتی ۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ صرف ایک دم رہ گئی ہے ۔

اس کی ماں نے کہا کہ اب تم دوسرے چوہوں جیسے ہوں گئے ہو ۔ اب تمھیں کوئی نہیں چھیڑے گا ۔

چوہا خوشی سے اپنی ایک دُم ہلاتا ہوا اسکول گیا ۔

لیکن چوہا پھر بھی روتا ہوا اور اپنی ناگ رگڑتا ہوا گھر واپس آیا ۔ اس نے کہا کہ امی امی چوہوں نے مجھے چھیڑا ہے ۔ وہ کہہ رہے تھے کہ عجیب صورت والے چوہے تمھاری ایک دُم ہے تم کتنے عجیب وغریب چوہے ہو ۔

اس چوہے نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ اس کی دُم کاٹ دے ۔ اس کی ماں نے آنسو بہاتے ہوئے اس کی آخری دُم بھی کاٹ دی ۔

وہ چوہا پھر روتا ہوا گھر واپس آیا ۔ امی امی چوہوں نے مجھے چھیڑا ہے وہ کہ رہے تھے او چھوٹے چوہے جس کی دُم نہیں ہے ۔ جس کی کوئی دُم نہیں تم کتنے بے وقوف چوہے ہو ۔

میں نے امی سے کہا کہ چوہوں نے اسے کیوں چھیڑا جب کہ اس کی ایک دُم تھی اور وہ اُنہی کی طرح تھا ۔ میری ماں نے کہا کہ اس چوہے نے چلا چلا کر اس قدر اودھم مچایا کہ دوسرے چوہوں کو اسے چھیڑنے میں مزہ آرہا تھا ۔

اگر آپ خود سوچے بغیر دوسرے لوگوں کی رائے پر عمل کرتے ہیں تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے ۔

میرے اتنے اور بہت کچھ کہنے سننے کے باوجود میری ماں نے اس کا اختتام نہیں بدلا ۔

ڈاکٹر توصیف تبسم

کہانی کیسے بنی

بھلے زمانے کا ذکر ہے، دور بہت دور، کسی پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹی سی بستی کے رہنے والے ایک دوسرے سے پیار کرتے، ہر کام میں ایک دوسرے کی مدد کرتے۔ وہاں نہ تو کبھی لڑائی جھگڑا ہوتا اور نہ دنگا فساد۔

اسی بستی میں ایک چھوٹا سا گھر تھا، جس میں دو میاں بیوی رہتے تھے۔ میاں کا نام شانوں اور بیوی کا نام زینب تھا۔ ان کے دو بچے تھے، ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکی کا نام زینو تھا اور لڑکے کو سب دارا کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کی ماں زینب، صبح سے شام تک گھر کا کام کاج کرتی، کپڑے دھوتی، چولہا ہنڈیا کرتی اور پالتو جانوروں کو چارہ ڈالتی، مگر شانو، ان کا باپ دن بھر کچھ نہیں کرتا تھا، بس بیٹھا ہوا تصویریں بناتا رہتا تھا۔ رات ہوتی تو دونوں بچے اپنی ماں سے کہتے کہ ہمیں کوئی کہانی سناؤ، مگر زینب کو کوئی کہانی آتی ہی نہیں تھی۔ بچے یہ سن کر اداس ہو جاتے۔

ایک دن شانو نے اپنی بیوی سے کہا: تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ جا کر ان بچوں کے لیے کہانیاں تلاش کرو۔ زینب نے کہا: ہاں یہ ٹھیک ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے بچوں اور میاں کو خدا حافظ کہا اور کہانی کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ وہ جہاں جاتی، لوگوں اور جانوروں سے پوچھتی، مجھے بتاؤ کہانی کہاں ملے گی مگر کسی نے بھی اس کی کوئی مدد نہیں کی۔

ایک دن جب وہ جنگل میں سے گزر رہی تھی، اس نے ایک ہاتھی دیکھا جو ایک درخت کے نیچے کھڑا اپنے کان پنکھے کی طرح ہلا رہا تھا اور سونڈ اٹھا اٹھا کر جھوم رہا تھا۔ زینب نے ہاتھی سے پوچھا تو اس نے جواب دیا: میرا خیال ہے تم سمندر کی طرف جاؤ اور وہاں جا کر عقاب سے ملو، وہ سارے پرندوں کا بادشاہ ہے۔ وہ ضرور تمھاری مدد کرے گا۔

چلتے چلتے زینب سمندر کے کنارے پہنچ گئی۔ اس نے دیکھا کہ عقاب ایک اونچی چٹان پر بیٹھا ہوا ہے اور اس نے اپنے پنجے میں ایک مچھلی دبائی ہوئی ہے جو شاید اس نے ابھی ابھی سمندر سے پکڑی تھی۔ زینب نے کہا: میری بات سنو۔ عقاب بولا: بے وقوف عورت! اب جب کہ میرا صبح کا ناشتہ پانی میں ڈوب چکا ہے، بتاؤ کیا

کہنا چاہتی ہو۔ زینب بولی: عظیم عقاب، میری مدد کرو، مجھے کہانیوں کی تلاش ہے۔ بتاؤ وہ مجھے کہاں ملیں گی۔ عقاب بولا: مجھے افسوس ہے میں تمھارا کوئی کام نہیں کر سکتا۔ البتہ سمندری کچھوا میرا دوست ہے۔ وہ ہر روز مجھے ملنے یہاں آتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ گہرے سمندر میں ایک دنیا آباد ہے، وہ شاید تمھاری کچھ مدد کر سکے۔ ابھی یہ بات چیت ہو ہی رہی تھی کہ دور سے چھپا چھپ، چھپا چھپ کی آواز آنے لگی۔ آواز نزدیک آئی تو ایک بہت بڑے ہرے رنگ کے کچھوے نے پانی سے سر نکالا۔ اس کی پیٹھ بالکل بڑی میز کی طرح تھی۔ کچھوے نے زینب کی بات سنی تو بولا۔ تم میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ، میں تم کو گہرے سمندر میں لے جاؤں گا، جہاں ایک جادونگری ہے۔ وہاں مجھے امید ہے تمھاری خواہش پوری ہو سکے گی۔

زینب نے کچھوے کا شکریہ ادا کیا اور اس کی پیٹھ پر سوار ہو گئی۔۔ پھر دونوں تیرتے تیرتے بہت دور تک گہرے سمندر میں چلے گئے۔ زینب نے دیکھا کہ یہاں کی ہر چیز بڑی عجیب و غریب ہے۔ طرح طرح کے جانور ہیں، بہت سی ٹانگوں والے جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ کچھ مچھلی اور گھونگے ایسے دکھائی دیئے جیسے وہ شیشے کے بنے ہوئے ہیں۔ جن کے آرپار دیکھا جا سکتا تھا۔ کچھ پانی کے جانوروں کی آنکھیں بجلی کے قمقموں کی طرح جلتی بجھتی تھیں۔

آخر کار زینب اور کچھوا دونوں جادونگری کے راجہ کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ رانی اور راجہ ایک تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ زینب نے جھک کر سلام کیا اور کہا کہ میں کہانیوں کی تلاش میں یہاں تک آئی ہوں۔ رانی نے بہت محبت سے کہا: ٹھیک ہے، ہمارے پاس بہت سی کہانیاں ہیں۔ اس میں سے ہم کچھ تم کو بھی دے دیں گے، مگر اس کے بدلے میں تم ہمیں کیا دو گی۔ زینب نے کہا: مجھے تو بس چولہا ہنڈیا کرنا، کپڑے دھونے، جھاڑو دینا اور بیل بکریوں کو چارہ ڈالنا آتا ہے۔ راجہ نے کہا کہ یہ سارے کام تو ہمارے نوکر کر لیتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنے گھر اور اپنے لوگوں کی کچھ تصویریں لا کر ہمیں دو تا کہ ہم ان کے بارے میں کچھ جان سکیں۔ میں اور رانی جانتے ہیں کہ ہم کبھی تمھاری دنیا کا سفر نہیں کر سکتے۔ تمھیں اس کام کے لیے سات دن دیئے جاتے ہیں۔ زینب نے کہا ہاں! میں یہ کام کر سکتی ہوں۔ اس نے دوبارہ راجہ کو جھک کر سلام کیا اور دوست کچھوے کی پیٹھ پر سوار ہو کر واپسی کا سفر اختیار کیا۔

زینب گھر پہنچی تو بچے اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بولے: ہماری کہانیاں کہاں ہیں۔ زینب نے کہا، ذرا صبر کرو۔ مجھے سانس تو لے لینے دو۔ پھر اس نے اپنے شوہر شانو کو ساری بات بتائی اور راجہ کی فرمائش کا

ذکر بھی کیا۔ شانو بولا: بھلا یہ بھی کوئی کام ہے۔ میں یہ تصویریں بنا دوں گا۔ شانو اپنے رنگوں کی پیالیاں اور برش لے کر بیٹھ گیا اور چند دنوں میں کئی تصویریں تیار ہو گئیں۔ ایک تصویر میں کمہار بیٹھا برتن بنا رہا تھا۔ ایک اور تصویر میں برات جا رہی تھی۔ دولہا آگے گھوڑے پر اور باراتی پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ پالکی میں دلہن بیٹھی صاف نظر آ رہی تھی۔ دلہن کے زیور اور کپڑے بہت ہی خوبصورت تھے۔ ایک دوسری تصویر میں بچے مدرسے میں بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ ان کے استاد بلیک بورڈ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ ایک تصویر بازار کی تھی، دکانیں ہر قسم کے سامان سے بھری اور لوگ، خرید وفروخت میں مصروف تھے۔ غرض یہ اور اسی طرح کی کئی تصویریں شانو نے چند دنوں میں تیار کر دیں۔

زینب یہ تصویریں دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور وعدے کے مطابق ساتویں دن سمندر کے کنارے پر پہنچ گئی، کچھوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ غرض وہ دونوں دوبارہ راجہ کے دربار میں حاضر ہوئے۔ راجہ تصویریں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ زینب نے ہر تصویر کے بارے میں ایک ایک بات راجہ اور رانی کو بتائی۔ رانی نے خوش ہو کر اپنے گلے کی مالا جو خوبصورت گھونگھوں سے بنی ہوئی تھی، اتار کر زینب کے گلے میں ڈال دی۔ راجہ نے کہا کہ ہم نے تمھیں کچھ کہانیاں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ کہہ کر اس نے ایک بڑا گھونگا زینب کو دیا اور کہا ساری کہانیاں اس کے اندر بند ہیں۔ جب تم اس کو اپنے کان پر لگاؤ گی تو یہ تمھیں نئی نئی کہانیاں سنائے گا۔ زینب نے راجہ کا شکریہ ادا کیا اور واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ سمندر کے کنارے پر گاؤں کے بہت سے لوگ جمع ہیں اور اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ لوگوں نے زینب کو دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجائیں۔ انھوں نے کہا: اب تم ہمیں کوئی کہانی کیوں نہیں سناتی ہو۔ زینب گھونگے کو اپنے کان کے قریب لے گئی۔ آواز آئی، ـــــ ”ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ بہت رحم دل اور غریبوں کا خیال رکھنے والا ـــــ“

☆☆☆☆

ثاقبہ رحیم الدین

عقاب

دیکھوتو سورج ابھی پوری طرح ڈوبا بھی نہیں اور چاند نکلنا شروع ہوگیا۔ آج چودھویں کا چاند ہے۔ ہے نا سچی بات کہ جب کہانی رات کی کہی جائے یا شام ڈھلے سنائی جائے تو زیادہ مزہ آتا ہے۔

بہت پرانی بات ہے کہ لاہور میں گلبرگ میں ایک چھوٹے سے گھر میں ایک کاریگر کام کرتا تھا...... ہاں یاد آیا سب اس کو فضل دین کہہ کر بلاتے تھے۔ فضل دین اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ صبح سویرے قالین کی فیکٹری چلا جاتا تھا اور اس کی چار بجے شام چھٹی ہوتی تھی۔ اسے اتنی مزدوری مل جاتی تھی کہ وہ ماں، بیٹے چین سے دو وقت کی روٹی کھا لیتے تھے۔ دونوں سیدھی سادی سکون سے زندگی گزار رہے تھے۔ فضل دین کی ایک عادت یہ تھی کہ صبح اُٹھتے ہی ہمیشہ چڑیوں کو دانہ ڈالتا اور رات کی بچی روٹی فیکٹری جاتے وقت پڑوس کے کتے کو کھلا دیتا تھا۔ پھر اس کے بعد وہ اپنی سائیکل پر جلدی جلدی قالین کی فیکٹری پہنچ جاتا......

دیکھو بچو! فضل دین کچھ بھی پڑھا لکھا نہ تھا اور مالی اعتبار سے معمولی آدمی تھا۔ وہ سادہ طبیعت کا انسان تھا۔ فضل دین کی شکل وصورت اچھی نہ تھی، رنگ سانولا، درمیانہ قد اور کپڑے بہت سستے پہنتا تھا۔ اس میں خوبی تھی تو یہ تھی کہ روز نماز پڑھ کر اپنے پیارے ربّ کا شکر ادا کرتا تھا۔ اور ہاں بچو! اس میں ایک اچھائی یہ بھی تھی کہ وہ کبھی بھی کسی بھی حال میں کسی کی برائی نہ کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ ہر ایک کی تعریف دوسرے سے کرتا ورنہ چپ رہتا تھا۔ کسی کی برائیاں معلوم بھی ہوں تو اپنے تک رکھتا تھا۔

وہ سب میں میل محبت بڑھاتا اور دوستیاں کرواتا تھا اس کا یقین تھا اور وہ کہتا بھی تھا۔ ”یہ دنیا ایک باغ ہے اپنا اپنا کام کرو اور باغ کو ہرا بھرا رکھو“ فضل دین عام طور سے رات کا کھانا جلدی کھا لیا کرتا تھا۔ یہ کئی بار اتفاق ہوا کہ اسے خواب ہی خواب میں سفر پیش آیا۔ عجیب بات ہے کہ وہ لاہور میں پیدا ہونے کے بعد کہیں باہر نہ گیا تھا۔ معلوم نہیں یہ اس کی خواہش تھی یا یہ خواب وخیال تھا کہ وہ سوتے میں دیکھتا کہ ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ سمندر میں تیر رہا ہے۔ کبھی نرم وسفید برف کو چھو رہا ہے اور کبھی ٹھنڈی ٹھنڈی بارش سے بھیگ رہا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے سر کو جھٹکتا کہ کیسے فضول خواب نظر آرہے ہیں۔ فضل دین کی آرزو تھی کہ کاش اس کے پَر ہوتے وہ ملکوں ملکوں کی سیر کرتا۔ ایک دن اس نے نیند میں دیکھا کہ وہ اپنے بنے ہوئے قالین پر بیٹھا اُڑ رہا ہے اور سورج کی کرنیں اس کے گرد جال

بنائے ہوئے ہیں۔ اس کی ماں نے یہ خواب سنے تو اُسے خوب ڈانٹا اور کہا ''سیدھی طرف کروٹ لے کر سویا کرو۔ خواب نہیں آئیں گے'' اب فضل دین یہ بھی سوچنے لگا کہ یہ خواب کیوں آتے ہیں۔

میرے پیارو! میرے بچو! ایک دن کا ذکر ہے کہ وہ پیڑ سے لگا بیٹھا اپنی غلیل ٹھیک کر رہا تھا کہ اس نے دیکھا ایک بالکل عجیب و غریب شکل کا آدمی بڑے سے جانور پر بیٹھا اس کی طرف آ رہا ہے۔ فضل دین نے اپنی آنکھیں ملیں اور بازو میں چٹکی لی کہ یہ واقعی اس کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ پہلے تو وہ اُٹھ کر کھڑا ہوا پھر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ یہ ایک جادوگر ہے جو اژدھے پر سوار ہے۔ وہ یہ سمجھا کہ گلبرگ کے قریبی جنگلوں سے کوئی نیا جانور نکل آیا ہے اور وہ سرکس کے جوکر کو لیے چلا آ رہا ہے۔ مگر نہیں یہ تو واقعی جادوگر تھا۔ اس کے کانوں میں سنہری گھنٹیاں بندھی تھیں۔ زبان کی نوک پر چاقو لٹک رہا تھا۔ لیکن سر پر ٹوپی کی طرح پھولوں کی ٹوکری تھی۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا جو آیا تو جادوگر گنگنانے لگا۔ اس نے فضل دین کا ڈر کچھ کم ہو گیا۔ یہ بڑا انوکھا جادوگر تھا قد و قامت کا لمبا، رنگت سیاہ، آنکھیں چمکیلی اور ناخن اور بال بڑھے ہوئے۔ وہ چلتا تو پیروں سے دھماکہ سا ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں فضل دین کو صرف اس کی مسکراہٹ بھلی لگے چلی جا رہی تھی جادوگر دھیرے دھیرے فضل دین کے قریب آ گیا۔ جادوگر نے اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ اس نے لاہور کی سخت گرمی کا رونا رویا اور یہ بھی کہا کہ اسے بے حد پیاس لگی ہے پھر اسے ایک مشن پر دور جانا ہے۔ فضل دین دوڑا دوڑا گھر گیا۔ پیسے جیب میں لایا اور جلدی سے انار کا شربت خرید لایا۔ فضل دین نے جادوگر کو انار کا شربت پلایا اور اپنی جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھنے کے لیے دیا۔ فضل دین نے اسے درخت کی چھاؤں تلے بیٹھنے کے لیے کہا۔ جادوگر آخر جادوگر تھا اور بادشاہوں جیسا دماغ رکھتا تھا۔ وہ خوش ہو گیا اور جھومنے لگا وہ ذرا دیر میں جھوم جھوم کر ناچنے لگا اور کہنے لگا ''تم اپنی کوئی آرزو بیان کرو جو تمھیں ناممکن معلوم ہوتی ہو۔ ہم اسے پلک جھپکنے میں پورا کر دیں گے'' فضل دین بڑی خوشی سے بولا ''مَیں آسمانوں میں اور سمندروں کے اُوپر سیر کرنا چاہتا ہوں، مَیں دور اور بہت دور اُڑنا چاہتا ہوں، اس کے سوا بس اور کچھ نہیں چاہتا'' جادوگر نے کہا کہ ذرا آنکھیں بند کرو۔ میرے بچو! بس پھر کیا تھا جوں ہی فضل دین نے آنکھیں بند کیں وہ عقاب میں تبدیل ہو گیا۔ وہ عقاب بن گیا جس کے پَر بڑے اور مضبوط تھے اور آنکھیں ایسی تیز جیسے بجلی چمکتی ہو عقاب نے اپنے پَر پھیلائے، سینہ پھلایا اور چونچ آسمان کی طرف اُٹھا کر اپنی تیز آنکھوں سے دیکھنا شروع کیا۔ عقاب کا مارے خوشی اور حیرت کے بُرا حال تھا۔ اس کی دنیا بالکل بدل کر رہ گئی۔ عقاب اُڑا اور خوب اُڑا۔ دن میں، اور رات میں اُڑتا ہی چلا گیا۔

اسے جب کبھی نیند آتی پہاڑوں پر چٹانوں پر اور بلند درختوں پر سو رہتا۔ عقاب کبھی کسی کا مارا ہوا شکار نہیں

کھاتا تھا۔ وہ اکثر چھوٹے موٹے جانور، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کا شکار کر لیا کرتا تھا۔ وہ تالاب، دریا اور سمندر پر سے گزرا اور نیلے آسمان اور سورج کی روشنی سے خوب لطف لیا۔

کچھ عرصے بعد اس کا اُڑان کا شوق پورا ہونا شروع ہو گیا۔ اچھا بچو! اب درمیاں میں نہ بولنا سنو تو میں کیا مزے کی بات سنانے لگی ہوں۔ حیرت کی بات ہے کہ عقاب ایک شہر میں اترا جو امریکہ کے بالکل پاس سمندر میں آباد تھا۔ بچو! عقاب کو خاصی دیر بعد معلوم ہوا کہ یہ شہر نہیں ہے بلکہ سمندر کے بیچوں بیچ ایک جزیرہ ہے۔ مگر نہیں یہ تو شاید مضبوط سا قلعہ تھا۔ عقاب کی عقل میں کچھ نہیں آ رہا تھا پھر اسے اِدھر اُدھر اُڑنے کے بعد پتہ چلا کہ یہ تو گہرے نیلے پانیوں میں ایک حد سے زیادہ بڑا جہاز کھڑا ہے۔ پرانے زمانے میں جب نہ ہم تھے اور نہ تم دنیا میں زبردست جنگ لڑی جا رہی تھی۔

اس وقت ہم مختصراً اتنا ہی بتائے دیتے ہیں کہ یہ جنگ دولت، زمین، اقتدار اور حکومت کے لیے تھی۔ اس میں جرمنی، امریکہ، فرانس انگلینڈ اور بہت سے ملک شامل تھے۔ سارے طاقتور ملک زمین و آسمان اور سمندر میں لڑائی لڑ رہے تھے۔ امریکہ دور دراز محاذوں پر اپنی طاقت استعمال کر کے کامیابی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں امریکہ میں یعنی دوسری جنگ عظیم کے دوران میں میں بڑا جہاز Aricraft Carreirs استعمال ہوا۔ آج تک انسان نے جو جنگی ساز و سامان بنایا ہے اس میں سب سے زیادہ حیران کن اور دلچسپ جنگی مشینری، طیارہ بردار بحری جہاز ائر کرافٹ ہے بچو! اب تم کہو گے یہ دوسرے پانی کے جہازوں سے مختلف اور اس قدر بڑا کیوں ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ بڑے کام اور اعلیٰ منصوبے زندہ قوموں کی پہچان ہوتے ہیں۔ ائر کرافٹ دراصل سمندر میں خوب وسیع جنگی پلیٹ فارم ہے اور جدید سائنسی ٹیکنالوجی کا شاہکار ہے۔ ائر کرافٹ کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ یہ اپنی سرزمین یعنی امریکہ سے دور رہ کر دشمن کے سمندروں میں بھری جنگ میں مصروف رہتا ہے۔ اس جہاز کی دوسری بڑائی یہ ہے کہ جنگ کے دوران میں میں مختلف قسم کے تیز رفتار ہوائی جہاز اس میں اتر سکتے ہیں۔ جہاز میں کئی منزلیں ہیں جہاں ہوائی جہازوں کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ ان کی مرمت اور دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ جنگی سامان سے مسلح کیا جاتا ہے اور جہاز کے عملے کی ضروریات اور تربیت کی جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ یہ جہاز ایک چھوٹے سے جزیرے کی مانند ہے یا اسے سمندر میں تیرتا ہوا طاقتور قلعہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ائر کرافٹ میں چھ ہزار پانچ سو آفیسرز اور دوسرے کارکن موجود ہوتے ہیں۔ ان آفیسرز کی چھ مہینوں بعد پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس جہاز میں دنیا جہان کی رہائشی سہولتیں موجود ہوتی ہیں۔ تم کوئی بھی نام لو وہ یہاں حاضر ہے۔ جہاز میں ہر وقت ہر لمحہ تقریباً آٹھ نو ہزار لوگوں کے سونے کا انتظام، کھانے کے کمرے کیفے ٹیریا، دکانیں، لانڈری، جمنیزیم، لائبریری،

ٹی وی اسٹوڈیو سنیما ہال، ڈاک خانہ، ہسپتال، تارگھر، سوئمنگ پول، ورکشاپ، بنک اور ہر طرح کی سہولت موجود ہے۔ اس جہاز کا وزن (۸۰) اسی ہزار ٹن سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی بارہ سو فٹ اور اس میں تقریباً دو سو پچاس فٹ لمبی سڑک یا رن وے ہوائی جہازوں کے اترنے کے لیے بنی ہوتی ہے۔

دیکھو بچو! بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ ائر کرافٹ سمندر میں رات دن استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہر ائر کرافٹ سمندر میں رات دن استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہر ائر کرافٹ میں نوے ہوائی جہاز رکھے جا سکتے ہیں، جس میں لڑاکا طیارے، آبدوز شکن طیارے، نگرانی کے لیے استعمال ہونے والے طیارے، تلاش اور بچاؤ کے طیارے اور بہت سے ہیلی کاپٹر شامل ہیں۔ اس جہاز میں اپنے ملک کی فضائی نگرانی کے لیے جدید آلات نصب ہوتے ہیں۔ جدید ترین دفاعی میزائل سسٹم نصب ہوتا ہے۔ اس میں دشمن ملک کی بربادی کے لیے تقریباً سترہ تباہ کن جہاز اور انتظامی جہازوں کا بیڑہ بھی ہوتا ہے اور میرے بچو یہ بات مشکل سے سمجھ میں آتی ہے کہ ائر کرافٹ کیرئر میں جنگی مواصلاتی سسٹم تو ہے ہی مگر یہ مواصلاتی سیارے کے ذریعے پوری دنیا میں بیک وقت سو سرکٹوں پر پیغام رسانی کر سکتا ہے۔

تم تو جانتے ہو میرے بچو! عقاب اچھا ذہن اور اچھی نگاہ رکھتا ہے، وہ سب کچھ دیکھتا رہا اور سنتا رہا وہ کبھی آسمان کو دیکھتا کبھی اپنا سر کھجلاتا دور دور پھیلے سمندر میں ائر کرافٹ کیرئر تیس میل کی رفتار سے مسلسل تیرے جا رہا تھا۔ یہ منظر شاندار بھی تھا اور حیرت سے بھرپور بھی۔ واقعی یہ انسانی عقل اور زبردست محنت کا کرشمہ ہے عقاب سوچتا رہا اور سوچتا ہی رہا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اُڑنا بھول گیا تھا عقاب کو اُڑتے اُڑتے کئی دن گزرے، راتیں گزریں اور مہینے گزرے اور وہ خیر سے اپنے وطن واپس پہنچا۔ بس جب سے وہ گلبرگ واپس آیا تھا بیٹھے بیٹھے اس کے سینے میں تیر سا لگ جاتا تھا۔ اس نے کبھی کراچی میں سفر والے بحری جہاز اور جنگی جہاز دیکھے تھے۔ وہ امریکہ میں بھی اور اپنے وطن میں بھی انھی سوچوں میں گم ہو جاتا اور بے چین رہتا تھا۔ ہم پاکستان کیوں نہیں اپنے خون پسینے کی کمائی سے دن رات کام کر کے ائر کرافٹ کیرئر بنا سکتے۔ کیا یہ ہمیشہ ناممکن رہے گا۔ وہ خود سے کہتا تھا۔

چلو میرا کیا، مَیں عقاب ہوں، میرا کام ہے اُڑنا اور اُڑنا میں قاصد کی طرح پاکستان کی خبر دوسرے ملکوں کو دوں گا اور دوست ملکوں کی خبریں اپنے ہاں لاؤں گا۔ کبھی تو کسی کو دنیا کے سب ملکوں کے سامنے پاکستانی جھنڈے کو اُونچا کرنے کا خیال آئے گا۔ واہ بھئی واہ بچو! عقاب بھی یہیں اور فضل دین بھی یہیں۔ فضل دین کا وہی کام اور وہی زندگی بس ہمیں یاد آ رہی ہے۔ اب نیند۔ اب کہانی وہانی اور نہیں سناؤں گی جلدی کرو اور گھر چلو۔ رات ہونے کو ہے۔ پھر کل ہمارے پاس آنا پھر نئی کہانی سُنائیں گے۔ اللہ حافظ!

جبار توقیر

جن کی خواہش

پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جسے خوشی پور کہتے تھے۔ گاؤں کے لوگ بڑے محنتی اور ہنس مکھ تھے۔ مگر اپنی اس خوبی کے باوجود بڑے پریشان رہتے تھے۔ کیوں کہ آئے دن اُن کی گلیوں میں ٹخنے ٹخنے پانی چڑھ آتا تھا۔

اس کے وجہ یہ تھی کہ پاس کی پہاڑی پر ڈنگڈم نامی جن رہتا تھا جو پاگل تو نہیں تھا مگر اُس کی ایک خواہش پاگلوں جیسی ضرور تھی۔ اُسے اپنے درخت جتنے اونچے قد سے سخت نفرت تھی۔ وہ بڑا بھلا مانس اور شریف جن تھا اور چاہتا تھا کہ اُس کا قد عام لوگوں جتنا ہو جائے تا کہ وہ گاؤں کے لوگوں کے ساتھ مل جُل کر زندگی گزارے۔ مگر اُس کی یہ خواہش کسی طرح بھی پوری نہ ہوتی تھی۔

جب بھی جن کی اپنے بانس جیسے قد پر نظر پڑتی وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا اور جب وہ روتا تو گاؤں کی گلیوں پانی سے بھر جاتیں۔

پانی سے بچنے کے لیے گاؤں کے لوگ ہمیشہ گھٹنوں تک اونچے جوتے پہنے رہتے تھے۔

ڈنگڈم کئی دفعہ بادشاہ کی فوج میں شامل ہو کر دشمنوں کے دانت کھٹے کر چکا تھا۔ اس لیے جب بادشاہ کو معلوم ہوا کہ وہ بہت دُکھی ہے تو وہ اس سے ملنے کے لیے آیا۔

کیا بات ہے ڈنگڈم! ہم نے سُنا ہے تم بہت پریشان رہتے ہو۔ بادشاہ نے پوچھا۔

حضور! میرا دل چاہتا ہے کہ میں انسانوں میں مل جل کر رہوں مگر وہ مجھ سے ڈرتے ہیں کیوں کہ میرا قد ان سے بہت لمبا ہے۔ جن نے کہا۔

ارے میاں تمھیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمھارا قد اتنا بڑا ہے۔ بادشاہ کے وزیر نے کہا۔

نہیں نہیں میں اتنا بڑا نہیں رہنا چاہتا۔ میں انسانوں جیسا ہونا چاہتا ہوں۔ لوگ مجھ سے خوفزدہ ہو کر بھاگ جاتے ہیں حالاں کہ میں ان سے محبت کرنا چاہتا ہوں۔ ڈنگڈم نے کہا۔

بہت بہتر ڈنگڈم! ہم تمھارے لیے کوئی تجویز سوچیں گے۔ بادشاہ نے ڈنگڈم کو تسلی دی۔

محل میں واپس آ کر بادشاہ نے فوراً شاہی جادوگر شپ شپ کو بلایا۔ جانتے ہو شپ شپ ہم نے تمھیں کیوں بلایا ہے؟ بادشاہ نے شپ شپ سے پوچھا۔

بندہ تو صرف حکم کا منتظر ہے، شپ شپ نے سر جھکا کر کہا۔ وہ بہت بڑا جادوگر تھا مگر بادشاہ کا ادنیٰ غلام سے بھی زیادہ فرماں بردار تھا۔

تم خوشی پور کی پہاڑی والے جن ڈنگڈم کو جانتے ہو؟ بادشاہ نے پوچھا۔

جی حضور! میں نے اُس کا نام کئی بار سُنا ہے۔ شپ شپ نے جواب دیا۔

اس کا قد بہت لمبا ہے، اسے چھوٹا کرنے کی کوئی دوا تیار کرو۔ بادشاہ نے حکم دیا۔

جو حکم عالی جاہ، شپ شپ نے سر جھکا کر کہا۔

ہمیں ایک ہفتے کے اندر اندر دوا مل جانی چاہیے۔ بادشاہ نے کہا۔

جادوگر سوچ میں ڈوبا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ اُس نے بہت سی رنگ برنگی بوتلوں میں سے سفوف نکالے اور کڑاہی میں ڈال دیے۔ پھر اس کے نیچے آگ جلا دی۔ جب آگ تیز ہوگئی تو اُس نے چولہے کے گرد ناچنا شروع کر دیا۔ وہ ناچتا جاتا تھا اور گاتا جاتا تھا۔

جڑی بوٹی، جڑی بوٹی   پیس پیس کر میں نے کوٹی
کوٹ کوٹ کر بن گیا میدہ   مرے گا جو بھی ہوا ہے پیدا
لیکن پیدا کرنے والے   اے مرے پیدا کرنے والے
ڈنگڈم کا قد چھوٹا کر دے

اس کے بعد شپ شپ نے اس سفوف کی انڈے کے برابر ایک گولی بنائی اور بادشاہ کے پاس پہنچا اور پھر سارے امیر، وزیر، بادشاہ کے ساتھ خوشی پور گئے۔

ہم اپنا وعدہ پورا کرنے آئے ہیں ڈنگڈم! لو یہ گولی کھا لو۔ اس کے کھانے سے تمھارا قد عام آدمیوں جتنا ہو جائے گا۔ بادشاہ نے کہا۔

شپ شپ نے گولی ڈنگڈم کے حلق میں ڈال دی اور پھر سب لوگ بڑے غور سے اس کو دیکھنے لگے۔ لوگوں کو یقین تھا کہ گولی سے ڈنگڈم کا قد چھوٹا ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اُس کا جسم تو ویسے کا ویسا ہی رہا البتہ اُس کی گز بھر لمبی ناک چھوٹی ہونی شروع ہوگئی اور یہاں تک چھوٹی ہوئی کہ چہرے پر ناک کی جگہ ایک نقطہ سا

باقی رہ گیا۔

ڈنگڈم نے گھبرا کر اپنی ناک ٹٹولی اور جلدی سے آئینہ دیکھا۔ جب اُسے اپنی ناک کا اتنا بُرا حشر نظر آیا تو وہ بے تحاشا رونے لگا۔ اس کے رونے سے خوشی پور کی گلیوں میں ایک بار پھر سیلاب آ گیا۔ یوں کہ اس کا ایک بُوند آنسو کا وزن ایک گھڑے سے کم نہ تھا۔ بادشاہ اور وزیر بھی گھٹنوں تک پانی میں ڈوب گئے۔

شپ شپ! بادشاہ نے غضب ناک ہو کر جادوگر کو آواز دی۔

عالی جاہ! شپ شپ کانپتا ہوا آگے بڑھا۔

ڈنگڈم کی ناک کہاں گئی؟ بادشاہ نے پوچھا۔

حضور! یہ سب اس گولی کا اثر ہے اس کی ناک ذرا چھوٹی ہو گئی ہے۔ جادوگر نے کہا۔

شپ شپ تم کہتے ہو اس کی ناک ذرا سی چھوٹی ہوئی ہے۔ ارے بے وقوف! یہ تو بالکل ہی غائب ہو گئی ہے۔ ڈنگڈم رو رہا ہے۔ اس کے آنسوؤں سے خوشی پور میں سیلاب آ گیا ہے اور ہم گھٹنوں تک پانی میں ڈوب گئے ہیں۔ اس کی ناک فوراً ٹھیک کر دو ورنہ ہم تمھیں پھانسی پر چڑھا دیں گے۔ بادشاہ نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

بہت بہتر عالی جاہ! شپ شپ نے خوفزدہ ہو کر کہا اور جلدی جلدی یہ منتر پڑھنے لگا۔

ہڑب - ہڑب - ہڑب

اے کان۔ اے کان۔ اے کان

جن کا مطلب یہ تھا کہ اے ناک بڑے ہو جا۔ اُس نے منتر پڑھ کر ڈنگڈم کی ناک پر زور سے پھونک ماری تو ناک پہلے جیسی ہو گئی۔

بادشاہ مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ گولی ناکام ہو گئی تھی۔ شپ شپ کی جادوگری کا بھرم کھل گیا تھا۔ اب ڈنگڈم پہلے سے بھی زیادہ اُداس رہنے لگا۔ کیوں کہ اس کے دُکھ کا کوئی علاج نہ تھا۔

چند دن بعد شپ شپ نے ایک دو سیر وزنی گولی بنائی اور بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا۔

یہ کیا لائے ہو، شپ شپ! بادشاہ نے گولی دیکھ کر پوچھا۔

حضور میں ڈنگڈم کے لیے ایک اور گولی لایا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اسے کھا کر اُس کا قد ضرور چھوٹا ہو جائے گا۔ شپ شپ نے کہا۔

اگر یہ بات ہے تو پھر ہم آج ہی خوشی پور چلیں گے۔ بادشاہ نے کہا اور امیروں، وزیروں کو کوچ کا حکم دے دیا۔

خوشی پور پہنچ کر شپ شپ نے بادشاہ کے سامنے ڈنگڈم کو وہ گولی کھلائی تو ہر شخص حیرت زدہ رہ گیا۔ کیوں کہ ڈنگڈم کا قد ایک دم گھٹنے لگا اور آدھ گھنٹے کے اندر اندر اُس کا قد عام انسانوں جیسا ہو گیا۔ مگر گھٹنے کی یہ رفتار جاری رہی اور اس کا قد اور چھوٹا اور چھوٹا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ چھوٹا سا بچہ دکھائی دینے لگا۔

کہاں تو ڈنگڈم کا قد تناور درخت جتنا اُنچا تھا اور کہاں وہ اب دو سال کا بچہ نظر آ رہا تھا۔ اس پر بھی اُس کا قد ابھی گھٹ رہا تھا۔ بادشاہ یہ تماشا دیکھ کر بہت پریشان ہوا اور گرج کر بولا:

شپ شپ یہ کیا ظلم ہو رہا ہے؟ اس سے پہلے کہ ڈنگڈم بالکل ہی ختم ہو جائے کوئی علاج کرو۔ ورنہ میں تمھیں ابھی قتل کر دوں گا۔

شپ شپ بے چارہ کانپتا ہوا ڈنگڈم کی طرف لپکا اور اس کے جسم پر ایک سفوف چھڑکنے لگا۔ ساتھ کے ساتھ یہ منتر بھی پڑھتا جاتا تھا۔

گُر۔ گُر۔ گُر۔ ڈنگڈم گُر
یادق کر۔ یادق کر۔ ڈنگڈم رُک

جس کا مطلب یہ تھا کہ اے ڈنگڈم رُک۔ اے ڈنگڈم کے قد رُک۔ اور اصلی حالت پر آ جا۔ تھوڑی دیر میں ڈنگڈم کا قد پھر بڑا ہونے لگا اور چند ہی لمحوں میں وہ اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔

یہ کیا مذاق ہے شپ شپ؟ کبھی تم اس بے چارے کو چھوٹا کر دیتے ہو۔ کبھی بڑا۔ میں تمھیں اس شرارت کی سخت سزا دوں گا۔ بادشاہ نے کہا۔

عالی جاہ! میرا کوئی قصور نہیں۔ دوا کے اجزا میں زیادتی یا کمی ہو جاتی ہے۔ شپ شپ نے کہا۔

واہ تمھاری دوا میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ اور ڈنگڈم کی جان پر بن جاتی ہے۔ تم سخت نالائق آدمی ہو۔ تمھارا یہ کالا علم بالکل فضول ہے۔ بادشاہ نے کہا۔

نہیں حضور! میرا علم صحیح ہے۔ میں ایک دفعہ پھر کوشش کروں گا اور مجھے اُمید ہے کہ اب ڈنگڈم کی خواہش پوری ہو جائے گی۔ شپ شپ نے کہا۔

جادوگر کی یہ بات سن کر ڈنگڈم زار زار رونے لگا اور بولا: نہیں نہیں۔ میں اب کوئی گولی نہیں کھاؤں گا۔ میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے مجھ سے اب کھڑا بھی نہیں ہوا جاتا۔ میں اب بالکل گولی نہیں کھاؤں گا۔

شپ شپ کوئی اور تجویز سوچو۔ گولیوں سے کام نہیں چلے گا اور ڈنگڈم تم آرام کرو۔ اور رونا بند کر دو۔

ورنہ خوشی پور میں پھر سیلاب آجائے گا۔ بادشاہ نے کہا۔

شپ شپ گھر جا کر دن رات اس کوشش میں لگا رہا کہ کسی نہ کسی طرح کوئی ایسا نسخہ ہاتھ آجائے۔ جس سے ڈنگڈم کا قد عام انسانوں جتنا ہو جائے۔ آخر کار اس نے ایک ایسا شیشہ ایجاد کیا جسے آنکھوں پر لگانے سے چیزیں بڑی نظر آتی تھیں۔ شپ شپ بہت خوش ہوا اور وہ بادشاہ کو ساتھ لے کر ڈنگڈم کے پاس جا پہنچا۔

لے بھی ڈنگڈم! اب تیری خواہش پوری ہو جائے گی۔ تو ذرا اس عینک کو آنکھوں پر لگا کر دیکھ۔ تجھے عجیب کرشمہ نظر آئے گا۔ شپ شپ بولا۔

ڈنگڈم نے عینک آنکھوں پر لگائی تو خوشی سے دیوانہ ہو کر ناچنے لگا۔ اسے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ اپنے ہی جتنے بڑے دکھائی دے رہے تھے۔

وہ قہقہہ لگا کر بولا: اب سب لوگ میرے برابر ہو گئے ہیں۔ میں تو چھوٹا نہ ہو سکا۔ البتہ انسان میرے جتنے بڑے ہو گئے۔ خدا تمھارا بھلا کرے شپ شپ! اب میں خوشی پور کے لوگوں کے ساتھ رہا کروں گا۔

ڈنگڈم خوشی پور میں ہنسی خوشی رہنے لگا۔ پھر کبھی اُس کی آنکھوں سے ایک آنسو نہ ٹپکا۔ اور خوشی پور کی گلیاں ہمیشہ کے لیے سیلاب سے محفوظ ہو گئیں۔

☆☆☆☆

حسن منظر

کُبڑا نیم

نشو کے گھر کے احاطے میں جو نیم کا درخت تھا کسی کو اس سے لگاؤ نہیں تھا۔ بس نجانے کتنے سال پہلے خود اُگ آیا تھا اور بڑا ہوتا گیا۔ نشو اور اس کے بھائی بہنوں کو کبھی نہ اس پر چڑھنے کا خیال آیا نہ جھولا ڈالنے کا۔ گھر کے بچے بڑے اُسے کبڑا نیم کہتے تھے حالاں کہ یہ کبڑا نہیں تھا۔ اس سے ان کی مراد ہوتی تھی کہ بوڑھا ہو چکا ہے۔

پیڑوں سے محبت رکھنے والے، پودوں کی طرح، کبھی انہیں بھی پانی دے دیتے ہیں یا جڑوں کے پاس کھاد پھیلا دیتے ہیں مگر نشو کے گھر والوں کو کبھی اس کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ یوں بھی اس کے گھر میں کسی کو نہ کبھی پودوں کی کیاریاں بنانے کا شوق ہوا نہ پھولوں کے گملے رکھنے کا۔ احاطہ خود اُجڑا پڑا تھا۔ ایک طرف کی دیوار ڈھے گئی تھی اسے بھی بڑوں نے ٹھیک نہیں کروایا۔ نیم کے پھول گرتے تھے تو نشو کی ماں کو شکایت ہوتی تھی۔ بالکل بے مصرف پیڑ ہے، بس پھول اور پتے سوکھ سوکھ کر گرتے رہتے ہیں، کوڑا ہوتا ہے۔ آم، امرود کا پیڑ ہوتا تو بات تھی یا املی کا ہوتا تو کٹارے کھانے کو ملتے

بہن کہتی: یا شریفہ ہوتا اور کچھ نہ سہی گوندنی کا پیڑ ہوتا۔

غرض سب کو نیم کے پیڑ سے شکایت تھی۔ جب نبولیاں پک کر ٹپکتی تھیں تو کبھی کبھار محلے کے بچے دیوار پھاند کر آ جاتے۔۔۔ وہ تھی ہی کتنی اونچی۔۔۔ اور دو ایک کو چوس کر ان کی گٹھلیاں تھوک کر چلے جاتے تھے۔ جیسے تیسے ہی پر ان کا دل بھر جاتا تھا۔ جدھر سے دیوار ٹوٹی تھی کتے، گدھے اور بکریاں بھینسیں گھس آتے۔ ان میں سے بھی کوئی پہلی نبولیوں کو منہ نہیں لگاتا تھا۔ نشو کے باپ نے ایک دفعہ نیم کا ایک شاخ توڑ کر اس کی دتون بنائی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر دانتوں پر پھیر کر لاحول ولا قوۃ کہتے ہوئے پھینک دی۔ بولے 'یہ بھی کوئی دتون ہے!'

نشو کے دادا نے کہا: 'جڑیں زمین چھوڑ رہی ہیں اس کے دن پورے ہو گئے ہیں'

'نیم کے جیسے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ خود اس اجاڑ گھر میں کب خوش تھا۔ جس کے لق و دق کچے احاطے میں نہ کبھی جھاڑو ڈالتی تھی نہ گرمیوں میں شام کو پانی چھڑکا جاتا تھا۔ وہاں تو گدھے لوٹتے تھے اور یہاں

وہاں ٹھیکرے اور کنکر پڑے تھے۔ اور وہاں لید اور گوبر۔

مگر 'دن پورے ہو گئے ہیں' والی بات نیم کو کھا گئی۔

'یہ لوگ بھول گئے ہیں ان کے پردادا کا جب انتقال ہوا تھا تو میرے ہی سائے میں ان کا سیاہ کپڑے سے ڈھکا ہوا ڈولا رکھا گیا تھا اور یہیں نماز جنازہ ہوئی تھی۔ انہیں نہیں معلوم ان سے پہلے ان کے کتنے ہی مرنے والوں کے جنازے میرے ہی سائے میں رکھے گئے تھے۔ اور ان سب کی نماز جنازہ پڑھی گئی تھی۔ بے چارہ رو پڑا۔ اسے وہ وقت بھی یاد آ رہا تھا جب کسی کو یرقان ہوتا تھا یا چیچک تو اس کے پتوں کی ہوا دینے کے لیے محلے والے اس کی شاخ کاٹ کر لے جاتے تھے اور یہ کام خود نشو کے گھر والے بھی بارہا کر چکے تھے۔ دادا نے اپنی کتابوں میں اس کی سوکھی پتیاں رکھ رکھی تھیں کہ دیمک نہ لگے۔ آج یہ لوگ سب احسان بھول گئے تھے۔ اس کا دل بھر آیا۔

اصل میں اس گھرانے کے بچے گلیوں میں کھیلتے تھے یا اپنے اسکول میں۔ شام کو ان کے پاس ٹیلی ویژن کے علاوہ کسی اور چیز کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔ بس سب ٹیلی ویژن کو گھیرے رہتے۔ کوئی ملنے والا آئے اس کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا، وہیں بیٹھے بیٹھے کھانا کھاتے تھے یا آپس میں لڑتے تھے۔ ہر ایک چاہتا تھا اس کی پسند کا پروگرام دیکھا جائے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے سب کو نیند آنے لگتی تھی۔

جس دن وقت پورا ہو گیا والی بات ہوئی نیم اتنا رویا کہ گھر میں کام کرنے کے لیے آنے والی بڑھیا جو اس کے پاس سے ہو کر اندر آئی تھی بولی: 'بی بی تمہارا نیم بڈھا ہو گیا۔ رو رہا ہے۔'

پہلے گھر کے سب بچے نیم کو دیکھنے گئے اور پہلی بار انہیں اس میں دلچسپی ہوئی۔ پھر نشو کے ابا اور ان کے بھائی باہر نکل آئے، اور آخر میں دادا ابا۔

دادا بولے: 'پہلے بھی کہہ چکا ہوں اس کی جڑیں باہر نکل آئی ہیں۔ بچے گا نہیں، مر جائے گا۔'

ایک لڑکی نے کہا: 'دادا ابا اسے دیمک بھی کھا رہی ہے۔' حقیقت میں اس نے اس مٹی کی لائن کو دیکھا تھا جو جوہڑ میں نہا کر آنے والی بھینس کے اپنے پُٹھے اور کھوے کو درخت کے تنے سے رگڑنے سے لگی رہ گئی تھی۔ اسے مٹی کی لائن دیمک کا گھر لگی۔

وہاں دانا منہ میں سنبھالے اوپر چڑھتی ہوئی چیونٹیوں کی قطار سب کو نظر آئی۔ دوسرے بچے بولے: 'ہاں اور دیمک چل بھی رہی ہے۔'

نشو کے دادا نے کہا: 'ایک دن تو اسے مرنا تھا ہی ۔۔ شاید میرے تایا ابا نے لگایا تھا'

'پھر؟' اندر سے نشو کی دادی کی آواز آئی ۔

'پھر یہ کہ اس کا رونا دنوں نہیں تھمے گا اور جو روئے گا وہ اس کا تیل ہوگا ۔۔۔۔ نیم کا تیل ۔۔۔۔ اسے بوتلوں میں بھر لینا'

'اسے کون پیئے گا' ایک چچی نے کڑواہٹ سے کہا ۔

دادا نے کہا: 'بڑے کام کی چیز ہے، گھاؤ پر لگاؤ یا آبلوں دانوں پر ۔ پیو تو اندر کے زہر مارتا ہے' ۔

تائی نے کہا: 'تو اب کیا ہم اس کا انتظار کریں کہ کسی کے گھاؤ لگے تو اس پر لگائیں گے، اور پیئے گا کون!'

نشو کے دادا نے کہا تو جب اس کا رونا تھمے اور سوکھ جائے تو کٹوا لینا ۔ لکڑی جلانے کے کام آئے گی' ۔

لیکن سب کی رائے ایک ہوئی اس کا رونا ایسا ہے جیسے الو کا بولنا ۔۔ ایک دم منحوس ۔ نجانے کب تھمے ۔ اس سے پہلے بھی ان لوگوں کو بارہا نیم کو کٹوانے کا خیال آیا تھا لیکن ہر دفعہ کسی نہ کسی کے کہنے سے کہ ہرے بھرے پیڑ کو کٹوانا گناہ ہے' اس کی جان بچ گئی تھی ۔ آج نشو کے بابا نے کہا تو ٹھیک ہے کل میں مزدوروں کو بلوا کر اسے کٹوا دوں گا'

شام ہو گئی تھی سب اندر چلے گئے ۔

'کتنے ناشکرے لوگ ہیں، میرے مرنے کا انتظار ہمیشہ سے کر رہے تھے ۔ آج کٹوانے کا سوچ رہے ہیں ۔ کبھی کسی سے اتنا نہ ہوا کہ ایک کٹورا پانی ہی میری جڑوں پر ڈال دیتا!' نیم کا دل رو رہا تھا ۔ آس پاس کوئی اور درخت بھی نہیں تھا جسے اپنا دکھڑا سنا سکتا ۔ حد یہ تھی کہ احاطے میں گھاس تک نہ تھی جو اس کے دکھ میں شریک ہو جاتی ۔

رات اندھیری تھی اور ہر طرف سناٹا تھا ۔ یہ گھر اور گھروں سے تھوڑا ہٹ کر تھا ۔ آج سے پہلے نیم کو کبھی ڈر نہیں لگا تھا ۔ اس ساری رات اس کا ایک پتا تک نہیں ہلا ۔ کوئی دیکھتا تو کہتا: کھڑے کھڑے سو گیا ہے یا سوگ میں ہے ۔ جب آسمان میں اُدھر ہلکی سرخی آ چلی تھی جدھر سے سورج اندھیرے میں سے سر نکال کر جھانک کر دنیا کو دیکھتا ہے تو جی کڑا کر کے نیم نے فیصلہ کر لیا ابھی وقت ہے ان بے مہر لوگوں سے دور نکل جانے کا ۔۔ ذرا دن اور نکلا تو جا کر کسی لکڑہارے کو بلا لائیں گے اور وہ بے دردی سے میری ان خوبصورت، مضبوط جڑوں پر کلہاڑا چلانا شروع کر دے گا ۔ میں نے درختوں کا یہ حشر پہلے دیکھا نہیں ہے! زندہ جڑوں کو کاٹتے

ہیں، پھر زندہ ہرے تنے پر کلہاڑے برساتے ہیں، آرا چلاتے ہیں اور جب وہ ادھ موا ہو جاتا ہے تو رسے ڈال کر گرا لیتے ہیں۔

پہلے یہاں کتنے درخت تھے! اب ایک بھی دیکھنے میں آتا ہے؟ اور تو اور میرے سائے میں آگ جلا کر اس پر دیگیں چڑھاتے ہیں۔ اتنا نہیں سوچتے اس سے اس کے پتے جھلس جائیں گے۔

سوچتے سوچتے اس کا خون کھول اٹھا۔ جی کڑا کر کے اس نے ہلنے کی کوشش کی اور بولا 'بلا سے زور لگانے سے جڑیں ننگی ہو جائیں۔ زندگی ہوئی تو پھر کہیں لگ جائیں گی۔ ان سنگدلوں سے دوری تو کسی طرح ہو'۔

اس نے گھر کے صحن پر نظر ڈالی، کوئی چلتا پھرتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ 'ابھی وقت ہے' اس نے خود سے کہا اور زور لگا کر جڑوں کو اکھیڑنا شروع کیا۔ لیکن اتنے گزرے ہوئے سالوں میں انہیں زوردار سے زوردار آندھی بھی نہیں اکھاڑ سکی تھی بھلا آسانی سے زمین کو چھوڑ دیتیں! وہ چڑچڑائیں۔ بے چارہ درخت زور لگاتا، زور لگاتا تھکا جا رہا تھا۔ جانتا تھا جان سب کو پیاری ہوتی ہے اور میری ہی خاطر یہ مٹی کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔

دن نکل رہا تھا۔ نیم نے آخری بار پوری قوت سے جڑوں کو زمین میں سے کھینچا اور جب ان کے پنجے سے زمین چھوٹی تو نیم خود دہل گیا۔ ساتھ ہی شور مچاتے کوے اڑے۔ جگائے جانے پر کائیں کائیں کر رہے تھے اور خوف زدہ بھی تھے کیونکہ ان کے گھونسلوں میں انڈے بھی تھے اور ان کے گرنے کا ڈر تھا۔ درخت نے سانس چھوڑتے ہوئے کہا: 'شکر ہے' اور احاطے سے باہر نکلنے کے لیے بھاگنا شروع کیا۔

راستے میں جو دیوار تھی وہ پہلے ہی کب مضبوط تھی جو اب اس کا راستہ روک سکتی۔ تھوڑی ہی دیر میں جڑوں پر چلتا ہوا وہ نشو کے گھر سے اتنی دور ہو چکا تھا کہ اگر وہاں کوئی چھت پر چڑھ کر بھی دیکھتا تو وہ اسے نظر نہ آتا۔

باہر کھلی ہوا میں پہنچ کر اس کا خوف دور ہوا اور کچھ دیر تھم کر اس نے سانس درست کیا۔

چاروں طرف پھیلے ہوئے کھیت ابھی تک سوئے سوئے سے تھے اور اس کا جی چاہ رہا تھا یہیں رُک جاؤں۔

لیکن یہ جگہ آبادی سے دور نہیں تھی۔ تھوڑی دور اور چل کر اسے ایک طرف دریا کا کنارا نظر آیا اور دوسری طرف چھوٹے چھوٹے مکانوں اور بنگلوں کی آبادی۔

'یہ جگہ مستقل قیام کے لیے ٹھیک رہے گی' اس نے دل میں کہا۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہاں کے لوگ نیک ہوں گے اور احسان ناشناس نہیں جیسے نشو کے گھر والے تھے'

یہاں دوسرے درخت بھی تھے اور لگتا تھا لوگوں کو باغ باغیچوں سے دلچسپی ہے۔ اسے یاد تھا نشو کا گھر اس علاقے میں تھا کیونکہ ان کی کسی سے نہ بنتی تھی اسی لیے ویرانے میں انہوں نے گھر بنایا تھا۔ ’یہاں لوگوں کے گھر پاس پاس ہیں۔ اچھے لوگ ہوں گے‘

دن نکل آیا تھا۔ آبادی میں لوگ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔

پھر اسے نظر آیا جہاں وہ باقی عمر گزارنے کا سوچ رہا تھا لوگ لکڑی کے تختوں میں ٹھونکا پیٹی کر رہے تھے۔

نیم کے درخت کو دیکھ کر انہوں نے ایک ساتھ کہا ’ارے واہ! یہ درخت کہاں سے آ گیا۔ ہم تو اچھی لکڑی کے لیے ترس رہے تھے‘

ایک بولا ’نیم ہے‘ کڑوا نیم‘

دوسرا بولا: ’اس کے تختے، تابوت بنانے کے لیے بھی اچھے ہوں گے اور قبر چھتیانے کے لیے بھی‘

تیسرے نے کہا: ’اسے دیمک نہیں لگے گی اور ہمیں اس کی لکڑی سے بنائے ہوئے تابوت اور قبر کے تختوں کے دام زیادہ ملیں گے‘

نیم کا دل دھک سے رہ گیا۔ ’آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا‘ اس نے دل میں کہا۔ وہ سمجھ گیا یہ لوگ بڑھئی ہیں اور ان سے کسی درخت کو بھلائی کی امید نہیں ہو سکتی ہے۔

پلک جھپکنے میں سب کے سب بڑھئی اس کی طرف آریاں اور کلہاڑے لیے دوڑے آ رہے تھے۔

نیم نے اپنی جڑوں سے کہا ’ایک بار پھر ہمت کر جاؤ ورنہ پل بھر میں تم الگ ہو گے اور تنا، شاخیں پتے الگ الگ۔ تھکی ہوئی جڑیں ایک بار پھر چرچرائیں اور چل پڑیں۔

جو بڑھئی سب سے آگے تھا رک گیا۔ ’ارے یہ کیسا درخت ہے! بھاگا جا رہا ہے‘

دوسرے نے کہا لگتا ہے جادو کا ہے اور اس سے دور رہنے ہی میں ہماری بھلائی ہے‘

لیکن باقی بڑھئیوں نے اس کا پیچھا کرنا بند نہیں کیا۔ وہ کہہ رہے تھے: کٹ کے اس کا جادو وادو سب نکل جائے گا۔ ایسی لکڑی اور بالکل مفت، کہاں ملے گی‘

مگر جڑیں اتنی تیز رفتاری سے چل رہی تھیں کہ دیکھنے والوں کو لگا کہ کوئی دیوہیکل پنجوں والا جانور بھاگا جا رہا ہے۔

نیم کو سمندر کے کنارے کنارے بھاگنے میں عافیت نظر آئی۔ مگر وہاں بھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک

جگہ مچھیروں کی بستی’ نظر آئی۔

‘سو یہ جگہ ٹھیک رہے گی’ نیم نے خود سے کہا اور ٹھہر گیا۔

سمندر کے کنارے جو جھونپڑیاں تھیں ان میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور ہر جھونپڑے میں چائے بن رہی تھی اور شاید گھی لگی روٹیاں۔ وہیں کنارے پر کشتیاں بندھی تھیں۔ کچھ کشتیاں ریت پر اوندھی پڑی تھیں۔ ان پر بچے چڑھ اتر رہے تھے۔

نیم کو یہ سین بہت اچھا لگا اور اس نے طے کر لیا یہ جگہ رہنے کے لیے اچھی رہے گی۔

لیکن ابھی اس نے ٹھیک طرح جڑیں نہیں جمائی تھیں کہ اسے چند آدمی ایک ادھوری بنی ہوئی کشتی کے پاس باتیں کرتے ہوئے نظر آئے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ ساری کشتیاں تو سمندر میں نہیں جاسکتیں۔۔۔ کسی کے پیندے کا تختہ گل گیا تھا تو کسی کا سامنے کا۔ پھر بڑی مشکل یہ تھی جو کشتی ادھوری تھی اسے پورا کرنے کے لیے اچھی لکڑی نہیں مل رہی تھی۔

یہ سن کر درخت کے تو کان کھڑے ہو گئے، لیکن اسے دیکھ کر ان سب کی باچھیں کھل گئیں۔

‘ارے اتنا اچھا درخت یہاں ہے ہم نے آج تک دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ تو وہی بات ہوئی بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا’

دوسرے نے کہا: اس اکیلے سے تو اتنی لکڑی نکلے گی کہ ساری ٹوٹی ہوئی کشتیاں بن جائیں گی’

تیسرے نے کہا: اور نئی کشتی کے لیے تختے ڈھونڈنے شہر بھی نہیں جانا پڑے گا’

وہ اپنے اوزار لے کر نیم کی طرف بڑھے اور بے چارہ تھکا ہارا ایک بار پھر بھاگنے پر مجبور ہو گیا’

ایک نے کہا ‘ارے یہ کیا! ہم درخت کی طرف دوڑ رہے ہیں اور فاصلہ بجائے کم ہونے کے بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ درخت ہے یا آسمان کا کنارا جو دور ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔

ایک بار پھر وہ سنسان علاقے میں تھا جہاں کی مٹی اسے اچھی نہیں لگی۔ اس میں نمک ہی نمک تھا۔

چلتے چلتے آخر کار وہ ایک آبادی کے نزدیک آ پہنچا، مگر اس مسلسل سفر سے اس کی جڑیں خشک ہو گئی تھیں اور جب وہ خشک تھیں تو تنے، شاخوں اور پتوں کی پیاس کیسے بجھتی!

ایک جگہ جہاں وہ رکنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا اسے آدمیوں کی بنائی ہوئی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں نظر آئیں جن میں اکثر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اور جن سے دھواں نہیں اٹھ رہا تھا ان میں نیچے بنے ہوئے

راستے مزدور سوکھی شاخیں اور گدے اندر دھکیل رہے تھے۔ کچھ مزدور کوئلے کی بوریاں گدھوں کی پیٹھ پر لاد رہے تھے۔

اس نے دل میں کہا 'بڑی خیر ہوئی کہ میں نے وقت پہ دیکھ لیا ورنہ تھوڑی دیر میں میں بھی ان کوئلہ بنانے کی بھٹیوں میں ہوتا'۔

ابھی آرام سے بیٹھنا اس کے نصیب میں نہیں تھا۔

شہر سے گزرتے ہوئے ایک علاقے میں اسے جگہ جگہ فرنیچر بنانے کے کارخانے نظر آئے جن میں چیرے ہوئے تختوں کے آریوں سے ٹکڑے کیے جا رہے تھے، رندوں سے انہیں ہموار کیا جا رہا تھا، کہیں برمے سے لکڑی میں سوراخ بنائے جا رہے تھے اور کہیں بنے ہوئے فرنیچر پر پالش کی جا رہی تھی۔۔ ایک کارخانے میں جس کی ہوا میں بُرادہ ہی بُرادہ تھا درختوں کے تنوں کو پٹے کی آرا مشین سے چیرا جا رہا تھا۔ اس سے زیادہ اس سے نہیں دیکھا گیا۔

اس نے دل میں کہا: 'اگر یہاں رک گیا تو جلد یا کسی مکان کے دروازے اور کھڑکیاں بن جاؤں گا یا اسکول کے ڈیسک اور کرسیاں'

ایک بار پھر اسے جڑوں سے کہنا پڑا 'بھاگو' اور جہاں جا کر انہوں نے دم لیا وہاں آبادی تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ بس چند گھر تھے۔

ایک لڑکی اپنے گھر کے باہر نیم کو دیکھ کر اتنی خوش ہوئی کہ اس نے اپنے بھائی بہنوں کو آوازیں دینا شروع کر دیں: 'ارے دوڑو، جلدی آؤ۔ دیکھو ہمارے گھر ایک پیڑ آیا ہے'۔

سب بچے اس عجیب خبر کو سن کر دوڑے آئے۔ کئی ایک کے پیر میں جوتیاں چپلیں تک نہیں تھیں۔ یہی نہیں اس لڑکی کے والد صاحب بھی ہڑبڑا کر گھر سے نکلے اور ماں پردہ اٹھا کر دروازے میں کھڑی اس نو وارد کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

ابا نے پاس آ کر پیڑ کو اوپر سے لے کر نیچے تک عینک کے شیشوں میں سے دیکھا، چھوا اور بولے 'ہے تو پیڑ ہی'۔

تھکے ہارے نیم کو لگا اب یہ میری موت کا حکم سنانے والے ہیں، اور اس کی جڑوں میں اس سے آگے جانے کا دم نہیں تھا۔

مگر اسی دم اس لڑکی نے نیم سے اس طرح لپٹ کر جیسے اسے اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کر رہی ہو

کہا: 'ابا اسے ہم یہیں کھڑا رہنے دیں'

باپ نے کہا: 'اس کی جڑیں باہر نکل آئی ہیں انہیں دھوپ لگ چکی ہے، اب یہ بچے گا نہیں'۔

لڑکی نے کہا: 'ابا اس کے لیے میں امی سے وہی دعا پڑھوا لوں گی جو انہوں نے اس وقت پڑھی تھی جب بھیا بیمار ہوا تھا اور اس کے بچنے کی امید نہیں رہی تھی۔ یہاں ایک بھی درخت نہیں'۔

باپ نے کہا 'مگر اس میں پھل نہیں آئے'

تو کیا ہوا۔ اسے لگالو، میں اس میں جھولا ڈالوں گی۔ روز اس کی جڑوں کو پانی بھی دیا کروں گی۔

لڑکیاں اور لڑکے بھی یہی سب کچھ کہہ رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا میں گرمیوں کی دوپہر میں اس کے نیچے بیٹھ کر پڑھا کروں گا۔

کوئی کہہ رہا تھا: میں چھاؤں میں کھٹولا بچھا کر سویا کروں گا۔

آخر میں باپ کو نیم کے تنے کو تھپک کر کہنے پڑا: 'اچھا بھئی تو یہیں رہ۔۔۔ خدا کرے ایک دن تو گبرا نیم بنے'

درخت کی جڑوں کا اکڑاؤ ختم ہو گیا اور دھیرے دھیرے اس کی شاخیں اور پتے ہلنے لگے۔

☆☆☆☆

حسینہ معین

شہزادی

میٹرن صاحبہ، نگینہ شہاب کے ساتھ اس وقت کامن روم میں داخل ہوئیں جب حلوہ تقریباً دم پر تھا۔

شبو بڑے سلیقے سے ٹینس کی میز پر چائے کی پیالیاں لگانے کے بعد ان میں چائے انڈیل چکی تھی --- افروز بڑی بوڑھیوں کی طرح لمبا سا جوڑا باندھے آلتی پالتی مارے دیگچی میں چمچہ چلا رہی تھی۔ نرگس اسٹوو کی چولیس ڈھیلی کر رہی تھی اور میں اور روبی بیٹھے ندیدوں کی طرح دیگچی میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو گھور رہے تھے۔

جیسے ہی کامن روم کا دروازہ کھلا ہم سب کل سے چلنے والے کھلونے کی طرح ادھر گھوم گئے۔

میٹرن صاحبہ شعلہ بار نظروں سے ہمیں گھور رہی تھیں۔ اور ان کے ساتھ کی دُبلی پتلی سفید سی لڑکی یوں آنکھیں جھپکا کر ہماری طرف دیکھ رہی تھی، جیسے کہ ہم کوئی بہت ہی مضحکہ خیز ناٹک پیش کر رہے تھے۔

ہوسٹل کے سجے سجائے کامن روم میں حلوہ بنانا یقیناً اتنا ہی بڑا جرم تھا، جیسے کسی موٹے سیٹھ کو یکے بعد دیگرے آٹھ دس گھونسے جُڑ دینا۔

لیکن ہم سب کو حیرت تو اس بات پر تھی کہ میٹرن صاحبہ تو دو دن کی چھٹی پر گئی تھیں، وہ اس وقت ایک دم جن کی طرح یہاں کیسے آ گئیں۔ یہ بات یقیناً ایسی تھی کہ ہم پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ منجمد ہو کر رہ گئے۔

افروز دیگچی میں ایسے جھانک رہی تھی، جیسے اگر وہاں سے نگاہ ہٹی تو قیامت ہی ٹوٹ پڑے گی اور باقی ہم سب منہ کھولے بڑی رحم طلب نگاہوں سے میٹرن صاحبہ کی طرف دیکھ رہے تھے یا تو وہ لڑکی کا کرم تھا یا پھر خود ہمارے ہی چہروں سے برستی ہوئی بے چارگی کا اثر تھا۔

اچھا جی آپ بالکل کچھ نہ کھائیں پئیں! افروز نے ایک لمبی اور ٹھنڈی آہ بھری، لیکن سرکار! ہم تو آپ ہی کا جامِ صحت نوش فرمائیں گے۔

ایک ہفتہ کے بعد کالج کھلنے والا تھا۔ ہم نے جان توڑ کوشش کی کہ نگینہ شہاب سے دوستی ہو جائے، مگر وہاں تو زمین جُنبد گُل محمد والا معاملہ تھا۔

شروع شروع میں ہم نے بہت پیار سے ابتدا کی۔ پھر آہستہ آہستہ تنگ کرنا شروع کیا۔ مگر وہ بھی بڑے حوصلے اور صبر سے برداشت کرتی رہی۔ جب کالج کھلا تو یہ معاملہ پورے گروپ کے سامنے رکھا گیا۔ چوں کہ

نگینہ شہاب اپنی ہی کلاس میں تھی۔ اس لیے آسانی بھی تھی۔

فیصلہ یہی کیا گیا کہ دوستی بہر حال اس لڑکی سے ضرور کرنی ہے، خواہ اس کی خاطر ہمیں اپنی تمام دوسری تفریحات کو خیر آباد کیوں نہ کہنا پڑے۔

خدا کو بھی کچھ نیکی ہی منظور تھی۔ انگلش کی ایک نئی لیکچرار مس عثمان آئیں اوّل تو یہ بے چاری خود ہی کچھ بدحواس سی تھیں دوسرے ہماری کلاس میں گھستے ہی ان کا بُرا حال ہو جاتا تھا۔ ادھر پوری پنجری تھی۔ (ہم تعداد میں ۱۰۰ تھے) اُدھر وہ اکیلی جان۔

عالم یہ ہوتا کہ ۴۵ منٹ کا پیریڈ پارلیمنٹ کے ہنگامی اجلاس کا نظارہ پیش کرتا لڑکیاں بڑی آزادی کے ساتھ ہر موضوع پر ایک دوسرے سے گفتگو کرتیں، کاغذ کے ہوائی جہاز بنا بنا کر اُڑائے جاتے۔ چاک کے ٹکڑے ایک دوسرے کو مارے جاتے، کارٹون بنتے، غبارے پُھلا پُھلا کر اُچھالے جاتے اور اس ہنگامے کے باوجود اُدھر مس عثمان کا لیکچر پورے زور شور سے جاری رہتا ایک بے چاری نگینہ شہاب ہی ایسی تھی جو بہت دل لگا کر لیکچر سنا کرتی۔

ایک دن ہم نے یہ طے کیا کہ آج نگینہ شہاب کو تنگ کیا جائے۔ ہم سب اس سے اگلی اور پچھلی سیٹوں پر جم کر بیٹھ گئے۔ مس عثمان جیسے ہی کلاس میں داخل ہوئیں، پوری پنجری نے اسلام علیکم کا نعرہ کھینچ مارا۔ مس عثمان کو اردو میں سلام کرنے سے سخت چڑ تھی اور اسی لیے ہماری فرمانبرداری کہ ہم دن میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی تقریباً پچاس دفعہ باجماعت قرأت سے اسلام علیکم کرتے۔ دوسرے ان کے پیریڈ میں فصیح و بلیغ اردو میں گفتگو کی جاتی۔ مس ''speak in to English'' اور شرما کر عرض کرتے: ''we can not'' اس وقت بھی انھوں نے چلا چلا کر ''who is that'' کہنا شروع کیا۔

ہم سب تو چپ ہو گئے مگر پچھلی سیٹوں سے طلعت آراء نے چلاتے ہوئے کہا:

رحم، مائی لارڈ، رحم!

''who is that'' انھوں نے پھر بگڑ کر پوچھا۔

''you are my lord'' قہقہوں سے کلاس روم گونج اٹھا اور مس عثمان نے ناراض ہو کر حاضری لینا شروع کر دی۔ تھوڑی دیر تک چپکے چپکے اس لطیفے پر ہنستے رہے۔ پھر ہم نے نگینہ شہاب کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ہر طرح سے اسے ستایا گیا۔ لیکن کیا مجال ہے کہ ٹس سے مس بھی ہوئی ہو، ایک بڑے سے کاغذ پر ایک مضحکہ خیز کارٹون بنا کر اسے دکھایا۔ اس پر نگینہ شہاب لکھا ہوا تھا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے شکریہ لکھ کر واپس کر دیا۔

میں نے جل کر کاغذ کا ایک پَر بنا کر اس کے بالوں میں ٹھوس دیا ۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی اور ہم اس کے مضحکہ خیز حلیے پر ہنسنے لگے ۔

دفعتاً مس عثمان کی کراری آواز آئی :

کھڑی ہو جایئے ، کیا نام ہے آپ کا ؟

جانے انھوں نے کیسے دیکھ لیا تھا ۔ وہ بڑی تیز نظروں سے مجھے گھور رہی تھیں ۔ میں اطمینان سے بیٹھی رہی ۔

سنا نہیں آپ نے ، کھڑی ہو جایئے ؟ وہ پھر چلائیں ۔

”ارے بھئی کھڑی ہو ناں ! دیکھو وہ تمھیں یاد کر رہی ہیں ؟“

میں نے پیچھے بیٹھی ہوئی روبی کو زور سے ٹہوکا دیا ۔

”جی ، کیا ۔ ۔ ۔ میں ؟“ روبی ہکلاتے ہوئے بولی ۔

جی نہیں میں ان سے کہہ رہی ہوں ! انھوں نے میری طرف اشارہ کیا ۔

اس دفعہ میں نے نگینہ کو ہلایا ۔

”جی نہیں تم سنتی نہیں ، وہ کہہ رہی ہیں ۔“

جی نہیں ، میں آپ سے کہہ رہی ہوں ! اس بار وہ غصے کے مارے کھڑی ہو گئیں ۔ ”ہائے اللہ آپ مجھ سے فرما رہی تھیں توبہ توبہ کیسی زبردست بھول ہوئی“ میں بڑی معصومیت سے کلیجہ پیٹنے لگی ۔

کیا نام ہے آپ کا ؟ انھوں نے ڈپٹ کر پوچھا ۔

جی میرا ؟ میں نے ذرا شرماتے ہوئے کہا ۔ ”نام وام کیا جی ، بس سب نگینہ شہاب کہتے ہیں ۔ نگینہ شہاب اسی طرح چپ چاپ بیٹھی رہی ۔ باقی سب لڑکیاں ہنس پڑیں ۔

جایئے ، آپ میری کلاس سے فوراً باہر نکل جایئے ۔ وہ اس وقت بہت سخت دکھائی دے رہی تھیں ۔

جی بہت اچھا ! میں اطمینان کے ساتھ اپنی کتابیں سمیٹنے لگی ۔ میرے ہاتھ میں ایک کارٹون تھا ۔ وہ میں اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی ثروت کو پکڑا دی ، وہ بدتمیز زور زور سے ہنسنے لگی ۔

”کیا ہے یہ ؟ مس عثمان خفا ہو گئیں ۔

جی ایک کارٹون ہے ! میں نے کاغذ انھیں تھما دیا ۔

یہ کس نے بنایا ہے ؟ انھوں نے پولیس والوں کی طرح سوال کیا ۔

انھوں نے! میں نے منہ بسورتے ہوئے نگینہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ یہ ہر وقت مجھے ستایا کرتی ہیں۔

جائیے آپ بھی چلی جائیے کلاس سے۔

انھوں نے میز پر گھونسہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ گویا یہ گھونسہ عالم تصور میں انھوں نے میرے سر پر رسید کیا تھا۔ نگینہ بھی میرے پیچھے پیچھے کلاس سے نکل آئی۔ سیڑھیوں پر پہنچ کر میں نے بیٹھتے ہوئے نگینہ شہاب سے کہا:

بیٹھ جاؤ! میں نے حکم دیا۔ یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا ہے۔

وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔

تم آخر ہر وقت بسورتی کیوں رہتی ہو۔ مجھے ایسے لوگ قطعی پسند نہیں آتے۔ میں نے بگڑتے ہوئے کہا۔

نگینہ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اس نے پنسل سے کاغذ کے ایک پُرزے پر کچھ لکھا۔ پھر بولی :چلیے کلاس میں چلیں۔

کلاس میں۔۔۔؟ میں نے آنکھیں پھاڑیں۔ کچھ دماغ چل گیا۔ مس عثمان ڈنڈا لے کر دوڑیں گی۔

ڈنڈے کھانے کو دل چاہ رہا ہے، چلیے نا۔ وہ ہنسنے لگی۔

ماشاءاللہ ماشاءاللہ! چشم بد دور! خدا نظر بد سے تم کو بچائے کلاس میں مٹھائی بٹنا چاہیے لڑکی پہلی دفعہ ہنسی ہے۔ میں نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں (Excuse me) کہتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کلاس میں داخل ہوئے۔ لڑکیاں دم بخود تھیں۔ مس عثمان حیران تھیں۔ نگینہ نے پرچان کی میز پر رکھ دیا اور ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئیں۔ پرچہ پڑھ کر مس عثمان اور پریشان ہو گئیں۔ وہ بڑی رحم طلب نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

آپ کا نام کیا؟ انھوں نے نگینہ سے پوچھا۔

حسینہ۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

آپ کا ذکر تو بہت سنا ہے، میں نے۔ انھوں نے شاید جل کر کہا۔

اس وقت گھنٹی بجی، ان کے جاتے ہی لڑکیوں نے لپک کر پرچہ اٹھایا۔ پھر تو وہ فلک شگاف قہقہے گونجے ہیں کہ گیلری سے گزرتی ہوئی لڑکیاں بھی رک گئیں۔ پرچہ میں صرف ایک شعر تھا:

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

اس دن سے نگینہ شہاب ہمارے گروپ میں شامل ہو گئی۔ وہ ایک دم سے اتنی زیادہ بدل گئی کہ ہم سوچ

بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ جو کچھ دن پہلے بسورا کرتی تھی۔

نگینہ شہاب کھیل کود میں بہت تیز تھی۔ کالج میں کھیلوں کے مقابلے ہوئے تو اسے چمپئن شپ کی شیلڈ ملی۔

اس کی سب سے زیادہ مجھ سے دوستی تھی۔ وہ میری ہر بات کو حکم کی طرح مانتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس میں ایک طرح کا احساس برتری تھا۔ سرحد کے کسی بہت ہی امیر خاندان کی لڑکی تھی۔ وہ ہم سب سے زیادہ حسین اور طاقت ور تھی۔ اس کے علاوہ وہ وائلن بجا سکتی تھی۔ گا سکتی تھی۔ غالباً انھیں خوبیوں نے اسے بہت زیادہ مغرور بنا دیا تھا، بعض اوقات تو اس کا رویہ اس قدر تحقیر آمیز ہو جاتا کہ میرا دل چاہتا کہ میں کبھی اس لڑکی سے بات نہ کروں۔

نمی کی شادی ہونے والی تھی۔ نگینہ دو دن سے کالج سے غائب تھی۔ جب وہ آئی تو میں نے اسے بتایا۔

نمی کی شادی ہونے والی ہے تیاریاں کر لو اور تحفے کے لیے پیسے بھی لیتی آنا۔ (وہ ہوسٹل سے جا چکی تھی)

دیکھو مینی! میں نمی کی شادی میں نہیں جا سکوں گی میں تمھیں وجہ بتا دیتی ہوں۔ نمی کو بتا دینا۔ میرے والد علاقے کے شاہ کہلاتے ہیں۔ ان کے اپنے پچاس سے زیادہ گاؤں ہیں۔ میں صرف اپنے بابا کی زبردستی سے پڑھ رہی ہوں، ورنہ خود مجھے کوئی دل چسپی نہیں۔ ہماری روزمرہ کی زندگی شاہی طریقے سے بسر ہوتی ہے۔ میں شہزادی کہلاتی ہوں۔ میرے والدین معمولی لوگوں سے نہ خود ملتے ہیں نہ مجھے ملانا پسند کرتے ہیں۔ اس سے ہماری ذلت ہوتی ہے۔

اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بڑی لاپروائی سے ہنس رہی تھی، میں خاموش ہو گئی۔ در حصل مجھے اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا کہ میں کیوں اس سے ملتی ہوں، جب کہ وہ ہمیں ذلیل سمجھتی ہے۔

نمی کی شادی ہو گئی۔ اس کے ولیمے میں جانے کے لیے سب لڑکیاں کپڑے وغیرہ لے کر میرے پاس ہوسٹل ہی میں آ گئی تھیں چوں کہ نمی کا سسرال کالج سے قریب ہی تھا۔ اس لیے سوچا کہ یہیں سے تیار ہو چلے جائیں گے۔

جس وقت ہم سب تیار ہو رہے تھے نگینہ آ گئی۔ آج وہ بے حد خاموش تھی۔ مسہری پر اوندھی لیٹی ہوئی وہ ہم سب کو غور سے دیکھتی رہی۔ اسے غالباً اپنے اکیلے رہ جانے کا صدمہ تھا۔ اس کے چہرے سے اداسی صاف نظر آ رہی تھی۔

ہم نے خاص اس موقعہ کے لیے زردوزی، غرارے اور قمیصیں اور زرتار دوپٹے بنوائے تھے۔ وہ ہم کو جلدی تیار ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ میں نے اس کا دھیان

ہٹانے کو آواز دی۔

نگی، ذرا یہاں آؤ۔ ڈیئر میرے بال ٹھیک کر دو۔

وہ خاموشی سے ننگے پاؤں میرے قریب آ گئی۔ دھیرے دھیرے میرے بال ٹھیک کیے اور پھر اس نے میری چوٹیوں پر کرن اور پھولوں کے ہار لپیٹ دیے۔ میں نے اس سے کہا۔

نگی! کسی دن اپنا شہزادیوں والا لباس پہن کر آؤ نا، میں دیکھوں گی تم کیسی پیاری لگتی ہو، اس لباس میں۔

شہزادیوں والا لباس؟ اس نے کھوئے کھوئے کہا۔

دیکھو۔ یہ دوپٹہ تمھارے اوپر کتنا پیارا لگتا ہے۔ میں نے کروالا دوپٹہ اس کے سر پر ڈال دیا۔ وہ چند لمحے ساکت سی آئینہ کے سامنے کھڑی رہی۔ اس کا چہرہ نہ جانے کیوں ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ اوئے شہزادی صاحب؟ میں نے بڑے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے۔

ٹمی! وہ ایک دم تڑپ کر الگ ہو گئی۔ دوپٹہ اس نے نوچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ اور مجھے بڑی بے دردی سے دھکا دے کر گراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

یہ لوگ جنگلی ہوتے ہیں! ثروت نے آگے بڑھ کر مجھے اٹھاتے ہوئے کہا۔

مغرور کہیں کی! غالباً ریحانہ نے جل کر کہا۔

شام کو جب میں ٹمی کے یہاں سے واپس آئی تو نگینہ میرے کمرے میں موجود تھی۔

ٹمی! تم خفا تو نہیں مجھ سے؟ اس نے کچھ ایسی، معصومیت سے پوچھا کہ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

تم بالکل جنگلی شہزادی ہو میں نے کہا۔

ٹمی! تم شہزادی کہتی ہو نا تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم میرا مذاق اڑا رہی ہو۔ دوسرے بعض اوقات میں یہ بھول جاتی ہوں کہ تم لوگ میری کلاس فیلو ہو میں محسوس کرنے لگتی ہوں کہ تم لوگوں کو بھی میرے ساتھ اسی تعظیم سے پیش آنا چاہیے۔ جیسے سب آتے ہیں۔ اس کے علاوہ تم لوگ میرے ہم رتبہ بھی تو نہیں ہو۔ دیکھو ٹمی! تم بُرا نہ ماننا۔ تم میری پہلی دوست ہو اور ہم دوستوں سے بے وفائی نہیں کرتے، خواہ وہ کتنے ہی چھوٹے درجے کے کیوں نہ ہوں۔ دوست کے لیے جان تک دینے کو تیار رہتے ہیں۔ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے ٹمی! اس نے مجھ سے پوچھا۔

نگی! دیکھو میں زیادہ دیر تک یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔ میں مانتی ہوں تم بہت بڑی شہزادی ہو۔ لیکن پھر میں کیا کروں۔ میں اپنی تذلیل برداشت نہیں کر سکتی۔ نگی! اگر تم کو کالج میں رہنا ہے اور مجھ سے دوستی رکھنا

ہے۔ تو پھر تمھیں نگی بن کر رہنا پڑے گا۔ شہزادی سے میری دوستی نہیں ہو سکتی نگی! میں کپڑے بدلنے غسل خانے میں چلی گئی۔

جب میں واپس آئی تو نگینہ جا چکی تھی۔

اس کے بعد ایک ہفتے تک وہ کالج نہ آئی۔ میں اپنے رویے پر نادم تھی۔ میں سوچتی تھی کہ غلطی میری ہے۔ وہ ساری عمر سے حکم منوانے کی عادی ہے لہٰذا وہ میرے حکم کو خود کیوں کر مان سکتی ہے، وہ خود بھی مجبور ہے۔

لائبریری سے پتہ لے کر میں ایک شام اس کے گھر پہنچی۔ سرخ رنگ کی ایک طویل عمارت تھی۔ باہر باغ میں ٹہلتی ہوئی مجھے ایک لڑکی ملی۔ اس کا لباس واقعہ شہزادیوں جیسا تھا۔ گھیر دار ریشمی شلوار پنڈلیوں سے اوپر چاندی کے گھنگھروؤں سے بندھی تھی۔ بلاؤز پر بڑے بڑے گول چمک دار بٹن لگے تھے۔ سر پر ایک سرخ رنگ کا خوب صورت رومال بندھا ہوا تھا۔ جس کے چاروں طرف موتیوں کی جھالر لگی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچی تو اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھ سے پوچھا۔:

فرمائیے! آپ کس سے ملنے آئی ہیں۔؟

نگینہ سے! میں نے اسے جواب دیا۔

ٹھہریئے! میں ملازم کو آواز دیتی ہوں۔ وہ آپ کو اس کے پاس پہنچا دے گی۔

کیا وہ یہاں نہیں رہتی؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

نہیں وہ رہتی تو یہیں ہے لیکن اس وقت وہ اپنے کمرے میں ہو گی۔ اس نے کہا۔

کیا وہ آپ کی بہن ہے؟ میں نے پوچھا۔

نہیں ------ وہ میری خادمہ ہے۔ دراصل ہمارے دھوبی گُل کی لڑکی ہے۔

گُل تین سال ہوئے مر گیا ہے۔ گُل کو میرے بابا نے گولی مار دی تھی۔ کیوں کہ اس نے میرے بابا کی پگڑی جلا دی تھی۔ اس کی ماں ہمارے یہاں باورچی ہے۔ نگی میرا کام کرتی ہے۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے افراد کے کپڑے وغیرہ بھی دھوتی ہے۔ اس نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

وردی پہنے ہوئے ایک نوکر بھاگتا ہوا آیا۔

ان کو نگی کے پاس پہنچا دو، انھوں نے ملازم سے کہا۔ لیکن اب تو نگی نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ اس نے اپنی ساری کتابیں چولھے میں ڈال کر جلا ڈالیں۔ حالاں کہ اس کی ماں، اس کو ساری عمر کے لیے ہماری خادمہ

اس لیے بنایا تھا کہ ہم اس کو انگریزی تعلیم دلا دیں۔ وہ یہ کہتی ہوئی اور ہنستی ہوئی واپس لوٹ گئی۔ گویا دلچسپ لطیفہ تھا۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی بے حس و حرکت ملازم کے ساتھ نگی کے کوارٹر تک چلی گئی۔ دروازے میں سے میں نے اندر دیکھا۔ نگی موٹے کھدر کا نئے رنگ کا لمبا سا کرتہ پہنے تھی۔ جو اس کے بازوؤں سے بالکل پھٹا ہوا تھا۔ اس کے سنہری گھنگھریالے بال بکھرے ہوئے تھے۔ سر پر ایک ملگجا سا رومال بندھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ دھلے ہوئے کپڑوں پر استری کر رہی تھی۔ استری اس نے زمین پر پٹخ دی۔ سرخ سرخ انگارے چاروں طرف بکھر گئے۔ وہ پاگلوں کی طرح چلائی۔

تم یہاں کیوں آئی ہو۔ کیوں آئی ہو۔ تم یہی معلوم کرنا چاہتی تھیں نا کہ شہزادی ہوں یا نہیں۔ تم انتقام لینے آئی ہو۔ جاؤ سب سے کہہ دینا کہ نگی جھوٹ بولتی رہی۔ وہ ایک ذلیل خادمہ ہے، جس کے باپ کو خان اعظم کی پگڑی جلا دینے پر گولی مار دی گئی تھی۔ جس کی ماں بدمزہ کھانا پکانے پر اُلٹی لٹکا دی جاتی ہے اور جن کی بیٹی ذرا سا قصور کرنے پر کوڑوں سے پیٹی جاتی ہے۔ آؤ دیکھو، میرے جسم پر ایک انچ بھی جگہ ایسی نہیں ہے۔ جہاں نیل نہ پڑے ہوں۔ تمھیں خوشی ہو گی نا۔ جاؤ خوب خوشیاں مناؤ، مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ جاؤ نکل جاؤ یہاں سے۔

وہ کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ سنہری بالوں کے ہالے میں اس کا سرخ چہرہ دمک رہا تھا جیسے وہ سچ مُچ کی شہزادی ہو اور ابھی مجھے موت کا حکم سنا دے گی کیوں کہ میں نے اس کی توہین کی تھی۔ میں دھیرے دھیرے کمرے سے باہر نکل آئی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے دفعتاً مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی سسک سسک کر کہہ رہا ہو۔

دوست خدا حافظ! پیچھے مڑ کے دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ ہو سکتا ہے یہ محض میرا وہم ہو۔ بہر حال مجھے ایسا لگا جیسے شہزادی کا اٹھا ہوا سر میرے آگے جھک گیا ہو اور اس نے اپنے بھیگے گال میرے بازو پر رکھ دیے ہوں۔

☆☆☆☆

خالد فتح محمد

بھولا

(راجندر سنگھ بیدی کی اجازت کے بغیر)

بھولے کو اپنے ماموں سے بہت پیار تھا اور وہ اُنھیں ملنے کے لیے آ رہا تھا۔ بھولے کو اپنی بے چینی اور انتظار پر قابو نہیں تھا۔ اگر اُس کے بس میں ہوتا تو اُسی وقت شام کر لیتا تا کہ ماموں جلد آ جائے۔ اُس نے اپنے دادا کو کہا کہ وہ اُسے کہانی سنائے تا کہ سنتے سنتے دن گزر جائے لیکن دادا نے کہا کہ دن کو اگر کہانی سنائی جائے تو راہی اپنا راستہ بھول جاتے ہیں۔ بھولا ضد کرتا رہا کہ اُس نے کہانی سنی ہے اور دادا کو اُس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ بھولا کہانی سنتے سنتے سو گیا۔ وہ شام کو جب جاگا تو اُس کا ماموں نہیں آیا تھا۔ اُسے پریشانی ہونے لگی: کہیں ماما اس لیے تو نہیں آیا کہ وہ راستہ بھول گیا ہے کیوں کہ اُس نے دن کے وقت دادا سے کہانی سنی تھی؟ آہستہ آہستہ اُس کا شک یقین میں بدلتا گیا اور شام گہری ہونے لگی۔ بھولا کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکل پڑا تا کہ راستہ گمے ہوئے ماموں کو ڈھونڈ کر گھر لے آئے۔

گاؤں سے تھوڑے فاصلے پر ایک گھنا جنگل تھا اور شہر سے آنے والا راستہ اُس جنگل میں سے گزرتا تھا۔ بھولے نے سوچا کہ ماما اُسی راستے سے آئے گا کیوں کہ اور کوئی راستہ تھا بھی نہیں۔

بھولا کسی کو بتائے بغیر اپنے ماموں کو ڈھونڈنے چل پڑا۔ بھولے کا ارادہ پکا اور اُس کی چال میں خود اعتمادی تھی۔ وہ جب جنگل میں داخل ہوا تو سورج غروب ہو چکا تھا اور جنگل پر اندھیرے کا قبضہ تھا۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ بھولے کو سامنے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں بھی اُسے کچھ نظر نہ آیا۔ اُس نے خوف زدہ ہو کر دائیں طرف دیکھا تو اندھیرے کی دیوار اُس کے سامنے تھی اور ایسا ہی نظارہ اُسے بائیں طرف دیکھنے کو ملا۔ اندھیرے کے علاوہ جنگل میں اتنی خاموشی تھی کہ اُسے اپنے کانوں میں سیٹیاں بجتے ہوئے محسوس ہوئیں۔ اُس نے سوچا کہ یہ جھینگروں کا شور ہے اور اپنا وہم دور کرنے کے لیے زمین پر اپنے پاؤں پٹخے تا کہ جھینگر خوف زدہ ہو کر بولنا بند کر دیں۔ وہاں جھینگروں کا راگ ہوتا تو خاموشی ہوتی! سیٹیاں لگاتار بجتی رہیں۔ بھولے کے لیے وہاں سے ہلنا ناممکن ہو گیا، اُسے لگا کہ وہ ٹخنوں تک زمین کے اندر دھنس گیا ہے۔ اُس

نے ماموں کو بلانے کے لیے آواز دینا چاہی لیکن اُس کا گلہ جیسے دبا ہوا ہو۔ اُس نے گاؤں والوں کو بلانے کے لیے شور کرنا چاہا لیکن پھر آواز گلے سے باہر نہ آ سکی۔ بھولا خوف زدہ، بے یقینی کا شکار اور مایوس سا کھڑا تھا کہ اُسے کسی وزنی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ اُس نے غور سے دیکھا تو سامنے دو آدمی کھڑے تھے جنھوں نے لنگوٹ کسے ہوئے تھے اور گہری تاریکی میں بھی اُن کے جسم تیل کی وجہ سے چمک رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں، بالکل ویسی جو گاؤں کے لڑائی کرنے کے لیے گھروں سے لے کر نکلتے تھے۔

”کون ہو تم؟“ اُن میں سے ایک آدمی نے پوچھا۔ اُس کی آواز بلند نہیں تھی لیکن اتنی نیچی بھی نہیں تھی کہ بھولا سمجھ نہ سکے۔

”بھولا!“ بھولے نے سہمتے ہوئے جواب دیا۔

”یہاں کیوں آئے ہو؟“ اُسی آدمی نے پوچھا۔

”اپنے ماموں کو ڈھونڈنے، وہ راستہ گم گیا ہے۔“ بھولا اب قدرے اعتماد سے تھا۔

”ہم سب راستہ بھولے ہوئے ہیں۔“ دوسرا آدمی پہلی مرتبہ بولا۔

”تمھیں پتا نہیں کہ رات کو اِس جنگل میں نہیں آتے؟“ پہلے آدمی نے اِس مرتبہ اونچی غصیلی آواز میں پوچھا۔

”میرا ماموں اگر راستہ نہ گمتا تو کبھی نہ آتا۔“ بھولے کی آواز میں اُکتاہٹ تھی۔

اُسی وقت کچھ چاٹے جانے اور ساتھ ہی سانس کی بھاری آواز سنائی دی۔ بھولا گھبرا گیا۔

”یہ کیا آواز ہے؟“ اُس نے پریشانی سے پوچھا۔

”شاید ریچھ چھتے میں سے شہد چاٹ رہا ہے۔“ دوسرے آدمی نے لاتعلقی سے جواب دیا۔ بھولا ریچھ کا سُن کر تھر تھر کانپنے لگا۔ اُسی وقت درخت پر سے ایک لمبی، بھاری اور مطمئن سی آواز آئی۔

”ریچھ کا پیٹ بھر گیا ہے۔“ پہلے آدمی نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ اُسی وقت کسی بھاری چیز کے زمین پر گرنے کی آواز آئی، بھولے نے وہ دھمک اپنے پیروں میں بھی محسوس کی۔ بھولے کی نظر اپنے آپ اُس آواز کی طرف اُٹھ گئی، ریچھ اُنھیں دیکھ رہا تھا۔ بھولے کی ریچھ کے ساتھ نظر ملی تو وہ بھاگ کر نزدیک والے آدمی کے پیچھے چھپ جانا چاہتا تھا کہ اُسی وقت ریچھ نے کسی اور طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

”یہ ہم پر حملہ تو نہیں کر دے گا؟“ بھولے کی آواز میں اب خوف کے بجائے شک تھا۔

‘‘نہیں!’’

‘‘کیوں؟’’

‘‘تمھارے پاس تو مشعلیں نہیں ہیں۔’’ بھولے نے گویا الزام لگایا۔

‘‘ہیں، کیوں نہیں ہیں؟’’

‘‘تمھارے پاس تو برچھیاں ہیں۔’’

‘‘مچان پر رکھی ہیں۔ اگر شیر نظر آجائے تو میں اُس کے حملہ کرنے کا سوچنے سے پہلے ہی جلا کر لے آؤں گا۔’’

‘‘شیر مشعل سے ڈرتا ہے؟’’ بھولا اپنی حیرت پر قابو نہ رکھ سکا۔

‘‘شیر آگ سے ڈرتا ہے۔ کئی مرتبہ یہ جنگل سے نکل کر کسی گاؤں کا رخ کرتے ہیں۔ ہم مشعلوں کی دیوار بنا کر اُنھیں واپس جنگل کی طرف موڑ دیتے ہیں۔’’ بھولے کو کبھی کبھی جنگل کی طرف ہونے والا آگ کا ناچ یاد آگیا جسے سب جنوں کا میلہ کہتے تھے۔ بھولا مطمئن ہوگیا۔ اُس کا خوف جاتا رہا اور اُس نے کھڑے کھڑے اپنے بے جان پیروں کو حرکت دی۔

‘‘ماموؤں؟’’ بھولے کی آواز میں درد تھا، ‘‘میری مدد کرو۔’’

‘‘ہم اِس وقت مدد نہیں کرسکتے۔’’ پہلے آدمی نے سختی سے جواب دیا۔ بھولا پھر خوف زدہ ہوگیا، ‘‘تم اِسے لے جاؤ۔ میں یہ حصہ اکیلا ہی سنبھال لوں گا۔’’

‘‘مجھے کہاں لے کر جاؤ گے؟’’ بھولے کی آواز میں ایک چیخ تھی۔

‘‘سردار کے پاس۔’’

‘‘وہ مجھے کیا دے گا؟’’ بھولے نے رونا شروع کردیا تھا۔

‘‘جو بھی کرنا ہے، اُسی نے کرنا ہے۔’’

یہ کہہ کر آدمی چل پڑا، بھولا اُس کے پیچھے ہولیا۔ بھولے کو وہ آدمی زمین پر چلنے کے بجائے ہوا میں تیرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ بھولا ایک رسی کے ساتھ بندھا ہوا اُس آدمی کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ وہ آدمی ایک دم رُک گیا، اُن کے سامنے ایک گھنا درخت پہاڑ کی طرح کھڑا تھا۔

‘‘یہ برگد کا ایک بوڑھا درخت ہے اور اِس کے تنے کے ساتھ ہی ایک گہری کھائی ہے جسے پار کرنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اِس درخت کا تنا اِس طرف ہے اور شاخیں پار زمین کو چھو رہی ہیں۔ ہم اِس درخت پر چڑھ کر

کھائی کو پار کریں گے۔ تم میرے پیچھے چڑھتے آؤ۔" آدمی بھولے کی ہچکچاہٹ دیکھ کر رُک گیا۔ "اپنی جوتی اُتار کر مجھے دے دو۔"

بھولے نے جوتا اُتار کر آدمی کے حوالے کیا اور اُس کے پیچھے برگد پر چڑھ کر کھائی کے پار اُتر گیا۔ پھر اُس نے اپنا جوتا پہنا اور پیچھے پیچھے چل پڑا۔ بھولے کو اچانک پانی کا شور سنائی دینے لگا۔ وہ ایک ندی کے کنارے پہنچ گئے تھے۔ ندی کا پانی تیز رفتار سے بہہ رہا تھا۔ آدمی نے بھولے کو جوتا اُتارنے کا اشارہ کیا اور جوتے ہاتھ میں پکڑ کر بولا:

"پانی تیز ہے۔ پاؤں مضبوطی سے رکھنا ورنہ تمھیں ڈھونڈے گا کوئی نہیں۔" بھولا کسی حد تک ماموں کو بھول کر اِس ایڈ ونچر میں گم ہو گیا تھا۔ ندی کا پانی بہت ٹھنڈا تھا، اتنا ٹھنڈا کہ بھولے کا خوف پھر سے جاگ اُٹھا۔

"ماموں! میرا ماموں؟" بھولا سردی سے کانپ رہا تھا۔

آدمی نے خالی نظروں سے بھولے کی طرف دیکھا، جوتے اُس کی طرف بڑھائے اور چل پڑا۔ تھوڑے فاصلے کے بعد اُن کے سامنے ایک پہاڑ آ گیا۔ آدمی نے ایک بکری کی طرح پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا اور بھولا ہانپتے ہوئے اُس کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک موڑ مُڑے اور اُن کے سامنے مشعلوں سے روشن ایک غار تھا۔ آدمی رُک گیا اور اُس نے بھولے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ آدمی پیچھے سے اونچی آواز میں بولا:

"یہ راستہ گم گیا تھا۔"

بھولے نے ڈرتے ہوئے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو وہ آدمی وہاں نہیں تھا۔ لنگوٹ باندھے ہوئے ایک آدمی نے اُسے اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ چند قدم چلنے کے بعد ایک اور موڑ آیا اور سامنے چند آدمی لاٹھیوں کے ساتھ وار کرنے اور دفاع کرنے کی مشق کر رہے تھے۔ ایک آدمی الگ بیٹھا اُنھیں غور سے دیکھ رہا تھا۔

"سردار!" بھولے کو لے کر جانے والے آدمی نے آواز دی۔

سردار آہستہ سے مُڑا، اُس نے بھولے کو دیکھا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ سردار بھی لنگوٹ کسے ہوئے تھا۔

"ہیں، کیوں بھولے!" سردار نے محبت سے کہا۔

"ماموں! میں نے دوپہر کو دادا سے کہانی سنی تھی، میں یہ بھی جانتا تھا کہ دِن کو کہانی سنیں تو راہی راستہ بھول جاتا ہے..... میں تمھیں ڈھونڈنے نکلا تھا کہ یہ مجھے یہاں لے آئے۔" اُس نے کسی طرف دیکھے بغیر اشارہ کیا۔

''ہم سب ہی راستہ بھولے ہوئے ہیں۔'' بھولے کے ماموں نے جواب دیا۔ پھر اُس نے تالی بجائی، ''میرے کپڑے! بھولے! ابھی آیا۔''

وہاں موجود لوگوں نے بھولے کو گھیرے میں لے کر حیرت سے دیکھنا شروع کر دیا جب کہ بھولے کی نظر میں غرور تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ماما سادہ سے کپڑے پہنے ہوئے آ گیا۔

''چلیں، بھولا!''

''سردار! اِسے کیوں لے کر جا رہے ہو؟'' سب یک زبان ہو کر بولے، ''یہ بھی راستہ بھولا ہوا ہے۔''

''یہ راستہ نہیں بھولا، ایک راستہ بھولے ہوئے مسافر کو ڈھونڈنے نکلا ہے،'' ''چلو بھولے!''

وہ پہاڑ پر سے نیچے اُترے، ندی پار کی، برگد کی گھنی شاخوں اور مضبوط ٹہنوں کی مدد سے کھائی پار کر کے جنگل سے باہر نکلے تو سامنے روشنیاں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں، جیسے جنوں کا میلا ہو۔ کسی نے بھولے کو پکارا:

''اوئے بھولا اووووو،'' یہ اُس کے دادا کی آواز تھی۔

''دادا! میں ماموں کو لے آیا۔''

سارا گاؤں اُن کے گرد اکٹھا ہو گیا اور بھولا اپنے ماموں کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے کھڑا رہا!

☆☆☆☆

رضوانہ سید علی

ریشم

پیارے بچو!

جانور ہماری طرح بول تو نہیں سکتے مگر جذبات اور احساسات رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو جانور انسانوں کے ساتھ رہتے ہیں وہ اپنے مالکوں کے ساتھ محبت اور انس کا مظاہرہ اپنی حرکات وسکنات سے کرتے رہتے ہیں۔ ایسے جانوروں میں گھوڑوں اور کتوں کا ذکر سرفہرست آتا ہے۔ آپ نے ان کی انسانوں سے محبت اور وفاداری کے بے شمار قصے سنے ہوں گے۔

آج ہم آپ کو جس جانور کی محبت اور وفاداری کی کہانی سنانے جا رہے ہیں، وہ ایک بلی ہے۔ یہ کہانی پڑھ کر آپ کو احساس ہوگا کہ محبت اور خلوص ایسے جذبات ہیں جن کی قدر جانور بھی کرتے ہیں۔

یہ بلی جس کا ذکر ہم کر رہے ہیں اس نے پنجاب کے ایک چھوٹے سے ہرے بھرے اور خوبصورت گاؤں میں آنکھ کھولی۔ اس گاؤں کا نام اکبرآباد تھا۔ دریائے جہلم کے کنارے آباد یہ گاؤں صرف ہرا بھرا اور خوبصورت ہی نہیں تھا بلکہ بے حد صاف ستھرا بھی تھا۔ اس گاؤں کی ملتانی مٹی سے لیپے ہوئے گھر اتنے پیارے اور صاف تھے کہ ان پر گڑیوں کے گھروندوں کا گمان ہوتا تھا۔ یہاں کے لوگ بڑے سیدھے سادھے اور ایماندار تھے۔

یہاں سعیدہ کا گھر بھی تھا۔ سعیدہ ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ سعیدہ کے پڑوس میں چاچا علم دین کا گھر تھا۔ اس گھر میں ایک بلی رہتی تھی۔ ایک دن اس بلی نے تین بچے دیے۔ تینوں بچے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ ایک کا رنگ کالا تھا۔ دوسرے کا رنگ بھورا اور تیسرا چتکبرا تھا۔ یعنی اس کی سفید جلد پر کالے اور بھورے رنگ کے دھبے تھے۔ بلی ہر دم اپنے بچوں کی حفاظت کرتی مگر کم بخت بلا تاک میں رہتا تھا۔ آخر وہ دو بچوں کو پکڑ کر لے ہی گیا جو ایک باقی بچا اسے سعیدہ کی امی اپنے گھر لے آئیں۔ بھورے رنگ کا یہ بچہ بالکل مریل سا تھا مگر سعیدہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ سعیدہ کی امی نے چھوٹی سی پیالی میں اس کے سامنے دودھ رکھا تو وہ ننھی سی زبان نکال کر لپ لپ پینے لگی اور دودھ پیتے ہی ایسا لگا جیسے اس میں جان آ گئی ہو۔ وہ گھر بھر میں یوں بھاگنے لگا جیسے وہ مدتوں سے یہیں رہ رہا ہو۔ اس کو یوں بھاگتے دوڑتے دیکھ کر سعیدہ کی امی کہنے لگیں آئے ہائے یہ تو

بالکل ریشم کا لچھا لگ رہا ہے۔

سعیدہ کو یہ نام اتنا پسند آیا کہ وہ اسے ریشم کہنے لگی اور پھر یہی اس کا نام ہو گیا۔ سعیدہ نے ایک سرخ ربن میں چھوٹا سا گھنگرو ڈال کر اس کے گلے میں باندھ دیا۔ اب تو بالکل چابی کا کھلونا معلوم ہونے لگا۔ جلد ہی اس نے طاقت پکڑ لی اور ایک خوبصورت بلی کی شکل اختیار کر لی۔ اس کا جسم بالکل مخمل جیسا ہو گیا۔ اس کی حرکات بھی بہت پیاری تھیں۔ وہ اپنی سبزی مائل بھوری آنکھوں میں حیرت بھر کر ہر چیز کو بہت غور سے دیکھتی تھی۔ صحن میں بیٹھی چڑیاں جب اس کے دبے پاؤں آنے پر پھرامار کر اڑ جاتیں تو وہ دیر تک انھیں حیرانی سے دیکھتی رہتی۔

سعیدہ تھی تو چھوٹی سی مگر اس کے بال کافی لمبے تھے۔ اس کی امی اس کے لمبے بالوں میں پراندہ ڈال کر چٹیا گوندھ دیتی تھیں۔ سعیدہ جب بھی چارپائی پر لیٹتی تو اس کی لمبی سی چٹیا چارپائی سے نیچے لٹک آتی۔ ریشم اچھل اچھل کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتی۔ سعیدہ الٹی لیٹ کر اپنی چٹیا کو نیچے لٹکا کر جھلاتی اور ریشم جوں ہی اسے پکڑنے لگتی تو وہ پراندے کو اوپر اٹھا لیتی۔ ریشم خوب اونچی اونچی چھلانگیں لگاتی اور کبھی اس کی جمپ اتنی اونچی ہوتی کہ وہ چارپائی پر چڑھ آتی۔ سعیدہ ہنس ہنس کر دوہری ہو جاتی۔

اسی طرح امی فارغ وقت میں بیٹھ کر کروشیا بُنتی یا سویٹر تو کبھی کبھار اون یا دھاگے کا گولہ نیچے گر جاتا۔ ریشم خدا جانے کہاں سے نکلتی اور پنجے مارتی ہوئی اسے اتنی دور لے جاتی کہ امی اُٹھ کر اسے ایک دھموکہ لگاتیں۔ وہ گھبرا کر تیزی سے بھاگتی اور بڑی پیٹی کے نیچے جا کر چھپ جاتی اور کافی دیر وہیں دبکیں رہتی۔

ایک دن چھوٹے بھیا اس کے لیے گیند لے آئے۔ اب سعیدہ صحن میں گیند پھینکتی اور ریشم اس پر خوب پنجے چلاتی۔ گیند کو لڑھکتا دیکھ کر وہ بالکل دیوانی ہو جاتی تھی اور گھنٹوں کھیل کر بھی اس کا دل نہ بھرتا تھا۔ سعیدہ دودھ میں روٹی بھگو کر اسے بہت پیار سے کھلاتی تھی۔ کبھی کبھار امی اسے دو تین بوٹیاں بھی ڈال دیتی تھیں۔ رات کو ریشم سعیدہ کی پائنتی دب کر سوتی تھی حالاں کہ اس کے لیے ٹوکری بنائی گئی تھی جس میں گدیلا بچھا تھا۔ روز رات کو اسے اس گدیلے پر بٹھا کر ٹوکری سٹور میں رکھ دی جاتی مگر صبح دیکھو تو وہ سعیدہ کی پائنتی پر پڑی سو رہی ہوتی تھی۔

ریشم کو ہفتے میں ایک مرتبہ نہلایا بھی جاتا تھا حالاں کہ وہ پانی سے بہت گھبراتی تھی مگر جب وہ بہت چھوٹی تھی تو اکثر مٹی میں بھر جاتی تھی۔ اسے نہلا کر جب تولیے سے رگڑ کر خشک کیا جاتا تو اس کے ریشمی بال اور بھی چمکیلے لگنے لگتے۔ اس کے گھر میں آنے سے چھپکلیاں اور چوہے بھی غائب ہو گئے تھے۔ امی کو اس بات سے

بہت تسلی ہوئی تھی کیوں کہ گھر میں سارے سال کا اناج پڑا رہتا تھا اور چوہے اناج کے دشمن بوریوں میں سوراخ کر کے اناج کا ستیاناس کرتے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ تو سعیدہ کی چارپائی کے بالکل قریب والی دیوار کے ایک سوراخ میں سے ایک کنکھجورے نے سر نکالا تو ریشم اس پر بجلی کی طرح جھپٹی اور پل بھر میں اچھا خاصا لمبا کنکھجورا نکال کر مار ڈالا۔

کبھی کبھار ریشم کو لے کر سعیدہ کھیتوں کی طرف نکل جاتی۔ دور سے کھیتوں میں بیٹھے پرندوں کو دیکھ کر ریشم کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔ وہ کچھ دیر رک کر جائزہ لیتی اور دبے دبے قدموں سے گھات لگا کر ان کی طرف بڑھتی۔ پرندوں کو جوں ہی ریشم کی آمد کا احساس ہوتا وہ جھپاک سے اُڑ جاتے۔ ریشم حیرت سے منہ اور آنکھیں کھولے انھیں تکتی رہتی۔ اس کی حالت دیکھ کر سعیدہ کو اس پر بہت ہنسی آتی۔

دن یوں ہی گزرتے رہے اور ہر گزرے دن کے ساتھ سعیدہ اور ریشم کی محبت بھی بڑھتی گئی۔ ساتھ ساتھ وہ خود بھی بڑی ہوتی گئیں۔ ریشم ایک بہت شاندار بلی بن چکی تھی۔ ہر وقت کے چلبلے پن کے بجائے اب اس میں بہت ٹھہراؤ اور وقار آ گیا تھا۔ اب اسے نہلانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ خود ہی بے حد صاف ستھری رہتی تھی۔ روزانہ اپنے پنجوں سے یوں منہ صاف کرتی جیسے منہ دھو رہی ہو پھر بھی سعیدہ کبھی کبھار گیلے کپڑے پر ڈیٹول چھڑک کر اس کے بدن کی صفائی کر دیتی تھی کیوں کہ اس کی امی نے اسے بتایا تھا کہ بلیوں کے جسم میں خطرناک بیماری کے کیڑے پلتے ہیں۔

سعیدہ کی پانچویں سالگرہ آئی تو وہ بے حد خوش تھی کیوں کہ وہ اپنی پانچویں سالگرہ کا انتظار کافی دنوں سے کر رہی تھیں۔ بھلا کیوں؟ کیوں کہ اس کے سکول جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ سعیدہ کو سکول جانے کا بہت شوق تھا۔ وہ جب بھی کندھوں پر بستے لٹکائے صاف ستھرے، ہنستے مسکراتے بچوں کو سکول جاتا دیکھتی تو ضد کرنے لگتی کہ وہ بھی سکول جائے گی۔ مگر امی سمجھاتیں کہ پانچ برس کی عمر سے پہلے وہ سکول نہیں جا سکتی کیوں کہ آپا جی پانچ سال کی عمر سے چھوٹے بچوں کو سکول میں داخل نہیں کرتیں۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ کیسا سکول تھا کیوں کہ آپ تو ساڑھے تین سال کی عمر میں ہی سکول چلے جاتے ہیں بلکہ کئی بچوں کی مائیں تو چاہتی ہیں کہ اڑھائی تین برس کا بچہ ہی سکول چلا جائے کیوں کہ وہ سمجھتی ہیں کہ ان کا بچہ بہت ذہین ہے، خوب پٹاخ پٹاخ باتیں کرتا ہے، جو سکھاؤ سیکھ لیتا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتیں کہ اتنے چھوٹے بچے پر پڑھائی کا بوجھ ڈالنا درست نہیں۔ اگر بچہ ذہین اور چست و چالاک ہے تو اسے خوب کھیلنے کودنے، کھانے پینے دیں اور کھیل کھیل میں جو سکھانا ہو سکھا دیں۔ اس طرح خوب صحت مند اور چست و چالاک بچہ جب سکول میں داخل ہو گا تو وہ پڑھائی میں بھی تیز ہو گا۔ اسی

طرح ساڑھے تین برس کی عمر میں جو بچے سکول میں داخل ہوتے ہیں انھیں نرسری یا مونٹیسوری میں داخل کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی کھیل کھیل میں تعلیم دی جاتی ہے۔ مگر یہ سہولتیں بڑے شہروں میں ہی میسر ہوتی ہیں۔ گاؤں کے سکول تو پہلی کلاس سے شروع ہوتے ہیں اور پہلی کلاس میں داخل ہونے کے لیے بچے کی عمر پانچ سال ہونی چاہیے۔ سو سعیدہ بھی اب پانچ سال کی ہو چکی تھی۔ اگلے دن امی اسے سکول لے گئیں۔ ریشم اس کی گود میں ہی تھی کیوں کہ وہ ریشم کو چھوڑنے پر تیار ہی نہیں تھی۔ امی نے سعیدہ کے لمبے لمبے بالوں کو دو حصوں میں گوندھ کر ربن باندھ دیے۔ نیلے رنگ کی فراک اور سفید جرابیں پہنائیں۔ آنکھوں میں کاجل ڈالا تو سعیدہ بالکل گڑیا لگنے لگی۔ ”واہ بھئی واہ میری سعیدہ تو بالکل شہری لڑکی لگ رہی ہے۔ شہر سے بہو لانے کا یہی فائدہ ہے۔“ دادی اماں سعیدہ پہ نثار ہوتے ہوئے بولیں تو امی ہنس پڑیں۔ سعیدہ کی امی کا تعلق شیخوپورہ کے ایک گاؤں سے تھا مگر ان کے ابو لاہور میں کاروبار کرتے تھے اور انھوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی خاطر لاہور میں ہی رہائش اختیار کر لی تھی۔ سعیدہ کی امی نے تعلیم تو آٹھ جماعت تک ہی حاصل کی تھی لیکن وہ بہت سمجھ دار تھیں۔ گاؤں میں ان کی سمجھ داری کے بہت چرچے تھے۔ وہ اپنے سب بچوں کی تعلیم پر بہت توجہ دیتی تھیں۔

گاؤں کا سکول تھا بھی بہت اچھا۔ پرائمری تک یہاں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے۔ سکول کی ہیڈ مسٹریس کو سب آپا جی کہتے تھے۔ آپا جی اپنی سب استانیوں کو نصیحت کرتی تھیں کہ وہ بچوں کو بہت محنت اور محبت سے پڑھائیں۔ ان پھول سے بچوں پر ڈنڈا کبھی نہ چلائیں۔ آپا جی نہ صرف بچوں کو اچھی اچھی باتیں بتاتی تھیں بلکہ وہ اکثر گاؤں کے لوگوں کو بھی اکٹھا کر کے انھیں صفائی کی اہمیت اور اپنی مدد آپ کرنے کے طریقے بتاتی تھیں۔ انھی کی کوششوں کی وجہ سے تو گاؤں اتنا صاف ستھرا تھا۔ سب ان کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کی ہر بات مانتے تھے۔

سعیدہ نے سکول میں داخل ہو کر دیکھا گھنے درختوں کے سائے میں جگہ جگہ صاف ستھرے ٹاٹ بچھے ہیں۔ بچے ٹاٹوں پر بیٹھے سبق یاد کر رہے ہیں یا تختیاں لکھ رہے ہیں۔ دو تین جگہ پانی کے مٹکے اور کٹورے رکھے ہوئے ہیں۔ کیاریوں میں پھول کھلے ہوئے ہیں۔ سعیدہ کو سکول بہت اچھا لگا۔ اس نے ریشم کو گود سے اتار دیا۔ ریشم ایک گلہری کے پیچھے بھاگی تو بہت سے بچے کھی کھی ہنسنے لگے۔

سعیدہ کا فوراً داخلہ ہو گیا کیوں کہ اسے (الف۔ ب) اور گنتی سب کچھ یاد تھا۔ آپا جی بہت خوش ہوئیں جب داخلہ ہو گیا تو امی آپا جی سے بولیں۔

”آپا جی! سعیدہ کہتی ہے کہ ریشم بھی اس کے ساتھ سکول آئے گی۔“

”کہاں ہے ریشم! لاؤ اس کا ٹیسٹ بھی لے لیں۔“ آپا جی نے کہا تو سعیدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ امی کو بھی ہنسی آ گئی۔

”آپا جی! ریشم اس کی پالتو بلی کا نام ہے۔“

”ارے“ آپا چونک پڑیں، ”نہیں بیٹا! پھر ریشم سکول نہیں آ سکتی۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ سکول میں بچے پڑھتے ہیں۔“

”ریشم بھی میرے ساتھ پڑھے گی۔“

”سعیدہ! ادھر آؤ۔ میری بات غور سے سنو۔ اگر تمھاری ریشم آئے گی تو پھر انور اپنے کتے موتی کو ساتھ لے آئے گا۔ بختاور کہے گی کہ میں اپنی بچھیا لاؤں گی۔ نور دین اپنا خرگوش لانے کو تیار ہو جائے گا۔ پھر خود سوچو یہ سکول رہے گا یا چڑیا گھر بن جائے گا؟“

سعیدہ کو سوچتے دیکھ کر آپا جی نے اپنی بات مکمل کی۔ ”بیٹا پڑھائی کے وقت پڑھائی، کھیل کے وقت کھیل۔ ہر کام اپنے وقت پر اچھا لگتا ہے اور سکول پڑھنے کے لیے ہے۔“

سعیدہ نے سر ہلایا تو آپا جی خوش ہو گئیں۔ ”شاباش بہت سمجھدار لڑکی ہے۔“

امی نے اطمینان کا سانس لیا جو بات وہ گھر میں کئی دن سے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں، آج سعیدہ کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

اب سعیدہ سکول جاتی اور ریشم گھر پر رہتی۔ سعیدہ کو سکول میں ریشم یاد تو آتی مگر جلد ہی پڑھائی، سہیلیوں کی باتوں اور کھیل کود میں مگن ہو کر ریشم کا خیال اس کے ذہن سے محو ہو جاتا۔ مگر جوں ہی چھٹی ہوتی، دوسرے بچے اس خیال سے گھر کی طرف لپکتے کہ مزے سے کھانا کھائیں گے، کھیلیں کودیں گے۔ سعیدہ کو یہ خیال ہوتا کہ جلدی سے گھر جا کر اپنی ریشم کو گود میں لے کر خوب پیار کرے۔

ریشم بھی سعیدہ کے بغیر، جلے پیر کی بلی کی طرح سارے گھر میں گھومتی رہتی اور جوں ہی سعیدہ کی واپسی کا وقت ہوتا، جانے اسے کیسے اندازہ ہو جاتا، وہ گلی کے نکڑ پہ جا کر کھڑی ہو جاتی۔ سعیدہ کا تانگہ دور سے آتا نظر آتا تو وہ اچھلتی کودتی اس طرف لپکتی۔ تانگہ آگے بڑھتا تو پلٹ کر اس کے پیچھے بھاگنے لگتی اور جب سعیدہ تانگے سے اترتی تو ریشم اس کے پیروں میں لوٹنے لگتی، جب تک سعیدہ اسے گود میں اٹھا نہ لیتی اس کو قرار نہ آتا۔

سعیدہ ایک کلاس سے دوسری کلاس میں آتی رہی۔ ریشم قدرت کے سکول سے وہ سب باتیں سیکھ چکی تھی

جو ایک بلی میں ہوتی ہیں۔ اب زمین پہ بیٹھے پرندے بمشکل ہی اس کی گرفت سے بچ پاتے۔ بلکہ درختوں پہ ان کے گھونسلے بھی اب ریشم سے محفوظ نہ تھے۔ سعیدہ کی غیر موجودگی میں وہ اب چپکے سے گھر سے نکل جاتی اور گاؤں کے چپے چپے پر گھوم آتی تھی۔

ایک دن سعیدہ کے ماموں آ گئے۔ وہ لاہور کے ایک نواحی گاؤں کے بڑے زمیندار تھے۔ ان کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی۔ ماموں اس شادی میں شرکت کی دعوت دینے آئے تھے۔ سعیدہ تو خوشی سے اچھل پڑی۔

’’ارے صائمہ باجی دلہن بنیں گی؟ ان کی بارات آئے گی؟ کتنا مزہ آئے گا!‘‘

’’پھر بلو بھی تو وہاں ہوگی۔ بلو کو دیکھے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔‘‘ بلو ماموں کی چھوٹی بیٹی تھی۔ وہ سعیدہ کی ہم عمر تھی۔ نام تو اس کا بلقیس تھا مگر گھر میں پیار سے سب اسے بلو کہتے تھے۔ ماموں رات وہیں رہے۔ دیر تک سب گھر والے ان سے باتیں کرتے رہے۔ ماموں زیادہ تر بیٹی کی شادی کی باتیں ہی کرتے رہے اور صبح سب سے آنے کا وعدہ لے کر چلے گئے اور امی نے اسی روز سے بھتیجی کی شادی میں جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان کا ایک ہی بھائی تھا۔ وہ اس کی بچی کی شادی میں خوب شان و شوکت سے جانا چاہتی تھیں۔

ایک روز وہ بیٹھی سعیدہ کے سوٹ میں گوٹہ لگا رہی تھیں کہ سعیدہ نے اچانک نعرہ لگایا ’’امی! ہم کتنے دنوں کے لیے جائیں گے۔‘‘

’’پتر! ایک ہفتہ تو لگ ہی جائے گا۔‘‘

’’ایک ہفتہ؟ مگر ایک ہفتہ ریشم کہاں رہے گی؟‘‘

’’ریشم کو چاچے علم دین کے گھر چھوڑ جائیں گے۔‘‘

چاچے علم دین کے گھر؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں ریشم کے بغیر نہیں رہ سکتی۔‘‘

’’پھر؟‘‘ امی نے تیوری چڑھا کر دیکھا۔

’’امی! کیوں نہ ریشم کو بھی ساتھ لے چلیں۔‘‘

’’لڑکی! دیوانی ہو گئی ہے کیا؟‘‘

’’امی! میری اچھی امی!! سعیدہ اٹھ کر امی سے لپٹ گئی۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ ہم ریشم کے لیے بھی خوب اچھے کپڑے بناتے ہیں اور زیور بھی ...... امی سونے کے زیور۔ ذرا سوچیں۔ سوچیں سب دیکھیں گے۔ واہ سعیدہ کی بلی کے کیا ٹھاٹھ ہیں ...... سعیدہ منصوبے باندھتی رہی اور امی ہنس ہنس کر دوہری ہوتی رہیں کہ ذرا اس لڑکی کی باتیں تو سنو۔

مگر جناب سعیدہ کی باتیں صرف باتیں نہ تھیں، وہ جو ٹھان لیتی وہ کر کے دم لیتی تھی۔ اس نے ریشم کے لیے زیور اور کپڑوں کا اس قدر مطالبہ کیا کہ آخر سب راضی ہو گئے کیوں کہ بات تو واقعی بالکل نئی تھی۔ سارے گاؤں میں چرچا ہوتا کہ دلشاد بیگم کے گھر کے جانور بھی زیور پہنتے ہیں۔ پوری برادری مرعوب ہو جاتی۔ لہٰذا ریشم کے لیے گہنے بنانے کا آرڈر دے دیا گیا۔

جلد ہی زیور بن کر آ گئے، سونے کا ایک کنٹھا جس میں بہت سے گھنگھرو لگے تھے اور چاروں پیروں کے لیے چھم چھم کرتے کڑے۔ ایک چھوٹا سا سرخ دوپٹہ امی نے گوٹہ کناری لگا کر تیار کر دیا اور جب وہ لوگ ماموں کے گھر پہنچے تو واقعی شور مچ گیا۔ لوگ دور دور سے ریشم کو دیکھنے آنے لگے، ہر طرف یہی چرچا تھا کہ دلشاد بیگم اور اللہ وسایا کی لڑکی کی بلی نے سونے کے گہنے پہن رکھے ہیں۔ سعیدہ تو سعیدہ اس کی امی بھی خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھیں۔

شادی کی رونقیں عروج پر تھیں۔ طرح طرح کی رسمیں ادا کی جا رہی تھیں۔ مزے دار کھانے پک رہے تھے۔ لڑکیاں ڈھولک کی تھاپ پہ ناچ رہی تھیں۔ گاؤں کے گھبرو بھنگڑے اور لڈیاں ڈال رہے تھے۔ سعیدہ کو بہت ہی مزہ آ رہا تھا۔ وہ بلو کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ریشم کو گود میں لیے کبھی ادھر جاتی کبھی اُدھر۔ اس کی امی نے اس کے لیے پورے پندرہ جوڑے سیئے تھے۔ تقریباً ہر رنگ کا جوڑا تھا اور خوب گوٹے کناری سے سجا تھا۔ ڈھیر سارے زیور اور خوبصورت پراندے تقریباً ہر دو گھنٹے کے بعد وہ لاڈلی کو نئے سرے سے سنوار دیتیں۔ سب کہہ رہے تھے کہ بھئی سعیدہ کے ٹھاٹھ تو دلہن سے بھی زیادہ ہیں۔

دو تین دن طرح طرح کی رسموں اور ملے گلے کے بعد شادی کا دن آ پہنچا۔ اس روز کی رونق باقی سب دنوں سے بڑھ گئی۔ ڈوم، میراثی اندر باہر گلے پھاڑ پھاڑ کر گانے لگے۔ کام کرنے والی عورتیں خوش رنگ لباس اور گلے میں پھولوں کا ہار پہنے مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے ہاتھوں میں لیے برات کے استقبال کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ اس روز سعیدہ کی سج دھج بھی دیکھنے کے قابل تھی۔ یک دم شور مچا ”بارات آ گئی، بارات آ گئی۔“ سب عورتیں، بچے بینڈ باجے کے نظارے کے لیے باہر کو بھاگے۔ سعیدہ بھی سہیلیوں کے جھرمٹ میں باہر نکلی۔ باجوں گاجوں کی آواز خوب زور و شور سے آ رہی تھی لیکن لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ دکھائی کچھ نہیں دے رہا تھا۔ لڑکیاں ایڑیاں اٹھا اٹھا کر بارات دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اچانک سعیدہ کی نظر مٹی کے ایک چبوترے پر پڑی۔ اس نے ریشم کو گود سے اتار کر اس چبوترے پہ کھڑا کیا اور خود بھی اس پر چڑھ کر بارات دیکھنے لگی۔

واہ کیا شاندار نظارہ تھا۔ دولہا ہاروں سے لدا پھندا، سہرے میں چھپا، بڑے سے لہراتے طرے والی

پگڑی باندھے، سفید گھوڑے پہ بیٹھا تھا۔ گھوڑا بہت خوبصورت تھا، اسے بھی گہنوں سے خوب سجایا گیا تھا اور وہ بڑی شان سے ڈلکی چال چل رہا تھا۔ آگے آگے نوجوان رنگ برنگے لاچے باندھے بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ پیچھے بینڈ باجے والے تھے۔ ان کے پیچھے بہت سے ملازم قیمتی چیزوں کے خوان اور پھلوں اور مٹھائی کے ٹوکرے اٹھائے چل رہے تھے اور سب سے پیچھے مہمان مرد، عورتیں اور بچے زرق برق لباسوں میں ملبوس چلے آ رہے تھے۔ ان پر گل پاشی کی جا رہی تھی۔ ان کے گلوں میں ہار ڈالے جا رہے تھے۔ سعیدہ تو اس نظارے میں گم ہو کر رہ گئی۔ جلد ہی بارات حویلی کے دروازے تک آ پہنچی، اسے بڑے اہتمام سے اندر لایا گیا۔ سعیدہ چبوترے سے نیچے اتری تو اسے کسی کمی کا احساس ہوا۔ کچھ دیر وہ سوچتی رہی پھر یک دم چونکی "ارے ریشم کہاں ہے؟" اس نے ادھر اُدھر دیکھا مگر ریشم کا کچھ پتہ نہ تھا۔ سعیدہ بے قرار ہو کر اٹھی اور دیوانوں کی طرح ریشم کو ڈھونڈنے لگی لیکن جب اسے کہیں نہ پایا تو روتی ہوئی امی کے پاس پہنچی۔ اسے روتے دیکھ کر امی بے تابی سے اس کی طرف لپکیں۔

"کیا ہوا...... کیا ہوا؟ پُتر کیوں رو رہی ہے؟ کچھ تو بول۔"

"امی وہ...... وہ......"

"سعیدہ! جلدی بول۔ کیا وہ...... وہ؟"

"امی وہ...... ریشم......"

"کہاں ہے ریشم؟" اب امی نے ادھر اُدھر دیکھا۔

"امی! وہ مجھے نہیں مل رہی۔ وہ کھو گئی ہے۔"

"مل جائے گی، مل جائے گی۔ تُو پریشان نہ ہو مگر وہ خود پریشان تھیں کیوں کہ ریشم نے کافی مہنگے گہنے پہن رکھے تھے۔

پھر سارا دن گزر گیا، کیسی شادی؟ کہاں کی خوشی۔ دلہن نے کیسے کپڑے پہنے کب رخصت ہوئی؟ سعیدہ کو کچھ ہوش نہ تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ہونٹوں پہ ہائے ریشم ہائے ریشم کی گردان تھی۔ پہلے حویلی اور پھر گاؤں کا چپہ چپہ چھان مارا گیا مگر اس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ شادی کی تقریبات ختم ہو گئیں اس کے بعد بھی کئی روز تک ریشم کو تلاش کیا جاتا رہا۔ بڑوں کو زیور کی فکر تھی اور سعیدہ کو ریشم کی۔ تھک ہار کر سب مایوس ہو گئے اور سعیدہ کی امی واپسی کی تیاری کرنے لگیں مگر سعیدہ مانتی ہی نہ تھی۔ وہ کہتی تھی کہ ریشم کے بغیر واپس نہیں جائے گی۔ بہت مشکل سے سمجھا بجھا کر، بہلا پھسلا کر اسے واپسی کے لیے تیار کیا گیا۔

مگر گھر جا کر سعیدہ کو ریشم کی ایسی ہڑک لگی کہ وہ تو بستر پر پڑ گئی۔ بخار میں کراہتی تو منہ سے ہائے اللہ یا ہائے ماں کے بجائے ہائے ہی نکلتا تھا۔ گھر بھر پریشان ہو گیا۔ حکیم صاحب کو بلایا گیا۔ شہر سے ڈاکٹر بلوایا گیا مگر سعیدہ کا بخار نہ اترا۔

بچو!

آپ کو بھی ضرور حیرت ہو رہی ہو گی کہ آخر ریشم کہاں گئی؟ سعیدہ کو اس کی حالت پر چھوڑ کر ہم ریشم کا حال دیکھتے ہیں۔ اسے سعیدہ نے جب مٹی کے چبوترے پر بٹھایا تو ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اچانک اسے ایک کونے میں چوہا نظر آیا۔ وہ چھلانگ مار کر اس کی طرف لپکی۔ چوہے کو شاید پتہ نہ چلتا مگر چھن چھن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک چھنچھناتی بلی اس پر جھپٹنے آ رہی ہے تو وہ تیزی سے بھاگا۔ ریشم کو گاؤں کی گلیوں میں بھگاتا دوڑاتا کھیتوں میں لے آیا اور پھر چھلانگیں مارتا غڑاپ سے کسی سوراخ میں کود گیا۔ شکار ریشم کے ہاتھ سے نکلا تو غصے سے اس کا برا حال ہو گیا۔ وہ غرانے لگی۔ بار بار اپنا پنجہ بل میں گھسانے کی کوشش کرتی۔ کبھی اندر جھانکتی مگر چوہا اب اس کی پہنچ سے دور تھا۔ جب ہر کوشش ناکام رہی تو ریشم نے اپنی طرف سے ایک چالاکی سوچی۔ وہ بل کے منہ سے کچھ دور ہٹ کر تاک لگا کر بیٹھ گئی۔

سعیدہ کے ماموں کا گاؤں سرحد کے بالکل قریب تھا۔ اتنا قریب کہ ہندوستانی کھیت اور پاکستانی کھیت ایک دوسرے کے گلوں میں بانہیں ڈالے کھڑے تھے اور جس چوہے کو ریشم نے شکار کے لیے تاکا تھا، اس کا گھر ہندوستانی کھیت میں تھا۔ گویا ریشم اپنے شکار کے تعاقب میں پاکستان سے نکل کر ہندوستان آ پہنچی تھی۔ مگر جانور بیچارے کو انسانوں کی باتوں کی کیا خبر۔ یہ کھیت مکھن سنگھ نامی ایک کسان کا تھا۔ مکھن سنگھ کا بیٹا شیر سنگھ یوں ہی گھومتا گھامتا اس طرف آ نکلا جدھر ریشم چوہے کی تاک لگائے بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ ایسی خوبصورت گہنوں سے سجی سجائی بلی؟ اس نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ ریشم بہتیرا غرائی، اسے پنجے بھی مارے مگر دھرتی کی گود میں پلنے والے بچے اتنے نرم و نازک نہیں ہوتے کہ معمولی خراشوں سے گھبرا جائیں۔ اس نے ریشم کو بغل میں دبایا اور گھر لے گیا۔ شیر سنگھ کی ماں گہنوں سے لدی پھندی بلی دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ''ارے شیرو! کس کی بلی اُٹھا لایا ہے؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''کسی کی بھی نہیں۔''

''کسی کی بھی۔ تو پھر اسے یہ گہنے کپڑے کس نے پہنائے ہیں؟''

''مجھے کیا پتا ماں۔''

”ارے کم بخت ابھی اس کا مالک آگیا نا تو تجھے پکڑ کر پولیس تھانے میں دے دے گا۔ جلدی جا جہاں سے لایا ہے اسے وہیں چھوڑ کر آ۔

”نہیں ماں! میں تو اسے پالوں ......بات ابھی شیرو کے منہ میں تھی کہ مکھن سنگھ بھی آگیا۔ اس نے بھی بیٹے سے یہی سوال کیا کہ وہ بلی کہاں سے پکڑ لایا ہے۔

”باپو! یہ ہمارے کھیت میں بیٹھی تھی۔“

”کھیت میں کہاں سے آ گئی؟ لگتا ہے کہ گرو کی کرپا ہو گئی ہمارے حال پر۔ اری بھاگوان اتار اس کے گہنے اور چھپا لے جلدی سے۔“

”ہاں آ گیا نا لالچ؟ گرو کی کرپا سے۔ ابھی کوئی آتا ہو گا پولیس لے کر، پھر بھی یہی کہیو کہ جوتے کھا رہا ہوں گرو کی کرپا سے۔“

”اری زیادہ ٹرٹر نہ کر۔ لا شیرو، ادھر لا اس جنور (جانور) کو۔“

”باپو! یہ میری بلی ہے، میں کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔ اس کے گہنے نہیں اتارنے دوں گا......باپو ......یہ میری بلی ہے، میں اسے روٹی کھلاؤں گا، دودھ پلاؤں گا۔“

”ارے دو ہاتھ لگاؤں گا۔ بڑا آیا کہیں سے بلی والا۔ ہٹ اُدھر۔“

شیرو مچلتا رہ گیا مگر اس کے باپ نے اس سے بلی چھین کر اس کے گہنے اتار دیے۔ انھیں دھوتی کی ڈب میں باندھا اور پھر ریشم کو ایک تھیلے میں بند کر لیا تاکہ کوئی ریشم کو اس کے گھر سے نکلتے دیکھ بھی نہ سکے۔ پھر اس نے ریشم کو کافی دور لے جا کر چھوڑ دیا۔

رہائی ملتے ہی ریشم بے تحاشا بھاگی۔ وہ بھاگ رہی تھی کہ ایک دم اس کے سامنے ایک گاڑی آ گئی۔ گاڑی ایک ہرے بھرے کھیت کے کنارے کھڑی تھی اور اس کی آڑ میں ایک خاندان چھوٹا سا غالیچہ بچھا کر کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ کھانے کی خوشبو ریشم کی ناک میں گئی تو اسے احساس ہوا کہ وہ بے حد بھوکی ہے۔ بے اختیار وہ غالیچے کے پاس جا کر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔

غالیچے پر ایک پیارا سا بچہ اپنے امی ابو کے ساتھ بیٹھا تھا۔ بلی کو دیکھ کر اسے اس پر بہت پیار آ گیا اور اس نے اپنے لنچ باکس سے تھوڑا سا کھانا نکال کر بلی کے سامنے ڈال دیا۔ ریشم بے تابی سے کھانے لگی۔

یہ ایک امریکی خاندان تھا۔ مسٹر اینڈ مسز ڈیوڈ اور ان کا بیٹا جونز۔ یہ لوگ اپنی گاڑی پر سیر و سیاحت کے لیے نکلے تھے۔ یورپ اور ایشیا کے مختلف ملکوں میں گھوم پھر چکے تھے۔ پچھلے ماہ سے وہ پاکستان میں تھے۔

پاکستان کی خوب سیر کر چکنے کے بعد اب وہ بھارت جا رہے تھے۔ جوزا اپنا کھانا بھول کر بہت دلچسپی سے ریشم کو دیکھنے لگا۔ جوں ہی ریشم سینڈوچ کھا کر فارغ ہوئی جوزنے تھرماس میں سے دودھ نکال کر ایک کاغذی پلیٹ میں ڈال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ریشم لپ لپ دودھ پینے لگی۔ جوز کو وہ اتنی پیاری لگی کہ اسے گود میں اٹھا کر سہلانے لگا۔ ریشم نے اسے بالکل پنجے نہیں مارے۔ وہ تو اس کا محسن تھا، اس نے اسے کھانا کھلایا تھا، دودھ پلایا تھا۔ وہ سر جھکائے ایسے میاؤں میاؤں کرنے لگی جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔ جوز کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”مما بہت پیاری بلی ہے نا؟“

”بہت۔“ مما نے بھی ریشم کو پیار کیا۔

”مما! میں اسے ساتھ لے جاؤں گا۔ دیکھیں میری گود میں کتنے آرام سے بیٹھی ہے۔ جیسے مجھے پہلے سے جانتی ہو۔“

”مگر بیٹا! کسی کی پالتو نہ ہو۔“

”نہیں مما! پالتو بلیوں کے گلے میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔ اس کے گلے میں نہ تو پٹا ہے نہ ربن۔“

جوز صحیح کہہ رہا ہے۔ ویسے بھی پالتو بلیاں کھیتوں میں نہیں گھومتی پھرتیں۔ یہ جگہ تو ویسے بھی آبادی سے بہت دور ہے۔ جوز کے پاپا بولے تو جوزنے خوشی کا نعرہ لگایا اور ریشم کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کی می اور پاپا نے جلدی جلدی سامان سمیٹ کر ڈگی میں ڈالا اور آگے کو روانہ ہو گئے کیوں کہ شام کے سائے لمبے پڑ رہے تھے۔

ریشم آنکھوں میں حسرت اور حیرت بھر کر گاڑی کے شیشوں سے باہر تکنے لگی۔ شاید اسے سعیدہ یاد آ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دبک کر بیٹھ گئی۔ جوز نے جلدی سے دو کشن لگا کر اس کے لیے بستر تیار کیا اور بہت پیار سے اسے ان پر بٹھا دیا۔

اگلے کئی ماہ میں ریشم نے ڈیوڈ فیملی کے ہمراہ بھارت کے تمام بڑے بڑے شہر دیکھ لیے۔ جوز اسے سویٹی کہتا تھا اور اس سے اتنی ہی محبت کرتا تھا جتنی کہ سعیدہ کرتی تھی مگر ریشم کو پھر بھی سعیدہ بھولی نہ تھی۔ اگر اسے ذرا بھی موقع مل جاتا تو وہ واپس سعیدہ کے پاس جاتی مگر جوز تو اسے چھوڑتا ہی نہ تھا۔ ہر وقت لادے لادے پھرتا تھا۔ دہلی، آگرہ، بنارس اور جانے کہاں کہاں سے ہوتے ہوئے وہ لوگ بمبئی جا پہنچے۔

بمبئی جسے گیٹ وے آف انڈیا کہتے ہیں کہ انگریزوں کو اسی راستے سے برصغیر میں اپنے قدم جمانے کا موقع ملا۔ جس زمانے میں یورپی قومیں دنیا بھر میں ایسی کالونیاں ڈھونڈتی پھر رہی تھیں، جن پر قبضہ جما کر وہ وہاں کے وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھا سکیں۔ اس زمانے میں پرتگالی اور ولندیزی بحری طاقت میں

انگریزوں سے زیادہ طاقت ور تھے ۔ برصغیر ان سب کی نظروں میں سونے کی چڑیا تھی جس کے پروں کو پرتگالیوں نے قبضے میں لیا تھا ۔ یعنی ہندوستان کی تمام مشہور بندرگاہوں پر تجارت کے بہانے انھوں ں نے قبضہ جما لیا تھا اور انگریزوں کو ان پر پاؤں نہ دھرنے دیتے تھے ۔ مغل بادشاہوں کو بحری طاقت کی اہمیت کا اندازہ ہی نہ تھا ۔ وہ ان سفید فام لوگوں کو صرف تاجر ہی سمجھتے تھے ۔ ان دنوں انگریز جلے پیر کی بلی کی طرح بحرِ ہند میں گھومتے پھرتے تھے اور للچائی نظروں سے ان بندرگاہوں کو دیکھتے تھے جن پر پرتگالیوں اور ولندیزیوں کا قبضہ تھا ۔ وہ اکثر بمبئی کے قریب سے گزرتے اور سوچتے کاش اس چھوٹی سی مچھیروں کی بستی پر پاؤں رکھنے کا موقع مل جائے ، پھر ہم ان پرتگالیوں اور ولندیزیوں سے نمٹ لیں گے ۔ آخر ایک دن ان کی امید بر آ ہی گئی ۔ کسی یورپی شہزادے کی شادی ایک ولندیزی شہزادی سے ہو گئی ۔ باپ نے بیٹی کو بمبئی کی بندرگاہ تحفے میں پیش کی مگر یورپی شہزادے کو یہ چھوٹی سی ماہی گیروں کی بستی پسند نہ آئی ۔ انگریز تو موقعے کی تلاش میں تھے ۔ انھوں نے جھٹ اس شہزادے کو ایک خطیر رقم کے عوض یہ بندرگاہ بیچنے کی پیش کش کی اور وہ بیوقوف مان گیا ۔

بس انگریز کو تو صرف قدم جمانے کے لیے تھوڑی سی جگہ درکار تھی ۔ اس نے اس مچھیروں کی بستی کو ممبئی میں تبدیل کر دیا ۔ اس کا نام پہلے ممبئی تھا انگریز اسے Bomby بمبے کہنے لگے ۔ ابھی حال ہی میں بھارت کی حکومت نے پھر سے اس کا پرانا نام ممبئی بحال کر دیا ہے ۔ مگر ہم آپ کو جس وقت کی کہانی سنا رہے ہیں ، اس وقت اس کا نام بمبئی تھا ۔ لہٰذا ہم اپنی کہانی میں اسے بمبئی ہی کہیں گے ۔ تو بچو ! بمبئی انگریزوں کے دور میں بھی ایسا شہر تھا جسے بین الاقوامی اہمیت حاصل تھی اور جسے عروس البلاد کہا جاتا تھا ۔ آج بھی بمبئی بھارت کا اہم ترین شہر ہے ۔ یہاں کے کئی علاقے دنیا بھر میں مشہور ہیں ۔ یہاں دنیا کے امیر ترین لوگ بھی رہتے ہیں اور غریب ترین لوگ بھی لاکھوں کی تعداد میں جو دن بھر مزدوری کرتے ہیں اور شام کو کھولیوں ، جھونپڑیوں اور فٹ پاتھوں پر سوتے ہیں ۔ کھولی اور جھونپڑ پٹی بمبئی کی زبان میں جھونپڑیوں کو کہا جاتا ہے ۔

ڈیوڈ فیملی نے بمبئی کا چپہ چپہ دیکھا مگر جوزف ساحلِ سمندر دیکھنے کے لیے بے تاب تھا کیوں کہ وہ امریکہ میں میامی میں رہتے تھے اور جوزف ہر ویک اینڈ ساحل پر گزارنے کا عادی تھا مگر جس روز انھیں بمبئی کے مشہور ساحل چوپاٹی جانا تھا ، اس روز اس کے پاپا نے اسے مشورہ دیا کہ سویٹی کو گاڑی میں ہی چھوڑ جانا چاہیے کیوں کہ بلیاں پانی سے بہت ڈرتی اور گھبراتی ہیں ۔ پہلے تو جوزف نہ مانا مگر اپنی سویٹی کے آرام کی خاطر مان گیا ۔ اس نے ریشم کے لیے دودھ اور کباب وغیرہ پلیٹ میں رکھے ۔ کشنوں کے ڈھیر پر اسے بٹھایا اور کہنے لگا ۔

” پیاری سویٹی ! بس دو تین گھنٹے تمھیں اکیلے رہنا پڑے گا ۔ تمھیں پانی سے ڈر لگتا ہے نا ، اسی لیے تمھیں

لے کر نہیں جا رہا۔ تم خوب کھانا پینا، آرام سے سو جانا۔ میں تمھارے لیے چاکلیٹ، بسکٹ اور کباب لے کر آؤں گا، ٹھیک۔"

ریشم نے ایسے سر جھکا لیا جیسے ساری بات سمجھ میں آ رہی ہو اور جوز چلا گیا۔ چوپاٹی تو بہت مزے کی جگہ تھی۔ وہاں بچوں کی تفریح اور موج میلے کے بہت سامان تھے۔ ہرے ناریل کا مزے دار پانی، چٹ پٹی بھیل پوری، طرح طرح کے کھیل تماشے، جھولے اور پھر سمندر کی موجیں۔ جوز تو بے تابی سے سمندر کی طرف لپکا اور گھنٹوں مچھلی کی طرح تیرتا رہا اور اس کا دل ہی نہ کرتا تھا کہ وہ پانی سے باہر آئے۔ آخر بمشکل پکڑ دھکڑ کر اسے پانی سے باہر نکالا گیا۔

ریشم کچھ دیر تو کشنوں کے ڈھیر میں دبکی بیٹھی رہی۔ پھر سو گئی، اٹھی تو اس نے خوب لمبی لمبی انگڑائیاں لیں۔ پھر اپنا پنجہ گیلا کر کے منہ دھویا اور جسم صاف کیا۔ پھر اپنی پلیٹ کی طرف لپکی، کھایا پیا پھر بیٹھ کر منہ صاف کرنے لگی۔ اس کے بعد اس کی مصروفیات ختم ہو گئیں۔ اب کیا کرے؟

اس نے گاڑی کا معائنہ شروع کر دیا۔ یہ گاڑی بالکل ایک گھر کی طرح تھی۔ اس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ریشم ایک ایک چیز کا معائنہ کرتی پھری۔ اچانک ایک طرف اس کی نظر پڑی۔ شیشے پر ایک تتلی بیٹھی تھی۔ ریشم اس پر جھپٹی تو شیشے سے جا ٹکرائی۔ تتلی تو اُڑ گئی مگر ریشم کا ایک پنجہ کھڑکی سے باہر نکلا۔ ارے! شیشہ تو کھلا تھا۔ ریشم نے پنجہ اندر کیا پھر باہر نکالا پھر اندر کیا اور پھر دونوں پنجے باہر نکال کر سر بھی باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔ ذرا سی جدوجہد کے بعد اس کا سر بھی باہر نکل آیا۔ بلیوں کے جسم میں ایک خاص لچک ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ چھوٹی سی جگہ میں سے بھی آر پار جا سکتی ہیں۔ ریشم بھی ذرا سی کوشش کے بعد باہر آ گئی۔ باہر نکل کر اس نے کچھ دیر لمبے لمبے سانس لیے اور پھر منہ اٹھا کر بھاگ پڑی اور جب جوز ہاتھ میں ڈھیر سارے غبارے، چاکلیٹ، بسکٹ اور کباب لے کر واپس لوٹا تو اس کی سوئی جا چکی تھی۔

ریشم کا سفر ایک مرتبہ پھر شروع ہو چکا تھا۔ یہ سفر اس کی اپنی ٹانگوں، یادداشت اور ہمت کے بل بوتے پر تھا۔ بمبئی بھارت سے اکبر آباد پاکستان کا سفر۔

سعیدہ کا بخار تو دو ہفتوں میں ٹوٹ گیا تھا مگر وہ اس قدر کمزور ہو چکی تھی کہ پہچانی نہ جاتی تھی۔ بڑے بھیا اس کے لیے ایک بہت بڑے پنجرے میں بہت سے رنگین طوطے لائے تھے مگر اس نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ امی نے کئی پیارے پیارے بلونگڑے منگوائے مگر انھیں دیکھتے ہی اسے ریشم یاد آ جاتی اور وہ ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگتی۔ چھوٹے بھائی نے اسے ڈھیر ساری مزے دار کہانیوں کی کتابیں لا کر دیں مگر اسے کچھ اچھا

نہ لگتا تھا۔ دادی جان کو تو اب غصہ آنے لگا۔ وہ اکثر چلا اُٹھتیں۔

”جانوروں سے ایسی محبت ہم نے تو نہ دیکھی نہ سنی۔ یہ لڑکی تو بالکل دیوانی ہے۔“

امی اور بابا بھی بہت پریشان تھے۔ سعیدہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بڑی لاڈلی اور نازوں کی پالی۔ اس کا یہ حال ان سے دیکھا نہ جاتا۔ اسے بہلانے کے سو سو جتن کرتے مگر سعیدہ کا دل کس طرح بہلتا۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ خود بخود سنبھل جائے گی مگر وہ وقت کب آئے گا؟ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔

سعیدہ کی آنکھیں ہر وقت دروازے پر رہتی تھیں۔ ہر آہٹ پر اسے ریشم کے آنے کا گمان ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ سب کی نظریں بچا کر چپکے سے باہر نکل جاتی اور گاؤں کے قریب سے گزرنے والی بڑی سڑک پر بیٹھ کر ریشم کی راہ تکنے لگتی۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن اس کی ریشم ضرور آئے گی اور ایک روز سچ مچ اس کی یہ آس پوری ہو گئی۔ وہ یوں ہی چپکے سے گھر سے نکلی اور بڑی سڑک کے کنارے میل پتھر پر جا کر بیٹھ گئی۔

عصر کا وقت تھا۔ سائے لمبے ہو رہے تھے۔ سعیدہ سڑک پر اس طرف نظریں جمائے بیٹھی تھی جو راستہ لاہور کو اس کے بعد اس نواحی گاؤں کو جاتا تھا جہاں اس کے ماموں رہتے تھے۔ اچانک اس نے دور سے دیکھا کہ ایک بلی بھاگتی چلی آ رہی ہے۔

سعیدہ چونک اٹھی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ”کہیں یہ ریشم نہ ہو۔“ بلی کچھ اور آگے آئی، وہ اس قدر دبلی تھی کہ اس کی پسلیاں گنی جا سکتی تھیں۔ اس کے بال کیچڑ میں اَٹ کر گندے غلیظ ہو رہے تھے مگر پھر بھی سعیدہ نے اسے پہچان لیا۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔

”ریشم!“

وہ واقعی ریشم تھی۔ ریشم بھاگتی ہوئی آئی اور سعیدہ کے قدموں پر گر پڑی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

”ریشم میری ریشم تُو کہاں چلی گئی تھی؟ سعیدہ کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ اس نے ریشم کے گندے ہونے کی کوئی پروا نہ کی اور اس کو لپک کر اٹھانے کے لیے جھکی۔ مگر یہ کیا، ریشم تو اپنی مالکن، اپنی سہیلی، اپنی بچپن کی ساتھی کے قدموں میں دم توڑ چکی تھی۔

اس نے اپنی دوست سے ملاقات اپنی جان کی قیمت پر کی تھی۔ بمبئی سے پاکستان کا سفر اس کی ننھی سی جان کے لیے بہت بھاری تھا۔ سعیدہ نے آنسو بہاتے ہوئے اپنی ریشم کے بے جان جسم کو سینے سے لگا لیا۔

رضیہ فصیح احمد

پیٹو بلی

ارشد کو بلیاں بہت پسند تھیں۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ اس نے اپنے باورچی خانے کے پچھواڑے میں یوں ہی ایک برتن میں تھوڑا سا دودھ ڈال کر دیوار کے ساتھ رکھ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ارشد نے آن کر دیکھا تو ایک چتکبری جنگلی بلی، وہ دودھ پی رہی تھی۔ یہ بلی تھی تو چتکبری اور جنگلی، مگر صورت کی بُری نہ تھی۔ اس کے بدن پر بھورے اور سلیٹی رنگ کے بڑے خوشنما نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ یہ خوب صورت نقش و نگار ارشد کو بڑے پیارے لگتے تھے۔

ارشد نے فی الحال اسی چتکبری بلی کو دوست بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بڑی تیز اور چوکنی بلی تھی۔ دودھ پیتے ہوئے اگر اس کے قریب پتہ بھی کھڑکتا تو وہ بھڑک کر دور ہٹ جاتی۔ آخر کنکھیوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے اس نے سارا دودھ پی لیا اور پھر وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئی۔ آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ ارشد نے دیکھا، وہ بلی پھر وہاں باورچی خانے کے قریب منڈلا رہی ہے، جیسے وہ کھانے کی تلاش میں ہو۔ اب کے وہ ذرا دور گئی تو ارشد نے جلدی سے گوشت کے چند ٹکڑے پلیٹ میں ڈال کر وہیں رکھ دیے، جہاں اس نے پہلے دودھ کا برتن رکھا تھا۔ ”بڑی بلی ہے، اتنے سے دودھ سے اس کا بھلا کیا بنے گا۔“ ارشد نے سوچا۔

ارشد نے اپنے کمرے میں آ کر جھوٹ موٹ باورچی خانے کا اندر سے دروازہ بند کر لیا اور تھوڑی سی درز میں سے باہر کا تماشہ دیکھنے لگا۔ بلی جھٹ گوشت پر ٹوٹ پڑی اور پھر منٹوں میں اسے صاف کر کے غائب ہو گئی۔

ابھی بمشکل دو گھنٹے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ وہ پھر آن موجود ہوئی۔ اس دفعہ تو وہ ہلکی ہلکی میاؤں میاؤں کی آواز بھی نکال رہی تھی، جیسے وہ چپکے چپکے کسی سے کھانے کو کچھ مانگ رہی ہو۔

ارشد کو بڑا تعجب ہوا۔ پھر اسے خیال آیا کہ بڑی بلیوں کی خوراک ضرور زیادہ ہوتی ہو گی، اسی لیے یہ بلی بار بار آتی ہے۔ اور پھر وہ خود بھی تو سارا دن کچھ نہ کچھ کھاتا رہتا ہے۔ اس دفعہ اس نے دودھ میں ڈبل روٹی کے چند ٹکڑے بھگو کر بلی کو دیے اور خود، وہیں دروازے میں کھڑا رہا۔ بلی چند فٹ کے فاصلے پر آرام سے دودھ

ڈبل روٹی کے ٹکڑے کھاتی رہی۔ پلیٹ کو صاف کر کے وہ اپنی زبان سے منہ دھو کر خاموشی سے درخت پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئی۔

ارشد شام کو اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ دروازے کے باہر میاؤں میاؤں کی آواز آئی۔ یہ آواز پہلے سے ذرا اونچی تھی۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو: ''ارشد میاں، ارشد میاں! سن رہے ہو...... میرے لیے بھی کچھ کھانے کو ہے؟''

ارشد نے امی سے پوچھ کر ایک کیک کا ٹکڑا بلی کو دے دیا۔ بلی نے جھپٹ کر ٹکڑا اٹھایا اور چلی گئی۔ ارشد چائے پی کر اپنے کمرے میں آ کر سکول کا کام کرنے لگا۔

رات کے کھانے پر بلی پھر آ دھمکی اور میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ اس بار اس کی آواز میں کچھ تیزی زیادہ تھی، جیسے وہ کہہ رہی ہو: ''ارشد میاں! کیوں بھئی! اکیلے ہی اکیلے۔ ارے میں بھی تو ہوں، میں بھی تو ہوں۔''

ارشد نے سالن میں سے کچھ بوٹیاں نکال کر روٹی کے ٹکڑوں کے ساتھ بلی کے آگے رکھ دیں۔ مگر اب ارشد کچھ پریشان سا تھا۔ وہ سوچنے لگا، یہ کیسی بھوکی بلی ہے کہ کسی طرح اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔

رات کو اس نے یہ قصہ امی کو سنایا۔ امی نے کہا:

''ایسی کوئی بات نہیں بیٹا! یہ بلی غالباً کئی دن سے بھوکی ہوگی۔ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی انسان ہو یا جانور، اگر کئی دن کا وہ بھوکا ہو تو پیٹ میں گنجائش سے کہیں زیادہ کھا لیتا ہے، مگر رفتہ رفتہ اپنی نارمل خوراک پر آ جاتا ہے۔ آج تم نے اس بلی کو اچھی طرح کھلا دیا ہے۔ کل سے وہ اتنا کھانا ہرگز نہیں کھائے گی، اور دیکھو کل صبح جب بلی آئے تو اسے خوب پیٹ بھر کھلا دینا۔''

دوسرے دن صبح جب ارشد گھر والوں کے ساتھ ناشتہ کر رہا تھا تو باہر سے بلی کی آواز آئی۔ اس وقت اس کی آواز ایسی تھی، جیسے وہ کسی سے باقاعدہ مطالبہ کر رہی ہو:

''ارشد میاں! کہاں ہے میرا ناشتہ؟''

ارشد جلدی سے اٹھا۔ پلیٹ بھر کے دودھ کارن فلیک اور ایک بڑا سا توس مکھن لگا کر بلی کو باہر دے آیا۔ اس کا خیال تھا کہ دوپہر کے کھانے تک کے لیے ایک بلی کے لیے یہ اچھا خاصا ناشتہ ہے۔ بلی نے وہ سب کچھ منٹوں میں چٹ کرنے کے بعد مونچھوں پر تاؤ دیا اور احاطے کی دیوار کے ساتھ لگے سفیدے کے ایک درخت پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئی۔ ارشد تیار ہو کر سکول چلا گیا۔

ارشد کی امی تھوڑی دیر کے بعد باورچی خانے میں کام کر رہی تھیں تو انھیں باہر سے بلی کی میاؤں میاؤں کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے سوچا کہ ہو نہ ہو یہ وہی رات والی بلی ہے۔ ارشد بے چارے نے صبح جلدی میں اسے ناشتہ نہیں دیا ہوگا۔ چلو میں ہی اسے کھانے کے لیے کچھ دے دیتی ہوں۔ چنانچہ انھوں نے پلیٹ بھر کے دودھ اور ریفریجریٹر میں سے گوشت کی چند بوٹیاں نکال کر بلی کے آگے رکھ دیں۔ بلی سب کچھ صفا چٹ کرنے کے بعد مونچھوں پر زبان پھیرتی ہوئی درخت پر چڑھ کر دیوار کے دوسری طرف کود گئی۔

دوپہر کو سکول سے واپس آنے کے بعد ارشد کھانا کھا رہا تھا کہ باہر سے بلی کی میاؤں کی آواز آئی۔ ارشد کی امی نے کہا: ”ارشد بیٹا! میں نے صبح تمھاری بلی کو خوب پیٹ بھر کر ناشتہ کرا دیا تھا۔“ ارشد نے حیران ہو کر کہا: ”ارے امی! میں تو خود بلی کو ناشتہ دے کر گیا تھا۔“

”واہ بھئی! عجیب پیٹو بلی ہے!“ امی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا، اور اس دن کے بعد سے اس بلی کا نام پیٹو بلی پڑ گیا۔ اور وہ واقعی تھی بھی پیٹو۔ کچھ نہیں تو کم از کم دو بلیوں کا کھانا تو وہ ضرور کھا جاتی تھی۔

رفتہ رفتہ سب گھر والے اس پیٹو بلی سے مانوس ہو گئے۔

ارشد کی امی کا یہ خیال کہ رفتہ رفتہ پیٹو بلی کی خوراک میں کمی ہو جائے گی، صحیح نہ نکلا۔ وہ ایک مرتبہ کھانا کھا کر جاتی اور تھوڑی دیر کے بعد پھر آ جاتی۔ ایک دفعہ تو ارشد اسے کھانا ڈالتا اور دوسری دفعہ امی اسے کچھ نہ کچھ کھلا دیتیں۔ کبھی کبھی جب ارشد کی امی گھر کے کام کاج میں مصروف ہوتیں تو وہ اپنے نوکر شکور سے کہہ دیتیں تو وہ بہت چڑتا: ”اس پیٹو بلی کو اتنا کھانا کھلانے کی کیا ضرورت ہے بیگم صاحب! .... پھر یہ کوئی پالتو بلی تو ہے نہیں، یہ تو ہر جگہ سے کچھ نہ کچھ کھا سکتی ہے۔“

”یہ تو ٹھیک ہے مگر وہ تو بے چاری ہمارے ہاں آس لگا کر آتی ہے۔ دیکھو وہ کس انداز میں میاؤں میاؤں کرتی ہے جیسا سے یہ معلوم ہے کہ اس کا کھانا یہاں موجود ہے۔“ ارشد کی امی نوکر کو سمجھاتی۔

”یہ بھی خوب رہی۔ نہ گھر کی رکھوالی کرے، نہ چوہے پکڑے، نہ ارشد میاں کے ساتھ کھیلے اور خوب ڈٹ کر کھانا کھا جائے۔ اللہ کرے مجھے بھی کوئی ایسا اچھا گھر مل جائے، جہاں کوئی کام کاج نہ کرنا پڑے، بس تینوں وقت وہاں جاؤں اور خوب پیٹ بھر کر روٹی کھا آؤں۔“ نوکر کہتا۔

امی جان شکور کو سمجھاتیں:

”آدمی اور جانور میں فرق ہوتا ہے شکور! جانور تو جانور ہی ہے۔ کسی نے ترس کھا کر کھانے کے لیے کچھ

دے دیا تو کھا لے گا ورنہ گرا پڑا ہی کھائے گا۔ وہ بھی نہ ملا تو چوری کرے گا، مگر انسان کو تو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ مانگ کر کھانا یا چوری کر کے کھانا انسان کے لیے ہرگز مناسب نہیں ہے...... اب یہ بلی بے چاری محنت مزدوری تو نہیں کر سکتی نا...... پھر یہ کہاں سے کھائے؟ تم خود ہی بتاؤ!‘‘

’’اور کیا۔ بلی کسی کے ہاں خانساماں تو نہیں بن سکتی نا۔‘‘ ارشد نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’مگر بلی تمھارے ہاں کی رکھوالی تو کر سکتی ہے۔ سارا دن گھر میں رہ کر تمھارے ساتھ کھیل تو سکتی ہے۔‘‘ ان کے نوکر شکور نے کہا۔

’’وہ تو میں خود ہی نہیں چاہتا۔‘‘

ارشد کہتا۔ ’’بس میں تو یہ چاہتا ہوں کہ وہ آزاد رہے۔ میں تھوڑی دیر اس سے کھیلوں، اسے پیار کروں۔ پھر وہ اپنی راہ، میں اپنی راہ۔‘‘

کئی ہفتوں تک یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔ ایک دن ارشد کے گھر ایک بڑی دعوت تھی۔ دعوت میں ان کے رشتہ داروں کے علاوہ ارشد کے بہت سے دوست بھی شامل تھے۔ سب لوگ بے حد مصروف تھے۔ کھانا کھانے کا انتظام باہر لان میں کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں لان میں میزیں اور کرسیاں لگا دی گئیں تھیں۔ کھانا کھاتے کھاتے کافی رات ہو گئی۔ اس کے بعد گانے اور لطیفوں کی محفل جم گئی اور اسی شغل میں رات کافی دیر سے یہ محفل برخاست ہوئی۔ آہستہ آہستہ سب مہمان اپنے گھروں کو سدھارے۔ گھر والے بھی کافی تھک چکے تھے۔ کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے، سب اپنے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے۔

ارشد بھی کافی تھک گیا تھا، چنانچہ وہ بھی جلدی سے سو گیا تھا کہ اچانک وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دروازے پر کھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی تھی، یوں لگا جیسے کسی نے باہر کے دروازے پر ہاتھ مارا ہو۔

ارشد نے گھبرا کر پوچھا: ’’کون ہے؟‘‘

باہر سے ایک بہت باریک آواز آئی: ’’میاؤں!‘‘ جیسے بلی نے کہا ہو: ’’میں ہوں!‘‘

اور پھر بہت دیر تک ہلکی ہلکی میاؤں میاؤں کی آواز آتی رہی۔ جیسے پیٹو بلی اس سے روٹھی ہوئی ہو اور شکایت بھرے لہجے میں کہہ رہی ہو:

’’تم مجھے بھول گئے نا۔ خوب مزے مزے کے اچھے اچھے لذیذ کھانے کھا کر اور لطیفے سن کر سو گئے، لیکن تمھیں یہ خیال تک نہ آیا کہ پیٹو بے چاری بھوکی ہو گی۔‘‘

اس شکایت بھرے لہجے میں میاؤں میاؤں سن کر ارشد کو اٹھنا پڑا۔ جب وہ باورچی خانے میں پہنچا تو بلی کی آواز اس طرف سنائی دی۔ ارشد نے سوچا، کیسی ہوشیار بلی ہے۔ میرے اٹھنے کا اسے پتہ چل گیا اور یہ بھی اندازہ ہوگیا کہ اب میں باورچی خانے میں پہنچ گیا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ ریفریجر میں کھانے پینے کی کافی چیزیں موجود تھیں۔ ارشد نے سوچا، چلو پیٹو بلی کے لیے بھی ضیافت کا انتظام کر دوں۔ چنانچہ اس نے ایک بڑی سی پلیٹ میں مرغی کی ٹانگ، پلاؤ زردہ اور چند کباب بھی رکھ دیے۔ ایک طرف کھیرا اور میٹھے ٹکڑے بھی رکھ دیے اور پلیٹ باورچی خانے کے باہر رکھ دی۔

جب وہ باورچی خانے کا دروازہ بند کرنے لگا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے بلی کہہ رہی ہو: ''شکریہ ارشد میاں شکریہ! آپ کا بہت بہت شکریہ! ہمیں اس وقت بہت سخت بھوک لگی تھی۔''

مگر یہ کیا۔ یہ تو ایک بلی کی آواز نہیں ہوسکتی۔ وہ اتنی تیزی سے کیسے بول سکتی ہے۔ ابھی تک تو وہ سارا کام برآمدے سے آنے والی روشنی میں کر رہا تھا۔ اب اس نے جلدی سے باہر کا بلب جلایا اور دیکھا کہ وہ ایک نہیں دو بلیاں تھیں۔ بالکل ایک جیسی، دونوں چتکبری تھیں اور ان دونوں کے رنگ یا نقش و نگار میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ارشد کو بے حد ہنسی آئی۔ جسے وہ سب پیٹو بلی سمجھ رہے تھے وہ ایک بلی نہیں تھی، دو بلیاں تھیں اور کتنی چالاک تھیں کہ باری باری کھانا کھانے آتی تھیں۔ ان دونوں نے ہم سب کو خوب بے وقوف بنایا۔

صبح جب وہ اپنی امی ابو کو یہ راز کی بات بتائے گا تو وہ بھی بڑے حیران ہوں گے اور ضرور ہنسیں گے۔

☆☆☆☆

پروفیسر رئیس فاطمہ

سرمد کی کہانی

بہت دنوں کا ذکر ہے کہ ہندوستان کے شہر فتح پور کی نزدیکی بستی میں ایک درزی رہتا تھا، جس کے دو بچے تھے، ایک بیٹی جو شادی شدہ تھی اور دوسرا بیٹا جس کی عمر یہی کوئی تیرہ چودہ سال تھی، درزی کی گزر اوقات بڑی مشکل سے ہوتی تھی، اس کا داماد بھی اس کی طرح غریب تھا اور وہ بھی درزی ہی تھا، درزی کے بیٹے کو جس کا نام ’سرمد‘ تھا، پڑھنے کا بڑا شوق تھا، وہ صبح مکتب جاتا تھا، اور شام کو پھولوں کے گجرے بیچتا تھا۔ ان کے گھر کے آنگن میں بیلا، موتیا، موگرہ اور ہار سنگھار کے پھول لگے تھے جن کی بھینی بھینی خوشبو سے پورا محلہ مہکتا رہتا تھا۔ سرمد کی ماں اور بہن آمنہ روزانہ پھول توڑ کر گجرے بناتیں، جنھیں سرمد جا کر بیچ دیتا تھا، کبھی تمام ہار اور گجرے بک جاتے اور کبھی کبھی اِکا دُکا ہی بک پاتے، رات کو چراغ کی روشنی میں بیٹھ کر سرمد اپنے مکتب کا کام کرتا، لیکن جب چراغ میں تیل کم ہوتا تو وہ کریم بابا کی پرچون کی دکان پہ جا کر پڑھتا، کریم بابا سرمد کا بہت خیال رکھتے تھے، وہ جب پڑھنے کے لیے آتا تو وہ چراغ کی لو بڑھا دیتے تا کہ سرمد تیز روشنی میں پڑھ سکے، سرمد کے ابا خود تو درزی تھے لیکن چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے۔ وہ جانتے تھے کہ علم کے بغیر انسان کا وجود بے کار ہے، علم انسان کو عزت و توقیر عطا کرتا ہے، لیکن سرمد ہمیشہ اداس اور خاموش رہتا تھا، وہ یہ دیکھ کر بہت کڑھتا تھا کہ اس کے برابر کے کچھ بچے بہت خوش حال تھے، وہ ہمیشہ اچھے کپڑوں میں مکتب آتے، ان کے ناشتہ دان میں پراٹھے، اور کباب ہوتے، ان کے برعکس سرمد ہمیشہ رات کی بچی ہوئی روٹی اور سالن یا دال لے کر مکتب آتا، اس کے پاس صرف دو جوڑے تھے، حالاں کہ اس کے ابا درزی تھے لیکن وہ کسی کے سلائی کے کپڑوں میں سے کپڑا چرانا گناہ سمجھتے تھے۔

ایک دن اس کی ماں نے بہت سے ہار اور گجرے بنائے یہ جمعرات کا دن تھا، سرمد کے بہنوئی نے اس سے کہا کہ اگر وہ بستی سے تھوڑا آگے جا کر بڑے پیر کی درگاہ پہ جا کر پھول بیچے تو ممکن ہے زیادہ آمدنی ہو، چنانچہ اس کی ماں نے ایک پوٹلی میں چار روٹیاں اور آلو کی بھجیا رکھ کر اسے دے دی تا کہ دیر ہو جائے تو وہ کھا لے، ساتھ ہی تاکید کی کہ وہ پہلے درگاہ پہ جا کے فاتحہ پڑھے، بعد میں پھول بیچے۔ سرمد یہ سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ کیا وہ ساری عمر پھول ہی بیچتا رہے گا، کیا وہ اعلیٰ تعلیم کبھی حاصل نہیں کر سکے گا، اچانک ایک بوڑھا شخص سامنے سے آتا دکھائی دیا، سرمد نے اسے سلام کیا، بوڑھے شخص نے پوچھا کہ وہ تو اسے جانتا بھی نہیں پھر اس نے سلام کیوں کیا، اس پر سرمد نے جواب دیا کہ اس کی اماں

کہتی ہیں کہ راستے میں یا کہیں بھی کوئی بزرگ ملیں تو ادب سے سلام ضرور کرو، یہ سن کر بوڑھے نے کہا:

’’کیا تم مجھے کچھ کھانے کے دے سکتے ہو کیوں کہ میں صبح سے بھوکا ہوں‘‘؟

سرمد نے فوراً روٹیوں کی پوٹلی کھول کر دو روٹیاں اور تھوڑی سے بھجیا اس کے حوالے کی۔ بوڑھا شخص اسے دعائیں دیتا ہوا چلا گیا، ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ اس نے دیکھا کہ ایک کتا سڑک کے کنارے نڈھال پڑا ہے جیسے ہی اس نے سرمد کو دیکھا اس کے قدموں میں لوٹنے لگا اور روٹی کی پوٹلی کو سونگھنے لگا، سرمد سمجھ گیا کہ کتا بھوکا ہے۔ اس نے بقیہ دو روٹیاں کتے کے آگے رکھ دیں اور خود ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا کہ میں گھر واپس جا کر کھا لوں گا۔ کیا پتہ یہ روٹیاں اس بوڑھے اور کتے کے نصیب کی ہوں، روٹیاں کھا کر کتاب سرمد کے پاؤں میں لوٹنے لگا اور جب وہ درگاہ کے لیے روانہ ہوا تو کتا بھی پیچھے پیچھے ہو گیا۔ چلتے چلتے مغرب ہو گئی تھی سرمد نے پہلے وضو کیا پھر چپلیں اتار کر درگاہ میں گیا وہاں فاتحہ پڑھی۔ دعا مانگی اور باہر آ کر پھول بیچنے لگا۔ اس کے تمام پھول ایک گھنٹے میں ختم ہو گئے کیوں کہ اس کے پھول تازہ بھی تھے اور سستے بھی، پھول بیچنے کے بعد وہ ایک طرف تھک کر بیٹھ گیا۔ اب اسے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ لیکن کھانے کو کچھ نہ تھا۔ درگاہ کے اندر ہی ایک شخص زردہ بریانی کا لنگر بانٹ رہا تھا شاید اس کی کوئی مراد پوری ہوئی تھی۔ کھانے کی خوشبو سے سرمد کی بھوک جاگ اٹھی تھی لیکن اس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ مانگ کر کھائے۔ اچانک دیگ کے پاس کھڑے شخص نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور ایک پلیٹ میں کھانا نکال کر اسے کھانے کو دیا۔ سرمد کو اتنی شدید بھوک لگ رہی تھی کہ وہ انکار نہ کر سکا اور ایک طرف بیٹھ کر کھانا ختم کیا اور شکریے کے ساتھ پلیٹ واپس کر کے جانے لگا تو اس نے شخص نے اسے زردہ بریانی کی دو پوٹلیاں دیں اور بتایا کہ اس کے گھر بڑی منتوں مرادوں کے بعد پوتا ہوا ہے اس لیے سب کو کھانا دیا جا رہا ہے تا کہ وہ اپنے گھر والوں کو بھی کھلا سکیں۔ سرمد خوش خوش دونوں تھیلیاں لے کر گھر روانہ ہوا۔ وہ بہت خوش تھا کہ نہ صرف سارے پھول بک گئے تھے بلکہ مزیدار کھانا بھی ملا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کے استاد کہتے تھے کہ:

’’نیکی کرو کیوں کہ نیکی کبھی رائگاں نہیں جاتی، ہمارے پیارے نبی ﷺ نے بھی ہمیشہ نیکی کرنے اور اخلاق سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔‘‘

وہ اپنی سوچوں میں مگن خوش خوش چلا جا رہا تھا کہ اچانک گلی کے نکڑ پہ ایک بوڑھی عورت روتی نظر آئی، سرمد دوڑ کر، اس کے پاس پہنچا اور رونے کا سبب دریافت کیا تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا کہ:

’’وہ بیوہ عورت ہے دو دن سے اس کے گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں۔ اس کی بیٹی اور اس کے چھوٹے بچے بھوک سے رو رہے ہیں اور کوئی بھی اس کی مدد کرنے کو تیار نہیں، سرمد کو خیال آیا کہ اس کے پاس مزیدار کھانا ہے لیکن وہ تو اپنے گھر والوں کے لیے لے کر جا رہا ہے، جنہوں نے برسوں سے ایسا لذیذ کھانا نہیں کھایا۔۔۔ لیکن دوسرے

ہی لمحے اس نے سوچا کہ گھر والے تو کھانا کھا چکے ہوں گے اور یہ بڑھیا اور اس کے بچے دو دن سے فاقے سے ہیں۔۔۔ بس یہ سوچ کر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس نے دونوں پوٹلیاں بوڑھی عورت کے حوالے یہ کہہ کر کر دیں کہ ''اماں اس وقت میرے پاس بس یہی ہے۔''

بوڑھی عورت سرمد کو دعائیں دیتی تھیلیاں لے کر گھر کی جانب چلی گئی گھر پہنچ کر جب اس نے اپنی اماں اور گھر والوں کو سارا واقعہ بتایا تو اس کے ابا نے کہا:

''بیٹا دانے دانے پہ کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔۔۔ وہ رزق ہمارے لیے تھا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں صرف وسیلہ بنایا تھا، بوڑھی عورت کی مدد کے لیے۔''

دوسرے دن مکتب سے آ کر سرمد نے کچھ دیر پڑھا پھر آرام کیا، گرمیوں کے دن تھے شام کو نہا دھو کر وہ پھولوں کی ٹوکری لے کر دوبارہ درگاہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کی اماں نے کہا تھا کہ اب صرف درگاہ پہ ہی پھول بیچا کرو وہاں برکت ہوتی ہے اور پھول جلدی بک جاتے ہیں۔ پہلے دن کی طرح آج بھی سرمد کے پاس چار روٹیاں اور چنے کی دال تھی۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا جا رہا تھا تا کہ بڑے پیر کی درگاہ پر جلدی پہنچے۔ اسے وہاں کا پاکیزہ ماحول بہت اچھا لگا تھا کہ اچانک وہی بوڑھا دوبارہ نظر آیا جس کو سرمد نے سلام کیا تھا اسے دیکھتے ہی سرمد نے ادب سے سلام کیا، سلام کا جواب دے کر بوڑھے نے پوچھا۔

''کیا آج بھی کھانا کھلاؤ گے؟''

اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے، پوٹلی میں سے دو روٹیاں اور آدھی دال نکال کر بوڑھے کو دے دی، بوڑھے نے اسے ڈھیر ساری دعائیں دیں اور ایک طرف بیٹھ کر کھانا کھانے لگا، سرمد بقیہ روٹیاں لے کر آگے بڑھ گیا، لیکن چند قدم چل کر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہی کتا زبان نکالے اسے دیکھ رہا تھا، جسے ایک دن پہلے اس نے روٹیاں کھلائی تھیں۔ سرمد کو ایسا لگا جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہا تھا اس نے غیر ارادی طور پر بقیہ روٹیاں اور دال کتے کے آگے رکھ دیں اور مسکراتا ہوا درگاہ کی جانب چل دیا۔

پھول بیچے اور فاتحہ پڑھنے کے بعد جب وہ اپنے گھر کی جانب روانہ ہوا تو شام ہو چکی تھی اور بھوک بھی لگ رہی تھی لیکن آج کوئی لنگر یا نیاز بھی نہیں بٹ رہی تھی اس نے درگاہ کے مٹکے سے پانی پیا اور اللہ کا شکر ادا کیا اور سوچنے لگا کہ ان چار روٹیوں پر، جن کا نام اللہ میاں نے لکھا تھا وہ انھیں مل گئیں۔ اب میرے نام کی روٹی گھر پہ ملے گی، ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک عورت نے بھنے ہوئے چنوں اور الائچی دانوں کی مٹھی بھر کے اسے دی، سرمد نے اپنی پھولوں کی خالی ٹوکری میں دونوں چیزیں لے لیں اور انھیں کھاتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہوا۔ جب گھر قریب آیا تو اس نے دیکھا کہ پیپل کے درخت کے نیچے وہی بوڑھا بیٹھا تھا، جسے اس نے دو روٹیاں دی تھیں سرمد نے اسے پھر سلام کیا، دعا دیتے

کے بعد اس بوڑھے نے اسے اپنے پاس بٹھالیا اور پوچھنے لگا کہ اس نے دونوں دن اپنی روٹیاں اسے کیوں دیں؟ اس پر سرمد نے ادب سے جواب دیا:

’’اس لیے کہ آپ بھوکے تھے‘‘

’’لیکن بقیہ دو روٹیاں بھی تم نے دونوں دن کتے کو کھلا دیں اور تمھارے پاس کھانے کو کچھ بھی نہ رہا کیوں؟‘‘

بوڑھے نے سوال کیا:

’’وہ اس لیے کہ کتا بے زبان ہے اس لیے‘‘

سرمد نے معصومیت سے جواب دیا:

’’تو کیا تمھیں بے زبان جانور کو روٹی کھلا کر خوشی ہوئی‘‘

بوڑھے نے دوبارہ سوال کیا:

’’جی ہاں بہت ---بہت خوشی ہوئی‘‘ اس نے کہا

’’لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا آپ تو وہاں تھے ہی نہیں‘‘

سرمد نے حیران ہو کر بوڑھے سے پوچھا:

’’اس لیے کہ میں ہی وہ بھوکا کتا ہوں‘ بوڑھے نے ہنس کر کہا۔

یہ سنتے ہی سرمد ڈر کر اچانک اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا ۔!!

’’ڈرو نہیں میرے بچے میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا‘‘

بوڑھے نے دوبارہ اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

’’آپ کون ہیں؟‘‘ ---سرمد نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

’’میں ایک جن ہوں‘‘ ---بوڑھے نے کہا۔

سرمد دوبارہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ اسے ڈر لگ رہا تھا۔ بوڑھے نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور پیار سے اپنے پاس بٹھا کر بولا ۔

’’مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے اس لیے ڈر رہے ہو کہ عام طور پر یہی مشہور ہے کہ جنات انسانوں کو تنگ کرتے ہیں، ان کے گھروں پہ قبضہ کر لیتے ہیں، عورتوں کو اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں، وغیرہ وغیرہ لیکن میں ان جنات میں سے نہیں ہوں ۔‘‘

’’تو پھر آپ کیسے جن ہیں، کیا اچھے والے‘‘؟ سرمد نے پوچھا ۔

’’ہاں میں اچھا والا جن ہوں اور اس قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں جو حضور اکرم ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لائے

تھے، جنہوں نے حضورﷺ سے قرآنی آیتیں سنیں تھیں اور جنہوں نے حضرت سلیمان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیشہ اچھے اور نیک لوگوں کے کام آئیں گے‘ بوڑھے نے بتایا؛

‘‘آپ کا نام کیا ہے‘ سرمد نے آرام سے پوچھا، اب اس کا ڈر کم ہوگیا تھا۔

‘‘بس تم مجھے جن دادا کہا کرو‘ بوڑھے نے ہنس کر کہا؛

‘‘آپ میرے گھر چلیے، میری اماں اور ابا آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

‘‘نہیں میرے نیک بچے ابھی نہیں ۔ ۔ ۔ پہلے مجھے تم یہ بتاؤ کہ اگر تمھیں بہت سی دولت مل جائے تو تم کیا کرو گے‘ بوڑھے جن نے کہا۔

سرمد سوچ میں ڈوب گیا اور پھر مایوسی سے بولا؛

‘‘مگر جن دادا مجھے دولت کہاں سے ملے گی؟ ہم تو بہت غریب ہیں’’۔

‘‘مل سکتی ہے ۔ ۔ ۔ میں تمھیں دوں گا ۔ ۔ ۔ لیکن پہلے سوچ کر بتاؤ کہ اس کا کیا کرو گے‘ بوڑھے نے پوچھا۔

تب وہ دوبارہ سوچ میں ڈوب گیا اور پھر بولا:

‘‘سب سے پہلے میں اپنا گھر بنواؤں گا ۔ اماں، ابا، آپا اور ان کے میاں کے لیے اچھے اچھے کپڑے، پھر میں ابا سے کہوں گا کہ وہ لوگوں کے کپڑے سینا چھوڑ دیں کیوں کہ اسی وجہ سے امیر بچے مجھ سے نہیں کھیلتے ۔ ۔ ۔ سرمد نے کہا؛

‘‘اور اس کے علاوہ کیا کرو گے؟‘ بوڑھے نے سوال کیا؛

‘‘میں ابا سے کہوں گا کہ وہ غریب بچوں کے لیے ایک بڑا سا مدرسہ بنوائیں جہاں غریب بچے پڑھ سکیں، اور ان کو قلم، دوات، تختی اور کتابیں مفت ملیں، اور ان کو دوپہر کا کھانا بھی مدرسے میں ملے۔’’

سرمد نے جوش سے کہا:

‘‘ٹھیک ہے ۔ ۔ ۔ تم اب گھر جاؤ ۔ ۔ ۔ اور رات کو جب تمھارے ابا نماز پڑھ چکیں تو اسی جگہ لا کر انھیں میرے بارے میں بتانا ۔ ۔ ۔ وہ تمھاری بات کا اگر یقین نہ کریں تو یہ اشرفی جیب سے نکال کر دکھا دینا۔’’

یہ کہہ کر بوڑھے شخص نے ایک اشرفی اسے دی اور ساتھ ہی ہوا میں ہاتھ پھیلائے کے کچھ تھیلیاں پکڑ لیں۔

‘‘یہ لو، کل تم نے مجھے کھانا کھلایا تھا، آج میں تمھارے گھر والوں کے لیے کھانا بھجوا رہا ہوں، یہ کھانا لے جاؤ لیکن گھر میں یہی بتانا کہ درگاہ کا لنگر ہے ۔ البتہ ابا کو رات میں بتا دینا اور کل مغرب کی نماز کے بعد ان کے ساتھ اسی جگہ مجھ سے آ کر ملنا۔’’

سرمد نے بوڑھے کے ہاتھ سے تھیلیاں لیں تو ان میں پلاؤ، زردہ اور مٹھائی تھی، بوڑھا غائب ہو چکا تھا، مزیدار کھانا لے کر جب وہ گھر میں داخل ہوا تو دسترخوان بچھ چکا تھا، اس نے جب کھانوں کی تھیلیاں اپنی ماں کو دیں تو انھوں

نے بیٹے کے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا:

”دیکھا تم نے، آج ہمارے نصیب میں یہ لذیذ کھانا لکھا تھا، ورنہ گھر میں تو آج صرف مولی کی بھجیا اور روٹی پکی تھی۔“

سب نے مزے لے لے کے کھانا کھایا، اتنا لذیذ کھانا، انھوں نے پہلے کبھی نہ کھایا، جو بچ گیا وہ انھوں نے صبح کے لیے رکھ دیا، جب سرمد کے ابا عشا کی نماز پڑھ چکے تو وہ انھیں باہر پیپل کے پیڑ کے نیچے لے آیا اور انھیں پوری حکایت سنا دی، اس کی بات سن کر، ابا مسکرائے اور کہنے لگے:

”لگتا ہے تم نے یا تو کوئی کہانی پڑھی ہے یا پھر خواب دیکھا ہے۔“

یہ سن کر سرمد نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چمکتی ہوئی اشرفی نکال کر ابا کے ہاتھ پہ رکھ دی۔

”یہ تو اشرفی ہے، تجھے کہاں سے ملی بیٹا“ ابا نے حیران ہو کر پوچھا۔

”یہ جن دادا نے دی ہے“ اس نے ہنس کر کہا۔

☆ ☆

رات بھر ابا کو نیند نہیں آئی، خوف اور ڈر کے ساتھ ساتھ ایک تجسس ہی تھا، جن دادا کو دیکھنے کا، خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور جب شام کو، وہ مغرب کی نماز پڑھ چکے تو وہ بیٹے کے ساتھ نکل پڑے، پیپل کے درخت کے نیچے ایک شخص سفید کپڑے پہنے بیٹھا تھا۔

”وہ جن دادا ہیں“ سرمد نے ابا کو بتایا۔

انھوں نے قریب جا کر سلام کیا تو بوڑھے شخص نے انھیں مسکرا کر اپنے پاس بٹھایا اور کہا:

”آپ کا بیٹا نہ صرف یہ کہ بہت رحمدل، نیک اور ذہین ہے بلکہ یہ بڑوں کا ادب بھی کرتا ہے، اسی لیے اس سے بہت خوش ہیں“

سرمد کے ابا کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے، ان کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور وہ چپ چاپ زمین کو دیکھے جا رہے تھے۔ جن دادا نے سرمد کے ابا کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے نرمی سے پوچھا:

”شیخ سلیم الدین، کیا تم خاندانی درزی ہو؟“

”جی نہیں ---میرے دادا اور والد مکتب میں بچوں کو پڑھاتے تھے۔“

سرمد کے ابا نے آہستہ سے کہا:

”پھر تم درزی کیسے بن گئے ---درزی ہونا کوئی بری بات نہیں ہے، لیکن جس کے باپ دادا بچوں کو تعلیم دیتے تھے، اس کا درزی بن جانا کچھ عجیب سی بات ہے۔“ ---جن دادا نے کہا:

‘‘دراصل میں بچپن ہی سے نکما تھا، اماں اور دادی کے لاڈ پیار نے مجھے کام چور بھی بنا دیا تھا، میرا پڑھائی میں بالکل دل نہیں لگتا تھا، بجائے مکتب جانے کے، میں اپنے ایک دوست کی دکان پہ بیٹھا رہتا تھا، جس کے والد کی درزی کی دکان تھی، ابا مجھے پڑھنے پہ مارتے، تو دادی انھیں برا بھلا کہتیں، بس مجھے پڑھنا بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔’’

اتنا کہہ کر وہ اپنی آنکھیں پونچھنے لگے۔

‘‘کیا ہوا ابا’’ سرمد نے پوچھا ‘‘آپ رو کیوں رہے ہیں۔’’

‘‘اس لیے بیٹا کہ اگر ابا کی بات مانتا، تو میں بھی یا تو کسی مدرسے میں پڑھا رہا ہوتا، یا کوئی ایسا کام کر رہا ہوتا، جس سے لوگوں میں عزت ہوتی۔۔۔ یہ بھی اسی درزی دوست کی مہربانی تھی کہ اس کی دکان پہ بیٹھ کے مجھے کپڑے کاٹنا اور سینا آ گئے ورنہ تو شاید کہیں بھیک مانگ رہا ہوتا۔’’

ابا نے افسردگی سے کہا:

‘‘تم نے سچ بولا اس سے ہم خوش ہوئے کہ تمھیں اس بات کا احساس ہے کہ تم نے مکتبہ نہ جا کر اور بڑوں کا کہنا نہ مان کر بہت بڑی غلطی کی ہے، اس لیے ہم تمھیں انعام دینا چاہتے ہیں، کیوں کہ سرمد بہت نیک لڑکا ہے اور تمھاری بیوی نے اس کی تربیت بڑے اچھے طریقے سے کی ہے۔’’

جن دادا نے کہا:

‘‘ہاں جن دادا آپ ٹھیک کہتے ہیں، شاید یہ میرے باپ دادا کی نیکیاں ہی تھیں، جو مجھے صالحہ خاتون جیسی بیوی ملی، جس نے بچوں کی تربیت پہ خاص توجہ دی، اگر میری ماں بھی مجھے پڑھنے لکھنے سے جی چرانے پہ سزا دیتی، ڈانٹتی ڈپٹتی تو آج میں درزی نہیں بلکہ لائق احترام استاد ہوتا۔’’

ابا کا ڈر، اب رفتہ رفتہ کم ہو رہا تھا۔

‘‘اچھا تم باپ بیٹے مجھے کوئی تین خواہشیں بتاؤ۔۔۔ بہت سوچ سمجھ کر بتانا کیوں کہ جو خواہش ایک بار تمھارے منہ سے نکل جائے گی اسے بدلا نہیں جا سکے گا۔’’ جن دادا نے کہا اور غائب ہو گئے۔

دونوں باپ بیٹوں نے اچھی طرح سوچا اور پھر جن دادا کو آواز دی:

‘‘تم لوگوں نے تو بڑی جلدی فیصلہ کر لیا۔۔۔ ایسا کیونکر ہوا، میرا تو خیال تھا کہ تم کم از کم ایک گھنٹہ تو ضرور لو گے۔’’ جن دادا نے ہنس کر کہا:

‘‘یہ اس لیے ممکن ہوا جن دادا کہ میں ہمیشہ یہ سوچا کرتا تھا کہ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں یہ سب کر سکتا، جو آج میں آپ کو بتانے والا ہوں۔’’ شیخ سلیم الدین نے جن دادا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

‘‘۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں، بولو میں سن رہا ہوں’’ جن دادا نے کہا۔

”---میری سب سے پہلی خواہش یہ ہے کہ---کہ میرا بیٹا سرمد ایک بہت بڑا عالم بنے، قانون اور طب میں اس کا کوئی ثانی نہ ہو، لوگ اس کی عزت کریں۔“

”میری دوسری خواہش ---یہ ہے ---کہ---میں ایک ایسا مکتب بنانا چاہتا ہوں، جس میں غریب بچے پڑھ سکیں، انھیں قلم دوات، تختی اور کتابیں مفت ملیں اور ساتھ ساتھ ناشتا اور دوپہر کا کھانا بھی ملے، ہر مہینا ایک کپڑوں کا جوڑا اور تمام ہندو، مسلمان اور سکھ، بچوں کو ان کے مذہبی تہواروں پہ کپڑے اور اناج کے علاوہ ان کے گھر والوں کے لیے کچھ رقم اور مٹھائی بھی“ سرمد کے ابا شیخ سلیم الدین نے کہا۔

”اور تمھاری تیسری اور آخری خواہش کیا ہے؟“ جن دادا نے پوچھا۔

”میری تیسری اور آخری خواہش یہ ہے کہ میرے تمام غریب دوست اور غریب رشتہ دار خوشحال ہو جائیں، ان کے بچے تعلیم حاصل کریں اور خوش رہیں۔“ شیخ سلیم الدین نے رقت آمیز لہجے میں کہا:

”لیکن تم نے اپنے یا اپنے خاندان کے لیے دولت کی خواہش نہیں کی---شاید تم بھول گئے کہ میں نے صرف تین خواہشیں پوری کرنے کے لیے کہا تھا۔“ جن دادا نے کہا:

”نہیں--جن دادا---ایسا نہیں ہے، ہم نے بہت سوچ سمجھ کر خواہشوں کا اظہار کیا ہے---اس چند روزہ زندگی میں دولت کی خواہش کرنا بے وقوفی ہے، میں چاہتا ہوں لوگ مرنے کے بعد بھی مجھے اور میرے خاندان کو عزت سے یاد کریں، محبت سے یاد کریں۔“ شیخ صاحب نے کہا:

”ہاں جن دادا---اماں ہمیشہ یہی کہتی ہیں کہ اللہ نے انسان کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ دوسروں کے کام آئے اور ان کی مدد کرے۔“

سرمد نے جن دادا سے کہا:

”تو کیا تمھارا دل نہیں چاہتا کہ تم اور تمھارے گھر والے امیر ہو جائیں اور اچھے اچھے کپڑے پہنیں۔“---جن دادا نے پوچھا۔

سرمد نے ایک لمحہ کو سوچا اور پھر ادب سے بولا۔

”جی ہاں جن دادا--میرا جی چاہتا ہے ہمارا بہت اچھا سا گھر ہو، اماں اور آپا کو گجرے نہ بنانے پڑیں ابا کو درزی کا کام نہ کرنا پڑے---اور میرے پاس بھی نئے نئے کپڑے اور جوتے ہوں۔۔اور بہت سی کتابیں ہوں کہانیوں کی۔“

”تو پھر تم نے اپنی خواہش کا اظہار کیوں نہیں کیا“---جن دادا نے پوچھا۔

”ابا نے منع کیا تھا“---سرمد نے مایوسی سے جواب دیا۔

”مگر تم نے ابا کی بات کیوں مانی؟--جب کہ دوست تو میں تمھارا ہوں---اور تم نے ہی میرے ساتھ نیکی کی

بھی تھی‘‘۔۔۔جن دادا نے پوچھا۔

’’میری کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے۔۔’’ماں باپ کا حکم مانو۔۔۔ان سے بحث مت کرو‘اور میرے استاد بھی یہی کہتے ہیں کہ ہمیشہ ماں باپ کی خوشیوں کا خیال رکھو،انھیں کوئی دکھ نہ پہنچاؤ۔‘‘سرمد نے جواب دیا۔

جن دادا نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا اور بولے:

’’شیخ سلیم الدین تمھارے گھر فرشتے نے جنم لیا ہے۔۔۔اس معصوم بچے نے تمھاری بات مان کر میرا دل جیت لیا ہے۔۔۔اب مجھے پکا یقین ہو گیا ہے کہ میں اچھے اور نیک لوگوں کی مدد کر رہا ہوں۔۔۔تمھاری تین خواہشوں کے ساتھ ہی تمھارے بیٹے کی خواہش بھی پوری ہو گی،یہ میری طرف سے تحفہ ہے۔‘‘

جن دادا کی بات سن کر سرمد کا چہرہ کھل اٹھا لیکن شیخ صاحب کے چہرے پہ تشویش کے آثار تھے انھوں نے جن دادا کی طرف دیکھ کر کہا:

’’جن دادا۔۔۔آپ نے کہا کہ میری تینوں خواہشیں پوری ہو جائیں گی۔۔اور ہم بھی خوشحال ہو جائیں گے۔۔۔لیکن لوگ کیا کہیں گے یہاں کا حاکم کیا کہیگا کہ ہمارے پاس پیسہ کہاں سے آیا۔۔۔پھر ہم کیا جواب دیں گے۔‘‘

’’تم اس کی بالکل فکر مت کرو،میں کل تمھارے گھر تمھارا چچا بن کر آؤں گا جو بیس سال پہلے ہندوستان چھوڑ کر مصر چلا گیا تھا وہاں بہت دولت کمائی لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی اس لیے وطن واپس آیا ہوں،اور تم ہی میرے سب سے قریبی عزیز ہو،تم لوگوں کو بتانا کہ میں نے ملکوں ملکوں پھر کر تجارت کی،چین بھی گیا اور بیت اللہ نے نوازا اب میری آخری عمر ہے،بیوی کا انتقال ہو چکا ہے،اس لیے تمام دولت اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہتا ہوں۔۔۔میرا نام تم شیخ امیر الدین بتانا۔۔۔اب میں چلتا ہوں،کل عصر کے بعد میرا انتظار کرنا۔۔۔لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ میرے بارے میں کسی کو کچھ بھی نہ بتانا‘‘۔۔۔جن دادا نے سمجھایا۔

☆☆

دوسرے دن سرمد کے تمام گھر والے شام کو صحن میں بیٹھے تھے،آج وہ پھول بیچنے درگاہ نہیں گیا تھا،کیوں کہ ابا نے روک لیا تھا کہ اچانک گھر کے دروازے پہ دستک ہوئی اور کسی نے سرمد کے ابا کا نام لے کر پکارا،انھوں نے لپک کے جا کے دروازہ کھولا تو مٹھو قصائی کے ساتھ کوئی بزرگ کھڑے تھے،نورانی چہرہ،سفید لباس اور لمبی سی داڑھی۔

’’شیخ جی۔۔۔یہ بڑے صاحب آپ کا پوچھ رہے تھے کہہ رہے تھے مصر سے آئے ہیں اور آپ کے چچا ہیں جو آپ کے والد سے ناراض ہو کر مصر چلے گئے تھے۔۔۔یہ بہت بڑے تاجر ہیں۔۔۔آپ نے تو کبھی کسی چچا کا ذکر نہیں کیا‘‘۔۔۔مٹھو قصائی جذباتی ہو رہا تھا۔

’’میاں صاحبزادے۔۔اس نے اس لیے ذکر نہیں کیا ہوگا کہ اس وقت یہ بہت چھوٹا تھا‘‘بڑے میاں نے

جلدی سے کہا۔

"ہاں ---بالکل ٹھیک کہا آپ نے کہ میں بہت چھوٹا تھا---لیکن ابا جان نے ذکر ضرور کیا تھا کہ ان کے ایک بھائی تھے، جو کسی بات پہ ناراض ہو کر، کہیں چلے گئے تھے" ---شیخ صاحب نے کہا اور بڑے میاں کو لے کر جلدی سے اندر آ گئے بڑے میاں نے اندر آ کر سب کو پیار کیا اور بہت سے تحائف دیئے اور پھر اپنی زندگی کی لمبی کہانی سنانے لگے۔ صرف سرمد اور اس کے ابا کو پتہ تھا کہ بڑے میاں اصل میں کون ہیں اور کیوں آئے ہیں۔

جن دادا جنھوں نے شیخ صاحب کے چچا کا روپ دھارا تھا، صبح صبح یہ کہہ کر گھر سے چلے جاتے کہ وہ جلد از جلد ایسا انتظامات کر لینا چاہتے ہیں، جو وہ سوچ کر آئے ہیں، شام کو مغرب کے بعد وہ گھر آتے اور کھانا کھا کر جلد سو جاتے، چند ہی دنوں میں انھوں نے قریب ہی زمین خریدی اور ایک بہت بڑے گھر کی تعمیر شروع ہو گی۔ مزدور دن رات کام کرتے، اس گھر میں پہلی منزل پہ مدرسہ تھا، جس میں غریب بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی دوسری منزل سرمد کے گھر والوں کی رہائش کے لیے تھی، جس مکان میں، اس وقت سرمد کے گھر والے رہتے تھے، اسے سرمد کی والدہ کی خواہش کے مطابق، بے سہارا عورتوں اور بچوں کے لیے رہائش گاہ بنانا چاہتا تھا، جہاں عورتوں بچوں کو دینی تعلیم دیں گی اور قرآن شریف پڑھائیں گی، سرمد کی دلی خواہش کے مطابق اسے قانون اور طب کی تعلیم حاصل کرنے بغداد جانا تھا۔ جہاں بڑے بڑے جید علما موجود تھے، تھوڑے ہی عرصہ میں سب کچھ ہو گیا۔ لوگ اب سرمد کے ابا کو احترام سے شیخ صاحب کہتے تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے، کیوں کہ یہ بات اب پوری بستی میں پھیل گئی تھی کہ شیخ صاحب کے امیر کبیر چچا بستی کے غریب بچوں اور بے سہارا عورتوں کے لیے کیا کچھ کرنے والے ہیں۔ مکان کی پہلی منزل تقریباً تیار ہو چکی تھی کہ ایک دن جن دادا نے خوشخبری سنائی کہ سرمد کو بغداد کے ایک بہت بڑے مکتب میں داخلہ مل گیا ہے اور اسے چند روز بعد ہی روانہ ہونا ہے یہ سن کر سب ہی اداس ہو گئے، لیکن سرمد کی ماں خوش تھی کہ اس کا بیٹا جو پڑھنے کا شوقین ہے، بہتر مستقبل کے لیے بغداد جا رہا ہے۔

☆ ☆

پانچ سال بعد سرمد طب اور قانون کی تعلیم حاصل کر کے فتح پور واپس پہنچا تو ہندوستان کے فرمانروا اور مغل اعظم جلال الدین محمد اکبر کا زمانہ تھا، ویسے تو سال میں ایک مرتبہ جن دادا اسے اپنے ماں باپ سے ملانے لے آتے تھے، لیکن اس بار وہ ایک عالم فاضل شخص بن کر آ رہا تھا۔ پوری بستی، اس کے استقبال کی تیاری کر رہی تھی۔ فتح پور کے حکمران تک بھی یہ خبر پہنچ چکی تھی۔ سرمد نے اپنی آمد کے بعد، سب سے پہلے بڑے پیر کی درگاہ پہ حاضری دی، جن کی برکت سے اسے جن دادا ملے تھے، بچوں کا اسکول بھی اچھا چل رہا تھا اور بے سہارا عورتوں اور بچوں کا ادارہ بھی، جس کا نام سرمد کے ابا نے، اپنی والدہ یعنی سرمد کی دادی کے نام پر رکھا تھا یعنی مدرسہ فضیلت بانو۔ اب سرمد کی ماں اس کے سر پہ سہرا دیکھنا

چاہتی تھی، بہت سے گھرانے سرمد کو اپنا داماد بنانا چاہتے تھے، جن میں رشتے دار پیش پیش تھے۔ لیکن سرمد ایک نیک دل اور پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اسی دوران میں جب سرمد اور اس کے ابا اور تمام گھر والے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی درگاہ پر فاتحہ پڑھنے گئے تو فتح پور کا حاکم بھی وہاں آیا ہوا تھا۔ سرمد نے بڑھ کر اسے تعظیم دی۔ حاکم کو یہ نوجوان بالکل الگ لگا۔ سچ ہے تعلیم انسان کو نکھار دیتی ہے اور جہالت برباد کر دیتی ہے۔ حکم شہر نے اسے اگلے دن اپنے دربار میں طلب کیا۔

اگلے دن سرمد حاکم کے دربار میں پہنچا تو حاکم اس کی قابلیت سے بہت متاثر ہوا۔ اسے اپنے دربار کے لیے ایک ایماندار اور قابل قاضی کی ضرورت تھی، جو بغیر کسی دباؤ کے صحیح فیصلے کر سکے۔ اس نے سرمد کو قاضی کے عہدے کی پیشکش کی اور ساتھ ہی اسے شعبہ طب کا نگران مقرر کر دیا۔ سرمد نے بخوشی دونوں عہدے قبول کر لیے اور دیانت داری سے اپنا کام شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی شہرت فتح پور سے نکل کر اکبر بادشاہ تک جا پہنچی، اس نے سرمد کو آگرے کا قاضی بھی مقرر کر دیا کیوں کہ طویل عرصہ سے آگرے کے قاضی کے بارے میں شکایات مل رہی تھیں، اب سرمد تین دن آگرے میں رہتا اور تین دن فتح پور میں۔

فتح پور کا حاکم سرمد کی ایمانداری اور محنت سے بہت خوش تھا، وہ نہایت خوش اخلاق بھی تھا اور منکسر المزاج بھی، لوگ اس کی قابلیت کے ساتھ ساتھ اس کی سادگی اور خوش مزاجی کی بنا پر اسے بہت پسند کرتے تھے۔ حاکم شہر کی ایک بیٹی تھی شاہ بانو جو بہت پڑھی لکھی تھی، لیکن اب تک کنواری تھی۔ ایک دن حاکم شہر نے سرمد سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اسے اپنا داماد بنانا چاہتا ہے۔ سرمد نے ادب سے جواب دیا کہ یہ فیصلہ اس کی ماں اور باپ کریں گے۔ یہ سن کر حاکم بہت خوش ہوا اور اس نے اپنی بیگم کے ہمراہ جا کر سرمد کے ماں باپ سے بات کی، انھیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس طرح ایک دن نیک ساعت دیکھ کر دونوں کا نکاح کر دیا گیا۔ شاہ بانو رخصت ہو کر سرمد کے والدین کے گھر میں آ گئی او رمختلف مقدموں اور مسئلوں کو نمٹانے میں اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ لیکن ساتھ ہی وہ سرمد کے والدین اور اس کی بہن اور بہنوئی کی بھی دل سے عزت کرتی تھی کیوں کہ وہ ایک نیک لڑکی تھی اور اس کے ماں باپ نے، اس کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ جو لوگ بزرگوں کی عزت کرتے ہیں، خدمت کرتے ہیں، وہی دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں۔ بزرگوں کی دعائیں بڑی سے بڑی بلا کو ٹال دیتی ہے وہی لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں، جو اپنے والدین کی عزت کرتے ہیں۔ ان کا خیال رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ بھی انھی کو پسند کرتا ہے جو بڑوں کا خیال رکھتے ہیں۔

لوگ سچ ہی کہتے ہیں کہ:

''باادب بانصیب، بے ادب بدنصیب۔'' سرمد نے اگر جن دادا کو بزرگ سمجھ کر سلام نہ کیا ہوتا ان سے ہمدردی نہ کی ہوتی اور اپنے ماں باپ کا کہنا نہ مانا ہوتا تو آج وہ اتنا بڑا آدمی کبھی نہ بنتا۔

زار ممتاز

چاند اور سورج

بہت عرصہ گزرا جب دُنیا بہت کم عمر تھی۔ ایک اُدھیڑ عمر کی عورت تھی۔ جس کے دو خوب صورت بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام سورج تھا۔ وہ بہت جراُت مند، پر اعتماد لیکن مغرور تھا۔ دوسرے کا نام چاند تھا۔ وہ شرمیلہ، غور و فکر کا عادی اور غالباً کسی حد تک خاموش طبیعت تھا۔

ان کی ماں دونوں سے محبت کرتی تھی اور ان کی خوبصورتی پر فخر کرتی تھی۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ اب وہ وقت تیزی سے آ رہا ہے، جب وہ اُن کی ضرورت پوری کرنے اور دیکھ بھال کے قابل نہیں رہے گی۔ درحقیقت پھر ان دونوں میں سے ایک کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اپنی ماں کا خیال رکھیں۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کس کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرے۔ وہ دونوں ہی سے محبت کرتی تھی۔ ان ہی دنوں میں نوجوان دُنیا کی جانب سے دونوں لڑکوں کو اس کی سالگرہ کی خوشی کی تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ آیا۔ اس تقریب میں بادل، بجلی، ہوا، بارش اور تاروں کے متعدد خاندان موجود ہوں گے۔ ماں چرخہ پر کام کرتی تھی۔ وہ خوش تھی کہ اسے سوچنے کا کچھ وقت مل جائے گا۔ اس نے سورج کو سنہرا لباس پہنایا اور چاند کو نقرئی اور انھیں تقریب میں بھیج دیا اور ہدایت کی کہ وہ اپنے طور طریقے بھولیں۔

یہ ایک بہت بڑی تقریب تھی۔ مخمل کے سبز رنگ کے لباس میں دُنیا بہت ہی خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ اس کی کمر اور ٹخنوں کے گرد اور بالوں میں پھولوں کے ہار لگے ہوئے تھے۔ چاندی کے طباقوں اور سونے کے پیالوں میں کھانے پینے کی ایسی چیزیں رکھی ہوئی تھیں، جن کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا۔ سورج نے یہ انتظار کیے بغیر کہ کوئی اور دوسرا کھانا کھانا شروع کرتا ہے یا نہیں، اپنی پلیٹ میں خوب بہت ساری چیزیں بھر لیں اور کھانا شروع کر دیں۔ اس کے برعکس چاند کو یہ ساری کھانے پینے کی چیزیں دیکھ کر فوراً اپنی ماں کا خیال آ گیا جو گھر میں اکیلی بیٹھی ہے اور تقریب کے مزے سے محروم ہے۔ جب کچھ مہمانوں کو کھانا پیش کر دیا گیا اس کے بعد اس نے اپنا سفید رومال نکالا اور ہر کیک اور مٹھائی میں سے تھوڑا تھوڑا سا ٹکڑا نکال کر اپنی ماں کے لیے رکھ لیا۔

جب دونوں لڑکے تقریب سے واپس آئے تو ان کی ماں نے دوڑ کر اُن کا استقبال کیا اور پوچھا کہ وہ

تقریب سے کتنے لطف اندوز ہوئے تھے۔ سورج نے کہا کہ اس نے وہاں بڑا اچھا وقت گزارا اور اتنا کھایا کہ اس کی طبیعت خراب سی ہو رہی ہے۔ چاند نے کہا کہ یہ ایک اچھی تقریب تھی اور دُنیا بہت ہی خوبصورت لگ رہی تھی۔ لیکن ماں مجھے تمھاری بہت یاد آئی۔ وہاں پر جو اچھی چیزیں کھلائی گئیں ان میں سے کچھ آپ کے لیے بچا کر لایا ہوں۔ ماں نے کہا کہ تم میرا اتنا خیال رکھتے ہو اور میں بڑھیا جب اور کمزور ہو جاؤں گی تو میں یقینی طور پر اپنی بقیہ زندگی تمھارے ساتھ گزاروں گی۔

یہ بات سن کر سورج اس قدر ناراض ہوا اور اس قدر حسد محسوس کیا کہ اس نے زمین پر زور سے اپنا پاؤں مارا اور غصے سے اس کا رنگ لال ہو گیا۔ اس کی ماں نے کہا مغرور اور خود غرض لڑکے تم مجھ سے دور چلے جاؤ۔ میری بددُعا ہے کہ تم ہمیشہ غصے اور حسد جلتے رہو تا کہ کوئی بھی اس ڈر سے تمھارے قریب نہ آئے کہ وہ جل کر کوئلہ ہو جائے گا اور اس خوف سے زیادہ دیر تک تمھاری طرف نہ دیکھے کہ وہ اندھا ہو جائے گا۔

اپنے پیارے بیٹے چاند سے اس نے کہا، میری دُعا ہے کہ تم ہمیشہ ٹھنڈے، خاموش اور پرسکون رہو، تا کہ تمھاری شعاعوں کے نیچے محبت ہمیشہ پھولے پھلے اور جو بھی تمھیں دیکھے وہ تمھاری تعریف کرے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ جب چاند کی طرف دیکھتے ہیں، آپ کو اس میں ایک چرخہ چلاتی ہوئی بوڑھی عورت نظر آتی ہے جو مسکرا رہی ہے اور خوشی سے گا رہی ہے۔

☆☆☆☆

ستار خان

ایک اندھیری رات

جب ہم چھوٹے تھے تو میں اور میرا بھائی جہانگیر اکثر اوقات روحوں اور بھوتوں جیسی چیزوں کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے۔ اس وقت اس کی عمر گیارہ سال تھی وہ آسیب زدہ گھروں اور مافوق الفطرت مخلوق جیسی تمام چیزوں پر یقین رکھتا تھا۔ میں اس سے دو سال بڑا تھا۔ وہ کٹر قسم کا شکی مزاج تھا میں اس کے بچگانہ خوف اور ذہنی شبیہوں کا مذاق اڑاتا تھا۔

ایک دن ہم نے اس معاملے کو ہمیشہ کے لیے طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم رات کو اندھیرے میں ایک گھنٹہ ایک قبرستان میں گذاریں گے جس کے بارے میں یہ عام خیال تھا کہ وہ آسیب زدہ ہے۔

اس دن شام کو ہم سات بجے چپ چاپ گھر سے نکل گئے۔ ہم اپنے ساتھ سنگتروں سے بھرا ہوا ایک تھیلا بھی لے گئے تاکہ اگر ہمیں بھوک لگے تو ہم وہ کھا سکیں۔ یہ سردیوں کی ایک ٹھنڈی رات تھی۔ جب ہم قبرستان کے قریب پہنچے تو جہانگیر نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا، مجھے وہاں سے بھاگنے کی غیر بہادرانہ خواہش کو دبانا پڑا۔

چھ منٹوں کے بعد ہمیں قبروں کے ڈھیر محسوس ہونے لگے اور ہم چاردیواری کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے قبرستان میں پہنچ گئے۔ میرا ہر قدم ایک ایک من کا محسوس ہو رہا تھا اور جہانگیر کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ اس کی آوز صاف سنائی دے رہی تھی۔

ہم نچلی دیوار پر جا کر بیٹھ گئے۔ ہمیں ڈر لگ رہا تھا اور سردی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن ہم وہاں بیٹھے رہے۔ ہمارا گھر جانے کو دل چاہ رہا تھا لیکن ہم وہاں بیٹھے رہے۔ میں نے اپنا ہاتھ جہانگیر کی کمر کے گرد رکھ دیا اور کہا کہ کیا خیال ہے کہ ایک سنگترہ کھایا جائے۔ اس نے ہلکی سی آواز میں کہا ضرور۔

اچانک ہم نے ایک چڑ چڑاہٹ کی آواز سنی۔ اندھیرا اتنا زیادہ تھا کہ کوئی چیز صاف نظر نہیں آتی تھی لیکن ایک پراسراری چیز ہماری جانب آ رہی تھی۔ جو آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی، اس نے چھینک ماری، چھینک سے میں نے بڑا اطمینان محسوس کیا۔ میں نے کہا: جہانگیر دیکھو یہ تو ایک آدمی ہے اپنی سائیکل کے ساتھ چل رہا ہے۔

اس کی سائیکل پر بھوسہ یا اور کوئی چیز لدی ہوئی ہے۔

ہم دونوں نے ہنسنا شروع کر دیا اور پھر آواز روکنے کی کوشش کی۔ اس آدمی نے ہماری آواز سن لی تھی اور رک گیا۔ اس نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی لیکن ہمیں نہیں دیکھا۔ جہانگیر نے سنگترے کا چھلکا اس کے اوپر پھینکا وہ حیران و ششدر رہ گیا۔ میں نے ایک سنگترہ پھینکا جو سائیکل پر ٹھک سے جا کر لگا۔ اس مرتبہ یہ شخص ڈر کے مارے بھاگ نکلا۔ اس کی سائیکل زمین پر گر گئی۔ اب ہم زور زور سے ہنس رہے تھے۔ ہمیں آواز آ رہی تھی کیوں کہ وہ تھوڑے سے فاصلے پر قبرستان کے چوکیدار کی جھونپڑی پر چلا چلا کر کہہ رہا تھا (شاہ جی بھوت، مجھے بچاؤ) تھوڑی دیر کے بعد بہت سے آدمیوں کی آوازیں آ رہی تھیں جو بھوت اور جنوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک شخص نے ٹارچ جلائی اور ادھر اُدھر اس کی روشنی ڈالی۔ اب بھاگنے کی ہماری باری تھی۔

ہم نے دو دیواریں پھلانگیں اور بالآخر اپنے گھر پہنچے۔ ہمارا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ جب ہم بستروں میں گھس گئے تو میں نے جہانگیر سے کہا کہ جہانگیر تم نے دیکھا وہاں پر ہمارے سوا اور کوئی بھوت نہیں تھے۔ ''ہوں'' اس نے نیند میں کہا اور بات وہاں ختم ہو گئی۔

اگلے دن صبح کو ہم نے ناشتہ کی میز پر قبرستان میں ایک رات قبل ہونے والا واقعے کے بارے میں سنا۔ خادمہ نے کہا کہ دس جنوں نے بچارے گلو کو پتھروں سے مارا اور اسے تقریباً ہلاک کر دیا۔ باورچی نے اس کہانی میں مزید پانچ بھوتوں کا اضافہ کر دیا۔ مالی نے کہا کہ شاہ جی گلو کو ان ابدی روحوں سے نجات دلائیں گے۔

میرے والد اتنے میں آ گئے انھوں نے کہا کہ تم لوگ اس قسم کی فضول باتوں پر کب تک یقین کرو گے۔ میں نے جہانگیر کی طرف دیکھا اور اس نے مجھے آنکھ ماری۔ ایک آدمی تھا۔ اس نے بالآخر اس قسم کی فضول باتوں سے نجات پالی ہے۔ میں نے آنکھ مار کر کہا اور ہم ہنس پڑے۔

☆☆☆☆

پروفیسر سجاد شیخ

نوشیروان عادل

نوشیروان ایک بے حد، دیانت دار اور انصاف کرنے والا بادشاہ تھا۔ اس کے عدل وانصاف کے قصے دنیا بھر میں مشہور رہیں۔ اسی لیے اسے نوشیروان عادل کہا جاتا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نوشیروان اپنے وزیروں اور مشیروں کے ساتھ شکار کے لیے گیا۔ جلد ہی بادشاہ اور اس کے ساتھیوں نے تین ہرن شکار کر لیے۔ اب دوپہر ڈھلنے والی تھی۔ سب کو بھوک ستا رہی تھی۔

نوشیروان نے شاہی باورچی کو حکم دیا کہ ہرنوں کو ذبح کر کے ان کا گوشت بُھون کر سب کو پیش کیا جائے۔ عین اس وقت شاہی باورچی کو معلوم ہوا کہ افراتفری میں صبح آتے وقت وہ نمک نہیں لایا۔ جب نوشیروان کو باورچی کی کوتاہی کا علم ہوا تو اس نے ایک ملازم کو حکم دیا کہ وہ قریبی گاؤں جا کر نمک لے آئے۔ نوشیروان نے ملازم کو تاکید کی کہ نمک دام دے کر خریدا جائے۔ ایک وزیر نے کہا:

"جناب ذرا سے نمک کی کیا حیثیت ہے کہ اسے بھی دام دے کر لیا جائے۔"

نوشیروان نے کہا:

"تم ٹھیک کہتے ہو کہ یہ ذرا سے نمک کی بات ہے۔ لیکن اگر حکام کو بغیر دام دیئے چیزیں لینے کی عادت پڑ گئی تو کیا ہوگا۔ ظلم پہلے ذرا سا ہوتا ہے مگر بار بار ظلم کیا جائے تو وہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ بادشاہ اور حاکم اگر اسی طرح ظلم کرتے جائیں تو ملک تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ رعایا ایسی ظالم حکومت سے تنگ آ کر بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی حکومت کا ملازم کسی باغ سے ایک سیب بغیر دام دیئے توڑ لے تو باقی ملازم پورا باغ اُجاڑ دیں گے۔ ذرا سوچو اس طرز عمل سے باغ کے مالک کا کیا حال ہوگا۔"

☆☆☆☆

سعدیہ نوشین جان

کالے بلے کی غلطی

گرین آئیز (نیلی آنکھیں) ایک بڑا کالا بلا تھا۔ جس کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں تھیں، وہ ٹپ ٹیپ نام کی جادوگرنی کے پاس رہتا تھا اور اس کے جادو کے کاموں میں اس کی مدد کرتا تھا۔ گرین آئیز آرام کی زندگی بسر کرتا تھا کیوں کہ ٹپ ٹیپ کی جھونپڑی میں اسے زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ جادوگرنی اسے خوب اچھا کھانا کھلاتی تھی، لیکن وہ بڑا ناشکر گزار تھا اور جو بھی چیز اسے دی جاتی، خاص طور پر کریم جو اسے بہت پسند تھی، وہ چاہتا کہ اسے اور ملے۔

ایک دن اس نے ٹپ ٹیپ سے شکایت کی لیکن اس نے اسے سختی سے جھڑک دیا اور اس سے کہا کہ وہ بڑا لالچی اور ناشکر گزار ہے۔ یہ سن کر گرین آئیز نے صرف اپنی مونچھوں کو حرکت دی اور کچھ نہیں کہا۔

ایک دن گرین آئیز کو ایک خیال سوجھا۔ جادوگرنی نے ایک چینی کے برتن سے جادو کا جگ بنایا اور اس سے کہا کہ وہ جادو کے پیالے کو ہلائے۔ جادوگرنی نے ایک جگ میں لیموں کا چھلکا اور بیج ڈالے اور اسے حکم دیا کہ وہ تیار کردہ (ترمنجاب) نکالے۔ جگ ایک طرف کو جھک گیا اور اس میں سے اتنا مزیدار (ترمنجاب) نکلا جو گرین آئیز اپنی نو زندگیوں میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس سہ پہر کو ٹپ ٹیپ چائے پینے کے لیے باہر گئی اور گرین آئیز کو ہدایت کر گئی کہ وہ گھر کا خیال رکھے اس کے جانے کے بعد گرین آئیز نے میز سے جگ اور دودھ کی پلیٹ اٹھائی اور کھانے پینے کے لیے اوپر غسل خانے میں چلا گیا۔ بے ایمان بلے نے جیسے ہی جگ سے کریم اگلوانا شروع کیا، دروازہ کی گھنٹی بجی۔ وہ جلدی سے نیچے گیا اور گھبراہٹ میں جگ کو بند کرنا بھول گیا۔ اگلے گھر میں رہنے والا جادوگر آیا تھا اور وہ جادوگرنی کے لیے ایک پیغام چھوڑنا چاہتا تھا۔

گرین آئیز اسے اس کمرے میں لے گیا جہاں سٹیشنری رکھی ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے اس گھر میں عرصہ سے کسی نے کوئی خط نہیں لکھا تھا اور جادوگر نے گرین آئیز کو نیا نب، روشنائی یا لفافہ لینے کے لیے بار بار بھیجا۔

جادوگر کے کان بہت تیز تھے، اس نے ٹپ ٹیپ کو اس کی بے چینی کی وجہ سے کئی مرتبہ جھاڑا لیکن اسے

اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ تیز مزاج جادوگر نے اسے دھمکی دی کہ وہ اس کی مونچھوں کو سانپوں میں بدل دے گا۔ گرین آئیز لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک گھنٹے کے بعد دیکھا کہ جوتوں کے ارد گرد کریم کے چھینٹے اڑ رہے ہیں، جادوگر اخبار پڑھ رہا تھا اس وقت باہر بارش ہو رہی تھی اور وہ جا نہیں سکتا تھا۔ ایک دم اس نے نیچے نظریں کیں اور اس نے دیکھا کہ اس کے جوتے کریم میں تیر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر جادوگر کو بہت کوفت ہوئی اس نے گرین آئیز سے کہا کہ وہ بتائے کہ اس نے یہ کیا کیا ہے، ورنہ وہ اس کو چڑا بنا دے گا۔

اسی دوران میں میں اشا ٹپ ٹیپ واپس آ گئی اور تمام بات سن کر اسے سخت غصہ آیا سزا کے طور پر گرین آئیز کو جادوگر کے جوتوں پر لگی ہوئی کریم چاٹ کر صاف کرنا پڑی بلکہ یہ بھی حکم دیا گیا کہ وہ ساری کریم جمع کرے اور اکٹھی ہو جانے کے بعد بھی ہر کھانے کے وقت اس کا چوتھا حصہ استعمال کیا کرے۔

بالآخر وہ بیمار ہو گیا اور جادوگرنی نے اس پر رحم کھاتے ہوئے اسے معاف کر دیا۔ جادوگرنی نے اس سے کہا کہ آئندہ کبھی بے ایمانی نہ کرنا۔ بہر حال جادوگر جب بھی ٹپ ٹیپ سے ملنے آتا تھا۔ بلے کو اتنا چڑاتا کہ اس کے آنسو نکل پڑتے۔ اوہو۔ گرین آئیز تم میرے ساتھ چائے پینے کے لیے کب آ رہے ہو؟ تمھاری ضیافت کے لیے میرے پاس کریم ہے۔ تم وہ کھانا پسند کرو گے! تمھیں کریم کیوں ناپسند ہے! خیر تم کتنے حیرت انگیز بلے ہو۔

☆☆☆☆

سعید لخت

چور کون

چھانگا مانگا کے جنگل میں ایک بوڑھا اُلو رہتا تھا، بہت عقل مند، نیک اور خدا ترس۔ جنگل کے کسی جانور پر کوئی بپتا پڑتی تو وہ دوڑا دوڑا میاں اُلو کے پاس آتا اور وہ چٹکی بجاتے ہی اس کی مشکل آسان کر دیتا۔ تمام جانور انھیں ادب سے گرو جی کہتے تھے۔ گرو جی روز شام کو دربار لگاتے اور جانور ان کے سامنے اپنا اپنا دکھڑا روتے۔ جس دن کوئی مصیبت کا مارا نہ آتا اس دن گرو جی جانوروں کو کوئی دلچسپ کہانی سناتے۔

شام ہوتے ہی تمام جانور میاں اُلو کے گھونسلے کے نیچے جمع ہو گئے اور ”گرو جی زندہ باد“ کے نعروں سے سارا جنگل سر پر اُٹھا لیا۔ تھوڑی دیر بعد گرو جی بڑی شان سے باہر نکلے، کھنکار کر گلا صاف کیا، دو چار جمائیاں لیں اور پھر مینا کو دیکھ کر حیرت سے بولے ”بی بی اس سے پہلے مَیں نے تمھیں یہاں کبھی نہیں دیکھا۔ تمھارا نام کیا ہے؟“

مینا بولی: ”منہنجو نالو شہلا چندرانی آھے، سائیں۔“

ہاتھی نے کہا ”اوئے! اے کیہڑی بولی بولدی اے؟“

گائے بولی: یہ سندھی زبان ہے“

اپنے دیس کی زبان۔ شہلا سندھ کی رہنے والی ہیں۔ کہتی ہیں میرا نام شہلا چندرانی ہے۔ گرو جی تعجب سے بولے ”بی گائے تمھیں سندھی زبان آتی ہے؟“

گائے نے کہا ”انھی سے سیکھی ہے اور مَیں انھیں پنجابی سکھا رہی ہوں۔“

گرو جی خوش ہو کر بولے ”جیتی رہو اور یاد رکھو! چمن میں طرح طرح کے پھول کھلتے ہیں۔ ہر پھول کی رنگت اور خوشبو الگ الگ ہوتی ہے مگر وہ سب پیار اور محبت سے رہتے ہیں۔ ہم سب بھی ایک ہی چمن کے پھول ہیں۔ رنگ اور بُو الگ الگ مگر گھر سب کا ایک۔ کیا سمجھے؟“

”سب سمجھ گئے“ لومڑی نے کہا ”اب آپ جلدی سے کوئی پھڑکتی ہوئی کہانی سنا دیجیے“۔

گرو جی نے کچھ سوچا اور پھر بولے ”ایک دن کا ذکر ہے دوپہر کا وقت تھا۔ مَیں بے خبر پڑا سو رہا تھا کہ

بی فاختہ نے آ کر جگا دیا۔ مَیں نے پوچھا’’ کہو بی فاختہ اس وقت کیسے آنا ہوا؟ خیر تو ہے؟‘‘

’’اجی گروجی‘‘ وہ چونچ ہلا کر بولی’’ آپ کے جنگل کے درخت ایک ایک کر کے غائب ہو رہے ہیں اور اگر یہی حالت تھوڑے دنوں میں رہی تو سارا جنگل صفا چٹ میدان بن جائے گا۔‘‘

’’یہ تو بڑے اچنبھے کی بات ہے‘‘ میں نے کہا’’ لیکن تمھاری رائے میں درختوں کے غائب ہونے کی وجہ کیا ہے؟‘‘ ’’مَیں آپ کو بتاتی ہوں‘‘ فاختہ ادھر اُدھر دیکھ کر بولی’’ یہ ساری شرارت اس کھٹ بڑھئی کی ہے جو ہمارے پڑوس میں رہتا ہے۔‘‘

مَیں نے ہنس کر کہا’’ تمھارا مطلب ہے کہ کھٹ بڑھئی درخت اٹھا کر لے جاتا ہے؟ بی فاختہ کیسی بہکی باتیں کرتی ہو۔‘‘

’’آپ یقین نہیں کرتے‘‘ فاختہ نے کہا’’ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ ساری کارستانی کھٹ بڑھئی ہی کی ہے۔ گروجی آپ کو پتا نہیں یہ کھٹ بڑھئی بڑی موذی قوم ہے۔ یہ درختوں کو کھوکھلا کر کے گرا دیتے ہیں اور پھر اٹھا کر کہیں دور پھینک آتے ہیں۔ ذرا خیال فرمایئے اگر انھیں کھلی چھٹی دے دی گئی تو جنگل میں ایک درخت بھی نہیں رہے گا۔ میری رائے میں آپ جنگل کے جانوروں کی ایک میٹنگ بلایئے اور کھٹ بڑھیوں کو الٹی میٹم دے دیجیے کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس جنگل سے چلے جائیں ورنہ ہم ان کا گھیراؤ کر لیں گے۔‘‘

مَیں نے زور کا قہقہہ لگایا اور بولا’’ بی فاختہ معلوم ہوتا تم بے چارے کھٹ بڑھئی سے کسی بات پر ناراض ہو گئی ہو۔ اری خدا کی بندی ذرا سوچ تو سہی۔ کھٹ بڑھئی جیسا ذرا سا پرندہ اتنے بڑے پیڑ کو کسی طرح گرا سکتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ وہ کیڑے مکوڑے کھانے کے لیے درختوں میں سوراخ کرتا ہے مگر یہ سوراخ اتنے ننھے ننھے ہوتے ہیں کہ اس سے درخت کا کچھ نہیں بگڑتا۔ گرنا تو بڑی بات ہے۔‘‘

فاختہ نے نفرت سے سر ہلایا اور بولی’’ آپ یقین نہیں کرتے نہ کیجیے۔ بتا دینا میرا کام تھا۔ مَیں اب جاتی ہوں۔‘‘

’’بات تو سنو‘‘ مَیں نے اُسے روکتے ہوئے کہا’’ کسی پر الزام لگانے سے پہلے خوب چھان بین کر لینی چاہیے۔ میرا خیال ہے یہ کام کسی آدمی کا ہے۔ ہو سکتا ہے سرکار کو لکڑی کی ضرورت ہو اور وہ درخت کٹوا رہی ہو۔‘‘

’’جی نہیں یہ کسی انسان کا کام نہیں‘‘ فاختہ نے کہا۔’’ اگر کوئی آدمی درخت کاٹتا تو جانور ضرور دیکھتے۔ لیکن

جانوروں نے کسی آدمی کو درخت کاٹتے ہوئے نہیں دیکھا۔‘‘

’’ارے بھئی یہ واقعہ تو الف لیلہ کی کہانیوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے‘ مَیں نے سر کھجاتے ہوئے کہا ’’اچھا میں کھٹ بڑھئی کے پاس جاتا ہوں۔ تم اپنے گھر جاؤ۔ کوئی نئی بات معلوم ہوئی تو تمھیں بتا دوں گا۔ یہ سن کر فاختہ چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد مَیں کھٹ بڑھئی کی تلاش میں روانہ ہوا۔ ادھر اُدھر گھومتے ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ شیشم کے ایک پیڑ سے کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ کھٹ بڑھئی بڑی تیزی سے درخت میں سوراخ کرنے میں مشغول تھا۔ میں پاس ہی ایک شاخ پر بیٹھ گیا اور مسکرا کر بولا ’’بڑے مصروف نظر آ رہے ہو میاں‘‘۔

وہ مجھے دیکھ کر چونکا اور پھر بولا ’’جی ہاں فرمایئے کیسے تشریف لائے؟‘‘

’’تمھاری ہی تلاش میں تھا بھائی‘ مَیں نے کہا شکر ہے کہ مل گئے۔ دراصل میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔‘‘

کھٹ بڑھئی میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولا ’’فرمایئے کیا بات ہے؟‘‘

مَیں نے اسے درختوں کے غائب ہونے کا قصہ سنایا اور بتایا کہ فاختہ کے خیال میں تم درخت غائب کر دیتے ہو۔

وہ بڑے زور سے ہنسا اور بولا ’’مجھ سا کمزور پرندہ درخت کو کس طرح گرا سکتا ہے گرو جی؟؟ اور پھر مَیں دن میں کرتا ہوں اور اگر میں درخت گراتا تو تمام جانور دیکھتے۔

’’سچ کہتے ہو بھائی‘‘ مَیں نے کہا ’’آج رات ہم دونوں جنگل کی چوکیداری کریں گے۔ روز کی طرح آج بھی درختوں کو غائب کرنے والا جادوگر ضرور آئے گا اور پھر ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ کس کی شرارت ہے۔‘‘

رات کو کھانا کھا کر مَیں کھٹ بڑھئی کے گھر گیا۔ وہ بالکل تیار بیٹھا تھا۔ ہم دونوں جنگل میں ادھر اُدھر گھومنے لگے۔ ایک گھنٹا، دو گھنٹے، تین گھنٹے یہاں تک کہ آدھی رات گزر گئی مگر کوئی شخص نظر نہ آیا۔ ہم مایوس ہو کر لوٹنے ہی والے تھے کہ اچانک ایک جگہ پتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی۔ ہم فوراً اڑتے ہوئے ادھر پہنچے۔ چار آدمی دھیرے دھیرے ایک درخت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سب سے آگے والے آدمی کے ہاتھ میں لالٹین تھی دوسرے کے ہاتھ میں آرا تھا، تیسرے کے ہاتھ میں موٹی سی رسّی تھی اور چوتھا کلہاڑا لیے ہوئے تھا۔

ایک درخت کے پاس پہنچ کر چاروں ٹھہر گئے۔ کلہاڑے والے شخص نے درخت کی جڑ میں چار پانچ ضربیں لگائیں اور پھر دو شخصوں نے مل کر آرا چلانا شروع کر دیا۔ جب تین چوتھائی سے زیادہ جڑ کٹ گئی تو انھوں نے ایک موٹی سی شاخ میں رسی پھنسا کر زور سے کھینچا۔ درخت دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ س کے بعد انھوں نے جلدی جلدی اس کی شاخیں کاٹ کر تنے کے تین چار ٹکڑے کیے اور اس کو لڑھکا کر جنگل کے باہر لے گئے جہاں ایک بیل گاڑی کھڑی تھی۔

”یہ چاروں سگے بھائی ہیں۔“ مَیں نے کھٹ بڑھئی کے کان میں کہا ”قصبے میں ان کی ٹال ہے۔“

”تو یہ کم بخت سرکاری لکڑی چرا کر فروخت کرتے ہیں؟“ کھٹ بڑھئی بولا ”مگر انھیں پکڑا کیسے جائے؟“

مَیں نے کہا ”ایک ترکیب ہے انھیں پکڑانے کی، ہم کسی طرح پولیس کو یہاں لے آئیں۔“

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے گرو جی؟“ کھٹ بڑھئی بولا ”ہم پولیس کو اپنا مطلب کیسے سمجھائیں گے؟“

”یہی تو مصیبت ہے“ مَیں نے کہا ”مَیں تھوڑی بہت اردو جانتا ہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مجھے انسانوں کی طرح بولتا دیکھ کر پولیس والے تھانہ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ خیر تم اب گھر جاؤ۔ کل شام تک ممکن ہے میرے دماغ میں کوئی ترکیب آ جائے۔“

خدا کی شان دوسرے دن شام ہونے سے پہلے پہلے میرے ذہن میں ایک نہایت ہی عمدہ تدبیر آ گئی۔ دوڑا دوڑا کھٹ بڑھئی کے گھر گیا اور اسے وہ تدبیر بتائی۔ مارے خوشی کے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اب ہم دونوں جانی کتے کی تلاش میں نکلے اور تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد اسے بھی ڈھونڈ نکالا۔

جب رات کے بارہ بج گئے اور مَیں نے دیکھا کہ چور جنگل میں داخل ہو گئے ہیں تو ہم تینوں قصبے کے تھانے پہنچے۔ تھانے کا دروازہ بند تھا اور ایک سپاہی دروازے کے پیچھے مونڈھے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ مَیں نے جانی سے کہا ”دیکھو! کھٹ بڑھئی دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ کھٹ کھٹ کی آواز سن کر سپاہی باہر آئے تو تم اس کی قمیص پکڑ کر کھینچنا۔ اس کے دل میں ضرور شبہ پیدا ہو گا اور وہ تمھارے پیچھے پیچھے ہو لے گا۔ مَیں تمھارے سر پر اُڑ رہا ہوں گا۔ جدھر میرا رُخ ہو تم سپاہی کو ادھر ہی لے چلنا۔ سمجھ گئے؟“

جانی نے دم ہلا کر ”ہاں“ کہا۔

مَیں نے کھٹ بڑھئی کو اشارہ کیا اور اس نے اپنی چونچ سے دروازے پر دستک دینی شروع کر دی۔ اونگھتا

ہوا سپاہی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور ڈانٹ کر بولا ’’کون ہے؟‘‘ لیکن جواب نہ پا کر پھر بیٹھ گیا۔ کھٹ بڑھئی نے دوبارہ دستک دی ’’کھٹ کھٹ‘‘

اب کے سپاہی جھلا کر اٹھا اور دروازہ کھول کر بولا۔

’’یہ کوئی وقت ہے رپٹ لکھوانے کا؟ چل، بھاگ یہاں سے۔ صبح کو آنا۔‘‘

جانی نے لپک کر اس کی پتلون دانتوں سے پکڑ لی اور کوں کوں کر کے کھینچنے لگا۔ سپاہی شور مچانے لگا۔ گڑبڑ سن کر دوسرے سپاہیوں کی بھی آنکھ کھل گئے اور وہ دوڑتے ہوئے آئے۔ ایک سپاہی کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔ اس نے جانی کی ٹانگوں پر زور سے ڈنڈا رسید کیا۔ غریب جانی مار کھا کر پیچھے ہٹا مگر پھر کوں کوں کر کے آگے بڑھا اور سپاہیوں کو اپنے پیچھے آنے کے لیے اشارے کرنے لگا۔ اتنے میں تھانے دار بھی آ گیا۔ وہ کچھ سمجھ دار تھا۔ اس نے جانی کو اُچھلتے کودتے اور اشارے کرتے دیکھا تو بولا ’’ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ آؤ چلو دیکھیں۔ کہاں لے چلتا ہے؟‘‘

سپاہی بندوق اور لاٹھیاں لے کر باہر آ گئے اور جانی کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ہم جنگل میں پہنچ گئے اور اس طرح پولیس نے چوروں کو عین موقع پر پکڑ لیا۔ تھانے دار کو کیا خبر کہ چوروں کو پکڑوانے والا ایک اُلو ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ جانی انھیں پکڑوا رہا ہے۔ وہ جانی کو تھانے لے گیا اور وہاں اس کی دودھ جلیبیوں سے خاطر کی۔

’’اور آپ کو کچھ بھی نہیں ملا گرو جی‘‘ گاے نے پوچھا۔ مجھے کیا ملتا‘‘ گرو جی نے کہا ’’دوسرے دن جانی ملا تو مَیں نے اس سے کہا’’ کیوں بھائی ترکیب ہم نے لڑائی اور دودھ جلیبیاں کھائیں تم نے۔‘‘

اس نے ہنس کر کہا ’’ڈنڈے بھی تو مَیں نے ہی کھائے تھے گرو جی۔‘‘ اچھا بھئی اب اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔ رات زیادہ ہو گئی ہے۔ کل مَیں تمھیں ایک اور قصہ سناؤں گا۔‘‘

☆☆☆☆

سعیدہ گزدر

مسکرانے والا درخت

میں جب بچی تھی تو اسکول جایا کرتی تھی، جس کے چاروں طرف بڑے بڑے درخت تھے۔ یہ درخت اتنے اُونچے اور گھنے تھے کہ باہر سے اسکول نظر نہیں آتا تھا۔ گرمیوں کے دنوں میں ہم ان درختوں کی گھنی چھاؤں میں ہر قسم کے کھیل کھیلتے تھے اور کھانا کھاتے تھے۔ سردیوں کے دنوں میں ہم اپنا خشک میوہ درختوں پر رہنے والے پرندوں اور گلہریوں کو بھی کھلایا کرتے تھے۔ نیم اور پیپل کے درخت اتنے آرام دہ تھے کہ کچھ استانیاں ہمیں ان کے نیچے بیٹھ کر سبق پڑھاتی تھیں۔

عذرا میری ہم جماعت تھی۔ وہ خاموش رہتی تھی اور مشکل سے کسی سے بات کرتی تھی۔ لیکن بعض اوقات اپنا رازدار بنا لیتی تھی۔ اسے درختوں، جھاڑیوں، پودوں اور پھولوں سے باتیں کرنے کی عجیب عادت تھی۔ میں نے ایک دن اُس سے پوچھا کہ وہ ان سے کیا باتیں کرتی ہے۔ وہ مجھ سے باتیں کرتے ہیں لیکن کس طرح اور کس بارے میں! انھیں تم پر اعتماد ہونا چاہیے۔ تمھیں ان سے محبت کرنی اور ہمدردی رکھنی چاہیے۔ ان کی شعور کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ ایک دم سمجھ جاتے ہیں کہ ان کا کون خیال رکھتا ہے۔

عذرا نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ یہ درخت کل مجھ سے ملنے آیا تھا۔

"یہ درخت" میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

ہم اسکول کے پیچھے ایک بڑے جامن کے درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ یہ بڑی خوب صورت جگہ تھی اور یہاں کوئی نہیں آتا تھا۔

ان دنوں جامن پھلوں کی دُکان پر فروخت نہیں ہوتے تھے۔ اس کی قدر و قیمت کوئی نہیں جانتا تھا۔ اِدھر سے گزرنے والے ان جامنوں کو اُٹھا لیتے، اور بچوں کو بہت سستے بیچ دیتے۔

میں تمھیں کل رات کے بارے میں صرف ایک شرط پر بتا سکتی ہوں کہ تم میرا راز کبھی نہیں کھولو گی۔

میں نہیں کھولوں گی۔

خدا سے وعدہ کرو۔

میں نے اپنا دایاں ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہاں میں وعدہ کرتی ہوں۔

پکا۔

پکا۔

ایک اور

میں نے بور ہوتے کہا: کیا ہے، مت بتاؤ۔

لیکن عذرا اپنے تجربے میں مجھے شامل کرنا چاہتی تھی۔

کافی رات ہو گئی تھی اور میں اپنی کتاب ختم کرنے والی تھی (عذرا کتابیں پڑھنے کی بڑی شوقین تھی) اور مجھے بڑی نیند آرہی تھی مجھا پنے کمرے میں کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ یہ درخت میرے سامنے کھڑا ہے اور مسکرا رہا ہے۔

درخت کس طرح مسکرا سکتا ہے؟ اس کا تو منہ ہی نہیں ہوتا۔ اور اتنے چھوٹے سے کمرے میں کس طرح آیا یہ تو تمھارے پورے گھر سے کم از کم پانچ گناہ بڑا ہے۔

عذرا نے بےتوجہی سے کہا، مجھے نہیں معلوم۔

لیکن یہ درخت ہر طرف، دائیں، بائیں، پیچھے، آگے اور وہ بڑا خوش نظر آرہا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا، میں نے اُوپر دیکھتے ہوئے کہا: کہ تم اپنے خوابوں میں کھوئی ہوئی ہو گئی۔

اس کی پتیاں سرسرا رہی تھیں اور شاخیں جھول رہی تھیں، وہ بڑا خوش نظر آتا تھا، وہ ہنس رہا تھا۔ اس پر مجھے جنرل سائنس کا وہ سبق یاد آ گیا کہ درخت اور پودے زندہ مخلوق ہوتے ہیں اور وہ بہت حساس ہوتے ہیں۔

اگر مالی بےتوجہی سے کام کرتا ہے تو درخت افسردہ اور بے جان ہو جاتے ہیں۔ اگر مالی ان کی طرف توجہ دیتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے تو درخت اور پھول اس کا جواب دیتے ہیں، ان پر رونق اور تازگی آجاتی ہے۔ ایک بیل ہوتی ہے جسے چھوئی موئی کہتے ہیں۔ اگر آپ اسے چھوئیں تو وہ بالکل سکڑ جاتی ہے۔ اگر درخت متجسس ہوں تو جھک جاتے ہیں، درخت بہت حساس ہوتے ہیں، وہ ہنستے ہیں۔

ہیلو۔ کیا یہ عذرا تھی جس نے درخت کی شکل اختیار کر لی تھی یا درخت نے عذرا کی شکل اختیار کر لی تھی۔

جب تم میری شاخ سے اپنی کمر لگا کر جھولتی ہو تو میں تم سے پیار کرتا ہوں میرا جی چاہتا ہے کہ میں تمھیں

اُٹھالوں اور پیار کرلوں۔ تم اتنے خوبصورت بچے ہو لیکن۔۔۔،

درخت بہت افسردہ نظر آتا تھا۔

لیکن کچھ بچے مجھ سے بُرا سلوک کرتے ہیں۔ وہ صرف چند جامنوں کے لیے مجھے پتھر مارتے ہیں لیکن میں انھیں اپنے پھلوں سے محروم نہیں کرتا۔ میری بات سنو۔ میں انھیں پھلوں سے محروم نہیں کرتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے انھیں پھل کھاتا دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اس طرح نہیں، تم اپنے دوستوں سے کہنا کہ مجھ پر پتھر نہ پھینکیں، بُرے طریقے سے میری شاخیں نہ توڑیں اور میرے تنے پر چاقو سے کھود کر کچھ نہ لکھیں۔ ان سب سے مجھے تکلیف پہنچتی ہے میں جگہ سے جگہ زخمی ہوں۔ جب مالی کاٹ چھانٹ کرتا ہے اور بڑھے ہوئے پتوں کو کاٹ کے مجھے ٹھیک بناتا ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اتنی احتیاط اور محبت سے کام کرتا ہے اور دوسری بات یہ کہ میں بھی چاہتا ہوں کہ میں خوبصورت اور ٹھیک ٹھاک نظر آؤں۔ جب میری تعریف کی جاتی ہے تو میں بڑا فخر محسوس کرتا ہوں۔

میری بات سنو۔ میں انھیں چھاؤں اور پناہ فراہم کرتا ہوں۔ میری شاخوں میں پرندے رہتے ہیں اور پلتے بڑھتے ہیں اور گاتے ہیں جس سے زندگی میں خوبصورت اور مٹھاس پیدا ہوتی ہے۔ آپ نے میرے بغیر گھر، عمارات اور سڑکیں دیکھی ہیں۔ وہ بڑی بھدی اور بدشکل نظر آتی ہیں۔ درختوں کے بغیر دُنیا بے رنگ نظر آئے گی۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ اگر دُنیا کے کسی حصے میں درخت غائب ہو جائیں یا ان کا وجود نہ رہے تو موسم تبدیل ہو جاتے ہیں مل جال کر ہنسی خوشی زندگی بسر کرنی چاہیے اور اس دنیا کو ہر شخص کے لیے خوشی کا گہوارا بنانا چاہیے۔

عذرا گہری نیند سو چکی تھی۔ میں نے اوپر کو دیکھا۔ ہاں یہ تم ہی تھے۔ وہ کہانیاں نہیں بنا رہی تھی۔ یقینی طور پر تم ہی تھے۔

تم مسکرانے اور ہنسنے والے، ہنسنے اور مسکرانے والے۔

☆☆☆☆

سلطان سکون

کام کی بات

یہ پرانے زمانے کی کہانی ہے، جب لوگ سچ بولتے تھے۔ جھوٹ سے نفرت کرتے تھے۔ کسی کے ساتھ دھوکا فریب نہیں کرتے تھے کسی کو دردوغم یا کسی مصیبت وپریشانی میں مبتلا دیکھ کر اس کی مدد کرتے تھے اور کسی مشکل میں ایک دوسرے کے کام آیا کرتے تھے۔ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کے ساتھ ہمدردی اور رحم دلی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ان کی تکلیف کو ان کی حرکات وسکنات سے محسوس اور معلوم کر لیا کرتے تھے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں جانور اور پرندے بھی باتیں کیا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہماری طرح باتیں نہیں کر سکتے تھے لیکن چوں کہ انسان کے دل میں ان کے لیے ہمدردی کے جذبات و احساسات موجود تھے، اس لیے وہ اُن کی حرکات سے جان لیا کرتے تھے کہ کوئی جانور یا پرندہ کیا کہنا چاہتا ہے یا کیا محسوس کر رہا ہے۔

آج ہم دیکھتے ہیں انسان جانوروں اور پرندوں کے لیے اپنے دل میں رحم دلی اور ہمدردی کے جذبات نہیں رکھتا یا اگر رکھتا بھی ہے تو نظر انداز کر دیتا ہے، جیسے گدھوں پر اُن کی طاقت اور برداشت سے زیادہ بوجھ لاد دیتا ہے۔ یا بہت سی مرغیوں کو ٹانگوں سے اکٹھا باندھ کر اور اُلٹا لٹکا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لاتا لے جاتا ہے اور انھیں نہایت بے دردی سے ذبح کرتا ہے۔

یہ کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے کہ اُسی زمانے میں ایک بھوکا گیدڑ پھرتا پھراتا ایک جنگل کی ایسی جگہ جا پہنچتا ہے، جہاں اُسے ایک بہت بڑا ہاتھی زمین پر مرا پڑا نظر آیا۔ یہ دیکھ کر گیدڑ دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا ہے کہ آج ہاتھی کا گوشت خوب پیٹ بھر کر کھاؤں گا۔ اب گیدڑ ہاتھی کے ارد گرد گھوم پھر کر دیکھتا ہے کہ ہاتھی کو کس جگہ سے کھانا شروع کروں۔ کیوں کہ ہاتھی کے جسم کی چمڑی بہت سخت ہوتی ہے۔ اتنے میں اسے ہاتھی کی سونڈ کے نیچے نرم گوشت والی جگہ نظر آجاتی ہے اور گیدڑ خوش ہو کر اُسی جگہ سے اُسے کھانا شروع کر دیتا ہے اور اسی طرح کھاتے کھاتے ہاتھی کے پیٹ کے اندر پہنچ جاتا ہے گیدڑ کا پیٹ تو خوب بھر گیا اب اُسے باہر نکل کر چلا جانا چاہیے تھا لیکن اُس کے دل میں اس لالچ نے سر اٹھایا کہ اگر میں ہاتھی کو چھوڑ کر چلا گیا تو دوسرے گیدڑ یا جانور

آ کر اس کو چٹ کر جائیں گے اور میرے لیے کچھ باقی نہ چھوڑیں گے بہتر یہ ہے کہ میں یہیں ہاتھی کے پیٹ میں بیٹھ جاتا ہوں اور پھر جب دوبارہ بھوک لگی تو پھر اسے کھانا شروع کردوں گا۔ اب گیدڑ چپ ہوکر وہیں بیٹھ گیا اور پھر سو گیا۔ وہ سردی کا موسم تھا جس کی وجہ سے ہاتھی کا جسم سکڑنا شروع ہوگیا اور صبح تک اُس کے جسم کی ساری کٹی پٹی جگہیں سکڑ کر آپس میں مل کر بند ہوگئیں۔ ادھر گیدڑ جاگا تو یہ دیکھ کر پریشان ہوا کہ اُس کے چاروں طرف اندھیرا ہے اور اس کے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ گیدڑ نے رونا شروع کردیا اور ساتھ ہی یہ کہے جارہا تھا جو کوئی مجھے ہاتھی کے پیٹ سے باہر نکالے گا میں اُس کو ایک بہت کام کی بات بتاؤں گا۔ اسی دوران میں اتفاق سے ادھر سے ایک لکڑہارے کا گزر ہوا جو لکڑیاں کاٹنے جنگل کو جارہا تھا۔ جب اس کو یہ ہاتھی پڑا نظر آیا تو اس نے سوچا کہ ہاتھی تو بہت بڑا اور طاقتور جانور ہے یہ ضرور کسی تکلیف میں مبتلا ہوکر گر پڑا ہے۔ شاید میں اس کی تکلیف دور کرسکوں یا کوئی مدد کرسکوں۔ جب وہ ہاتھی کے قریب پہنچا تو اسے ہاتھی کے پیٹ سے گیدڑ کے رونے کی آواز آرہی تھی اور ساتھ ہی وہ کہہ رہا تھا کہ جو کوئی مجھے ہاتھی کے پیٹ سے باہر نکالے گا میں اس کو ایک بہت قیمتی بات بتاؤں گا۔ چنانچہ لکڑہارے نے کندھے سے اپنی کلہاڑی اتاری اور ہاتھی کا پیٹ پھاڑنا شروع کیا جب ہاتھی کا پیٹ کُھلا تو اندر سے گیدڑ چھلانگ لگا کر باہر آگیا اور لکڑہارے کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں نے جس ”کام کی بات“ کا وعدہ کیا تھا وہ یہ ہے کہ۔

”اپنے سے بڑے اور طاقت ور کی دُم میں گھسنا نہیں چاہیے“

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے سے زیادہ طاقتور اور بڑی حیثیت کے آدمی کے معاملہ میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے ورنہ آدمی کسی نہ کسی پریشانی سے دوچار ہوسکتا ہے اور دوسری نصیحت جو اس کہانی سے ملتی ہے وہ یہ ہے کہ لالچ بری بلا ہے۔ اگر وہ گیدڑ اپنی بھوک مٹا کر وہاں سے چلا جاتا تو اس مصیبت میں مبتلا نہ ہوتا۔

☆☆☆☆

شاہد زبیر

بہترین استاد

بہت پرانی بات ہے، ایک آدمی تھا جس کو اللہ پاک نے بہترین گھر، صحت مند جانوروں اور زرخیز زمین سے نواز رکھا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کو ایک خوبصورت، محبت کرنے والا بیٹا بھی عطا ہوا تھا۔ اس بیٹے نے بہت شاندار وقت گذارا تھا اور اسے کبھی کسی مصیبت یا مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ایک روز باپ نے سوچا کہ اس کے بیٹے کو کسی ناکامی یا مصیبت کا بھی سامنا کرنا چاہیے مگر خوش بختی ہمیشہ بیٹے کے ساتھ رہی، حتیٰ کہ ایک روز اسے باپ نے جنگل سے لکڑیاں لانے کیلیے کہا۔ اتفاق سے اس وقت محض ایک شکستہ بیل گاڑی فارغ تھی۔ باپ اپنے بیٹے کو گاڑی میں بیلوں کی جوڑی جوتتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے سوچا کہ یہ شکستہ گاڑی اگر آج ٹوٹ پھوٹ جائے تو اس کے بیٹے کیلیے ایک اچھا تجربہ ہوگا۔ اس نے بیٹے کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا کہ اگر آج جنگل میں یہ گاڑی ٹوٹ جائے تو ’’ضرورت‘‘ تمہیں خود سمجھا دے گی کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔

لڑکا جو بہت چالاک نہیں مگر تابعدار تھا کہنے لگا ’بہت بہتر‘ بابا جان۔ اس نے سوچا کہ ’’ضرورت‘ ضرور کوئی مددگار خاتون ہوگی۔ جو جنگل میں مسافروں اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتی ہوگی۔ پھر لڑکا بیل گاڑی کو دور جنگل کے اندر لے گیا جہاں درخت گھنے اور کاٹنے آسان تھے۔ اس نے درختوں کو بہت محنت سے کاٹا، ان کے ڈھیر بنائے اور پھر انہیں بیل گاڑی میں لاد لیا۔ جب گاڑی بھر گئی تو اس نے اپنے بیلوں کی جوڑی کو پکڑا جو اس نے جنگل میں گھاس چرنے کے لیے چھوڑ دی تھی۔ بیلوں کو گاڑی میں جوت کر وہ گھر کی جانب چل پڑا۔ جب بیل گاڑی ناہموار اور گڑھوں والی سطح زمین سے گزری تو لڑکھڑا گئی اور اس کا ایک ایکسل ٹوٹ گیا۔ اس نے سوچا مددگار ’’ضرورت‘‘ یقیناً کہیں نزدیک ہی ہوگی۔ کچھ دیر تک جب کوئی ’’ضرورت‘‘ اس کی مدد کو نہ پہنچی تو اس نے اسے آوازیں دینی شروع کر دیں۔ ’’ضرورت‘‘ خاتون! ضرورت بی بی! میری مدد کو آؤ مگر کہیں سے جواب نہ آیا۔ وہ جنگل کے ایک راستے اور کبھی دوسرے راستے پر ’ضرورت‘ کو پکارتا بھاگتا پھرا، مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ لڑکا تھک گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ بابا کی چالاک دوست ’ضرورت‘‘ کو مزید تلاش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، بابا نے اسے ایک فضول نصیحت کی تھی۔

نوجوان لڑکا واپس اپنی بیل گاڑی کے پاس آیا۔ اپنا کوٹ اُتارا، گاڑی سے بیلوں کی جوڑی کو کھول دیا۔ لکڑیاں گاڑی سے اتار دیں۔ پھر ایک لکڑی کو گھڑ کر اس نے ایکسل کی مرمت کی۔ مرمت کے بعد اس نے بیل دوبارہ گاڑی میں جوتے اور گھر کی جانب چل پڑا۔ اس نے خود گاڑی کی مرمت کر کے اور لکڑی کی ایک بڑی مقدار گھر لا کر واقعی ایک شاندار کام کیا تھا۔ باپ لڑکے پر بہت خوش تھا۔ لیکن لڑکا باپ سے ناراض۔ اس نے غصّے سے کہا کہ بابا جنگل میں مجھے تمہاری دوست ”ضرورت“ کہیں نظر نہیں آئی اور نہ ہی اس نے مجھے کوئی سبق سکھایا۔ میں نے اپنے تجربے سے سیکھا کہ اگر کوئی کام تم پر آن پڑے تو اسے کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے خود کرو۔ ایسا کرنے سے کام جلدی اور بہترین ہوتا ہے۔ اگر میں کسی کام میں دوسروں کی مدد کی طرف دیکھتا رہوں گا یا انحصار کروں گا تو میں صرف دیکھتا ہی رہوں گا اور وہ کام کبھی مکمل نہیں ہوگا۔

بالکل ٹھیک ہے بیٹا، یہی بات سچ ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ ”ضرورت“ خود بخود تمہیں سکھا دے گی۔ اسی کا نام ضرورت ہے اور ضرورت ”بہترین استاد“ ہے۔

☆☆☆☆

شعیب ہاشمی

دلہن کی کہانی

یہ موسمِ سرما کی ایک بہت ٹھنڈی رات تھی، بارش ہو رہی تھی، اگرچہ ہم اتنے بڑے ہو چکے تھے کہ اس سردی اور اندھیرے کو برداشت کر سکتے تھے، لیکن باہر بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی اور باہر جا کر کھیلنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ یہ ایک شادی کا موقع تھا اور ہم تقریباً بارہ بچے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ٹیلی ویژن نہیں تھا۔ چنانچہ اس کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ ایک کمرے میں جمع ہو جائیں اور کہانیاں سنائیں۔

بڑی بہن جس کی چند دنوں کے بعد شادی ہونے والی تھی۔ بہت خوبصورت تھی جیسے کہ تمام ہونے والی دلہنیں ہوتی ہیں۔ سب اس کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ ایک آرٹسٹ تھی اور جب اس نے ایک ایسی کہانی سنانے کی پیشکش کی جو سچی اور حقیقی تھی اور سردی اور بارش کی کلفت دور کر دینے والی تھی۔

یہ ایک بڑے فیشن کا کمرہ تھا جس کی چھت بہت اونچی تھی اور ہم سب لحاف اور کمبل اوڑھ کر بیٹھے ہوئے تھے اور دلہن ہمارے درمیان تھی اور چھت پر بارش سے پیدا ہونے والی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے کہانی سنانا شروع کی۔

پینٹنگ کے فائنل امتحان سے یہ ایک دن پہلے کی بات ہے۔ میں دیر تک سٹوڈیو میں کام کر رہی تھی۔ میں نے خیال نہیں کیا کہ سب لوگ جا چکے ہیں۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی اور اس جگہ میں اکیلی تھی۔ میری تصویر تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے ایک کونے میں ذرا سے سرخ رنگ کی ضرورت تھی لیکن میں نے دیکھا کہ میرا سرخ رنگ کا پانی تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اگلے دن صبح امتحان تھا۔ میں نے ساری چیزیں جمع کیں اور ”کرمزن لیک“ جو سرخ رنگ کا نام ہے خریدنے کے لیے انارکلی کی طرف چل دی۔

جب میں نے دیکھا کہ تمام دکانیں بند ہو چکی ہیں تو اس وقت مجھے احساس ہوا کہ کتنی دیر ہو چکی ہے۔ پوری سڑک سنسان تھی صرف ایک جگہ چند لوگ بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ انھوں نے چادریں اوڑھی ہوئی تھیں اس لیے مجھے ان کے چہرے نظر نہیں آئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ انھیں ایسی دکان کا پتہ ہے جو دیر تک کھلی رہتی ہے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ صبح کا انتظار کروں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ صبح کو تو

امتحان تھا۔ وہ سب خاموش ہو گئے۔ پھر آہستہ آہستہ بولنے لگے۔ ایک دبلے پتلے شخص نے دائیں جانب ایک لمبی اور تاریک گلی کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ آپ کو بالکل آخر میں روشنی نظر آ رہی ہو گی۔ یہ ایک دکان ہے، جو ساری رات کھلی رہتی ہے لیکن اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو صبح تک انتظار کرتا۔

یہ تو صحیح ہے کہ ایک آرٹسٹوں کی دکان تھی لیکن وہ روشنی ایک چراغ سے آ رہی تھی۔ جو کاؤنٹر پر رکھا تھا۔ اس کے پاس کوئی آدمی نہیں تھا۔ میں نے ایک ہلکی سی آواز سنی۔ یہ سسکی کی آواز تھی۔ اس کے پیچھے ایک چھوٹا سا دروازہ کھلا اور ایک بوڑھی عورت باہر نکلی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ اس نے چراغ اٹھایا اور میرے چہرے کے قریب لے آئی۔ میں بھی اس کا چہرہ دھندلا سا دیکھ سکی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چلانے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی ہیں۔

اس نے پوچھا کہ مجھے کونسا رنگ چاہیے۔ میں نے کہا کہ کرمزن لیک۔ اس نے کہا کہ میں دیکھتی ہوں کہ میرے پاس یہ ہے کہ نہیں۔ اس نے شیلف پر رکھے ہوئے بکسوں میں جن کے اوپر گرد و غبار تھا، اپنی انگلی ڈال کر تلاش کرنا شروع کیا۔ ایک رنگ کے اوپر لگے ہوئے لیبل پر کرمزن لیک لکھا ہوا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر بار اسے نہیں ملتا۔ میں نے اس کی توجہ اس طرف دلائی، اس نے میری طرف دیکھا اور کہا کوئی نہیں ہے۔ وہ چراغ میرے چہرے کے قریب لائی اور کہا کہ اگر مجھے یہ ضرور چاہیے تو مجھے اس کے ساتھ اس کے گھر جانا ہوگا۔ اس نے کہا کہ رنگوں کی ایک کھیپ آئی ہے اور اس نے ابھی وہ کھولی نہیں ہے۔

ہم نے چلنا شروع کر دیا اور وہ مجھ سے میرے بارے میں سوالات کرتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے پیروں کے گرد دھند اتنی سخت تھی کہ مجھے وہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ یہ اتنی عجیب بات تھی کہ میں نے یہ خیال نہیں کیا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ اچانک اس دھند میں ایک دروازہ دھندلا سا نظر آیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ایک چارپائی پر بیٹھا دیا۔ اس نے ایک دم میری پیشانی پر پیار کیا اور کہا کہ میری شکل اس کی بیٹی سے بہت ملتی ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک سسکی بھری، میں سمجھ گئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کچھ کھایا ہے یا نہیں اور مجھے یاد ہے کہ میں نے صبح ناشتہ کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ یہاں بیٹھ جاؤ اور کچھ کھا لو۔ اس کے بعد میں تمھیں پینٹ دوں گی۔

اس کے بعد وہ کمرے کے اندر گئی جو یقینی طور پر باورچی خانہ ہو گا۔ اس کے بعد مجھے آگ جلانے اور برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ ایک ٹرے اٹھا کر چلی آ رہی ہے

جس میں کچھ پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں اور کپڑے میں لپٹی ہوئی کچھ روٹیاں رکھی تھیں۔ ڈش میں پکا ہوا سالن خوشبو سے بڑا لذیذ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے تھوڑا سا نکال کر میری پلیٹ میں ڈالا۔ اس میں سے بھاپ نکل رہی تھی اور میں سخت بھوکی تھی۔ میں نے روٹی کا ایک نوالہ توڑا اور پلیٹ میں رکھ دیا۔ ایک دم سے چراغ کی لو بھڑکی اور اس کی روشنی میں، مَیں نے دیکھا کہ گوشت کا وہ ٹکڑا جو میں کھانے والی تھی ایک انسانی انگلی تھی۔

آپ نے دیکھا کہ ہماری دلہن ……دلہن نے اس ……کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس موقع پر اس کے بھائی نے جسے کسی نے آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، ساری بتیاں بجھا دیں اور وہ دونوں چیخے۔ اور ہم سب بچے بھی چیخ پڑے۔

☆☆☆☆

شمع خالد

ننھی پری

ارما اور سانو دونوں اپنی اپنی گڑیا کو گود میں اٹھائے ان کے کپڑے تبدیل کر رہی تھیں۔ کہ لائبہ کمرے میں داخل ہوئی۔ لائبہ ان دونوں سے بڑی تھی۔ اس لیے وہ اکثر کھیل کھیل میں کوئی نہ کوئی نیا آئیڈیا دے کر کھیل کو اور دلچسپ بنا دیا کرتی تھی۔ لائبہ نے اپنا شاپر کھولا تو اس میں چمکتے ہوئے کپڑوں کے بچے ہوئے ٹکڑے تھے۔ مانو نے پوچھا: لائبہ یہ کیا ہے تو اس نے بڑی پراسراری مسکراہٹ سے کہا یہ "پوٹلے" ہیں۔ ارما جھٹ سے بولی: لائبہ آپا آپ ہمیشہ نئی بات کرتی ہیں۔ یہ تو وہ کپڑے ہیں جو آپ کے عید کے جوڑے سے بچے تھے۔ تو لائبہ نے کہا: ہاں بھئی ہیں تو وہی۔ لیکن انھیں پوٹلے اس لیے کہہ رہی ہوں کہ اس کپڑے سے گڑیا کے کپڑے بنیں گے۔ واہ بھئی واہ میں تو اپنی گڑیا کے لیے غرارہ بناؤں گی۔ یہ بے چاری ہر وقت اس چھوٹی سی سکرٹ میں پھنسی رہتی ہے۔ ارما فوراً بولی اور میں اپنی گڑیا کے لیے ایسا فراک بناؤں گی جیسا خالدہ نے ماموں کی شادی پر پہنا تھا۔ لائبہ بولی کلیوں والا فراک مگر اس میں تو بہت زیادہ کپڑا لگتا ہے۔ ارما نے منہ بسورتے ہوئے کہا، بس میری گڑیا تو ویسا ہی فراک پہنے گی۔ تینوں نے کپڑے کا شاپر اٹھایا۔ اپنی اپنی گڑیا گود میں لی اور تمکنت آپا کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ تمکنت آپا اپنے کمرے میں سالانہ امتحان کی تیاری کر رہی تھیں۔ تینوں نے جب کمرے کا دروازہ کھولا۔۔۔ اور پوچھنے لگیں، آپا ہم نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا۔ تمکنت آپا نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا، ڈسٹرب تو تم نے کر ہی دیا۔۔۔ آپا کے اس جواب سے تینوں کے چہرے اتر گئے تو آپا نے مسکراتے ہوئے کہا: چلو بھئی اس میں بھی کوئی بات نہیں۔ تو مانو نے کہا: تمکنت آپا لائبہ گڑیا کے لیے پوٹلے یعنی کپڑے لاتی ہے۔ ہم اس کا غرارہ بنانا چاہتے ہیں۔ مانو خالہ جیسا فراک بنانا چاہ رہے ہیں۔ تمکنت آپا نے پوچھا کیوں بھئی گڑیا کی شادی ہے کیا۔ مانو خوشی سے اچھل پڑی، اچھی آپا ہمیں گڑیا کی شادی کرنی ہے۔ ہمیں اجازت دے دیجیے ناں۔۔۔

آپا نے کہا اچھا میرے امتحان ختم ہونے دو پھر چھٹیوں میں گڑیا کی شادی رچائیں گئے۔ تمکنت آپا یہ کہہ کر پھر پڑھائی میں مشغول ہو گئیں۔ لیکن اب مانو اور ارما کو قرار کہاں۔۔۔ دونوں نے اپنے کمرے میں جا کر کمپیوٹر آن کیا اور گڑیا کے لباس کے ڈیزائن کے لیے فیری ورلڈ (پریوں کی دنیا) کو کلک کیا۔۔۔ دونوں نے پھولوں بھرے درختوں ندی نالوں کے بیچ میں پریوں کو جب گاتے کھیلتے اور نہاتے دیکھا تو اپنے ہوش گنوا کر پریوں کے دیس میں گم ہو گئیں۔ وہاں ایک

ننھی پری انوشہ نے انھیں دیکھا۔ جس نے ہاتھ پکڑ کر انھیں بھی کمپیوٹر کی سکرین کے اندر کر لیا۔ لائبہ نے اپنی جیسی پری دیکھی تو حیران رہ گئی اور پوچھنے لگی۔ ننھی پری میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تمھیں دیکھ رہی تھی تو مجھے یوں لگا جیسے میں آپ کے سامنے بیٹھی ہوں لیکن یہ پھول، یہ تتلیاں، یہ خوبصورت پرندے۔۔۔ اور یہ پھول کنول۔۔۔ یہ سب کتنا حسین ہے۔ ننھی پری نے کہا آؤ میں تمھیں دنیا محل دکھاتی ہوں اور پھر وہ محل کیا تھا۔۔۔ جیسی کوئی خوبصورت کرسٹل کا ڈیکوریشن پیس جس میں چمکتے ہیرے موتی جڑے تھے۔۔۔

محل کے اندر داخل ہوتے ہی لائبہ اور مانو حیران رہ گئیں۔ ایک کمرے میں پھل پھول شہد اور رنگا رنگ مٹھائیاں جنھیں خوبصورت پریاں پیش کر رہی تھیں۔ اب جیسا مٹھائی اور پھل کا ٹرے ان کے ہاتھ میں ہے۔ ویسے ہی کپڑے انھوں نے پہن رکھے تھے۔ اسٹرابری کی مٹھائی اور پھل والی پری خود بھی جیسے اسٹرابری لگ رہی تھی۔ پھولوں پھلوں اور مٹھائیوں کے کمرے سے اگلے کمرے میں چاکلیٹ ہی چاکلیٹ تھی۔ مانو نے جلدی جلدی کچھ چاکلیٹ اٹھائے تو ایک جگہ وہ گھبرا گئی۔ جسے وہ چاکلیٹ سمجھ کر اٹھا رہی تھی وہ ایک چھوٹا سا پری زاد تھا۔ مانو نے گھبرا کر اسے چھوڑا وہ زمین پر گرا اور فرش پر ٹوٹ کر بکھر گیا۔ لائبہ نے اسے جلدی جلدی سمیٹا اور سوچنے لگی آنکھ بچا کر اسے کسی جگہ پھینک دوں تا کہ کسی کو پتہ ہی نہ چلے۔

لائبہ ابھی اِدھر اُدھر جگہ تلاش کر رہی تھی کہ اسے آہستہ آہستہ رونے کی آواز سنائی دی اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو ٹوٹی ہوئی چاکلیٹ سے آواز آ رہی تھی۔ مجھے پھینک نہ دینا۔ ساتھ والے کمرے میں ہماری فیکٹری ہے۔ مجھے وہاں لے چلو۔۔ لائبہ اور مانو اسے لے کر آگے چل پڑیں۔۔ سامنے کمرے میں مشین چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ دونوں نے وہاں دیکھا ایک مشین میں کچھ چاکلیٹ سے بنے پری زاد نکل رہے ہیں۔ انھیں آواز آئی مجھے اس مشین میں ڈال دو دونوں نے جلدی سے اپنے ہاتھوں سے چاکلیٹ کو مشین میں ڈالا اور باہر واپس بھاگ آئیں۔

مانو دوبارہ چاکلیٹ والے کمرے میں جانا چاہتی تھی کیوں کہ اس نے ڈر کے مارے ابھی تک نہ پھلوں مٹھائی والے کمرے میں کچھ کھایا تھا اور نہ چاکلیٹ والے کمرے سے۔۔ اوپر سے یہ حادثہ ہو گیا۔ وہ تو شکر ہے کسی نے کچھ دیکھا نہیں۔۔ لیکن لائبہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ گئی اور کہنے لگی ہم نے یہاں سے کچھ نہیں کھانا۔ جانتی نہیں امی اور ابو ہمیشہ کہتے ہیں کہ کبھی کسی اجنبی سے کچھ نہیں لے کر کھانا چاہیے۔ پھر یہ جگہ تو ہمارے لیے بالکل نئی ہے تم نے دیکھا نہیں پھلوں کے ساتھ پھلوں والے لباس کی پریاں اور چاکلیٹ سے بنا پری زاد۔ تو بہ توبہ۔۔ اگلے کمرے میں تو ان کی مرضی کی جگہ تھی۔ جی ہاں یہ کمرہ تھا ماڈلز کا۔۔۔۔

کمرے میں خوبصورت لباس مختلف جگہوں پر لٹک رہے تھے اور ویسے ہی لباس پہنے بہت ہی حسین سنہرے بالوں اور چمکتے پروں والی پریاں گھوم رہی تھیں۔ ان کے لباس میں قیمتی موتی جڑے ہوئے تھے کانوں میں چمکتے ہیرے

کی بالیاں۔۔۔ مانو اور لائبہ کی آنکھیں ہی چندھیا گئیں۔۔۔ دونوں حیرت کی تصویر بنی کھڑی تھیں کہ وہی ننھی پری نمودار ہوئی اور دونوں کا ہاتھ پکڑے باہر کی طرف بھاگی۔ جلدی چلو تمھارا وقت ختم ہو رہا ہے۔ دونوں کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ وہی جگہ آئی جہاں پھولوں پر تتلیاں رقص کر رہی تھیں۔ رنگ برنگے پرندے درختوں پر بیٹھے ہوئے خوش الحانی سے گا رہے تھے۔ زمین پر مور ناچ رہے تھے ایک جگہ نہر کے کنارے ننھی پری نے انھیں دکا دے دیا۔۔ وہ دونوں جیسے نہر میں ڈوبنے لگیں۔ انھوں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

جب انھیں سخت زمین محسوس ہوئی آنکھیں کھولیں تو اپنے کمرے میں تھیں۔۔۔ دونوں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا۔ کیا یہ کوئی خواب تھا جو دونوں کی آنکھوں نے ایک ساتھ دیکھا۔ نہیں یہ خواب نہیں۔۔۔ کیوں کہ دونوں کے ہاتھوں میں پھل اور چاکلیٹ تھیں۔ جنھیں انھوں نے وہاں ڈر کے چکھا بھی نہیں تھا۔

ابھی دونوں اپنے ہاتھوں کو دیکھ ہی رہی تھیں کہ لائبہ نے چیخ کر کہا، مانو وہ اپنی گڑیا دیکھو۔۔ لائبہ کو جیسے جھٹکا ہی تو لگا۔۔۔ مانو کی گڑیا نے وہی لباس اور زیور پہن رکھا تھا، جو ننھی پری نے پہن رکھا تھا اور شکل بھی ویسی ہی تھی۔ دونوں حیرت سے گڑیا کو دیکھ رہی تھیں۔۔ گڑیا نے دونوں کو آنکھ ماری۔ دونوں گڑیا کی طرف بڑھیں۔ لیکن وہ تو بالکل بے جان گڑیا تھی۔۔ دونوں نے یہ دیکھ کر چیخ ماری اور تمکنت آپا کے کمرے کی طرف بھاگیں۔

☆☆☆☆

شیما مجید

خرگوش اور خلاباز

ایک سفید، خوب صورت خرگوش لکڑی کی بار کے نیچے رہتا تھا۔ بار کے ایک طرف کھیت ہی کھیت تھے۔ اور دوسری طرف سڑک تھی۔ جب صبح سویرے سڑک پر موٹر یا بس وغیرہ گذرتی تو خرگوش کا سارا گھر ہلنے لگتا۔ دراصل خرگوش کو دیر تک سونا پسند تھا لیکن اکثر گھر کی دیواریں ہلیں، تو کوئی سو کیسے سکتا ہے! اس لیے خرگوش پو پھٹنے سے پہلے ہی اٹھتا، اپنے پنجوں سے آنکھیں ملتا اور کام پر بھاگ جاتا۔

اس کا کام تو بہت ہی معمولی تھا۔ وہ بس پیڑوں کے نیچے کیڑے مکوڑے پکڑتا اور انھیں رسد خانے پہنچا دیتا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ خرگوش آرام کرنے کے لیے درخت کے پاس بھاگ آیا اور وہاں بیٹھا ہوا وہ برابر آسمان کی طرف دیکھتا رہا ریشمی دھاگے پر کہیں سُرخ کیڑا تو نہیں جھول رہا ہے۔ مگر اس کی جگہ خرگوش نے دیکھا کہ آسمان سے بہت بڑا سورج گر رہا ہے۔

خرگوش بے چارہ ڈر گیا کہیں سورج اُسے جلا نہ ڈالے، اس لیے اس نے سَر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگنا چاہا لیکن تھوڑی دیر کے بعد سورج کی بیچوں بیچ انسان دکھائی پڑ گیا۔ وردی سے اس نے فورا پہچان لیا۔ نارنگی چھتری کے سہارے خلاباز نیچے آ رہا تھا۔ خلاباز زمین پر اُترا۔ اُس نے پیٹیاں کھولیں کوٹ اُتارا اور درخت کے قریب آیا۔

سلام درخت پیارے۔ اُس نے کہا اور ایک شاخ کو ہاتھ میں لے کر اس کے پتوں کو چوما۔ خرگوش کو یہ اچھا نہیں لگا ذرا سوچو تو بھلا اس نے صرف پیڑ کو سلام کیا ہے جب کہ یہاں اور جانور بھی موجود ہیں اسے شاید اور کوئی نظر نہیں آ رہا، خرگوش نے سوچا۔ وہ آہستہ آہستہ خلاباز کے جوتے پر چڑھ گیا۔ وہاں سے اُس نے دوڑ لگائی تانگ سے بازو تک پہنچا خلاباز خرگوش کو دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

السلام و علیکم خرگوش بھائی۔ آج اتنے سویرے سویرے کیوں اُٹھ گئے؟ کام کاج ہے؟

ہاں بھائی صاحب آج کل مجھے کام کاج بہت ہیں۔ خرگوش نے جواب دیا۔

خرگوش نے خلاباز سے سوال کیا۔

کیا یہ سچ ہے کہ زمین کھیت میں پڑے ہوئے کدو کی طرح ہی گول گول ہے۔

ہاں بھئی سچ ہے۔ خلاباز بولا۔ میں زمین سے بہت دور تھا اور وہاں سے میں نے دیکھا کہ وہ گول ہے۔

زمین پر ہم سب جانوروں کے خوب مزے ہیں۔ خرگوش نے کہا۔ ہاں ہم سب خوشی خوشی رہتے ہیں، مگر زمین کے نیچے والے حصے پر کوئی نہیں ہے، وہ سب ہی اس سے گر جاتے ہیں۔

زمین کے نچلے حصے پر بھی لوگ اور جانور ہیں۔ خرگوش بھائی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ خرگوش کو یقین نہیں ہوا۔

تھوڑی دیر بعد شور سنائی دیا ہیلی کاپٹر خلاباز کو لینے آیا تھا۔ جلدی سے چھپ جاؤ نہیں تو یہ تمھیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ خلاباز نے کہا اور خرگوش درخت کے پیچھے چھپ گیا۔

ہیلی کاپٹر کے اڑنے اور ہوا کے آہستہ ہو جانے کے بعد خرگوش پورے زور کے ساتھ جنگل کی طرف بھاگا تا کہ اس انوکھی ملاقات کے بارے میں سب کو بتائے۔

جنگل کے تمام جانوروں نے خلاباز کو دیکھا تھا مگر اس سے بات کرنے اور اُس کے بازو پر بیٹھنے کا شرف صرف خرگوش کو ہی ملا تھا۔ بے شک وہ ایک معمولی سا جانور تھا۔ پھر بھی سب ہی اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ خود خرگوش نے یہ سوچا کہ اب کسی بات کی کیا پروا وہ تو موج منائے گا، ناچ لینے دو اسے۔ جنگل کے تمام جانور بولے۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو خوشی کے مارے مر جاتا۔ ان کا خیال تھا کہ خرگوش کچھ دیر ناچ کے بعد اپنے کام میں لگ جائے گا۔

مگر خرگوش تو کام کرنے کی سوچ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تو صرف ناچتا رہا۔ اب تمام جانور ناراض ہو گئے۔ رات کو انھوں نے اپنے گھروں کے دروازے بند کر دیے اور بے چارے خرگوش کو سڑک پر باہر سونے کے لیے چھوڑ دیا تو ایسے ہی سہی میں، اپنا گھر الگ بنا لوں گا۔ تمھارے گھروں سے کہیں بہتر اور میں وہاں اکیلا رہوں گا۔ خلاباز نے مجھے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زمین بہت وسیع ہے۔ سچ مچ میں اپنے لیے زمین کی تلاش کیوں نہ کروں۔ رات کو سردی سے کانپتے ہوئے خرگوش نے سوچا اور اپنے لیے گھر ڈھونڈنے کے لیے چل دیا۔ اسے دھاری دار بڑا سا کدو پسند آیا۔ خرگوش کے خیال کے مطابق زمین جیسا تھا۔ وہ کدو پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور اُسے پورا یقین ہو گیا کہ کدو کے اردگرد جو پیلی دھاریاں تھیں وہ کھیت جیسی تھیں۔ ہری دھاریاں جنگل جیسی تھیں۔ اور اس کے سر پر گڑھے میں بارش کا جو پانی جمع ہو گیا تھا، وہ سمندر تھا۔

خرگوش نے سمندر کے کنارے ناچ شروع کر دیا اور تھوڑی دیر کے آرام کرنے کے بعد وہ سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ اس نے زمین کے گرد دوڑ کر چکر لگانے اور یہ دیکھنے کا فیصلہ کیا کہ نیچے کی طرف کیا ہے ممکن ہے کہ وہاں پہاڑ، درخت یا کوئی دلچسپ منظر دیکھنے کو مل جائیں۔ خرگوش کود کے اوپر سے دوڑ رہا تھا۔ کدو کا پہلو چکنا پھسلواں تھا۔ خرگوش اپنی زمین سے نیچے کیاری میں جا گرا۔ یہ کیا ہے؟! اپنی پیٹھ سہلاتے ہوئے اُس نے سوچا۔ خلاباز نے تو کہا تھا کہ زمین سے گرنا ممکن نہیں۔

خرگوش پھر سے کدو پر چڑھ گیا وہ سمندر کے کنارے بیٹھ گیا۔ پنجوں میں سر تھام لیا اور لگا سوچنے کہ یہاں گھر کیسے بنایا جائے۔ اس نے سوچ بھی لیا ہوتا مگر اچانک کانپ اُٹھا۔

ارے واہ! خرگوش ڈرا اور ساتھ ہی خوش بھی ہوا۔ لگتا تھا جیسے زلزلہ آیا ہے۔ میری زمین تو بالکل اصلی ہے۔ مگر یہ زلزلہ نہیں تھا۔ یہ تو کھیت کے پاس سے گزرے ایک لڑکے نے غلیل سے کدو پر کنکر مارا تھا۔

دن گزرتے رہے، وہ کھیت میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا کبھی کبھی درخت تک جا پہنچتا۔ مگر یہ سب چوری چھپے کرتا تا کہ رشتے داروں کی نظر نہ پڑے۔ کدو والی زمین سے وہ مانوس ہو گیا۔ غرور اسے گھر واپس جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ خرگوش بے گھر ہو گیا اور جب خرگوش نے درخت کے نیچے ایک آدمی کو بیٹھے دیکھا تو فوراً اس طرف دوڑ پڑا۔ خرگوش جھاڑیوں اور گھنی گھاس کے درمیان سے دوڑتا جاتا اور اُسے زیادہ سے زیادہ غصہ آتا جاتا تھا۔ ناک پر کاٹوں گا اس نے دل ہی دل میں دھمکی دی۔

وہ پیچھے سے کود کر آدمی پر چڑھ گیا، بازوؤں سے دوڑ کر اُس کی گردن تک پہنچ گیا وہ زور سے کاٹنے کے لیے جھکا ہی تھا کہ اس نے اپنے آپ کو آدمی کے ہاتھ پر پایا۔

ارے واہ پرانے ملاقاتی۔ خرگوش کو آواز سنائی دی۔ کیا بات ہے کہ تم میرے جسم پر سیر کر رہے ہو؟ خرگوش کا تو جیسے دم نکل گیا۔ یہ تو وہی خلاباز تھا جو ایک صبح کو یہاں اُترا تھا۔ وہ شرم سے سُرخ ہو گیا۔

سلام۔ خرگوش نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ آپ پھر ہمارے یہاں تشریف لائے ہیں۔

زمین کے اس گوشے کو درخت اور تمھیں دیکھنے کو دل مچل اُٹھا۔ خلاباز نے جواب دیا۔ زمین پر آنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ میں کبھی اس خوشی کو بھول نہیں سکوں گا۔ زمین کدو جیسی گول ہے نا؟ کدو والی زمین پر سے گرنے کی وجہ سے اُسے، جو تکلیف ہوئی تھی، اسے یاد کرتے ہوئے خرگوش نے پوچھا۔

میں نے تمھیں کہا تو تھا کہ وہ کدو، گیند اور غبارے سے ملتی جلتی ہے۔ آسمانی رنگ کے گولے کی طرف وہ

خلا میں اُڑ رہی ہے۔ اس پر کوئی گرتا نہیں۔ کوئی بھی نہیں گرتا تو میں اپنی زمین سے کیوں گر پڑا۔ خرگوش نے کہا۔ دکھ کے مارے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ خرگوش کی بات سن کر وہ ہنس پڑا۔ میرے دوست خرگوش، زمین تو عجیب وغریب ہے! اگر تمھیں کوئی بہت ضروری کام نہ ہو تو میں تمھیں چھوٹی چھوٹی کہانیاں سناتا ہوں۔ کوئی ضروری کام تو نہیں ہے۔ خرگوش نے دکھی آواز میں کہا سنایئے!۔

کبھی ایسا بھی وقت تھا، جب زمین سے سب کچھ گر جاتا تھا۔ نیچے کی چیزیں نیچے گرتی تھیں۔ زمین کے اوپر والی چیزیں اوپر گرتی تھیں، بے شک یہ عجیب بات تھی۔ وہ پرندے کی طرح اُڑ جاتی تھیں اگر جانوروں کو گھروں میں باندھا نہیں جاتا تو وہ نیچے گرتے تھے یا اُوپر کی طرف اُڑتے تھے۔ لوگوں کے لیے سڑکوں پر باڑیں لگائی گئیں، وہ انھیں پکڑ کر چلتے تھے اور گھر میں کیا ہوتا، میزوں اور کرسیوں کو اگر فرش کے ساتھ کیلوں سے ٹھونک نہیں دیا جاتا۔ تو وہ چھت پر جا لگتی تھیں تو تم کیا سمجھ گئے بھائی خرگوش کہ زمین پر تمھارے کدو سے بھی زیادہ بُری زندگی تھی لیکن زمین پر سب کچھ تو بالکل ٹھیک ٹھاک نہیں چل رہا تھا۔ جانتے ہو کیوں خرگوش بھیا زمین خلا میں لٹکی ہوئی تھی۔ سورج اس کے ایک پہلو کو ہمیشہ روشن کرتا تھا۔ اس لیے ایک طرف لگاتار دن رہتا تھا۔ اور دوسری طرف لگاتار رات رہتی تھی۔ جب لوگ اس روشن پہلو پر سونے کے لیے بستر پر جاتے تو کھڑکیوں کو بہت موٹے پردوں سے ڈھانک دیتے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اگر آنکھوں پر روشنی پڑے تو نیند آتی نہیں لیکن اگر نیند آ جاتی تو وہ سوئے ہوئے رہ جاتے لہٰذا لوگوں کو کارخانے میں اپنے کام پر جانے میں دیر ہو جاتی اور اکثر پیارے پیارے بچے اسکول دیر سے پہنچتے۔

آخر کار سب لوگوں نے مل کر زمین کی منت کی، رحم دل زمین کیا تم گھوم نہیں سکتیں؟ اور زمین سورج کے سامنے ایسے گھومنے لگی جیسے کوئی پیاری سی بچی نیا فراک دکھاتے ہوئے اپنی سہیلیوں کے سامنے گھومتی ہے۔ سورج باری باری سے کبھی ایک کبھی دوسری طرف کو روشن کرنے لگا۔ خرگوش اس وقت دن ہے، اس کا مطلب ہے کہ زمین کا ہمارا والا پہلو سورج کے سامنے ہے، دیکھ رہے ہو۔ وہ کیسے چمک رہا ہے۔ مگر دوسری طرف اس وقت رات ہے اور وہاں سب لوگ سو رہے ہیں۔ خرگوش بھیا تم نے کہا تھا، تمھارے کدو پر ایک بچے نے پتھر مارا تھا اور تم بال بال بچ گئے۔ اس طرح زمین پر بھی ڈھیروں پتھر گرتے تھے۔ ایک بار زمین نے لوگوں سے کہا پتھر اتنے زور سے نہ مارا کرو لہٰذا لوگوں نے زمین کے لیے شیشے کی قمیص بنائی۔ خلاء کے پتھروں نے جنھیں شہاب ثاقب کہتے ہیں شیشے میں سوراخ کر ڈالا تھا۔ شیشہ بنانے والے، جن کی تعداد بہت زیادہ تھی، نیا شیشہ

بنانے لگے۔ وہ ایک جگہ پر شیشہ بناتے تو دوسری جگہ شیشے کے ٹکڑوں کی چھنک سنائی دیتی۔ کاریگروں کی ہمت پست ہونے لگی تو لوگوں نے زمین کے لیے لوہے کی قمیص بنانی شروع کر دی۔ پر تب تو دروازے میں سے سورج نظر نہیں آئے گا۔ پھر لوگ غباروں سے ہوا نکالنے لگے اور وہ زمین کے اوپر ہوا ہی ہوا چھوڑتے رہے۔ ان لوگوں کو سائنسی الفاظ استعمال کرنے کا شوق تھا۔ انھوں نے اس ہوا کو فضا کا نام دیا۔ اب میں کیا کروں خرگوش بولا وہ تو گھر میں مجھے گھسنے نہیں دیتے، دروازے بند کر دیتے ہیں۔ یقیناً کدو کوئی زمین تو ہے نہیں۔ موسم گرم میں لوگ کدو مارکیٹ میں لے جائیں گے۔ وہاں اس کا سالن بنالیں گے۔ جاڑے میں مائیں اس کا مغز نکال کر اپنے بچوں کو دیں گی۔ بچوں کے تو مزے ہیں۔ ان کے پاس کوٹ ہیں گرم جوتے اور ٹوپیاں ہیں۔ مگر میں جاڑے میں سردی سے مر جاؤں گا۔

خلاباز نے خرگوش کی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور آہستہ سے کہا، فکر مت کرو۔ میرے خیال میں تم اپنی غلطی درست کر سکتے ہو۔ اللہ تعالٰی کی زمین بہت وسیع ہے۔ خرگوش جب جنگل میں پہنچا تو کسی نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ کیوں کہ اب وہ اپنی عادت درست کر چکا تھا۔ سب جانور بہت پہلے سے یہ جانتے تھے۔

☆☆☆☆

صابرہ اعظم

جو کچھ ہونا ہے، ہو کر رہے گا

یہ دو سہیلیوں عطیہ اور پوجا داس کی کہانی ہے۔ وہ دونوں فزیکل ایجوکیشن کی استانیاں تھیں۔

پوجا مزید تربیت کے لیے امریکہ گئی۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد اسے بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن لاہور میں فزیکل ایجوکیشن ڈائرکٹر کی حیثیت سے منتخب کر لیا گیا۔ اسے اپنی ملازمت سے پیار تھا اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ اس ملازمت کے لیے بہت موزوں ہے سخت محنت سے کام کرتی تھی۔

کیوں کہ پوجا خاصی کم عمر تھی۔ اس کی طالبات اس سے اکثر اوقات خاصے مشکل سوالات پوچھتی تھیں۔ ان کا خیال ہوتا تھا کہ وہ جواب نہیں دے سکے گی۔ لیکن اس کے اعتماد کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ جاتیں۔

ایک مرتبہ عطیہ سروس کے دوران میں میں ایک کورس ختم کر رہی تھی جو اس نے راولپنڈی کے سکولوں کی فزیکل ایجوکیشن کی استانیوں کے لیے کیا تھا۔ اسے پوجا کا ایک پیغام ملا۔ وہ بھی مری میں ایک کورس کا اہتمام کر رہی تھی جس میں فزیکل ایجوکیشن کالجوں کی استانیوں کے لیے کھیلوں اور سپورٹس کے قواعد وضوابط پر نظر ثانی کی گئی تھی۔

پوجا نے عطیہ سے اگلے دن آنے کے لیے کہا۔ عطیہ نے اپنا سامان باندھا، ہیڈ مسٹرس کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور پوجا سے ملنے کے لیے روانہ ہو گئی۔

مری میں کورس کے بعد عطیہ اور پوجا نے اس شام کو راولپنڈی واپس جانے کا فیصلہ کیا تا کہ اپنی ملازمت پر واپس پہنچنے کے لیے پوجا جلد از جلد لاہور روانہ ہو سکے۔ جب وہ بس اسٹاپ پر اس کا انتظار کر رہی تھی تو بادل بھر کر آ رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بارش ہو گی۔ بسیں نہیں آ رہی تھیں۔

درایں اثنا ان کے قریب ایک کار آ کر رکی۔ کار میں بیٹھے ہوئے دو آدمیوں نے ان سے پوچھا کہ آیا وہ راولپنڈی جانا چاہتی ہیں۔ ڈرائیور نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے کیوں کہ اس کی ایک عم زاد بہن نے اس دس روزہ کورس میں شرکت کی تھی، جس کا پوجا نے اہتمام کیا تھا۔ دونوں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

دس میل دور جانے کے بعد کار ایک دم دائیں جانب ایک بڑے سے گھر میں مڑ گئی۔ پوجا نے ڈرائیور

سے رکنے کی وجہ پوچھی لیکن اس نے صرف یہ کہا انھیں راستے میں سے کچھ چیزیں لینی ہیں۔ دونوں خواتین اپنے آپ کو کوسنے لگیں۔ اسی دوران میں میں دروازہ کھلا اوران سے کہا گیا کہ وہ اندر چلی جائیں۔ انھوں نے انکار کر دیا اوراس کی بجائے برآمدے میں بیٹھ گئیں۔ انھیں چائے دی گئی لیکن وہ پینے سے خوف زدہ تھیں۔

جب وہ دونوں آدمی واپس آئے تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ عطیہ نے پوجا کو خوف زدہ ہوکر بھینچ لیا۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں بندوق اور کارتوس تھے۔ دونوں خواتین نے کار میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ ان آدمیوں نے انھیں یقین دلایا کہ یہ بندوق صرف شکار کھیلنے کے لیے ہے۔ عطیہ اور پوجا کار میں بیٹھ گئیں۔ دونوں ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی تھیں اور خدا سے اپنی حفاظت کے لیے دعا کر رہی تھیں۔

جب راولپنڈی کی روشنیاں نظر آنی شروع ہوئیں تو ڈرائیور نے ان سے پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہیں۔ پوجا نے جلدی سے عطیہ کا ہاتھ دبا دیا جس نے فوراً کہا کہ اپنے کالج۔ جو وہاں سے قریب ہی تھا۔ جب وہ کار سے اتریں تو ان لوگوں نے کہا کہ اگر کوئی تکلیف ہوئی ہو تو معاف کر دیں۔

عطیہ اور پوجا رات کالج کے ہوسٹل میں ٹھہریں۔ اپنے بستروں میں جا کر وہ ایک دوسرے کو کوسنے لگیں کہ انھوں نے ایسا خطرہ کیوں مول لیا تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا" جو ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے"۔

دو یا تین سال کے بعد عطیہ کو پوجا کی شادی میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ اس نے جوشِ مسرت سے پوجا کو فون کیا اور اسے معلوم ہوا کہ جس سے اس کی شادی ہو رہی ہے وہ ایک امریکن ہے اور لاہور کے ایک کالج میں کام کر رہا ہے اور فزیکل کا ڈائریکٹر ہے عطیہ نے پوجا کو شادی میں تحفہ دینے کیے لیے ایک خوبصورت ساڑھی خریدی۔

یہ شادی ایک گرجا گھر میں ہوئی جس میں پوجا کے بہت سے رشتہ دار اور دوست شریک ہوئے۔ پوجا دلہن کے لباس میں انتہائی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ یہ جوڑا کلیسا کی نشستوں کے درمیانی راستہ سے آیا جہاں ہر طرف خوشی اور مسرت تھی لیکن جب وہ کار میں بیٹھے تو وہ سٹارٹ نہیں ہوئی۔ بالآخر اسے دھکے دے کر چلایا گیا۔ عطیہ نے ایک عورت کی آواز سنی جو کہہ رہی تھی" یہ برا شگون ہے۔ مگر مجھے امید ہے کہ سب کچھ ٹھیک رہے گا" عطیہ نے پریشانی کے عالم میں عورت کی جانب دیکھا پھر اوپر کی طرف نگاہ ڈالی اور کہا" جو کچھ ہونا ہے ہو کر رہے گا "۔

دو سال کے بعد عطیہ نے سنا کہ پوجا اپنے شوہر اور نوزائیدہ بچی کے ساتھ امریکہ جانے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ پوجا اپنی سسرال کے لوگوں سے ملنے کے لیے پہلی مرتبہ جا رہی تھی۔ وہ عطیہ کو الوداع کہنے کے لیے آ گئی۔ اس کی بچی بھی اس کے ساتھ تھی جو سب کی آنکھوں کا تارا تھی۔ حسبِ معمول پوجا بڑی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے عطیہ سے کہا کہ وہ اس کے لیے دعا کرے اور نیک تمناؤں کا اظہار کرے کیوں کہ وہ نکل جا رہی ہے۔

دو دن کے بعد عطیہ نے اخبار کھولا۔ اس نے پڑھا کہ جس جہاز میں پوجا اس کا شوہر اور بچی روانہ ہوئے تھے بحرِ اوقیانوس کے اوپر لاپتہ ہو گیا ہے۔ جوں ہی اس نے دل ہلا دینے والی یہ خبر پڑھی اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ صرف دو دن پہلے وہ پوجا اور بچی سے گلے ملی تھی اور ان کے لیے نیک تمناؤں اور زندگی کی تمام خوشیوں کی تمنا کا اظہار کیا تھا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں اس نے اخبار پھاڑ کر پھینک دیا اور زار و قطار رونے لگی۔ اس نے اوپر کی طرف دیکھا اور کہا ”جو کچھ ہونا ہے ہو کر رہے گا“۔

☆☆☆☆

طاہر نقوی

لائبریری

شانی اپنے ہم عمروں سے مختلف بچہ تھا۔ اسے ایسے کھیل ذرا پسند نہیں تھے جو عام بچے کھیلتے تھے۔ وہ گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں میں کبھی شریک نہ ہوتا۔ کبھی اپنے کسی ہم عمر کے اصرار پر جاتا بھی تو تھوڑی دیر میں گھر واپس آ جاتا۔ ابو یا امی کے دریافت کرنے پر یہی جواب دیتا کہ میر جی ایسے کھیلوں میں نہیں لگتا۔ بلکہ ان بچوں پر حیران ہوتا کہ اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں۔ میں پاس بٹھا کر اسے یہی سمجھانے کی کوشش کرتا کہ ابھی تم بچے ہو کھیلنے کودنے سے صحت اچھی رہتی ہے۔ ہمیشہ یہی جواب دیتا کہ ابو وقت لوٹ کر نہیں آتا۔ اسے یوں ضائع کرنے کے بجائے کسی اچھے کام میں صرف کرنا چاہیے۔ اس کی سمجھداری کی ایسی باتوں سے میں لاجواب ہو جاتا۔

اسی دوران میں ایک روز میں آفس سے تھکا ماندہ گھر کی طرف آ رہا تھا۔ میری نظر گھر کے سامنے کھڑے شانی پر پڑی۔ وہ چند ہم عمروں کے ساتھ کھڑا باتوں میں مصروف تھا۔ وہ بچے اس کی باتیں سننے کے بجائے اس کی ہنسی اڑا رہے تھے۔ کبھی ایک دوسرے کو شرارتی انداز میں دیکھ لیتے۔ پھر ایک ایک کر کے وہاں سے کھسکنے لگے۔ شانی انھیں جاتے ہوئے بے بسی سے دیکھتا رہا۔ میں نے قریب جا کر شانی سے ماجرا دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ ابو یہ بچے اسکول سے آنے کے بعد زیادہ وقت کھیل کود میں ضائع کر دیتے ہیں۔ ان کے امی ابو بھی نہیں روکتے۔ میں نے سر اثبات میں ہلا کر اس کی بات کو تسلیم کیا۔ تب اس نے بتایا کہ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ محلے میں ایک لائبریری قائم کی جائے۔ تاکہ بچے وہاں اچھی اچھی کتابیں اور اخبارات پڑھیں۔ مگر وہ سب مجھ پر ہنستے ہوئے چلے گئے۔ میں نے شانی کی حوصلہ افزائی کے لیے تھپکی دی۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وعدہ کیا۔ اس لمحے اس کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ میری بیوی نے پہلے تو یہ کہ کر مخالفت کی کہ ابھی وہ ناسمجھ بچہ ہے۔ چند روز میں پرانی بات بھول جائے گا۔ تم لائبریری کہاں اور کیسے قائم کرو گے۔ میرے سمجھانے پر وہ چپ ہوگیا۔

میں نے اپنے گھر کے ڈرائینگ روم کو چھوٹی سی لائبیریری میں تبدیل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ کتابوں کے لیے چند چھوٹی چھوٹی الماریوں اور ریڈنگ ٹیبلز کا آرڈر دے دیا۔ شانی ہر معامے میں خوشی خوشی میرے ساتھ

رہا۔ جان پہچان والوں سے درخواست کرنے کے علاوہ میں نے لائبریری کے لیے کتابیں مہیا کرنے کے لیے اخبارات میں چھوٹا سا اشتہار بھی دے دیا۔ اس دوران میں شانی کا جوش وخروش دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ آس پڑوس میں جا کر لائبریری کے لیے کتابیں دینے کے لیے بھی کہتا۔ لیکن کوئی اُس کی بات کو قابلِ اعتنا نہ سمجھتا۔ محلے کے بچے اس کی ہنسی اڑاتے۔ البتہ میں نے اس کا جوش وخروش دیکھتے ہوئے اپنی جان پہچان والے ایک سیاسی لیڈر کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے بلا کر اس لائبریری کا افتتاح بھی کروا دیا۔ اس روز محلے میں گہما گہمی رہی۔ شانی سارے وقت خوشی سے سرشار رہا۔ اسے اب اپنے مقصد میں کامیابی کا یقین ہو چکا تھا۔ وہ یہی کہتا کہ اب محلے کے بچے کھیل کود میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کریں گے۔ اس کا یہ جوش وخروش دیکھ کر میں اور اس کی ماں خوش ہوتے رہتے۔ اب اسکول سے آنے کے بعد شانی سارا دن لائبریری میں بیٹھا ایسے مخیر افراد کا انتظار کرتا رہتا جو لائبریری کے لیے کتابیں عطیہ کرنے کے لیے آئیں گے۔ اسے یقین تھا کہ کتابیں، رسائل اور اخبارات لائبریری کا رخ ضرور کریں گی۔ میں اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اندر سے میں خود ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا۔ میری یہ کیفیت دیکھ کر ایک شناسا نے طنزیہ انداز میں کہا کہ اگر تم ناچ گانے کے کسی فنکشن کے لیے چندے کی اپیل کرتے تو تمھیں ایسی مایوسی نہ ہوتی۔ اسی دوران میں ایک روز میں آفس سے آیا تو میں نے شانی کو لائبریری میں تنہا اور اُداس بیٹھے دیکھا۔ وہ بے چارگی سے خالی الماریوں کو تک رہا تھا۔ اسی لمحے ایک بوڑھا ایک بچے کو ساتھ لیے داخل ہوا دونوں کے چہروں سے معاشی بدحالی صاف ٹپک رہی تھی۔ بوڑھے نے آتے ہی کہا۔

”میرا بیٹا آپ کی لائبریری کے لیے چند کتابیں لایا ہے۔“

☆☆☆☆

طاہرہ مظہر

محبت کا پیمانہ

بہت عرصہ گزرا ایک بادشاہ تھا جس کی تین بیٹیاں تھیں اس نے اپنی تینوں بیٹیوں کو بلایا اور ان سے باری باری پوچھا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہیں، سب سے بڑی لڑکی نے کہا میں آپ سے شکر جتنی محبت کرتی ہوں۔ دوسری نے کہا میں آپ سے شہد جتنی محبت کرتی ہوں۔ سب سے چھوٹی نے کہا میں آپ سے نمک جتنی محبت کرتی ہوں۔ سب سے چھوٹی بیٹی کا جواب سن کر بادشاہ بہت ناراض ہوا اور اسے گھر سے نکال کر جنگل میں بھیج دیا۔

وہ ایک دن جنگل میں اداس گھوم رہی تھی۔ اس کو گھوڑے کی آواز سنائی دی۔ وہ ایک درخت کے کھوکھلے تنے میں چھپ گئی۔ لیکن اس کے کپڑوں کی پھڑپھڑاہٹ سے گھڑسوار کو، جو ایک شہزادہ تھا، اس کا پتہ چل گیا۔ شہزادہ اس سے محبت کرنے لگا اور اس نے اس سے شادی کر لی۔

کچھ عرصے بعد بادشاہ نے، جسے یہ نہیں معلوم تھا، اس کی بیٹی کہاں ہے، اس کے شوہر سے ملنے آیا۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھا تو شہزادی نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ بادشاہ کو جو کھانے پیش کیے جائیں۔ وہ شکر سے بنے ہوں۔ بادشاہ نے ان کھانوں کو محض چکھا یا بالکل نہ کھایا۔ وہ بہت بھوک محسوس کر رہا تھا۔ اس کا کسی ایسی چیز کے لیے دل چاہ رہا تھا جو وہ کھا سکے۔ شہزادی نے اسے نمک سے پکا ہوا سادہ ساگ بھیجا۔ جیسا کہ کسان کھاتے ہیں۔ بادشاہ نے بڑے ذوق وشوق اور مزے لے لے کر کھایا۔ اس کے بعد شہزادی نے اپنا نقاب اتارا اور بادشاہ کے سامنے آ گئی۔ اس نے اپنے باپ سے کہا۔ میں آپ سے نمک جتنا پیار کرتی ہوں۔ میری محبت سیدھی سادی ہے۔ لیکن یہ سچی محبت ہے۔ میں آپ سے معافی کی خواستگار ہوں۔

اس کے بعد بادشاہ کو احساس ہوا کہ اس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ اس نے بیٹی سے صلح کر لی۔ اور سب خوش وخرم رہنے لگے۔

☆☆☆☆

ظفر اقبال

بُھوکی لومڑی اور چالاک کوا

ایک بھوکی لومڑی جنگل میں ماری ماری پھر رہی تھی اور کھانے کے لیے اسے کوئی چیز نہیں مل رہی تھی۔ پہلے اس نے سوچا کہ شہر کا رخ کرے، شاید کھانے کو کچھ ہاتھ آ جائے، لیکن شہر کے خونخوار کتوں کا خیال آتے ہی اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ رفتہ رفتہ بھوک اتنی شدت اختیار کر گئی کہ اس کے لیے چلنا پھرنا بھی مشکل ہو گیا۔ اِدھر اُدھر کوئی جنگلی چوہا بھی نظر نہیں آ رہا تھا جو عام حالات میں جنگل میں دندناتے پھرتے ہیں۔ گھر سے نکلتے وقت ایک گلہری پر اس کی نظر پڑی تھی جسے وہ تھوڑی کوشش کر کے شکار کر سکتی تھی، لیکن کسی بہتر شکار کی امید میں اس نے ارادہ ترک کر دیا، جس پر وہ اب پچھتا رہی تھی، لیکن اب ہاتھ ملنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کیوں کہ اس میں بھوک کی شدت کی وجہ سے ہاتھ ملنے کی سکت بھی نہ رہی تھی۔ اتنے میں اس کی قسمت نے یاوری کی اور اس نے دیکھا کہ ایک درخت کی باہر نکلی ہوئی ٹہنی پر ایک کوا آ کر بیٹھ گیا، جس کی چونچ میں پنیر کا بڑا سا ٹکڑا تھا، جس پر نظر پڑتے ہی شدید بھوک نے ایک بار پھر اس پر حملہ کر دیا اور وہ پنیر کا ٹکڑا ہتھیانے کی تدبیر سوچنے لگی۔ درخت کی ٹہنی اتنی اونچی تھی کہ وہ اچھل کر بھی اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی کہ کوّے کی نظر بچا کر وہ ٹکڑا جھپٹ لے۔ تاہم، اس نے اندازہ لگایا کہ کوّے کو کچھ زیادہ بھوک نہیں لگ رہی تھی اور وہ پنیر کا ٹکڑا کھانے میں کسی جلدبازی کا مظاہرہ نہیں کر رہا تھا۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہوئی کہ شاید یہ نعمت اسی کی قسمت میں لکھی ہو جو کوا اتنے آرام سے بیٹھا تھا اور اسے کھانے سے بے پروا تھا۔ اس کے تھکے ہوئے ذہن میں پنیر کا یہ ٹکڑا ہتھیانے کی بہت سی ترکیبیں آ رہی تھیں لیکن کمزور اور بھوکی ہونے کی وجہ سے وہ انھیں ایک ایک کر کے رد کرتی چلی جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ اس کی نظر پنیر کے ٹکڑے پر بھی جمی ہوئی تھیں۔

جب وہ سوچتے سوچتے بہت بدحال ہو گئی تو اس کے بھوکے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح چمکا جس پر اس نے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس نے کہیں سے سن رکھا تھا کہ جو کام کسی اور طریقے سے نکل نہ سکتا ہو، اسے خوشامد اور چاپلوسی سے نکالا جا سکتا ہے۔ اس نے سوچا کہ یہ حربہ استعمال کرنے سے پنیر کا یہ خوبصورت ٹکڑا اس کے پیٹ کی زینت بن سکتا ہے۔ چنانچہ بھوک کی شدت سے بچی کھچی قوت کو اس نے اپنے اندر جمع کیا

اوراس تجویز کی تفصیلات پر غور کرنا شروع کر دیا جب کہ اس نے دیکھا کہ بیوقوف کوا پنیر کا وہ ٹکڑا کھانے کے بجائے ابھی تک اسے چونچ میں پکڑے بیٹھا ہے۔ چنانچہ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولی:

"پیارے کوے! سنا ہے تم گانا بہت اچھا گاتے ہو۔ میں نے جنگل کے سب جانوروں کے منہ سے تمھارے گانے کی بے حد تعریف سنی ہے کہ ایسا سریلا گانا پورے جنگل میں اور کوئی نہیں گا سکتا بلکہ لکڑ بگڑ تو کہہ رہا تھا کہ شہر کے سارے گویے بھی تمھارے آگے پانی بھرتے ہیں بلکہ بلبلیں، مینائیں اور کوئلیں تو خاص فرمائش کر کے تم سے گانا سننے کے لیے آتی ہیں اور میں شکر کرتی ہوں کہ میرے بھائی کو اللہ میاں نے کیسا سریلا گلا عطا کیا ہے، جس کی سارے جنگل میں دھوم مچی ہوئی ہے، اور، اب تو جنگل اور آس پاس کے کئی پرندے تم سے حسد کرنے لگے ہیں حالاں کہ انھیں اپنی قسمت پر شاکر رہنا چاہیے کہ یہ صرف اللہ تعالٰی کی دین ہے، جس پر وہ مہربان ہوتا ہے، یہ ہنر وہ اسی کو عطا کرتا ہے۔ کیا اپنی بہن کو گانا نہیں سناؤ گے؟"

اس کا خیال تھا کہ کوا خوش ہو کر جوں ہی گانے کے لیے چونچ کھولے گا، پنیر کا ٹکڑا نیچے گر پڑے گا اور اس کی عید ہو جائے گی۔ لیکن کوا چوں کہ خود بھی بہت چالاک واقع ہوا تھا اور اس نے لومڑی کی مکاریوں کی کئی داستانیں پہلے بھی سن رکھی تھیں اور اس کے چکر میں آنے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے پنیر کا ٹکڑا چونچ سے نکال کر پنجے میں دبایا اور بولا۔

"پیاری بہن! کون سا گانا سنوگی؟ کوئی پکا گانا سناؤں یا کوئی فلمی گیت؟"

اس کے بعد لومڑی پر جو گزری اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

سبق: پیارے بچو، اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ لومڑی کتنی بھی چالاک ہو، کوے کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

☆☆☆☆

ظفر اقبال

خرگوش اور کچھوا

کسی خرگوش اور کچھوے کا ایک جگہ ٹاکرا ہو گیا۔ خرگوش کو اپنی تیز رفتاری پر بڑا گھمنڈ تھا چنانچہ وہ اپنی اس خوبی کے قصے سنا سنا کر کافی دیر تک کچھوے کو بور کرتا رہا، اور، ساتھ ساتھ کچھوے کی سست رفتار کا مذاق بھی اڑاتا رہا۔ آخر تنگ آ کر کچھوا بولا:۔

''آؤ مجھ سے دوڑ لگا کر دیکھ لو!''

خرگوش یہ سن کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اتنے میں کچھ اور جانور بھی جمع ہو گئے، جن کے سامنے خرگوش کچھوے کا ٹھٹھا اڑاتا رہا کہ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ، یہ مجھ سے دوڑ لگانے چلا ہے! جانوروں نے بھی کچھوے کو بہت سمجھایا کہ جانے دو، تم خرگوش کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہو جب کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کے مقابلے میں دوڑ نہیں سکتا، ماسوائے ہرن کے۔ لیکن کچھوا برابر اپنی ضد پر اڑا رہا اور چیلنج کیا کہ میں خرگوش کا گھمنڈ توڑ کر رہوں گا۔ یہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔

چنانچہ جب دوسرے جانور اِدھر اُدھر ہو گئے تو خرگوش نے اس سے آخری بار کہا کہ تم کس انہونی کے پیچھے پڑے ہوئے ہو، تمھارا دماغ تو صحیح ہے نا، جس پر کچھوا بولا:۔

''میرا دماغ تو صحیح ہے، تم اپنے دماغ کا کچھ علاج کراؤ، جسے غرور نے اتنا خراب کر دیا ہے۔'' تاہم، خرگوش نے اسے کہا کہ ''آخری بار سوچ لو۔ جس پر کچھوا بولا کہ ''میں نے سوچ لیا ہے تم دوڑنے کی تیاری کرو۔'' یہ سن کر خرگوش نے دل ہی دل میں ایک اور قہقہہ لگایا اور کہا کہ ''بتاؤ کیا شرط لگاتے ہوئے؟'' کچھوے نے کہا:

۔

''میری کچھوی نے دس انڈے دیئے ہیں، اگر تم جیت گئے تو سب کے سب تمھارے اور یہ انڈے ایسے ہیں کہ شہر کی بیکریوں میں عام استعمال ہونے لگے ہیں۔ کبھی کھا کر دیکھو تو پچھلا کھانا پیا سب بھول جاؤ گے اور اگر میں جیت جاؤں تو تمھاری کیا سزا ہے؟''

''میں باقی سارے جانوروں کے سامنے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے تم سے معافی مانگ لوں گا اور

آئندہ کسی کے سامنے کوئی بڑک نہیں ہانکوں گا۔"

خرگوش نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے" کچھوا بولا۔ "یہ بتاؤ کہ دوڑ کہاں تک ہے؟"

"یہاں سے نہر کے کنارے پہنچنا ہے جو یہاں سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہی سڑک سیدھی وہاں تک جاتی ہے" خرگوش نے جواب دیا۔

چنانچہ دوڑ شروع ہوگئی۔ کچھوے نے اپنی رفتار سے آہستہ آہستہ رینگنا شروع کر دیا اور خرگوش بھی ٹہلتا ہوا چل پڑا کہ بھاگ بھاگ کر ہلکان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی کچھوا تھوڑی دور ہی گیا ہوگا کہ ایک خالی رکشہ پیچھے سے آ کر رکا اور رکشے والے نے کچھوے سے پوچھا:

"کہاں جانا ہے؟"

"او وہ ذرا نہر تک" کچھوا بولا۔

چنانچہ رکشے والے نے اسے بٹھا لیا اور فراٹے بھرتا ہوا آن کی آن میں نہر کے کنارے پہنچ گیا جب کہ ٹہلتا ہوا خرگوش کہیں راستے ہی میں رہ گیا تھا۔ کافی دیر بعد جب خرگوش نہر پر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران اور پریشان ہوا کہ کچھوا اس سے پہلے ہی منزلِ مقصود پر پہنچا ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر کچھوا بولا،

"کہاں گئی تمھاری تیز رفتاری؟ بڑی ہانکیں مار رہے تھے!"

اس پر خرگوش نے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگی اور آئندہ اس قسم کی شرط لگانے سے توبہ کی۔

سبق: اس کہانی سے 'پیارے بچو' یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ بڑا بول کچھوے کے سامنے بھی نہیں بولنا چاہیے۔ بے شک آپ خرگوش ہی کیوں نہ ہوں۔

☆☆☆☆

عذرا اصغر

غرور کا سر نیچا

بہار دنیا میں مہمان آئی ہوئی تھی اور اس خوشی میں وہ پھولوں کے لیے بہت اچھے اچھے تحفے لائی تھی۔ رنگ برنگے کپڑے تھے۔ ہرے، اودے، پیلے، سرخ، نیلے، گلابی، لال، بسنتی۔ غرض پھولوں نے بہار کا لایا ہوا رنگ برنگ لباس پہن لیا تھا اور پیار کی آمد کی خوشی میں انھوں نے میلہ لگایا تھا۔ باغوں میں، گھروں کے بڑے بڑے لانوں میں، آنگنوں میں بنی ہوئی کیاریوں میں، ہر جگہ بس پھول مسکرا رہے تھے۔ آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ وہ سب دوست تھے۔ بے تکلف اور پیار کرنے والے۔ اور اب بہار ان کے گھر مہمان آئی ہوئی تھی پھر بھلا وہ خوش کیوں نہ ہوتے؟ مہمان اور وہ بھی بہار جیسا۔ اتنا اچھا اور خوبصورت پھول بہت خوش تھے اور مسرت سے جھومتے تھے۔ گیت گاتے تھے۔ موسم بھی بہت ہی اچھا تھا۔ آسمان دھلا دھلا لگ رہا تھا۔ سفید سفید بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے شرارت سے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے پھر رہے تھے۔ جیسے وہ آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔ درختوں نے بھی سبز رنگ کے نئے کپڑے پہن لیے تھے۔ اور فخر اور خوشی سے سر اٹھائے جھوم رہے تھے۔ موسم ایک دم بے حد حسین ہو گیا تھا۔

خوبصورتی خانم کا دعویٰ تھا کہ:

"یہ سب رنگ میں نے بکھیرے ہیں اور دنیا میں صرف میری وجہ سے ہی رونق ہے۔ پھولوں کا کہنا تھا کہ اگر ہم نہ ہوتے تو بھی خوبصورتی خانم منہ دیکھتی رہ جاتیں۔ یہ تمام رونق اور تازگی تو بس ہماری وجہ سے ہے۔ ہم دنیا میں رنگ بکھیرتے ہیں اور خوشبوئیں پھیلاتے ہیں۔ ہم نہ ہوتے تو دنیا میں گندگی اور بدبوئیں ہوتیں۔ بچے ہمیں دیکھ کر مسرور ہوتے ہیں اور بڑے لوگ ہمیں دیکھ کر کھل اٹھتے ہیں۔ مرد ہمیں کوٹ کے کالر میں سجاتے ہیں اور عورتیں ہمیں اپنے جوڑے میں ٹانک کر اپنی زینت کرتی ہیں۔ اپنے گھر کے کمروں میں سجاتی ہیں۔"

بس بھیا پھر کیا تھا۔ خوبصورتی کو تو پھولوں کی بات سن کے غصہ آ گیا۔ بولی:۔

"اگر میں نہ ہوتی تو تم کچھ بھی نہ ہوتے۔ میں ہی تو ہوں جو تمھارے اندر حسن پیدا کرتی ہوں۔ تمھیں دلکش بناتی ہوں کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ تم بہت نادان ہو کہ میرا احسان ماننے کی بجائے غرور سے

بات کرتے ہو۔ ''

پھولوں نے کہا:۔

''بھئی ہم تو ہرگز بھی مغرور نہیں ہیں بلکہ ہم تو اللہ کے شکرگزار ہیں جس نے ہمیں ایسی زیب و زینت بخشی ہے اور اتنے پیارے پیارے رنگ عطا کیے ہیں۔ مغرور تو تم ہو کہ اپنے حسن پر اتراتی پھرتی ہو۔ ''

غرض بھئی ہوا یہ کہ خوبصورتی خانم اور پھولوں کے بیچ جھگڑا بڑھتا گیا۔۔۔ اور یہ تو ہوتا ہی ہے نا کہ جب دو لوگ آپس میں لڑ رہے ہوں تو پھر جو کوئی عقل مند ہوتا ہے یا بڑا ہوتا ہے، لڑنے والوں کا جھگڑا ختم کرا دیتا ہے۔ سو ایسا ہی ہوا۔ جب خوبصورتی خانم اور پھول لڑ لڑ کر ہلکان ہو گئے اور تھک کر چور چور ہو گئے تو بہار نے دونوں کو خوب ڈانٹ پلائی اور بولی:۔

''تم سب نہایت بیوقوف ہو اور ایک بے حد احمقانہ بات پر جھگڑ رہے ہو۔ نادانوں! کیا تم نہیں جانتے کہ مہمان اللہ کی رحمت ہوتا ہے اور جہاں کہیں اللہ کی رحمت ہو وہاں رونق نہیں ہو گی تو اور کیا ہو گا؟۔ دیکھو آج کل میں تمھارے ہاں مہمان بھیجی گئی ہوں اس لیے یہ ساری رونق ہے، خوشی ہے۔ بہار کی بات سن کر پھول شرما کر چپ ہو گئے وہ جانتے تھے کہ بہار ان سے بڑی ہے۔ انھیں وہی تو کھلنا سکھاتی ہے۔ جب وہ آتی ہے تو ان کے لیے اچھے اچھے رنگوں کے کپڑے لاتی ہے۔ خوشگوار ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کو اپنے ساتھ لاتی ہے جو پھولوں کو گدگدیاں کرتی ہیں تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ لہٰذا پھول تو بہار کی بات سن کر چپ ہو گئے مگر خوبصورتی خانم کو حسب عادت بڑا غصہ آیا۔ بظاہر تو وہ بھی چپ ہو گئی مگر دل ہی دل میں غصے سے کھولتی رہی۔ آخر کار جب رات کا اندھیرا پھیل گیا اور پھول، درختوں اور پودوں کی شاخوں پر اپنی ننھی ننھی گردنیں ٹکا کے سو گئے تو خوبصورتی خانم کو موقعہ مل گیا اور وہ سیدھی آسمان پر جا پہنچی۔ ''

نیلے شفاف آسمان پر اس وقت ستاروں کی محفل سجی تھی اور وہ سب آپس میں خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ کچھ کھیل رہے تھے، کچھ ہنس رہے تھے اور کچھ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ آسمان پر اتنی رونق تھی کہ خوبصورتی خانم ششدرہ گئیں۔ تاروں کے بیچوں بیچ چاند کی بڑی سی قندیل چمک رہی تھی اور اس کی وجہ سے آسمان اتنا سجا ہوا تھا کہ ایک دفعہ تو خوبصورتی خانم کے بھی قدم لڑکھڑا گئے۔ مگر وہ بے حد خودسر اور مغرور تھی۔ بھلا کب ٹلنے والی تھی۔ اپنی شکست ماننا تو اسے آتا ہی نہیں تھا۔ اس نے غرور سے سوچا:۔

''ارے یہ سب تو میری وجہ سے ہوا ہے۔ میری وجہ سے ہی یہاں اچانک اتنا حسن پیدا ہو گیا ہے۔ میں

نہ آتی تو چاند تارے سب پھیکے پھیکے نظر آتے۔ پیلا پیلا چاند۔ یرقان زدہ......فضول، بیکار۔ یہ بھی کوئی رنگ ہوا بھلا؟ اور یہ سفید، پھٹک تارے۔ نہ رنگ نہ روپ۔ میں نہ آتی تو کیسے خراب لگتے۔ قطعی فضول۔ بیکار۔''

تو بھئی! اللہ میاں کو خوبصورتی خانم کی یہ بات بہت ہی بری لگی۔ وہ تو دلوں کا حال جاننے والا ہے نا۔؟ اس نے خوبصورتی خانم کو ڈانٹا۔ اس نے کہا:۔

''یہ تم کس بات پہ ناز کرتی ہو اور اکڑی اکڑی پھرتی ہو۔ تمھاری حیثیت ہی کیا ہے۔ ذرا سی تو تمھاری زندگی ہے اور حقیری سی تم چیز ہو۔ اس پہ اتنی اکڑ اور اتنا غرور۔؟''

اب بھئی! خوبصورتی خانم کے تو یہ سن کر چھکے چھوٹ گئے اور وہ زار و قطار رونے لگیں۔ پھر اللہ میاں کے آگے گڑگڑانے لگیں۔

''اے کائنات کے مالک! مجھے ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی عطا کر دے۔ میں کبھی فنا نہ ہوں۔ مجھے معاف کر دے میرے رب۔''

اسے معافی تو خیر مل گئی۔ مگر صاحب! اللہ میاں نے اپنا فیصلہ واپس نہ لیا اور خوبصورتی خانم کو خوب خوب سرزنش ہوئی۔ اللہ میاں اور خوبصورتی خانم کی یہ باتیں چاند نے چھپ کر سن لیں۔ اب تو جناب چاند صاحب کے پیٹ میں مارے درد کے بل پڑنے لگے۔ انھیں اصل میں چغل خوری کی بری عادت تھی۔ انھوں نے اپنے بہت نزدیکی دوست ستارے مریخ کو یہ گفتگو سنا دی۔ مریخ ستارا پہلے تو بہت حیران ہوا پھر اداس ہو گیا کیوں کہ اسے بھی خوبصورتی خانم بہت پسند تھیں۔ پھر وہ بھاگا بھاگا شبنم کے پاس پہنچا اور سارا قصہ اس کو سنا ڈالا۔ شبنم پھولوں کی بہت ہی گہری دوست تھی۔ اس نے جب یہ قصہ سنا تو لپک جھپک کرتی پھولوں کے پاس پہنچی اور آنسو بہا بہا کے یہ بات بتائی اب تو جناب پھولوں کا رو رو کر برا حال ہو گیا۔ بہار کو ان کی اس حالت پر بہت تشویش ہوئی۔ اس نے پھولوں سے پوچھا:۔

''اے معصوم اور پیارے ساتھیو! کیا ہوا۔ تم اتنے غمگین کیوں ہو۔؟''

پھولوں نے سسکیاں بھر بھر کر تمام واقعہ بہار کو سنا ڈالا۔ وہ بچاری بھی سخت پریشان ہوئی اور اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اس نے شفقت سے پھولوں کے سر پہ ہاتھ رکھا اور بہت تسلی دی۔ پھر وہ کہنے لگی:

''یہ خوبصورتی خانم کتنی بیوقوف نکلی۔ اپنے غرور کے پیچھے اس نے ہم سب کو دکھی کر دیا ہے لیکن خیر! تم اداس نہ ہو۔ اب بہت دن ہو گئے ہیں۔ میں چلتی ہوں کہ میرا دل بھی سخت غمگین ہو گیا ہے۔ میں پھر جلد ہی

آؤں گی اور تمھارے لیے اچھے اچھے رنگوں کے کپڑے بھی اپنے ساتھ لاؤں گی۔“

بہار خوب روئی اور پھر سسکیاں لیتی ہوئی پھولوں سے جدا ہو گئی۔ پھول اتنے غمزدہ ہوئے کہ ڈالیوں سے جھڑ گئے اور درختوں کی شاخیں لنج منج رہ گئیں۔ اب خوبصورتی خانم ایک کونے میں اکیلی بیٹھی رو رہی تھیں۔

اللہ میاں! میری توبہ۔ میں نے غرور کیا۔ بہار سے لڑی۔ پھولوں سے جھگڑی۔ مگر اللہ میاں مجھ پر رحم کر اور ہماری سب کی بہار رانی کو پھر سے ہمارے پاس بھیج دے کہ ہم سب دوست ہیں۔“ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ دوستوں کی طرح مل جُل کر رہوں گی ہم دنیا سے جائیں گے تو ایک ساتھ اور آئیں گے تو ایک ساتھ۔“

تو بھئی! چاند کو بھی اس کی چغل خوری کی یہ سزا ملی کہ اللہ تعالی نے اس کے حسین چہرے پر سیاہ دھبے ڈال دیئے۔ اور تب سے چاند نے بھی اپنی چغل خوری کی بری عادت چھوڑ دی۔ اللہ نے اسے معاف کر دیا۔ اور اسے روشنی پھیلاتے رہنے کی تاکید کر دی۔ ادھر خوبصورتی خانم کی بھی توبہ قبول ہو گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ اس کا وجود بہار، پھول، چاند، تارے سبھی کی وجہ سے ہے۔ ورنہ اس اکیلی کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔ کچھ بھی حقیقت نہیں۔ اب وہ سب مل جل کر رہتے ہیں اور خوش ہیں۔۔۔۔!

☆☆☆☆

عزیز صدیقی

آخری قربانی

بہت عرصہ ہوا ایک چھوٹا ملک تھا جس پر دو آدمی حکومت کرتے تھے۔ ایک تو بادشاہ تھا جو بہت بہادر اور رحمدل تھا۔ وہ درمیانی عمر کا تھا۔ دوسرا شخص بڑا پجاری تھا۔ اس کی سفید لمبی داڑھی تھی اور وہ شکل سے سخت گیر نظر آتا تھا۔ جیسے کہ عام طور پر بڑے پجاری ہوتے ہیں۔ اس ملک میں ایک پہاڑی پر ایک مندر تھا۔ مندر کے اندر کالے پتھر سے بنا ہوا دیوی کا مجسمہ تھا۔ بظاہر یہ دیوی اس وقت خوش ہوتی تھی، جب اس کے نام کی قربانیاں دی جاتی تھیں اور جتنی زیادہ قربانیاں دی جاتی تھیں وہ اتنا ہی زیادہ انھیں پسند کرتی تھی۔ جب کوئی مرد یا عورت اپنی خواہش یا آرزو پوری کروانا چاہتا تو دستور کے مطابق وہ ایک بکری یا بھیڑ مندر لے جاتا اور مندر کی سیڑھیاں اس جانور کے خون سے دھوتا۔ اگر خواہش فوری اور ضروری نوعیت کی ہوتی تو زیادہ جانور لے جائے جاتے۔ ایسا شاذونادر ہی ہوتا تھا۔ کہ منت ماننے والا اتنا کچھ کرے جس سے دیوی پوری طرح خوش ہو۔ پھر ایسا ہوا کہ اس ملک کی ملکہ کے کوئی بچہ نہیں تھا اور اس نے مندر کی سیڑھیاں دھونے میں ملک کے آدھے جانور ختم کر دیئے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دیوی کے لیے اس سے پوری طرح خوش نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں رہنے دے گی۔ اس نے قربانی دینے کے لیے ۲۰۰ بکریاں اور ۳۰۰ بھیڑیں پکڑانے کا حکم دیا۔

یہ تقریب بادشاہ اور ملکہ کے سامنے منعقد ہو رہی تھی کہ ایک خوبصورت بھکاری لڑکی دیوانہ وار دوڑتی ہوئی آئی۔ اس نے چیخ کر کہا کہ تم نے میری چھوٹی سی بکری کو مار دیا ہے۔ تم نے ایسا ظلم کیوں کیا ہے۔ اب میں اس کے بغیر کیا کروں گی۔ پجاری نے سختی سے کہا بھاگ جاؤ یہاں سے بے وقوف لڑکی کیا تم نہیں جانتیں کہ تمھاری بکری ہماری ماں دیوی کے پاس چلی گئی ہے۔ بھکاری لڑکی نے جسے کسی طرح قرار نہیں آ رہا تھا۔ کہا، لیکن میرا کیا ہوگا۔ میں اس کی ماں تھی۔ میں اپنے ہاتھ سے اس کو چارہ کھلاتی تھی اور نہلاتی تھی۔ دیوی ماں کس طرح ایک ماں کو اس کو بچے سے محروم کر سکتی ہے۔ بادشاہ ان باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے کہا میری سمجھ میں خود نہیں آتا کہ دیوی جو زندگی دیتی ہے وہ زندگی لے کر کس طرح خوش ہو سکتی ہے۔ وہ لوگوں میں خوشی پھیلانے کی بجائے کس طرح غم اور تکلیف دے سکتی ہے۔ آج سے میرا حکم ہے کہ اب میرے ملک میں خون نہیں بہایا جائے گا۔

ہر شخص اس اعلان سے حیران رہ گیا۔ لیکن پجاری نے کہا بادشاہ کس طرح دیوتاؤں کے معاملات میں دخل دے سکتا ہے ۔ وہ دیوی ماں کے لیے کی جانے والی قربانیاں کس طرح بند کرسکتا ہے ۔ بلاشبہ جلد ہی اس پر دیوتاؤں کا قہر ٹوٹے گا۔ لوگوں نے جو اپنے عقائد کے عادی ہونے پر چکے تھے۔ سوچا کہ بادشاہ نے محض ترنگ میں آکر یہ قدم اٹھایا ہے لیکن اپنے حکم پر عمل درآمد نہیں کرے گا۔ لیکن اگلے دن ان کی امید غلط ثابت ہوئی ۔ بہت سارے سپاہی مندر پہنچ گئے تا کہ اس بات کا خیال رکھیں کہ اب وہاں قربانیاں نہ دی جائیں ۔

پجاری نے جب یہ دیکھا کہ دیوتا بادشاہ کو سزا دینے میں دیر لگا رہے ہیں، اس نے کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سپہ سالار کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ تمھارا میرے بارے میں کیا خیال ہے! اس نے جواب دیا کہ آپ ہمارے روحانی باپ ہیں، آپ دیوتاؤں کی آواز ہیں ۔ دیوتا میرے خواب میں آئے ہیں اور کہا ہے کہ بادشاہ کا خون چاہتے ہیں ۔ میں نے یہ ذمہ داری تمھیں سونپنے کا فیصلہ کیا ہے ۔

سپہ سالار حیران رہ گیا ۔ اس نے کہا لیکن میرا فرض تو بادشاہ کو تمام خطرات سے محفوظ رکھنا ہے ۔ اسے بتایا گیا کہ دیوتاؤں کی جانب اس کا فرض پہلے آتا ہے ۔

سپہ سالار نے وہ رات بڑی بے چینی میں گزاری اور اگلے دن دیوتاؤں کی خواہش پوری کرنے کے لیے دربار میں گیا۔ لیکن بادشاہ کے سامنے پہنچ کر اس کی بادشاہ کے لیے وفاداری اس پر غالب آنے لگی ۔ اس نے بڑی ہمت کرکے یہ کہا کہ اس کے سپاہی مندر کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتے ۔ بادشاہ نے کہا لیکن میں نے تو اس کے لیے تمھیں حکم دیا ہے ۔ سپہ سالار نے کہا کہ حضور میں آپ کا وفادار ملازم ہوں لیکن دیوتاؤں کی جانب بھی مری ذمہ داری ہے ۔ پھر تم اپنی تلوار اپنے نائب کے حوالے کردو ۔ آپ کے آبا واجداد نے یہ تلوار میرے آبا واجداد کے حوالے کی تھی میں یہ تلوار صرف آپ کے حوالے کرسکتا ہوں ۔ یہ کہہ کر سپہ سالار نے بادشاہ کے قدموں میں تلوار رکھ دی اور چلا گیا ۔

اس کے بعد پجاری نے بادشاہ کے بھائی کو بلایا اور اس سے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تم جلد ہی بادشاہ بن جاؤ گے ۔ بادشاہ کے بھائی نے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے ۔ جب کہ ہمارا بادشاہ زندہ ہے ۔ وہ زندہ نہیں رہے گا ۔ دیوتا اس کا خون چاہتے ہیں ۔ اور یہ کام تمھارے سپرد کیا جاتا ہے ۔ وہ بھی یہ بات سن کر حیران رہ گیا ۔ اب اس کے اندر بادشاہ یعنی اس کے بھائی کے لیے اس کی محبت میں اور دیوتا کے حکم کے درمیان ایک کشمکش شروع ہوئی ۔ اس نے پجاری سے کچھ مہلت طلب کی وقت گزرنے کے ساتھ پجاری بہت بے قرار اور

بے چین ہو گیا۔ اس نے بالآخر اپنے بیٹے کو بلایا اور یہ کام اس کے سپرد کیا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا۔ کہ خوبصورتی اور مسرت سے بھری ہوئی اس دنیا میں ایک شخص کو دوسرے شخص کو مارنے کی لیے کیوں کہا جائے۔ دوسری جانب ایک فرماں بردار بیٹے اور دیوتاؤں کے ایک عقیدت مند کی حیثیت میں دونوں لحاظ سے اس کا ایک فرض بھی تھا۔ اسے حکم دیا گیا تھا یہ کام فوراً سرانجام دینا ہے۔ اسے اُس رات جانا اور بادشاہ کے خون سے بھرا ہوا پیالہ دیوی کے پاس لانا تھا۔ وہ یہ حکم بجا لانے کے لیے بدحواسی کے عالم میں روانہ ہوا اور ایک گھنٹے کے بعد واپس آیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا اور وہ وحشت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ پجاری نے پوچھا کہ کیا تم بادشاہ کا خون لائے ہو۔ ہاں اس کے بیٹے نے جواب دیا۔ میرے آبا و اجداد بادشاہ تھے اور میری رگوں میں بھی شاہی خون دوڑ رہا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے سینے میں خنجر گھونپ لیا اور اپنا جسم دیوی ماں کے قدموں پر گرا دیا۔

پجاری کی جو حالت ہوئی وہ نا قابلِ بیان ہے۔ اس نے لڑکے کو اپنے بازؤں میں لیا اور رونے لگا کہ اس نے یہ کیا کیا ہے۔ دیوی ماں نے یہ آخری قربانی قبول کر لی تھی۔ اس کا باپ غم سے دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس نے زور زور سے سانس لینا شروع کیا اور بالآخر اس اونچی جگہ سے گر کر لڑھکتا ہوا قربانی کی سیڑھیوں پر آ گیا۔ اس سے ہر طرف ہلچل مچ گئی اور لوگ اپنے گھروں سے نکل کر مندر میں آ گئے۔ انھیں اپنی دیوی کا بچا کھچا حصہ نظر آیا اور نیچے وادی میں ایک چلتا ہوا دھبہ سا نظر آیا۔ پجاری تھا جو اپنے بیٹے کی لاش لے کر جا رہا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد کسی نے بادشاہ سے پوچھا کہ دیوی ماں کہاں ہے۔ اس نے کہا کہ اب وہ میرے عوام کے دلوں میں رہتی ہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر عطش درانی

پتھروں میں سیب

اسلام آباد سے آئے ہوئے مہمانوں کو لے کر ہم باجی گُل کے گھر پہنچے۔ ان کا گھر کوئٹہ سے زیارت کی طرف جاتے ہوئے ایک مشہور قصبے زندرہ میں ہے۔ داخل ہوتے ہی تمام گھر والوں میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ ہمیں مہمانوں کے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ کمرہ قالینوں، غالیچوں اور گویلوں سے سجایا گیا تھا۔ دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ ہم تکیوں کے سہارے ان قالینوں پر بیٹھ گئے۔ اس علاقے میں زمینی نشست زیادہ پسند کی جاتی ہے۔

حال احوال کے بعد باجی گل کی بیٹی ٹرے میں چائے، بسکٹ اور خشک میوے جن میں بادام، پستہ اور کشمش شامل تھے، لے کر آئی۔ چائے پیالیوں میں ڈال کر پیش کی گئی۔ سب نے خشک میوؤں اور خوش بودار چائے کا لطف اٹھایا۔ مہمانوں نے چائے پی تو میزبان نے ان کی پیالیوں میں اور چائے انڈیل دی۔ اب مہمان حیران تھے کہ اتنی چائے کیسے پئیں۔ ہم نے چپکے سے موقع پا کر ان سے کہا ”اپنی پیالیوں کو جب تک آپ الٹا کر کے نہیں رکھیں گے، میزبان آپ کی پیالی میں چائے ڈالتے رہیں گے۔ یہ رسم ترکستان، چین اور جاپان میں بھی اسی طرح ملتی ہے“۔

گھر کے لوگوں کے خوب صورت لباس مہمان خواتین کو بہت پسند آئے۔ بڑے بڑے گھیر دار فراک جن پر رنگین دھاگوں اور شیشوں سے کشیدہ کاری کی ہوئی تھی۔ دوپٹوں کے کناروں پر بھی وہی کام تھا۔

ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک خاتون آئیں۔ انھوں نے دسترخوان بچھایا۔ پھر باہر گئیں اور سلوچی، بدنی جسے ظروف بھی کہا جاتا ہے، ساتھ لے کر آئیں۔ ان کے دوسرے ہاتھ میں تولیہ تھا۔ انھوں نے باری باری سب کے ہاتھ خود دھلوائے۔ یہ بھی مہمانوں کی عزت کرنے کا ایک انداز ہے۔

یہاں کے لوگ مال مویشی بہت عزیز رکھتے ہیں۔ مگر مہمانوں کی آمد ہو اور دنبہ ذبح نہ ہو، یہ ناممکن ہے۔ کچھ دیر بعد دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے چن دیے گئے۔ گوشت، پلاؤ، سجی، تلے ہوئے آلو، بینگن، بھنڈی، دہی، سلاد، اچار چٹنی اور لاندی وغیرہ۔ لاندی ایک طرح کا خشک گوشت ہوتا ہے۔ اسے سخت سردیوں میں بنایا جاتا ہے۔ دنبے کو ذبح کر کے اس کی ہڈیاں نکال دی جاتی ہیں، پھر نمک اور ہینگ لگا کر گوشت کے

ٹکڑے کر لیے جاتے ہیں۔ انھیں سوتی رسی میں پرو کر اور ہوادار کمروں میں رکھ کر سکھایا جاتا ہے۔ اب یہ لاندی پورا سال استعمال ہو سکتی ہے۔ یہ خاص مہمانوں کے لیے پکائی جاتی ہے۔ ان سب کھانوں کے ساتھ روغنی نان اور پتلی پتلی چپاتیاں بھی تھیں۔ پینے کے لیے پانی کے علاوہ پتلی لسی تھی جو سوکھے دہی، کردیا خرد، سے بنائی جاتی ہے اور بڑی ہاضم ہوتی ہے۔

جب تمام کھانے دسترخواں پر سجا دیے گئے تو میزبان ''نوشِ جان'' کہ کر کمرے سے نکل گئے۔ یہاں یہ رواج عام ہے کہ میزبان کھانا رکھ کر کمرے سے نکل جاتا ہے تا کہ مہمان بے تکلف ہو کر کھانا کھائے اور میزبان کے سامنے کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرے۔

مہمان مزے دار کھانے سے لطف اندوز ہوئے۔ کھانے کے بعد سب کے ہاتھ کمرے ہی میں کمال توجہ سے دھلوائے گئے۔ کھانے کے بعد سبز چائے لائی گئی جسے یہاں کی زبان میں سلیمانی کہتے ہیں اور اسے الائچی اور دارچینی ڈال کر اور دم دے کر تیار کیا جاتا ہے۔ چینی کے بجائے مصری کی ڈلی کے ساتھ پی جاتی ہے۔ چائے کے بعد گھر سے ملحقہ پرانے باغ کی سیر کروائی گئی۔ وہاں اس باغ کے تازہ سیبوں سے بھی تواضع کی گئی۔

ہم نے واپسی کی اجازت چاہی تو باجی گل سب مہمانوں کے لیے مختلف تحائف لے آئیں۔ جن میں لونگ، الائچی اور موتیوں کے بنے ہوئے ہار، کشیدہ کیے ہوئے رنگین شیشوں والے گلے، خوب صورت رنگین اونی پراندے، سیبوں کا کریٹ اور کچھ بادام وغیرہ شامل تھے۔ انھوں نے اس قدر محبت سے یہ چیزیں پیش کیں کہ انکار کی گنجائش ہی نہ رہی۔

زندرہ میں ہم جس گھر کے مہمان تھے، وہ اس علاقے کے باغوں کے سب سے بڑے خاندان کا گھر تھا۔ یہاں دور دور تک سیبوں اور خوبانیوں کے سرسبز باغات ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ سوائے پتھروں کے اس علاقے میں کچھ نہ ہوتا تھا۔ پتھروں کے بیچ میں بس ایک ندی بہتی تھی۔ پھر ایک غریب مگر محنتی شخص نے ہمت سے کام لیا۔ اس نے ایک ایک جھولی مٹی کی بھر کر پتھروں پر جمائی۔ سخت محنت اور مشقت کے بعد پھلوں کے خوب صورت باغ اگائے۔ آج ان کے پوتے پوتیاں ایک وسیع علاقے میں باغات کے مالک ہیں اور یہاں کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہم ایسے ہی ایک عظیم شخص کے گھرانے کے مہمان تھے جس کی محنتوں کا ثمر آج اس کی اگلی نسلیں کھا رہی تھیں۔

اس غریب مگر محنتی شخص کا نام حاجی پاپو خان تھا۔ وہ پائنیزئی قبیلے کا ایک عام سا فرد تھا۔ اپنا رزق حاصل کرنے کے لیے اسے سخت محنت کرنا پڑتی تھی۔ زندہ رہ میں ہر طرف پتھر ہی پتھر تھے۔ وہ کبھی پتھر کوٹنے کا کام کرتا اور کبھی

مزدوری کے اور ذرائع ڈھونڈتا۔ کئی بار فاقوں تک نوبت بھی آجاتی۔ بازار میں سرخ سرخ سیب اور خوبانیاں دیکھ کر اس کے جی میں بھی آتا کہ کبھی اس کی زبان بھی ان کی لذت کو چکھے مگر افسوس کہ اس کے پاس پھل کریدنے کے لیے پیسے نہ ہوتے اور اس علاقے میں کوئی ایسا پھل دار درخت بھی نہ تھا کہ اسی سے کچھ توڑ لیتا۔

ایک روز اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ کب تک ان خواہشوں اور آرزوؤں پر سسکتا رہے گا۔ کیوں نہ وہ خود ہی سیب کا درخت اگائے اور اس کا پھل کھائے۔ مگر کیسے؟ ان پتھروں پر مٹی نام کی تو کوئی چیز نہیں تھی۔ درخت تو مٹی میں اگتا ہے۔ لیکن اس نے ٹھان لی کہ وہ ان پتھروں میں درخت اگا کر ہی دم لے گا۔

ایک روز اس نے اپنا مزدوری کا تیشہ ہاتھ میں لیا اور پہاڑ کے دامن میں چڑھنے لگا۔ کچھ اوپر سے اس نے کدائی شروع کی۔ سخت محنت کے بعد ایک جھولی بھر مٹی اس کے ہاتھ لگی اور اس نے اسی کو غنیمت جانا۔ نیچے اترا اور ندی کے قریب پتھروں کے ایک وسیع علاقے پر ایک طرف جا کر ان پتھروں پر مٹی ڈال دی۔ ہاتھوں سے اسے جمانے کے بعد وہ پھر دامن کوہ کی طرف بڑھا۔

آہستہ آہستہ اس نے ایک بہت بڑی رقبے پر مٹی جما دی۔ کئی ماہ کی دن رات کی محنت رنگ لائی اور ایک خاصا بڑا قطعہ زمین ہموار ہو گیا جس پر پودے اگائے جا سکتے تھے۔

پاپو خان جواں ہمت تھا، مستقل مزاج تھا، بلند حوصلہ تھا اور یہ کہ اب نوجوانوں کا راہ نما تھا۔ لوگ اس کی محنت کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے اپنی بنائی ہوئی زمین کے گرد پتھر جڑ کر دیوار بنائی اور اس زمین میں سیب کے پودے لگانے شروع کیے۔ پانی دینے کے لیے ندی کے اوپر سے چھوٹی چھوٹی نالیاں بنا کر وہاں تک لایا اور چند سال کی محنت سے وہاں ایک لہلہاتا اور سرسبز باغ کھڑا کر دیا۔ وہ پرانا باغ آج موجود ہے۔ اس باغ کے سیب محنت کا مزہ لیے ہوئے ہیں، اس لیے بے حد لذیذ ہیں۔ یہ سیب اپنی لذت کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور رہیں اور آج ہم اسی باغ کی سیر کر رہے تھے۔

حاجی پاپو خان پانیزئی نے اپنے مقامی لوگوں کو ایک راستہ دکھا دیا۔ غربت نے اس علاقے میں جو ڈیرہ جما رکھا تھا، اس کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ اس کی دیکھا دیکھی بہت سے اور لوگوں نے بھی کوشش شروع کر دی۔ ان میں سے کئی لوگوں نے باغات اگائے۔ اب زندہ رہ باغوں کا شہر کہلانے لگا۔ اس عظیم شخص کی محنت رنگ لائی۔ اب یہاں، اسکول، ہسپتال، ڈاک خانہ، بجلی، ٹیلی فون، تار گھر، سڑکیں، اڈہ غرض یہ کہ ہر سہولت موجود ہے۔ حاجی پاپو خان تو آج ہم میں موجود نہیں، لیکن ان کا نام زندہ ہے۔ یہ نام زندہ رہ کے لوگوں کے لیے عزم و ہمت اور محنت کا نشان ہے۔ یہ اس راہ پر چلنے والوں کے لیے ایک سنگ میل ہے۔

پروفیسر عنایت علی خان

درختوں نے کہا

گرمیوں کی ایک دوپہر تھی۔ گاؤں کی فضا خاموش تھی۔ ایسے میں ایک بچہ ہاتھ میں کتاب لیے اپنے مکان سے نکلا اور قریب کے ایک باغ میں ایک گھنے درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنا سبق یاد کرنے لگا۔ ذرا سستی آئی تو درخت کے تنے سے پشت لگائی۔ باغ میں چاروں طرف درخت کھڑے تھے۔ وہ اپنے دل میں سوچنے لگا کہ یہ درخت بھی عجیب چیز ہیں، صبح سے شام تک بس آرام سے اپنی جگہ کھڑے رہتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں، میں بہت کام کرتا ہوں۔ کھیتی باڑی کا کام، سکول کا کا، گھر کا کام، غرض صبح سے شام تک کام ہی کام۔ ابھی وہ اپنے کام ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ باغ کی خوشگوار اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے اسے نیند آ گئی۔ درخت اب بھی اس کے سامنے تھے۔ اس نے دیکھا کہ درختوں نے بولنا شروع کر دیا۔

وہ جس درخت کے نیچے لیٹا ہوا تھا سب سے پہلے اس نے بات شروع کرتے ہوئے کہا:

”میرے ننھے دوست! اللہ نے جہاں تمھیں اور بہت سی نعمتیں مثلاً ہوا، پانی اور دھوپ وغیرہ عطا فرمائی ہیں وہاں اس نے ہمیں بھی تمہاری خدمت پر مامور کیا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ ہم ہمیشہ یوں ہی کھڑے رہتے ہیں؟ یہ صحیح ہے کہ ہم اونٹوں، گھوڑوں اور موٹروں کی طرح چلتے پھرتے نہ بھاگتے دوڑتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم نکمے اور بیکار ہیں۔ گرمی کے موسم میں جب تم سکول سے گھر آتے ہو تو ہم راستے میں تم پر سایہ کرتے ہیں، بارش کے موسم میں جب تمھیں کوئی جائے پناہ نہیں ملتی تو سیدھے ہماری طرف بھاگے آتے ہو۔

دوسرے درخت نے پہلے کی تائید کی۔ کہنے لگا:

”بعض پھل تو ہم تمھیں ایسے دیتے ہیں کہ ایک بار خرید لاؤ اور مہینوں کھاتے رہو۔ خراب ہونے کا کوئی خطرہ ہی نہیں۔ کیا بادام، اخروٹ، پستے وغیرہ ایسے ہی پھل نہیں ہیں؟“

ابھی دوسرا اپنی بات ختم نہیں کر پایا تھا کہ تیسرے نے بولنا شروع کر دیا:

”تمہارے مکان کے دروازے، کھڑکیاں، میزیں، کرسیاں اور دوسری ضرورت کی چیزیں مثلاً اوزار، گاڑیاں، تانگے، ٹرک اور ٹھیلے وغیرہ جس لکڑی سے بنائے جاتے ہیں وہ بھی درخت سے حاصل کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ آگ جلانے کے لیے تمھیں لکڑی اور کوئلے کی جتنی ضرورت ہوتی ہے، وہ بھی درخت فراہم کرتے ہیں۔"

تیسرا سانس لینے کو رکا تو چوتھے نے بولنا شروع کر دیا:

"ہم سے تمھیں بے شمار فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ربڑ جس سے تم اپنے غلط الفاظ اور ہندسے مٹاتے ہو اور یہ گوند جس سے تم اپنی کاپیوں میں خوبصورت تصویریں چپکاتے ہو یہ چیزیں بھی تو ہمیں نے تمھیں دی ہیں۔"

"اور یہ کاغذ۔" پانچوں نے اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی تو اکثر ہم ہی سے بنتا ہے۔ اگر کاغذ نہ ہو تو کتابیں اور کاپیاں نہ ہوں۔ کتابیں نہ ہوں تو علم نہ ہو اور علم نہ ہو تو انسان اور جانور میں کیا فرق رہ جائے۔"

اب چھٹے درخت نے بولنا شروع کیا:

"تمھاری زندگی اور صحت کا دارومدار صاف ہوا پر ہے۔ درخت گندی ہوا اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور تمھارے لیے صاف ہوا مہیا کرتے ہیں تاکہ تم صحت مند رہو۔ درختوں کی وجہ سے بارش ہوتی ہے۔ موسم خوشگوار رہتا ہے، زمین خوبصورت نظر آتی ہے، پرندے بھی درختوں پر بسیرا کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہم بیماری میں بھی تمھارا ساتھ نہیں چھوڑتے کہ ہمارے پھلوں، پھولوں، پتوں، جڑوں اور چھال سے دوائیں بنتی ہیں۔ جنھیں پی کر تم دوبارہ بھلے چنگے ہو جاتے ہو۔

نہ معلوم خدمات گنوانے کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہتا کہ ایک بوڑھے درخت نے شفقت سے کہا:

"لیکن بیٹے! خدا نے جہاں ہمیں تمھاری خدمت پر مامور کیا ہے، وہاں اس نے تمھیں بھی تو یہ حکم دیا ہے کہ ہم سے فائدہ اٹھانے کے لیے تم بھی ہماری کچھ نہ کچھ خدمت اور دیکھ بھال کرو۔ راہ چلتے ہوئے ہماری ٹہنیاں نہ توڑو، پتے نہ نوچو اور کھیل ہی کھیل میں نرم و نازک پودوں کو زمین سے نہ اکھاڑو۔ نوکیلی چیزوں سے ہم پر اپنے نام نہ کھودو۔ ہمیں تکلیف پہنچانے سے پہلے ذرا تو سوچ لیا کرو کہ کس طرح ایک ننھا سا بیج زمین میں بویا جاتا ہے اور پھر اس بیج میں سے نکلنے والا نرم پودا کس طرح سخت زمین کو پھاڑ کر نکلتا ہے اور پھر وہ کیسے مٹی، پانی ہوا اور دھوپ کی مدد سے بڑھتا اور ایک بڑا درخت بن جاتا ہے۔ تمھیں چاہیے کہ ہمیں نقصان پہنچانے کے بجائے ہر طرح ہماری حفاظت اور دیکھ بھال کرو۔ ہماری تعداد بڑھانے کی کوشش کرو تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ

تمہارے کام آئیں اور تمہاری ترقی میں مددگار ثابت ہوں۔ ''

ایک درخت نے بچے کو سمجھاتے ہوئے کہا:

''اور بیٹے! تم مسلمان بچے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ خدا کے آخری رسول ﷺ نے انسانوں اور حیوانوں کی طرح درختوں کو بھی نقصان پہنچانے سے منع فرمایا ہے اور تم نے یہ بھی پڑھا ہوگا کہ مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروق ؓ کتنے شوق سے درختوں کو پانی دیا کرتے تھے۔ تمہیں تو ان بزرگ ہستیوں کا نام لیوا ہونے کی حیثیت سے ہمارا اور بھی زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ ''

ابھی درختوں کی گفتگو کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ عصر کی اذان کی آواز فضا میں گونجی۔ جس سے بچے کی آنکھ کھل گئی اور اس کی آنکھ کھلتے ہی آس پاس کھڑے ہوئے سب درخت نہ جانے کیوں ایک دم خاموش ہو گئے۔

☆☆☆☆

فریدہ حفیظ

نیکی کی تلاش

منے میاں اب تو خیر سے کافی بڑے ہو گئے تھے۔ تیسری جماعت میں آ گئے تھے۔ مگر سب انھیں منا کہہ کر ہی بلاتے تھے۔ آج جب وہ سکول سے واپس آئے تھے۔ کچھ پریشان سے دکھائی دے رہے تھے۔ اس بات کا اندازہ موجو بھائی نے لگا لیا تھا۔ منے کو بھی کچھ کچھ احساس ہوا کہ موجو بھائی ان کی طرف کچھ زیادہ ہی توجہ دے رہے تھے۔

اتنے میں ہلکی سی چیخ کی ساتھ ہائے کی آواز آئی تو دونوں نے مڑ کر دیکھا اور امی کی طرف لپکے۔ ان کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی اور اُن سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

''منے بیٹے ذرا یہ تولیہ فرش پر سے اٹھا دو میرا ہاتھ نہیں پہنچ رہا۔'' مگر منے میاں ٹس سے مس نہیں ہوئے۔

''بیٹا آپ نے سنا نہیں'' امی نے ذرا غصے سے کہا۔

''امی منے کو کچھ مت کہیے یہ آج کچھ پریشان سے ہیں'' موجو بھائی نے منے کو چڑاتے ہوئے کہا۔

''کیوں کیا ہوا میرے بچے کو'' امی اپنی تکلیف بھول کر منے کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''امی میں نیکی کو ڈھونڈ رہا ہوں'' منے نے بڑی معصومیت سے کہا۔ موجو بھائی فوراً بولے۔ اوہ اچھا اب سمجھ میں آیا وہی پرانا مسئلہ۔ منے میاں نیکی کی تلاش میں ہیں۔ اور کوئی ایسا کام کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی میڈم صاحبہ سن کر واہ واہ کریں، انھیں شاباش دیں۔ مگر انھیں سڑک پر کوئی اندھا یا معذور نہیں ملا، جس کی انگلی پکڑ کر سڑک پار کرائے نہ کوئی اور مدد کا طلبگار ملا ہوگا۔

منے آپ کل ہی تو بتا رہے تھے کہ میڈم جی نے کہا تھا کہ اول خویش بعد درویش اور دوسرے یہ کہ نیک کام اپنے گھر سے شروع کرنا چاہیے۔

منے میاں خاموش رہے۔ موجو بھائی نے امی کو سہارا دے کر کرسی پر بٹھایا۔ امی نے منے کو پیار سے اپنے قریب کیا اور بتایا کہ اس کا مطلب ہے پہلے اپنے گھر والوں اور قریبی لوگوں کا خیال کرنا چاہیے اس کے بعد دوسروں کا یعنی غیروں کا۔ اب یہ نہیں کہ اپنے گھر میں کوئی بیمار رہے تو آپ چلے باہر کسی بیمار کی تلاش میں۔

منے میاں منہ اٹھا کر یوں دیکھ رہے تھے جیسے ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا ہو۔ منے جی ابھی میں نے آپ سے کہا تھا کہ کپڑے اٹھا کر مجھے دے دو مگر آپ نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ آپ نے دیکھا بھی کہ میرے پاؤں میں موچ آ گئی ہے۔ آپ کپڑے اٹھا کر دے دیتے تو یہ نیکی کا کام ہوتا۔ ’’امی وہ کیسے‘‘ منے نے بے یقینی سے کہا۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ امی کی مدد کرنا کون سی نیکی ہے۔

جب اچھے بچے ماں باپ اور گھر والوں کا کسی کام میں ہاتھ بٹا دیتے ہیں تو وہ نیکی کا کام ہوتا ہے۔

منے کو امی کی بات کا پھر بھی اعتبار نہ آیا۔ ان کے خیال میں نیکی کا کان کرنے کے لیے گھر سے نکلنا ضروری تھا اور نیکی صرف غیر اور انجانے لوگوں سے کی جاتی ہے۔ اپنوں سے نہیں۔ منے جی میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ جس کا جی چاہتا ہے بچوں کو نصیحت کر دیتا ہے کہ نیکی کا کام کیا کرو، نیک کام کرو اللہ اس کا اجر دے گا ثواب ملے گا مگر یہ نہیں بتاتا کہ نیکی کا کام کیا ہے۔ نیکی کا موقع قدم قدم پر ملتا ہے۔ دوسروں سے اچھی طرح بات کرنا بھی نیکی ہے۔ راہ چلتے کوئی نقصان دہ شے ہٹانا بھی نیکی ہے۔

’’وہ کیسے امی‘‘ منے میاں نے دلچسپی سے پوچھا۔

وہ یہ کہ پھلوں کے چھلکے اگر فرش پر یا راستے میں پڑے ہوں گے تو ایک تو گندگی پھیلے گی دوسرے کسی کا پاؤں پڑا تو پھسل کر گر پڑے گا۔ گرنے والے کے چوٹ لگ سکتی ہے۔ اس بات کا خیال اپنے گھر اور اسکول میں تو ضرور رکھنا چاہیے۔

بالکل درست موجو بھائی نے امی کی حمایت میں نعرہ لگایا۔ امی جان آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔ آپ کے پاؤں میں موچ کا درد اور سوجن کم کرنے کے لیے میں گرم پانی میں نمک ڈال کر لاتا ہوں پھر آئیوڈیکس لگا کر پٹی باندھ دوں گا۔ موجو بھائی نے کہا تو منے میاں فوراً بولے گرم پانی نہیں چوٹ والی جگہ پر اب برف رکھتے ہیں۔ واہ بھئی واہ منے میاں نے تو میری بات خوب یاد رکھی۔ پھر موجو بھائی کو دعا دی۔ جیتے رہو بیٹا، اللہ خوش رکھے۔

اچھا تو نیک کام کا ثواب اور دعا تو موجو بھائی لے گئے امی جان میں سارے میلے کپڑے اکٹھے کر دیتا ہوں اور قالین پر بکھرے اخبار اور کاغذ اٹھا دیتا ہوں تا کہ آپ کو جھکنا نہ پڑے۔ شاباش میرا پیارا بیٹا لمبی عمر آئے دنیا خوشیاں ملیں۔ امی نے خوش ہو کر شاباش دی۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر فقیر حسین ساگا

راجہ رسالو

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بادشاہ تھا جس کا نام راجہ رسالو تھا وہ عورتوں کو پسند نہیں کرتا تھا اور شادی نہیں کرنا چاہتا تھا پھر بھی ان کی ماں اس سے کہتی رہتی بیٹا شادی کرلو، بیٹا شادی کرلو آخر کار وہ راضی ہوگیا اور شادی کرنے کے لیے اپنے گاؤں کے لوگوں کے ساتھ دلہن کے گھر گیا۔ شادی کی رسم کا ایک حصہ یہ تھا کہ آگ کے گرد سات چکر لگانے پڑتے تھے اسے پھیرا کہتے ہیں جب راجہ رسالو نے ساتواں چکر مکمل کیا تو اس نے کہا کہ میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے، ہوسکتا ہے کہ گھوڑے پر سواری کرنے سے دور ہو جائے، وہ ایک گھوڑے پر چڑھا اور چلتا چلتا اپنے گھر پہنچ گیا، اس کی ماں نے اپنے بال دھوے تھے اور بالکنی میں کھڑے ہو کے انھیں خشک کر رہی تھی کہ اس نے راجہ رسالو کو اکیلے آتے ہوئے دیکھا۔ اسے دیکھ کر اس نے گانا گانا شروع کر دیا، میرے بیٹے تم دلہن اور بارات کو کہاں چھوڑ آئے ہو۔ اس نے جواب میں کہا ماں میں اسے اس جگہ چھوڑ کر آیا ہوں جہاں ہماری شادی ہوئی تھی اور تمام لوگ بھی اس کے ساتھ ہیں۔

اس کی ماں بہت پریشان ہوئی اس نے نوکرانی سے کہا کہ وہ ایک جوتے میں سکہ ڈال کر دروازے پر اُلٹا کر کے رکھ دے اس طرح وہ راجہ رسالو کو بتانا چاہتی تھی کہ اس نے اس سے قطع تعلق کرلیا ہے راجہ رسالو گھر سے چل پڑا راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک درخت جل رہا ہے اور اندر اس پر ایک طوطا بیٹھا ہوا ہے اس نے طوطے سے کہا تم اس درخت سے چلے کیوں نہیں جاتے یہ جل رہا ہے طوطے نے کہا "میں نے اس درخت پر لگے ہوئے سارے پھل کھائے ہیں، اب میں اس کا ساتھ دوں گا اور اسے اس وجہ سے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا کہ یہ جل رہا ہے" تم بہت عظیم ہو کیوں کہ تم اس درخت کو چھوڑ کر نہیں جا رہے ہو۔ راجہ رسالو تھوڑی دور گیا اور ایک محل پر پہنچا وہاں بادشاہ نے اس سے کہا کہ آؤ آگ کے گرد چکر لگائیں اس آگ میں تیل تھا۔ ایک بادشاہ راجہ رسالو کو اس میں پھینکنے کا منصوبہ بنا رہا تھا لیکن راجہ رسالو اس سے زیادہ ہوشیار تھا۔ راجہ رسالو نے بادشاہ سے کہا کہ وہ آگے آگے نہ چلے اور جوں ہی وہ آگ کے گرد چکر لگانے لگے راجہ رسالو نے اسے آگ میں پھینک دیا۔

اس کے بعد وہ ایک اور جگہ پر گیا، جہاں جوئے باز تھے، وہاں بادشاہ اپنی رعایا کے ساتھ چوسر کھیلتا تھا۔ وہ اپنی خوبصورت بیٹیوں سے رقص کراتے اور کھیلنے والوں کی توجہ دوسری طرف مبذول کرا دیتی تھیں اور اس طرح بادشاہ ہمیشہ جیت جاتا تھا کیوں کہ راجہ رسالو عورتوں کو پسند نہیں کرتا تھا، اس کی توجہ دوسری طرف مبذول نہیں ہوئی جس وقت بادشاہ راجہ رسالو کے ساتھ جوا کھیل رہا تھا، ایک پیغامبر آیا اور بادشاہ سے کہا کہ حضور مبارک ہو آپ کی ساتویں بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ بادشاہ نے راجہ رسالو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھے مبارک باد مت دو اسے میں نے اس کھیل پر اپنی زندگی کی بازی لگا دی ہے اور وہ جیت رہا ہے راجہ رسالو نے کہا کہ مجھے تمھاری زندگی کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے وہ بیٹی دے دو جو پیدا ہوئی ہے بادشاہ نے اسی بچی کو، جس کا نام رانی تھا راجہ رسالو کو دے دی۔ وہ اس ملک سے روانہ ہو گیا، اس نے رانی کو پالنے اور اس کو بیوی بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک ایسا محل بنایا جس میں دروازے نہیں تھے اس محل کے اندر آنے اور باہر جانے کا واحد ذریعہ ایک سیڑھی تھی جو راجہ رسالو اپنے پاس رکھتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کی ہونے والی بیوی، اس کی اجازت کے بغیر محل سے باہر نہ جا سکے، رانی جب بڑی ہوئی تو وہ بہت خوبصورت تھی۔ ایک دن راجہ رسالو اپنی بیوی کے ساتھ شکار کھیلنے گیا اس نے رانی کو ایک مرد کے کپڑے پہنائے اور شکار گاہ میں چلے گئے، وہاں کچھ بگلے رہتے تھے، ان دونوں کو دیکھ کر وہ سوچنے لگے کہ آیا رانی مرد ہے یا عورت۔ بگلوں کے سردار نے کہا کہ یہ معلوم کر کے آتے ہیں، وہ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا اور رانی نے راجہ رسالو سے اس بات کی شکایت کی۔ راجہ رسالو نے اپنی تلوار نکالی اور بگلے کی ناک کاٹ دی۔ بگلہ بڑا شرمندہ ہوا کیوں کہ ناک کٹ جانا جھوٹے ہونے کی نشانی ہوتی ہے۔ بگلے نے اس کا بدلہ اس طرح لیا کہ اس نے ایک اور آدمی راجہ ہودی کو راجہ رسالو کے محل کا راستہ بتا دیا، جہاں اس نے اپنی بیوی کو تالا لگا کر رکھا ہوا ہے۔ جب راجہ رسالو اپنے محل سے جاتا تو راجہ ہودی رانی سے ملنے کے لیے وہاں پہنچ جاتا، راجہ رسالو نے محل میں ایک مینا اور ایک طوطا بھی رکھے ہوئے تھے۔ مینا نے رانی کو کہا کہ راجہ کو بتا دوں گی۔ رانی نے اسے پنجرے سے نکال کر اس کا گلا گھونٹ دیا۔ طوطا بہت افسردہ اور ناراض تھا۔ لیکن اس نے رانی سے کہا کہ وہ بہت خوش ہے کیوں کہ مینا بہت پریشان کرتی تھی۔ اس نے رانی سے کہا کہ پنجرے کا دروازہ کھول کر مجھے اڑ جانے دو اور رانی نے ایسا ہی کیا۔ طوطا اُڑ کر اس جگہ پہنچا جہاں راجہ رسالو شکار کھیل رہا تھا۔ اس نے راجہ رسالو کو کہا کہ جب تم جاتے ہو تو ایک آدمی تمھاری بیوی کے پاس آتا ہے اور اس نے میری مینا کو مار دیا ہے۔ راجہ رسالو فوراً گھر آ گیا۔ رانی نے راجہ ہودی کو ایک چٹائی میں چھپا دیا اور اسے ایک طرف رکھ دیا راجہ رسالو نے رانی کو کچھ مٹھائی دی اس نے مٹھائی کھائی اور بے احتیاطی سے کچھ راجہ

ہودی کی طرف پھینک دی، جو چھپا ہوا تھا۔ راجہ ہودی بھاگ نکلا لیکن راجہ رسالو نے اسے پکڑ لیا۔ اسے جان سے مار کر اس کا جگر نکال لیا۔ گھر واپس آیا اور رانی سے کہا کہ یہ شکار کیا تھا اور اس جگر کا کباب بنا دو۔ رانی نے اس کا کباب بنا دیا لیکن راجہ رسالو نے کہا؛ اسے، اس کی ضرورت نہیں ہے چناں چہ اکیلی رانی نے ہی کھایا۔ راجہ سالو کے گھر ایک بلی بھی رہتی تھی اور جب اس نے رانی کو کباب کھاتے ہوئے دیکھا تو اپنے آپ سے کہا تم اپنے دوست کا جگر کھا رہی ہو۔ اسے حیرانی ہوئی کہ وہ کیا کہ رہی ہے لیکن اُس نے کچھ نہیں بتایا۔ جب وہ اوپر گئی اور اس نے کھڑکی سے راجہ ہودی کی لاش دیکھی اس وقت اس کی سمجھ میں آیا کہ بلی کیا کہہ رہی تھی اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی اور مر گئی۔ جب راجہ رسالو نے دیکھا کہ اس کی بیوی مر گئی، وہ بھکاری اور درویش بن گیا۔ وہ ہر دروازے پر جاتا اور بھیک مانگتا۔ ایک دن وہ ایک گھر پر گیا اور ایک عورت نے اسے خیرات دی۔ اس عورت نے اسے غور سے دیکھا اور ایک دم سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا تم میرے خاوند ہو۔ راجہ رسالو بڑا حیران ہوا اور کہا تم مجھ جیسے فقیر کو چھوڑو۔ تم جانتی ہو میں ایک دیندار انسان ہوں اس عورت نے جواب دیا۔ ''جب میری شادی ہوئی تو میں نے چند پودے بوئے تھے جواب بڑے ہو کر درخت بن گئے ہیں یہ درخت تمھارے سر کے اوپر جھکے ہوئے ہیں کیوں کہ انھیں معلوم ہے کہ میرا خاوند کون ہے۔''

☆☆☆☆

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

مجھے معاف کر دو

وہ تینوں بچپن کے دوست تھے۔ ایک ہی شہر اور ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ تینوں پہلے ایک ہی پرائمری سکول میں پڑھا کرتے تھے بعد میں جب ہائی سکول پہنچے تو انھوں نے والدین سے اصرار کر کے ایک ہی ہائی سکول میں داخلہ لیا۔ زوہیب کے والدین باقی دونوں کے گھر والوں کے حساب سے امیر تھے جب کہ انیس کا تعلق متوسط طبقے سے تھا لیکن اُن کا رہن سہن بھی سادہ طرز کا تھا۔ جہاں تک واجد کا تعلق تھا تو اُن کا مشکل سے گزارا ہوتا تھا لیکن کبھی فاقوں کی نوبت نہیں آئی تھی۔

پرائمری سکول میں تینوں کی تکون مشہور تھی گھر سے تینوں کو جو بھی جیب خرچ ملتا وہ سب مل کر خرچ کرتے۔ باقی طالب علم بھی ان کی اس بات کو جانتے تھے اور رشک کرتے تھے۔ باقیوں نے بھی اسی طرح کی تکونیں اور چوکوریں بنا رکھی تھیں مگر جتنا ان تینوں کا یارانہ تھا وہ کہیں نہ بن سکا۔ سکول میں تینوں کی کارکردگی بڑی اچھی تھی۔ زوہیب سب سے زیادہ ذہین تھا وہ جو بھی سبق پڑھتا، اسے بہت جلد یاد ہو جایا کرتا تھا۔ انیس ذہین سے زیادہ محنتی تھا۔ اسے سبق یاد کرنے میں ذرا دیر تو لگتی مگر وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتا کہ اُس کے نمبر زوہیب سے کم نہ آنے پائیں۔ واجد نسبتاً لاپروا تھا لیکن دونوں مل کر اُسے سبق یاد کروا دیا کرتے تھے اس لیے وہ بھی پاس ہوتا آ رہا تھا، گو کہ اُس کے نمبر دونوں سے کم آیا کرتے تھے۔

جب تینوں چھٹی جماعت میں پہنچے تو شہر میں تین ہائی سکولوں میں سے کسی ایک میں داخلے کا انتخاب کرنا تھا۔ تینوں نے کہا کہ آج شام کو کمپنی باغ میں کینٹین پر بیٹھ کر چائے بھی پئیں گے اور پھر وہیں گپ شپ بھی لگائیں گے اور ہائی سکول کا انتخاب بھی کر لیں گے۔ شام کو تینوں مل بیٹھے تو خوب انجوائے کیا۔ تینوں نے باغ کی خوب سیر بھی کی اور جب تھک ہار گئے تو کینٹین پر بیٹھ کر چائے بھی پی اور لذیذ بسکٹ بھی کھائے۔ اس دن اتفاق سے انیس پیسے گھر بھول آیا اور واجد کی جیب خالی تھی۔ زوہیب یہ ساری صورت حال بھانپ گیا اور ہنس کر بولا ”آج کی ٹریٹ میری طرف سے ہے۔ آج کینٹین والے کو بل میں ادا کروں گا۔“

دوسروں نے نہ نہ تو کی مگر مان گئے۔ تاہم سب خوش تھے کہ آج سیر بھی کی، چائے بھی پی اور ہائی سکول کا فیصلہ بھی ہو گیا۔ بعد میں سب نے اپنے اپنے گھر اپنا فیصلہ بتایا تو کسی کے گھر والوں نے اعتراض نہ کیا کہ

انھیں معلوم تھا کہ یہ تینوں ایک دوسرے کے کتنے قریب ہیں اور یہ بھی کہ تینوں مل کے پڑھتے ہیں۔

چھٹی جماعت میں وہی پرانا سلسلہ چلتا رہا کہ سب مل کر تفریح کے وقت کوئی نہ کوئی چیز خرید کر کھاتے۔ تاہم انیس کو یہ احساس رہتا تھا کہ زوہیب اس مشترکہ فنڈ میں تینوں سے زیادہ پیسے ڈالتا ہے۔ اسے شروع ہی سے یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس نے ایک بار جب تینوں تفریح میں اکھٹے کچھ کھا رہے تھے تو بولا "یار زوہیب! یہ اچھی بات نہیں کہ تو ہمیشہ سے مشترکہ فنڈ میں زیادہ پیسے ڈالتا ہے۔ ہم تینوں اپنی اپنی پسند کی چیزیں کیوں نہ لیا کریں۔۔۔؟ کیوں واجد تمھارا کیا خیال ہے؟

واجد نے کہا "تمھاری بات تو ٹھیک ہے ایسا ہی ہونا چاہیے۔" تب زوہیب نے کہا "یار کیسی باتیں کرتے ہو، میرے اور تمھارے پیسوں میں فرق ہی کیا ہے۔۔۔؟

تاہم بات مزید بن نہ سکی اور اب تینوں بیٹھتے تو اکٹھے تھے مگر چیزیں اپنی اپنی پسند کی خریدتے تھے گو کہ پھر بھی ایک دوسرے کی چیزیں کھا لیتے تھے۔ انیس نے اپنے طور پہ ٹھیک بات کی تھی مگر واجد کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ میں شاید غریب ہوں اس لیے انیس نے ایسی بات کی ہے۔ اس چھوٹی سی بات پر اب تینوں کے دل اپنی اپنی بات سوچنے لگے، چھٹی ساتویں تک تو اتنا محسوس نہ ہوا لیکن آٹھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے وہ بات نہ رہی، جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ اب سکول کے دوسرے بچوں میں بھی چہ مگوئیاں ہونے لگیں کہ ان تینوں میں اتنا پیار نہیں رہا۔ تینوں کو کبھی استادوں سے مار نہیں پڑی تھی مگر ایک دفعہ کیا ہوا کہ کسی اور نے شرارت کی اور نام زوہیب اور انیس کا لگ گیا۔ پہلی بار ان دونوں کو کسی اور کی شرارت کی سزا ملی۔ وہ بھی حیران تھے کہ ایسا کیوں ہوا۔ پھر تو دو چار مہینوں بعد ایسا ہی ہونے لگا لیکن تینوں مل بیٹھتے اور اس شرارتی کا کھوج لگانے کی کوشش کرتے جس کی وجہ سے یہ سزا ملتی مگر کوئی پتہ نہ چل سکا۔

میٹرک کے بعد واجد تو ویسے ہی پڑھائی چھوڑ گیا۔ میٹرک میں وہ بڑی مشکل سے پاس ہوا تھا اس کے گھر والوں نے کہا کہ اب ہم تمھیں مزید نہیں پڑھا سکتے۔ ایک تو تم پہ خرچ کریں اوپر سے تم نالائق ہوتے جا رہے ہو میٹرک میں بڑی مشکل سے پاس ہوئے ہو۔ آگے ایف اے میں تو تمھارے پاس ہونے کے کوئی امکانات نہیں ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ کوئی کام دھندا کر لو کیوں کہ اب گھر میں بھی فاقوں کی نوبت آ پہنچی ہے۔ وقت کا پہیہ چلتا رہا۔ کوئی محنت کرے نہ کرے وقت نے تو آگے بڑھ ہی جانا ہوتا ہے۔ زوہیب سی ایس ایس کا امتحان نمایاں حیثیت میں پاس کر کے بڑا افسر لگ چکا تھا جب کہ انیس نے بھی ایم بی اے کرنے کے بعد اپنے ابو کی فیکٹری سنبھال لی تھی، لیکن واجد جس دکان پہ کام کرتا تھا، اُس میں اس کا دل نہیں لگتا تھا تاہم اُسے بغیر محنت کیے

راتوں رات امیر بننے کی خواہش ضرور تھی۔ ایک مرتبہ ہوا کیا کہ اُس والی دکان پہ چوری ہوگئی۔ واجد بھی مالک کے ساتھ ساتھ مل کر چور کو تلاش کرتا رہا۔ پولیس جب تفتیش کر رہی تھی تو واجد پولیس کی مدد کرنے میں سب سے آگے تھا لیکن پھر پولیس انسپکٹر کو اُس پہ شک ہوگیا۔ انھوں نے واجد کو دو چار تھپڑ لگائے تو وہ مان گیا اور رونے لگا کہ مجھے معاف کر دو لیکن مالک نے کہا کہ اس نے مجھ جیسے شخص کی چوری کی ہے جس نے اسے اپنے بچوں کی طرح رکھا تھا اس لیے اسے حوالات میں بند کر دو۔۔۔۔ جب واجد حوالات میں بند ہوا تو تب اسے تینوں دوستوں کا پیار یاد آیا۔ وہ اپنے آپ میں شرمندہ تھا لیکن اب اپنے دوستوں کی مدد لیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا اُس نے کسی سے کہہ کر زوہیب کو فون کروایا جو دوسرے شہر میں بڑا افسر لگا ہوا تھا۔ پھر اُس نے انیس کو بھی فون کروا دیا جو اُس وقت فیکٹری چلا رہا تھا۔ زوہیب کو جب واجد کی اس حرکت کا پتہ چلا تو اُسے غصہ تو بہت آیا مگر اُس نے تھانے دار کو فون کیا کہ یہ اس کی پہلی غلطی ہے اسے معاف کر دیں اور میری ضمانت پہ چھوڑ دیں۔ اتنی دیر میں انیس بھی وہاں پہنچ چکا تھا اسی نے دکان کے مالک سے بھی اسے معافی دلوا دی اور تھانے سے رہا کروا کے اپنے ساتھ فیکٹری لے آیا، وہیں اُس نے زوہیب کی واجد سے بھی بات کروائی تو وہ رو رو کر معافی مانگنے لگا اُس نے کہا کہ وہ اپنے کیے پہ بہت شرمندہ ہے۔ زوہیب نے بھی اسے معاف کر دیا۔ انیس نے وہیں فیکٹری کے دفتر میں واجد کے لیے کھانا منگوایا اور کہا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آج زوہیب بھی اس شہر میں ہوتا تو ہم تینوں پھر سے اکٹھے ہو کر کھانا کھاتے۔ کھانے پر گفتگو کے دوران میں ہی اس نے واجد کو آفر کی کہ اگر وہ اس میں اپنی ہتک نہ سمجھے تو وہ اسے اپنی فیکٹری میں ہی کسی اچھے کام کے لیے کسی عہدے پہ لگا دیتا ہے۔ یہ سن کر واجد بلک بلک کے رونے لگا اور پھر انیس کے سینے سے لگ کے بولا ’’بھائی انیس تم اور زوہیب مجھے معاف کر دو۔ میں تم دونوں سے حسد کرنے لگ گیا تھا۔ سکول میں بھی شرارت میں کرتا تھا اور نام تم دونوں کا لگ جاتا تھا۔ اس حسد نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ میں اپنے اور اپنے خاندان کے لیے کچھ نہیں کر پایا۔ مجھے معاف کر دو تم دونوں بہت اچھے ہو۔ بہت اعلیٰ ظرف ہو کہ مجھ جیسے شخص کو اپنے ساتھ رکھا۔۔۔‘‘

انیس نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا ’’یار واجد کوئی بات نہیں۔ غلطی تو انسان سے ہو ہی جاتی ہے لیکن عظمت تو اسے تسلیم کرنے میں ہے۔ تمھیں غلطی کا احساس ہو گیا ہے یہی بہت ہے۔‘‘ تب انیس نے واجد کی زوہیب سے بھی فون پر بات کروائی، اُس نے بھی واجد کو حوصلہ دیا اور پھر جب اگلی عید پر زوہیب گھر آیا تو کمپنی باغ کی کینٹین پر تینوں مل بیٹھے تھے اور پھر سے ان کے قہقہے گونج رہے تھے۔۔۔۔۔

☆☆☆☆

محمد اسلام نشتر

چاند کی لکیر

”ایلڈرن یار!...... 1969 میں جب ہم نے پہلی بار چاند پر قدم رکھا تھا تو ساری دنیا کی نظریں ہم پر لگی ہوئی تھیں۔ ہم نے چاند گاڑی اور چاند کی سطح سے ان کے لیے مسلسل تصاویر ارسال کیں۔ یہ تاریخ انسانی کا ایک نہایت بڑا کارنامہ تھا۔ میں نے اسی لیے تو کہا تھا ’چاند پر انسان کا چھوٹا سا قدم انسانیت کا بہت بڑا قدم ہے۔“

”جی ہاں۔۔۔ جناب آرمسٹرانگ!۔۔۔ مجھے وہ ایک ایک لمحہ ابھی تک یاد ہے۔ وہ تو میری زندگی کے نایاب لمحات تھے۔ ان لمحات نے تو انسانی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا تھا۔ آج بھی میں جب اس دن کی تصاویر کا البم دیکھتا ہوں تو تمام یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔“

”یہی کیفیت میری ہے۔۔۔ میں تو ان لمحات کو اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھتا ہوں، لیکن ایک بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں چاند کی سطح کی تصویر دیکھتا ہوں تو اس کے درمیانی حصے میں ٹوٹ پھوٹ محسوس کرتا ہوں۔ میرے دل میں شبہ پیدا ہوا ہے کہ یہ دراڑ نئی نہیں ہے بلکہ بہت پرانی ہے۔ لگتا ہے چاند اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی یہاں سے ضرور ٹوٹا ہوگا مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یقیناً یہ میرا وہم ہے۔ ایسا نہیں ہوگا۔ میں یقیناً غلط ہوں۔“

”ذہن تو میرا بھی کبھی کبھی اس طرف متوجہ ہوتا ہے، لیکن میں نے اس بات پر کبھی غور نہیں کیا۔ یسوع مسیح نے کبھی توفیق دی تو شاید یہ مشکل حل ہو جائے۔

”ایلڈرن!۔۔۔ آپ کی بات ٹھیک ہے، مگر سائنس تو نام ہے تحقیق کا، کوشش اور سوچ سمجھ کر غور کرنے کا۔ مجھے تو اپنے مذہب میں ابھی تک کوئی بات ایسی نظر نہیں آئی جس سے اس مشکل پر روشنی پڑتی ہو۔ میں نے یسوع مسیح کی متبرک انجیل کے سارے نسخے دیکھ ڈالے ہیں، برناباس، متی، مرقس، لوقا اور یوحنا وغیرہ سب چھان مارے ہیں مگر کچھ نہیں ملا، ہاں البتہ۔۔۔ ایک دن میں مسلمانوں کی چند مذہبی کتابیں پڑھ رہا تھا تو مجھے جیسے شک سا پڑا۔ یار ایلڈرن۔۔ مسلمانوں کا مذہب تو بڑی رواداری کا قائل محسوس ہوتا ہے۔ ہمارے یسوع

کے ساتھ تو انھیں بھی بڑی محبت ہے۔ وہ عظیم یسوع کو ہماری طرح ہی خدا کا پیغمبر مانتے ہیں۔ ان کی عزت و تکریم کرتے ہیں۔ اماں مریم کا بڑا ادب کرتے ہیں۔ ہماری تجربہ گاہوں میں جو مسلمان سائنس دان اور خلائی سائنس دان کام کرتے ہیں ان کا رویہ یسوع اور بی بی مریم کے بارے میں بہت اچھا ہے۔ یہ کسی تعصب کی بات نہیں، میں نے کئی بار ان سے بات چیت کے دوران میں محسوس کیا۔ بعض باتیں ہمیں پتا ہی نہیں ہوتیں تو وہ فوراً بتا دیتے ہیں۔

''مسٹر نیل آرمسٹرانگ! آپ بجا فرماتے ہیں، مگر آپ کو یہ بھی یاد ہونا چاہیے کہ وہ یسوع مسیح کو پیغمبر تو مانتے ہیں، لیکن ہماری طرح تین خداؤں کو نہیں مانتے۔ وہ یسوع کو خدا کا بندہ تو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس کا بیٹا قرار دینے سے سختی سے انکار کرتے ہیں۔ ہمیں ان سے متاثر ہونے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں ایلڈرن! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ مگر اس وقت جو مسئلہ ہمیں درپیش ہے، اس کا کیا کیا جائے؟ بہر حال ہمیں اس مسئلے کا حل چاہیے، جہاں سے بھی تلاش کرنا پڑے، کرنا چاہیے۔''

''ہاں مسٹر نیل! یہ تو ہونا چاہیے۔۔ میں تلاش کروں گا۔ اگر کسی سے ہمیں پوچھنا پڑا تو ضرور پوچھیں گے۔ اب تو کافی دیر بھی ہو گئی ہے۔۔۔ میں چلتا ہوں۔ میرے چند دوستوں کو گھر آنا ہے۔۔۔ پھر ملاقات ہوگی۔۔۔ گڈبائی گڈبائی۔''

ایلڈرن تو اب چلا ہی گیا ہے، میں کیوں نہ۔۔۔ اس بارے میں کچھ کتابیں اور رسائل پڑھ لوں۔ ان سب سائنسی رسائل و اخبارات میں تو وہی تصویر چھپی ہوئی ہے۔ ہم تو وہاں صرف خلاباز کی حیثیت سے گئے تھے۔ دوسرے تمام ماہرین تو یقیناً اس بات پر تحقیق کر رہے ہوں گے۔ روسی رسالوں میں تو ہمارے چاند پر پہنچنے سے پہلے کی تصویروں میں بھی یہ بات بڑی واضح دکھائی دے رہی ہے۔ ہم جب چاند پر گئے تو تھے تو اس کے بعد بھی تو اپالو کئی مہمیں وہاں جا چکی ہیں۔

اچھا چلو۔۔۔ وہ رسالہ اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ آہا۔۔ اس میں تو اپالو 15 کے بارے میں معلوات شائع کی گئی ہیں۔ بہت خوب۔۔۔ میرے لیے خاصا دلچسپ رہے گا۔ کمال ہے، بہت مزے کی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس کا تو ایک ایک صفحہ غور سے دیکھنے والا ہے۔۔۔ چلو دیکھتے چلتے ہیں۔۔۔ واہ بھئی وا۔۔۔ رسالے کے مدیر کو مبارک باد دینی چاہیے۔۔ ہیں۔۔۔ یہ کیا؟ انگریزی رسالے میں کسی اور زبان کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ کون سی زبان ہے۔۔۔ کہیں چاند کی زبان تو نہیں۔۔۔ لیکن وہاں تو کوئی رہتا ہی نہیں۔۔ میں خود جو دیکھ آیا

ہوں۔ او۔۔ یاد آیا۔۔ میں بھی چاند پر ہی رہنے لگا ہوں۔۔ یہ تو اپنے دوست ملک سعودی عرب اور وہاں کے دوسرے عرب ملکوں کی زبان عربی ہے۔۔ بہت خوب۔۔ اس کے نیچے تو انگریزی میں اس کا ترجمہ بھی لکھا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے: ''اہل زمین کو خلائی چاند گاڑی اینڈ ریو سے سلام۔'' یہ پیغام تو اپالو 15 کے خلا بازوں کا ہے جو انھوں نے چاند سے زمین پر بھیجا تھا۔

خیر آگے دیکھتا ہوں۔۔ کیا کچھ لکھا ہے؟۔۔۔ یہ صفحہ تو ختم ہو گیا ہے آگے چلوں۔۔۔ ہیں؟۔۔ ایرب کریکر۔۔ یعنی عرب دراڑ۔۔ کیا؟ جس تصویر پر میں حیران و پریشان ہوں، اس کے بارے میں دوسرے سائنس دان بھی تحقیق کر رہے ہیں۔ تو میرا شک ٹھیک تھا۔ اس بات نے دوسروں کو بھی حیرت میں ڈال دیا ہے۔ گویا یہ عرب دراڑ ہے۔۔۔ یہ نام کس وجہ سے دیا گیا ہے؟ میں یہ باتیں کسی سے ضرور پوچھوں گا۔۔۔ مگر کیوں نہ پہلے میں مزید کتابیں پڑھ لوں۔ یہ بھی ایک مناسب خیال ہے۔

مجھے اسی وقت کسی کتب خانے میں جانا چاہیے۔۔ کون سی لائبریری مناسب ہو سکتی ہے۔۔ مجھے اس وقت کسی مسلمان لائبریری میں چلنا ہو گا۔ ان کی کتابوں سے استفادہ کرنا چاہیے کیوں کہ عرب میں مسلمان آباد ہیں۔ انھیں اس نام کی وجہ ضرور معلوم ہو گی۔ خوش قسمتی سے ہماری کالونی سے کچھ ہی دور تو مسلمانوں کی ایک عمدہ لائبریری ہے۔۔۔ یہ رسالہ بھی ساتھ ہی لے چلتا ہوں۔

اسی وقت چلنا چاہیے۔۔۔ گاڑی بھی باہر کھڑی ہے۔۔ چلو بھئی نیل ضمیر کے قیدی: کوئی کیا یاد کرے گا کہ آرمسٹرانگ چاند پر پہنچنے کے بعد بھی اسے نہیں بھولا۔۔۔ میں ذرا گھر والوں کو بتاتا چلوں کہ تھوڑی دیر بعد آنے کی کوشش کروں گا۔۔۔ نہ آ سکا تو کھانا کھا لیجیے گا۔۔۔

بیگم! میں ذرا ایک کام کے لیے گھر سے باہر جا رہا ہوں۔ دیر ہو گئی تو کھانا کھا لیجیے۔۔۔ گڈ بائی۔۔۔ ٹاٹا۔۔۔ ٹاٹا۔

یسوع کرے۔۔۔ آج مجھے کوئی نئی، چونکا دینے والی حقیقی بات معلوم ہو جائے۔۔

میں صحیح بات معلوم کر لینے کی پوری کوشش کروں گا۔ ویسے مسلمانوں کا مذہب بڑا پیارا ہے۔

تاریخ میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ کا وہ فرشتہ جو یسوع کے پاس بھی اللہ کا پیغام لے کر آیا کرتا تھا۔ جب مسلمانوں کے پیغمبر کے پاس آنے لگا تو مقامی لوگوں نے ان کی بہت مخالفت کی تھی یسوع کی بھی تو لوگوں نے مخالفت کی تھی۔ جب مسلمانوں کے پیغمبر کے ساتھیوں کو مخالفین نے بہت تنگ کیا تو ان میں کچھ ہجرت کر کے

اس وقت کے حبشہ کے نجاشی کے پاس چلے گئے تھے۔ یہ بات مجھے ایک مسلمان دوست نے بتائی تھی۔ نجاشی اس وقت کا عیسائی حکمران تھا۔ اس کا اصل نام تو اصحم بن ابجر تھا۔ اس نے یسوع کی پیش گوئیوں کے مطابق مسلمانوں کی بڑی مدد کی۔ مکہ والوں نے خفیہ طور پر جا کر حبشہ ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو سزا دینے کی سفارش کی، مگر نجاشی اصحم نہ مانا۔۔۔ ٹھیک ہے یہ باتیں تو میں نے اپنی تعلیم کے دوران میں کسی کتاب میں پڑھی تھیں۔ آج لائبریری میں اس پر بھی تفصیلی غور ہوگا۔ ہاں۔۔ یاد آیا۔۔ ہمارے یسوع نے بھی تو اس پیغمبر کے اپنے بعد اس دنیا میں آنے کی خبریں دی تھیں۔ آج کل کی بائبل میں یہ باتیں بہت کم ملتی ہیں لیکن اگر مقدس انجیل کے پرانے زمانے کے نسخے دیکھیں تو یہ باتیں واضح طور ملتی ہیں۔ سینٹ برناباس سے میں نے پڑھا تھا:

”اور اللہ نے اس کے لیے کوئی رسول نہیں بھیجا، جو اس کی توبہ کی طرف بلاتا، لیکن انسان، یہ جانے کہ تمام انبیا سوائے اس رسول اللہ کے آ چکے ہیں، جو میرے بعد آئے گا، کیوں کہ اللہ اسی امر کا ارادہ رکھتا ہے کہ میں اس کا راستہ صاف کروں۔ بے فکری کے ساتھ بغیر کسی خوف کے یوں زندگی گزارتا ہے، گویا خدا موجود ہی نہیں۔“

ایک اور جگہ میں نے پڑھا تھا کہ یسوع نے اپنے بعد آنے والے خدا کے آخری پیغمبر کی نشانیاں بتاتے ہوئے فرمایا:

”بے شک وہ تمھارے زمانے میں نہ آئے گا بلکہ تمھارے کئی برسوں کے بعد، جس وقت کہ میری انجیل بدل کر دی جائے گی اور قریب قریب تیس مومن بھی نہ پائے جائیں گے۔ اس وقت اللہ دنیا پر رحم کرے گا، پس وہ اپنے اس رسول کو بھیجے گا، جس کے سر پر سفید ابر کا ایک ٹکڑا رہا کرے گا۔ اس کو اللہ کا ایک برگزیدہ بندہ پہچانے گا اور وہی اسے دنیا پر ظاہر کرے گا اور وہ رسول بدکاروں پر بڑی قوت کے ساتھ آئے گا اور بتوں کی پوجا کو دنیا سے نابود کر دے گا اور میں اس بات کو راز کی طرح لکھتا ہوں، کیوں کہ اسی کے ذریعے اس کا اعلان ہوگا اور اللہ کی بڑائی کی جائے گی اور میری سچائی ظاہر ہوگی۔“

اُف۔۔۔ میں کن باتوں میں کھو گیا۔۔ خیر۔۔ لائبریری کا گیٹ سامنے ہے۔۔ پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے اندر چلا جاتا ہوں۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ مگر سامنے سے ایک اور دوست آ رہا ہے۔۔ بہت اچھا ہوا۔ قریب ہی آ گیا ہے۔۔ ہیلو!۔۔۔ ویلکم۔۔ تھینک یو۔۔۔ آج یہاں کیسے آنا ہوا۔۔۔

”بھئی!۔۔۔ ہم سائنس کے لوگ۔۔ صحیح بات کی تلاش میں جہاں جہاں جانا پڑے، بلا تخصیک چلے

جاتے ہیں۔ ایک بات ذہن میں مسئلہ بنی ہوئی تھی، سوچا اس لائبریری سے ہی کوئی فائدہ اٹھالیا جائے۔‘‘

’’مناسب ہے۔۔ آپ ہو آئیں میں تو واپس جا رہا تھا۔۔۔ آپ سے پھر کسی وقت ملاقات ہوگی۔۔ میں ذرا جلدی میں ہوں نیل یار!۔۔۔ جلد ہی پھر تفصیلی ملاقات ہوگی۔۔ او کے!‘‘

بھئی! یہ دوست بھی چلے گئے۔۔۔ اندر چل کر لائبریری کے انچارج کو تلاش کرتا ہوں۔۔ مگر میں تو یہاں کبھی آیا ہی نہیں۔۔۔ چلیں کوئی بات نہیں۔۔۔ کسی سے پوچھ لینے میں کیا حرج ہے۔ وہ ایک لڑکا آ رہا ہے۔۔۔ ہیلو!۔۔۔ یس سر! مہربانی فرما کر مجھے لائبریرین کا کمرہ بتا دیں۔۔ ویل!۔۔۔ آپ اسی برآمدے کے کونے تک چلے جائیں۔ وہاں سے دائیں طرف اوپر جانے والی لفٹ ہے۔ چوتھی منزل پہ جا کر اُتر جائیں۔ وہاں اسی طرح کے برآمدے میں اسی طرف کو آئیں گے تو بائیں طرف تیسرا کمرہ لائبریرین کا ہے۔۔۔ تھینک یو!

بہت خوب بھئی! لائبریری تو بہت جدید انداز کی لگ رہی ہے۔ کتابیں بھی یقیناً کارآمد اور جدید علوم کے مطابق ہی مل جائیں گی۔۔۔ برآمدہ تو ختم ہوا۔۔ وہ رہی لفٹ۔۔۔ لفٹ نیچے ہی آ رہی۔۔۔ لو! لفٹ پہنچ گئی۔۔ اب جلدی سے اس میں داخل ہونا چاہیے۔۔۔ کمال ہے۔۔۔ لفٹ بھی کمپیوٹر سے چلنے والی۔۔۔ ہم تو مسلمانوں کو عمومی طور پہ غیر ترقی یافتہ خیال کرتے ہیں۔ بس۔۔۔ چند ایک لوگ جو ہمارے ہاں آ گئے ہیں، وہی جدید تہذیب سے واقف ہوتے ہیں۔۔ خیر! چوتھی منزل آ گئی ہے۔ اس لڑکے نے بتایا تھا کہ بائیں طرف کا تیسرا کمرہ۔۔۔

تیسرا کمرہ تو یہی ہے۔۔ استقبالیہ پہ موجود لڑکی سے لائبریرین صاحب کا پوچھنا مناسب رہے گا۔۔۔

’’سوری مس! کیا مسٹر لائبریرین موجود ہیں؟ کیا میں ان سے ملاقات کا وقت حاصل کر سکتا ہوں؟‘‘۔۔

آپ کا نام؟‘‘۔۔۔۔

’’میرا نام مسٹر نیل ہے۔۔۔

’’بہتر۔۔ میں ابھی پوچھ کے آپ کو بتاتی ہوں۔۔ آپ تشریف رکھیے‘‘۔۔۔

’’ہیلو!۔۔۔ ہیلو!۔۔۔ یس! سر!۔۔۔ کوئی مسٹر نیل آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔۔‘‘

”او کے۔۔۔ انھیں اندر بھجوا دیں۔۔۔ لیکن انھیں بتا دیں کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“

”سر! آپ ملاقات کر سکتے ہیں لیکن مختصر وقت کے لیے“۔۔۔

”کوئی بات نہیں۔۔۔ بس مجھے مختصر سا ہی کام ہے۔“

”آیئے۔۔۔ مسٹر نیل! آپ کو مجھ سے کیا کام ہے۔۔۔ بیٹھیے۔۔ یقیناً کسی کتاب کی ضرورت ہوگی۔“

”جی ہاں۔۔۔ آپ کا اندازہ بالکل صحیح ہے۔ میں دراصل ایک سائنس دان ہوں اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ سائنس دان کو حقیقت معلوم کرنے کے لیے جہاں بھی جانا پڑے، وہ چلا جاتا ہے۔“

”آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔۔ آپ تو بڑے دلچسپ آدمی ہیں، علم دوست اور علم کے متلاشی بھی، لیکن بتایئے میں اس وقت کیا خدمت کر سکتا ہوں۔۔۔“

”میرے پاس چاند سے لائی گئی کچھ تصویریں ایسی دکھائی دیتی ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی ضرور ٹوٹا ہے۔ وہ بعد میں کسی ایسی گوند سے جڑا ہوا لگتا ہے، جو بہت مضبوط جوڑنے والی تھی مگر۔۔۔ آپ جانتے ہیں کہ ٹوٹ پھوٹ کے نشان تو کبھی نہیں جا سکتے نا۔۔۔ کیا آپ اس بارے میں مجھے کوئی کتاب عنایت فرما سکتے ہیں جو مجھے اس مسئلے کا حل بتا سکے۔“

”مسٹر نیل آپ تشریف رکھیں۔۔ میں اللہ کے فضل سے ضرور کچھ بتاؤں گا۔ کتابیں بھی ہیں اور جو علم ہم تک محفوظ حالت میں پہنچا ہے، اس سے بھی آگاہ کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”واہ۔۔۔ میں آپ کا بہت شکر گزار رہوں گا۔“

”شکریہ! مسٹر نیل آپ نے جو سوال دریافت کیا ہے، اس کے بارے میں قصہ یہ ہے کہ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ سے ایک رات مکہ کے کافروں نے کہا کہ آج آپ اپنے سچے نبی ہونے کا ثبوت دیجیے تاکہ ہم آپ پر ایمان لاسکیں۔ رات کا وقت تھا چاند آسمان پر اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ آپ ﷺ نے اپنی انگلی مبارک کا اشارہ کیا تو چاند درمیان سے ٹوٹ کر دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ ایک ٹکڑا دائیں طرف والے پہاڑ اور دوسرا بائیں طرف والے پہاڑ پر چلا گیا۔ آناً فاناً یہ ایک ایسا منفرد معجزہ واقع ہوا کہ خدا کے کسی اور پیغمبر کو نہ ملا تھا۔“

”مسٹر لائبریرین! کیا اس کا ثبوت کسی کتاب میں موجود ہے۔ اگر کتاب آپ کے برگزیدہ نبی ﷺ

کے وقت کی ہو تو شکر گزار رہوں گا۔"

"مسٹر نیل! اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ نے اپنی زندگی کے دوران میں جو کام سرانجام دیے یا جو باتیں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیں، مسلمانوں نے انھیں حرف بہ حرف لکھ لیا۔ یہ باتیں حدیث کہلاتی ہیں۔ حدیثوں کی مستند کتابیں آج بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔ حدیثوں کی دو کتابوں صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں یہ قصہ پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے علاوہ کئی اور حدیث کی کتابوں میں بھی اس کا تذکرہ بیان کیا گیا ہے۔"

"مسٹر لائبریرین! کیا چاند کے دو ٹکڑوں میں تقسیم کا عمل کسی اہم شخصیت نے بھی دیکھا۔"

"جی ہاں۔۔ مسٹر نیل! مکے کے کافروں کے علاوہ آپ ﷺ کے ساتھیوں میں سے حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انسؓ وغیرہ نے اپنی آنکھوں سے یہ واقعہ دیکھا۔"

"مسٹر لائبریرین! آپ کا بہت شکریہ، لیکن اگر زحمت نہ ہو تو میرے ایک دو مزید سوالات کے جواب عنایت فرما دیں۔"

"مسٹر نیل! آپ فرمائیے، مجھے صاحب علم ہونے کا دعویٰ تو نہیں، لیکن ایک مسلمان کی حیثیت سے جو جوابات میں دے سکوں گا، ضرور دوں گا۔ ورنہ کوئی ضروری کتاب بتا دوں گا یا کسی بڑے اہل علم کے پاس آپ کو لے کر چلوں گا۔"

"تھینک یو۔۔۔ مسٹر لائبریرین! جب اہل مکہ نے چاند کا ٹوٹنا دیکھا تو یقیناً مکے کے باہر کے لوگوں نے بھی یہ نظارہ کیا ہو گا۔ کوئی ایسا واقعہ تا کہ میرے دل کی تسلی ہو سکے۔"

"جی ہاں۔۔۔ پہلے تو کفار مکہ نے کہا کہ یہ ابو کبشہ کے بیٹے کا جادو ہے۔ مکہ کے باہر سے جو مسافر آئے اور انھوں نے بھی چاند دو ٹکڑے دیکھنے کا ثبوت دیا تو ان کے منہ بند ہو گئے۔ اعتراض کرنے کے قابل بھی نہ رہے۔ یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ ساری دنیا پر تو یہ واقعہ نظر نہیں آیا ہو گا۔

مسٹر نیل!۔۔۔ آپ خود سائنس دان اور خوش قسمتی سے ماہر فلکیات ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ چاند ایک وقت میں ساری دنیا پر تو دیکھا نہیں جا سکتا۔ بعض دفعہ موسم ابر آلود ہوتا ہے یا اونچے پہاڑوں کی وجہ سے بھی چاند نظر نہیں آ سکتا۔ کتابوں میں یہ واقعات بھی ملتے ہیں کہ جب یہ معجزہ ہوا تو اس وقت ایشیا کے علاقے ہندوستان پر ایک ہندو راجہ کی حکومت تھی۔ وہ یہ دیکھ کر بڑا پریشان ہوا۔ اس نے اپنے دربار کے تمام جوتشیوں،

نجومیوں، عاملوں اور دوسرے ماہرین اور وزیروں کو بلا کر تحقیق کرنے کا حکم دیا۔ وہ بہت خوفزدہ تھا کہ کہیں اس پر کوئی آسمانی مصیبت تو نہیں آ رہی یا یہ دنیا تو تباہ نہیں ہونے والی۔ اس کے ماہرین نے اپنا اپنا حساب لگا کر اسے بتایا کہ عرب میں آخری نبی آ چکے ہیں۔۔ یہ انھوں نے اپنے نہ ماننے والوں کو معجزہ دکھایا ہے۔''

''مسٹر لائبریرین! میں آپ کا بے حد شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے صحیح راہ بتائی۔ یقیناً چاند کی سطح پر یہ ٹوٹنے کی نشاندہی ہے۔ اب مجھے اجازت۔۔۔ میں نے آپ کا کافی وقت صرف کر دیا ہے۔''

''کوئی بات نہیں مسٹر نیل! مجھے ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ سب کچھ بتا کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ ہم تو سیدھی راہ بتانے کے لیے ہر وقت حاضر ہیں۔ اب بھی اگر کسی کتاب یا حوالے کی ضرورت ہو تو پیش کروں۔ میرے پاس متعلقہ سارا علمی ذخیرہ موجود ہے۔''

''نہیں۔۔۔ شکریہ! آپ نے کافی تفصیل سے بتا دیا ہے۔

''اچھا اللہ حافظ۔۔۔ مسٹر لائبریرین! پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔''

☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر

اندھیروں کی شکست

گھٹاٹوپ اندھیرا چاروں جانب اتنی تیزی سے پھیلنے لگا کہ کامران محمود اور رضوان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ تینوں دوست اپنی یونیورسٹی کی طرف سے دریا کے پانی سے زمین کے کٹاؤ کو روکنے کے منصوبے پر عملی تجربے کے لیے تھوڑی دیر پہلے پہاڑ کے دامن میں، جنگل کے ساتھ بہتے ہوئے دریا کے قریب پہنچے تھے۔

ابھی انھوں نے اپنا سامان درخت کے نیچے رکھا ہی تھا کہ شمال کی جانب سے کالے اور گہرے بادل سورج کو اپنی آغوش میں لے چکے تھے۔ تینوں دوستوں کے لیے یہ منظر بہت ہی خوب صورت اور دل فریب تھا۔ ابھی ان کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں کہ انھیں اپنے قریب سے گزرتے ہوئے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کا شور سنائی دیا۔ ایک چرواہا لاٹھی سے بھیڑ بکریوں کو تیزی سے ہانکتا ہوا نظر آیا۔ چرواہے نے تینوں دوستوں کو بادلوں کے خوب صورت منظر میں کھوئے ہوئے دیکھا تو اس نے چلا کر کہا:

"ابھی اور اسی وقت کسی محفوظ جگہ چلے جاؤ۔ آسمان پر تیزی سے پھیلتے ہوئے گہرے اور سیاہ بادل خطرناک طوفان کی آمد کا پتا دے رہے ہیں۔"

رضوان نے چرواہے کے مشورے کو مذاق میں اڑاتے ہوئے کہا: "ہم تو اپنے تعلیمی منصوبے پر تحقیقی کام کے لیے آئے تھے۔ اگر اس موقع پر اتفاق سے اتنے خوب صورت مناظر دیکھنے کو مل گئے ہیں تو تم ہمیں ڈرا رہے ہو کہ اپنا سامان سمیٹ کر کسی محفوظ جگہ پر منتقل ہو جائیں۔ تم تو بڑے بزدل اور ڈرپوک چرواہے ہو، بھیڑ بکریوں کو مار مار کر ہانک رہے ہو، لگتا ہے باڑے تک پہنچنے سے پہلے دو تین بکریوں کا کام تو تمام کر ہی دو گے۔

''یہ سُن کر چرواہے نے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کے پیچھے بھاگتے ہوئے لڑکوں سے کہا: میری بات کو مذاق میں نہ اڑائیں۔ یہ خوف ناک طوفان بادوباراں ہے، جو تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اگر اس سے بچنا چاہتے ہیں تو میرے پیچھے بھاگتے ہوئے چلے آؤ۔ میں آپ کو محفوظ ٹھکانے تک لے چلوں گا۔''

محمود نے اس کے جواب میں کہا: ''ہمارے خیال میں طوفانِ بادوباراں کے متعلق تمھاری رائے درست نہیں ہے۔ اگر معمولی بارش آ بھی گئی تو کسی درخت کے نیچے پناہ لے لیں گے اور اگر واقعی تیز بارش آ گئی تو اپنا ٹھکانہ بتا دو تا کہ بارش سے بچاؤ کے لیے تمھارے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔''

چرواہے نے بھاگنے کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا: میری بات مان لو اور اپنا سامان اٹھا کر میرے ساتھ چلے آؤ، اگر پھر بھی میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو جب اپنی آنکھوں سے طوفان باد و باراں کو قریب آتے دیکھ لیں تو پھر جنوب کی طرف بھیڑ بکریوں کا باڑہ ہے۔ اس باڑے کے ساتھ ہی پتھروں سے بنا ہوا ایک مکان ہے، جس میں اپنے ماں باپ، بہن اور بھائی کے ساتھ رہتا ہوں، وہاں چلے آنا، ہمارا غریب خانہ آپ لوگوں کے لیے محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوگا۔

''صدیوں سے نسل در نسل بھیڑ بکریاں چرانے والے چرواہے بھی کتنے قدامت پسند اور دقیانوس ہوتے ہیں کہ ذرا سے بادلوں کو دیکھ کر حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ ابھی صبح ہی محکمہ موسمیات نے ٹی وی کی نشریات میں اعلان کیا تھا کہ آیندہ دو دن میں موسم صاف رہے گا اور بارش کا کوئی امکان نہیں ہے، اسی لیے تو ہم اپنے تحقیقی منصوبے پر کام کرنے کے لیے آج یہاں ۔۔۔۔'' کامران نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ سورج گہرے کالے بادلوں کی اوٹ میں چلا گیا، اور اس کے ساتھ چاروں جانب تاریکی چھا گئی۔

''میرے خیال میں تند و تیز ہوا سے بادل آگے نکل جائیں گے اور سورج کی چمکتی ہوئی روشنی ایک بار پھر چار سُو پھیل جائے گی اس لیے..........'' محمود کی بات جاری تھی کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی، جس سے تاریکی میں اور اضافہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر پہلے چرواہے کا مذاق اڑانے والے تینوں دوست اس اچانک طوفان باد و باران سے خوف زدہ ہو گئے۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اس مشکل صورت حال میں کیا کریں۔ موسلا دھار بارش کے ساتھ طوفانی ہوا اِس قدر تیز تھی کہ اُن کو اور اُن کے سامان کو اُڑا لے جائے گی۔ اس لیے تینوں دوست اپنے سامان کے ساتھ درخت کے تنے کے ساتھ چمٹ کر بیٹھ گئے۔

طوفانِ باد و باراں کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ درخت کی شاخوں کے ساتھ اب تنا بھی ہچکولے لینے لگا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ درخت جڑوں سمیت اکھڑ کر کہیں دور جا گرے گا۔ ایسے میں کامران خوف زدہ لہجے میں کہنے لگا: ''سب دوست مصیبت کی اس گھڑی میں وہ تمام دعائیں پڑھنا شروع کر دیں، جو مشکل اور مصیبت کے وقت پڑھی جاتی ہیں۔ امید ہے اس طرح اللہ تعالیٰ ہمیں مشکل سے نجات دے دے گا۔''

کامران نے جیسے ہی بات مکمل کی، تینوں دوستوں کو مصیبت اور مشکل وقت میں پڑھی جانے والی جتنی بھی قرآنی اور نبویؐ دعائیں یاد تھیں، بڑی دل سوزی کے ساتھ اُن کا ورد کرنے لگے۔ دعاؤں کا سلسلہ جاری تھا کہ طوفانِ باد و باراں کی شدت میں کمی آنے لگی۔ تینوں دوستوں نے ہمت کر کے بارش سے شرابور اور

بکھرے ہوئے سامان کو جمع کرنا شروع کر دیا، اسی دوران میں رضوان نے پوچھا: ''اب آپ کے کیا ارادے ہیں؟''

''طوفانِ بادوباراں میں کمی ضرور ہوئی ہے، لیکن یہ معلوم نہیں کہ بارش کا سلسلہ کب تک جاری رہے۔ اس لیے کھلے آسمان کے نیچے بھیگے کپڑوں کے ساتھ زیادہ دیر تک رکا نہیں جا سکتا۔'' کامران نے کہا۔

''پھر کیا ہونا چاہیے؟'' محمود نے پوچھا۔

''طوفانِ بادوباراں سے ذرا پہلے چرواہے نے ہمیں یہاں سے محفوظ جگہ پر منتقل ہونے کا مشورہ دیا تھا اور اپنے ہاں آنے کی پیش کش کی تھی۔ اس کے متعلق آپ دوستوں کی کیا رائے ہے؟'' رضوان نے پوچھا۔

''یہاں اردگرد بارش سے بچنے کے لیے کوئی محفوظ جگہ نظر نہیں آ رہی، اس لیے مسلسل ہونے والی بارش سے بچنے کے لیے چرواہے کے ہاں پناہ لینا مناسب رہے گا۔'' کامران نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''ہم نے طوفانِ بادوباراں سے پہلے چرواہے کی پُر خلوص پیش کش ٹھکرائی تھی۔ اب کس منہ سے اس کے ہاں پناہ لینا چاہیں گے۔'' محمود نے خیال ظاہر کیا۔

''شرم اور حجاب کی کیا بات ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ، ذرا سی شرمندگی اور سارے وقت کا آرام، اس لیے مناسب یہی ہے کہ چرواہے کے ہاں پناہ لے لی جائے۔'' رضوان نے پُر زور انداز میں کہا۔

مسلسل بارش اور سب کچھ بھیگ جانے کی وجہ سے رضوان اور محمود نے کامران کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے چرواہے کی پناہ گاہ کا رُخ کیا۔ وہاں سے نزدیک نظر آنے والا چرواہے کا گھر، بھیگے ہوئے کپڑوں اور وزنی سامان کی وجہ سے خاصا دُور لگ رہا تھا۔ تینوں دوست، آٹھ دس منٹ کی مسافت کے بعد چرواہے کے گھر کے قریب پہنچے تو باڑے میں بند بھیڑ بکریاں، اجنبی لوگوں کو دیکھ کر خوف کے مارے آوازیں نکالنے لگیں۔

چرواہا، بھیڑ بکریوں کی گھبرائی ہوئی آواز سُن کر باہر نکلا تو اُسے بارش میں بھیگتے ہوئے تینوں دوست نظر آئے۔ چرواہے نے انھیں دیکھتے ہی پتھروں سے بنے ہوئے اپنے مکان کا دروازہ کھول کر اندر کمرے میں آنے کی دعوت دی۔ کمرے میں کوئلوں کی انگیٹھی جل رہی تھی، جس سے اندر کا ماحول خاصا گرم تھا۔ کامران، محمود اور رضوان کے کپڑے بُری طرح گیلے ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ ان کو جلد از جلد تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ تینوں دوستوں کے سامان والے بیگ واٹر پروف کپڑے کے بنے ہوئے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے پہنے

والے کپڑے نکالے اور باری باری باتھ روم میں جا کر کپڑے تبدیل کیے۔ گیلے کپڑے چرواہے نے کوئلوں کی انگیٹھی کے اوپر خشک ہونے کے لیے رسی پر لٹکا دیئے۔ خشک کپڑے پہن کر تینوں دوست کوئلوں والی انگیٹھی کے قریب بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھے تو انھیں بہت سکون ملا۔ کمرے کے گرم ماحول سے جب ان کے اوسان بحال ہوئے تو انھوں نے پہلی بار چرواہے کو غور سے دیکھا جو بجھے ہوئے کوئلوں کی جگہ نئے کوئلے انگیٹھی میں ڈال رہا تھا۔

چرواہا اُن کی عمر سے چھوٹا تھا۔ اُس کے کپڑے اگرچہ سادہ تھے لیکن وضع قطع سے لگتا تھا کہ عام چرواہوں کی طرح اَن پڑھ نہیں ہے۔ کامران نے لڑکے سے کہا: ''اب جب کہ ہم رات بھر کے لیے آپ کے ہاں زبردستی کے مہمان بن گئے ہیں تو آپس میں تعارف بھی ہو جانا چاہیے۔''

''کیوں نہیں!'' لڑکے نے یہ کہہ کر بتانا شروع کیا: ''پہاڑ کے دامن میں دریا کے کنارے اِس پتھروں کے بنے ہوئے گھر میں، اپنے ماں باپ اور بہن بھائی کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرا نام نثار ہے۔ میرے بڑے بھائی کا نام صبار ہے۔ بہن کا نام فاطمہ ہے وہ ہم دونوں سے چھوٹی اور چھ سات سال کی ہے۔ میرے ابو کا نام اظہار احمد ہے۔ وہ ......'' نثار نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک صاحب السلام علیکم، کہتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

کامران محمود اور رضوان وعلیکم السلام کہتے ہوئے چٹائی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ نثار کے ابّو نے اُن سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور خود بھی ان کے ساتھ انگیٹھی کے قریب بیٹھ گئے۔

اظہار صاحب نے اُن سے پوچھا: ''طوفان بادوباراں میں وہ اس طرف کیسے نکل آئے۔'' اس کے جواب میں محمود نے بتانا شروع کیا: ''ہمیں اپنی یونیورسٹی کی جانب سے فائنل امتحان میں کامیابی کے لیے ایک پروجیکٹ مکمل کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم یہاں سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع محکمہ جنگلات کے ریسٹ ہاؤس میں گزشتہ رات پہنچے تھے۔ تین دن قیام کے دوران میں پہلے روز آج صبح گیارہ بجے، آپ کے گھر سے کچھ فاصلے پر دریا کے کنارے ہم نے اپنے بیگ رکھے ہی تھے کہ آسمان پر شمال کی جانب سے کالی گھٹا اٹھتی نظر آئی۔ ابھی ہم اس خوب صورت منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ آپ کا بیٹا نثار بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ گزرا، اُس نے ہمیں بتایا کہ آسمان پر چھانے والی بادلوں کی گھٹا بہت جلد شدید طوفانِ بادوباراں کی صورت اختیار کر جائے گی۔ اس لیے فوراً یہاں سے نکل جائیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ہاں پناہ دینے کی پیش کش بھی کی۔ ہم نے نثار کو جاہل اور گنوار چرواہا سمجھتے ہوئے اُس کا مذاق اڑایا اور وہیں بیٹھ کر موسم کا

نظارہ کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں کالی گھٹا نے سورج کو اپنی آغوش میں لے لیا تو چاروں جانب گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی تیز ہوا اور شدید بارش کی صورت میں طوفانِ بادوباراں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس سے پریشان ہو کر ہم نے بالآخر آپ کے ہاں پناہ لینے کا فیصلہ کیا۔"

محمود نے جیسے ہی بات مکمل کی، اظہار صاحب نے سُرخ کوئلوں سے دہکتی ہوئی انگیٹھی کے قریب سے اٹھتے ہوئے کہا: "میں آپ لوگوں کے لیے گھر میں کھانے کا انتظام کرواتا ہوں۔ آپ لوگ نثار احمد کے ساتھ گپ شپ لگائیں، بلکہ صبار احمد کو بھی بھیجتا ہوں۔

اظہار صاحب کے جانے کے تھوڑی دیر بعد صبار احمد السلام علیکم! کہتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے تینوں مہمان نوجوانوں سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور نثار احمد کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی کے بعد رضوان نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا: "نثار میاں! آپ کو بھیڑ بکریاں چراتے ہوئے گنوار سا چرواہا محسوس کیا، لیکن اپنے قریب بیٹھے دیکھ کر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اس ویرانے میں رہتے ہوئے بھی آپ دونوں بھائی تعلیم سے ناتا جوڑے ہوئے ہیں۔ کیا میرا خیال درست ہے؟"

"آپ کا خیال درست ہے۔ میں نویں جماعت، جب کہ صبار بھائی دسویں جماعت کا کورس گھر پر ابا جان سے پڑھ رہے ہیں"۔ نثار احمد نے جواب دیا۔

"آپ لوگ شہر سے دُور اس ویرانے میں کیوں رہ رہے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟" کامران نے سوال کیا۔

"اس سوال کا جواب زیادہ بہتر انداز میں ابا جان ہی دے سکتے ہیں، اس لیے آپ اُن ہی سے پوچھیں"۔ صبار احمد نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا: چلیں اس سوال کا جواب آپ کے ابا جان سے پوچھ لیں گے، لیکن نثار میاں یہ تو بتاؤ کہ تمھیں یہ کس طرح پتا چل گیا کہ طوفان بادوباراں آنے والا ہے؟" محمود نے پوچھا۔

"انسان کے مقابلے میں جانور، کسی بھی قسم کے خطرے کی بُو کو انسان سے بہت پہلے محسوس کر لیتے ہیں اس لیے کسی بھی متوقع خطرے کے موقع پر وہ بے چین و بے قرار ہو جاتے ہیں۔ میں جب بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ آپ کے قریب سے گزر رہا تھا تو بھیڑ بکریوں کے چلنے کی رفتار مجھ سے تیز تھی۔ اس لیے کہ وہ متوقع طوفان بادوباراں کے خطرے کی وجہ سے جلد از جلد اپنے باڑے تک پہنچنا چاہتی تھیں۔" نثار احمد نے تفصیل سے جواب دیا۔

میاں! بھیڑ بکریاں چرانے کا سلسلہ آپ نے کب سے شروع کر رکھا ہے؟" کامران نے معلوم کیا۔

"جب ابا جان نے یہاں آباد ہونے کا فیصلہ کیا تو گزر اوقات کے لیے بھیڑ بکریاں پالنے اور اس مکان کے پچھلی جانب سبزیاں اُگانے کا پروگرام بنایا گیا۔ آغاز میں صرف دو تین بھیڑ بکریاں پالی گئیں، جو وقت کے ساتھ بڑھتی ہوئی ریوڑ کی شکل اختیار کر گئی ہیں۔ مکان کے پچھلی جانب سبزیاں اُگانے کی ذمہ داری صبا ربھائی نے لی۔ چھوٹے سے قطعہ زمین پر سبزیاں اُگانے کا سلسلہ اب خاصا وسیع ہو چکا ہے" ۔ نثار احمد نے بتایا۔

…………………

کھانا کھانے کے بعد تینوں دوست کوئلوں والی انگیٹھی کے اور قریب ہو گئے، کیوں کہ گھر کے باہر چلنے والی تیز برفانی ہوا، دروازے کے سوراخوں میں سے اندر داخل ہو کر کمرے کے ماحول کو سرد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں اظہار احمد کمرے میں داخل ہوئے، انھوں نے نثار احمد سے کہا کہ انگیٹھی کو گرم رکھنے کے لیے اندر سے اور کوئلے لے آؤ۔ یہ کہنے کے بعد انھوں نے تینوں دوستوں کے اصرار پر شہر کو چھوڑ کر اس ویرانے میں رہائش اختیار کرنے پر اپنی داستان یوں شروع کی: "یہ سات آٹھ سال پرانی بات ہے، جب میں محکمہ جنگلات کے صوبائی ہیڈ کوارٹر میں ڈائریکٹر کے طور پر کام کرتا تھا۔۔۔۔۔" اظہار احمد صاحب نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ محمود حیرت سے بولا: "آپ ڈائریکٹر تھے؟ آپ کو موجودہ رنگ ڈھنگ میں دیکھ کر یقین تو نہیں آتا کہ آپ کسی سرکاری محکمے کے ڈائریکٹر بھی ہو سکتے ہیں۔"

"یہ اچھا ہوا کہ آپ نے میری داستان کے آغاز ہی میں شک و شبہے کا اظہار کر دیا۔ اس لیے مجھے اپنی داستان سنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔" یہ کہتے ہوئے اظہار احمد اٹھنے لگے تو کامران اور رضوان دونوں نے محمود کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے، اظہار احمد صاحب سے التجا بھرے لہجے میں کہا: "چچا جان! محمود کے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ کبھی محکمہ جنگلات میں ڈائریکٹر نہیں رہے بلکہ اس جنگل بیابان میں آپ نے جو طرز زندگی اختیار کر رکھا ہے۔ اس پر محمود نے حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ڈائریکٹر جیسے بڑے عہدے پر کام کرنے والا فرد اتنا سادہ نہیں ہو سکتا"۔

کامران اور رضوان کی وضاحت کے بعد اظہار احمد صاحب اپنی داستان کا سلسلہ دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہنے لگے: "میں بتا رہا تھا کہ محکمہ جنگلات کے صوبائی ہیڈ کوارٹر میں ڈائریکٹر کے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ عہدہ جتنا بڑا تھا۔ میری مشکل اور آزمائش بھی اتنی ہی بڑی تھی۔۔۔۔۔"

اظہار احمد صاحب کی بات جاری تھی کہ کامران نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا: "کسی بھی سرکاری محکمے میں ڈائریکٹر صاحبان تو عیش کرتے ہیں۔ دفتری استعمال کے علاوہ انھیں ذاتی استعمال کے لیے بھی گاڑی ملتی

ہے۔ بہت بڑا بنگلہ اور نوکروں کی فوج ظفر فوج ان کے آگے پیچھے ہوتی ہے۔''

''وہ لوگ جو رزق حلال کے مقابلے میں رزق حرام کے لیے رشوت اور کمیشن کو ذریعہ آمدن بناتے ہیں، تو پھر سب کچھ وہی ہوتا ہے، جس کا نقشہ کامران نے کھینچا ہے۔۔۔۔۔ اظہار احمد صاحب سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے: جو افسر رزق حلال پر یقین رکھتے ہیں۔ سرکاری روپے، پیسے کو آخرت کی جواب دہی کے احساس کے تحت ملک وقوم کی امانت سمجھتے ہیں۔ وہ کسی بھی سرکاری محکمے میں ڈائریکٹر کے عہدے پر کام کرتے ہوئے مہنگائی کے اس دور میں مشکل سے اپنے اور اپنے گھر والوں کے روزمرہ کے اخراجات پورے کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرا تعلق بھی ایسے ہی افسروں میں سے تھا۔۔۔۔۔'' اظہار احمد صاحب پانی پینے کے لیے ذرا رُکے، اور دوبارہ کہنے لگے:

''میں بتا رہا تھا کہ عہدہ جتنا بڑا ہوتا ہے، آزمائش بھی اتنی ہی بڑی ہوتی ہے۔ میرے محکمے کا سربراہ، مختلف منصوبوں میں کمیشن کے نام پر ٹھیکیداروں سے لاکھوں روپے سمیٹنے کے چکر میں تھا۔ لیکن اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ میں تھا۔ کیوں کہ محکمے کے تمام مالی امور کی کلیئرنس میرے دستخطوں سے ہوتی تھی۔ میں ایسے مالیاتی منصوبوں پر دستخط کرنے سے انکار کر دیتا تھا، جن کے متعلق مجھے شک ہوتا تھا کہ ان میں مالی بدعنوانی کی گئی ہے۔ محکمے کے سربراہ نے مجھے کئی بار اپنے دفتر میں بلا کر بہت لالچ دیئے اور کئی سبز باغ دکھائے کہ اگر تم صرف دو تین مالیاتی منصوبوں پر دستخط کر دو تو تم دنوں میں لاکھ پتی بن جاؤ گے اور اس کے بعد کروڑ پتی بننے کی راہ خود بخود ہموار ہو جائے گی۔

کئی دفعہ شیطان نے مجھے ورغلایا کہ اتنا بڑا افسر ہونے کے باوجود گھر والوں کے ساتھ تنگی ترشی کی زندگی گزار رہے ہو۔ دو تین مالیاتی منصوبوں پر دستخط کرنے سے تمھارا کیا جائے گا۔ اُلٹا راتوں رات لاکھ پتی بن جاؤ گے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ضمیر مجھے ملامت کرتا اور یہ احساس دلاتا ہے کہ اس چند روزہ زندگی کے بعد جب قبر میں جاؤ گے تو یہی حرام مال و دولت، زہریلے سانپ بن کر قیامت تک ڈستے رہیں گے۔ یہ خیال آتے ہی میں اللہ تعالیٰ سے ثابت قدمی کی دعا کرتا اور مالیاتی منصوبوں پر ناجائز طریقے سے دستخط کرنے سے انکار کر دیتا۔

محکمے کے سربراہ نے محسوس کیا کہ جب تک میں اس محکمے میں ڈائریکٹر مالیات کے طور پر موجود ہوں، اُس کی دال نہیں گل سکتی۔ اُس لیے اس نے دفتر میں اپنے ہموا افسروں کے ساتھ مل کر ایک خطرناک منصوبہ بنایا۔۔۔۔'' اظہار احمد صاحب کی بات جاری تھی کہ رضوان نے تجسس کے مارے جلدی سے پوچھا: ''وہ

خطرناک منصوبہ کیا تھا؟''

''میں وہی بتانے لگا ہوں، اس لیے خاموشی سے سنتے جائیں۔۔۔۔ اظہار احمد صاحب گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے: ایک روز میں معمول کے مطابق دفتر پہنچا تو میرے کمرے کے اندر اور باہر پولیس موجود تھی۔ پولیس کو دیکھ کر میں ابھی حیران اور پریشان ہو رہا تھا کہ انسپکٹر پولیس نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگا دی۔ میں نے اس بات پر سخت احتجاج کیا تو انھوں نے بتایا کہ میری میز کی دراز سے رشوت کے نشان زدہ نوٹ ملے ہیں۔ میں نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کسی فرد کی غیر موجودگی میں اس کی میز کی دراز میں خود ہی نشان زدہ نوٹ رکھ کر اور پھر خود ہی ان نوٹوں کو برآمد کر کے کسی بے گناہ فرد کو رشوت کے الزام میں گرفتار کر لیا جائے۔

انسپکٹر پولیس کے پاس میرے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن اُس نے اِس کے باوجود اصرار کیا کہ پولیس کے اہل کاروں نے میرے میز کی دراز سے رشوت کے نشان زدہ پچاس ہزار روپے مالیت کے نوٹ قبضے میں لیے ہیں۔

پولیس کی یہ ساری کارروائی دیکھ کر میرے لیے اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں تھا کہ یہ سب کچھ محکمے کے سربراہ نے کروایا ہے۔ کیوں کہ میں اُس کی بدعنوانیوں اور مالی بے ضابطگیوں کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ مجھے تھوڑی دیر میں حوالات پہنچا دیا گیا۔ اگلے روز پولیس نے عدالت سے استدعا کر کے مجھے سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا۔ میرے گھر والوں کو اس وقت پتہ چلا جب میں قیدی کی حیثیت سے جیل کی سلاخوں کے پیچھے جا چکا تھا۔

گھر والوں نے میری بے گناہی ثابت کرنے کے لیے دُور پار کے جاننے والے ایک وکیل کی خدمات حاصل کیں۔ اس کے مقابلے میں میرے محکمے کے سربراہ نے بہت بھاری فیس سے سب سے مہنگے وکیل کی خدمات حاصل کیں۔ اس کے علاوہ جس عدالت میں میرے خلاف مقدمہ درج کروایا گیا تھا۔ اس عدالت کے جج کے متعلق عام تاثر یہی تھا کہ وہ روپے پیسے کی چمک سے متاثر ہو کر فیصلے کرتا ہے۔

عدالت میں میرے کیس کے حوالے سے محض رسمی کارروائی ہوئی اور عدالت نے مجھے پانچ سال قید با مشقت کی سزا سنا دی۔ میں کیوں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز رہا تھا۔ اس لیے میرے وکیل کی درخواست پر مشقت کی سزا ختم کر کے جیل کی بی کلاس میں بھیج دیا گیا اور.........'' اظہار احمد صاحب کی دردبھری داستان جاری تھی کہ محمود نے پوچھا: ''چچا جان! آپ کے گھر والوں نے مقامی عدالت کے جج کے

فیصلے کے خلاف اعلیٰ عدالت میں اپیل دائر کی تھی؟''۔

''میں اپنی گفتگو کے آغاز میں بتا چکا ہوں کہ حکومت کے مختلف محکموں میں بڑے سے بڑے عہدے پر فائز افسر مہنگائی کے دور میں رزق حلال کی بنیاد پر مہینے بھر کی تنخواہ پر مشکل سے اپنے گھر کے اخراجات چلا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ گھر والوں کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ بھاری فیس ادا کر کے کسی اچھے وکیل کے ذریعے مقامی عدالت کے فیصلے کے خلاف اعلیٰ عدالت میں اپیل کر سکیں۔ اس لیے پانچ سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند رہنا میرا مقدر بن گیا۔'' اظہار احمد صاحب نے بتایا۔

''جیل جانے کے بعد آپ کے گھر والوں پر کیا گزری؟'' رضوان نے سوال کیا۔

''میرے جیل میں جاتے ہی گھر والوں سے سرکاری رہائش گاہ خالی کروالی گئی۔ شہر میں ہمارا کوئی قریبی عزیز اور رشتے دار نہیں تھا کہ مشکل وقت میں گھر والے ان کے ہاں سر چھپا سکتے۔ اس لیے انھوں نے مجبور ہو کر شہر کے مشرق کی جانب زیر تعمیر بستی میں دو کمروں کا چھوٹا سا مکان کرائے پر لے کر زندگی کے دن گزارنے لگے۔ اس لیے۔۔۔'' اظہار احمد صاحب کی بات جاری تھی کہ کامران نے پوچھا: ''آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ کے گھر والے کتنے افراد پر مشتمل تھے ان کا ذریعہ معاش کیا تھا اور بچوں کی تعلیم کا کیا بنا؟''

''آپ نے ایک سوال میں کئی سوال پوچھ لیے ہیں۔ میں ان سب کا باری باری جواب دوں گا۔۔۔'' یہ کہتے ہوئے اظہار احمد صاحب بتانے لگے: ''ہمارا گھرانہ میاں بیوی کے علاوہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی پر مشتمل تھا۔ تینوں بچے سکول کی ابتدائی جماعتوں کے طالب علم تھے۔ شہر سے باہر زیر تعمیر نئی بستی میں ابھی کوئی سکول موجود نہیں تھا۔ اس لیے بچوں کی والدہ نے تینوں کو گھر ہی میں پڑھانا شروع کر دیا۔''

''گھر کے اخراجات کیسے پورے ہوتے تھے؟'' رضوان نے پوچھا۔

''میری بیوی اگرچہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ لیکن اُس نے پیسے کی خاطر کبھی ملازمت کا نہیں سوچا تھا۔ وہ گھریلو خاتون کے طور پر سارا دن بچوں کی تعلیم و تربیت میں صرف کرتی تھی۔ میری گرفتاری کے بعد گھر کے اخراجات چلانے کے لیے اس نے کئی بار ملازمت کا سوچا۔ لیکن چھوٹی عمر کے بچوں کو دن بھر کس کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے میری سعادت مند بیوی نے گھر میں رہتے ہوئے روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ردی اخبار سے لفافے بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ صبا احمد اور ثنا احمد بھی اپنی والدہ کا ہاتھ بٹاتے اور روزانہ دو تین سو لفافے تیار کر لیتے۔ یہ لفافے زیر تعمیر بستی میں موجود کریانے کی دکان والے کو بیچ دیئے جاتے۔ دکان دار اس کے بدلے میں کھانے پینے اور روزمرہ استعمال کی چند چیزیں دے دیتا۔ اس طرح پانچ

سال تک گھریلو اخراجات کی گاڑی جیسے تیسے چلتی رہی۔‘‘ اظہار احمد صاحب ماضی کی باتوں کو یاد کرتے ہوئے افسردہ ہوگئے۔

’’آپ کے یا آپ کی بیوی کے رشتے دار اور عزیز و اقارب اس شہر میں نہ سہی، ملک دوسرے علاقوں میں تو رہتے ہوں گے۔ انھوں نے آپ کی رہائی کے لیے کوشش اور گھر والوں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مدد کیوں نہ کی؟‘‘ رضوان نے پوچھا۔

’’میں اپنی درد بھری داستان کے آغاز میں یہ بتانا بھول گیا کہ میرا اور میری بیوی کا تعلق ایک ہی خاندان سے تھا۔ وہ میری چچا زاد بہن ہیں۔ قیامِ پاکستان سے پہلے ہمارا گھر بار مشرقی پنجاب کے شہر لدھیانہ میں تھا۔ جب پاکستان وجود میں آیا تو ہمارے پورے خاندان نے مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان آنے کا فیصلہ کیا۔ جو لوگ ہجرت کر کے پاکستان جا رہے تھے۔ ہندو اور سکھ ان کو جان سے مار رہے تھے۔ ہمارے پورے خاندان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ مسلح سکھوں نے رات کی تاریکی میں حملہ کر کے خاندان کے چھوٹے بڑے سب لوگوں کو شہید کر دیا۔ چھوٹی عمر کی وجہ سے ہم دونوں لاشوں کے نیچے زخمی حالت میں دب گئے تھے۔ میری اور چچا زاد بہن کی خوش قسمتی تھی کہ رضا کاروں کی ایک ٹیم مسلح سکھوں کے ہاتھوں شہید ہونے والوں کو سپردِ خاک کرنے کے لیے وہاں سے اٹھانے لگے تو ان کے نیچے ہم دونوں زخمی حالت میں موجود تھے۔ رضا کاروں نے پورے خاندان کے لوگوں کو سپردِ خاک کرنے کے بعد ہمیں اپنی حفاظت میں والٹن کے مہاجر کیمپ میں پہنچا دیا۔

پورے خاندان کی شہادت کے بعد دنیا میں ہم دونوں کا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں رہا تھا۔ جو اس مشکل وقت میں ہمارے سروں پر ہاتھ رکھتا۔ والٹن کیمپ میں ایک بیوہ عورت، جو اپنے تمام عزیز و اقارب کی جانوں کی قربانی دے کر پاکستان پہنچی تھی۔ اس نے کیمپ انچارج کی اجازت سے ہم دونوں کو گود لے لیا۔ اس مہربان عورت، جس نے ماں بن کر ہمیں پالا پوسا، اور لکھایا پڑھایا۔ اسی نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ہم دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا۔ اس کے کچھ ہی ماہ بعد ہماری منہ بولی ماں ہمیں اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔‘‘ اظہار احمد صاحب نے آنکھوں میں موتیوں کی طرح چمکتے آنسوؤں کو رومال سے پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

’’چچا جان! مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ سے ایسا سوال پوچھ بیٹھا، جس کے جواب نے آپ کو دکھی کر دیا ہے۔ اس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں‘‘ رضوان نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”یہی وجہ ہے کہ...... اظہار احمد صاحب نے افسردہ فضا کو ختم کرنے کے لیے گفتگو کا دوبارہ آغاز کرتے ہوئے بتانا شروع کیا: گھر کے اخراجات، بیوی بچے مل کر کسی نہ کسی طرح چلا رہے تھے۔ جیل میں شروع کے کچھ دن تو بہت مشکل گزرے، اس کے بعد ساری صورت حال کو اللہ تعالٰی کی جانب سے آزمائش سمجھتے ہوئے حالات سے سمجھوتہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیل کی بی کلاس کے قیدیوں کو اخبارات اور کتابوں کے مطالعے کی اجازت ہوتی ہے۔

جیل میں سارا دن فارغ گزارنا بہت مشکل کام تھا۔ اس لیے میں نے وقت گزارنے کے لیے لائبریری کا رخ کیا۔ وہاں ناول اور افسانوں کے علاوہ دینی کتابیں بھی موجود تھیں۔ میں نے سب سے پہلے ترجمے والے قرآن مجید کا مطالعہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہر روز فجر کی نماز کے بعد ترجمے والے قرآن مجید کا مطالعہ شروع کرتا تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلتا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ قرآن مجید واقعی زندگی گزارنے کے لیے مکمل ضابطہ حیات ہے۔“

”چچا جان! کیا آپ بتائیں گے کہ آپ لوگ شہر کے پر رونق ماحول کو چھوڑ کر اس جنگل بیابان میں کیوں آ گئے ہیں؟“ محمود نے پوچھا۔

”میں نے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ایک فیصلہ کیا۔ وہ فیصلہ یہ تھا کہ وہ ماحول اور معاشرہ جہاں ایمان داری سے کام کرنے والوں کا صلہ اور بدلہ جیل ہو اور اس کے مقابلے میں بے ایمان اور رشوت لینے والوں کو پوچھنے والا کوئی نہ ہو تو پھر شہری زندگی سے یہ جنگل بیاباں زیادہ اچھا ہے۔“

”چچا جان! اگر آپ......“ کامران نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اظہار احمد صاحب بولے: ”باتوں ہی باتوں میں اتنا وقت گزر گیا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلا، اب آپ لوگ سو جائیں، باقی باتیں صبح ناشتے پر کریں گے“۔ یہ کہتے ہوئے اظہار احمد صاحب کے ساتھ ان کے دونوں بیٹے صبار احمد اور نثار احمد اٹھے اور دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

....

”کامران! ایک روز تم بتا رہے تھے کہ تمھارے ابو محکمہ جنگلات میں بہت بڑے افسر لگے ہوئے ہیں۔ کیا وہ اظہار احمد صاحب کی بے گناہی ثابت کر کے انھیں دوبارہ محکمہ جنگلات میں بحال نہیں کروا سکتے؟“ محمود نے اظہار احمد صاحب کے دوسرے کمرے میں جاتے ہی پوچھا۔

”محمود! تم نے بہت اچھی توجہ دلائی ہے۔ میں اسی وقت ابو کو موبائل فون پر ساری صورت حال سے آگاہ

کرتا ہوں۔ ممکن ہے وہ اس پوزیشن میں ہوں کہ اظہار احمد صاحب کو اُن کے عہدے پر بحال کروا سکیں۔ یہ کہہ کر کامران نے فون پر ابّو سے رابطہ کیا اور سب سے پہلے اس نے اپنے اور دونوں دوستوں کے متعلق بتایا کہ وہ اس وقت کہاں موجود ہیں۔ اس کے بعد اس نے اظہار احمد صاحب کے متعلق ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔

کامران کے ابّو نے اُس سے پہاڑوں کے دامن میں دریا کے کنارے اظہار احمد صاحب کے گھر تک پہنچنے کا سارا پتہ تفصیل سے معلوم کیا اور فون بند کر دیا۔ رات خاصی بیت چکی تھی، اس لیے تینوں دوست جلد ہی نیند کی وادی میں کھو گئے۔

……

کامران محمود اور رضوان گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ اظہار احمد صاحب کی آواز کمرے میں گونجی:

”بھئی! کب تک سوتے رہو گے، نماز فجر کا وقت ہو گیا ہے، آؤ مل کر نماز ادا کرتے ہیں۔ تینوں جلدی سے اٹھے، وضو کیا اور سب نے مل کر نماز ادا کی۔ نماز کے بعد تینوں دوست پھر بستروں میں گھس گئے۔ تھوڑی دیر میں صبار احمد اور نثار احمد ناشتا لے آئے۔ دسترخوان پر ناشتہ سجایا جا رہا تھا کہ اظہار احمد صاحب بھی السلام علیکم کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

ناشتے کے ساتھ ہی اِدھر اُدھر کی باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کامران موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے رات کو جو بات اظہار احمد صاحب سے پوچھنی تھی۔ اس کے متعلق وہ کہنے لگا: ”چچا جان! اگر آپ ......“ کامران نے بات شروع ہی کی تھی کہ باہر گاڑیوں کا شور سنائی دیا۔ نثار احمد جلدی سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو اسے تین گاڑیاں نظر آئیں۔ ایک چھوٹی اور دو بڑی گاڑیاں تھیں۔ نثار احمد اندر آ کر بتانے ہی لگا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اظہار احمد صاحب کے ساتھ تینوں دوست بھی کمرے سے باہر نکلے تو سامنے کامران کے ابو کھڑے تھے۔

اظہار احمد صاحب حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ نئے ماڈل کی گاڑی پر آنے والے صاحب کے ساتھ محکمہ جنگلات کی دو بڑی گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ کامران، آگے بڑھ کر اپنے ابّو سے لپٹ گیا۔ اظہار احمد صاحب کے چہرے پر ابھی تک حیرت کے آثار موجود تھے۔ انھوں نے کامران کے ابّو سے ہاتھ ملایا اور انھیں اندر آنے کی دعوت دی۔ جسے کامران کے ابو نے خوشی سے قبول کر لیا۔ اظہار احمد صاحب کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ صبح ہی صبح محکمہ جنگلات کی دو بڑی گاڑیوں کے ساتھ کون صاحب بغیر اطلاع ان کے ہاں آئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ اظہار احمد صاحب، کامران کے ابّو سے پوچھتے کہ وہ کس مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ کامران کے ابو نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا: ”اظہار احمد صاحب میں بہت دنوں سے آپ کی تلاش میں تھا......“

کامران کے ابّو نے اتنا ہی کہا تھا کہ اظہار احمد صاحب یہ سن کر گھبرا گئے کہ اب پھر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔

کامران کے ابّو، اظہار احمد صاحب کے چہرے کے تاثرات کو دیکھے بغیر کہہ رہے تھے: زرعی یونیورسٹی سے ایم ایس سی کرنے کے بعد مجھے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے سکالرشپ مل گیا۔ بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے ساتھ ہی مجھے وہاں بہت اچھی ملازمت مل گئی۔ اس لیے میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہاں کے ماحول میں رَچ بُس گیا۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے مجھے حکومت پاکستان کی جانب سے پیغام ملا کہ آپ کی صلاحیتوں اور خدمات کی پاکستان کو زیادہ ضرورت ہے۔ اس لیے آپ وطن واپس آ کر محکمہ جنگلات کی تعمیر وترقی کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ میں نے حکومت کی یہ پیش کش اس شرط پر قبول کر لی کہ مجھے یہ اختیار حاصل ہوگا کہ محکمہ جنگلات کی تعمیر وترقی کے لیے زیادہ سے زیادہ باصلاحیت اور ایمان دار لوگوں کو اپنا دست وبازو بنا سکوں۔ وطن واپس آتے ہی میں نے محکمہ جنگلات کے سربراہ کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی تو پتہ چلا کہ محکمہ جنگلات کی تباہی وبربادی کے لیے اوپر سے لے کر نیچے تک رشوت اور بدعنوانی کا بازار گرم ہے۔ مجھے دفتر کے ایک محنتی اور ایماندار کلرک نے بتایا کہ کئی سال پہلے محکمہ جنگلات میں ایک افسر اظہار احمد صاحب ہوتے تھے، جو اپنی امانت ودیانت کے لیے مشہور تھے۔ لیکن محکمے کے رشوت خور سربراہ کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ اس لیے انھوں نے اظہار احمد صاحب کو اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتے ہوئے رشوت کا جھوٹا الزام لگا کر اُن کو پانچ سال کے لیے جیل بھجوا دیا۔

محکمے کے کلرک کی یہ بات سن کر مجھے بہت دکھ ہوا کہ ایک دیانت دار افسر کو اس کی امانت ودیانت کی سزا دی گئی ہے۔ میں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ محکمہ جنگلات کے جس دفتر میں آپ کام کیا کرتے تھے۔ اُس کے سربراہ کو برطرف کر دیا اور رشوت وبدعنوانی کے ذریعے بنائی گئی اُس کی ساری جائیداد ضبط کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد دوسرا کام آپ کی تلاش تھی۔ سنٹرل جیل کے عملے سے پتہ چلا کہ آپ دو سال پہلے اپنے ناکردہ گناہ پر پانچ سال کی قید بھگت کر رہا ہو چکے ہیں۔ لیکن رہائی کے بعد کسی کو بھی آپ کا کچھ اتا پتا نہیں تھا کہ آپ کہاں چلے گئے ہیں۔ میں آپ کی تلاش میں تھا کہ رات کو کامران بیٹے کا موبائل فون پر پیغام ملا کہ جن صاحب کی آپ کو تلاش ہے۔ اتفاق سے میں اپنے دوستوں کے ساتھ پہاڑوں کے دامن میں دریا کے کنارے اُن کے گھر میں موجود ہوں۔ یہ اطلاع ملتے ہی میں نے ہنگامی طور پر اپنے محکمے کی دو بڑی گاڑیوں کو تیار رہنے کا حکم دیا اور صبح ان گاڑیوں کو اپنے ساتھ لے کر یہاں پہنچا ہوں کہ آپ کو اور آپ کے گھر بار کے سامان کو اپنے ساتھ لے کر شہر واپس آؤں گا”۔

''لیکن میں تو واپس شہر نہیں جانا چاہتا۔ خاص طور پر اُس محکمے میں تو کبھی نہیں جاؤں گا، جس ادارے کے سربراہ نے میری امانت ودیانت کا بدلہ پانچ سال جیل کی سزا کی صورت میں دیا۔'' اظہار احمد صاحب نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔

''میں آپ کو تھوڑی دیر پہلے بتا چکا ہوں کہ محکمے کے جس سربراہ نے آپ کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اُس کو اپنے کیے کا بدلہ مل گیا ہے۔ اس لیے آپ واپس چلیں۔ مجھے آپ جیسے دیانت دار افسر کی ضرورت ہے۔'' کامران کے ابو نے کہا۔

''شہر کے نفرتوں اور عداوتوں سے بھرے ماحول کے مقابلے میں یہاں پہاڑ کے دامن میں دریا کے کنارے، خود کو فطرت کے قریب تر محسوس کرتا ہوں۔ شہری زندگی کی منافقت وریا کاری کے مقابلے میں یہاں چاروں جانب پُرسکون ماحول ہے۔ میں اس کو چھوڑ کر شہر کے گندے ماحول میں واپس نہیں جانا چاہتا۔'' اظہار احمد صاحب نے ایک بار پھر انکار کرتے ہوئے کہا۔

''یہ درست ہے کہ آپ کو ماضی میں اپنی دفتری ذمہ داریاں امانت ودیانت کے ساتھ انجام دینے کے لیے قدم قدم پر رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن آج آپ کو میری موجودگی میں محکمے سے رشوت اور بدعنوانی کے اندھیروں کو شکست دینے کا موقع مل رہا ہے تو اس مرحلے پر آپ کا انکار کم ہمتی اور بزدلی کا ثبوت پیش کرے گا۔''

کامران کے ابو کی یہ بات سن کر اظہار احمد صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اپنی زندگی کے بے شمار قیمتی سال امانت ودیانتداری کے ساتھ محکمہ جنگلات کے لیے وقف کرنے کے باوجود، ادارے کے سربراہ کی جانب سے بددیانتی کے جھوٹے الزام کی وجہ سے پانچ سال کے لیے بیوی بچوں سے دور جیل کی کال کوٹھری کا ایک ایک دن ان کی نظروں کے سامنے گھوم گیا، لیکن انھوں نے ملک وقوم کے لیے اپنا سب کچھ قربان اور نچھاور کرنے کے احساس اور جذبے کے ساتھ فیصلہ کن لہجے میں کہا: ''اگر محکمے کو آپ جیسا نیک، پُرعزم اور جرأت مند سربراہ مل گیا ہے تو پھر میں بھی اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت کے سہارے آپ کا دست وبازو بن کر رشوت اور بدعنوانی کے اندھیروں کو شکست دینے کے لیے آخری سانس تک جد وجہد اور کوشش کروں گا۔

یہ سنتے ہی سب کی زبان سے بے اختیار نکلا: ان شاء اللہ

☆☆☆☆

محمد علی چراغ

شیطان کی انگلی

جن بابا نے شیطان سے دوستی ہی اسی لیے کی تھی کہ وہ شیطان سے کچھ باتیں سیکھ سکے۔ ہوتا یوں کہ دونوں دوست اکٹھے ادھر ادھر گھومتے رہتے۔ جن بے چارہ اس آوارہ گردی میں بور ہوتا رہتا اور شیطان میاں کہیں اپنا کام دکھا آتے۔

شیطان کو اپنے کارناموں اور شیطانیوں کے بعد بڑا ہی لطف محسوس ہوتا۔ وہ جی ہی جی میں اپنی کامیابیوں پر خوش ہوتا رہتا تھا۔

جن نے چند ہی دنوں میں یہ جان لیا تھا کہ شیطان کو ہر اس کام سے خوشی ہوتی ہے کہ جو برا ہوتا ہے۔ جس میں لوگوں کو کچھ نقصان اٹھانا پڑتا ہے یا جس عمل یا فعل سے لوگوں میں دنگا فساد برپا ہوتا ہے۔ جن بابا نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ شیطان ہی لوگوں کو برے کاموں پر اُکساتا ہے۔

ایک دن، جن بابا اور شیطان میاں کسی بازار میں سے گزر رہے تھے۔ جن بابا نے شیطان میاں سے پوچھ ہی لیا۔

مَیں نے دیکھا ہے کہ تم تو کچھ بھی نہیں کرتے، لیکن اس کے باوجود تم لوگوں میں اس قدر بدنام کیوں ہو؟ ہر برے کام کا سبب تمھیں ہی کیوں سمجھا جاتا ہے؟”

یہ دلچسپ سوال سن کر شیطان ترچھی سی ہنسی ہنسا، اور بولا “واقعی تمھارا خیال سو فیصد درست ہے۔ لوگ اصل میں برائیاں اور برے کام خود ہی کرتے ہیں، لیکن ڈال میرے کھاتے میں دیتے ہیں۔”

اس کے ساتھ ہی شیطان کو سامنے بازار میں دودھ دہی کی ایک دکان دکھائی دی۔ شیطان نے جن بابا سے کہا “کیا وہ دودھ دہی کی دکان دیکھ رہے ہو؟” جن نے کہا “ہاں دیکھ رہا ہوں” دودھ دہی کی دکان میں ایک شیشے کی الماری چینی کے کچھ پیالے، شیشے کے گلاس، دودھ سے بھری ہوئی کڑاہی اور دہی کے کئی کونڈے پڑے تھے۔ ادھیڑ عمر کا شخص اس دکان کا مالک اس وقت کام کاج سے فارغ ہو کر گاہکوں کے انتظار میں اونگھ رہا تھا۔

شیطان کی شیطانی کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اس نے کہیں سے اپنی شہادت کی انگلی کی صرف پہلی پوری کو شہد میں ڈبویا اور جن بابا کو لے کر دودھ دہی کی دکان پر آ گیا۔

دودھ دہی کی دکان والا ابھی سونے اور جاگنے کی کیفیت میں تھا۔ شیطان نے شہد لگی ہوئی وہی انگلی دکان دار کی کونڈوں والی الماری پر لگا دی اور بس اس کے بعد وہ فارغ ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس نے جن بابا سے کہا۔ اب اس کے بعد کے حالات اور واقعات تم خود ہی دیکھتے رہنا۔

صاف ستھرا، تازہ، خوشبودار اور میٹھا شہد کونڈوں والی الماری پر لگا تھا۔ اس لیے چند ہی منٹوں کے اندر اندر شہد کو کھانے کے لیے کئی ایک چیونٹیاں اور مکھیاں آ گئی تھیں۔ بلکہ اب تو مکھیاں جھنجھنانے لگی تھیں۔ دکان دار بھی اس جھنجھناہٹ کو سن کر ہوشیار ہو کر گدی پر بیٹھ گیا تھا اور گاہکوں کا انتظار کرنے لگا تھا۔

شہد پر بیٹھی اور جھنجھناتی مکھیوں کو دیکھ کر قریب کی دیوار کی درز میں سے ایک چھپکلی بھی نکل آئی تھی۔ چھپکلی نے سوچا اب تو بہت سے شکار میرے قریب ہیں میں ان مکھیوں کو خوب کھا سکوں گی۔ لہٰذا وہ بڑی ہی احتیاط اور آہستگی سے مکھیوں کی جانب بڑھنے لگی۔

دکان دار نے چوہوں کے خاتمے کے لیے ایک بلی بھی پال رکھی تھی۔ سات قریبی گھروں کی گشت کرنے کے بعد بلی بھی دودھ دہی کی دکان کے پاس آئی اور کہیں لیٹ کر سونے کے لیے سوچنے لگی۔

چپکے سے بلی نے دکان کے اندر لیٹ کر اپنے پورے جسم کو کھینچ اور پھیلا کر پہلی ہی انگڑائی لی تھی کہ اس کی نظر اس چھپکلی پر پڑی جو رفتہ رفتہ مکھیوں کی جانب بڑھ رہی تھی اس کے بعد بلی نے بھی ٹکٹکی باندھ کر چھپکلی کو دیکھنا شروع کر دیا۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ شہد پر مکھیوں کی رونق ہے۔ مکھیوں کی جانب آہستہ آہستہ ایک چھپکلی بڑھ رہی ہے اور چھپکلی پر جھپٹنے کے لیے ایک بلی بھی انتظار میں بیٹھ گئی ہے۔

عین اسی وقت ایک گاہک دودھ لینے کے لیے آ جاتا ہے۔ گاہک کے ساتھ ہی اس کا گھریلو کتا بھی ہے۔ دکان کے سامنے آ کر کتے نے ایک جھرجھری لی اور اپنے جسم کو جھاڑا۔ اس نے کانوں کو بھی جھاڑا۔ کانوں کے جھاڑنے کی آواز کو دکان دار نے بھی سنا۔

اس کے بعد جوں ہی کتے نے منہ اُٹھا کر دکان دار کو دیکھا تو اسے دکان کے اندر ایک بلی کسی مورچے پر ڈٹی ہوئی دکھائی دی۔ کتا وہیں پر تن کر کھڑا ہو گیا کہ اسے شکار مل گیا۔

اب نقشہ یوں ہے کہ:

شہد پر مکھیوں کا میلہ لگا ہوا ہے۔
مکھیوں پر چھپکلی جست لگائے بیٹھی ہے۔
چھپکلی پر جھپٹنے کے لیے بلی بالکل تیار ہے۔
کتا بھی اب بلی پر کودنے والا ہے۔

۔۔۔۔اور دکان دار گاہک کو دودھ دے رہا ہے، جن بابا اور شیطان اس ساری صورتِ حال کو دیکھ رہے ہیں۔ اسی دوران میں ایک دھماکہ سا ہوتا ہے اور طوفان بدتمیزی کھڑا ہوجاتا ہے وہ اُودھم مچتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ چھپکلی مکھیوں پر جھپٹتی ہے۔ چھپکلی پر بلی کودتی ہے اور بلی پر کتا اُچھل کر کود گیا۔ اس دوڑ بھاگ میں بلی دودھ کی کڑاہی میں جاگری۔ کتا دہی کے کونڈوں سے جاٹکرایا۔ چھپکلی بھاگ کر دیوار کی درز میں جاگھسی اور مکھیاں دوبارہ اس شہد پر آکر بھنبھنانے لگیں۔

دکان دار کا چوں کہ سارا دودھ خراب ہوگیا اور اس کے کئی دہی کے بھرے ہوئے کونڈے بھی ضائع ہوگئے۔ اس لیے اس نے غصے میں آکر کڑچھا مار کر گاہک کے کتے کو زخمی کردیا۔

گاہک نے اپنے کتے کا بدلہ لینے کے لیے دکان دار کے پیٹ میں برف توڑنے والا سوا جھونک دیا۔ اس پر دکان دار کے وارثوں نے گاہک کو قتل کردیا۔

یہ سب کچھ آناً فاناً ہوگیا اور شیطان چپکے سے دیکھتا رہا۔

یہ سارا ماجرا دیکھ کر شیطان نے جن بابا سے کہا کہ ”بھلے میاں، اب تم ہی بتاؤ اس سارے کھیل میں میرا کیا قصور ہے اور مَیں نے اس میں کیا ہی کیا ہے؟“

جن بابا نے ایک طرح سے شیطان کو چڑانے کے لیے کہا:

”ہاں! شیطان میاں، تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ تم نے صرف شہد کی انگلی لگائی تھی۔“

اس پر شیطان نے کچھ مزید وضاحت کرنے کے لیے جن بابا کو مخاطب کیا، لیکن جن بابا اس کی دوستی سے توبہ کر کے جاچکا تھا۔

☆☆☆☆

مسعود مفتی

سماجی بھلائی

اسلم دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک شام وہ گلی میں جا رہا تھا کہ اُسے اکرم مل گیا۔ اکرم بھی اسلم کے ساتھ دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

اسلم نے اکرم سے پوچھا کہاں جا رہے ہو دوست؟

اکرم نے کہا میں تمھاری طرف ہی آ رہا تھا۔ سوچا چل کر تمھارے ساتھ کچھ گپ شپ لڑائیں تو وقت اچھا گزر جائے گا۔

اسلم بولا میں بھی اسی لیے نکلا ہوں کہ کہیں گھوم آئیں۔ کچھ سیر ہو جائے گی اور باتیں بھی ہوں گی۔

اکرم نے کہا بڑا اچھا خیال ہے۔

اسلم نے پوچھا تو کہاں چلیں؟

اکرم بولا میرا خیال ہے کہ نہر کی طرف چلتے ہیں۔ نہر کے ساتھ ساتھ چلنے سے گرمی بھی کم لگے گی۔

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے ساتھ والے مکان کی چھت سے کسی نے کیلے کے چھلکے گلی میں پھینکے۔ اسلم نے کہا۔ دیکھو کتنی بری بات ہے۔

اکرم نے کہا کہ بات تو واقعی بری ہے۔

اسلم کہنے لگا مجھے ڈر ہے کہ کسی گزرنے والے کا پاؤں چھلکوں پر پڑ گیا تو وہ پھسل جائے گا اور اسے چوٹ بھی لگ سکتی ہے۔ میں ان چھلکوں کو اُٹھا کر ایک طرف پھینک دیتا ہوں۔

اکرم نے کہا ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے، کہ دوسروں کے پھینکے ہوئے چھلکے اُٹھاتے پھریں۔ جس نے یہ چھلکے پھینکے ہیں، اُس کو کہنا چاہیے کہ آ کر اُٹھائے۔

اسلم نے کہا اگر اُس آدمی میں اتنی عقل ہوتی تو وہ چھلکے پھینکتا ہی کیوں؟ جس کو دوسروں کا کوئی خیال نہ ہو، اُس سے یہ اُمید کیوں رکھیں کہ وہ خود اُٹھانے آئے گا۔

یہ کہہ کر اسلم نے کیلے کے چھلکے راستے سے اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیے جہاں سے کوئی نہ گزرتا تھا۔

اس پر اکرم اسلم کا مذاق اُڑانے لگا۔

اگلے دن سکول میں آدھی چھٹی کے وقت اُنھوں نے یہ واقعہ اپنے اُستاد صاحب کو سُنایا تو انھوں نے اسلم کو شاباش دی۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ جو لوگ دُوسروں کی تکلیف کا خیال نہیں کرتے وہ اچھے شہری نہیں ہیں۔"

اُستاد صاحب کی بات سُن کر اکرم نے بُرا سا مُنہ بنایا تو وہ ہنس کر کہنے لگے:

بیٹھو! میں تمھیں ایک کہانی سُناتا ہوں۔ کسی مُلک کا بادشاہ مر گیا۔ وہ اپنی زندگی میں بڑا مغرور تھا۔ ایک دن اُس کے وزیر نے خواب دیکھا کہ بادشاہ جنت میں گھوم رہا ہے۔ وزیر نے اُس سے پوچھا کہ آپ تو بہت مغرور تھے۔ آپ کو جنت میں کیسے جگہ مل گئی؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ میں ایک دن جنگل میں شکار کھیل رہا تھا کہ راستہ بھول کر اپنے ساتھیوں سے الگ ہو گیا۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی درخت کے نیچے پڑا ہے۔ زمیں پر لیٹنے سے اُس کے جسم میں کیکر کے کئی کانٹے چُبھے ہوئے تھے۔

میں نے بڑی احتیاط سے سارے کانٹے اُس کے جسم سے نکالے اور اُس کا سر دباتا رہا۔ اتنے میں میرے ساتھی بھی مجھے ڈھونڈتے ہوئے اُدھر آ نکلے۔ میرے کہنے پر اُنھوں نے اس زخمی آدمی کو لیا اور میرے ساتھ محل میں لے آئے۔ یہاں اُس کا کچھ دن علاج ہوتا رہا۔ آخر وہ بالکل تندرست ہو گیا۔ پھر میں نے اُسے کچھ انعام دے کر رُخصت کیا۔ وہ دُعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ آج مجھے اُس آدمی کی خدمت کرنے کی وجہ سے جنت میں جگہ ملی ہے۔

جب اُستاد صاحب اسلم اور اکرم سے باتیں کر رہے تھے۔ تو کئی اور لڑکے بھی پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور اُن کی باتیں سنتے رہے۔ اِتنے سارے لڑکوں کو ایک اُستاد کے پاس کھڑے دیکھا تو سکول کے مولوی صاحب بھی اُن کے پاس آ گئے اور پُوچھنے لگے۔

لڑکو: کیا ہو رہا ہے؟

اسلم نے کہا کہ ہم ایک بات کے متعلق مشورہ کرنے اُستاد کے پاس آئے تھے۔

مولوی صاحب نے پُوچھا کس بات کا مشورہ؟

اسلم نے کہا میں اپنے دوست سے کہہ رہا تھا کہ لوگوں کو تکلیف سے بچانے کے لیے اگر ہمیں کوئی ایسا کام کرنا پڑے جو ہم عام طور پر نہیں کرتے تو ہمیں شرم محسوس نہیں کرنی چاہیے، بلکہ وہ کام کر لینا چاہیے۔

پھر اسلم نے مولوی صاحب کو کل کی ساری بات بتائی۔

مولوی صاحب بھی اسلم پر بہت خوش ہوئے اور لڑکوں سے کہنے لگے:۔

لڑکو: تمھیں شاید علم نہیں کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لوگوں کی خدمت اور نیکی کے کاموں میں سب کا ساتھ دو۔ مگر گناہ اور ظلم کے کام میں کسی کے ساتھی نہ بنو۔

ایک لڑکے نے کہا مولوی جی۔ آپ اُس دِن جماعت میں ایک حدیث بھی تو سنا رہے تھے۔

مولوی صاحب نے جواب دیا وہ حدیث یہ تھی کہ رسول کریم نے فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت نہیں بھیجتا، جو اللہ کے بندوں پر رحم نہیں کرتا اور اُن کے دکھ میں ان کی مدد نہیں کرتا۔ اِس طرح اگر ہم کوئی ایسا کام کرتے ہیں جس کے نتیجے میں دوسروں کو کوئی پریشانی نہ ہو تو یہ اور بھی اچھی بات ہے۔

پھر مولوی صاحب نے لڑکوں کو بتایا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ بننے سے پہلے روز اپنے محلے میں ایسے لوگوں کے گھروں میں جا کر اُن کی بکریوں کا دُودھ دوہ دیا کرتے تھے، جن کے ہاں یہ کام کرنے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔ جب آپ خلیفہ بنے تو اک دن ایک لڑکی نے آ کر کہا کہ آپ تو خلیفہ بن گئے ہیں اب ہماری بکریوں کا دُودھ دوہنے میں کون ہماری مدد کرے گا؟

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:

بیٹی! فکر نہ کرو۔ میں اب بھی تمھاری بکریوں کا دُودھ دوہ دیا کروں گا۔

اسی طرح مولوی صاحب نے حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ سُنایا جب وہ خلیفہ تھے تو جنگ کے زمانے میں سپاہیوں کے خط خود جا کر اُن کے گھروں میں بانٹا کرتے تھے پھر گھر والوں سے پُوچھ کر ان کا جواب بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ اگر ان کو کوئی پریشانی ہوتی تو ان کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ اسی طرح بیوہ عورتوں کو بازار سے سودا لا دیتے۔ اُن کے پینے کے لیے پانی بھی بھر کر لایا کرتے تھے۔

یہ اچھی اچھی باتیں سن کر تمام لڑکے بہت خوش ہوئے اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ اُستاد صاحب اور مولوی صاحب بھی اس واقعہ کے متعلق باتیں کرتے کرتے ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر کی طرف چل دیے۔ وہاں پہنچے تو باتوں باتوں میں انھوں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو بھی یہ قصہ سنایا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے یہ بات سنی۔ تو کہنے لگے: میرا خیال ہے کہ ابھی لڑکے اتنے سمجھدار نہیں ہوئے کہ خود ہی یہ باتیں سوچ سکیں۔ اسلم کو خود خیال آ گیا۔ مگر ایسے لڑکے کم ہوں گے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ دوسرے لڑکوں کو بھی یہ باتیں ایسے طریقے سے سمجھائی جائیں کہ وہ اچھی طرح ان کی باتوں کو سمجھ جائیں۔ میں حکومت کے متعلقہ محکمہ کو لکھوں گا کہ وہ ہمیں چند ایسی فلمیں بھیج دیں۔ جن میں اسلام کے ایسے اصولوں کو بیان کیا گیا ہو۔

چند دن بعد سکول میں نوٹس لگا کہ آج شام کی نماز کے بعد سکول کے میدان میں فلم دکھائی جائے گی۔ ایک لڑکے نے دوسرے کو بتایا۔ دوسرے نے بھاگ کر تیسرے کو اور اس طرح یہ خبر جلد ہی سب لڑکوں میں پھیل گئی۔ وہ جب گھر گئے۔ تو اُنھوں نے اپنے اپنے ماں باپ کو بتایا۔ بھائی بہنوں کو بتایا۔ اور ہمسایوں کو بتایا۔ اس طرح یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ اور لوگ بڑے شوق سے شام کا انتظار کرنے لگے۔

دسویں جماعت کے طالب علموں کو اُن کے اُستادوں نے دُوپہر کے بعد ہی سکول میں بلا لیا، تا کہ وہ انتظام کر سکیں۔ انھوں نے میدان میں سے پتھر، اینٹیں اور ڈھیلے ہٹا دیے اور بیٹھنے کے لیے زمین صاف کر دی۔

پھر دو دو لڑکے مل کر پانی کی بالٹی اُٹھا کر لاتے اور زمین پر تھوڑا تھوڑا پانی چھڑک دیتے۔ تا کہ مٹی نہ اُڑے۔ زمین سُکھ گئی تو انھوں نے کمروں سے دریاں نکلا کر اس پر بچھا دیں۔

بعض لڑکے بھاگے بھاگے گھروں کو گئے۔ اور اپنے ساتھ چٹائیاں اور کھیس لے آئے اور اپنے بیٹھنے کے لیے جگہ کی نشانی بنا کر رکھ دیے۔

پھر انھوں نے کمروں سے کرسیاں نکلا کر کچھ فاصلے پر نصف دائرے کی شکل میں لگا دیں۔

تا کہ ان پر اُستاد، افسر اور قصبے کے دوسرے بزرگ بیٹھ سکیں۔

ایک طرف کچھ چارپائیں کھڑی کر کے اُن پر چادریں ڈال دی گئیں تا کہ گاؤں کی عورتیں پردے میں بیٹھ سکیں اور چند کُرسیاں لگا دیں۔

ابھی شام ہونے میں کافی دیر تھی کہ گاؤں کے چھوٹے بچے وہاں پہنچ گئے اور ادھر اُدھر دوڑنے اور دریوں پر کشتی کرنے لگے۔ بڑے لڑکے ان کو بار بار ہٹاتے مگر وہ پھر آ جاتے۔

شام ہونے لگی تو دکانداروں نے دکانیں وقت سے پہلے ہی بند کر دیں۔ تانگے والوں نے گھوڑے کھول دیے۔ درزی کی مشین رُک گئی۔ ٹھیکے والے مزدور بھی جلدی کام بند کر کے آ گئے۔ لوہار کی بھٹی ٹھنڈی ہو گئی۔ کاریگروں کے ہاتھ رُک گئے۔

ہر شخص مغرب کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی اذان ہوئی، لوگوں نے مسجد میں نماز ادا کی اور پھر جلدی جلدی سکول کی طرف چل دیے۔ وہ راستے میں بھی خیال ہی خیال میں فلم کا لُطف لے رہے تھے۔

وہاں پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ میدان میں ایک طرف فلم دکھانے والی موٹر کھڑی ہے۔ جس کے پیچھے ایک دروازہ ہے۔ جو کھلا ہے۔ اس میں سے فلم دکھانے والی مشین نظر آ رہی ہے۔ اس موٹر سے کافی دُور سامنے

والی دیوار کے پاس بہت بڑا سفید پردہ لگا ہوا تھا۔ جس کے پاس سکول کے چند لڑکے کھڑے تھے اور گاؤں کے چھوٹے بچوں کو ہٹا رہے تھے، جو تھوڑی دیر بعد پھر وہاں آ جاتے اور پردے کو ہاتھ لگا کر دیکھنا چاہتے۔

اسی طرح کئی بچے موٹر کے پاس بھی کھڑے تھے اور گردنیں لمبی کر کر کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گاڑی والا تھوڑی تھوڑی دیر بعد پکارتا۔

بچو ذرا پیچھے ہٹ جاؤ۔

لڑکے آواز سن کر پیچھے ہو جاتے۔ مگر پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھ آتے۔

تھوڑی دیر بعد موٹر والوں نے مشین پر گانے لگا دیے اور لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر سننے لگے۔ گانوں کی آواز سن کر گاؤں سے اور لوگ بھی بھاگ بھاگ کر سکول کی طرف آنے لگے۔

اتنے میں ہیڈ ماسٹر صاحب اٹھ کر پردے کی طرف گئے اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جسے دیکھ کر موٹر والوں نے گانے بند کر دیے۔ اب ہیڈ ماسٹر صاحب تقریر کرنے لگے۔

پیارے بچو۔ بھائیو اور بہنو! آپ کی بہت مہربانی کہ آپ اپنے اپنے ضروری کام چھوڑ کر اور وقت نکال کر یہاں آئے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ ہم آپ دکھائیں گے۔ وہ ہم سب کے لیے بہت مفید ہوگا۔

لوگوں کا عام خیال یہی ہوتا ہے کہ ہمیں صرف وہ کام کرنا چاہیے جس سے ہم روزی کماتے ہیں۔ یا جو ہمارا اپنا کام ہے۔ یا ہمارے بچوں کا ہے۔ یا ہمارے رشتہ داروں کا ہے۔ جب یہ سارے کام نہ ہوں تو ہم بے کار بیٹھے رہتے ہیں۔ آج ہم آپ کو بتانا چاہتے ہیں کہ یہ خیال درست نہیں۔ ایک کام ایسا بھی ہے کہ، جو ہمارے اپنے لیے یا ہمارے بچوں کے لیے ہمارے رشتہ داروں کے لیے نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کے لیے کیا جاتا ہے اور اس میں کوئی معاوضہ یا لالچ نہیں ہوتا۔ اس سے ہماری نیکی بڑھتی ہے اور دوسروں کی مدد ہو جاتی ہے۔ اسے ہم عوامی خدمت کہتے ہیں۔ یعنی ایسا کام جس سے کسی ایک آدمی یا بہت سے لوگوں کا بھلا ہو۔ اور وہ کام لوگوں کی بھلائی کی نیت سے کیا جائے اور بغیر کسی لالچ کے کیا جائے۔ یعنی ہم دوسروں سے کچھ لینا نہ پسند کریں بلکہ ان کو دینے کی کوشش کریں۔

جب آپ کسی اندھے کی لاٹھی پکڑ کر سے سڑک پار کر دیتے ہیں تو یہ بھی عوامی خدمت ہے۔

جب دو ہمسائے یا دو دوست یا میاں بیوی آپس میں ناراض ہو جائیں اور آپ ان میں صلح کرا دیں تو وہ بھی عوامی خدمت ہے۔

کسی بچے کا باپ مرگیا ہو۔ یا غریب ہو اور آپ اس کی تعلیم میں مدد دیں۔ تو یہ بھی عوامی خدمت ہے۔

گرمیوں میں اپنے گھر کے باہر پانی کا مٹکا رکھ دیں تا کہ مسافر اپنی پیاس بجھا سکیں تو یہ بھی عوامی خدمت ہے۔

اگر آپ پڑھے لکھے ہیں اور کسی سکول میں استاد نہیں ہیں اور آپ چند روز کے لیے سکول جا کر بچوں کو پڑھا آتے ہیں تو یہ بھی عوامی خدمت ہے۔

ہمارا مذہب بھی ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ عوامی خدمت کرنے والے جنت میں جائیں گے۔

ہمیں کوشش کرنے چاہیے کہ ہم بے کار نہ بیٹھیں۔ بلکہ جب ہمارے پاس اپنا کام کوئی نہ ہو تو اس وقت ہم دوسروں کی بھلائی کے کام کریں ایسا کام ایک آدمی خود بھی کرسکتا ہے اور کسی دوسرے آدمیوں کے ساتھ مل کر بھی کرسکتا ہے۔

آج ہم ان فلموں میں آپ کو بتائیں گے کہ کس طرح ہم لوگ عوامی بھلائی کے لیے مفید کام کر سکتے ہیں۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے تقریر ختم کی تو انھوں نے اشارہ کیا اور فلم شروع ہوگئی۔

پہلی فلم میں ایک آدمی عبداللہ کی کہانی تھی وہ دفتر میں کام کرتا ہے۔ صبح سات بجے دفتر جاتا۔ دوپہر کے بعد گھر واپس آتا۔ تھوڑی دیر آرام کرتا اور پھر گھر کے کاموں میں لگ جاتا یا بچوں کے ساتھ باتیں کرتا۔

ایک دن اس نے سوچا کہ اس کے پاس کافی فالتو وقت ہے۔ جو وہ یوں ہی ادھر اُدھر گھومنے میں یا باتوں میں ضائع کر دیتا ہے۔ وہ سوچتا رہا کہ اس کا مفید استعمال کیسے کرے۔

ایک دن وہ اپنے ہمسائے سے ملنے گیا۔ ہمسائے نے بتایا کہ اس کا بھائی بیمار ہے اور ہسپتال میں داخل ہے۔ وہ اسے کچھ پھل اور کچھ دوسری چیزیں دینے کے لیے جانا چاہتا ہے۔ مگر اسے خود بخار ہوگیا ہے اس لیے اب وہ ہسپتال نہیں جا سکتا۔

عبداللہ نے کہا میں ہسپتال چلا جاتا ہوں اور یہ تمام چیزیں تمھارے بھائی کو دے آؤں گا۔ وہ مان گیا۔

جب وہ ہسپتال پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک بڑے کمرے میں دور تک چارپائیاں ساتھ ساتھ پڑی ہیں اور ان پر مریض لیٹے ہوئے ہیں۔ وہ رشتہ داروں سے ملاقات کا وقت تھا اس لیے کمرے میں شہر کے دوسرے لوگ بھی مریضوں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

عبداللہ نے اپنے ہمسائے کے بھائی کو ڈھونڈا اور اسے ساری چیزیں دے دیں۔

تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا رہا۔ ہمسائے کا بھائی بہت خوش ہوا۔ اس نے عبداللہ کا شکریہ ادا کیا۔

جب عبداللہ وہاں سے اٹھنے لگا تو اس نے دیکھا کہ تھوڑی دور چارپائی پر ایک اور مریض پڑا ہوا ہے۔ جس کے پاس کوئی رشتہ دار موجود نہیں۔

عبداللہ اس کے پاس گیا۔ وہ ایک نوجوان سا لڑکا تھا۔

عبداللہ نے اسے سلام کیا۔ خیریت پوچھی اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔

عبداللہ نے پوچھا تمھارا کوئی رشتہ دار ملاقات کے لیے نہیں آیا؟

لڑکے نے کہا میرے باپ کو اس وقت ڈیوٹی پر جانا پڑتا ہے۔ اس لیے وہ روز نہیں آ سکتے بلکہ ایک دن چھوڑ کر اگلے دن آتے ہیں۔ وہ کل آئے تھے اس لیے آج نہیں آئے۔

عبداللہ اس کے پاس بیٹھا رہا اور ادھر ادھر کی باتوں سے اس کا دل بہلاتا رہا۔

لڑکا بہت خوش ہوا۔

ملاقات کا وقت ختم ہوا تو عبداللہ چلنے لگا۔ لڑکے نے بڑے پیار اور محبت سے عبداللہ سے ہاتھ ملایا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔

راستے میں عبداللہ سوچتا رہا کہ ہسپتال میں کئی مریض ایسے ہوتے ہوں گے، جن کے رشتے دار کسی ایک دن یا چند دن کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں آ سکتے اور وہ ہسپتال میں مایوسی سے انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اس سے ان کی تکلیف اور بھی بڑھ سکتی ہے۔

یہ سوچ کر اس نے فیصلہ کیا کہ اس کے پاس ایک دو گھنٹے فالتو ہوتے ہیں۔ وہ یہ وقت ایسے مریضوں کو تسلی دینے کے لیے استعمال کرے گا۔

اس کے بعد وہ روزانہ ملاقات کے وقت ہسپتال جانے لگا۔ جو مریض اکیلا ہوتا وہ اس کے پاس بیٹھ جاتا۔ اس سے باتیں کرتا۔ اس کا دکھ کم کرنے کی کوشش کرتا اور اگر اسے بازار سے کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو لا کر دے دیتا۔

ہسپتال والوں نے جب دیکھا کہ یہ آدمی روزانہ آتا ہے۔ تو انھوں نے اس کی وجہ پوچھی عبداللہ نے بتایا کہ میں بیکار رہنے کی بجائے مریضوں کا دل بہلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس سے مجھے بھی تسلی ہو جاتی ہے۔

ہسپتال والے اس کی بات سن کر بہت خوش ہوئے اور اسے اجازت دے دی کہ وہ ملاقات کے وقت

کے علاوہ بھی ہسپتال میں آ سکتا ہے۔

اب عبداللہ جس وقت چاہتا ہسپتال چلا جاتا اور مریضوں کی دلجوئی کرتا۔ ان سے باتیں کرتا۔ ان کی ضرورت کی چیزیں بازار سے لا دیتا اور ان کے خط لکھ کر دیتا۔

آہستہ آہستہ وہ اپنے نیک کام کی وجہ سے اتنا مشہور ہو گیا کہ ہسپتال والوں نے اسے اپنی کمیٹی کا ممبر بنا لیا جو مریضوں کے آرام کا خیال رکھتی تھی۔ وہاں عبداللہ بہت مفید مشورے دیتا، جس سے ہسپتال کی عام حالت اچھی ہوتی چلی گئی۔

دوسری فلم ایک امیر آدمی کی تھی جو ایک کارخانے کا مالک تھا۔ اس کے پاس بہت دولت تھی۔ ایک دن وہ کار میں اپنے کارخانے کی طرف جا رہا تھا کہ ایک لڑکا تیزی سے سڑک عبور کرتے ہوئے اس کی کار کے سامنے آ گیا۔ وہ کار کے نیچے آنے ہی والا تھا کہ اس نے بڑی مشکل سے کار روک لی اور جلدی سے باہر نکل کر لڑکے کو پکڑ لیا۔ اس آدمی نے دیکھا کہ لڑکے کے ہاتھ میں بستہ بھی تھا مگر وہ سکول کے وقت میں سڑک پر گھوم رہا تھا۔

اس نے لڑکے سے پوچھا تم سکول کیوں نہیں گئے؟ اور یہاں کیوں گھوم رہے ہو؟

پہلے تو لڑکا ڈرا۔ مگر جب اس امیر آدمی نے پیار سے بات کی تو لڑکے نے بتایا کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔ اس کی ماں بیوہ ہے اور سلائی کر کے گزارہ کرتی ہے۔ اب اس کے پاس فیس کے لیے پیسے نہ تھے اور ماسٹر نے سکول سے اس کا نام کاٹ دیا ہے اور اب وہ واپس گھر جا رہا ہے۔

امیر آدمی نے اسے اپنی کار میں بٹھا لیا اور سکول لے گیا۔ وہاں جا کر اس نے ماسٹر سے پوچھا کہ کیا یہ لڑکا سچ بول رہا ہے۔

ماسٹر نے بتایا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے فیس ادا نہ کرنے کی وجہ سے اس کا نام کاٹ دیا گیا ہے۔

امیر آدمی نے پوچھا یہ پڑھائی میں کیسا ہے؟

ماسٹر نے بتایا بہت اچھا ہے۔

امیر آدمی نے اسی وقت لڑکے کی سال بھر کی فیس دے دی اور لڑکے کا نام پھر رجسٹر میں لکھ لیا گیا۔

پھر وہ امیر آدمی اس لڑکے کو لے کر اس کی بیوہ ماں کے پاس گیا اور اسے کہا کہ وہ آئندہ سے لڑکے کی تعلیم کا تمام خرچ برداشت کرے گا۔ لڑکے نے تیسری جماعت پاس کر لی۔

اگلے سال اس نے چوتھی جماعت پاس کر لی۔

پھر پانچویں۔

اسی طرح اس نے آہستہ آہستہ دس جماعتیں پاس کر لیں۔

جتنا عرصہ وہ پڑھتا رہا۔ امیر آدمی یہ سوچتا رہا کہ جس طرح اس لڑکے کی مدد سے اس کی زندگی سنور گئی ہے اسی طرح اس جیسے کئی اور لڑکوں کو تعلیم دلائی جا سکتی ہے، لیکن اس کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ ایک وقت میں بہت سے لڑکوں کی مدد ہو سکے۔ آخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ایک اچھا سا سکول بنائے گا۔ جس میں ایسے ضرورت مند بچوں کو مفت تعلیم دی جائے گی۔ وہ ایسا سکول ہوگا جس میں تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کے اخلاق اور کردار کو بھی سنوارنے کی کوشش کی جائے گی۔

اس امیر آدمی نے اپنے اس فیصلے کا ذکر اس لڑکے سے کیا، جس نے ابھی ابھی میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا اور اسے کہا کہ وہ اس نیک کام میں اس کا ہاتھ بٹائے اس لڑکے نے امیر آدمی کی اس پیشکش کو قبول کر لیا۔

اس کے بعد امیر آدمی نے زمین خریدی اور چند ہی مہینوں میں اس پر عمارت کھڑی کر دی۔ وہ لڑکا وہاں ہیڈ ماسٹر بن گیا اور پہلی جماعت میں بچے داخل ہو گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ زیادہ اور بچے آتے گئے۔ سکول میں کئی استاد رکھے گئے۔ چند ہی سال میں وہ ایک کامیاب سکول بن گیا۔ اس میں بچوں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی اور سکول کے تمام اخراجات وہ امیر آدمی خود برداشت کرتا تھا۔

اس طرح عوامی خدمت کا بہت اچھا پروگرام جاری ہو گیا۔

تیسری فلم میں یہ دکھایا گیا تھا کہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں لوگ کس طرح عوامی خدمت کرتے ہیں۔

ایک ملک میں بہت بڑا ہسپتال دکھایا گیا تھا جسے کچھ لوگ مل جل کر چلا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی زمین دی۔ باقی سب نے کئی کئی ہزار روپیہ چندہ دیا۔ اس طرح لاکھوں روپیہ جمع ہو گیا، جس سے ہسپتال کی عمارت بن گئی۔ عمارت کے چاروں طرف دو سو دکانیں بنائی گئی تھیں۔ ان دکانوں کے کرائے سے ہسپتال کا خرچ پورا ہوتا تھا۔

ہسپتال والوں کو زیادہ تنخواہیں نہیں دینا پڑتی تھیں، کیوں کہ انھوں نے بہت تھوڑے ملازم تنخواہ پر رکھے تھے۔ باقی کام کے لیے شہر کے لوگ تھے جو اپنے فالتو وقت میں آ کر مفت کام کرتے تھے۔ شہر میں کام کرنے والے کئی ڈاکٹر وقتاً فوقتاً ہسپتال میں آتے اور مفت علاج کرتے تھے۔ اسی طرح کئی نرسیں اپنے فارغ وقت میں بغیر کسی معاوضے کے یہاں کام کرنے آتی تھیں۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کے اس تعاون سے یہ ہسپتال مثالی طریقے سے چل رہا تھا۔

ایک اور ملک میں چند کاروباری لوگوں نے مل کر ایک دفتر بنایا تھا۔ جس میں ان کے دس پندرہ آدمی باری

باری بیٹھا کرتے تھے۔ جو کوئی فارغ ہوتا، وہ آ کر دفتر میں بیٹھ جاتا۔ اس طرح سارا دن کوئی نہ کوئی آدمی دفتر میں موجود ہوتا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر کسی دکان دار یا کاروبار کو کوئی مشکل پیش آئے یا اسے کسی مشورے کی ضرورت پڑے تو وہ ان سے رابطہ قائم کر سکے۔ اور وہ اس مشکل کا حل کرنے میں مدد دے سکیں۔

اسی ملک میں کاشت کاروں نے بھی مل کر اسی قسم کا دفتر بنایا تھا اور وہ اسی طرح آپس میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو بتا دیتے کہ اچھا بیج کہاں سے مل سکتا ہے۔ مویشیوں کا کیسے خیال رکھا جا سکتا ہے۔ کس کس بیماری کا علاج کہاں سے کرایا جا سکتا ہے۔ فصل کو بیماری سے کیسے بچایا جا سکتا ہے اور اگر دوائی کی ضرورت ہے تو کہاں سے مل سکتی ہے۔

ایک ملک میں چند نیک لوگوں نے مل کر ایک ایسا سکول بنایا ہوا تھا جس میں اندھے بچوں کو ایسے کام سکھائے جاتے تھے کہ وہ کاریگر بن کر اپنی روزی خود کما سکیں۔ اسی طرح وہ گونگے اور بہرے بچوں کو بھی خاص طریقے سے تعلیم دیتے تھے۔ تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں اور دوسروں کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں۔

ایک ملک کے گاؤں کی کہانی بتاتی تھی کہ فوج کا ایک افسر اپنی ملازمت ختم کر کے گاؤں واپس آیا تو سارا سارا دن بے کار پڑا رہتا تھا۔ کیوں کہ اس کے پاس کرنے کو کچھ نہ تھا۔

کئی دفعہ گاؤں میں گھومتے ہوئے اس نے دیکھا کہ گاؤں کے نوجوان لڑکے فصل کے موسم میں تو کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ مگر جن دنوں کھیتوں پر کام نہیں ہوتا وہ بازار میں بے کار گھومتے رہتے ہیں۔

فوجی افسر نے یہ بھی دیکھا کہ گاؤں میں صفائی کی حالت بہت خراب ہے۔ کہیں پتھر اور ڈھیلے بکھرے ہوئے ہیں کہیں لکڑیوں کا ڈھیر ہے۔ کہیں گھر سے نکلنے والی نالی ٹوٹی ہوئی ہے اور اس کا سارا پانی گلی میں پھیل رہا ہے۔ کسی کا گڈا گلی کے درمیان کھڑا ہے جس سے راستہ رکا ہوا ہے۔ اور کسی کے بیل یا گدھے بازار میں کھلے گھومتے پھر رہے ہیں۔ فوجی افسر کئی دن تک سوچتا رہا۔ ایک دن اس نے کچھ لڑکوں کو بلایا اور کہا کہ ہم اپنے بے کار وقت میں گاؤں کی بھلائی کے لیے کچھ کام کریں گے اور لوگوں کو سمجھائیں گے کہ وہ صفائی کا خیال کیسے رکھیں۔

لڑکوں نے کہا کہ لوگ کسی کی بات نہیں مانتے۔

فوجی افسر نے کہا کہ وہ ایک یا دو آدمیوں کی بات نہیں سنیں گے۔ مگر جب ہم دس پندرہ لوگ مل کر جائیں گے تو پھر ان کا ماننا ہی پڑے گا۔

اس کے بعد وہ سب مل کر لوگوں کے پاس جانے لگے۔ انھوں نے سب سے کہا کہ ہر گاؤں والا اپنے گھر

کے سامنے والا گلی کا حصہ صاف رکھے گا۔ جس کے گھر کی نالی ٹوٹی ہوئی تھی اس کو کہا کہ نالی کی مرمت کراؤ۔

جو کوئی غلط طریقے اس گلی میں گڈا کھڑا کرتا۔ وہ جا کر اس کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور کہتے کہ باقی کام چھوڑ کر پہلے گڈا ٹھیک طریقے سے کھڑا کرو۔ جس کے مویشی گلی میں بازار میں کھلے گھوم رہے ہوتے اس سے کہتے کہ مویشیوں کو گھر لے جاؤ۔

ان لوگوں کی چند دن کی کوشش سے وہ گاؤں اتنا صاف ستھرا ہو گیا کہ اردگرد کے علاقے میں صفائی کی وجہ سے مشہور ہو گیا۔

فلم ختم ہوئی تو سب لوگ گھروں کو واپس چلے۔ راستے میں وہ باتیں کرتے جا رہے تھے کہ ہم لوگوں کو کبھی ایسا خیال ہی نہیں آیا۔ ورنہ اگر ہم چاہیں تو اپنے گاؤں کو بھی بہت اچھا بنا سکتے ہیں۔ ہمارے پاس بھی فالتو وقت ہے اور ہم بھی اس کا مفید استعمال کر سکتے ہیں۔

جب رات کو لوگ اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے تو سونے سے پہلے ہر آدمی یہ سوچ رہا تھا کہ وہ عوامی خدمت کے لیے کیا کر سکتا ہے؟ اکرم سوچ رہا تھا کہ یہ جو اتنی مفید باتیں معلوم ہوئی ہیں تو یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اس دن اسلم نے کیلے کا چھلکا اٹھا کر کونے میں پھینک دیا۔ اگر وہ نہ پھینکتا تو ہمارا جھگڑا نہ ہوتا اور ہم ماسٹر صاحب کے پاس نہ جاتے اور ہیڈ ماسٹر صاحب فلمیں نہ منگواتے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نیکی کا اگر ایک کام کیا جائے تو اس سے نیکی پھیلتی ہے۔ اگر ہم میں سے ایک آدمی بھی عوامی خدمت کی نیت کر کے اس پر کام شروع کر دے تو اس کا دیکھ کر باقی لوگ بھی ایسا ہی کرنے لگیں گے۔ جس سے آپس میں محبت بھی بڑھے گی اور قصبہ بھی خوش حال ہو جائے گا۔

☆☆☆☆

مشتاق گزدر

کشتی اور محافظ

یہ شیخ سعدی کی کہانی ہے جو میرے والد نے مجھے بچپن میں سنائی تھی۔ یہ کہانی آج بھی میری پسندیدہ کہانیوں میں سے ایک ہے۔ یہ کہانی کچھ اس طرح ہے۔

ایک بادشاہ اپنے مصاحبوں کے ساتھ سیر و تفریح اور موسم کی تبدیلی سے لطف اندوز ہونے کے لیے کشتی کے ذریعے ایک دوسرے جزیرے پر جا رہا تھا۔ کشتی میں بادشاہ کا ایک محافظ بھی تھا جو حال ہی میں مقرر کیا گیا تھا۔ اس دن ہوا کافی تیز چل رہی تھی۔ لہروں کی وجہ سے کشتی ادھر ادھر جھول رہی تھی۔ بعض مرتبہ پانی کشتی کے عرشے پر بھی آجاتا تھا۔ بادشاہ کا محافظ خوفزدہ ہو کر چلانے لگا اور واپس جانے کے لیے کہنے لگا۔ ہر شخص نے اسے خاموش کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ بادشاہ اپنے محافظ کی اس حرکت سے سخت پریشان ہوا وہ ایک بچے کی طرح چیخ رہا تھا۔ بالآخر اس نے کہا کہ جو شخص اس بے وقوف کو چیخنے سے روکے گا اسے مناسب انعام دیا جائے گا۔

ایک دانا آدمی آگے آیا اور اس نے اپنی ترکیب بیان کی کہ اس کو سمندر میں پھینک دو۔ یہ سن کر سب متعجب ہوئے اور بادشاہ کے ردِعمل کا انتظار کرنے لگے۔ یہ محافظ بادشاہ کے چچا نے اسے تحفے کے طور پر دیا تھا۔ تاہم بادشاہ نے بات منظور کر لی اور محافظ کو دھکا دے کر پانی میں گرا دیا گیا۔ پانی میں گرتے ہی اس نے مدد کے لیے چلانا شروع کر دیا۔ اس دانا آدمی نے ملاحوں سے کہا کہ اسے پانی سے نکال لیں۔

کشتی میں واپس آنے کے بعد محافظ ایسے خاموش ہو گیا جیسے کہ ایک سوتا ہوا بچہ ہوتا ہے۔ بادشاہ نے اس آدمی سے کہا کہ تم نے جو ترکیب سوچی تھی اس کے پیچھے کیا فلسفہ تھا۔ اس آدمی نے جواب دیا۔ اس محافظ نے اس تحفظ اور سلامتی کی قدر نہیں کی جو کشتی کی وجہ سے اسے حاصل ہو رہی تھی اور پانی میں گرنے کے بعد وہ اس کی قدر جان سکا۔

☆☆☆☆

نجم الحسن رضوی

دھرتی پہ آیا چاند

چاند نگر میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ رمضان کی انتیس تاریخ تھی اور اس شام ننھے چاند یعنی ہلال میاں کو افق پر آکے عیدِ سعید کا اعلان کرنا تھا۔ آسمانوں کی روایت یہی تھی جس پر کسی پس وپیش کے بغیر پرانے زمانے سے عمل کرتا آرہا تھا مگر چندا ماموں کے گھر میں آج بڑی مصیبت کھڑی ہوگئی تھی کیوں کہ ہلال میاں نے اچانک لوگوں کے سامنے جانے سے انکار کردیا تھا۔

ان کا کہنا تھا کہ وہ بار بار یہی عمل دہرا کے اکتا چکے تھے اور اب وہ یہ کام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اب ابا میاں کو چاہیے کہ وہ خود جا کے عید کا اعلان کریں۔ آخر وہ اتنے بڑے اور چمکدار ہیں، پورا چاند نظر آئے گا تو لوگ زیادہ خوش ہوں گے اور ان پر اعتبار بھی کریں گے۔

’’مگر یہ ناممکن ہے میرے بیٹے۔‘‘ چندا ممانی نے کہا۔ ’’تمھارے ابا یہ کام نہیں کرسکتے، بھئی پورا چاند کہیں مہینے کی آخری تاریخ پر نظر آسکتا ہے، یہ تو فطرت کے قانون کے خلاف ہوگا اور دنیا چاند کی پوری چودہ راتوں سے محروم ہوجائے گی۔ پورا چاند تو ہر مہینے صرف چودھویں کی شب ہی اپنا جلوہ دکھا سکتا ہے!‘‘

مگر ہلال میاں قائل نہ ہوئے۔ ’’کچھ بھی ہو میں تو آج نہیں جاسکتا، مجھے فرصت ہی نہیں، آج تو مجھے اپنے دوست قطبی ستارے کے ساتھ بادلوں کی سیر کو جانا ہے!‘‘ پھر انھوں نے اپنے سر کو کھجایا اور بولے......

’’اچھا اگر ابا نہیں جاسکتے تو پھر آپ خود...... پلیز امی، میری خاطر!‘‘

’’کیا، میں......، کیا مذاق ہے، میں تو روز ہی دکھائی دیتی ہوں سب کو...... آدھا چاند جو ٹھہری، یعنی نصف بہتر...... ارے میاں مجھے دیکھ کے بھلا کون خوش ہوگا...... کم از کم آج تو بالکل نہیں حالاں کہ تمھیں پتہ ہے کتنی محنت کرتی ہوں، میں اندھیری راتوں کو روشن رکھنے کے لیے......؟‘‘ چندا ممانی نے جواب دیا۔

’’مجھے پتہ ہے مائیں بڑی محنتی ہوتی ہیں......!‘‘ ہلال میاں نے کہا۔ ’’مگر آپ کچھ کریں نا...... اچھا ابا سے کہیں کہ وہ صرف آج میری جگہ لے لیں...... بس آج......!‘‘ ’’پاگل ہوگیا......!‘‘ اچانک چندا ماموں جو دوسرے کمرے میں شیو بنا رہے تھے، اندر آگئے۔ ’’میاں یہ کام صرف تمھارا ہے کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ آخر

تمھاری سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آ رہی ہے کہ تمھارا کام ہم دونوں کے کاموں سے زیادہ اہم ہے۔ تمھاری صرف ایک جھلک دنیا میں موجود لاکھوں آدمیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آتی ہے، وہ سب تمھیں خوشی کا پیغام بر سمجھتے ہیں!‘‘

’’خوشی کیا ہوتی ہے؟‘‘ اچانک ہلال میاں نے سوال کیا۔

’’خوشی؟‘‘ چندا ممانی نے جواب دیا۔ ’’یہ ایک طرح کی راحت ہوتی ہے!‘‘

’’اور راحت کسے کہتے ہیں؟‘‘ ہلال میاں نے پھر سوال داغا۔

’’زیادہ سوال جواب مت کرو میرے بیٹے!‘‘ چندا ماموں نے سمجھایا۔ ’’تم اپنے کام پر جاؤ، مجھے یقین ہے وہاں تمھیں خود بخود پتہ چل جائے گا کہ خوشی کتنی بڑی نعمت ہے۔‘‘

پھر ہلال میاں اپنے دوست قطبی ستارے کے پاس گئے اور اس سے پوچھا کہ کیا اسے معلوم ہے کہ خوشی کیا ہوتی ہے؟‘‘

قطبی ستارہ بڑا عقل مند تھا اور ہمیشہ دوسروں کی مدد کو تیار رہتا تھا۔ اس نے کہا کہ اس سوال کا جواب تو وہی لوگ دے سکتے ہیں، جو خوش ہونے کے لیے نئے چاند کے انتظار میں رہتے ہیں۔‘‘

دونوں دوستوں نے انسانی بھیس میں زمین پر اترنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے مسافروں کا بھیس بدلا اور بڑی بڑی پگڑیاں اوڑھ لیں تاکہ ان کی پیشانی سے پھوٹتی نیلی روشنیاں کسی کو نظر نہ آئیں۔ چوں کہ قطبی ستارے کو ساری سمتوں کا علم تھا لہٰذا دونوں کو ایک بھرے پڑے شہر پہنچنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی جہاں لوگ ہی لوگ تھے۔

جلد ہی وہ شہر کے مرکز میں پہنچ گئے۔ یہ ایک بازار تھا، جس میں لوگ خریداری میں مصروف تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے جو عید کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اچانک ایک آدمی بہت سارے تھیلے اُٹھائے، ایک دکان سے باہر نکلا، اس کے پیچھے پانچ چھ بچے تھے اور برقعے میں ملبوس ایک عورت۔

ہلال میاں نے کہا، ’’چلو اس آدمی سے پوچھتے ہیں کہ خوشی کیا ہوتی ہے؟‘‘

قطبی ستارہ آگے بڑھا اور اس نے سوال کیا، ’’کیا آپ خوش ہیں؟‘‘

’’اچھا تو تم مجھ پر فقرہ کس رہے ہو۔‘‘ وہ بولا۔ ’’ہاں بھئی خوش ہوں مگر یار کچھ مدد تو کرو میری ...... مرا جا رہا ہوں اتنے سارے تھیلوں کے بوجھ سے ...... ذرا دیکھو!‘‘

دونوں دوستوں نے سہارا دے کر اس آدمی کو اس کے بچوں سمیت ٹیکسی تک پہنچایا اور آگے بڑھے۔ چند قدموں کے فاصلے پر انھیں ایک اور دکان نظر آئی جس میں خریداروں کا ہجوم تھا۔ دکاندار کو کسی سے بات کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ جلدی جلدی سامان پیک کر رہا تھا اور نقدی اپنے گلے میں پھینکتا جا رہا تھا جو کرنسی نوٹوں اور چمکتے سکوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

ہلال میاں اس کے پاس گئے اور بڑے ادب سے پوچھا، ''مہربانی کر کے کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ خوشی کہاں ملتی ہے؟''

''سوری......!'' دکاندار نے نوٹ گنتے ہوئے جواب دیا۔ ''ابھی وہ اسٹاک میں نہیں ہے جناب، بعد میں آئیں، ہوسکتا ہے کہ......!'' اور وہ دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''لیکن میں تو خوشی کی بات کر رہا ہوں!'' ہلال میاں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہاں، ہاں، میں جانتا ہوں!'' دکاندار بولا۔ ''بے شک وہ بہت خوب صورت چیز ہے، بہترین چپل، آرام دہ اور نفیس، بڑی مانگ ہے اس کی آج کل!''

دونوں دوست دکان سے باہر چلے گئے۔ سڑک پر انھیں ایک نوجوان بجلی کے کھمبے پر چڑھتا نظر آیا۔ وہ اسے رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجا رہا تھا۔

ہلال میاں نے پوچھا ''بھئی آپ بہت خوش لگتے ہیں، مجھے بتائیں گے کہ آخر خوشی ہوتی کیا ہے؟''

''خوشی......؟'' نوجوان نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بولا ''مجھے پتہ نہیں سر، میں تو بس اس آدمی کے لیے کام کر رہا ہوں جو ایک جلسے سے خطاب کرنے والا ہے، مجھے جھنڈیاں لگانے کے پیسے ملیں گے!''

پھر ایک ہاؤسنگ سوسائٹی سے گزرتے ہوئے دونوں دوستوں نے ایک شخص کو اپنے گھر کے باہر لان پر بیٹھے دیکھا۔ وہ اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس گئے اور پوچھا، ''سنیے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ خوشی کہاں مل سکتی ہے؟''

بوڑھے کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ چمکی۔ اس نے اخبار ہٹا کر کہا، اس اخبار میں تو ہرگز نہیں، جو لوگ خوشی ڈھونڈ رہے ہیں، انھیں تو میں یہی مشورہ دوں گا کہ اخبار کے پاس نہ جائیں، اسے پڑھ کے تو آدمی اداس اور ناخوش ہی ہوسکتا ہے!'' وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔

اب دونوں دوست تھک چکے تھے اور شام ہونے والی تھی۔ اچانک قطبی ستارے کو کچھ یاد آیا۔ ''ارے

اس بستی میں میری ایک دوست بھی تو رہتی ہے وہ یقیناً ہمارا مسئلہ حل کر دے گی!''

''دوست؟'' ہلال میاں نے قطبی ستارے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''ہاں بھئی،'' قطبی ستارہ بولا۔ پانچ سال کی بچی ہے، گڑیا ...... وہ دنیا کی سب سے خوب صورت اور عقل مند لڑکی ہے اور بڑی خوش مزاج! اسے میں نے کبھی بُرے موڈ میں نہیں دیکھا، وہ یقیناً ہمیں بتا سکے گی کہ خوشی کسی کہتے ہیں۔''

قطبی ستارہ جو گڑیا کے پاس اکثر ایک غبارے بیچنے والے کے بھیس میں جاتا تھا، ہلال میاں کو گڑیا کے گھر لے گیا، مگر وہاں پہنچ کے انھیں سخت حیرت ہوئی کیوں کہ گڑیا اس وقت بہت اداس تھی اور تقریباً رو رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ بہت اکیلا پن محسوس کر رہی تھی کیوں کہ ہفتے بھر سے اس کی ماما ہسپتال میں تھیں اور وہ ان کے پاس نہیں جا سکتی تھی اور بابا نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ وہ گھر پر خادمہ کے پاس رہے۔

قطبی ستارے نے کہا۔ ''مگر تمھارے پاس اتنے سارے کھلونے ہیں تم ان سے کیوں نہیں کھیلتیں، کہو تو میں تمھارے لیے بہت سے غبارے بھی لے آؤں؟''

''آپ کا شکریہ!'' گڑیا بولی۔ ''مگر مجھے اب کھلونوں سے کھیلنے میں مزا نہیں آتا، بے جان کھلونے ...... بابا نے کہا تھا کہ جب ماما ہسپتال سے واپس آئیں گی تو وہ میرے لیے بے بی بھیا لے کر آئیں گی ننھا منا سا!''

''یہ بے بی کیا ہوتا ہے؟'' اچانک ہلال میاں نے سوال کیا۔ اس نے پہلے کبھی کوئی بے بی نہیں دیکھا تھا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ قطبی ستارہ اور ہلال میاں دونوں کھڑکیوں کے پردوں کے پیچھے چھپ گئے۔ دروازہ کھلا اور گڑیا کے بابا کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے گڑیا کی ماما بھی تھیں جو کچھ پیلی پیلی سی لگ رہی تھیں مگر وہ مسکرا رہی تھیں اور ان کے بازوؤں میں کپڑوں کا ایک بنڈل تھا۔

''دیکھو گڑیا ......'' بابا نے کہا۔ ''ہم تمھارے لیے کیا لائے ہیں، بے بی بھیا!''

ماما گڑیا کے پاس بیٹھ گئیں اور انھوں نے کپڑوں کا بنڈل گڑیا کی گود میں رکھ دیا۔ گڑیا کا چہرہ ایک دم سے کِھل اُٹھا۔ کپڑوں کے بنڈل میں پیارا سا بچہ تھا، بھلو سا، اس کا ننھا بھائی ...... وہ سو رہا تھا۔ گڑیا خوشی سے چلائی۔ ''اس کا منہ تو دیکھیے بابا، بالکل ایسا ہے جیسے چاند! کتنا پیارا ہے بے بی بھیا!''

ماما نے کہا۔ ’’آج کتنا اچھا دن ہے، تمھارا بے بی بھیا ہمارے لیے ایسی خوشی لایا ہے جو نئے چاند کو دیکھ کے ہوتی ہے!‘‘

ہلال میاں یہ سن کے جھوم گئے۔ بابا نے اپنی گھڑی دیکھی اور کہا۔ ’’لو بھئی شام ہوگئی ہے، چلو سب اوپر چھت پر، شاید ہمیں آسمان کے بے بی چاند کی بھی جھلک نظر آ جائے، تب ہی تو عید منائی جائے گی!‘‘

ہلال میاں نے قطبی ستارے سے کہا۔ ’’بھئی! اب چلنا چاہیے، تمھیں پتہ نہیں مجھے کام پر جانا ہے، بہت اہم کام پر! دونوں نے فوراً! آسمان کی راہ لی۔

نیچے لوگ۔ مکانوں کی چھتوں پر جمع تھے اور گلیوں اور چوراہوں پر کھڑے تھے۔ ان میں جو زیادہ بہادر تھے وہ پیڑ پر چڑھ گئے تھے۔ یہ ساری تیاریاں عید کا چاند دیکھنے کے لیے کی جا رہی تھیں۔ اچانک کسی نے پکار کے کہا۔ ’’آہا وہ رہا چاند!‘‘ سارے اس طرف گھوم گئے اور وہ وہاں موجود تھا، مسجد کے ایک مینار کے اوپر۔ چمکتی درانتی کی شکل میں ہلالِ عید!

عید کے چاند نے لوگوں کے دلوں کو خوشیوں سے بھر دیا تھا۔ ان میں وہ دکاندار بھی شامل تھا جو خوشی نامی چپل بیچتا تھا، وہ بوڑھا بھی، جس کا کہنا تھا کہ اخبار پڑھ کے لوگ ناخوش ہوتے ہیں اور گڑیا، جس نے ایک دن میں دو نئے چاند دیکھے تھے اور آسمان پر ہلال میاں بھی خوش تھے کہ انھوں نے اپنا فرض ادا کر کے اپنی امی اور ابو دونوں کو خوش کر دیا تھا۔

☆☆☆☆

نصیر انور

تحفے

یہ ایک خوب صورت وادی کی کہانی ہے۔ جو ایک پہاڑی کے دامن میں آباد تھی۔ وہاں کے رنگین پھول بچوں سے باتیں کیا کرتے تھے۔

تمام بچے علم حاصل کرنے کے بہت شوقین تھے۔ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھتے۔ لیکن ان میں ایک نجمہ بڑی گندی تھی اسے کئی بار سمجھایا گیا۔ لیکن اس نے کسی کی نصیحت پر بھی کان نہ دھرے۔

کبھی تم نے چلتی پھرتی اور باتیں کرتی ہوئی گندگی دیکھی ہے؟ ایک دن نجمہ کو چڑانے کے لیے جب اس کی سہیلیوں نے آپس میں یہ مشورہ کیا تو وہ فوراً غصہ میں آ گئی۔ اس نے اپنے میلے کچیلے بالوں کو اپنے گندے چہرے سے ہٹایا اور اپنی سہیلیوں کو کوسنا شروع کیا اس کی بہتی ناک اور پیلے رنگ کے بدنما دانت دیکھ کر اس کی ایک سہیلی کہنے لگی۔

چلو بھاگو یہاں سے بُو آ رہی ہے۔ سامنے یہ گندی لڑکی جو کھڑی ہے۔ یہ کہہ کر اس کی تمام سہیلیاں بھاگ گئیں اور نجما اکیلی منہ بسورے کھڑی رہ گئی۔

ایک روز نجمہ صبح سویرے اُٹھی کمرے کی دیوار پر بڑا آئینہ لگا تھا۔ جوں ہی اس کی نظر آئینے پر پڑی تو آنکھیں مارے خوف کے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے دیکھا کہ سامنے ایک چڑیل کھڑی ہے جس کے گندے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ چہرے پر ایسے نشان ہیں جیسے مکھیاں بیٹھی تیزی سے گھوم رہی ہوں۔ یکا یک اس نے اپنے تیز اور بڑے بڑے دانت نکالے اور اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر نجمہ کو پکڑنے لگی۔

نجمہ کو ایسا ڈر لگا کہ وہ بے تحاشا کمرے سے بھاگ نکلی اور اندھا دھند باغ کی طرف بھاگی۔ آخر ہانپتی پھولوں کی ایک جھاڑی کے پاس آ گری وہ اتنی سہمی ہوئی تھی کہ اس نے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں۔ اتنے میں ہلکی سی ہنسی سنائی دی جو آہستہ آہستہ اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو پھولوں کو ہنستے ہوئے دیکھا پر ایک گلاب کا سرخ پھول اپنی جھاڑی سے جھکا اور کہنے لگا کہ لڑکی ہماری طرف دیکھو صبح سویرے شبنم نے ہمارا منہ دھلایا اور ہوا نے ایسا گدگدایا کہ ہم خوشی سے بے اختیار ہنس رہے ہیں۔ لو اب تو سورج کی

کرنیں تیز ہونے لگیں جاؤ تم بھی منہ دھو لو اور صاف ستھرے کپڑے پہنو، بالوں میں تیل لگاؤ اور کنگھی کرو، پھر میرے پاس آؤ۔

نجمہ یہ سن کر گلاب کی طرح خوشی سے جھومنے لگی۔ وہ فوراً غسل خانے کی طرف لپکی نہا دھو کر فارغ ہوئی تو صاف ستھری پوشاک پہنی، بالوں میں تیل لگا کر کنگھی کی اس کے بعد وہ گنگناتی ہوئی گلاب کے پاس آئی اور کہنے لگی لو میں آ گئی۔

گلاب کا پھول خوشی سے کھل گیا۔ مجھے توڑ لو اور اپنے بالوں میں لگا لو پھر آئینے میں اپنی صورت دیکھنا۔

نجمہ نے ایسا ہی کیا اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی لیکن وہ دل ہی دل میں اتنی ڈری ہوئی تھی کہ اس نے اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

اتنے میں آواز آئی نجمہ میری طرف دیکھو۔

اس نے سامنے دیکھا تو ایک خوب صورت پری مسکرا رہی تھی وہ نجمہ کو دیکھ کر کہنے لگی میں تمھارے لیے دو تحفے لائی ہوں لو انھیں قبول کرو۔

پھر اس نے ان دونوں کو نجمہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ان میں سے ایک صحت ہے اور دوسرا خوشی۔

نجمہ نے دونوں تحفے لیے اس کا چہرہ شرم کے مارے لال ہو گیا وہ منہ سے کچھ نہ بولی اس کا سر شکریہ ادا کرنے کو جھک گیا۔

لیکن جوں ہی اس نے نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ پری غائب ہو چکی ہے اور اب اس کی جگہ ایک خوبصورت لڑکی کھڑی ہے جو اس پری سے بھی زیادہ خوب صورت ہے اور اس کے بالوں پر سرخ گلاب کا پھول خوب صورتی کا تاج معلوم ہوتا ہے۔

☆☆☆☆

نیلوفر اقبال

نُورے کا سکول

سیٹھ اکبر علی جو ایک مشہور انجینئرنگ فرم کے مالک تھے، اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں آرام دہ صوفے پر نیم دراز، رسالے کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ ان کا ملازم دین محمد ہولے ہولے ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔ وہ دن کے کھانے کے بعد یوں ہی تھوڑی دیر آرام کرنے کے عادی تھے۔ پھر وہ دوبارہ آفس چلے جاتے اور شام ڈھلے لوٹتے۔ ان کا بیٹا کاشف دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور ابو کہتا ہوا ان سے لپٹ گیا۔ وہ اسی وقت سکول سے لوٹا تھا۔ پھر پیار لینے کے لیے اپنے دونوں سُرخ سُرخ گال باری باری ان کی طرف بڑھا دیے۔ باپ نے اس کے گالوں کے بوسے لیے اور بولے:

واہ بھئی، ساری تھکن دور ہو گئی۔ پھر بیٹے کے سر کو سہلایا تو گرم سا لگا۔ میرے بیٹے کا سر تپ گیا۔ آج ہی گاڑی کا اے۔ سی ٹھیک کروانے کے لیے بھیجتا ہوں۔

اور ابو۔ نورا بے چارہ۔ وہ تو اتنی دور سے چل کر سکول آتا ہے۔ اتنی تیز دھوپ میں۔ اس کے لیے بھی گاڑی بھیج دیا کریں ابو۔

نورا؟

نور محمد۔ میرا لڑکا سر اس کا سکول بہت دور ہے کیا کرے اسی طرح آنا جانا پڑتا ہے بارش ہو چاہے دھوپ۔ ملازم دین محمد نے پاؤں دباتے ہوئے کہا۔

کوئی بات نہیں دین محمد۔ ہم گاڑی بھیج دیا کریں گے۔ ٹھیک ہے اور؟ کاشف نے کہا۔

سیٹھ صاحب نے کاشف کو گھور کر دیکھا۔ لیکن وہ معصومیت سے بولتا گیا۔

پتہ ہے ابو۔ نورا کہتا تھا اس کے سکول میں کمرے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ وہ باہر بیٹھتا ہے زمین پر۔ سارے کپڑے گندے ہو جاتے ہیں۔ گرم اور پیاس سے بُرا حال ہو جاتا ہے۔ وہاں پانی بھی نہیں۔

باہر؟ زمین پر؟ یہ کیسا سکول ہے سیٹھ صاحب چونک کر بولے۔

سر غریب بچوں کے سکول ایسے ہی ہوتے ہیں جی۔ گرمی سردی میں باہر بیٹھ کر پڑھنا پڑتا ہے۔ زمین پر

ٹاٹ بھی نہیں۔ پانی پنکھا تو دور کی بات۔

اب چلیں نا ایک دن نورے کو سکول دیکھتے ہیں۔ مجھے رحم آ رہا ہے نورے کے سکول پر۔ بے چارہ نورے کا سکول۔ کوئی بات نہیں دین محمد۔ اب نورے کو ٹاٹ لے دیں گے۔ ہے نا ابو؟

سیٹھ صاحب اپنے لاڈلے بیٹے کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئے۔ ان کا بیٹا شہر کے بہترین سکول میں پڑھ رہا تھا۔ جس میں ہر طرح کی آسائش تھی۔ بہترین فرنیچر تھا۔ ایئر کنڈیشنڈ کار میں آتا جاتا تھا۔ پھر بھی سکول سے آتے آتے تھک جاتا تھا۔ دوسری طرف نورا تھا۔ وہ بھی بچہ تھا۔

وہ بھی تو ایک بچہ ہے!

ہاں بیٹا ایک دن ضرور چل کر نورے کا سکول دیکھیں گے۔

وعدہ ابو؟

وعدہ!

چند روز بعد دین محمد نے سیٹھ صاحب کو یاد کروایا کہ انھوں نے نورے کے سکول جانے کا وعدہ کیا ہے۔

ابو ہفتے کے روز سیٹھ صاحب کاشف اور دین محمد کے ہمراہ نورے کا سکول دیکھنے چلے۔

کچی پکی گلیاں سے گزرتے۔ آخر ایسی جگہ آ گئی جہاں گاڑی آگے نہیں جا سکتی تھی۔ کچی پکی نالیوں میں غلیظ پانی بھرا تھا اور جگہ جگہ انھیں کوڑے کی ڈھیریاں پھلانگنا پڑتی تھیں۔

کیا نورا یہاں پڑھنے آتا ہے؟

”اس سے بھی زیادہ دور سر۔“ دین محمد بولا۔

آخر کچھ دور چلنے کے بعد سامنے چھوٹے سے خالی میدان میں ٹوٹے پھوٹے چند کمرے دکھائی دیے۔ جن کے سامنے ایک برآمدہ سا تھا، جو یوں نظر آ رہا تھا جیسے ابھی گر پڑے گا۔ اس کے اندر قطاروں میں بہت سے بچے فرش پر بیٹھے تھے۔ باہر ایک بڑے درخت کے نیچے بہت سے بچے زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ایک ماسٹر صاحب ہاتھ میں چھڑی سنبھالے ٹہل ٹہل کر پڑھا رہے تھے۔ ان لوگوں کو آتا دیکھ کر وہ رُک گئے۔ پھر نورے کے باپ کو پہچان کر آگے بڑھے اور ان لوگوں سے ہاتھ ملانے لگے۔

میرا بیٹا کاشف، نور محمد کے ساتھ کھیلتا ہے اور یہی ہمیں آج اس کا سکول دکھانے لایا ہے۔ میں دیکھنے آیا ہوں کہ اس سکول کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔

بہت بہت شکریہ، ماسٹر صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ سکول کی حالت تو آپ کے سامنے ہے۔ ایسے ہزاروں سکول موجود ہیں جو توجہ کے محتاج ہیں۔

شکریہ کی کیا بات ہے۔ بچوں کو پڑھنے کے لیے بہتر ماحول کی وجہ سے بہت سے بچے پڑھائی چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ آپ جیسے چند اور لوگ مل جائیں تو ایسے سکولوں کی حالت سنور جائے۔

کاشف جیسے بچوں کی بات کیجیے دراصل وہی ہمیں لے کر آیا ہے۔ اسی نے اپنے دوست نورے کی تکلیف محسوس کی۔

سیٹھ صاحب واپس لوٹے تو بہت کچھ سوچ رہے تھے انھوں نے اگلے روز ہی اپنے چند دوستوں سے بات کی۔ سب نے اس نیک کام میں حصہ لینے کا وعدہ کیا۔

چند ہی روز میں سیٹھ اکبر علی نے سکول کی خستہ حال عمارت کی مرمت کروا دی۔ ان کے دوست نے بچوں کے لیے بینچ فراہم کرا دیے ایک اور دوست جن کی بجلی کے سامان کی فیکٹری تھی انھوں نے پنکھوں کا انتظام کر دیا۔ اسی طرح نورے کا سکول کسی سکول سے کم نہ رہا۔

دین محمد ایک دن سیٹھ اکبر علی سے کہہ رہا تھا۔

کاشف بیٹا بہت نیک بچہ ہے۔ اس نے اپنے دوست کی ہمدردی کی اور پورے سکول کی حالت بدل گئی۔ سینکڑوں غریب بچوں کا بھلا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کاشف بیٹے کو اس کا اجر دے گا اور اسے بہت لائق بنائے گا۔

آمین:

سیٹھ صاحب نے کہا۔

اب نورا بہت خوش تھا۔ اچھلتا کودتا جاتا تھا۔ اس کے کپڑے اب خراب نہیں ہوتے تھے نہ ہی سردی گرمی میں باہر بیٹھنا پڑتا تھا۔

میرا بیٹا نور محمد بڑے اچھے سکول میں پڑھتا ہے۔ دس جماعتیں پڑھے گا۔ دین محمد نے کہا۔

اس سے بھی زیادہ ابا۔ نور محمد بولا اور سب ہنس پڑے۔

☆☆☆☆

یونس جاوید

صبح کا بھولا

گھر سے سکول جاتے جاتے اچانک حامد کے دل میں خیال آیا کہ آج چھٹی ہی کیوں نہ کی جائے۔ تمام دن سڑکوں پر گھوما پھرا جائے باغ کی سیر کی جائے۔ تتلیاں پکڑی جائیں اور درختوں کے نیچے بیٹھ کر ٹھنڈی چھاؤں اور مزے دار کہانیوں کا حظ اُٹھایا جائے۔ شاید یہ بات اس لیے اس کے دل میں آ گئی تھی کہ آسمان پر اُجلے اُجلے بادل چھائے ہوئے تھے، گرمیوں کے آغاز کا موسم تھا اور گھر سے نکلتے ہی جو ٹھنڈی خوشگوار ہوا حامد کے سینے میں بھری تو اس نے سکول جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔

گھر والوں کو پتا نہ چل جائے۔ اس کے دل میں خیال آیا۔

لو۔۔۔ بھلا گھر والوں کو کس طرح علم ہو سکتا ہے میں گھر عین وقت پر جاؤں گا جس طرح ہر روز سکول سے واپس جاتا ہوں، حامد نے اپنے دل میں آئے ہوئے خیال کو جھٹک دیا اور سکول جانے والے راستے سے ہٹ کر دوسری سڑک پر ہولیا۔

یہ سڑک ایک باغ میں جا نکلتی تھی۔ باغ کے بالکل ساتھ چڑیا گھر بھی تھا، جس میں مور، راج ہنس، شیر، چیتا، ریچھ اور ہرن جانور تھے۔ مگر حامد کا خیال تھا کہ پہلے باغ کی سیر کی جائے۔ سو وہ تیز تیز چلتا ہوا باغ میں آ گیا۔ اسے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ باغ میں اس وقت رونق یا بھیڑ بھاڑ نہیں۔ اس کا خیال تھا کہ میری طرح بہت سے اور لڑکے بھی سکول سے بھاگ کر آئے ہوں گے، مگر یہاں تو باغ کے مالیوں کے سوا اور کوئی تھا ہی نہیں۔۔۔ وہ کچھ سوچتا ہوا ایک پہاڑی پر چڑھ گیا اور ایک کونے میں رکھے ہوئے خوبصورت بنچ پر آ بیٹھا۔ یہاں تک آتے ہوئے وہ تھک سا گیا اور ابھی تک ذرا بھی لطف نہ آیا تھا۔ بستہ زمین پر رکھ کر وہ بنچ پر لیٹ جانا چاہتا تھا کہ اسے وہ تین رنگ برنگی تتلیاں نظر آئیں۔ اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ کتنی خوبصورت ہیں یہ تتلیاں اُدھر سے اِدھر اور اِدھر سے اُدھر اُڑ رہی تھیں۔ جب حامد اُن کے قریب پہنچا تو وہ پھر سے اُڑ کر دُور جا بیٹھیں۔

اس بھاگ دوڑ میں وہ پہاڑی کے دوسرے کنارے تک چلا گیا۔ یہاں تین چار تتلیاں ایک ساتھ بیٹھیں تھیں۔ اس نے رومال پھینک کر دو پکڑ لیں، انہیں رومال میں باندھ لیا، باقی اُڑ کر نیچے کی طرف جا رہی تھیں، وہ اُن کے پیچھے پیچھے دور تک چلا گیا اور بڑی تگ و دو کے بعد ایک تتلی اور پکڑ سکا۔ وہ اس وقت تھکن محسوس کر رہا

تھا۔ وہ تتلی کو جیب میں ڈال کر رومال میں بندھی تتلیوں کو تلاش کرنے لگا۔ جنھیں وہ ایک درخت کے نیچے رکھ گیا تھا مگر اسے سخت افسوس ہوا، دو تتلیوں میں ایک اُڑ چکی تھی۔

ناچار اُس نے دونوں کو رومال میں باندھ لیا اور بستے کو تلاش کرنے لگا۔ سامنے ہی بینچ تھا۔ وہ دوڑ کر قریب آیا تو اس کے نیچے بستہ نہیں تھا۔ وہ بڑا حیران ہوا۔ جس طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھتا اُسے کوئی نہ کوئی بینچ دکھائی دیتا لیکن اُن کے نیچے بستہ نظر نہ آتا تھا۔ شاہد وہ بھول چکا تھا کہ اس نے کس بینچ کے نیچے رکھا ہے۔ ایک گھنٹے تک وہ مارا مارا پھرتا رہا۔ اسے پیاس بھی لگ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پہاڑی سے نیچے اُترنے لگا سامنے ایک اور بنچ تھا۔ اس کے نیچے اس کا زرد بستہ رکھا تھا۔ وہ بھاگ کر قریب پہنچا اور بستے کو اُٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ جنگلی بلا تھا جو سو رہا تھا۔ وہ پہلے تو غرایا اور پھر اُس نے زور سے چھلانگ لگائی کہ حامد پہاڑی پر سے پھسلتے پھسلتے بچا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

وہ مایوس اور سہما ہوا مڑا تو اس کے پاؤں کے بالکل قریب سے ایک مینڈک اُچھل پڑا۔ وہ مینڈک سے ڈرتا تو نہیں تھا۔ مگر اچانک اُس کے اُچھلنے سے ڈر گیا تھا۔

اُسے یاد آیا کہ اس جگہ سانپ سے بھی سامنا ہو سکتا ہے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اس کے سامنے کالے سیاہ اور زرد زرد سانپ رینگنے لگے۔ اُس نے ایک منٹ تک آنکھیں بند رکھیں اور پھر بُرا سا منہ بنا کر پہاڑی سے اُترنے لگا۔

سڑک پر آ کر اُسے دل سے ایک بوجھ اُترتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور چلنے ہی والا تھا کہ خیال آیا کہ بستہ تو پہاڑی پر رہ گیا ہے، وہ اس خیال سے اداس ہو گیا۔ دوبارہ پہاڑی پر چڑھنے کی اُس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ بغیرہ سوچے سمجھے سڑک پر چلنے لگا۔ جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے پاؤں من من کے ہو گئے تھے۔ وہ بستہ لیے بغیر گھر کیوں کر جا سکتا ہے۔ یوں تو سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور شاید پھر اُس پر اعتماد نہ کیا جائے اور سکول کے لڑکے بھی اسے آوارہ سمجھیں اور ماسٹر صاحب بھی اُسے نالائق لڑکوں کی فہرست میں جگہ دیں۔ ہائے! وہ کیوں سکول نہ چلا گیا۔

اب چڑیا گھر کی دیوار شروع ہو گئی تھی دیوار کیا تھی۔ جنگلا سا تھا، جس میں سے اکثر جانور دکھائی دے رہے تھے۔

وہ جنگلے کے پاس کھڑا ہو کر اُس ہرن کو دیکھنے لگا جو گھاس کھا رہا تھا۔ اس کے دائیں طرف پانی کے چھوٹے سے جوہڑ میں راج ہنس تیر رہے تھے اور دور سے شیر کے دھاڑنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ وہ ایک منٹ کے لیے بستے کو بھول گیا اور جانور دیکھنے لگا کچھ اور لوگ بھی پنجروں سے کچھ دور کھڑے جانور دیکھ رہے

تھے اور انہیں چنے وغیرہ بھی کھلا رہے تھے۔ یکا یک اُسے طاہر نظر آیا۔

طاہر اُس کا خالہ زاد بھائی تھا اور اُس سے دو برس بڑا بھی تھا۔ اس نے سوچا اگر طاہر مان جائے تو بستہ تلاش کیا جا سکتا ہے اور...... یہی کچھ سوچ کر اُس نے فوراً طاہر کو آواز دی مگر طاہر تک یہ آواز نہ پہنچ سکی۔ طاہر وہاں سے ہٹ کر بندر دیکھنے آگے نکل گیا۔

حامد اُس وقت بڑا بے چین تھا۔ اُسے بستہ تلاش کر لینے کا ایک راستہ دکھائی دیا تو تھا مگر اب چڑیا گھر کے ٹکٹ کی مجبوری تھی اور جیب میں صرف دس پیسے تھے۔

اچانک اُسے ایک ترکیب سوجھی۔ اُس کے سامنے ایک جگہ سے جنگلا ٹوٹا ہوا تھا۔

اِدھر اُدھر دیکھ کر اُس نے قدم آگے بڑھائے اور چاہتا تھا کہ اندر کود جائے مگر سڑک پر دو راہگیروں کے آجانے سے وہ رُک گیا۔

وہ لوگ گزر گئے تو اُس نے دوبارہ ہمت باندھی اور ٹوٹے ہوئے جنگلے سے اندر قدم رکھ دیا۔ ایک لمحے میں وہ چڑیا گھر کے اندر تھا۔

وہ خود تو اندر پہنچ گیا تھا مگر ٹوٹے ہوئے جنگلے کی ایک کیل میں اس کی قمیص بری طرح پھنس گئی تھی۔ جسے چھڑانے کے لیے اُسے دو منٹ تک رُکنا پڑا۔ کوشش کے باوجود قمیص تار میں اُلجھی رہی۔ اُس نے ایک جھٹکے سے قمیص علاحدہ کی تو وہ اوپر تک پھٹ گئی۔

وہ ابھی اپنا پھٹی ہوئی قمیص دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک خاکی وردی والے چڑیا گھر کے نگران نے اُسے گردن سے آن دبوچا۔ اُس کی چیخ تک نہ نکل سکی۔ اس نے ہاتھ پاؤں مار کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ ناچار وہ ہانپ کر رہ گیا۔

مجھے چھوڑ دو۔ اُس نے منمنا کر کہا۔

کیوں چھوڑ دوں؟ تم بغیر ٹکٹ اور غلط راستے سے اندر آئے ...... تمھیں اب پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔

پولیس کا نام سن کر تو حامد کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور حلق سوکھنے لگا۔ وہ آدمی حامد کو اپنے دفتر کی طرف گھسیٹنے لگا۔ حامد رونے لگا تھا۔ اس نے لاکھ منتیں کیں مگر اُس آدمی نے اُسے نہ چھوڑا اپنے افسر کے پاس لے گیا۔

یہ ایک بڑی بڑی مونچھوں والا سیاہ رنگ کا موٹا سا آدمی تھا۔ حامد اُسے دیکھ کر ہی ڈر گیا۔ مگر وہ آدمی قدرے رحم دل نکلا۔ اس نے حامد سے سب حالات پوچھے۔ حامد نے اُسے سب کچھ بتایا اور پھر رونے لگا۔

اس بڑے افسر نے اسے تسلی دی اور کہا، تمہیں بہت تھوڑی سزا ملے گی۔ صرف اتنی کہ آج شام تک تمھیں اس چھوٹے سے کمرے میں بند رہنا پڑے گا۔ اس نے یہ کہہ کر چپڑاسی کو اشارہ کیا تو واقعی چپڑاسی نے اسے چھوٹے سے تاریک کمرے میں بند کر دیا۔

اس کمرے میں حامد کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کا جی پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ کاش وہ سکول سے چھٹی نہ کرتا۔ وہ گھٹنوں میں سر دے کر سسکنے لگا اور دیر تک سسکتا رہا۔ حتیٰ کہ اس افسر نے خود دروازہ کھولا اور اس شرط پر رہا کر دیا کہ آئندہ کبھی وہ سکول سے نہیں بھاگے گا۔ حامد نے وعدہ کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ چپڑاسی اسے چڑیا گھر کے دروازے تک چھوڑنے آیا تھا۔

وہ اس وقت بے حد غمگین تھا۔ اتنا غمگین کے اسے بہت دیر تک چلنے کے بعد بات معلوم ہوئی کہ اُس کا ایک جوتا غائب ہے۔

ایک جوتا ایک پاؤں میں تھا اور دوسرا جانے اس افراتفری میں کہاں گم ہو گیا تھا۔ اس کے دُکھ میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

وہ پھٹی ہوئی قمیص ایک جوتا ہاتھ میں پکڑے بغیر بستے کے روتا بسورتا جب گھر میں داخل ہوا تو شام ہو چکی تھی۔ اس کے ابا جان برآمدے میں کرسی پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے حامد کو اس حالت میں دیکھا تو انہیں بہت غصہ آیا۔

حامد کچھ کہنے کے بجائے رونے لگا۔ رونے کی آواز سن کر امی دوڑتی آئیں اور بیٹے کی بلائیں لینے لگیں۔ حال پوچھا تو حامد نے شروع سے آخر تک سچ سچ بتا دیا۔ اس پر اس کے ابا جان کو اور بھی غصہ آیا مگر حامد نے فوراً کہا ان سب چیزوں کے باوجود میں نے آج کا سبق اچھی طرح یاد کیا ہے ابا جان:

وہ کیا ......؟ اس کے ابا ذرا نرم ہو کر بولے، یہ کہ سکول سے نہیں بھاگنا چاہیے۔ تتلیوں کو یا کسی بھی پرندے یا جانور کو قید نہیں کرنا چاہیے۔ بغیر ٹکٹ کے چڑیا گھر میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کہتے ہوئے حامد نے رومال سے دونوں تتلیوں کو نکالا اور اُچھال دیا۔ وہ ہوا میں اُڑنے لگیں اور سامنے درخت پر جا بیٹھیں۔

خوب ...... اس کے ابا بولے ...... اگر واقعی تم نے ان تکلیفوں کے بعد یہ سبق سیکھا ہے تو پھر تم بڑے خوش قسمت ہو۔ لہٰذا تمھارا قصور معاف۔

حامد مارے خوشی کے ماں سے لپٹ گیا۔ اس کے ابا بھی پاس کھڑے مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆☆

اسماء ہارون

رُوحوں کے رشتے!

”تمھارا کیا نام ہے؟“

”دولت! اور تمھارا؟“

”بینش!

”بی نش؟ اس کا کیا مطلب ہے؟“

”دانائی، ہوشیاری!“

”تمھارا یہ نام کس نے رکھا تھا؟“

”میری امی نے!“

”وہ کہاں ہیں؟“

”میں جب چھوٹی سی تھی تو اللہ میاں نے انھیں بلا لیا! تمھاری امی کہاں ہیں؟“

”پپا کہتے ہیں کہ مما امریکا میں رہتی ہیں۔ وہ وہاں پڑھ رہی ہیں!“

”اچھا۔۔۔آ۔۔۔آ! تمھیں ناشتا کھانا کون دیتا ہے؟“

”پپا نے تین چار عورتیں اور مرد سرونٹ جو رکھے ہوئے ہیں!“

”اوہ!“

میرے بنگلے میں چلو ناں! وہاں بہت ساری چیزیں دکھاؤں گی تمھیں!

”ابھی نہیں، پھر کبھی!“

”اچھا تو آج سے میری تمھاری دوستی پکی!“

”سچ!؟“

”سچ نہیں تو اور کیا!“

”بابا! یہ ساتھ والے بنگلے میں دولت رہتی ہے!“

”بنگلوں میں دولت ہی رہتی ہے جان پدر! مگر تمھیں یہ عجیب بات کس نے بتائی؟“

”کسی نے بھی نہیں بابا! اس بنگلے میں میری ہم عمر لڑکی رہتی ہے، اس کا نام دولت ہے!“

”اچھا۔۔۔ اب سمجھا! وہ تم سے کب ملی؟“ ”آج بابا، ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ وہ کہہ رہی تھی بنگلے میں چلو، اچھی اچھی چیزیں دکھاؤں گی۔“

”ناں۔۔۔ میری بینو، ناں! یہ غریبوں کے دشمن نہیں تو دوست بھی نہیں ہوتے!“

”کیوں بابا؟ دولت تو کہہ رہی تھی کہ آج سے ہم دونوں ایک دوسرے کی پکی دوست ہیں!“

”یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں بیٹے!“

”بن جائے گا میری جان، بینش بیٹے! جب اللہ میاں چاہیں گے!“

”اللہ میاں کب چاہیں گے بابا؟“

”تمھیں نیند نہیں آ رہی بیٹا؟“

”نہیں بابا۔۔۔ میں کل دولت کے پاس جاؤں گی۔“

”اچھا، اب تو سو جاؤ!“

”پپا! آج میں نے بینش کو اپنی پکی دوست بنا لیا!“

”کیا۔۔۔ کون بینش؟“

”یہ ہمارے بنگلے کے ساتھ والے مکان میں رہتی ہے!“

”او وہ ڈیم! خوب کان کھول کر سن لو۔ اب سے بنگلے سے باہر قدم نہ نکالنا۔۔۔ اچھا!“

”کیا ہو جائے گا پاپا؟“

”خبردار! غریب، حقیر بچوں کے ساتھ تمھیں کھیلنے کی کوئی ضرورت نہیں!“

”پھر میں اکیلی دن بھر کیا کروں؟“

”چلو۔۔۔ اپنے بیڈ روم میں جا کر سو جاؤ!“

”بینش! یہ دیکھو اڑتی ہوئی رنگ برنگی تتلیاں!“

”دولت! تمھارا باغ تو پھولوں سے بھرا پڑا ہے!“

”ارے! یہ مچھلی گھر بھی تو دیکھو! کتنا خوب صورت ہے!“

”ہائے اللہ! کتنا پیارا ہے! یہ کون لایا؟“

”میرے پپا لائے۔ پانچ ہزار روپے کا ہے!“ ”پانچ ہزار روپے کا؟ ایک ہزار۔۔۔ دو ہزار۔۔۔ تین

ہزار۔۔۔چار ہزار۔۔۔پانچ ہزار۔۔۔پورے پانچ ہزار کا مچھلی گھر!''

''اب ذرا تم میرے کمرے میں تو چلو! یہ دیکھو۔۔۔کتنی پیاری پیاری گڑیاں ہیں! ہنستی، بولتی گڑیاں! سوتی جاگتی گڑیاں!'' ''واہ! کتنے اچھے اچھے، عمدہ عمدہ کپڑے اور فراک ہیں ان کے؟''

''کیا تمھارے پاس کوئی گڑیا نہیں ہے؟''

''میرے بابا تو مجھے۔۔۔''میری پیاری گڑیا'' کہہ کے پکارتے ہیں!''

''اچھا۔۔۔تو یہ لو دو گڑیاں میری طرف سے ''گفٹ'' کے طور پر!''

''دولت! تم کتنی اچھی دوست ہو!۔۔۔یہ مشین کیسی ہے؟''

''یہ وڈیو گیم کی مشین ہے۔ آؤ دکھاؤں تمھیں!''

''واہ واہ! وہ ہوائی جہاز آیا، ارے! اس پر تو فائر ہو گیا! یہ کیا۔۔۔اتنے سارے آدمی کہاں سے آ گئے؟

دولت۔۔۔دولت!

دیکھو وہ لڑکی سمندر میں گر گئی! بڑا سا مگر مچھ آ رہا ہے تیزی سے۔۔۔وہ اسے کھا جائے گا؟ ہائے! وہ بچاری لڑکی!

''دولت بے بی! صاحب آ گئے ہیں!''

''تو کیا۔۔۔چلو تم جاؤ یہاں سے!''

''دولت! دولت بے بی!''

''یس پپا! جسٹ کمنگ!''

''دولت! یہ تم کس لڑکی کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے؟ کون ہے یہ؟''

''یہی تو ہے پپا۔۔۔میری دوست بینش۔۔۔پڑوس میں رہتی ہے!''

''نان سینس! اے چھوکری! چل بھاگ یہاں سے!۔۔۔اور یہ گڑیاں کہاں لیے جا رہی ہے؟''

''پپا! یہ گڑیاں میں نے اسے گفٹ کی ہیں۔۔۔آؤ بینش! تمھیں گیٹ تک چھوڑ آؤں!''

''بابا! دولت میری بہت اچھی، پکی سہیلی ہے۔ دیکھیں، اس نے یہ دو گڑیاں تحفے میں دی ہیں؟''

''تم تو پگلی ہوئی جا رہی ہو! یہ لوگ، یہ بنگلوں میں ٹھاٹ باٹھ سے رہنے والے امیر لوگ۔۔۔یہ دولت والے، کبھی کسی کے سنگی ساتھی نہیں ہوتے بیٹا بینش!''

''بابا! میری دوست دولت کے بابا اچھے نہیں ہیں۔۔۔مجھے بہت ڈانٹا ڈپٹا! وہ تو دولت آڑے آ گئی!''

’’میں تم سے ہمیشہ کہتا ہوں کہ وہاں مت جاؤ۔۔۔یہیں کھیل کود لیا کرو۔‘‘

’’بابا! ادھر بھی بنگلے، ادھر بھی بنگلے۔۔۔بس ایک ہمارا یہ چھوٹا سا پلاٹ بیچ میں ہے، اس میں بھی ادھورا کمرہ بنا ہوا ہے۔۔۔میں کس سے کھیلا کروں؟‘‘

’’او بھائی! تم اپنا پلاٹ بیچ کر یہاں سے چلے جاؤ۔۔۔منہ مانگے پیسے لے لو!‘‘

’’نہیں، سیٹھ صاحب! یہ میرے مرحوم باپ کی نشانی ہے۔ مجھے پیسا ویسا نہیں چاہیے۔ اپنے پاس ہی رکھیں!‘‘

’’دیکھو! اپنی بیٹی کو بنگلے جانے سے منع کرو۔ اب کے بنگلے میں اندر آئی تو ٹانگیں توڑ دوں گا اس کی!‘‘

’’اچھا سیٹھ صاحب! سختی سے منع کر دوں گا اسے!‘‘

’’بینش، بینش! کم آن بھئی۔۔۔گھر سے باہر نکلو نا!‘‘

’’بے بی! آپ سے اب نہیں کھیلے گی!‘‘

’’کیا؟ کیوں نہیں کھیلے گی وہ انکل؟‘‘

’’سیٹھ صاحب نے حکماً کہا ہے کہ اگر وہ بنگلے کے اندر آئی تو اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا!‘‘

’’اچھا۔۔۔تو پپا نے یہ بات کہی ہے، انکل؟ آپ میری فرینڈ کو تو باہر بھیجیں! میرا دل بہت اداس ہو رہا ہے اس کے بغیر!‘‘

’’بے بی! ہم غریبوں پر رحم کریں!‘‘

’’میں آج بینش کو اپنے ساتھ اپنے بیڈ روم میں سلاؤں گی۔ آپ اجازت دیں!‘‘

’’دولت بے بی! اس کی ٹانگیں۔‘‘

’’پہلے میری ٹانگیں ٹوٹیں گی۔۔۔بینش! باہر آؤ بھئی! یہ دیکھو! آج شاپنگ کرنے گئی تھی! تمھارے لیے اپنی جیسی بائیسکل لائی ہوں۔۔۔آؤ دیکھو! کتنی خوب صورت ہے! انکل! یہ پکڑیں سائیکل! میں بینش کو اپنے ساتھ لیے جا رہی ہوں!‘‘

’’پپا! بینش آج میرے ساتھ میرے بیڈ روم میں رہے گی۔ ہم دونوں خوب باتیں کریں گی، ہنسیں گی، بولیں گی۔ اچھے اچھے سہانے خواب دیکھیں گی۔ بنفشی سرمئی اور دودھیا رنگوں کے حسین بادلوں میں پریوں کے ساتھ اڑتی پھریں گی!‘‘

’’شٹ اپ! کیا بکواس ہے؟‘‘

''اچھا تو پھر میں اس کے گھر جا رہی ہوں۔ صبح ناشتے کے وقت۔۔۔''

''دولت بیٹا! کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟ کہاں یہ بوریہ نشین لوگ اور کہاں ہم لوگ!''

''پپا! بینش میری دوست ہونے کے علاوہ آج سے وہ میری بہن ہے اور میں اس کی بہن!''

''دولت! مجھے اب کچھ کرنا ہی پڑے گا! او کے! گڈ نائٹ''۔

''ڈاکٹر صاحب! میری بینش کو بچا لیں! میں پاگل ہوا جا رہا ہوں! مجھے کچھ پتا نہیں کیا کچھ بک رہا ہوں۔''

''حوصلہ رکھیں۔۔۔ بس دعا کریں۔۔۔ انتہائی ذہنی صدمہ پہنچنے سے بچی کی بیماری قابو میں نہیں آ رہی!''

''ڈاکٹر صاحب! پڑوس کے بنگلے کی امیر کبیر بچی اور میری بچی میں پکا بہناپا قائم ہو گیا تھا۔ سیٹھ صاحب کو یہ سخت ناپسند تھا۔ ایک مہینہ ہوا وہ اپنے ساتھ امریکا لے گیا ہے!''

''بھائی! معاملہ اب اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔۔۔ وہی شفا بخشنے والا ہے!''

''بینش کہاں ہے بڑے بھائی؟''

''بڑا بھائی؟ کون بڑا بھائی؟''

''مذاق مت کریں! آپ کی بچی کہاں ہے؟''

کیوں سیٹھ صاحب! کیا بات ہو گئی؟''

''امریکا میں دولت، بینش کی جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ وہ برین ہیمرج کا شکار ہو گئی! وہاں کے بہترین ڈاکٹروں سرجنوں کا علاج کرایا مگر بے سود۔ ان کی رائے میں بینش ہی اس کا واحد علاج ہے۔ اس وقت بھی بنگلے میں شہر کے چوٹی کے معالج موجود ہیں۔ مہربانی کر کے ذرا بینش کو بھیج دیں؟''

''چلے جاؤ سیٹھ صاحب، یہاں سے چلے جاؤ! وہ کل عالم بالا کو سدھار چکی! میری بینش کے قاتل چلے جاؤ یہاں سے!''

''سیٹھ صاحب! اب کچھ باقی نہیں رہا! بس دعاؤں کی ضرورت ہے!

''ہائے۔۔۔ میری دولت! اوہ! میرے خدا!''

اگلے دن قومی اخبارات میں یہ خبر جلی سرخیوں کے ساتھ چھپی کہ سیٹھ حبیب نے اپنی ساری جائیداد ملک بھر کی بارہ سال عمر تک کی بچیوں کے علاج و بہبود کے لیے وقف کر دی!

☆☆☆☆

امرت

پِلا

نقاہت کے باوجود آج پھر اس کی آنکھ چائے کی بھینی بھینی خوشبو سے کھل گئی وہ اپنی جھونپڑی سے باہر نکل آیا باہر بھی کیا نکلنا؟ ایک لحاظ سے وہ باہر ہی تو تھا کیوں کہ جھونپڑی کا پچھلا حصہ گذشتہ سال کی موسلا دھار بارش سے بھیگ بھیگ کر گر چکا تھا کانے اور تنکوں سے بنی یہ جھونپڑی بارش کے پانی کی وجہ سے جگہ جگہ سے خالی ہو چکی تھی دور سے دیکھنے سے یوں لگتا جیسے آگ لگنے سے سیاہ ہو چکی ہو وہ اس چائے خانے کی جانب خود کو کھینچتا ہوا چلنے لگا بھوک، نقاہت بیماری کی وجہ سے جھونپڑی کی طرح اس کی رنگت بھی سیاہ ہو چکی تھی حالاں کہ جب یہ پیدا ہوا تھا تب گورا چٹا تھا۔ اس کی ماں اینٹوں کے بھٹے پر مزدوری کرتی تھی۔ شوہر ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہو کر مر چکا تھا اور ماں خود ٹی بی کی مریضہ تھی اپنے بیٹے کے لیے دل و جان سے محنت کرتی تھی مگر موت کے بڑھتے سائے نے اس کی زندگی بھر کی روشنی چھین لی تب ہی اس کا بیٹا اس اینٹوں کے بھٹے کے اردگرد پھرتے ہوئے جوان ہوا۔ جوانی تو برائے نام ہی اس پر آئی بلکہ آئی اور منہ چڑا کر گزر گئی اور یہ ماں کے ساتھ جھونپڑی میں قبل از وقت آئے بڑھاپے سے لپٹ کر رہنے لگا۔ بیماری سے آئی نقاہت نے اس کے بھٹے پر پھیرے پہلے کم اور پھر بعد میں بالکل ہی بند کر دیئے ورنہ اس کی ماں کو جاننے والی مزدور عورتیں اسے کچھ نہ کچھ کھانے کو دے ہی دیتی تھیں۔ اینٹوں کا بھٹہ اس کی جھونپڑی سے کافی دور تھا اس لیے اس نے اپنی ساری امیدیں اسی چائے کے کھوکھے سے لگا لیں اس کی جھونپڑی اس کھوکھے کے پچھواڑے تھی اور وہاں سے کھوکھے تک کا فاصلہ چند قدم ہی تھا کھوکھے کے ساتھ ایک پان والے کا بھی کھوکھا تھا ان دونوں کھوکھوں پر ہر وقت ہجوم رہتا کیوں کہ سامنے سڑک کے پار ایک ہاؤسنگ اسکیم بنی تھی اور اسی اسکیم میں رہنے والے خصوصاً من چلے تو ہر وقت یہاں جھرمٹ لگائے رکھتے تھے یہ بھی جھونپڑی سے اسی امید پر نکل آتا کہ شاید چائے کے کھوکھے والا رحم کھا کر اس کو گاہک کی بچی ہوئی ٹھنڈی چائے ہی دے دے یہ تو پیالی کی ٹھنڈی چائے پی کر اس کی تہہ میں پڑی پتی بھی کھا جاتا تھا اور ذرا دیر کو اس کی دھنسی ہوئی ٹی بی زدہ آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں بالکل ایسے جیسے صحن میں لالٹین پڑی ہو اور اس کی لو تیز ہوا سے کبھی ادھر کبھی ادھر ہوتی جاتی ہو مگر ذرا دیر کو ہوا رکے تو لالٹین کی لو ایک جگہ رک کر

روشنی دینے لگ جاتی ہے۔ آج کل تو اس کی حالت اور زیادہ ناساز ہو گئی تھی کیوں کہ کئی دنوں سے اسے بہت تیز بخار ہوتا تھا جو اس کی جمع شدہ طاقت کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیتا تھا۔

نئی ہاوسنگ اس کیم میں ایک گھر بالکل (سڑک کے دوسرے کنارے) تھا جس میں میاں بیوی کے علاوہ ایک دو سالہ بچہ اور ایک نوکرانی تھی ہر وقت اس گھر سے بچے کے چیخنے چلانے کی آواز آتی رہتی تھیں بچہ انتہائی ضدی تھا ماں اور نوکرانی سارا دن اسے طرح طرح کے کھانے پیش کر کر کے تھک جاتی تھی اور عیاشی میں پلا ہوا بچہ ادھ پونی چیز کھا کر ڈسٹ بن کے حوالے کر دیتا تھا عموماً بچہ نوکرانی کی نگرانی میں باہر کھیلنے آتا تو ہاتھ میں کچھ نہ کچھ کھانے کو ہوتا جسے وہ لاپروائی سے کھاتا کم اور گراتا زیادہ تھا یہ چائے کے کھوکھے باہر نیچے ٹھنڈی، نم زمین پر بیٹھا یہ تماشہ اپنی نقاہت بھری ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھتا اور مزید زمین کو اپنے گرتے آنسو سے نم کرتا رہتا، کڑھتا رہتا اور سوچتا کہ اے کاش! یہ گرتی ہوئی خوراک میں اٹھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھا لوں وہ آگ جو معدے سے شروع ہوئی مگر اب سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔

چائے کے کھوکھے کے مالک کی آواز نے اسے سڑے بجھے خیالات کی دنیا سے باہر نکالا مالک اسے آوازیں دے رہا تھا فقیرا!!!۔۔۔فقیرا!!۔۔۔اوئے۔۔آجا۔ یہ روٹی لے جا۔ یہ ہمت جمع کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور مالک نے اپنے گھر سے آئے لنچ میں سے بچی ہوئی روٹی کا ٹکڑا اسے ٹفن کے سالن والے خالی برتن کے ڈبے سے پونچھ کر یوں فخریہ انداز میں دیا۔ گویا اپنے 5 اسٹار ہوٹل کا کھانا کھلا رہا ہے۔

فقیر کا ناک تو کبھی کا سالن کا ذائقہ سونگھنے سے محروم ہو چکا تھا۔ سالن کا ذائقہ بھی اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ روٹی کے ٹکڑے کو یوں چبا چبا کر آہستہ آہستہ کھا رہا تھا جیسے وہ انتظار کر رہا ہو کہ (24) گھنٹے اسی روٹی کو کھاتے گزریں تاکہ پھر سے لنچ ٹائم کھوکھے کا مالک اسے آخری روٹی کا کوئی دو یا تین نوالے کا ٹکڑا دے دیں۔ بس یہی اس کا پورے دن کا کھانا تھا جو اس کے جزوِ بدن بننے کے بجائے جانے کہاں کھو جاتا ہے۔ مغرب کے بعد دونوں کھوکھے بند ہو جاتے تھے گویا امید کے دروازے بند ہو گئے ہوں۔

اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور آخری نوالہ منہ سے نکل کر زمین پر جا پڑا کھوکھے پر بیٹھے ایک گاہک نے نفرت سے منہ پھیر کر اپنی چائے پینی شروع کر دی۔ اور فقیرا خود کو سنبھالتا وہاں سے چل پڑا۔ جب ہاؤسنگ اس کیم کے بہت سے گھر بن چکے تھے تب، بھٹے پر گرنے والی ان بوندوں سے کہیں زیادہ تیزی سے اس کی سوکھی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے وہ کھوکھے کے آگے زمین پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ کاش یہ پانی کی بوندیں میرے

معدے کی آگ بھی بجھادیں۔ جس طرح خشک زمین کی آگ بجھا رہی ہیں کئی دنوں بعد بارش ہوئی تھی۔ ویسے بادل تو کئی دن سے بن رہے تھے۔ بمشکل خود کو گھسیٹ کر فقیرے نے کھوکھے کے قریب درخت تلے خود کو بارش سے محفوظ کرنا چاہا مگر بارش نے سردی میں اضافہ کر دیا تھا۔

اتنے میں سڑک پار اسی گھر سے بچہ نوکرانی کے آگے دوڑتا ہوا نکل آیا نوکرانی ہاتھ میں تازہ پراٹھے کا ٹکڑا لیے اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے بلا رہی تھی۔ بچے نے رک کر پراٹھا نوکرانی کے ہاتھ سے لیا اور زمین پر پھینک کر پھر گھر کی جانب حسرت سے دیکھنے لگا جیسے ہی پراٹھا گرا (فقیرے یا کتے کے بچے جانے کس کی نظر لگی؟) کتے کے بچے نے دوڑ لگادی اور جا کر جلدی سے پراٹھے کے ٹکڑے کو کھانے کے لیے اٹھا لایا جو اب تک آدھی مٹی سے لتھڑ چکا تھا۔ فقیرے نے حسرت سے اس پراٹھے کو دیکھا اور سوچا کہ کاش! میں بھی کتا ہوتا تو یوں خوراک حاصل کر لیتا اس نے خود کو گھسیٹ کر کتے کے بچے کے قریب کر لیا کتے کے بچے نے پراٹھے کا ٹکڑا منہ میں ڈالا اور غراہٹ سے اسے ڈرانے لگا، نقاہت سے تقریباً اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ فقیرے نے ہاتھ یونہی بڑھا رکھا تھا اور ہاتھ کی انگلیوں کی پوریں پراٹھے کے ٹکڑے کو پکڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ اگلا لمحہ چونکا دینے والا تھا۔ جب کتے کے بچے نے اپنی گرفت پراٹھے کے ٹکڑے پر کمزور کر دی اور پراٹھا اس لمحے فقیرے کی تحویل میں آگیا اور کتے کا بچہ پھر خوراک کی تلاش میں ڈرم کی جانب بڑھ گیا کیوں کہ بارش تھم چکی تھی۔ اس وقت تک تقریباً سبھی گھر والے اپنا کوڑا کرکٹ اسی کچرے کے ڈرم کے حوالے کر چکے ہوتے ہیں شاید کتے کا بچہ اس لیے بھی چلا گیا تاکہ فقیرا بنا شرمندگی کے اس پراٹھے کے ٹکڑے سے اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکے۔ تھا تو وہ کتے کا بچہ مگر زمانے کی سرد، گرم بھوک سہہ سہہ کر اب اتنا بھی بچہ نہیں رہا تھا وہ۔۔۔۔۔۔!

☆☆☆☆

حافظ مظفر محسن

چڑیا گھر کے مزدور

''پاپا''۔۔۔ یہ شیر ہم لوگوں کو کرتب دکھاتا ہے۔ ہمارے ساتھ شرارتیں کرتا ہے۔ ہمیں ڈراتا ہے۔ ہماری خاطر اس چھوٹے سے مرغیوں کے ڈربے جتنے پنجرہ نما جگہ میں ''گرفتار'' ہے۔ ''قید'' ہے کیا۔ ''قید خانے'' کے مالکان یا کرتا دھرتا اس بے چارے کو اس کام کی کوئی مزدوری بھی دیتے ہیں یا محض۔ ''پرانے جانوروں'' کے گوشت سے ہی ٹرخا دیتے ہیں۔ اور بے چارہ ''مرتا کیا نہ کرتا'' مجبوری میں زہر مار کر جاتا ہو۔ احمد نے ایک لمبا سوال چڑیا گھر میں داخل ہوتے ہی داغ دیا۔ اور میری ہنسی نکل گئی۔

''بھائی صاحب آپ چڑیا گھر کی سیر کو آئے ہیں یا جانوروں کے حقوق کی تنظیم ''ینگ جانور ایسوسی ایشن کے صدر ہو'' ارے توبہ۔۔۔ پاپا۔۔۔ یہ بندر پندرہ فٹ اونچے دس فٹ چوڑے پنجرے میں قید ہے۔ اور تڑپ بھی رہا ہے۔ کہاں یہ جنگلوں بیابانوں میں اس درخت سے اس درخت پر چھلانگ لگاتا ہے، انجوائے کرتا ہے۔ اپنے سے بڑے، طاقتور اور مکار جانوروں کو بھی گدگدی کر کے بھاگ جاتا ہے۔ اپنے بچوں کی جوئیں نکال نکال کر محض ''سویٹ ڈش'' کے طور پہ کھاتا ہے۔ کیونکہ باقی خوراک اسے جنگل میں بھاگتے دوڑتے مل ہی جاتی ہے۔!

بچے نے میری جگت بازی پر توجہ نہ دی۔ مجھے نہایت سنجیدگی سے دیکھا۔ پھر احمد نے درد بھری آہ بھرتے ہوئے کہا۔ تو میں بھی اداس ہونے لگا کہ اک بڑے بندر نے چھوٹے بندر کو تھپڑ مار دیا۔ اب جو شور مچا۔۔۔ خدا کی پناہ۔ بندروں نے سارا چڑیا گھر سر پہ اٹھا لیا۔ جیسے بندر کے خلاف ''خوفناک نعرے بازی'' ہو رہی ہو۔ احتجاج کیا جا رہا ہو۔ بھلا بندر کے احتجاج سے بندر کیونکر ڈر سکتا ہے۔ آگے سے اس ظالم نے بھی چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ بچے جو چڑیا گھر کی سیر کو آئے تھے وہ خوشی سے تالیاں پیٹنے لگے۔ اور بندر جنگلے کی جالیاں پیٹنے لگے۔ گویا بندروں کی لڑائی نے چڑیا گھر کے ''سکون'' کو چار چاند لگا دیئے۔ یعنی جنگل کا قانون چڑیا گھر میں نافذ ہو گیا۔ جس کا جو دل چاہے وہ کرے۔ شور مچاؤ۔ کوئی جیے چاہے مرے۔ نہ پولیس نہ تھانہ۔ نہ ہی ماماں جی کی عدالت۔!

اک خوبصورت سی صدا بلند ہوئی ہم سب اس جانب متوجہ ہوئے۔ ارے واہ۔ ’’مور ناچ رہا تھا۔ اپنے نہایت خوبصورت پنکھ پھیلائے۔۔! ‘‘ سب خوش تھے۔ حیرت اور محبت سے یہ نہایت دل کش منظر دیکھ رہے تھے۔

’’پاپا۔۔ دیکھا‘‘۔۔ احمد پھر بول پڑا۔ ’’اتنے خوبصورت پرندے کو آپ لوگوں نے پنجرے میں قید کر رکھا ہے۔ یہ کھیتوں اور جنگل باغات میں پھرتا۔ اڈاریاں مارتا پرندہ۔ اس کی آزادی ان انسانوں نے نہایت محبت سے سلب کر رکھی ہے۔ اور اس قیدی کو دیکھنے لوگ جوق در جوق آ رہے ہیں۔ ٹکٹ خرید کر۔‘‘ میں پھر چپ ہو گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سب لوگ مگن تھے مور کے خوبصورت ڈانس دیکھنے میں۔ دونوں مور، جو سبز پیلے رنگ اور ایک مکمل سفید رنگت میں تھا۔ اپنی دھن میں مگن تھے۔

اک اور شور اٹھا۔ اتنا خوبصورت موروں کا جوڑا لوگوں کی توجہ میں نہ رہا۔ سب بچے تالیاں بجاتے بھاگ نکلے۔ اک نہایت مسحور کن آواز۔ جیسے بہت سے گیدڑ ایک ساتھ بول رہے ہیں۔ یا شاید آندھی آ رہی ہو یا بہت سے شیر ایک ساتھ رو رہے ہوں۔ بچے بڑے سب اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اک شخص جو چھوٹی سی جسامت کا تھا۔ اس نے اک مخصوص قسم کی لکڑی کی بنی ہوئی چیز پکڑ رکھی تھی۔ وہ ایک بڑے سائز کی بس جتنے جانور کو محبت سے مخصوص آواز نکال کر ہانک رہا تھا۔ اور وہ اسکول سے نکلے بچے کی طرح جس کے پیچھے اس کا استاد آ رہا ہو۔ ادب سے چل رہا تھا۔ رفتار کوئی خاص نہ تھی مگر انداز جارحانہ تھا۔ جیسے وقت کے حاکم کی سواری جا رہی ہو۔ کالی رنگت والا۔ بدمست ہاتھی۔ ارے یہ تو ’’لکی رانی‘‘ ہے۔

لاہور کے چڑیا گھر کی شہزادی۔ کچھ بچے سیڑھی کی طرح ہتھنی پر چڑھ دوڑے۔ وہ شاید مسکرا رہی تھی۔ یا برا محسوس کر رہی تھی۔ کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ احمد پھر بول پڑا۔ ’’پاپا‘‘۔۔۔ یہ بے چارہ ہاتھی کہیں کیچڑ کے باعث سلپ نہ ہو جائے۔ یہ چڑیا گھر والوں نے دیکھو کیسے اس جنگلی شہزادے کو چڑیا گھر میں قید کر رکھا ہے۔ اس کی آزادی سلب کر رکھی ہے۔ ہاتھی دن میں میلوں سفر کرتا ہوگا۔ میلوں پھیلے جنگلی پھل، گنے کے کھیت سب اس کی دسترس میں ہوتے ہوں گے۔ مگر یہاں بے چارہ یہ ہیبت ناک جانور محدود قسم کی دو گلیوں میں بند ہے۔ سارا دن ان گلیوں میں چکر لگاتا رہتا ہوگا۔ پاپا یہ ان چھوٹے چھوٹے چکروں کی وجہ سے گھبرا تو جاتا ہوگا۔ ممکن ہے اسے چکر بھی آتے ہوں اور وہ بے چارہ الٹیاں بھی کرتا ہو۔ شاید اسے بچوں کا یہ شور پسند نہ ہو مگر کس قدر انسان نے اس بے چارے کو مجبور کر کے رکھ دیا ہے۔ چند پرانے بوسیدہ گنے کھا کھا کے بے

چارہ کیا سوچتا ہوگا؟

تو کیا۔۔احمد۔۔۔چڑیا گھر والوں کو چاہیے کہ وہ اس کو گنے کا رس پلائیں یا کسی بڑے کپ میں چائے ڈال کے دیں اور وہ چسکیاں لے لے کر پیتا جائے اور منہ سے ہلکا ہلکا دھواں بھی نکالے۔

اب کے احمد کی بھی ہنسی نکل گئی۔ ”اور اگر چائے نہ ہو تو کافی ہی چل جائے گی“۔ احمد نے اپنی رائے کا اظہار بھی کر ڈالا۔ ”بیٹے۔۔کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بچوں کو چڑیا گھر کی سیر کرانے کے عوض چڑیا گھر والے اسے ڈالروں میں مزدوری دیں یا بڑے سائز کا چیک کاٹ کے دیں سات سو نوے روپے چالیس پیسے کا۔

”لو جی۔ یہ غضب بھی انسان نے ڈھایا اور شیر چیتا۔۔۔ ببر شیر سب مزدوری پر جھونک ڈالے“۔ شیر دھاڑا۔۔لیکن دو تین بچوں نے چھوٹے چھوٹے شیشوں سے ان کی آنکھوں میں چمک ڈالی تو وہ دھاڑنا بھول گئے۔ گویا بچوں نے شیر کو بھی بہکا دیا۔ چکر میں ڈال دیا۔۔۔ وہ بچے جن سے شیطان ڈرتا تھا۔ شیر بھی ان کی دسترس سے نہ بچ پایا۔ میں نے نہایت سنجیدگی سے احمد کی بات پر غور کیا یہ شیر، چیتے یہاں تک کہ بھورے غضب ناک بالوں والا ببر شیر بھی بچوں کے لیے تفریح کے سامان کے طور پر یہاں بند ہے۔ محدود جگہ پر زندگی گزارنے کو پابند ہے۔ ویسے جنگل میں اس کا مقام سب سے بلند ہے۔

”پاپا دیکھو۔۔یہاں کس قدر گند ہے“۔۔! شیر کو اس کے شایان شان جگہ تو بہرحال ملنی چاہیے۔ چلیں سنگ مرمر نہ ہی موجودہ دور کے مطابق چپس ملا فرش تو ہو جس کی صفائی ستھرائی تو ہر روز نہایت آسانی سے ہو سکے۔ مگر۔ چڑیا گھر اور جنگل میں چونکہ فرق ہے اس لیے ایسا تو ہوگا۔ میں نے بات کی تو احمد اچھل پڑا۔

”پاپا“۔۔۔ جہاں جہاں انسان کے قدم پہنچے اس نے غضب ڈھا دیا۔ دنیا کو ایٹم سے متعارف کروا دیا۔ جاپان میں دیکھیں تابکاری اثرات سے اب انسان خود ہی اپنے بنائے ایٹم بم سے خوفزدہ ہے۔ بالکل بے بس ہے۔ چڑیا گھر کو۔۔۔ جنگل کا نمونہ ہونا چاہیے تھا لیکن یہ ایک کمرشل جگہ بن گئی۔۔نہ صفائی۔ نہ ستھرائی۔ حالاں کہ اگر آپ نے یہ جانور مزدوری کے لیے رکھے ہیں تو یہ چڑیا گھر کسی بہت بڑی بہت ہی کھلی جگہ ہونا چاہیے۔ کہ یہاں تو بندر آدھ مرلہ کے پنجرے میں بند ہیں۔ پندرہ شیروں کے لیے ایک کنال پر ان کی رہائشیں، ورزش کی جگہ، واش روم (اوپن ائیر) ہے نا زیادتی۔۔۔ حالاں کہ اس کو ایک عدد شکارگاہ بھی الاٹ ہونی چاہیے۔ جب کہ الٹا خود بچوں کے ظلم کا شکار ہیں۔۔!“ احمد غصے میں تھا۔

”تو بیٹا۔۔اس سے آپ کی کہیں یہ مراد تو نہیں کہ شیر چیتوں کو بھی شیشے دیئے جائیں کہ وہ دھوپ کی

رفلیکشن سے بچوں کی آنکھیں بھی چندھائیں ۔ ان کو ڈرائیں’’ ۔ گویا شیر چیتے اور بچے آپس میں دو ٹیمیں بن کر کھیلیں اک دوسرے کو ڈرائیں موجیں کریں ۔

میری اس بات سے احمد کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا ۔ اس نے میری انگلی پکڑی اور مجھے چڑیا گھر انتظامیہ کے دفتر لے گیا ۔ ‘‘بڑے افسر تو چھٹی پر تھے سنا ہے رحیم یار خان شکار پر گئے ہوئے ہیں ۔’’ (اپنا چڑیا گھر چھوڑ کر پرندوں کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں) باقی لوگوں نے جب احمد کی جانوروں سے ہمدردی والی باتیں سنیں تو ہنسنے لگے ۔ لیکن جب میں نے احمد کی سنجیدگی کی بنیادی وجہ بتائی تو انہوں نے ہمیں بٹھایا اور چائے پیش کی اصل میں، میں چاہتا ہوں کہ یہ جو سینکڑوں جانور، پرند چرند ہم نے پنجروں میں بند کر رکھے ہیں محض بچوں بڑوں کی تفریح طبع کے لیے خود مزدور بن کر خدمات سرانجام دے رہے ہیں ۔

اداکار بن کر اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں ۔ ہم ان کو آزاد کرنے سے قاصر ہیں کہ اس شہر کی خوبصورت جیل میں قید ہونے کے بعد ان کی جان مر کر چھوٹے گی ۔ ہم ان کی خوراک کا خیال رکھیں، تازہ خوراک دیں ۔ ہم ہاتھی کو محض مور یا ہرن جتنا ناشتہ دے کر تو ٹرخانے سے رہے کہ مزدور کو بہر حال پوری مزدوری تو ملنی چاہیے ۔ ان کو جنگل والا ماحول دیں بچوں کو سمجھائیں کہ وہ ان کو ڈسٹرب نہ کریں ۔ ان سے پیار کریں ۔ صفائی ستھرائی کا خوب خیال رکھیں اور ساڑھے چار سو کنال پر مشتمل یہ چڑیا گھر آہستہ آہستہ شہر سے باہر کم از کم چار ہزار کنال جگہ پر منتقل کریں کہ ایک نیچرل ماحول ان جانوروں پرندوں کو ملے اور وہ خوش خوش زندگی گزاریں اور انہیں یوں نہ لگے کہ وہ انسانی تفریح کے لیے بڑی سی جیل میں بند ہیں ۔

جانور خوش دلی سے انسانوں کو خوش کریں کہ جدید دنیا کا یہی تقاضا ہے ۔ احمد کی باتوں کا انتظامیہ پر بہت اثر ہوا انہوں نے احمد کو بتایا کہ شہر کے کھاتے پیتے لوگوں نے جانوروں سے محبت کا دم بھرتے ہوئے انہیں گود لے رکھا ہے ۔ اور وہ ان کی نہ صرف دیکھ بھال کرتے ہیں بلکہ مالی طور پر بھی انتظامیہ سے تعاون کرتے ہیں ۔ احمد نے بھی ایک ‘‘طوطے’’ سے محبت کا اظہار کیا ۔ اور اس کا خرچا اپنی پاکٹ منی سے برداشت کرنے کا عہد کیا ۔ میں نے چڑیا گھر سے نکلتے ہوئے پنجروں پر نظر ڈالی تو یوں لگا جیسے جانور احمد کا شکریہ ادا کر رہے ہوں کہ اس نے چڑیا گھر کے مزدوروں کے حقوق کی بات کی ۔؟!

☆☆☆☆

حماد الرحمٰن گورایہ

میں لوٹ کے آؤں گا

میں نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میرا دل شدت سے چاہا کہ ماں کو آواز دوں، ان سے ڈھیروں باتیں کروں مگر میری ہمت جواب دے گئی کیونکہ اگر ایسا کرتا تو وہ یقیناً یہی کہتیں

”بیٹا! یہ کہاں کی تہذیب ہے کہ آدھی رات کو جگا کر کہا جائے کہ میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“
اور وہ بھی جہاز میں۔۔۔۔

یہی بات میں کچھ عرصہ پہلے کہتا تو ماں کو خوشی ہوتی لیکن دولت کی چمک نے ماں کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ اب سٹیٹس، آداب، تکلفات، محبتوں اور شفقتوں پر غالب آ چکے تھے۔ دنوں میں یہ انقلاب دراصل خدا کی طرف سے ہمارے لیے آزمائش تھی۔ ماں سے باتیں تو ممکن نہ تھیں لیکن ماضی کی خوشگوار یادوں کا تصور تو میرے اختیار میں تھا۔ سو میں آنکھیں بند کر کے ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔

ابو جی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود معمولی عہدے پر فائز تھے۔ کرائے کے ایک مکان میں روٹی کپڑے کے علاوہ دوسری ضروریات زندگی کا تصور بھی محال تھا۔ مگر۔۔۔ ماں ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتی۔ صبح سویرے جب بھی میری آنکھ کھلتی وہ کئی سو دانوں کی تسبیح ہاتھ میں پکڑے آنکھیں بند کیے بڑی عقیدت سے پڑھ رہی ہوتیں۔ میں وضو کر کے چپکے سے ان کے پاس بیٹھ جاتا کہ وہ پریشان نہ ہوں مگر انہیں تو شاید میری خوشبو آتی تھی تو وہ مسکرا کر میری طرف دیکھتیں، ماتھے پر بوسہ دیتیں اور خود عبادت میں مشغول ہو جاتیں۔

شب برات اور معراج شریف کو بڑی عقیدت سے جاگ کر اپنے رب کی عبادت کرتیں۔ کسی بھی حوالے سے اہمیت کے حامل دن کا آغاز ہمارے گھر میں تلاوت قرآن پاک سے ہوتا۔ ایک دفعہ یوم آزادی کو تو میں نے انہیں روتے دیکھا۔ وہ کہتیں کہ ”آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔“ وہ کہا کرتیں:

”فخر اس چیز پر کرو جو تمہاری پہنچ میں ہو یا جو حاصل کی ہو اور محنت اتنی کرو کہ کامیابی تمہارا مقدر بن جائے۔“

اس کی پیدا کی گئی انہیں صفات کا نتیجہ یہ تھا کہ میں تعلیمی میدان میں ہمیشہ ریکارڈ بناتا اور توڑتا رہا۔

یوں تو خدا اپنے بندوں کو تنگدستی اور مشکلات کے ذریعے آزماتا ہے مگر اللہ میاں نے ہمیں ''خوشحالی اور مسرتیں'' دے کر آزمائش کے لیے منتخب کیا۔ ملک میں قرعہ اندازی کی ایک بہت بڑی مہم جاری تھی۔ نہ جانے کیسے امی ابو کے دل میں ٹکٹ خریدنے کا خیال پیدا ہوا اور ہماری ٹکٹوں پر پہلے تین انعامات ''ناقابلِ فراموش'' واقعہ بن گئے۔ دولت کا ایک سیلاب ہمارے گھر میں اُمڈ آیا جس نے آتے ہی حب الوطنی اور رشتوں کی محبت کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔

اب تو ہر دن عید اور ہر رات شب برات کا منظر پیش کر رہی ہوتی اور قیمتی قیمتی لباس، جواہرات اور بزنس کی باتیں ہوتیں۔ ہمارے گھر میں وہ عبادت کرنے والی راتیں ماضی کی دھند میں چھپ گئی تھیں۔ ماں کے چہرے کو نور کی دنیا کی چکا چوند کر دینے والی روشنی مات دے گئی تھی۔ جب ہی تو انہیں میری خوشبو بھی نہیں آتی تھی۔۔۔

پاکستان کی سالگرہ کا دن قریب آ رہا تھا۔ ہم سب دوستوں نے یوم آزادی کو شایان شان انداز میں منانے کا پروگرام بنایا۔ ماں جی سے ذکر کیا تو ان کا جواب سن کر میرے اندر کا سانس اندر باہر کا باہر رہ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پاکستان سے بے پناہ محبت کرنے والی ماں پاکستان کو چھوڑ بھی سکتی ہے؟ ماں نے کہا تھا کہ ''بس اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔''

''مگر ماں! وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ پاکستان۔۔۔ پاکستان کی سالگرہ۔۔۔؟''

میرے منہ سے بات صحیح طرح سے نکل ہی نہ پائی تھی کہ ماں بولی۔

''سالگرہ۔۔۔ اور وہ بھی پاکستان کی۔۔۔؟ ہم نے ہر سال اس کی سالگرہ منانے کا ٹھیکا اٹھا رکھا ہے کیا؟

میں ہکا بکا ماں کی صورت دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی طور پر اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے تیار نہ تھیں۔

''ماں پلیز!!! آپ پاکستان کی سالگرہ تک ہی رک جائیں۔''

میں نے ماں سے التجا کی۔

''بھئی ٹکٹیں ہو چکی ہیں۔ اب جلد از جلد امریکہ پہنچنا ہے ہمیں، سنا تم نے۔۔۔ اس تیسری دنیا کے ایک چھوٹے سے ملک میں رہنے کا کسے شوق ہے۔ یہاں ہے کیا؟''

ماں کہہ رہی تھی اور میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ اب مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

ماں کے سر پر تو دولت کا بھوت سوار ہو چکا تھا اور میں چھوٹا ہونے کے ناطے کر بھی کیا سکتا تھا سوائے

کے۔ اگلے ہی روز ہم جہاز پر سوار تھے۔ جہاز نے ٹیک آف کیا تو ماں جی نے منہ ہی منہ میں کہا

”اب ہمیں ہماری منزل مل جائے گی۔“

”منزل۔۔۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔۔ ”کیسی منزل۔۔۔؟“ ”منزل تو ہم پیچھے چھوڑے جارہے ہیں۔ پھر یہ کیسی منزل پا رہی ہیں؟ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں نے ایک اجنبی سی نگاہ ڈالی مگر وہ گردوپیش سے بے خبر یقیناً امریکہ کے گلیمر اور رنگینیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ میں نے تڑپتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا اور پھر میری نظریں ”دھرتی ماں“ کی جانب چلی گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے دھرتی چیخ چیخ کر کہہ رہی ہو۔ ”کہاں جارہے ہو بیٹا!!! اپنی ماں کو چھوڑ کر! کیا یہی محبتوں کا صلہ ہے کہ جب ماں کے لیے کچھ کرنے کا وقت آئے تو اس سے تمام ناطے ختم کر لیے جائیں۔“

مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ آج میں ایک ماں کے حکم کے ہاتھوں مجبور ہو کر دھرتی ماں کی تمام تر وفاؤں، شفقتوں اور محبتوں کو چھوڑ کر دور جا رہا تھا۔ شدت غم سے میرے منہ سے ایک آہ سے نکلی اور پھر مجھے اپنی آنکھوں پر اختیار نہ رہا۔

☆☆☆☆

خواجہ مظہر صدیقی

زندگی کی لہر

پورے قصبے میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ مایوسی اور نا امیدی کے بادل چھٹتے نظر آ رہے تھے۔ ویران اور بے رونق چہروں پر ہلکی سی مسکان پیدا ہو رہی تھی حالاں کہ ابھی خوشی کا سامان مہیا نہیں ہوا تھا۔ مگر امید کے چراغوں کو صبح روشنی ملنا تھی۔ حکومت کی طرف سے خشک سالی اور قحط سے متاثرہ افراد کی بحالی کے لیے بہت بڑی امداد آئی تھی۔ ڈھولچی پیر بخش ڈھول پیٹ پیٹ کر منادی کر رہا تھا۔ حکومت سرکار کی طرف سے خوراک، سامان ضروریات زندگی، مال مویشیوں کے لیے چارہ اور نقد روپے سردار سائیں کے ڈیرے پر پہنچ گئے ہیں۔ صبح سویرے ہر گھر سے ایک فرد ڈیرے پر پہنچ جائے سب کو اپنا اپنا حصہ ملے گا۔ ڈھولچی مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے منادی کرتا جا رہا تھا۔

بلوچستان کے ضلع مستونگ کے اس چھوٹے سے قصبے میں سات سو سے زائد چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ ان سب گھروں میں نمایاں ایک حویلی سردار ولایت خان کی تھی۔ جس میں نوکر چاکر رہتے تھے، سردار سائیں کا بنگلہ کوئٹہ شہر میں تھا اور بچے بیرون ملک پڑھ رہے تھے۔ زیادہ تر سردار سائیں شہر میں رہتے، سال میں ایک دو بار پکنک منانے مختلف وڈیروں اور جاگیروں کے ساتھ مستونگ کے اس قصبہ میں اپنی قلعہ نما حویلی میں آ کر ٹھہرتے۔ بسا اوقات الیکشن کے دنوں میں مسلسل قصبے میں قیام رہتا، کیونکہ یہ قصبہ سردار ولایت خان کے حلقہ انتخاب میں تھا۔ پورے قصبہ میں سردار سائیں کی حویلی میں بجلی کا کنکشن تھا، بجلی کے بیش قیمت بلب جلتے دیکھ کر یہی معلوم ہوتا تھا کہ سردار سائیں حویلی میں آئے ہوئے ہیں اس وقت بجلی کے قمقموں کے روشن ہونے سے حویلی رات میں دن کا منظر پیش کر رہی تھی۔ حویلی میں خوب ہلچل تھی۔ صبح کے انتظامات میں تمام نوکر چاکر مصروف تھے۔

پانی، خوراک اور صحت کی سہولتوں کی قلت نے ضلع کے دوسرے قصبوں کی طرح اس قصبے میں بھی بہت سے معصوم بچوں کو لقمہ اجل بنا دیا تھا اور کئی کمزور بوڑھے چند دنوں میں دنیا سے دور چلے گئے تھے۔ غرض خشک سالی اور قحط نے کئی گھروں کے چراغ گل کر دیئے تھے۔ جو بچ گئے تھے وہ موت کے منتظر تھے جو کسی بھی لمحے

انہیں آ گھیرتی۔ مستونگ کے لوگوں کا پیشہ مویشی چرانا تھا۔ وہ سال میں ایک دوبار ضرورت پڑنے پر شہر میں جا کر مویشی فروخت کر آتے اور انہی روپوں سے ضروریات زندگی کی اشیا خرید لیتے۔ بعض اوقات شہر سے منڈی کے بڑے بیوپاری آتے اور اچھی قیمت میں بھیڑ، بکریاں خرید لے جاتے۔ غلہ بانی کے لیے زمین ناہموار تھی صرف مویشیوں کے لیے چارے اور ضرورت کی سبزی ترکاری لگائی جاتی۔ اسی سے زندگی کی گاڑی چلتی رہتی۔

اللہ داد اپنے بستر پر پڑا کراہ رہا تھا وہ گہری ٹھنڈی سانسیں لے رہا تھا اور وقفے وقفے سے اللہ خیر کردے اللہ خیر کردے...... کا ورد نحیف آواز میں حلق سے نکالتا۔ اللہ داد کے ہونٹ خشک تھے اس نے ہلکی سی جنبش سے خود کو اٹھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے فریادی نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا ''مولا بس کردے ہم بہت گناہ گار ہیں مگر تو رحمان و رحیم ہے۔ ہم غلطیاں کرتے ہیں اور تو پردہ پوشی کرتا ہے اور درگزر فرماتا ہے۔ اے آسمانوں اور زمینوں کے خالق و مالک ہم پر رحم فرما، ہماری توبہ کو قبول کر اور بارش برسا تاکہ اس بنجر اور خشک زمین کو زندگی ملے۔ اے فریادوں اور دعاؤں کے سننے والے سمیع و بصیر ہم پر رحم فرما، بیماریوں تکلیفوں اور مصیبتوں کو ہم سے دور فرما۔''

''آمین......'' اختر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے باادب انداز میں منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ کہاں گئے تھے بیٹا، ابا نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنی آنکھوں کے تارے اختر سے پوچھا، ابا تیرے لیے ہم سب کے لیے بلکہ پورے قصبے کے لوگوں کے لیے خوشخبری ہے۔ حکومت سرکار کی طرف سے خوراک اور طبی امداد کا ایک بہت بڑا حصہ سردار ولایت خان کی طرف بھیجا گیا ہے۔ صبح سویرے سردار سائیں قصبے کے لوگوں میں سارا سامان تقسیم کریں گے۔ پھر ہماری تنگ دستی کے دن ڈھل جائیں گے، بھوک ختم ہو جائے گی اور خوش حالی ہمارا مقدر بنے گی، باقی زندگی اچھی گزر جائے گا۔ ڈھولچی پیر بخش کہہ رہا تھا کہ یہ امداد کی پہلی قسط آئی ہے دوسری کھیپ بھی جلد پہنچ جائے گی۔ ابا اب تو خوش ہو جاؤ۔ بارہ سالہ اختر باپ کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ وہ ابا کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پھر سے مخاطب ہوا۔ ابا تیرے پھیپھڑوں کی تکلیف ختم ہو جائے گی۔ تیری سانس بھی نہیں پھولے گی اور گھنٹوں کھانستے رہنا بھی بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ کیونکہ قصبے میں ڈاکٹروں کی ٹیم بھی آ چکی ہے۔ اختر کی خوشی دیدنی تھی اس کو یقین تھا کہ ابا ہشاش بشاش اور تندرست و توانا ہو جائے گا۔ اس کی آنکھوں میں یقین کی چمک تھی جو لوگ یقین کی دولت سے مالا مال ہوں وہ کہیں بھی شرمندہ و شرمسار نہیں

ہوتے ہمیشہ ہر جگہ اور ہر میدان میں سرخرو نظر آتے ہیں۔ اختر خیال ہی خیال میں ابا کو بستر سے اٹھتا ہوا اور کھلے میدانوں میں بکریاں چراتے چاق و چوبند دیکھ رہا تھا ابا کو کھانسی اور پھیپھڑوں کی تکلیف بھی نظر نہ آتی تھی۔

”بکتا ہے تیرا پیر بخش ڈھولچی ....“ ابا نے جرأت کر کے ٹوٹے لفظوں سے ادھورا جملہ کہا۔ وہ غصہ نہیں کر سکتا تھا۔ ذرا سے غصہ سے اسے کھانسی کا نہ ختم ہونے والا دورہ پڑ جاتا اور دوائی بھی پورے ایک ماہ سے ختم ہو چکی تھی۔ شہر بھی کوئی نہیں جا رہا تھا۔ حالات ہی سازگار نہ تھے ورنہ دوائی منگوائی جاتی۔ دوائی آتی بھی کیسے؟ کچھ بھی تو نہیں تھا ان کے پاس روٹی کے سوکھے ٹکڑوں کو پانی میں بھگو کر کھانا چاہتے مگر پانی بھی دستیاب نہ ہوتا گھر سے باہر جوہڑ میں پانی کا تھوڑا سا ذخیرہ تھا‘ سخت دھوپ اور گرمی کی وجہ سے زمین ڈکار چکی تھی۔ آخری بار جب انھوں نے پانی پیا تھا تو آنکھوں میں ڈالنے والی دوائی کے قطروں کی مقدار میں‘ ان کے سارے مویشی دیکھتے ہی دیکھتے ان کے سامنے ڈھیر ہو گئے تھے۔ قدرت نے باپ بیٹے کو بھوکا‘ پیاسا معجزہ کے طور پر زندہ رکھا ہوا تھا۔

اللہ داد کچھ دیر توقف کے بعد گویا ہوا کچھ نہیں دے گا سردار سائیں ہمیں‘ وہ کئی بار ہمیں حق بات کرنے‘ سچے اور ایمان دار لوگوں کا ساتھ دینے کی سزا دے چکا ہے۔“

میں سمجھا نہیں ابا‘ اختر متجسس نگاہوں سے ابا کی خالی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ابا خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہنے لگا‘ یہ ان دنوں کی بات ہے جب تم پانچ سال کے تھے۔ اسی طرح خشک سالی اور قحط پڑا تھا۔ تیری ماں سخت بیمار پڑ گئی۔ حکومت سرکار نے اس وقت بھی امداد اور ڈاکٹروں کی ٹیمیں بھیجی تھیں۔ پورے قصبے میں یہ امداد تقسیم کی گئی مگر تین گھروں کو محروم رکھا گیا۔ تیری نیک بخت ماں سخت تکلیف میں درندہ صفت سردار ولایت خان کی خودغرضی اور ستم ظریفیوں پر صبر کرتے ہوئے ہمیں اکیلا چھوڑ گئی‘ اختر کی آنکھوں میں آنسو منڈلانے لگے‘ آنسو پونچھتے ہوئے اس نے پھر سوال کیا۔ ابا سردار سائیں نے ایسا کیوں کیا؟ الیکشن کے دنوں میں ہم نے سردار سائیں کی حمایت نہیں کی تھی۔ اس لیے کہ سردار مکروہ دھندوں میں ملوث تھا۔ وہ قصبے کے معصوم بچوں کو اپنے کارندوں کے ذریعے اغوا کروا کے بیرون ملک سمگل کرتا تھا۔ اس کی بجائے ہم نے ایک نیک سیرت اور اچھے کردار کے حامل انسان کی انتخابی مہم میں حصہ لیا۔ ہمارے امیدوار کو بڑی شکست ہوئی۔ سات سال پہلے کی خشک سالی میں ہمیں ایک جانی نقصان ہوا تھا اور تیری ماں ...... ابا کی آواز شدت جذبات سے بھرا گئی‘ وہ کچھ دیر توقف کے بعد دھیمے دھیمے بولنے لگا اب کی خشک سالی میں ایک اور جان سے

ہاتھ دھونا پڑیں گے' بس ابا مت کہو ایسا' میرا سوہنا اللہ' مجھے باپ کے سائے سے محروم نہیں کرے گا' ابا تم خواہ مخواہ دل گرفتہ ہو رہے ہو۔ مایوسی سخت گناہ بلکہ کفر ہے! ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تو پتھر میں پڑے کیڑے کو رزق عطا کرتا ہے۔ سمندر کی گہرائیوں میں ننھی ننھی مچھلیوں کو پیدا کرتا ہے اور ان کی پرورش کرتا ہے اختر سیانی باتیں کر رہا تھا۔ ابا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بارش تھی۔

مولوی صاحب قصبے کی جامع مسجد میں بچوں قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ حکمت و دانائی کی باتیں بھی سکھاتے تھے۔ وہ اختر کی تربیت خاصی محبت کے ساتھ کر رہے تھے۔ اختر ایک سعادت مند بچہ تھا۔ اس کی سوچ عام بچوں سے مختلف تھی۔ وہ زمین پر رہتے ہوئے سورج' چاند اور ستاروں کی باتیں کرتا' نیک خیالات رکھتا' خیر خواہی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ مولوی صاحب اکثر کہتے کہ میری گناہیں دیکھ رہی ہیں کہ اختر بہت بڑا آدمی بنے گا۔ جو لوگوں کے لیے خیر کا سرچشمہ ہوگا۔ اختر طلوع فجر کے وقت مسجد میں پہنچ چکا تھا۔ مولوی صاحب کی صحت بھی دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ آج بھی بڑی مشکل سے انھوں نے نماز پڑھائی اور حجرہ میں چلے گئے' اختر نے سہارا دیا اور پاؤں دبانے لگا' اس کا دھیان اپنے ابا کی طرف تھا۔ ادھر مولوی صاحب کی حات بھی خطرے سے باہر نہ تھی ان کی زبان پر کلمہ طیبہ کا ورد تھا۔ سردار ولایت خان کے نوکر حجرے میں آئے۔ سلام کیا اور آٹا' پانی کا گیلن' ضروریات زندگی کا تھوڑا سا سامان نقد ایک ہزار روپے دے کر چل دیئے وہ مولوی صاحب کی تشویشناک حالت دیکھ کر جاتے ہوئے کہہ گئے کہ شہر سے ڈاکٹر آئے ہوئے ہیں وہ ابھی ڈاکٹروں کو بھیج دیں گے۔ مولوی صاحب نے امدادی سامان اور روپے اختر کے حوالے کئے اور اسے رضامند کیا کہ وہ سب چیزیں گھر لے جائے گا' تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹروں کی ٹیم مولوی صاحب کی زندگی بچانے آ گئی۔ آخری سانسوں میں انھوں نے ڈاکٹروں سے وعدہ لیا کہ وہ اختر کے ساتھ اس کے ابا کو دیکھنے جائیں گے۔ ڈاکٹروں نے اپنا وعدہ پورا کیا' پوری محنت اور لگن سے اللہ داد کو علاج کی سہولتیں فراہم کیں۔ اختر کو مولوی صاحب کے دنیا چھوڑ جانے کا غم تو تھا ہی مگر ابا کو زندگی مل جانے کی خوشی بھی تھی۔ پورے قصبے میں واقعی زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی اور اختر کے معصوم چہرے پر خوشی کے نمایاں اثرات دیکھے جا سکتے تھے۔

☆☆☆☆

ذیشان بن صفدر

بچانے والا ہاتھ

ویسٹ مورلینڈ کے علاقے میں کیلپس نامی ایک سرائے نیلی پہاڑیوں کے دامن میں قائم ہے۔ اگر موسم خراب ہو تو یا کسی اور وجہ سے کوہ پیما اگر آگے بڑھنے میں ناکام رہیں تو وہ اسی سرائے میں قیام کرتے ہیں اور راستے کی مشکلات دور ہو جانے موسم خوشگوار ہونے کے بعد یہاں سے آگے بڑھتے ہیں، آج سے دس، پندرہ سال پہلے کی بات ہے، دو بھائی جان بوسن اور جیمس بوسن رات کے وقت اس سرائے میں پہنچے۔ برف باری کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس لیے بہت ہی کم لوگ کوہ پیمائی کے لیے ان دنوں وہاں پہنچ سکے تھے۔ یہ دونوں بھائی کوئی تجربے کار اور ماہر کوہ پیما تو تھے نہیں۔ بس کوہ پیمائی کا شوق نیا، نیا ہوا تھا انہیں سرائے کے مالک کو جب ان کے اس نئے نئے شوق کا علم ہوا تو اس نے اپنے طور پر انہیں پہاڑی پر چڑھنے اور آگے بڑھنے سے روک لینے کے لیے کافی دیر تک سمجھایا اور کہا۔

”ابھی ٹھہر جاؤ...... موسم کی شدت ذرا کم ہو جائے تب تم دونوں اپنا شوق پورا کر لینا۔“ اس وقت راستے کی مشکلات بھی کافی حد تک کم ہو جائیں گی۔“ مگر وہ دونوں بھائی اپنے پروگرام میں کوئی تبدیلی لانے پر آمادہ نہیں ہوئے وہ دونوں ہر حال میں کوہ پیمائی کرنا چاہتے تھے۔ وہ رکنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

سرائے پہنچنے کے دوسرے ہی دن انھوں نے اپنی کوہ پیمائی کے لیے تیاری کر لی۔ اتفاق دیکھئے اس دن امید کے برخلاف موسم بھی صاف ہو گیا تھا۔ ہوا بند تھی اور آسمان پر دور دور تک بادلوں کا نام ونشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ انھوں نے چھڑی کی مدد سے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور ہنستے مسکراتے خوشگوار موڈ کے ساتھ نیلی چوٹی کی طرف بڑھنے لگے۔

کوہ پیماؤں کے مخصوص لباس کے بجائے انھوں نے استری کئے ہوئے کپڑے اور چمک دار نوکیلے جوتے پہنے ہوئے تھے جنہیں دیکھ کر سرائے میں موجود تجربے کار کوہ پیما زیر لب مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ ان میں سے کسی نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ ناتجربے کار شوقیہ نوجوان کوہ پیما نوکیلی چوٹی کے پار گیند نما چٹان تک پہنچنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس چٹان تک پہنچنے میں بہت سے ماہر اور تجربے کار کوہ پیما تک ناکامی کا صدمہ جھیل چکے تھے۔

اس کے علاوہ برف باری کے موسم میں چوٹی کو سر کرنے کی کوشش کرنا اپنی موت کو دعوت دینے کی سی بات تھی۔

پہاڑ تک سارا راستہ ہنستے کھیلتے منٹوں میں طے ہوگیا۔ چڑھائی میں انہیں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ نہ ہی کسی مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ دونوں نے محسوس کیا جیسے کوہ پیمائی کوئی جان لیوا مشکل کام نہیں بچوں کا سا کھیل ہی تو ہے ....لیکن جلد ہی چڑھائی کی مشکلات اور مسائل نے انہیں گھیر لیا اب ہر قدم انہیں بہت احتیاط اور پھونک پھونک کر آگے اٹھانا پڑ رہا تھا۔ کہیں سیدھی چٹان یا برف میں ڈھکی ہوئی چوٹی آ جاتی تو اسے پار کرنے میں کافی وقت لگ جاتا۔ برفیلی سطح پر پیر پھسل پھسل جاتے تھے۔ دو میل کا راستہ طے کرنے میں انہیں چار گھنٹے لگ گئے تھے۔ پیروں میں درد ہونے لگا تھا۔ مسلسل جھکے رہ کر آگے بڑھنے کی وجہ سے ان کی کمر لکڑی کا تختہ بن گئی تھی سیدھا کھڑا ہونے کی کوشش میں ناقابل برداشت قسم کی تکلیف محسوس ہوتی اور ہونٹوں سے دبی دبی سسکیاں بھی نکل جاتیں۔ چوتھے میل پر چھوٹا بھائی بار بار تھکن اور سر چکرانے کی شکایت کا اظہار کرنے لگا تھا۔ راستہ بہت ہی تنگ اور دشوار ہوگیا تھا۔ اس لیے وہ باری باری سوٹ کیس اٹھاتے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔

کسی نہ کسی طرح آخر وہ نیلی چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ چھ میل کا سفر انھوں نے چھ گھنٹوں میں طے کیا تھا۔ کافی دیر تک ستانے کے بعد ان کی جان میں جان آئی تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ گیند نما چٹان پر پہنچنے کے بجائے واپس چلا جائے۔ ڈیڑھ، دو گھنٹے نیچے اترنے کے بعد انہیں ایک چھوٹا سا کمرہ نظر آیا، جسے پتھروں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ جہاں برف پر پھسلنے کا شوق پورا کرنے کے بعد لوگ اپنی گاڑیاں اور دوسرا سامان رکھتے تھے دونوں بھائیوں کا خیال تھا کہ وہ رات یہیں اس مقام پر گزارنے کے بعد اگلی صبح سرائے پہنچیں گے۔ واپسی کا سفر شروع ہوا تو جیمس بوسن نے بڑے بھائی سے کہا۔ پہاڑی پگڈنڈی کے بجائے ہم ناک کی سیدھ میں سرائے کی طرف چلیں اس طرف وقت بچے گا اور راستے کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں پار کرنے میں مزا بھی آئے گا۔

چھوٹے بھائی کا دل رکھنے کے لیے بڑا بھائی خاموش رہا اسے رہ رہ کر محسوس ہو رہا تھا کہ پگڈنڈی کا راستہ چھوڑنا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا نوکیلے پتھروں اور چٹانوں کے گہرے کھڈوں اور تنگ وادیوں کو پار کرنے میں انہیں صحیح سمت کا بھی خیال نہ رہا اور وہ کولہو کا بیل بن کر رہ گئے ایک ہی پہاڑی کے گرد چکر کاٹتے رہے۔

بہت مشکل سے انہیں صحیح راستہ ملا۔ موسم کے تیور بھی بدل گئے تھے بادلوں نے آسمان کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ ہوا میں بھی کافی تیزی آ گئی تھی۔ آثار بتا رہے تھے کہ بارش ہونے والی ہے۔ دونوں بارش سے پہلے گاڑیوں کے کمرے تک پہنچ جانا چاہتے تھے۔ اس لیے گھاس اور ابھرے ہوئے پتھروں کا سہارا لیتے ہوئے تیزی سے لڑھکنے اور پھسلنے لگے۔ ابھی چند سو گز کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ جیمس کا پیر پھسل گیا بہت کوشش کے باوجود بھی وہ سنبھل نہ سکا اور کافی دور تک نیچے لڑھکتا چلا گیا۔

جان اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے شور سنا تو بھائی کی طرف لپکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جیمس ابھری ہوئی چٹان کے آخری سرے سے نکل کر گہرے کھڈ میں جا گرا۔ جان تیزی سے وہاں پہنچا۔ جھانک کر دیکھا تو ساٹھ فٹ کی گہرائی میں ایک تنگ سی پٹی پر اسے اپنا بھائی نظر آیا۔ جس چٹان پر جیمس گرا تھا وہ صرف دو فٹ چوڑی اور پندرہ فٹ لمبی تھی۔ اس کے نیچے گہری کھائی تھی۔

بھائی تک پہنچنے کا جب کوئی راستہ اسے نظر نہیں آیا تو جان موت کے خطرے سے بے خبر ہو کر کنارے کی طرف سرک گیا اور ساٹھ فٹ نیچے چھلانگ لگا دی۔ کچھ دیر بعد ہوش ٹھکانے لگے تو اپنے آپ کو اس نے جیمس کے قریب پایا۔ اس کی دو پسلیاں ٹوٹ چکی تھیں ناک کی ہڈی کا بھرتہ بن گیا تھا۔ پیشانی کی جلد پھٹ گئی تھی اور چہرے کی بوٹیاں اڑ چکی تھیں۔ وہ خود حیران تھا کہ اتنی شدید اور گہری چوٹوں کے باوجود وہ زندہ تھا اور سانسیں لے رہا تھا۔

جیمس نیم مردہ سا ہو گیا تھا۔ اس میں اتنی قوت نہیں تھی کہ اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو حرکت دے سکتا۔ جان نے اپنا کوٹ اتار کر اسے اڑھا دیا اور اس کے قریب بیٹھ کر اس سے بات کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بھائی کی اس حالت پر اس کا گلا رندھ گیا تھا اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ جلد ہی رات کے اندھیرے نے ماحول کو اپنی سیاہ چادر میں لپیٹ لیا۔ سردی بھی بڑھ گئی جس کی وجہ سے اس کے دانت بجنے لگے تھے۔ لیکن اب بھوک کا احساس مٹ چکا تھا۔ سینڈوچ کے کچھ بچے ہوئے ٹکڑے اس کے پاس تھے۔ اس نے دو ٹکڑے الگ رکھ دیئے تاکہ ہوش میں آ جانے کے بعد جیمس کو کھلا سکے۔

اچانک اسے محسوس ہوا کہ جیمس کچھ کہہ رہا ہے۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ غور کرنے پر اس نے سنا کہ وہ نہایت کمزور سی آواز میں پینے کے لیے پانی مانگ رہا تھا۔

جان تڑپ اٹھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں پانی نظر نہیں آیا۔ پھر اسے خیال آیا جس جگہ جیمس کا پیر پھسلا تھا

وہیں قریب میں ایک چھوٹا سا پانی کا چشمہ تھا۔ اس کے پاس کوئی برتن تو تھا نہیں۔ اس نے جیمس کا چوڑے کناروں والا ہیٹ اٹھایا اور چٹان پر چڑھنا شروع کردیا۔

یہ چڑھائی بہت ہی مشکل اور پیچیدہ چڑھائی تھی۔ عام حالت میں تو وہ اوپر چڑھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ مگر یہاں اس کا اپنا بھائی تھا جس کی جان بچانی ضروری تھی۔ وہ جیسے تیسے مشکل اور مسائل کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پانی کے چشمے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ تاروں کی مدھم ٹمٹماتی روشنی میں اس نے خطروں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہیٹ میں پانی بھرا اور پھر بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتا واپس اپنے بھائی کی طرف بڑھنے لگا جو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا پانی کا انتظار کررہا تھا۔

کبھی تیز نوکیلے پتھر ہاتھ میں چبھ جاتے کبھی آگے کی طرف نکلا ہوا کوئی پتھر بے خیالی میں اس سے ٹکرا جاتا کئی بار وہ گرنے سے بال بال بچا۔ مگر جیسے ہی اسے جیمس کا خیال آتا۔ اپنی مشکلیں بھول جاتا۔

بہت ہی مشکل سے جان توڑ کوششوں کے بعد وہ اوپر پہنچ گیا۔ چشمے سے ہیٹ میں پانی بھرلیا واپس جانے کے لیے پلٹا۔ واپسی پر اسے انہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جو پہلے جھیل چکا تھا۔ مگر اس وقت تو اس کے لیے جیمس کی جان بچانے کا سوال تھا۔ اپنی مشکلات اور اپنی دشواریوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے مردانہ وار انہیں جھیلا اور واپسی کے لیے چل پڑا.......... ہیٹ کو دانتوں سے پکڑنے کی کوشش کی تو پانی ہیٹ سے نیچے گرنے لگتا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ اس نے ہیٹ ایک طرف رکھ کر اپنی ٹائی گلے سے اتاری ہیٹ کے کناروں پر سوراخ کئے اور ٹائی کے سرے ان سوراخوں سے باندھ کر ہیٹ کو گلے میں لٹکا لیا اور پھر آگے بڑھنے لگا۔ آخر وہ پانی لے کر بھائی تک واپس پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ پہلے پانی کے قطرے اس کے حلق میں ٹپکائے۔ پھر کچھ قطرے چہرے پر ڈالے اور خون کے دھبے صاف کردیئے۔

رات دبے پاؤں آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ جان اپنے بھائی کی جان بچانے کے لیے جو کچھ بھی کرسکتا تھا کرگزرنا چاہتا تھا۔ قریبی آبادی تک پہنچنے میں اسے دس گھنٹے لگتے اور بھائی کی حالت یہ تھی کہ نہ جانے کب اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے ہی رہ جائے۔ اس نے اللہ کے حضور اپنے بھائی کی زندگی کے لیے دعا بھی مانگی۔

صبح صبح جیمس کے ہونٹ پھر ہلے۔ اس نے کچھ کہا۔ جان نے سننے کی پوری کوشش کی مگر سن نہ سکا۔ ہوا بھی اب تیز ہوگئی تھی۔ وہ جیمس کو جیسے تیسے گھسیٹ کر چٹان کی دیوار کے قریب لے آیا تاکہ ہوا کے تیز

ٹھنڈے برفیلے جھونکوں سے اسے محفوظ رکھ سکے۔

رات کے آخری پہر کی سخت سردی سے اس کا خون جمنے لگا تھا۔ بھوک، پیاس، زخموں کی جلن اور ٹوٹی ہوئی پسلیوں کی تکلیف الگ پریشان کر رہی تھی۔ جیمس نے اپنی بہت ہی کمزور سی آواز میں پھر پانی مانگا تو جان نے ہیٹ میں بچا ہوا پانی چلو میں لے کر اس کے حلق میں ٹپکا دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ بھائی کی حالت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ساتھ بگڑتی ہی جا رہی ہے۔ اس کے پاس دعا کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں رہا تھا۔ بھائی کی جان بچانے کے لیے وہ اپنی سی ہر ممکن کوشش کر چکا تھا۔ اچانک اسی لمحے جان نے فضا میں ایک گڑگڑاہٹ کی سی آواز سنی۔ گردن اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تو ایک ہیلی کاپٹر اندھیرے میں اڑتا نظر آیا.........اس نے فوراً جیمس کو اٹھایا اپنا کوٹ اس پر سے اتارا اور ہاتھ میں لے کر فضا میں تیزی سے لہرانے لگا اور ساتھ ہی یہ دعا بھی مانگ رہا تھا کہ ہیلی کاپٹر میں بیٹھے لوگ اس کا کوٹ ہلتا دیکھ لیں۔ وہ اس کا مطلب سمجھ لیں اور ہیلی کاپٹر کو نیچے لے آئیں تاکہ اس کے بھائی کی زندگی بچ جائے۔ وہ موت کے منہ میں جانے سے محفوظ رہے اور پھر ایسا ہی ہوا ہیلی کاپٹر والوں نے اسے کوٹ فضا میں لہراتے دیکھ لیا۔ اس کا مقصد بھی وہ سمجھ گئے۔ ہیلی کاپٹر نے فضا ہی میں ایک چکر گولائی میں لگایا اور پھر اسے نیچے اتار لائے۔

اللہ نے جان کی دعا قبول کر لی تھی۔ جیمس کو فوراً طبی امداد کے لیے قریبی اسپتال پہنچا دیا گیا۔ دراصل یہ ہیلی کاپٹر اس علاقے میں گشت کے لیے مخصوص تھا تاکہ مصیبت اور مسائل میں پھنس جانے والے کوہ پیماؤں کی مدد کر کے انہیں مشکلات سے نکالا جا سکے اور خطرے میں گھر جانے والوں کو خطرے سے نکال کر ان کی جانیں بچائی جا سکیں۔ یہ ہیلی کاپٹر اپنی معمول کی گشتی پرواز پر تھا۔

ہیلی کاپٹر کے کارکنوں نے دونوں بھائیوں کو ہیلی کاپٹر کی مدد فراہم کی۔ ایک طویل عرصے علاج اور دیکھ بھال کے بعد جیمس کی زندگی بچالی گئی۔ اب وہ صحت یاب ہو کر نئی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ اپنے دوستوں میں ہوتا تو اکثر یہی کہتا.........میری زندگی تو ختم ہی ہو گئی تھی۔ یہ تو جان بھائی کی دعاؤں کا ثمر ہے کہ میں آپ سب کے درمیان زندہ ہوں اور دعاؤں سے ملی زندگی گزار رہا ہوں۔ سچ ہے مارنے والے سے بچانے والے کے ہاتھ لمبے ہیں۔

☆☆☆☆

رضوان ثاقب

سب سے بڑی دولت

یہ ایک خوبصورت شہر تھا جسے چند ہی دن پہلے ایک رحم دل بادشاہ نے فتح کیا تھا۔ اس شہر کو فتح کرنے سے پہلے یہاں کے عوام ظالم حکمرانوں سے بہت پریشان رہتے تھے۔ شہر کے فتح ہونے سے ان کی ساری پریشانی خوشی اور خوش حالی میں تبدیل ہوگئی۔ مگر اس شہر سے کوئی ستر اسی کلومیٹر کے فاصلے پر دو چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد تھیں۔ جن میں سے ایک بستی پر ہوازن قبیلے کی حکمرانی تھی اور دوسری بستی پر ثقیف قبیلے کی۔ دونوں قبیلے بہت طاقت ور اور انا پرست تھے۔ وہ کسی کی ماتحتی میں رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ رحم دل بادشاہ نے جب ایک بڑے اور خوب صورت شہر کو فتح کیا تو ان دونوں قبیلوں کو یہ شاندار فتح برداشت نہ ہوئی ان کو اس بات پر بہت غصہ آیا کہ ان کی موجودگی میں کوئی دوسرا ان سے زیادہ طاقت ور ہوا۔

طاقت کا یہی نشہ انسانوں اور ملکوں کو تباہ و برباد کردیتا ہے۔ فرعون اور نمرود سمیت تاریخ میں جتنے بھی حکمرانوں نے اپنی طاقت کو سب سے بڑی طاقت سمجھا ان کا انجام ذلت اور رسوائی ہی ہوا۔

ہوازن اور ثقیف قبیلے بھی رحمدل بادشاہ کی شاندار فتح کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کرپائے۔ انہوں نے ایک بڑا لشکر تیار کیا اور اس رحمدل بادشاہ سے جنگ کی تیاری شروع کردی۔ رحمدل بادشاہ کو جب ان قبیلوں کی اس سازش کا علم ہوا تو اس نے بھی مقابلے کے لیے بارہ ہزار سپاہیوں کی فوج تیار کی اور ان سپاہیوں کو ساتھ لے کر دشمن سے مقابلہ کے لیے روانہ ہوگیا۔ رحم دل بادشاہ کی قیادت میں جب یہ فوج میدان جنگ میں پہنچی تو دشمن نے سامنے سے مقابلہ کرنے کے بجائے چھپ کر وار کیا۔ ہوا کچھ یوں کہ بارہ ہزار سپاہیوں کی یہ فوج جب میدان جنگ میں پہنچی تو ہوازن قبیلے کے کچھ لوگ گھات لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے اچانک اس فوج پر تیروں سے حملہ کردیا۔ اس اچانک حملے سے یہ فوج اِدھر اُدھر بکھر گئی۔ صرف رحم دل بادشاہ چند بہادر سپاہیوں کے ساتھ میدان میں کھڑا رہا۔ پھر رحم دل بادشاہ نے اپنے ایک بہادر سپاہی جس کا نام عباس تھا کو حکم دیا کہ وہ بلند آواز سے سپاہیوں کو پکارے۔ چنانچہ اس نے آواز دی تو سب سپاہی پلٹ آئے۔ پھر یہ سپاہی اس جوش کے ساتھ دشمن سے لڑے کہ اسے کچل کر رکھ دیا۔ دشمن کی فوج کا ایک حصہ بھاگ کر قلعے میں چھپ گیا۔

رحم دل بادشاہ کے سپاہیوں نے اس کا بھی پیچھا کیا اور اس قلعے کو گھیرے میں لے لیا۔ مگر رحم دل بادشاہ نے ان لوگوں پر رحم کھاتے ہوئے تین دن بعد اس قلعے کا گھیرا ختم کر دیا۔ اس جنگ میں دشمن اپنا بہت سا سامان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ لڑائی میں دشمن جو مال چھوڑ کر بھاگ جائے اسے مال غنیمت کہتے ہیں۔ اس جنگ میں بہت سامال غنیمت رحم دل بادشاہ کے ہاتھ آیا۔ ڈھیروں مال مویشیوں کے علاوہ چھ ہزار قیدی بھی تھے۔ رحم دل بادشاہ نے یہ سب قیدی رحم کھا کر چھوڑ دیئے۔ رحم دل بادشاہ نے قیدیوں کو صرف چھوڑا ہی نہیں بلکہ کپڑوں کا ایک ایک جوڑا بھی تمام قیدیوں کو دیا۔ مال غنیمت کو جب رحم دل بادشاہ نے اپنی فوج میں تقسیم کیا تو بادشاہ نے جس شہر کو فتح کیا تھا وہاں کے لوگوں کو بہت سے اونٹ دے دیئے۔ اس پر شہر کو فتح کرنے کے لیے بادشاہ کے ساتھ جو لوگ آئے تھے ان کے کچھ نوجوانوں کو ملال ہوا اور ان کے منہ سے نکل گیا:

”ہم رحم دل بادشاہ کے ساتھ دشمن سے سر دھڑ کی بازی لگا کر لڑتے رہے لیکن اب جب مال غنیمت کی باری آئی تو یہ لوگ زیادہ حصہ لے گئے ہیں حالاں کہ یہ لوگ رحم دل بادشاہ کے بعد میں ساتھی بنے ہیں۔“

رحم دل بادشاہ نے یہ باتیں سنیں تو تحقیق کے لیے سب کو جمع کیا اور پوچھا کہ کیا تم نے یہ باتیں کی ہیں۔

انہوں نے کہا۔

”ہم سب نے تو نہیں البتہ ہمارے کچھ نوجوانوں نے ایسی باتیں ضرور کی ہیں۔“

رحم دل بادشاہ نے کہا۔

”اس شہر کے لوگ میرے نئے نئے ساتھی بنے ہیں میں نے یہ مال ان کی دل جوئی کے لیے انہیں دیا ہے۔ کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ یہ لوگ تو مال مویشی اپنے گھروں کو لے جائیں اور تم اپنے ساتھ مجھ کو لے جاؤ۔“

رحم دل بادشاہ کی یہ بات سننا تھا کہ وہ لوگ اس قدر روئے کہ ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں۔ جن لوگوں نے یہ باتیں کی تھیں ان کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی تھی کہ مال مویشیوں کے بجائے آج انہیں اس دولت کے مل جانے کی خوشخبری ملی ہے جس سے بڑھ کر اور کوئی دولت نہیں ہو سکتی۔

عزیز ساتھیو، یہ واقعہ شوال 8 ہجری کا ہے۔ یہ جنگ جو رحم دل بادشاہ حضرت محمد ﷺ کی قیادت میں بارہ ہزار صحابہ کرامؓ نے لڑی اسے غزوہ حنین کہتے ہیں۔ صحابہ صحابی کی جمع ہے اور صحابی اسے کہتے ہیں جس نے نبی ﷺ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، آپ ﷺ پر ایمان لایا اور ایمان کی حالت میں وفات پائی۔ غزوہ اس جنگ کو کہتے ہیں جس میں ہمارے پیارے نبی ﷺ خود بھی شریک ہوئے ہوں۔ اس لڑائی کو غزوہ حنین اس لیے

کہتے ہیں کہ اس میں حضرت محمد ﷺ خود شریک ہوئے اور یہ جنگ حنین کی وادی میں ہوئی۔ رمضان کے مہینے میں مکہ شہر کی شاندار فتح کے چند دن بعد ہی غزوہ حنین کا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ میں آپ کے ساتھ مدینہ منورہ سے آئے ہوئے صحابہ کرام بھی تھے۔ ان صحابہ کرام کو انصاری صحابہ کہا جاتا ہے۔ مکہ میں جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے وہ صحابی بھی جنگ میں شریک تھے۔ دشمن کے تیراندازوں کے اچانک حملے سے یہی نئے مسلمان ہونے والے دو ہزار ساتھی میدان سے بھاگ گئے تھے جس کی وجہ سے اسلامی فوج اِدھر اُدھر بکھر گئی تھی۔ مگر اس کے باوجود جب مسلمانوں کو شاندار فتح نصیب ہوئی تو مال غنیمت میں سے زیادہ مال نبی ﷺ نے ان نئے مسلمان ہونے والے صحابہ کو دیا جس پر انصاری صحابہ میں سے کچھ نوجوانوں کو اس کا ملال ہوا مگر نبی ﷺ نے فرمایا کہ

”یہ لوگ نئے نئے اسلام لائے ہیں میں نے یہ مال ان کو ان کی دل جوئی کے لیے دیا ہے۔ لیکن کیا تم لوگوں کو یہ پسند نہیں کہ یہ لوگ تو مال مویشی اپنے گھروں کو لے جائیں اور تم اپنے ساتھ مجھ (محمد ﷺ) کو لے جاؤ۔“

سبحان اللہ، انصاری صحابہ کو جو دولت مل گئی تھی اس سے بڑھ کر بھلا اور دولت کیا ہو سکتی ہے۔ اپنی جان، اپنے ماں باپ اور اپنی اولاد بھی محبت رسول ﷺ کے حصول میں قربان ہو جائے تو یہ سودا مہنگا نہیں، انصاری صحابہ کو مال مویشی کے بدلے میں سے بڑی اس دولت کی خوش خبری مل گئی تھی۔ تبھی تو فرط جذبات سے ان کی آنکھیں اشکبار اور داڑھیاں تر بتر ہو گئی تھیں۔ مگر یہ دولت کیسے نصیب ہوئی؟ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی جب اسی شہر مکہ سے آٹھ سال پہلے کفار کے ظلم وستم سے تنگ آ کر ہجرت کر کے مدینہ آئے تو انہی انصاری صحابہ نے آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کی بے مثال میزبانی کی۔ پھر ہر کڑے وقت میں آپ ﷺ کے ہر حکم پر لبیک کہا۔ غزوہ حنین میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر جم اور ڈٹ کر میدان جنگ میں کھڑے رہے۔ آج ہم بھی اگر سب سے بڑی دولت یعنی محبت رسول ﷺ کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں آپ ﷺ کے ہر حکم پر لبیک کہتے ہوئے سر دھڑ کی بازی لگانے کا عزم کرنا ہوگا۔ رسول ﷺ کے ساتھیوں کی میزبانی کے لیے اپنی قیمتی سے قیمتی چیز کو پیش کرنے میں بھی ذرا دریغ نہیں کرنا ہوگا۔

نبی ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ کے مطابق انصاری صحابہ کے پاس مدینہ منورہ میں ہی وصال فرمایا اور آپ ﷺ کے روضہ مبارک بھی مدینہ منورہ میں ہے۔ کاش آج ہم بھی نبی ﷺ کے ہر فرمان پر لبیک کہنے والے بن جائیں اور ہمارے گھروں میں بھی مال مویشیوں کے بجائے نبی ﷺ مہربان کی

محبت گھر کر جائے اور یوں ہم بھی دنیا و آخرت کے امیر ترین انسان بن جائیں (آمین)۔ آیئے آج سے ہم یہ دولت عظمیٰ حاصل کرنے کا عہد کریں نبی مہربان ﷺ کے دس فرمان یاد کریں اور ان پر آج سے ہی عمل کرنا شروع کر دیں۔ آپ ﷺ کے دس سنہری فرمان یہ ہیں:

☆ ہمیشہ سچ بولو اور جھوٹ سے بچو۔

☆ کسی سے حسد نہ کرو، کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح برباد کر دیتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو جلا دیتی ہے۔

☆ کسی کی چغلی مت کرو۔ سب سے برے وہ لوگ ہیں جو چغلیاں کھاتے ہیں اور دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں۔

☆ کسی کو گالی یا طعنہ نہ دو اور کوئی گندی بات منہ سے نہ نکالو۔

☆ جب وعدہ کرو تو اس کو پورا کرو۔

☆ مہمان کی عزت اور خدمت کرو۔

☆ کسی کی بات چھپ کر اور کان لگا کر نہ سنو۔

☆ غریبوں اور حاجت مندوں کی مدد کرو۔

☆ بیماروں کی خبر گیری کیا کرو۔

☆ کسی پر احسان کر کے اسے کبھی نہ جتاؤ۔

☆☆☆☆

زمرد سلطانہ

لالچ کی سزا

ایک بادشاہ کے دو بیٹے تھے دونوں ہی بیٹے لائق تھے۔ مگر بادشاہ کا پہلا بیٹا جس کا نام محمد علی تھا بہت رحمدل، پارسا اور نیکی کے کاموں میں ہمیشہ آگے رہنے والا تھا۔ جب کہ بادشاہ کا دوسرا بیٹا بہت لالچی اور خود غرض تھا وہ ہر کام میں اپنا مطلب تلاش کرتا تھا۔

بادشاہ نے جب بیٹوں یعنی شہزادوں سے اپنے خزانے کا ذکر کیا اور کہا کہ میری وفات کے بعد وہ خزانہ آپ دونوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے گا تو شہزادے یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ اچانک ہی بادشاہ نے یہ سوچ کر اپنا فیصلہ بدل دیا کہ کل کو انھیں میں سے کوئی ایک بادشاہ بنے گا۔ یہ نہ ہو کہ عوام کے فائدے میں نہ ہو اور ان کو نقصان پہنچائے اور عیش و عشرت میں اپنی زندگی برباد کر دے۔

کیوں نہ ان کا امتحان لیا جائے۔ لہذا بادشاہ نے انھیں اپنے پاس بلایا اور خزانے میں سے چالیس ہزار اشرفیاں محمد علی کو اور چالیس ہزار اشرفیاں خرم کو دیں اور انھیں ایک اچھا سا کاروبار کرنے کے لیے دو مہینے کی مہلت دی۔

دونوں شہزادے خوش خوش اپنے رستے کی طرف چل پڑے۔ بعد میں وہ سوچنے لگے کہ انھیں کون سا کاروبار کرنا چاہیے۔ شہزادہ خرم اپنے دل میں یہ سوچ کر خوش ہوا کہ وہ ذخیرہ اندوزی کرے گا جب غلہ ملے گا تو دگنی قیمت پر فروخت کروں گا اور خوب پیسہ کماؤں گا۔

دوسری طرف شہزادہ محمد علی سوچ رہا تھا۔ کہ وہ ان اشرفیوں کا کیا کرے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے راستے میں ایک فقیر ملا۔ اس نے شہزادے کو ایک راستہ بتایا کہ اگر وہ چالیس دن تک مچھلیوں کو باقاعدگی سے دانہ ڈالے گا اور ارد گرد رہنے والے تمام پرندوں کا دھیان رکھے تو اسے چالیسویں دن بہت عمدہ تحفہ ملے گا جسے دیکھ کر وہ دنگ رہ جائے گا۔ شہزادے نے فقیر کے کہنے پر دانہ خریدا اور مچھلیوں کو ڈالنے کے لیے چلا گیا۔ یہ سلسلہ مسلسل انتالیسویں دن تک جاری رہا۔ چالیسویں دن جب شہزادہ محمد علی مچھلیوں کے لیے دانہ خرید کر لایا تو فقیر سے بولا کہ ”میرے پاس اب دینے کے لیے اور کچھ نہیں بچا۔ میں یہ کیسا کام کر رہا ہوں۔ جس میں صرف

دینا ہے اور لینا کچھ بھی نہیں"۔ فقیر نے جواب دیا کہ "تم اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو اور جاؤ اپنے کام میں دیر مت کرو۔"

شہزادہ محمد علی فقیر کے کہنے پر چل دیا۔ ابھی وہ دریا پر جا ہی رہا تھا کہ اسے ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔ ایسے جیسے جنگل میں موجود تمام پرندے اس کا استقبال کر رہے ہوں اور خوش آمدید کہہ رہے ہوں۔ دریا پر مچھلیوں کو دانہ ڈالنے کے دوران وہ جنگل میں موجود پرندوں سے باتیں کرنے لگا اور کہنے لگا کہ آج میرا دریا پر آخری دن ہے اس کے بعد شاید زندگی میں یہاں آنا ہو کہ نہ ہو۔ مچھلیوں کا یہ سننا کہ وہ دریا کے مختلف حصوں میں پھیل گئیں اور ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ دراصل وہ یہ کہنا چاہتی تھیں کہ تم نے یہ کام اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے اور اس کی مخلوق کو دانہ کھلا کر جو نیکی کی ہے اس کا اجر شاید ہی کوئی دے سکے۔

اس کے بعد مچھلیاں دریا کے کونے کونے میں موجود خزانے میں سے دنیا کا سب سے قیمتی ہیرا تلاش کرنے لگیں آخرکار جب وہ اسے تلاش کرنے کامیاب ہو گئیں تو انھوں نے وہ ہیرا شہزادہ محمد علی کو پوٹلی کے ساتھ باہر اگل دیا۔ جب شہزادہ محمد علی دانہ ڈال کر اپنی پوٹلی اٹھانے لگا تو اسے ایک چمکتی ہوئی چیز دکھائی دی۔ یہ دنیا کا سب سے انمول ہیرا تھا جس کی قیمت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ خوش خوش جنگل سے روانہ ہوا اور فقیر نے اسے خوش ہو کر رخصت کیا اور دعا دی۔

دوسری طرف شہزادہ خرم لالچ میں اندھا ہو گیا تھا۔ وہ غلے کو دگنی سے بھی زیادہ قیمت میں فروخت کرنے لگا۔ تاجر حضرات اس سے تنگ آ گئے۔ وہ براہ راست کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ کسی نہ کسی کو مہرہ بنا کر استعمال کیا کرتا۔ کوئی بھی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ کون ہے جو غلے کو دگنے داموں میں فروخت کر رہا ہے۔ بادشاہ بھی بہت پریشان تھا۔ کوئی بھی اس پریشانی کا حل تلاش کرنے میں کامیاب نہ رہا۔

ایک دن اتفاقاً شہزادہ محمد علی کی ملاقات شہزادہ خرم سے ہوئی۔ شہزادہ خرم نے محمد علی کو اپنے گودام میں آنے کی دعوت دی۔

شہزادہ محمد علی جو کہ بہت ہی نیک اور ملنسار انسان تھا نے آنے کی ہامی بھر لی اور اس سے ٹھیک ایک دو دن بعد وہ شہزادہ خرم سے ملنے کے لیے اس کی رہائش گاہ پر گیا۔ باتوں ہی باتوں میں شہزادہ محمد علی نے اپنا تمام حال و احوال بیان کر دیا اور ہیرے کا بھی تذکرہ کر دیا اور وہ ہیرا شہزادہ خرم کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ہیرے کو دیکھتے ہی

اس کے دل میں خیال آیا کہ میں ایک ماہ بیس دنوں تک اتنا مال اکٹھا نہیں کر سکا جتنا اس نے چالیس دنوں میں حاصل کر لیا۔ کیوں نہ ہیرا میں اپنے پاس رکھ لوں۔ لہٰذا اس نے چال چلتے ہوئے شہزادہ محمد علی کو بہلا پھسلا کر وہ ہیرا اپنی پوٹلی میں رکھ لیا اور اسے کہا کہ جب دو ماہ پورے ہو جائیں گے تو تم آ کر مجھ سے لے لینا۔ میرے پاس یہ تمہاری امانت ہے۔ شہزادہ محمد علی اس کی بات مان گیا۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ شہزادہ خرم اسے لے کر بھاگنے کی کوشش کرے گا جب دو مہینے پورے ہوئے اور شہزادہ محمد علی اپنا ہیرا لینے کے لیے گیا تو وہاں موجود نہیں تھا وہ یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوا وہ سیدھا اپنے ابا یعنی بادشاہ حضور کے پاس گیا اور تمام ماجرا گوش گزار کر دیا اور ساتھ ہی شہزادہ خرم کے گوداموں کا پتہ اور ٹھکانا بھی بتا دیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ شہزادہ خرم بھاگنے کی تیاریوں میں تھا کہ سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔

بادشاہ نے اس سے پوٹلی لینے کا حکم دیا اور اسے قید با مشقت کی سزا دی۔ وزیر نے پوٹلی کھولی تو ہیرے کی چمک نے تمام دربار کو روشن کر دیا۔

ہیرے کو دیکھ کر بادشاہ حیرت میں گم ہو گیا اور کہا کہ یہ ہیرا ہے جس کی قیمت نہیں لگائی جا سکتی انمول ہیروں میں سے بھی انمول۔ اس سے مراد شہزادہ محمد علی تھا۔

اس کے بعد بادشاہ نے اپنے تخت پر شہزادہ محمد علی کو بٹھایا اور وہ ہیرا اس کے تاج میں لگوا دیا بادشاہ کا یہ فیصلہ بہت درست ثابت ہوا کیوں کہ رعایا اپنے بادشاہ سے بہت خوش تھی۔

☆☆☆☆

سید اشرف بیتھوی

ذہانت کا انعام

پیارے بچو!

یہ ایک سچا واقعہ ہے جو امریکا کے ایک گاؤں میں پیش آیا تھا۔ جہاں ریلوے لائن پر ایک پُل بنا ہوا تھا جس کے نیچے سے روزانہ ہزاروں کاریں، موٹریں اور لاریاں گزرتی تھیں۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ سامان سے لدا ہوا ایک ٹرک جو بہت اونچا ہونے کے باعث پل کے نیچے سے گزرتے ہوئے پل کے اندر پھنس گیا۔ لاکھ کوشش کے باوجود وہ ٹرک اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ بس ایسا لگ رہا تھا جیسے ٹرک کا اوپر والا حصہ پل کی چھت سے چپک کر رہ گیا ہو۔

ٹرک کے مالکان اور ریلوے کے انجینئرز موقع پر پہنچ گئے اور سبھی اپنی اپنی تدبیریں لڑا رہے تھے۔ دونوں جانب سے آنے جانے والی گاڑیاں موٹریں اور کار والے بے حد پریشان تھے کیوں کہ انھیں آنے جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ گاڑیوں والے ہارن پر ہارن بجا رہے تھے جس کی وجہ سے پورے علاقے میں ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ اس دلچسپ صورت حال کو دیکھنے کے لیے تماشائیوں کا ہجوم لگ گیا تھا۔ ریلوے کے انجینئروں نے دوسری گاڑی کی مدد سے ٹرک کو دھکیل کر نکالنا چاہا مگر اس میں انھیں کامیابی نہ ہو سکی۔ ٹرک کو نکالنے کی کوئی ترکیب کارگر ثابت نہیں ہو رہی تھی۔

آخر کار تنگ آ کر کمپنی کے انجینئروں نے یہ تجویز پیش کی کہ پُل کا اوپری حصہ ادھیڑ دیا جائے۔ سامان باہر نکال کر ٹرک کو نکال لیا جائے۔ پل کو دوبارہ سے بنا دیا جائے لیکن اس تجویز پر ریلوے انجینئروں کو اعتراض تھا کہ اس طرح سے گاڑیوں کی آمد و رفت کئی روز تک رکی رہے گی اور لوگوں کو بہت تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ اس کے علاوہ ریلوے کی کارکردگی سے اخبارات اور عوام خراب اثر لیں گے۔ ریلوے کے انجینئروں نے اپنی طرف سے یہ تجویز پیش کی کہ ٹرک کا اوپر والا حصہ توڑا جائے لیکن کمپنی کے انجینئر اور افسران یہ بات ماننے کو تیار نہ تھے کیوں کہ ٹرک میں ان کا قیمتی سامان تھا۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا اتنا بڑا نقصان ہو۔

بس اب کیا تھا فریقین میں تکرار بڑھ گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ مسافر حضرات

بے حد پریشان تھے اور تماشائی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ فرم اور ریلوے کے ماہرین کے درمیاں تو تو میں میں جاری تھی۔ آپس کی تکرار ختم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی دوران ٹریفک پولیس کے افسران بھی وہاں پہنچ گئے اور حالات کا جائزہ لینے لگے۔ ان کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ٹرک پل کے نیچے سے کس طرح نکالا جائے اور لوگ کبھی ٹرک کو دیکھتے اور کبھی اس پل کو جس کی وجہ سے یہ مصیبت آئی تھی ان کا ذہن جواب دے گیا تھا۔

اسی دوران ایک ننھا منا طالب علم گلے میں بستہ لٹکائے اس جگہ آ نکلا۔ شاید وہ بھی سب لوگوں کی طرح تماشا دیکھنے آیا تھا پہلے وہ خاموشی سے دیکھتا رہا اور لوگوں کی باتیں سنتا رہا پھر آگے بڑھ کر ایک انجینئر سے بولا۔ انکل کیا یہ ٹرک نکل نہیں رہا ہے۔ دیکھیے آپ اس ٹرک کے تمام پہیوں کی ہوا نکال دیں۔ ٹرک نیچے ہو جائے گا اور پھر اسے دھکیل کر باہر نکال لیا جائے۔ ریلوے کا انجینئر بچے کی اس بات پر بے حد حیران ہوا اور بچے کو پیار سے گود میں اٹھا لیا اور اپنے ساتھیوں سے بولا دیکھا اس ذہن طالب علم کی ذہانت نے ہمارا مسئلہ حل کر دیا۔ جائیے جلدی سے ٹرک کے پہیوں کی ہوا نکالیں اور ٹرک کو دھکیل کر پل سے باہر نکال لیں۔ وہاں کھڑے ہوئے تمام لوگ حیران ہوئے اور سب کی نظریں اس ذہن بچے کی طرف لگ گئیں۔ جس نے اتنے بڑے مسئلہ کو ایک منٹ میں حل کر دیا تھا۔ ایسا ہی ہوا اور ٹرک کے پہیوں کی ہوا نکلنے کے بعد ٹرک آسانی سے پل کے نیچے سے باہر نکل آیا۔ ریلوے کے انجینئر اور مالک فرم نے بچے کی ذہانت پر سرکار کی طرف سے بہت بڑا ذہانت کا انعام دلوایا۔ اس ذہین بچے کی ذہانت کا چرچا عام ہو گیا۔ اخبارات میں اس کی تصویر کئی روز تک چھپتی رہیں۔ دیکھا بچو! ایک بچے کی ذہانت نے کتنی آسانی سے پل کے نیچے پھنسے ہوئے ٹرک کو با آسانی باہر نکلوا دیا۔

بچو! تمھیں بھی چاہیے کہ اس ذہین بچے کی طرح تم بھی کوئی بڑا کام کر کے دکھاؤ جس کی وجہ سے سب لوگ تمھیں بھی ہمیشہ یاد کرتے رہیں۔

☆☆☆☆

سید نظر زیدی

لکھ پتّی

آدھی چھٹی کی گھنٹی بجی تو بچے خوانچے والوں اور دکانوں کی طرف یوں بھاگے جیسے قید سے رہا ہوئے ہوں اور اپنی اپنی پسند کی چیزیں خریدنے لگے، لیکن منظور اسکول کے لان میں اسی جھاڑی کے قریب بیٹھ گیا جہاں روز بیٹھا کرتا تھا۔ دل تو اس کا بھی بہت کرتا تھا کہ اچھی اچھی چیزیں خرید کر کھائے، مگر اس کے پاس پیسے ہی نہ ہوتے تھے۔ اس کی غریب بیوہ ماں دن رات محنت کر کے گھر کا خرچ چلا رہی تھی۔ اس کی فیس کے پیسے بھی مشکل سے جمع ہوتے تھے۔ بچے عام طور پر اپنے بڑوں کے معاملات کی طرف دھیان نہیں دیتے کہ ابا جان کی آمدنی کتنی ہے اور امی جان گھر کا خرچ کس طرح پورا کرتی ہیں۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہ زیادہ تر کھیلنے اور کھانے کی طرف دھیان ہوتا ہے، لیکن منظور ایک سمجھ دار بچہ تھا۔ اللہ پاک نے اپنی خاص مہربانی سے اسے عقل کا نور زیادہ دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ میری امی جان جیب خرچ دینے کے قابل نہیں ہیں۔ اس لیے وہ کبھی ضد نہ کرتا تھا۔ باسی روٹی کھا کر اسکول آ جاتا تھا اور خوب شوق سے تعلیم حاصل کرتا تھا۔

ابھی اسے یہاں بیٹھے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ گلفام ٹہلتا ٹہلتا اس کے پاس آ گیا۔ وہ پکوڑوں کی پلیٹ لیے چٹخارے لے لے کر پکوڑے کھا رہا تھا۔ وہ پلیٹ منظور کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ”لو یار پکوڑے کھاؤ!“ لیکن پھر فوراً پلیٹ پیچھے ہٹا لی اور مذاق اُڑانے کے انداز میں بولا ”اوہ معاف کرنا یار“ مجھے یاد ہی نہ رہا تھا کہ تمھیں تو پکوڑوں سے پرہیز ہے تمھاری امی جان نے تاکید کر رکھی ہے، بیٹے پکوڑے کبھی نہ کھانا۔ ویسے بھی یار، میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم کھانے پینے کی سبھی چیزوں سے پرہیز کرنے لگو، بڑی بچت ہوگی۔ لکھ پتی بن جاؤ گے۔ کیوں ہے نا شان دار مشورہ؟“ یہ کہہ کر گلفام زور سے ہنسا۔

منظور اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ مغرور امیر لڑکا اس کی غربت کا مذاق اُڑا رہا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔

آدھی چھٹی میں وہ اسی طرح اس کے پاس آ جاتا تھا اور طنز بھری باتیں کر کے اس کا دل دکھاتا تھا۔ اس کا دل کرتا تھا اُٹھ کر گریبان پکڑے اور باتوں کا جواب لاتوں سے دے۔ آج بھی اسے سخت غصہ آیا لیکن فوراً ہی امی جان کی نصیحت یاد آ گئی جنھوں نے لڑنے جھگڑنے سے سختی سے روکا تھا۔ وہ کسی قدر تیز آواز میں بولا۔ ”اس مشورے کا شکریہ“ لیکن مہربانی کر کے آپ یہاں سے تشریف لے جایئے۔“

گُلفام غصے سے بولا: ''کیوں تشریف لے جائیں؟ کیا جگہ خریدی ہے جناب نے؟''

''تو میں چلا جاتا ہوں'' یہ کہہ کر منظور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ بے بسی اور غصے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ یا تو ہم سے تشریف لے جانے کے لیے کہہ رہے تھے یا اپنی تشریف کا ٹوکرا اٹھا کر چل دیے۔ لیکن ہم تمھیں بھی نہ جانے دیں گے۔ کبھی کبھی تو تم سے باتیں کرنے اور مشورے دینے کا موقع ملتا ہے اور ہمارا تازہ بتازہ مشورہ یہ ہے کہ تم اپنا نام نامنظور رکھ لو!'' بات ختم کر کے گُلفام بہت زور سے ہنسا۔ وہ آج اس غریب لڑکے کو جی بھر کے پریشان کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے ایک دوست سے باتیں کرتے ہوئے وہاں آ گئے اور انھیں دیکھ کر وہ وہاں سے کھسک گیا۔

یہ کوئی ۳۸ برس پہلے کا واقعہ تھا جو گُلفام کو یاد آ گیا تھا۔ اس زمانے میں وہ گورنمنٹ ہائی اسکول لدھیانہ کا ایک شرارتی اور نالائق طالب علم تھا۔ اسکول کے کم زور اور غریب طالب علموں کو ستانا اس کا خاص مشغلہ تھا۔ جن طلبہ کو وہ خاص طور پر ستایا کرتا تھا ان میں منظور بھی شامل تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل جاتی تھیں۔ وہ طرح طرح کے فقرے چست کرتا۔ خاص طور سے یہ تو ضرور کہتا ''یار، تمھارا نام تو نامنظور ہونا چاہیے تھا۔''

منظور کو اس طرح ستانے کی جرأت اسے اس کے بہت غریب ہونے کی وجہ سے ہوتی تھی۔ اگرچہ وہ ہاتھ پیروں میں اس سے مضبوط تھا، لیکن اپنی غریبی کی وجہ سے ایک امیر لڑکے کو ترکی بہ ترکی جواب دینے کی ہمت نہ کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی امی کی نصیحتوں کی وجہ سے بھی مجبور تھا جنھوں نے بہت سختی سے اسے لڑنے جھگڑنے سے روکا تھا۔

پاکستان بنا تو لدھیانہ کے مسلمانوں کو بھی ہجرت کرنی پڑی۔ گُلفام اپنے ماں باپ کے ساتھ لاہور آ گیا اور اس کے والد نے بھاگ دوڑ کر کے ایک کوٹھی اور ایک فیکٹری الاٹ کرا لی اور یوں یہ لوگ پہلے سے زیادہ مال دار ہو گئے۔ منظور اور اسکول کے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں گُلفام کو کچھ معلوم نہ ہوا کہ وہ کہاں گئے۔ یہ معلوم کرنے کی اس نے کبھی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ اب اس کی زندگی پہلے سے کہیں زیادہ شان دار تھی۔ اس کے والد صاحب نے اسے فیکٹری کا منیجر بنا دیا تھا اور ان کے انتقال کے بعد وہ فیکٹری اور کوٹھی دونوں کا مالک بن گیا تھا۔

آج منظور سے اس کی ملاقات بالکل یوں ہوئی جیسے کوئی چیز راستے میں پڑی مل جائے۔ وہ انگریزی دوائیوں کی ایک دکان سے بلڈ پریشر کی دوا خرید رہا تھا۔ دکان دار کو ہزار روپے کا نوٹ دیا تو اس نے دراز کھول

کر موجود رقم کا اندازہ کیا اور پھر نوٹ ملازم کو دیتے ہوئے کہا ’’مرزا صاحب، میرے پاس تو پیسے کم ہیں۔ مہربانی کر کے لکھ پتی سے پکڑ لیجیے‘‘

مرزا صاحب نوٹ لے کر سڑک کے دوسری طرف کھڑے ہوئے ریڑھی والے کی طرف بڑھ گئے۔ جو سیب بیچ رہا تھا۔ گلفام نے مرزا صاحب کو ریڑھی والے کی طرف جاتے دیکھا تو ہنستے ہوئے بولا۔ ’’اگر یہ شخص لکھ پتی ہے تو آپ کو ارب پتی ہونا چاہیے، لیکن آپ کے پاس ہزار روپے کے نوٹ کا بقیہ بھی نہیں ہے؟‘‘

دکان دار بولا ’’جناب، یہ غریب لکھ پتی کہاں ہے، لوگوں نے یوں ہی اسے لکھ پتی لکھ پتی کہنا شروع کر دیا ہے۔ نام تو اس کا منظور احمد ہے‘‘

’’منظور احمد!‘‘ گلفام کو نہ جانے کیوں اپنا اسکول کا ساتھی منظور یاد آ گیا جسے وہ نامنظور کہہ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ اس نے دوا اور نوٹ کی باقی رقم وصول کی اور اپنی کار کی طرف آنے کے بجائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا لکھ پتی کی ریڑھی کے قریب آ گیا۔ ریڑھی پر بہت اچھے تازہ سیب سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ اور دوسری طرف ویسا ہی تر و تازہ ایک شخص اسٹول پر بیٹھا تھا۔ گلفام نے ذہن پر زور ڈال کر اپنے پرانے یار منظور کو پہچاننے کی کوشش کی اور ماتھے پر داہنیں طرف سرخ رنگ کے تل کی وجہ سے جلد ہی پہچان لیا کہ یہ وہی منظور ہے جسے وہ نامنظور کہہ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ اسے ایسی خوشی ہوئی کہ زندگی میں ایک دوبار ہی ہوئی ہوگی۔ اس نے خوشی سے کانپتی ہوئی اونچی آواز میں کہا ’’نامنظور، بالکل نامنظور!‘‘

لکھ پتی نے چونک کر حیرت بھری نظروں سے گلفام کو دیکھا۔ لیکن جواب میں وہ گلفام کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس کے سامنے ایک گورا چٹا، موٹا تازہ بہت رعب دار آدمی کھڑا تھا جس نے بہت بڑھیا سوٹ پہن رکھا تھا۔

گلفام نے اسے خاموش دیکھا تو اسکول کے پرانے انداز میں بولا ’’ابے کیا تُو رو رہا ہے، نامنظور، بالکل نامنظور، ادھر آ اور سینے سے لگ جا میرے۔ مَیں گلفام ہوں، گلفام تیرا پرانا یار، جو تجھے ستا کر خوش ہوا کرتا تھا۔‘‘

لکھ پتی تقریباً دوڑتا ہوا گلفام کے پاس آ گیا۔ اس کا تندرست چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا تھا لیکن آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ دونوں ننھے بچوں کی طرح ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ خوب بھینچ بھینچ کر خوشی اور محبت کا اظہار کیا اور جب یہ جوش کم ہوا تو گلفام بولا ’’اسے اللہ کی خاص مہربانی ہی کہنا چاہیے منظور بھائی کہ اتنے عرصے بعد ہماری ملاقات ہوئی۔ سناؤ کس حال میں ہو؟ کیسی گزر رہی ہے؟‘‘

’’منظور نہیں، نامنظور بلکہ نامنظور بھی نہیں لکھ پتی، اللہ کا شکر ہے، اس نے بہت سکھ دے رکھے ہیں۔ نام ہی

سے اندازہ کرلو کہ محلّے اور بازار کے سب لوگ لکھ پتی کہتے ہیں۔ اللہ نے مفت میں لکھ پتی بنا دیا اور کیا چاہیے"

"واقعی بہت بڑی بات ہے۔ اچھا اب تم یوں کرو کہ یہ ریڑھی یونہی چھوڑو، بلکہ اعلان کردو جس کا جی چاہے سیبوں سمیت لے جائے۔ تم خود میرے ساتھ کار میں بیٹھو، باقی باتیں کوٹھی پہنچ کر ہوں گی" گلفام نے پُر جوش انداز میں کہا۔

"اے یار کی آدھی بات منظور، آدھی نامنظور.... منظور یہ کہ کار میں بیٹھ کر تمھارے ساتھ چلوں گا، نامنظور یہ کہ ریڑھی لوٹ لینے کا اعلان نہیں کروں گا۔ مفت کا مال نہیں ہے۔ کسی سے کہہ دیتا ہوں میرے گھر پہنچا دے گا" لکھ پتی نے کہا اور ایک ہمسائے سے ریڑھی گھر پہنچانے کا کہہ کر گُلفام کا ہاتھ پکڑا اور چمکتی دمکتی کار کی طرف بڑھ گیا۔

گُلفام کی کوٹھی کیا تھی جنت کا ٹکڑا تھی۔ اتنی بڑی کہ کمرے گننے میں دشواری پیش آئے۔ یہ بڑے بڑے...... لان اور نوکروں کے کوارٹرا لگ۔ پوری کوٹھی دکھانے کے بعد جب گُلفام لکھ پتی کو لے کر اپنے کمرے میں آیا تو وہ صوفے پر چوکڑی مار کر بیٹھتے ہوئے بولا:

"واہ بھئی واہ" کوٹھی تو ماشاءاللہ بہت شان دار ہے۔"

"فیکٹری دیکھو گے تو اور بھی خوش ہو گے۔ وہ اس سے بھی بڑی اور شان دار ہے" گُلفام نے بہت خوش ہو کر کہا۔

لکھ پتی اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا "دیکھو یار برا نہ ماننا۔ ہمدردی کے طور پر کہہ رہا ہوں کہ تمھاری اپنی کوٹھی یعنی صحت کچھ اچھی حالت میں نہیں ہے اچھے خاصے بیمار لگ رہے ہو"

گُلفام اداس ہو کر بولا: "اس میں برا ماننے کی کیا بات، میری صحت واقع اچھی خاصی بگڑ گئی ہے۔ شوگر ہے، بلڈ پریشر ہے۔ کچھ دن سے دل میں بھی گڑبڑ محسوس کر رہا ہوں۔ ڈاکٹروں کا کہنا تو یہ ہے کہ بائی پاس کرانا پڑے گا۔ لیکن میاں یہ تو سب اللہ کی مرضی ہے۔ انسان کا کیا بس ہے"

"نا! نا! یوں نہ کہو گُلفام بھائی، صحت کا اچھا ہونا یا خراب ہونا بڑی حد تک انسان کے بس میں ہوتا ہے۔ اچھی عادتیں اپناؤ، مثلاً ورزش کرو، عمدہ خوراک کھاؤ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے خیالات کو پاک رکھو، نیکی کے کام کرو۔ گناہوں سے بچو، تندرست رہو گے۔ اس کے خلاف کرو گے تو نتیجہ الٹا ہو گا۔"

لکھ پتی کی یہ باتیں گُلفام کے دل کو لگیں، لیکن وہ مجرم بننے کے لیے تیار نہ تھا۔ بات بدلتے ہوئے بولا "اچھا چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ ۱۹۴۷ء میں لدھیانہ سے ہجرت کرنے کے بعد کیسی گزری، کیا کرتے رہے۔

کوئی مکان وغیرہ الاٹ کرایا یا نہیں۔ تم تو خاصی بڑی حویلی میں رہتے تھے وہاں"

لکھ پتی نے جواب میں کہا "مکان الاٹ کرانے کی کوشش تو بہت کی، لیکن محکمے والے رشوت مانگتے تھے اور امی جان کا حکم یہ تھا کہ ایک دھیلا کسی کو نہیں دینا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حق ہوتے ہوئے مکان نہ ملا۔ تعلیم ادھوری ہونے کی وجہ سے نوکری بھی نہ ملی۔ مجبور ہو کر سبزی منڈی میں مزدوری کرنے لگا۔ تعلیم مکمل کرنے کے لیے دل تڑپتا تھا لیکن وقت ہی نہ ملتا تھا۔ اماں جی لاہور آ کر بس دو برس زندہ رہیں۔ ان کے انتقال کے بعد منڈی کے ایک آڑھتی نے اپنے پاس جگہ دے دی اور آگے چل کر ایسا راضی ہوا کہ اپنی اکلوتی بیٹی سے میری شادی کر دی۔ میری تو زندگی سنور گئی۔ مزدوری چھوڑ کر چھوٹا موٹا کاروبار کرنے لگا۔ بچے ہوئے، انھیں تعلیم دلوائی، دو بڑے بیٹوں کی شادی کی۔ انھیں نوکر کرایا اور اب اپنے کنبے کے ساتھ عیش کی زندگی گزار رہا ہوں۔"

"اگر تم نامنظور کی جگہ واقعی منظور ہوتے تو تھوڑی بہت رشوت دے کر کوئی شان دار مکان الاٹ کروا لیتے بلکہ کئی مکان الاٹ کروا لیتے۔ اس زمانے میں تو یہی کچھ ہو رہا تھا۔ اچھا خیر جو ہوا۔ یہ لکھ پتی والی بات بتاؤ۔ سچ کہتا ہوں بڑی دلچسپ لگتی ہے مجھے تو...... مَیں لکھ پتی چھوڑ کر کروڑ پتی ہوں لیکن کوئی دل سے یہ بات نہیں مانتا۔ منہ پر ضرور میاں صاحب، میاں صاحب یا سیٹھ صاحب، سیٹھ صاحب کہیں گے لیکن پیٹھ پھرتے ہی میرے بُرے ناموں سے یاد کرنے لگتے ہیں" گلفام نے کہا۔

"یہ کوئی خاص راز نہیں ہے۔ ہوا یوں کہ ایک بار حکومت نے قرض دینے کا اعلان کیا۔ دوست احباب نے مجھ سے بھی کہا کہ قرض لے کر اپنا کاروبار بڑھاؤ لیکن مَیں نے اپنی ماں کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے قرض لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر ایک رشتہ دار نے طنز کے طور پر کہا "انھیں قرض لینے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو ماشاءاللہ لکھ پتی ہیں۔" انھوں نے میرا مذاق اُڑانے کے لیے مجھے لکھ پتی کہا تھا۔ ان جیسے اور لوگوں نے بھی یہ حرکت کی اور یوں میں بیٹھے بٹھائے لکھ پتی بن گیا۔ ویسے اگر سچ پوچھو تو مَیں سچ مچ لکھ پتی ہوں۔ اگر کوئی واقعی عقل مند ہے تو یہ بات مانے گا کہ اس دنیا میں آدمی کے لیے سب سے بڑی دولت ایمان اور اس کے بعد تندرستی ہے اور میرے اللہ نے اپنی خاص مہربانی سے یہ دونوں مجھے بہت زیادہ دی ہیں۔ مَیں اپنا مالک اور خالق صرف اللہ کو مانتا ہوں اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زندگی گزارنے کے جو طریقے بتائے ہیں ان کے مطابق چلنے کی پوری پوری کوشش کرتا ہوں۔ رہی تندرستی، تو وہ تم دیکھ ہی رہے ہو۔ عمر میں تم سے دو چار سال بڑا ہی ہوں گا۔ کشتی لڑ کر دیکھ لو، بچھاڑ نہ دوں تو اپنا نام بدل کر نامنظور اور لکھ پتی رکھ لوں گا"۔

گُلفام رشک بھری نظروں سے اپنے پرانے ساتھی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے اپنے آپ سے بہت بہتر لگ رہا تھا۔ کشتی لڑنے کی بات سن کر بولا۔ ”نا بابا نا میں تو اسکول کے زمانے میں تم سے ڈرتا تھا۔ اوپر اوپر سے تمھارا مذاق ضرور اُڑاتا تھا لیکن دل میں یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں اُٹھ کر میرا گریبان نہ پکڑ لو۔ میں تو اس وقت تم سے پکی صلح کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ تم میری فیکٹری کا انتظام سنبھال لو۔ رہنے کے لیے شان دار بنگلہ اور آنے جانے کے لیے بڑھیا کار دوں گا۔ تنخواہ ۲۵ ہزار روپے مہینہ الگ، بولو منظور ہے۔ آج کل میرا بڑا بیٹا یہ کام کر رہا ہے لیکن میں اس کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔ وہ اپنی بیوی اور اس کے رشتہ داروں کی بات بہت مانتا ہے بس ہاں کہہ دو اور مجھ پر ایک احسان کر دو۔“

لکھ پتی سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ بنگلے کار اور بھاری تنخواہ کی بات سن کر اس کے چہرے پر چمک آ گئی تھی، لیکن اس نے فوراً ہی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا ”گُلفام بھائی، یہ تم میری حیثیت سے زیادہ عزت دے رہے ہو مجھے، لیکن بالکل ایمان داری سے مجھے بتاؤ کہ تمھاری فیکٹری میں دو نمبر مال تو تیار نہیں ہوتا“۔

”کیسی فضول باتیں لے بیٹھے ہو یار تمھیں ایمان داری، ایک نمبر یا دو نمبر سے کیا مطلب۔ جیسے کام چل رہا ہے چلاتے رہنا!“ گُلفام نے کہا۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار چھا گئے تھے۔

لکھ پتی پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”پہلے اس سوال کا جواب دو، بعد میں کوئی اور بات۔ اور لوگوں کے بارے میں تو میں زیادہ نہیں جانتا لیکن خود یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ پاکستان کے سب سے بڑے دشمن بے ایمانی کرنے والے ہیں۔ جب کوئی غلط کام کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس نے اس عمارت کی بنیاد سے ایک اینٹ نکال لی جس کا نام پاکستان ہے۔“

”مطلب یہ ہوا نا کہ تمھیں یہ نوکری منظور نہیں؟“ گُلفام نے منہ بنا کر کہا۔

”بھائی، میرا تو نام ہی نامنظور رکھ چھوڑا ہے تم نے۔ اچھا السلام علیکم“ دوا لینے ادھر جاؤ تو سلام دعا لے لیا کرنا۔ میں کبھی کبھی آ جایا کروں گا۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ اپنی حفاظت میں رکھے“ بات ختم کر کے لکھ پتی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے ہاتھ ملائے بغیر باہر کا رُخ کیا۔

گُلفام اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ شخص تو واقعی لکھ پتی ہے۔ لوگوں نے اس کا نام غلط نہیں رکھا۔

☆☆☆☆

سیدہ تعظیم عمران

شیر اور خرگوش

کسی جنگل میں ایک شیر اور خرگوش رہتے تھے۔ جنگل کے بادشاہ شیر اور سفید سفید بالوں اور بھولی بھالی شکل والے خرگوش میں گہری دوستی تھی۔ ایک دفعہ شیر کو دو دن شکار نہیں ملا اسے چنانچہ بھوک لگی ہوئی تھی۔ ایسے میں خرگوش اسے ملنے آیا، جیسے ہی اُن دونوں کا آمنا سامنا ہوا، خرگوش کا نرم نرم گوشت دیکھ کر شیر کے منہ میں پانی بھر آیا۔ شیر نے خرگوش کو کہا کہ میں دو دن کا بھوکا ہوں، ایسے میں تم خود چل کر میرے پاس آ گئے گویا کنواں پیاسے کے پاس چلا آیا۔ تمھاری میری دوستی اپنی جگہ لیکن آج دوستی پر بھوک غالب ہے، سو آج کوئی مجھے، تمھیں کھانے سے نہیں روک سکتا۔ خرگوش نے کہا کہ شیر بھائی تمہاری دوستی پر میری جان بھی قربان لیکن میں تو چھوٹا سا ہوں مجھے کھا کر تمھاری بھوک کہاں ختم ہوگی، تم ایسا کرو مجھے چھوڑ دو، میں شہر جاؤں گا اور تمھارے لیے بوٹی لاؤں گا۔ یوں میری جان بھی بچ جائے گی اور تمھاری بھوک بھی مٹ جائے گی۔

شیر مان گیا، یوں خرگوش شہر پہنچ کر باورچی کے پاس گیا اور اسے کہا: باورچی باورچی مجھے ایک بوٹی دے دو، مَیں بوٹی میں شیر کو دوں گا، شیر بوٹی کھائے گا اور مجھے چھوڑ دے گا۔ باورچی نے جواب دیا، مجھے تم انڈا لا کر دو، انڈے سے مرغی بنے گی، مرغی کی بوٹی تم لے لینا۔ خرگوش بھاگا بھاگا مرغی کے پاس گیا۔ مرغی مرغی مجھے ایک انڈا دے دو، انڈا میں باورچی کو دوں گا، باورچی مجھے بوٹی دے گا اور جب وہ بوٹی شیر کھائے گا تو میری جان بچ جائے گی۔ مرغی نے کہا کہ پہلے تم مجھے دانہ دو پھر میں انڈا دوں گی۔ خرگوش دوڑا دوڑا مشین کے پاس گیا اور کہا: مشین مشین! مجھے تھوڑا سا دانہ دے دو، دانہ مرغی کو دوں گا، مرغی مجھے انڈا دے گی، انڈا باورچی لے گا، بدلے میں مجھے وہ بوٹی دے گا، بوٹی شیر کھائے گا اور میں زندہ رہ جاؤں گا۔ مشین نے کہا: میں خود کئی دن کی پیاسی ہوں۔ دو گھونٹ پانی حلق سے اترے گا تو دانہ دوں گی ناں۔ تم پہلے مجھے پانی پلاؤ پھر دانہ لے جاؤ۔ خرگوش بھاگا بھاگا دریا گیا اور کہا: دریا دریا تمھارے پاس پانی کا اتنا ذخیرہ ہے، تھوڑا سا پانی مجھے بھی دے دو۔

پانی مشین کو چاہیے، پھر وہ دانہ دے گی، دانہ مرغی کھائے گی۔ دانہ کھا کر مرغی انڈا دے گی، وہ انڈا میں باورچی کے حوالے کروں گا۔ بدلے میں مجھے بوٹی ملے گی اور وہ بوٹی شیر کو دے کر میں اپنا وعدہ پورا کر سکوں گا۔ دریا پانی بھرنے کی اجازت دے دیتا ہے۔

خرگوش جا کر پانی مشین کو پلاتا ہے، مشین دانہ دیتی ہے، دانہ لے کر وہ مرغی کو کھلاتا ہے۔ مرغی سے انڈا لے کر باورچی کو دیتا ہے۔ باورچی اس کو بوٹی دے دیتا ہے۔ بوٹی لے کر وہ واپس بھاگا بھاگا جنگل پہنچتا ہے۔ یوں شیر کو کھانے کے لیے بوٹی مل جاتی ہے اور شیر اور خرگوش دوبارہ ہنسی خوشی دوست بن جاتے ہیں۔

☆☆☆☆

شعیب خالق

چالیس روپے

لچھے بیچنے والا لڑکا جس سڑک کے کنارے اُوندھے منہ پڑا روئے جا رہا تھا اس سڑک کے بائیں جانب ان بڑی کوٹھیوں کی کشادہ پشت تھی جن کے گیٹ دوسرے طرف بڑی سڑک پر کھلتے تھے۔ کوٹھی کے لان میں رنگین لباس چھوٹے چھوٹے لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ان کے ہنسنے اور وقفے وقفے سے لڑنے کا شور چھوٹی سڑک تک آ رہا تھا مگر لچھے والے کے رونے کی آواز ان رنگین لباس بچوں تک نہیں پہنچتی تھی۔ یوں بھی کوئی آدھ گھنٹے سے مسلسل روتے ہوئے اس کا دماغ اب اتنا سُن ہو گیا کہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ دُھندلی اور بے ربط سوچوں کے ساتھ وہ رو بھی رہا ہے۔ سڑک پر لچھے والے کے قریب سے گزرتے ہوئے لوگوں کی چال قدرے سست پڑتی اور وہ اس پر سرسری سی نگاہ ڈالتے آگے بڑھ جاتے۔ اِکا ذکا راہ گیروں نے ذرا رُک کر رونے کا سبب پوچھا تو اس نے پیٹ اور چھاتی میں سے ابھرنے والے ہچکیوں کے جھٹکوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا---

”مے---رے---چالی---رپے---ہوں ہوں---ہوں ہوں۔“

ان ٹوٹے پھوٹے لفظوں سے لڑکے کی کتھا جوڑتے ہوئے رُکنے والوں میں سے کچھ نے جیب سے ایک ایک دو دو روپے نکال کر اس کے سر کے گرد پھیلے ہوئے بازو کے نیم دائرے میں پھینکے اور اپنی راہ لی۔ لڑکے نے چند آہٹوں اور آوازوں کو رکتا اور پھر دور ہوتا ہوا محسوس کیا تو اس نے اپنے منہ کی کروٹ سڑک کے بجری والے کنارے پر پہلی بار بدلی۔ اس کا آدھا چہرہ جو کروٹ کے بعد دکھائی پڑا اس پر باریک کنکریاں اُن کی چبھن کے نقطے اور ریتلی مٹی کے دھبے تھے اس نے آنسوؤں سے بھیگی پلکوں کو کھول کر دیکھا تو اسے منہ کے آگے ہچکیوں بھری سانسوں سے ہلتے ہوئے چند نوٹ دکھائی دیئے پھر لمحہ بھر کو جیسے ان نوٹوں نے ہلنا بند کر دیا، لیکن اگلے ہی لمحے اس کے اندر زیاں کا احساس اس شدت سے اُبھرا کہ وہ ایک بار پھر پیروں کو زمین پر رگڑتے ہوئے دھاڑیں مار کر رونے لگا۔

لچھے والے کی عمر سات آٹھ سال تھی۔ کالی رنگت چپٹی ناک اور سُرخی اور زردی ملی موٹی موٹی آنکھیں

بدن پر گھٹیا سے ملیشیے کا چرمر اور میلا کچیلا جوڑا، قمیص کے گریبان کی طرح شلوار کا پائنچہ بھی اُدھڑا ہوا، پاؤں میں اپنے سائز سے بڑے، پھٹے پرانے پی ٹی شوز جن میں تسموں کی جگہ اس نے بوریوں کے منہ بند کرنے والی بھورے رنگ کی سُتلی پرو رکھی تھی۔ چند ہفتے پہلے کرائی ہوئی ٹنڈ پر ابھی بال اتنے گھنے نہیں ہوئے تھے کہ سر پر ایک زخم کے ملائم نشان اور چند پھنسیوں جیسے چکنے دانوں کو چھپا سکتے۔ گردن ٹخنے اور کلائیوں پر جمی میل میں جیسے اس کی خشک جلد نے ننھی دراڑیں ڈال دی تھیں۔

لچھے بیچنے والا یہ گُنگ دماغ لڑکا پچھلے ڈیڑھ ماہ سے سیٹلائٹ ٹاؤن کی مارکیٹ میں جوتوں کی ایک دکان کے برآمدے والے شیلف کے سامنے بیٹھ کر گھنٹوں ایک جوتے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ ہر روز سکول کے گیٹ پر ہاف بریک کی گھنٹی بجتے ہی اپنے ہاتھوں میں پکڑی ننھی سی گھنٹی زور زور سے ہلاتا اور شور مچانے لگتا۔

لچھے جی لچھے، بڑے مزیدار لچھے ……

پھر شروع میں لڑکوں کا ایک ریلا آتا اور اس سے لچھے لے کر کھاتا، شور مچاتا اِدھر اُدھر بھاگنے لگتا، لیکن بعد میں وہ آہستہ آہستہ گھنٹی بجاتا۔ سیدھا مارکیٹ میں جوتوں کی دوکان کے سامنے آ بیٹھتا اور پھر وہیں بیٹھے بیٹھے بچے کچھے لچھے بھی بیچتا اور ربڑ کے اس جوتے کو بھی دیکھتا رہتا جو چمکتے ہوئے چمڑے سے بنایا گیا معلوم ہوتا تھا۔ وہ جوتا، یوں اچانک نجانے کیوں اس کے دماغ میں تسمے کس کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک دن اس نے ڈرتے ڈرتے سیلز مین سے اس کی قیمت بھی پوچھی جو اس نے چالیس روپے بتائی تھی۔ پھر اس نے روز آٹھ آٹھ آنے چاچا کی نظروں سے چھپاتے چھپاتے جمع کیے اور آج صبح لچھے بیچنے کے لیے جاتے ہوئے ایک دکاندار سے اپنی ریزگاری کے بدلے دس دس کے نوٹ لیے تھے۔ وہاں سے وہ سکول آیا اور فل بریک بھگتا کر مارکیٹ کی طرف تیزی کے ساتھ جاتے ہوئے اسے یک دم اپنے چالیس روپوں کے گم ہونے کا خیال چاچا کے زناٹے دار تھپڑ کی طرح محسوس ہوا اور اس کا سارا وجود جیسے لمحہ بھر کو سُن ہو گیا۔

اس نے جلدی سے موی لفافہ اور گھنٹی سڑک کے کنارے پھینکی اور جیب میں پڑے پیسوں میں انہیں ڈھونڈا، شلوار کے نیفے کو اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں اور انگلیوں کی پوروں سے خوب دبا دبا کر ٹٹولا، لیکن پھر تھک ہار کر سڑک پر اوندھے منہ گرا اور پاؤں زمین پر رگڑ رگڑ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اچانک ایک گیند آئی اور لڑکے کی ٹانگوں کے قریب پڑے مومی لفافے پر ٹھپہ کھاتی ہوئی سامنے نالی میں جا گری۔ دو لڑکے جن کی عمر لچھے والے جتنی ہی ہو گی، دیوار پر چڑھے اور گیند کو ڈھونڈتے ان کی نگاہیں لچھے والے پہ آ ٹھہریں۔

انہوں نے جھکتے ہوئے پوچھا

"اوے لچھے والے، کیا ہوا ہے؟" لچھے والے نے ساکت آنکھوں کو آہستگی سے گھما کر دیکھا اور جب نیکر پہنی ٹانگوں کو قریب پایا تو اس کی نظریں ننگی ٹانگوں سے سرکتی ہوئی ان کے دور ننگے جاگرز پر آ رکیں، ان جاگرز کو دیکھ کر اس کے ذہن میں مارکیٹ کے شیلف میں پڑے جوتے آئے ......اُس کے اندر ایک درد بھری تڑپ اُبھری اور اس نے پھٹے پرانے پی ٹی شوز زمین پہ رگڑنا شروع کر دیے اور زور زور سے کہنے لگا۔

"مے رے چالی رپے مے رے چالی رپے اللہ جی"

وہ دونوں لڑکے لچھے والے کے یوں ایک دم چیخ مار کر رونے سے ڈر گئے اور "اوئے اسے کیا ہوا" کہتے ہوئے چند قدم پیچھے ہٹے انہیں شبہ سا گزرنے لگا جیسے وہ کوئی پاگل ہے پھر اس خوف سے کہ کہیں وہ کوئی اینٹ یا پتھر اٹھا کر نہ دے مارے وہ واپس دیوار پر چڑھے اور وہاں بیٹھ کر گیند اٹھا لانے کے جھگڑے میں پڑ گئے اسی دوران کوٹھیوں سے کسی کی فیشن ایبل نسوانی آوز ا ابھری

دانیال ـــــدانیال ـــدانیال بیٹا۔

"اوئے ممی بلا رہی ہیں،، یہ کہہ کر صحت مند لڑکے نے لان میں چھلانگ لگا دی۔

"دانیال کے بچے اب تو مجھے کہنا کبھی کھیلنے کے لیے" دیوار پر بیٹھے لمبے لڑکے نے ٹھوڑی پہ ہاتھ پھیر کر کہا۔

"اچھا نہ کھیلنا میں کوئی تمہارا بھوکا نہیں ہوں کچھ دیر وہ وہیں ہیں خاموش بیٹھے رہنے کے بعد دیوار سے اُتر ا اور لچھے والے سے قدرے ڈرتا ہوا آہستگی کے ساتھ نالی میں سے گیند اُٹھا کر اسے زور زور سے سڑک پر ٹھپے دیتا رہا اور اپنے گھر کی جانب چل دیا۔

لچھے والے کے سینے میں جو شور اٹھا وہ کچھ دیر بعد باہر کی خاموشی سے جیسے ڈر سا گیا اس نے سہمی سہمی نظروں سے بازو کے نیم دائرے میں پڑے پیسے ہاتھ سے سرکا کر اپنی مٹھی میں بھرے اور دونوں کہنیوں پر زور دے کر خود کو زمین سے اٹھانا چاہا لیکن ایک کنکر اس کی کہنی کے نیچے اس زور کا چبھا کہ اس کی چھاتی پھر بجری والی زمین سے جا چپکی۔ اس نے کروٹ لے کر نوٹوں بھری مٹھی سے کہنی کو مسلا اور اٹھ بیٹھا۔ ارد گرد نظر دوڑا کر جلدی سے مومی لفافہ سرکا کر اپنے قریب کیا اور ساتھ ہی ننھے سے لاؤڈ اسپیکر جیسی زرد رنگ کی گھنٹی بھی اٹھا کر لفافے پر رکھ دی۔ جھولی پھیلا کر سارے نوٹ مٹھی ڈھیلی چھوڑتے ہوئے اس میں ڈالے اور پھر ایک ایک نوٹ کی سلوٹیں سہلاتا دل ہی دل میں گنتی کرنے لگا۔

نوٹوں کو غور سے گنتے ہوئے اسے شام کے گہرے ہونے کا احساس ہوا تو اس نے سڑک کے دونوں اطراف گردن گھما کر دیکھا، سڑک ویران تھی اور آسمان پر چھائے بادل کسی وقت بھی برسنے کو تیار تھے اچانک ایک آدمی اس پر جھکتے ہوئے شفیق آواز میں بولا۔

’’پتر کیا بات ہے؟ ادھر کیوں بیٹھے ہو اس وقت ہیں؟‘‘ لڑکے نے جھولی کو یک دم دوہرا کر کے پیسے ڈھانپتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک آدمی جس نے سنہرے فریم والی عینک لگا رہی تھی اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ لڑکے سے کوئی جواب نہ پاتے ہوئے ہاتھوں میں چند فائلیں اٹھائے ہوئے وہی آدمی پھر بولا:

’’پتر کیا بات ہے، ہیں؟ اُٹھو، شاباش اُٹھو وہ اسے بازو سے پکڑ کر اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا، وہ ایک ہاتھ سے جھولی کو تھامے اُٹھا اور پھر جھک کر دوسرے ہاتھ سے مومی لفافہ اور گٹھڑی اُٹھا کر اس آدمی کی طرف وقفے وقفے سے اجنبی نظروں سے دیکھتا اس کے گھر کی طرف چل پڑا جو سڑک کے دائیں طرف کوٹھی نما مکانوں کی قطار میں چند قدم آگے تھا۔

گھر میں داخل ہو کر اس آدمی نے اس سے بیٹھنے کو کہا اور بیوی کو آواز دی۔ بیوی اندر آئی اور لڑکے کو حیران نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی: ’’یہ کون ہے؟‘‘

’’جب میں آیا تو یہ باہر سڑک پر بیٹھا گھبرائے سے انداز میں پیسے گن رہا تھا‘‘ آدمی نے جواب دیا:

’’ہائے اللہ!‘‘ بیوی نے شوہر کی بات کاٹی۔ ’’یہ وہی تو نہیں جو کوئی گھنٹے بھر سے باہر کہیں بیٹھا روئے جا رہا تھا۔ اس کی آواز یہاں تک آ رہی تھی‘‘۔ ’’ہاں شاید وہی ہے میں آیا تو چُپ تھا مگر لگ رہا تھا جیسے بہت دیر تک روتا رہا ہے خیر چھوڑو میں اس سے پوچھتا ہوں تم اس کے کھانے کے لیے کچھ لے آؤ‘‘۔

’’ہائے کیوں نہیں میں ابھی لاتی ہوں۔ بیچارا‘‘ یہ کہہ کر بیوی باورچی خانے کی طرف چلی گئی اور آدمی نے لڑکے کو مخاطب کیا ’’کیوں پتر بھوک لگ رہی ہو گی نا، ہیں؟‘‘ لڑکے نے بمشکل اثبات میں سر ہلایا اور پھر گردن ٹیڑھی کر کے نظریں جھکائے پیروں کے بل بیٹھا دیوار سے ٹیک لگائے اپنے پھٹے پرانے جوتے دیکھ رہا تھا۔

’’اوئے پتر ہوا کیا ہے تمہارے ساتھ، کسی نے مارا ہے یا پیسے چھین لیے ہیں؟ پتر ڈرو نہیں بتاؤ۔ ہیں؟ آدمی نے اپنے جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے اس سے پوچھا لڑکا قدرے ڈرا ڈرا سا بغور اس آدمی کے جوتوں کو دیکھ رہا اور جب اس نے سر اٹھا کر جواب دیا تو اس کی خشک آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

’’جی میرے چالی روپے گم گئے‘‘ اور یہ جملہ ختم کرتے ہی وہ آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگا وہ آدمی

پاؤں کی ایڑی میں پھنسی جراب اُتار کر ننگے پاؤں اس کے قریب آیا۔

''اوئے پتر روتے نہیں ہیں'' ہمارے چالیس سال گم ہو گئے اور پتہ بھی نہیں لگا'' پھر ایک گھٹنا فرش پر ٹکا کر ہنستے ہوئے بولا: ''لو دسو اوئے ناں ناں رومت تمہارے پیسے ابھی پورے ہو جاتے ہیں لاؤ بتاؤ مجھے ذرا تمہارے پاس کتنے جمع ہو گئے ہیں؟''

لڑکے نے معصوم اعتبار بھرے انداز میں اپنے ننھے ہاتھ کی مٹھی اس آدمی کے کشادہ ہاتھ پر الٹ دی۔

پنجی روپے جی،، اور پھر ہچکی بھر کر سر اٹھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا آدمی کی نظر پیسے لیتے ہوئے اس کے نیلے ہاتھ پر ٹھہر گئی جس کی جلد کی سطح خشکی سے پھٹی ہوئی دیکھ کر چند لمحے پہلے مسکراتے اس آدمی کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی اس نے اٹھتے ہوئے لچھے والے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا:

''چل بس پتر چپ کر جا۔ تیرے چالیس روپے سمجھ پورے ہو گئے''۔

اس نے جیب سے بٹوہ نکالا اور اس میں سے دس دس کے چار نوٹ دکھاتے ہوئے کہا۔

اتنے ہی تھے نا۔ ہیں؟ یہ لو بس چلو اب ہنسو شاباش۔،، لڑکے نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر پیسے پکڑے اور اسی دوران بیوی کھانا لے آئی وہ پیسے اپنی مٹھی میں دبائے دوسرے ہاتھ سے نوالے توڑ کر کھانے لگا۔ بیوی نے شوہر سے پوچھا:

''کیا بتایا ہے اس نے؟ کیا ہوا تھا اسے؟'' آدمی نے عینک اتار کر میز پر رکھی اور دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملتے ہوئے بولا

''اس کے چالیس روپے گم ہو گئے اور یہ غریب رو رو کر ہلکان ہوا جا رہا تھا۔ دے دیئے ہیں۔،، اس کی بیوی کے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑی اور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی:

''توبہ توبہ اللہ معاف کرے، اللہ سب بچوں کا وارث ہو اس کی عمر اپنے گڈے جتنی ہی ہو گی نا،،۔۔

''ہاں پچ کدھر ہے وہ بلاؤ اسے ادھر''۔

''نہیں سویا ہوا تھا ابھی اٹھا ہے اور ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہا ہے''۔

''اچھا دیکھو'' آدمی نے لڑکے کے پھٹے پرانے جوتے دیکھتے ہوئے بیوی کو مخاطب کیا'' وہ جو جوتے گڈو کو کاٹتے تھے اور اس نے پہننا چھوڑ دیئے تھے وہ ذرا لے آؤ۔،، یہ بات سنتے ہی لچھے والے کی بھوک اس کے پیٹ میں معدوم ہوتی چلی گئی۔

”وہ تو بالکل نئے ہیں“ بیوی نے کہا۔

”تو پھر کیا ہوا؟، خاوند ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ ”کون سے چمڑے کے بنے ہوئے ہیں ربڑ کے ہی تو ہیں بس تم لے آؤ وہی جوتے جاؤ۔“

بیوی جوتوں کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے اندر داخل ہوئی تو لچھے والے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں وہی جوتے جو اس کے خوابوں والی دکان کے شیلف میں اسے دکھائی دیتے تھے وہ جوتے اب اس کے سامنے تھے اور آدمی کہہ رہا تھا۔

”پتر یہ تمہارے جوتے ہیں پہن لو انہیں۔، لڑکے نے نوالہ ترکاری والی پلیٹ میں ہی چھوڑا اور پھٹے پرانے پی ٹی شوز کی تنی کھولی سائز سے بڑے جوتوں میں سے اس کے پیر بہ آسانی باہر نکل آئے اور وہ نئے جوتوں کو چمکتی نظروں سے دیکھتا اپنے پیروں پر چڑھانے لگا۔

”کیوں پتر پورے ہیں نا۔“

”ہاں جی۔، لڑکے نے شرمائے سے انداز میں اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

”گڈ، لو بھئی اس کا کام تو بن گیا نئے جوتے بھی مل گئے اور پیسے بھی پورے ہو گئے،، پھر آدمی نے مسکراتے ہوئے سگریٹ سلگائی اور گہرا کش لیا۔

لچھے والے نے اصلی تسمے ایسے کس کر باندھے جیسے پھر کبھی انہیں نہیں کھولے گا، پھر اٹھتے ہوئے لچھوں والا مومی لفافہ اور گھنٹی اٹھائی اور باہر والے دروازے کی طرف نئے نئے قدموں سے چلنے لگا۔

”اب پیسے سنبھال کر رکھنا اچھا“ بیوی نے اسے آواز دیتے ہوئے کہا۔ آدمی اس کے ساتھ باہر آیا اور اسے نئے ڈھنگ سے چلتا ہوا دیکھتا رہا۔

باہر ہلکی ہلکی پھوار شروع ہو چکی تھی گہری شام کا سرمئی اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ وہ لڑکا اصلی تسمہ بندھے جوتوں کو پہن کر جیسے خواب میں چلتا گھنٹی بجاتا چھوٹی سڑک کا موڑ مڑ گیا۔ گھنٹی کی آواز معدوم ہوتی ہوئی محسوس کر کے وہ آدمی اندر پلٹا، دروازے کی چٹخنی چڑھا کر دوسرے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ اس کی نظر لچھے والے کے پھٹے پرانے جوتوں پر پڑی جنہیں وہ ادھر چھوڑ گیا تھا اس نے آگے بڑھ کے جوتوں کو کوڑے کرکٹ والے ڈبے میں پھینکنے کی غرض سے اٹھایا تو ہاتھوں میں ایک جوتا جھول سا کھا گیا اور کوئی شے دھپ کر کے گری۔ آدمی نے جھک کر دیکھا تو وہ دس دس کے چار نوٹ تھے۔

صداقت حسین ساجد

آبِ حیات کا درخت

بادشاہ کا دربار لگا ہوا تھا، ایک غیر ملکی تاجر دربار میں حاضر ہوا۔ ان دنوں یہ اصول تھا کہ جب کوئی تاجر مال تجارت لے کر کسی ملک میں جاتا تو سب سے پہلا کام وہ یہ کرتا کہ اس ملک کے بادشاہ کے دربار میں حاضری دیتا اور بادشاہ کو تحفے دیتا۔ یوں ایک تو اسے سرکاری طور پر اپنا مال وہاں فروخت کرنے کی اجازت مل جاتی تھی اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا کہ بادشاہ کی رضامندی بھی حاصل ہو جاتی۔۔۔ چنانچہ اس تاجر نے بھی دستور کے مطابق بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر چند تحفے پیش کیے، وہ ہر چیز کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے تحفے دکھا رہا تھا:

”بادشاہ سلامت! یہ پانی سے چلنے والی گھڑی ہے۔ میں نے یونان سے آپ کے لیے خریدی ہے اور یہ غالیچہ۔۔۔! میں نے ایران سے لیا تھا۔ ایران میں اس سے زیادہ قیمت والا غالیچہ اور کوئی نہیں۔ یہ قلم دیکھئے! میں نے یہ قلم خاص طور پر جاپان سے اچھی خاصی رقم سے خریدا تھا۔“

”بہت خوب۔۔۔! بادشاہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ تمام چیزیں زبردست ہیں۔۔۔ جو تم نے یونان، ایران اور جاپان سے خریدی ہیں، لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا حضور۔۔۔؟“

”لیکن یہ بتاؤ کہ تمہیں ہندوستان میں ہمارے شایانِ شان کوئی چیز نہیں ملی تھی؟“

”عالی جاہ! ویسے تو آپ کے شایانِ شان کئی چیزیں تھیں مگر جو چیز مجھے پسند آئی تھی۔۔۔۔ وہ میں حاصل نہیں کر سکتا تھا۔“

”کیوں نہیں حاصل کر سکتے تھے؟“ بادشاہ کے لہجے میں حیرت تھی۔“

کیوں کہ اسے حاصل کرنے کے لیے کافی عرصہ درکار تھا جب کہ میں نے وہاں صرف دو دن ٹھہرنا تھا۔

”اچھا! لیکن وہ کیا چیز ہے؟“ بادشاہ اس چیز کے تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ”بادشاہ سلامت! وہ ایک درخت ہے، جو ہندوستان کے ایک علاقے میں پایا جاتا ہے۔۔۔ اس جیسا اور درخت پوری دنیا میں نہیں ہے۔“

''وہ کیوں ۔۔۔ کیا اس میں کوئی خاص خوبی ہے؟''

''جی ہاں بادشاہ سلامت! وہ ایسا عجیب و غریب درخت ہے، جو بھی اس کا پھل کھا لیتا ہے ۔۔۔ وہ ہمیشہ جوان رہتا ہے اور اسے موت بھی نہیں آتی، اس درخت میں آبِ حیات کی سی خوبی ہے۔'' تاجر نے ادب سے بتایا ۔۔۔ بادشاہ اس عجیب و غریب درخت کے بارے میں سن کر بہت حیران ہوا اور وہ اس درخت کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو گیا۔ دوسرے دن بادشاہ نے اپنے ایک وزیر کو بلا کر حکم دیا۔

''ہمیں پتا چلا ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسا درخت ہے جس کا پھل کھانے والا ہمیشہ جوان رہتا ہے اور اسے موت بھی نہیں آتی۔ تم ہوشیاری سے جاؤ اور اس درخت کو ڈھونڈو ۔۔۔ کامیابی حاصل کر کے ہی آنا ۔۔۔ خواہ کتنا ہی عرصہ لگ جائے ۔۔۔ ہم تمہارے اخراجات کے لیے رقم بھیجتے رہیں گے۔''

''جو حکم عالی جاہ!'' وزیر نے احترام سے جواب دیا۔

وزیر بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے چل پڑا ۔۔۔ آخر وہ ہندوستان پہنچ گیا اور اس نے فوراً ہی وہ درخت ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ وہ بے چارہ ہندوستان کا چپہ چپہ گھوما ۔۔۔ جنگل، پہاڑ، دریا اور جزیرے تک چھان مارے ۔۔۔ لیکن اسے اپنا مطلوبہ درخت نہ ملا۔ وہ جس سے بھی اس درخت کے بارے میں پوچھتا ۔۔۔ وہ اس کا مذاق اُڑاتا ۔۔ کوئی کہتا:

''پاگل تو نہیں ہو ۔۔۔ ایسا درخت تو اس دنیا میں کہیں بھی نہیں ہے۔'' کسی کا جواب یہ ہوتا: اجنبی مسافر! ایسے درخت کو ڈھونڈنا جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو ۔۔۔ دیوانگی کے سوا کچھ نہیں۔''

وہاں تو یہی معاملہ تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں، لیکن وزیر بھی دھن کا پکا تھا ۔۔ وہ لوگوں کی باتیں صبر سے سنتا رہا۔ کئی سال گزر گئے، وہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر اس درخت کو ڈھونڈتا رہا ۔۔ بادشاہ نے بھی اپنا وعدہ نبھایا اور اچھی خاصی رقم بھیجتا رہا۔ تلاش کی بھی حد ہوتی ہے ۔۔۔ وزیر اب اس تلاش سے اکتا گیا تھا، کیونکہ اسے اس انمول درخت کا پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اس درخت کا کہیں بھی وجود نہیں تھا ۔۔ وہ مایوس ہو گیا۔ درخت کی تلاش میں اس نے جتنی جدوجہد کی تھی، وہ سب رائیگاں گئی تھی ایسا درخت ہوتا تو ملتا۔ آخرکار وہ مایوس اور بددل ہو کر واپس چل پڑا۔ وہ ناکامی اور بادشاہ کے ڈر سے روتا جا رہا تھا کہ اسے راستے میں ایک شخص ملا۔ اس نے وزیر کی یہ حالت دیکھ کر پوچھا:

''اجنبی مسافر! تو کون ہے اور کس غم میں مبتلا ہے کہ تو روتا جا رہا ہے ۔۔۔؟ اتنا مایوس اور فکرمند

کیوں ہے؟''

وزیر ٹھنڈی سانس لے کر کہنے لگا۔

''میں ایک قاصد ہوں، بادشاہ نے مجھے ایک ایسے درخت کی تلاش میں بھیجا ہے جس کا پھل کھانے والا ہمیشہ جوان رہتا ہے اور اسے موت نہیں آتی۔ میں کئی سال سے اس درخت کو ڈھونڈ رہا ہوں، لیکن ناکام رہا۔ میں پریشان ہوں کہ بادشاہ کو کیا جواب دوں گا۔''

اس شخص نے وزیر سے ہمدردی کا اظہار کیا اور تسلی دے کر بولا:

''اے مسافر! تو پریشان مت ہو۔۔ یہاں پاس ہی ایک صوفی بزرگ رہتے ہیں، جو بہت بڑے عالم اور ولی ہیں۔۔ تو ان کے پاس جا، یقیناً وہ تمہاری مشکل حل کر دیں گے۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑے علم و دانش سے نوازا ہے۔۔ وہ تمہاری پریشانی ضرور دور کر دیں گے۔''

وزیر نے اس شخص کا شکریہ ادا کیا اور صوفی بزرگ کی طرف چل دیا۔ وہ اس بزرگ کی خدمت میں اس امید پر حاضر ہوا کہ شاید وہ اس کی مراد پوری کر دیں اور اس کی مایوسی ختم ہو جائے۔ وزیر جب بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا تو زور زور سے رونے لگا، بزرگ نے شفقت سے پوچھا:

''مسافر! تو روتا کیوں ہے، اتنا مایوس اور پریشان کیوں ہے۔۔ کسی نے تمہارا دل دکھایا ہے یا کسی ڈاکو نے تمہیں لوٹا ہے؟''

''یا حضرت! میں ہر طرف سے مایوس اور ناامید ہو کر آیا ہوں، مجھے اس وقت آپ کی مہربانی اور رحم و کرم کی ضرورت ہے، آپ میری مدد فرمائیں تاکہ میں ناکامی اور شرمساری سے بچ سکوں۔'' وزیر ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔

بزرگ نے ہمدردی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا:

''مایوسی و ناامیدی گناہ ہے تو اپنا مسئلہ بیان کر اور صاف صاف بتا کہ تمہاری ناامیدی اور مایوسی کس لیے ہے۔۔ تیرا مقصد کیا تھا اور اب کیا چاہتا ہے؟''

''جناب! میں اپنے ملک کا وزیر ہوں۔۔۔ بادشاہ سلامت کو پتا چلا کہ ہندوستان میں ایک ایسا درخت موجود ہے جس کا پھل آب حیات کی طرح ہے، اس پھل کو کھانے والا ہمیشہ جوان رہتا ہے، وہ کبھی نہیں مرتا۔۔۔ بادشاہ نے مجھے اس درخت کو ڈھونڈنے کے لیے بھیجا تھا۔۔۔ میں نے ہندوستان کا چپہ چپہ چھان

مارا ہے۔۔ ہر ایسی جگہ دیکھی ہے جہاں کسی درخت یا پودے کے اُگنے کا امکان ہو، لیکن ۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔؟"

"لیکن مجھے اس درخت کا سراغ نہیں ملا، میری اتنے سالوں کی محنت ضائع ہو گئی ہے۔"

یہ سن کر بزرگ بے ساختہ ہنسنے لگے ۔۔ پھر وزیر سے کہنے لگے:

"افسوس! تم نے عقل سے کام نہ لیا اور اتنا عرصہ ایک درخت ہی ڈھونڈتے رہے۔"

"یا حضرت ۔۔۔! میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔"

"بھلے آدمی! وہ درخت اصل میں علم کا درخت ہے، لیکن تو اس کی ظاہری شکل میں درخت کو ڈھونڈتا رہا۔ علم ایک ایسی چیز ہے جسے لاکھوں بلکہ اربوں نام دیئے جا سکتے ہیں ۔۔۔ کہیں تو اس کا نام درخت ہے، تو کہیں اسے سورج کہتے ہیں، کبھی یہ سمندر کہلاتا ہے، تو کبھی بادل اور پہاڑ۔"

"لیکن ۔۔۔ وہ ہمیشہ جوان رہنے اور نہ مرنے والی خوبی ۔۔" وزیر نے حیرت سے پوچھا، تو بزرگ نے مسکراتے ہوئے کہا: علم کی ہزاروں خوبیاں ہیں ۔ ان میں سے ایک خوبی ہمیشہ کی زندگی ہے، تو اسے درخت کی شکل میں کیوں ڈھونڈتا ہے، اس کے معنی ڈھونڈ ۔۔ شکل تو پھل کا چھلکا ہے اور معنی اس پھل کا گودا، تمہیں چھلکے سے کیا غرض ۔ تو گودا کھا ۔ نام کو چھوڑ اور اس کی خوبی کو دیکھ تا کہ اس کی خوبی سے تیری رہنمائی ہو ۔۔۔ ہر چیز کی تاثیر کا تعلق اس کے نام سے نہیں ۔۔۔ اس کی اندرونی خوبی سے ہوتا ہے۔ شکر قندی کو ہم اس کی ظاہری صورت سے شکر قندی کا نام نہیں دیتے بلکہ اس کے اندر موجود مٹھاس کی وجہ سے اسے شکر قندی کہتے ہیں۔ خدا کی مخلوق میں نام ہی سے اختلاف پیدا ہوتا ہے لیکن جب وہ معنی پر پہنچتے ہیں، تو وہ اختلاف دور ہو جاتا ہے، علم بھی ایک ایسا درخت ہے، جس کا پھل کھانے والا یعنی علم حاصل کرنے والا ہمیشہ جوان رہتا ہے اور اسے کبھی موت نہیں آتی، کیونکہ علم کا درخت لافانی اور لازوال ہوتا ہے۔ وہی آبِ حیات ہے ۔۔ وہی حیات بخش ہے۔"

وزیر بزرگ کی بات سے قائل ہو گیا۔ اب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس نے مطلوبہ درخت ڈھونڈ لیا تھا۔ اس نے بزرگ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

"حضرت! آپ نے میری سالوں کی ناکامی کو ایک لمحے میں کامیابی میں بدل دیا ہے ۔۔ واقعی آپ نے ٹھیک کہا ہے کہ مجھے جس درخت کی تلاش تھی، وہ علم کا درخت ہے اور یہ صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ

دنیا کے ہر حصے میں چپے چپے پر موجود ہے۔"

پھر وہی وزیر ہنسی خوشی کامیابی کے گیت گاتا اپنے ملک روانہ ہوگیا، جب وہ دربار میں پہنچا تو بادشاہ نے پوچھا:

"کہاں ہے وہ درخت؟"

"عالی جاہ! وہ قابل قدر درخت مجھے مل گیا اور خدا کی قدرت دیکھئے کہ مجھے وہاں جا کر پتا چلا کہ حضور تو پہلے ہی اس سے واقف اور اس کے مالک ہیں۔"

"کیا مطلب؟" پھر وزیر نے تفصیل سے بادشاہ کو اس درخت کے بارے میں بتایا تو بادشاہ بزرگ کی بات کا قائل ہوگیا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ درخت کی جسامت اور شکل کی سوچ سے نکل کر اس کے مطلب اور پیغام کی رُوح تک پہنچ گیا تھا۔

☆☆☆☆

علی اکمل

غلامی

لالی جان لیوا حملے کا شکار ہوا تھا اور اب وہ اپنی جان بچانے کے لیے جد وجہد کر رہا تھا۔ صبح جب وہ خوراک کی تلاش میں نکلا تھا تو اسے اندازہ تک نہیں تھا کہ وہ خود بھی کسی کی خوراک بن سکتا ہے اور اب مصیبت اس کے سر پر رقص کر رہی تھی۔ وہ تھک چکا تھا، لیکن جان بچانے کی جد وجہد تو اسے اپنی آخری سانس تک کرنا تھی۔ اس نے ایک لمبا غوطہ لگایا۔ شکاری پرندہ اپنی نوکیلی چونچ اور پنجوں کے ساتھ اس کے تعاقب میں تھا۔ اس کی رفتار بھی غضب کی تھی۔ ایک بار لالی کو پنجوں میں دبوچنے کی دیر تھی۔ پھر وہ اپنی چونچ سے لالی کو چیر کر رکھ دیتا۔

شکرے کی پرواز میں تیزی ضرور تھی۔ لیکن لالی کی پرواز میں توازن تھا۔ وہ کمال مہارت سے پرواز کے دوران مخالف اطراف میں غوطہ لگا جاتا تھا۔ یوں شکرے کا ہر حملہ ناکام ہو رہا تھا۔ اب لالی نیچی پرواز کر رہا تھا۔ اسے سامنے ایک باغ نظر آیا۔ جان بچانے کے لیے اسے اس باغ میں پناہ مل سکتی تھی۔ لالی نے اپنے جسم کی تمام قوت کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ شکرے کو بھی سمجھ آ گئی تھی کہ لالی اگر باغ میں پہنچ گیا تو شکار ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اس نے طوفانی انداز میں ایک اور حملہ کیا۔

’’چیں ....چیں ....‘‘ یہ شکرے کی للکار تھی۔ لالی کا دل کانپ کر رہ گیا۔ لالی نے اپنے پروں کو سمیٹ کر ایک لمحے کے لیے اپنی رفتار کم کی اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا غوطہ لگایا۔ شکرے کے نوکیلے پنجے لالی کے جسم کو چھو کر گزر گئے۔ اس سے پہلے کہ شکرا پلٹ کر حملہ کرتا۔ لالی تیز رفتاری کے ساتھ باغ میں گھس گیا۔ باغ کی حفاظت پر مامور مالی نے شکرے کو ایک معصوم سے کبوتر پر حملہ کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شکرے کو بھگانے کے لیے آ گیا تھا۔ ان کے پاس ایک مخصوص قسم کی غلیل تھی۔ پھلوں کو پرندوں سے بچانے کے لیے وہ اس غلیل سے مدد لیتے تھے۔ اس غلیل سے نکلنے والے ’’چوہے‘‘ میں اتنی طاقت ہوتی تھی کہ کسی انسان کی ہڈی توڑ دے۔ شکرا ڈر کر واپس لوٹ گیا۔

’’کبوتر کہاں گیا......؟‘‘

مالی اپنے ساتھیوں سے پوچھ رہا تھا۔ لیکن کسی نے لالی کو درخت کے تنے میں چھپتے نہیں دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر کی تلاش کے بعد سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ لالی اب خطرے سے باہر تھا۔ اسے بہت زیادہ اڑنے کے باعث بھوک لگ رہی تھی۔ صبح سے اس نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ وہ ہمت کر کے سوراخ میں سے باہر نکل آیا اور پھر درخت کی ایک بلند شاخ پر آ بیٹھا۔ ہر طرف امن تھا، سکون تھا۔ اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ مغرب کی طرف شہر کے آثار نظر آ رہے تھے۔ لالی نے سوچا یہاں اسے ضرور کچھ کھانے کو مل جائے گا۔ پھر وہ اپنے گھر واپس لوٹ جائے گا۔ جواب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ پھر وہ شہر کی طرف پرواز کرنے لگا۔

لالی نے آزاد فضاؤں میں آنکھ کھولی تھی۔ شہر سے بہت دور ایک گاؤں کے پاس کھنڈر میں اس کا گھونسلہ تھا۔ وہ شہر کے قریب پہنچا اور پھر خوشی سے جھوم اٹھا۔ وہاں بہت سے کبوتر فضا میں پرواز کر رہے تھے۔ وہ بھی ان میں شامل ہو گیا۔ لالی نے غور کیا تمام کبوتر ایک دائرے میں پرواز کر رہے تھے، نیچے ایک مکان کی چھت پر اسے ایک بڑا سا پنجرہ رکھا نظر آیا۔ چند کبوتر پنجرے اور چھت پر گھوم پھر رہے تھے۔ لالی سمجھ نہیں پایا کہ معاملہ کیا ہے۔ پھر اسے ایک آدمی نظر آیا۔ وہ چھت پر دانہ پھینک رہا تھا۔ تمام کبوتروں نے پر سمیٹے اور چھت کی طرف غوطہ لگایا۔ لالی بھی ان کے ساتھ ہی چھت پر اتر آیا۔ وہ بھوکا تھا خوراک دیکھ کر اس کے دل میں لالچ پیدا ہو گیا تھا۔ ویسے بھی اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں اسے خطرے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ دوسری طرف خطرہ دبے پاؤں اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دانہ ڈالنے والا آدمی ان کبوتروں کا مالک تھا۔ وہ کبوتر باز تھا۔ کبوتروں کی پرواز پر وہ جوا کھیلتا تھا۔ اپنے کبوتروں میں ایک اجنبی کبوتر کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر اسے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ کبوتر اچھی نسل کا ہے۔ اگر اس پر محنت کی جائے تو وہ بہت اونچی پرواز کرے گا اور سب سے آخر میں گھر لوٹ کر اس کی جیت کا باعث بنے گا۔ وہ اب لالی کو پکڑنا چاہتا تھا۔ لالی ہر خطرے سے غافل پیٹ بھرنے میں لگا ہوا تھا۔ پاس ہی ایک برتن میں پانی رکھا ہوا تھا۔ پانی پینے کے بعد اسے اپنے گھر واپس لوٹنا تھا۔ لیکن پھر چپکے سے قیامت چلی آئی۔ لالی کا سانس اس کے سینے میں ہی پھنس کر رہ گیا تھا۔ اس کا ننھا سا دل زور سے دھڑکا تھا۔ اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ کسی نے اسے دبوچ لیا تھا۔ اس نے پوری قوت سے پھڑپھڑانے کی کوشش کی لیکن گرفت بہت مضبوط تھی۔ اب اس گرفت سے نکلنا ناممکن تھا۔ وہ غلام ہو چکا تھا۔ کبوتر باز ایسے خوش ہو رہا تھا جیسے اس کے ہاتھ کوئی

خزانہ لگ گیا ہو۔

''پکڑ لیا..........پکڑ لیا..........''

''کیا ہوا..........کسے پکڑ لیا؟'' اس کی بیوی نے آواز لگائی۔

''بیگم ایک پردیسی کبوتر ہے۔ بہت ہی اچھا..........بہت ہی اعلیٰ......آج تو قدرت ہم پر مہربان ہے......''

پھر وہ لالی سے مخاطب ہوا:

''اب تم پردیسی نہیں ہو..........یہ گھر تمہارا اپنا ہے۔'' اس نے پنجرے کی طرف اشارہ کیا۔

''تھوڑی سی تکلیف تو تمہیں ہوگی۔ لیکن یہ ضروری ہے ورنہ تم اڑ جاؤ گے۔ میں تمہارے پر نوچ لوں گا۔ اگلے دو ماہ میں تمہارے نئے پر آ جائیں گے۔ اور تب تک تمہیں اپنے اس نئے گھر سے محبت ہو جائے گی۔ پھر آزاد ہونے کے باوجود بھی تم لوٹ کر اسی گھر میں آیا کرو گے۔ جیسے میرے دوسرے کبوتر لوٹ آتے ہیں......''

پھر اس نے مخصوص انداز میں لالی کو ایک ہاتھ میں پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا بازو پھیلایا اور اپنے دانتوں کی مدد سے لالی کے پر نوچ لیے۔ لالی بہت تڑپا۔ اسے بہت درد ہوا۔ چیخیں اس کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئیں۔ اب لالی پرواز کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا۔ کبوتر باز نے لالی کو دوسرے کبوتروں کے ساتھ چھوڑ دیا۔ لالی کے دونوں بازو لٹک گئے تھے۔ وہ ایک کونے میں سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اب ایک نئی دنیا اس کی منتظر تھی۔ غلامی کی دنیا..........لالی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس پنجرے میں رہنے والے غلام کبوتروں میں سے چند نے لالی کو خوش آمدید کہا۔ چند کو لالی کی آمد ناگوار گزری، لیکن چند دنوں میں ہی انھوں نے لالی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ لالی زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ وقت پر اسے کھانا ملتا تھا۔ لیکن وہ بے دلی سے اتنا ہی کھاتا تھا کہ بس زندہ رہ سکے۔ اب اسے گزرا وقت یاد آتا تھا۔ آزاد فضاؤں میں پرواز کرنا۔ جب دل چاہے کھیتوں میں چلے جانا۔ دانہ دنکا چگ کر اپنے گھر لوٹنا۔ یہ مسرت اور خوشیوں بھری زندگی اب ماضی بن چکی تھی۔ اور جو حال تھا وہ غلامی کا دور تھا۔ اس نے مستقبل کے حوالے سے اپنے دل میں منصوبہ بندی کر لی تھی۔ وہ اس نئے گھر میں دل نہیں لگائے گا۔ چاہے جتنا بھی وقت گزر جائے قوتِ پرواز آتے ہی وہ اڑ جائے گا۔ اور اپنے گھر، اپنے وطن میں آزادی کے ساتھ زندگی گزارے گا۔ اپنے ساتھی کبوتروں کے ساتھ اس کا رویہ اجنبیوں والا ہی تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کے لیے اس کے دل میں

محبت پیدا ہو۔ لیکن دو بچے ایسے تھے جنہوں نے لالی کے دل میں اپنے لیے جگہ بنالی تھی۔

یہ بھولو اور بالی تھے۔ دونوں پرلے درجے کے بھوکے اور ندیدے تھے۔ جب لالی قید ہوا تھا تو وہ ابھی پچیس دن کے تھے۔ وہ بول بول کر ہر وقت اپنے بھوکے ہونے کا اعلان کرتے رہتے تھے۔ کبوتر باز دن میں دو بار اپنے کبوتروں کو کھانا دیتا تھا۔ بھولو اور بالی کے ماں باپ اپنے پوٹو میں دانہ اور پانی بھر کر پنجرے میں جاتے تھے اور اپنے بچوں کو چوغا دیتے تھے۔ اس دوران دونوں بچے ان پر حملہ کر دیتے تھے۔ ماں باپ گھبرا جاتے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو تو پیٹ بھر کھلا دیتے تھے، لیکن خود بھوکے رہ جاتے تھے۔ کیونکہ تب تک دوسرے کبوتر دانہ دنکا چٹ کر جاتے تھے۔ غلامی میں رہنے کی ایک سزا یہ بھی تھی ایک خاص حد سے زیادہ کبوتر باز انہیں خوراک نہیں دیتا تھا۔ کبوتر باز سمجھتا تھا کہ زیادہ کھانے سے اس کے کبوتر ست ہو جائیں گے۔ وقت گزر رہا تھا۔ بھولو اور بالی اب بڑے ہو گئے تھے۔ وہ لالی کے پکے دوست بن گئے تھے۔ لالی کے پر نکل آئے تھے۔ لیکن یہ پر ابھی کچے تھے۔ پروں کی جڑوں میں ابھی خون موجود تھا۔ آزادی کے حصول کے لیے لالی کو ابھی تھوڑا اور صبر کرنا تھا۔ لالی جب اداس ہوتا تھا تو بھولو اور بالی اس کے پاس آجاتے تھے۔ پھر لالی انہیں اپنی کہانی سناتا تھا۔ جس میں اس کے گھر کا ذکر ہوتا تھا۔ آزاد فضاؤں کا ذکر تھا۔ کھیتوں، باغوں، چشموں اور میدانوں کا ذکر تھا۔

”میں لوٹ جاؤں گا، میں اپنے گھر لوٹ جاؤں گا، مجھے آزادی چاہیے ...... آزادی ......“

”ہمیں بھی اپنے ساتھ لے جائیں ....“

ایک دن بھولو اور بالی نے لالی سے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ لالی نے چمکتی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ غلامی میں بھی آزادی کی شمع روشن کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ یہ روشنی بھولو اور بالی نے دیکھ لی تھی۔

”ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلیں ....ہم آزادی کو دیکھنا چاہتے ہیں ....ہم آزاد فضاؤں میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں ....“

”آزادی کے راستے پر میں تم دونوں کو خوش آمدید کہتا ہوں ......“ لالی کی آواز میں جوش تھا۔

”لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، آزادی حاصل کرنے سے زیادہ دشوار آزادی کو برقرار رکھنا ہے، کیا تم اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکو گے؟“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد لالی شرمندگی سے بولا:

”میں بھی اپنی آزادی کو برقرار نہیں رکھ پایا۔ کیونکہ میں نے پیٹ سے سوچا تھا۔ سوچنے کا کام دماغ کا ہے اور دماغ کبھی دھوکا نہیں دیتا۔ ہم تب ہی غلام ہوتے ہیں۔ جب ہمارے دل میں لالچ آتا ہے۔ اور ہم

پیٹ سے سوچنے لگتے ہیں اور پھر دانہ ڈالنے والا ہمیں غلام بنا لیتا ہے..........''

بھولو اور بالی کچھ سوچنے لگے۔ پھر بھولو نے لالی سے کہا: ''ہم آپ کی اس نصیحت کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔ لیکن ایک بات بتائیے۔ ہم اس پنجرے میں غلام ہیں۔ لیکن ہمارا مالک ہمیں دو وقت کھانا دیتا ہے۔ ہمیں بھوکا نہیں مرنے دیتا۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آزادی میں ہمیں دو وقت کا کھانا ملے گا.........'' بھولو کی اس بات پر لالی تڑپ اٹھا۔

''احمق.......... یہ کمزور ایمان کی نشانی ہے۔ ہمارا مالک اللہ ہے اور اللہ اپنی مخلوق کو بھوکا اٹھاتا ضرور ہے لیکن بھوکا سلاتا نہیں ہے، کھانا ملے گا اور پیٹ بھر ملے گا۔ کھیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے کھانے کا وافر انتظام کر رکھا ہے.....'' لالی درست کہہ رہا تھا۔ عظیم صوفی شاعر حضرت بابا بلھے شاہؒ کے چند پنجابی اشعار کا مطلب کچھ یوں ہے کہ پرندے اپنے لیے خوراک ذخیرہ نہیں کرتے صبح گھر سے بھوکے نکلتے ہیں اور پیٹ بھر کر واپس لوٹتے ہیں کبھی کسی نے کسی پرندے کو بھوک سے مرتے نہیں دیکھا ہے۔ لیکن انسان خوراک ذخیرہ کرتا ہے پھر بھی بھوکا مرتا ہے۔

لالی کو قید میں دو ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اب اس کے پروں میں اتنی طاقت آ گئی تھی کہ وہ طویل پرواز کر سکے۔ آزادی کے حصول کے لیے اس پرواز میں بھولو اور بالی بھی شامل تھے۔ یہ پنجرے میں ان کی آخری رات تھی۔ اگلی صبح کبوتر باز اپنے کبوتروں کو دانہ ڈالنے کے لیے چھت پر آیا۔ کبوتر بھوک کی وجہ سے پنجرے کی جالیوں سے ٹکرا رہے تھے۔ کبوتر باز نے چھت پر دانہ پھینکا اور پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ کبوتر دانے پر ٹوٹ پڑے۔ ایسے میں لالی بجلی کی سی تیزی سے باہر نکلا اور اڑ گیا۔ اس کے پیچھے بھولو اور بالی بھی تھے۔ دانہ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ان کا ارادہ کمزور پڑ گیا۔ پھر انہیں لالی کی یہ بات یاد آ گئی۔

''آزادی کے حصول سے زیادہ دشوار آزادی کو برقرار رکھنا ہے۔ اگر پیٹ سے سوچو گے تو کبھی آزادی حاصل نہیں کر پاؤ گے۔''

بھولو اور بالی بھی لالی کے پیچھے پرواز کر گئے۔ کبوتر باز چیختا ہی رہ گیا۔ وہ اس قابل نہیں تھا کہ اڑ کر تینوں کبوتروں کو پکڑ لے۔ ہوا کیا تھا، یہ بات کبوتر باز کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ تینوں آن کی آن میں بلند فضاؤں میں پہنچ گئے۔ لالی اپنے گھر کی طرف جانے والا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ پھر اسے راستے کی سمجھ آ گئی۔ اب وہ تینوں اسی سمت میں پرواز کر رہے تھے۔ خوشیوں اور مسرتوں بھری نئی زندگی ان کی منتظر تھی۔ اور گھر میں لالی کے

والدین اور بہن بھی لالی کے لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے اور اب انتظار ختم ہو رہا تھا۔ یہ آزاد کبوتروں کا ایک چھوٹا سا قبیلہ بن گیا تھا۔ ہر دن عید کا دن تھا اور ہر رات شب برات تھی۔ پھر کتنے ہی دن گزر گئے۔ بھولو اور بالی کے دل میں آزادی کے حوالے سے جو غلط فہمیاں تھیں وہ دُور ہو گئی تھیں۔ اب وہ خوش تھے کہ انھوں نے اچھا فیصلہ کیا تھا۔

موسم بدل رہا تھا۔ ایک دن آندھی چلی کالے بادلوں نے آسمان کو گھیر لیا۔ بارش مسلسل تین دنوں تک برستی رہی۔ آزاد کبوتروں کا یہ غول اپنے گھر میں محصور ہو کر رہ گیا۔ اب صرف پانی پر گزارا تھا۔ لالی اور اس کے اہل خانہ اس بدلتی موسمی صورت حال کے عادی تھے۔ لیکن بھولو اور بالی کے لیے یہ معاملہ تکلیف دہ تھا۔ انہیں بھوک تڑپا رہی تھی۔ تیسری رات بادل پھٹ گئے۔ آسمان پر ستارے ٹمٹمانے لگے تو لالی خوش ہو کر بولا:

''بس ایک رات کا انتظار اور ہے، صبح ہمیں ہمارے نصیب کا رزق ضرور ملے گا......''

پھر نئے دن کا آغاز ہوا۔ سب مختلف سمتوں میں رزق کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ بھولو، بالی اور لالی ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ وہ تینوں ایک کھیت میں موجود درخت پر آ بیٹھے تھے۔ ایسے میں بھولو خوشی سے بولا:

''وہ دیکھو...........خوراک...........'' لالی اور بالی نے دیکھا۔ ایک جگہ پر دانہ بکھرا ہوا تھا۔ یہ دانہ گندم چنے اور باجرے پر مشتمل تھا۔ بالی اور بھولو اپنے پر سمیٹنے لگے۔ وہ خوراک پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ ایسے میں لالی بول پڑا:

''احمقو! تم پیٹ سے سوچ رہے ہو۔ ذرا غور کرو۔ سارا دانہ ایک مخصوص جگہ پر موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی شکاری نے جال بچھا رکھا ہو۔''

''ہم احمق نہیں ہیں، حماقت والی باتیں تو آپ کر رہے ہیں یہاں ہمیں کوئی جال نظر نہیں آ رہا۔''

بھولو اور بالی فضا میں بلند ہوئے۔

''رک جاؤ...........غلامی کے بعد دوبارہ آزادی کے لیے طویل انتظار کرنا پڑتا ہے۔ میری بات مان لو، رک جاؤ۔''

لالی شور مچاتا ہی رہ گیا۔ بھولو اور بالی نے دانے پر حملہ کر دیا تھا۔ ان کے پیٹ کی آگ بجھ رہی تھی اور سکون مل رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ خوش ہو رہے تھے کہ لالی ہمیں فضول میں ڈرا رہا تھا۔ یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اچھی طرح پیٹ بھرنے کے بعد انھوں نے پرواز کرنے کے لیے پر پھیلائے انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے

زمین نے ان کے قدموں کو پکڑ لیا ہو۔ وہ گھبرا گئے۔ پرواز کے لیے وہ پھڑ پھڑانے لگے۔ لیکن وہ جتنا زور لگاتے تھے۔ اتنا ہی پھنستے چلے جاتے تھے۔ وہ شکاری کے بچھائے جال میں قید ہو چکے تھے۔ لالی ان کے اوپر آزاد فضاؤں میں پرواز کر رہا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کی مدد کرنے کے قابل نہیں تھا۔ لیکن اس کا دل رنجیدہ تھا۔ اتنے میں انہیں دور سے شکاری آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں پنجرہ موجود تھا۔

''میں نے کہا تھا جو پیٹ سے سوچتے ہیں غلامی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ افسوس تم لوگوں نے آزادی تو حاصل کر لی لیکن اسے برقرار نہیں رکھ پائے ....''

لالی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ شکاری نے جال کے قریب پہنچ کر بھولو اور بالی کو پکڑ کر پنجرے میں قید کر لیا۔ وہ دونوں بھی رو رہے تھے۔ لالی نے آواز لگائی:

''میں تمہارا انتظار کروں گا ....''

لالی جانتا تھا۔ بھولو اور بالی آزادی کی قدر کو جان چکے ہیں۔ چاہے جتنا بھی وقت لگ جائے۔ قوت پرواز آتے ہی وہ آزادی کے حصول کے لیے کوشش کریں گے۔ اور پھر واپس لوٹ آئیں گے۔ غلامی سے آزادی اور آزادی سے غلامی تک کا یہ سفر ان دونوں کو یہ شعور ضرور دے گیا کہ پیٹ سے سوچنے والوں کا مقدر غلامی ہے۔ صرف اور صرف غلامی۔

☆☆☆☆

علی عمران ممتاز

جاگو اور جگاؤ

گاؤں کوٹ عباس کے لوگ اپنے گھروں کو تالے لگا کر نامعلوم منزل کی طرف رواں تھے۔ اس کے پاس لے جانے کے لیے کچھ خاص سامان نہ تھا بس پہننے کے لیے کپڑے، جمع پونجی اور جانور۔ گاؤں کے لوگ اپنے خاندان کے ساتھ ٹولیوں کی شکل میں اکٹھے ہی نکل رہے تھے۔ ہر طرف عجیب افراتفری تھی، کوئی بھینسوں کو رسی باندھے لے جا رہا تھا تو کوئی بکریوں کو۔ اکثر افراد گھر میں پڑی چارپائیاں اپنے سروں پر لادے جا رہے تھے۔

گاؤں کوٹ عباس میں ایسی افراتفری اور بھاگ دوڑ پہلی دفعہ ہی نظر آئی۔ گاؤں میں موجود قبرستان کے ساتھ ایک کچا مکان تھا جس میں اماں تاج اپنے بیٹے فرید حسین اور پوتی رابعہ کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ بھی اپنا ضروری سامان ایک پوٹلی میں باندھے اپنے بیٹے اور پوتی رابعہ کے ساتھ گھر سے باہر آئی۔ اماں! میری تختی اندر رہ گئی ہے۔ ۹ سالہ رابعہ نے اماں تاج سے کہا۔

”پتر! تختی ہم نئی لے لیں گے۔ جلدی سے یہاں سے چلو۔“ اماں نے اسے جواب دیا اور اس کا ہاتھ تھامے کوٹ عباس کی مین سڑک کی طرف چل دی۔ فرید حسین کپڑوں کی پوٹلی اٹھائے ساتھ ساتھ تیزی سے چل رہا تھا۔

اماں نے ایک نظر اپنے گھر پر ڈالی اور پھر کوٹ عباس کے دوسرے گھروں پر بھی اپنی نظریں جما لیں۔ ایک صاف شفاف ہیرے کی طرح موٹا موٹا آنسو اماں کی آنکھ سے نکلا۔ انہوں نے اپنے دوپٹے سے آنسو صاف کیا۔ دوسرے ہی لمحے اماں تاج کی آنکھوں میں ماضی کے ایسے واقعات نے انگڑائی لی جنہیں یاد کرتے ہی اماں تاج پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

انہیں یاد آ رہا تھا جب 63 سال پہلے وہ ہوشیار پور میں رہتی تھیں۔ اُس وقت ان کی عمر 7 سال تھی۔ جب انہیں ان کے ابا فضل حسین نے کہا تھا کہ ہم ہوشیار پور چھوڑ کر ایک نئے آزاد وطن پاکستان میں جا رہے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کو شہید کر رہے ہیں۔ آج رات ہم یہ گھر چھوڑ کر پاکستان جانے کے لیے ہجرت کریں

گے۔ آزاد وطن کی آزاد فضاؤں میں سکھ چین سے رہیں گے۔

اماں تاج اپنے ابا کی باتیں سُن کر سوچ رہی تھی کہ یہ گھر ہم چھوڑ جائیں گے اور پھر رات کے تقریباً 2 بجے جب پورے علاقے کے ہندو نیند کی وادی میں کھو گئے تو فضل عباس اپنی بیٹی تاج اور بیوی کے ساتھ ایک پوٹلی میں ضروری سامان باندھ کر دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ہوشیار پور کو خیر آباد کہہ کر پاکستان کی سرحد کی طرف گامزن ہو گئے۔

صبح تقریباً 7 بجے اماں تاج نے اتنے سارے مسلمانوں کے ساتھ خود کو دیکھا جنہوں نے ضروری سامان اٹھایا ہوا تھا کیونکہ رات کے اندھیرے میں جب ابا ہوشیار پور سے نکلے تھے اس وقت تاج سو رہی تھی۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو ایسا منظر اس نے دیکھا۔

اماں کہاں کھو گئی ہو؟ فرید حسین نے اماں کو آواز دی جو اپنے گاؤں کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑی تھی۔ اماں کو ہوش آیا تو کہنے لگیں پتر! گاؤں پر ایک نظر ڈالی تھی تو 63 سال پہلے کا وقت یاد آ گیا جب ہم نے ہوشیار پور سے پاکستان کے لیے ہجرت کی تھی اور آج پھر ہم ہجرت کر کے ایک نامعلوم منزل کی طرف جا رہے ہیں۔

اماں اگر ہم یہاں رہے تو غرق ہو جائیں گے۔ یہاں سے جانا ضروری ہے، جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو واپس آ جائیں گے۔ فرید حسین نے اماں کو دلاسہ دیا اور گاؤں کی مین سڑک کی طرف چل دیے۔

بات دراصل کچھ یوں تھی کہ ملک بھر میں بارشوں کی وجہ سے سیلاب آ گیا تھا جو پنجاب سے ہوتا ہوا خیبر پختون خواہ، سندھ اور پھر بلوچستان میں داخل ہو گیا تھا۔ سیلابی پانی نے ملک بھر میں تباہی مچا دی تھی۔ فصلیں، باغات، مویشی سب کے سب اس سیلاب کی نذر ہو گئے تھے۔ پاکستان کے تقریباً سوائے چند شہروں کے سب شہر سیلاب سے متاثر ہوئے تھے۔ سیلابی ریلہ بہت تیزی سے ایک شہر میں تباہی پھیلاتے ہوئے دوسرے شہر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مکانات گر گئے تھے۔ لوگ بے گھر ہو گئے، خوراک کی کمی ہو گئی یہاں تک کہ خوراک نہ ہونے اور وبائی امراض پھوٹنے کی وجہ سے لوگ مر رہے تھے۔

کوٹ عباس بہت سر سبز و شاداب گاؤں تھا۔ گاؤں والے خوشحالی سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب سیلابی ریلہ کوٹ عباس کی طرف بڑھا تو حکومت نے گاؤں خالی کرنے کا اعلان کر دیا۔ اعلان سنتے ہی کوٹ عباس کے لوگ اپنا ضروری سامان اُٹھائے گاؤں سے نامعلوم منزل کی طرف ہجرت کرنے لگے۔

سیلابی ریلہ اعلان کے پانچ گھنٹوں کے بعد کوٹ عباس میں تباہی پھیلانے کے لیے آ رہا تھا اور پانچ

گھنٹوں میں گاؤں خالی ہوگیا۔ آخر میں اماں تاج، اس کا بیٹا اور پوتی رہ گئے تھے۔ اماں تاج اور اس کا بیٹا اپنی رابعہ کے ساتھ گاؤں کی مین سڑک پر پیدل چل رہے تھے۔ کوئی ایسی سواری نہیں تھی جو انہیں گاؤں سے جلد از جلد دور لے جاتی۔ سڑک پر چلتے چلتے انہیں دور سے فوجیوں کی ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔

گاڑی ان کے قریب آ کر رکی، ایک فوجی نوجوان نے انہیں کہا آپ گاڑی میں بیٹھیں پانی گاؤں میں داخل ہونا شروع ہوگیا ہے۔ ہم یہاں اس لیے آئے ہیں کہ کوئی یہاں رہ نہ گیا ہو، اسے لے جائیں۔

اماں، اس کا بیٹا اور رابعہ فوجیوں کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی واپس مڑی اور تیزی سے دوسرے شہر کی طرف روانہ ہوگئی۔ کوٹ عباس میں پانی تیزی سے داخل ہوا اور تمام مکانوں کو گراتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔

……

ایک زوردار تھپڑ کاشان کے چہرے پر پڑا تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ ''یہ رقم تم نے کہاں سے لی ہے؟''

یہ جملہ اس کے کانوں سے ٹکرایا لیکن وہ خاموشی سے سر جھکائے ہچکیاں لیے روئے جا رہا تھا جبکہ اس کے سامنے اس کی امی کھڑی غصے سے اس سے پوچھ رہی تھیں کہ اتنی ساری رقم کہاں سے لی ہے مگر وہ کچھ بولے بغیر صرف روئے جا رہا تھا۔ آخر تھک ہار کر امی بولیں ''پچھلے مہینے تم نے اپنے ہم جماعت اسد کے پیسے چرائے تھے، لگتا ہے اس بار تم نے کسی کی تجوری میں ہاتھ ڈالا ہے۔ تمہارے ابو کو آ لینے دو وہ تمہاری خبر لیں گے۔''

''امی …… یہ …… یہ پیسے …… مم …… مم …… میں نے'' ''بس اب مجھے کچھ نہیں سننا۔ کاشان نے کچھ بولنا چاہا مگر امی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے غصے میں اپنا فیصلہ سنایا اور کاشان کے ہاتھوں سے رقم لے کر کمرے کی طرف بڑھ گئیں جبکہ کاشان انہیں یوں غصے سے جاتے ہوئے صرف دیکھتا رہ گیا۔

بات کچھ اس طرح تھی کہ کاشان سکول سے گھر آیا تو اس کے پاس بہت سی رقم تھی جو تقریباً 9 ہزار روپے تھی۔ امی نے دیکھے تو اسے تھپڑ مارا۔ ان کے ذہن میں تھا کہ اس نے یہ رقم کہیں سے چرائی ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی اس نے اپنے ہم جماعت اسد کے بیگ سے اس کے تین سو روپے چوری کیے تھے جو اس نے مطالعۂ پاکستان کی کتاب میں رکھے تھے۔ آج کاشان کے پاس اتنی بڑی رقم دیکھ کر ان کا غصہ ڈبل ہوگیا۔ اس سے اصل وجہ پوچھی نہیں اور غصہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

کاشان نے دل میں طے کر لیا تھا کہ اب تو وہ امی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ رات کو ابو آفس سے گھر آئے۔

افطاری کے بعد کھانے کی میز پر امی نے ساری بات کہہ ڈالی۔ ابو کو بھی غصہ آ گیا۔ انھوں نے بھی تفتیش کیے بغیر اسے ڈانٹ دیا۔

……

اگلے دن صبح کاشان اپنے ابو کے ساتھ سکول کے پرنسپل صاحب کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کے ابو نے پرنسپل صاحب کو نو ہزار کی رقم دیتے ہوئے ساری بات بتائی اور کہا اس سے پوچھیں یہ رقم اس نے کہاں سے لی ہے؟ پرنسپل صاحب نے ایک نظر دونوں باپ بیٹے کو دیکھا اور مسکرانے لگے۔ مسکراتے ہوئے بولے کل چھٹی کے بعد کاشان کی مس عائشہ نے مجھے بتایا کہ سکول کے تمام بچوں نے یہاں تک کہ ٹیچرز نے اپنی طرف سے سیلاب زدگان کے لیے چندا اکٹھا کیا تھا۔ یہ سوچ چونکہ کاشان کو آئی تھی اس لیے اسے ہی رقم اپنے پاس جمع کرنے کا کہا گیا اور یوں پورے سکول سے نو ہزار روپے اکٹھے ہوئے۔ سکول کے تمام طلبہ و اساتذہ نے دس دس روپے کاشان کے پاس جمع کرائے تھے۔ سکول میں طلبہ کی تعداد کے مطابق اتنی رقم اکٹھی ہوئی تھی۔

یہ کہہ کر پرنسپل صاحب خاموش ہوئے اور چند لمحے بعد اپنی جیب سے ہزار روپے نکال کر کاشان کو دیتے ہوئے بولے یہ میری طرف سے ہمارے سیلاب متاثرین کے لیے۔

کاشان کے ابو اندر ہی اندر شرمندہ ہو رہے تھے اور خوش بھی تھے کہ کاشان نے اپنے پاکستانی افراد کے لیے چندہ اکٹھا کیا ہے۔ انہوں نے بھی کاشان کو 2 ہزار روپے دیے۔ کاشان خوش تھا کہ اس پر سے لگا چوری کا الزام دھل چکا تھا بس ایک آخری الزام تھا اسد کے بیگ سے تین سو روپے کا غائب ہونا اور کاشان کے بیگ سے نکلنا۔ کاشان نے صبر کا دامن تھامتے ہوئے اپنے آپ سے کہا، میں سچا ہوں۔ آج نہیں تو کل یہ الزام بھی ہٹ جائے گا۔

کاشان کے سکول سے کچھ فاصلے پر ایک پارک تھا، جہاں سیلاب کے متاثرین نے خیمہ بستی بنائی تھی۔ یہ خیمے انہیں حکومت پاکستان کی طرف سے ملے تھے۔ اگلے دن صبح کاشان اپنے ابو اور سکول پرنسپل کے ساتھ اس خیمہ بستی میں گیا جہاں تقریباً 15 خیمے لگے تھے اور متاثرین رہائش اختیار کیے ہوئے تھے۔ تمام خیموں میں اس نے جمع کی گئی رقم تقسیم کر دی۔ آخری خیمے میں جب وہ لوگ داخل ہوئے تو ان کے پاس رقم صرف 500 روپے بچی تھی۔

اس خیمے میں اماں تاج، فرید حسین اور رابعہ تھے۔ انہیں پانچ سو روپے دینے کے بعد کاشان کے پرنسپل

نے اماں تاج سے پوچھا: آپ کہاں سے آئے ہیں؟ ہم کوٹ عباس کے رہنے والے ہیں۔ یہ میری اماں اور یہ 9 سالہ رابعہ میری بیٹی ہے۔ فرید حسین نے اپنا تعارف کروایا۔

اللہ کرم کرے گا۔ آپ لوگ پریشان مت ہونا ہم آپ کے مسلمان بھائی ابھی زندہ ہیں۔ ہم سے جو ہو سکا آپ لوگوں کے لیے کرتے رہیں گے۔ ابو نے فرید حسین کو تسلی دی اور تینوں سلام کر کے خیمے سے باہر نکلنے لگے تو ان کے کانوں سے معصوم رابعہ کی آواز ٹکرائی اماں ان پیسوں سے مجھے نئی تختی خرید دو گی ناں۔ کاشان نے مڑ کر معصوم رابعہ پر ایک نظر ڈالی اور یہ سوچ کر خیمے سے باہر آ گیا کہ صبح رابعہ کو تختی خرید کر دوں گا۔ کاشان اپنے سکول میں گرا ہوا مقام بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا جبکہ اسد اس کی یوں عزت افزائی دیکھ کر جل بھن سا گیا۔

کاشان اور اسد دسویں جماعت کے طالب علم تھے اور ایک ہی جماعت میں ایک ہی ڈیسک پر بیٹھتے تھے۔ اسد نالائق جبکہ کاشان لائق۔ اس نے کاشان کو بے عزت کرنے کے لیے اس کے بیگ میں تین سو روپے ڈال دیے تھے اور اس پر چوری کا الزام لگا دیا تھا۔ وقتی طور پر تو مس عائشہ اور اس کے گھر والے اس کی اس حرکت پر ناراض تھے لیکن جب سیلاب متاثرین کے لیے اس نے چندہ اکٹھا کیا تو سب اس سے خوش ہو گئے۔

اسد نے سوچا میں بھی سیلاب متاثرین کے لیے امداد اکٹھی کرتا ہوں اور ان لوگوں میں تقسیم کروں گا۔ یوں ہر کوئی میری تعریف کرے گا۔ اس مقصد کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسد نے اپنی کالونی کے 4 لڑکوں کو جمع کیا جو اس کے دوست تھے اور شرارتی ٹولہ بھی۔ اسد نے جب انہیں اپنا مقصد بتایا تو وہ مان گئے۔ بس پھر کیا تھا انہوں نے امداد اکٹھی کرنے کی مہم کا آغاز کر دیا۔

……………………

اگلی صبح سکول جانے سے پہلے کاشان خیمہ بستی میں اماں تاج کے خیمے میں گیا۔ اس کے پاس ایک تختی، قلم اور دوات تھی۔ وہ اس نے رابعہ کو دی۔ رابعہ نے خوشی سے تمام چیزیں لے لیں۔ اماں تاج نے کاشان کو ڈھیروں دعائیں دیں۔ کاشان نے جاتے ہوئے اماں سے کہا عید قریب ہے۔ عید کے کپڑے مَیں تین دن تک دے جاؤں گا۔

پُتر! کیا اب ہم عید منائیں؟ ہمارے تو گھر ہی اُجڑ گئے۔ اماں نے غمزدہ لہجے میں کہا۔ نہیں اماں ایسا نہ کہیں یہ پاکستان ہی ہمارا گھر ہے ہم سب لوگ اس گھر کے باسی ہیں۔ یہ تو ہمارا امتحان ہے۔ اللہ پاک ہمیں آزما رہا ہے۔ ایک نہ ایک دن تمام آزمائشیں ختم ہوں گی۔ آپ غمگین نہ ہوں۔ کاشان نے ایک ہی سانس میں

کئی دلاسے بھری باتیں کہہ دیں۔

پتر! اللہ تعالیٰ تجھے خوش رکھے ہمارے پاکستان کا ہر فرد تمہارے جیسی سوچ رکھے تو مجھے امید ہے ہم ہر آزمائش، ہر مصیبت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اماں نے دعائیں دیتے ہوئے پرجوش لہجے میں کاشان کی بات کا جواب دیا۔ کاشان مسکراتا ہوا اجازت لے کر خیمے سے باہر آ گیا۔ کسی خیمے میں ریڈیو کے چلنے کی آواز آ رہی تھی جس پر یہ گانا چل رہا تھا:

موج بڑھے یا آندھی آئے، دیا جلائے رکھنا ہے
اس گھر کی خاطر سو دُکھ جھیلیں، گھر تو آخر اپنا ہے

اسد نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر تین دن میں کافی چندا اکٹھا کر لیا تھا۔ انہوں نے امدادی رقم گنتی کی تو پورے تیس ہزار روپے دو سو پچاس روپے تھے۔ اسد اور اس کے دوست بہت خوش تھے لیکن شیطان ان کے دلوں پر قبضہ جما چکا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا کہ ہم پانچ دیگیں چاولوں کی پکوا کر رات کا کھانا خیمہ بستی کے رہنے والوں کو دیں گے۔ باقی رقم پانچوں دوست آپس میں بانٹ لیں گے۔ کسی کو کیا پتہ چلے گا؟ گھر والے پوچھیں گے تو بتا دیں گے کہ تمام رقم متاثرین کو دے دی ہے۔ دیگیں کہاں سے پکوائیں؟ اسد نے دوست سے سوال کیا۔

میرا ایک جاننے والا ہے، وہ دیگیں پکی پکائی دیتا ہے۔ کالو پکویا نام ہے اس کا۔ اسد کے ایک دوست دانش نے اپنے ایک جاننے والے کے بارے میں بتایا۔ تو ٹھیک ہے اسی کے پاس چلتے ہیں، اسد نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ دانش، اسد اور دوسرے دوستوں کو لے کر “کالو پکویا” کے ڈیرے پر لے گیا جو اِن کے گھر سے تقریباً آدھے گھنٹے کے فاصلے پر واقع کچی بستی میں تھا۔ کالو پکویا کی شکل عجیب و غریب قسم کی تھی۔ اسد دیکھ کر ڈر گیا لیکن دل کو تسلی دی اتنا بھی خوفناک نہیں ہے۔ دانش نے اسے ساری بات بتائی۔ کالو پکویا بولا آپ لوگ فکر نہ کرو۔ افطاری سے پہلے شام 6 بجے تک آ کر پانچ دیگیں بریانی لے جانا اور یہ کہ آپ لوگوں کو ان کے کچھ بھی پیسے ادا نہیں کرنے ہوں گے وہ میری طرف سے سیلاب متاثرین کے لیے امداد ہوں گی۔ اسد یہ سن کر خوش ہو گیا۔ پانچوں دوست کالو پکویا سے اجازت لے کر واپس چلے گئے۔ افطاری سے پہلے انہوں نے کالو پکویا سے بریانی کی دیگیں اُٹھائیں اور خیمہ بستی میں لے گئے۔ خیمہ بستی والوں کو دیگیں دیں اور کہا کہ صبح آ کر خالی دیگیں لے جائیں گے۔

بریانی کی خوشبو چہار سو پھیل گئی تھی اور خیمہ بستی کے رہنے والوں نے باہمی اتفاق سے بریانی ایک

دوسرے کو تقسیم کی اور سب نے افطاری کے بعد خوب سیر ہو کر کھائی۔

صبح سحری کے بعد کاشان خیمہ بستی میں چلا گیا۔ آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ رابعہ سے تختی پر املا لکھوائے۔ یہ سوچ کر وہ خیمہ بستی گیا۔ وہاں پولیس آئی ہوئی تھی اور کچھ ایمبولینسیں بھی۔ کاشان نے دل میں سوچا، لگتا ہے کچھ گڑبڑ ہے۔ یہ سوچ کر وہ خیمہ بستی میں داخل ہو گیا۔ معلومات لینے پر اسے پتہ چلا کہ رات کو انہوں نے بریانی کھائی تھی جس کی وجہ سے خیمہ بستی میں رہنے والے سب لوگ بے ہوش ہو گئے تھے۔ بریانی میں نشہ آور دوائی ملائی گئی تھی۔ جن دیگوں میں بریانی آئی تھی انہیں قبضے میں کر لیا گیا تھا۔

پولیس تفتیش کر رہی تھی اس سے بری خبر یہ تھی کہ خیموں میں رہنے والوں کے بچے بھی غائب تھے، انہیں اغوا کر لیا گیا تھا۔

کاشان جلدی سے اماں تاج کے خیمے میں گیا۔ اماں تاج رو رہی تھی، ان کا بیٹا فرید حسین بھی غمگین تھا۔ انہوں نے کاشان کو بتایا کہ رابعہ کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ کاشان بھی تمام صورتحال دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس کی نظر خیمے کے ایک کونے میں پڑی تختی پر پڑی جس پر رابعہ کے ہاتھوں سے یہ جملہ لکھا ہوا تھا کہ ’’اے اللہ میرے پیارے پاکستان کو مصیبتوں سے نکال‘‘ جملہ پڑھ کر اس کا دل بھر آیا اور وہ سوچنے لگا، ہمارا ملک سیلاب کی وجہ سے تباہی و بربادی کے دہانے پر ہے۔ لاکھوں افراد بے گھر ہو گئے، اس کے باوجود بھی ہمارے ملک میں ایسے افراد ہیں جو ان بے گھر افراد کی پریشانیوں سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ بجائے ان کی مدد کے ان کی مشکلات میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اگر یہ آفت ان شرپسند افراد کے گھروں پر آتی تو وہ کیا کرتے؟

یہ وہ باتیں تھیں جو کاشان سوچ کر رونے لگا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ ضرور ان افراد کو بے نقاب کرے گا جو مصیبت زدہ لوگوں کی مجبوریوں کو نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگ بے حس ہوتے ہیں اور مسلمان تو بے حس نہیں ہوتا۔

……

اسد اپنے دوستوں کے ساتھ صبح سات بجے ہی خیمہ بستی پہنچ گیا تاکہ دیگیں اُٹھا کر وہ ساتھ لے جائے اور کالو پکویا کو دے آئے لیکن وہاں کی صورتحال نے تو انہیں اور بھی چونکا دیا۔ اب تو اسد کو جان کے لالے پڑ گئے۔ اس نے اور اس کے دوستوں نے واپس جانے میں عافیت سمجھی۔ وہ جیسے ہی واپس جانے کے لیے مُڑے ایک آواز اسد کے کانوں سے ٹکرائی ’’اسد کہاں جا رہے ہو؟‘‘

اس نے گھبرا کر پیچھے مُڑ کر دیکھا، سامنے کاشان تھا۔ ’’مم……مم……میں گھر جا رہا تھا‘‘ اسد نے

گھبراہٹ آمیز لہجے میں جواب دیا۔ سمجھ نہیں آ رہی ہمارے ملک کے بے حس لوگوں نے یہ سب کیسے کر دیا۔ کاشان نے افسردہ لہجے میں اسد سے کہا۔

”جج...... جی...... انہیں ایسا...... نہیں...... کر...... کرنا...... چاہیے تھا۔“ اسد نے اٹکتے ہوئے کاشان کی بات کی تائید کی۔

اس کے باقی چار دوست تو رفوچکر ہو گئے تھے کہ کہیں انھیں کوئی دیکھ کر پہچان نہ لے۔ اسد شرمندہ بھی تھا اور اس کا ضمیر صورتحال دیکھ کر جاگ اُٹھا تھا۔ اس نے کاشان کو ساری بات تفصیل سے بتانے کا عزم کیا اور اسے اپنے ساتھ ویران جگہ لے گیا اور ساری بات کاشان کو بتا دی۔ کاشان کو دکھ تو ہوا لیکن اس کے راہ راست پر آ جانے کی وجہ سے خوش بھی تھا۔ اب مسئلہ تھا کالو پکویا کو پکڑوانے کا۔ دونوں دوست پولیس اسٹیشن گئے اور انسپکٹر کامران کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔ انسپکٹر کامران نے اسد سے کہا ”تمہارا کوئی قصور نہیں ہے تم نے صرف امداد کے طور پر کالو پکویا سے دیگیں اُٹھائی تھیں لیکن اب وہ کالو پکویا بچ نہیں پائے گا۔“ جی انسپکٹر صاحب ایسے لوگوں کو کڑی سزا دی جائے اور لوٹ مار کے اس بازار کو ہم سب نے مل کر ہی جڑ سے اُکھاڑنا ہے۔ کاشان نے پُرعزم لہجے میں انسپکٹر کامران سے کہا تو انسپکٹر کامران بولے آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

انسپکٹر صاحب جلدی کریں کالو پکویا کے گھر چھاپہ ماریں کہیں وہ فرار نہ ہو جائے۔ اب کی بار اسد نے فکرآمیز لہجے میں کہا۔ ہم نے جلد از جلد کالو پکویا کو پکڑنا ہے۔ انسپکٹر کامران نے اسد کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے مکمل منصوبہ بھی بنا لیا تھا اور اس منصوبے کے تحت جس راستے سے یہ لوگ گزرے تھے چیک پوسٹیں لگا دیں۔

کالو پکویا کے گھر کو انہوں نے چاروں اطراف سے گھیر لیا۔ انسپکٹر کامران نے اس کے گھر میں جا کر اُسے گرفتار کر لیا۔ کالو پکویا پوچھتا رہا میرا قصور کیا ہے؟ مگر انسپکٹر کامران نے اسے کچھ نہ بتایا۔ تھانے پہنچ کر انسپکٹر کامران نے اسے اس کا قصور بتایا اور گواہ کے طور پر اسد کو سامنے کیا۔ کالو نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اسد نے اپنے دوسرے دوستوں کو بھی بلا لیا انھوں نے بھی کالو پکویا کا بتایا کہ انہوں نے اس سے دیگیں لی تھیں مگر کالو پکویا بضد تھا اور پانچوں دوستوں کو پہچاننے سے انکار کر رہا تھا۔

انسپکٹر نے اس کا حل یہ نکالا کہ کالو پکویا پر تشدد کر کے اس سے سچ بات اگلوائی جائے تو اس نے سب سچ بتا دیا۔ اس نے بتایا کہ دیگوں میں نشہ آور اشیا میں نے ملائی تھی۔ میرا تعلق ایسے گروہ سے ہے جو بچوں کو

اغوا کر کے انہیں دوسرے ممالک فروخت کرتا ہے جہاں بچوں کو اونٹ ریس میں شامل کیا جاتا ہے۔

انسپکٹر کامران نے کالو پکویا کی نشاندہی پر تمام گروہ کو گرفتار کرلیا اور اغوا کیے گئے بچے آزاد کروا لیے۔ رابعہ بھی اب آزاد تھی۔ اسد نے کاشان کو وہ رقم دے دی جو انہوں نے امداد کے لیے اکٹھی کی تھی اور غبن کر کے اپنی خرچے کے لیے رکھ لی تھی۔

…… ……………… ……

ماہ رمضان گزر چکا تھا۔ صبح عیدالفطر منائی جانی تھی لیکن مسلمان پاکستانیوں کے لیے یہ عید افسردگی میں گزرنی تھی۔ حکومت نے اعلان کیا تھا کہ یہ عید اِن افراد کے سوگ میں جو سیلاب میں ہلاک ہو گئے تھے، سادگی سے منائی جائے۔ اسد اور کاشان دونوں ایک ہی مسجد میں نمازِ عید ادا کرنے گئے۔ مولوی صاحب نے نمازِ عید سے پہلے اپنے بیان میں کہا: حالیہ آنے والی آفت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم صبح کے وقت باقاعدگی سے نماز اور قرآن پڑھنا بھول گئے ہیں۔ صحت یاب ہوں تو اللہ تعالیٰ کو یاد نہیں کرتے، کام میں ہوں تو نماز بھول جاتے ہیں۔ دوسرے کی برائی کریں تو انجام بھول جاتے ہیں۔ حیا نام کی چیز ہم میں نہیں رہی، کوئی بھی کام شروع کریں تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا بھول جاتے ہیں، سوتے وقت توبہ کرنا بھول جاتے ہیں، غصے میں ہوں تو صبر کرنا بھول جاتے ہیں، سفر میں ہوں تو دعائیں بھول جاتے ہیں جو ہمیں کبھی نہیں بھولا اسی رب کو ہم ہر موقع پر بھول جاتے ہیں۔ اگر ہم اپنی اصلاح کرلیں اور اپنی زندگی اصلاحی اصولوں کے مطابق گزاریں تو ہم ہر آفت سے بچ سکتے ہیں۔

کاشان اور اسد کو مولوی صاحب کا بیان بہت اچھا لگا۔ انہوں نے عہد کیا کہ خود بھی نیک بنیں گے اور دوسروں کو بھی اچھائی کی تقلید کریں گے۔ اب کاشان اور اسد ایک دوسرے کے دشمن نہیں بلکہ اچھے دوست تھے۔

☆☆☆☆

غلام محی الدین ترک

روشنی

رات کو گاؤں میں ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سب لوگ میٹھی نیند سو رہے تھے مگر ایک گھر ایسا بھی تھا جہاں ہلکی ہلکی روشنی باہر آ رہی تھی۔ یہ روشنی ایک موم بتی کی تھی، جس کی روشنی میں امجد اپنا سبق یاد کر رہا تھا۔ کل اس کا امتحان تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ سارا سال اپنی پڑھائی سے غافل رہا تھا۔ امتحان کے وقت اسے کچھ ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا کہ وہ مجبوراً موم بتی کی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔ امجد میٹرک کا طالب علم تھا۔ دو ہفتے قبل اس کے والد بیمار ہوئے تو اسے اپنے کھیتوں کی دیکھ بھال کرنا پڑ گئی۔ وہ فارغ اوقات میں اپنے بابا کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا اس وجہ سے اسے کھیتوں میں کام کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی مگر کھیتوں میں کام کرنے کی وجہ سے اس کی اسکول سے چھٹیاں ہو رہی تھیں۔ وہ تو ماسٹر کرم دین اچھے تھے جو شام کے وقت اسے پڑھا دیا کرتے تھے تا کہ اس کی پڑھائی کا کوئی حرج نہ ہو۔ انہیں امجد اور اسکول میں پڑھنے والے دوسرے طالب علموں سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ بچے پڑھ لکھ کر گاؤں سے جہالت کا اندھیرا دور کریں گے اور پھر گاؤں علم کی روشنی سے جگمگا جائے گا۔ امجد ماسٹر جی کے خوابوں کی تعبیر بننا چاہتا تھا۔

امجد کو موم بتی کی روشنی میں سبق یاد کرتے ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ سردی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ہوا چلنے کی وجہ سے موم بتی کی روشنی بار بار دھیمی ہو رہی تھی اور امجد کو بار بار اس کے گرد ہاتھ رکھنا پڑ رہے تھے تا کہ وہ بجھ نہ جائے۔ یکا یک ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا، موم بتی کی روشنی پھر دھیمی ہوئی۔ امجد نے بے چین نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ کم بھی ہو رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کی بے چینی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر فکر کی ایک لہر نمودار ہوئی۔

”یا اللہ میرے پاس یہی موم بتی ہے۔ یا اللہ تو میری مدد فرما۔“ اس نے دعا مانگی اور دوبارہ پڑھائی میں مشغول ہو گیا۔ اس کی یہ دعا موم بتی بھی سن رہی تھی۔

”امجد کو میرے جلنے کی کتنی فکر ہے۔ میں تو یہی سمجھ رہی تھی کہ مجھ حقیر چیز کی کوئی قدر نہیں۔ لوگوں کو میری کوئی فکر نہیں، بس ادھر مجھے استعمال کیا اور اُدھر میری موم پھینک دی۔“ پھر اسے وہ سرگوشی یاد آئی جب وہ اور اس کی ساتھی موم بتیاں ایک کارخانے میں تیار ہو رہی تھیں۔ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد جب وہ مکمل

تیار ہوگئیں اور ان کی رخصتی کا وقت قریب آیا تو اچانک انہوں نے سرگوشی سنی۔ کارخانے سے رخصت ہوتے وقت ہر موم بتی یہ سرگوشی ضرور سنتی تھی۔ ان سب نے سنا۔

”تم سب اب جا رہی ہو۔ انسان تمہیں جلائے گا، وہ آگ سے بہت ڈرتا ہے مگر تمہیں اس وجہ سے جلائے گا تاکہ وہ تم سے فائدہ اٹھا سکے۔ یاد رکھو! جب تمہیں یہ معلوم ہو کہ تمہیں ایک عظیم مقصد کے لیے جلایا جا رہا ہے تو پھر اس وقت تم اپنی خفیہ صلاحیتیں استعمال کرنا۔ اس طرح تم میں زیادہ طاقت آ جائے گی۔ اور تم زیادہ دیر تک جلتی رہو گی۔“

کچھ دیر بعد وہ سب وہاں سے مختلف جگہوں پر چلی گئیں۔ پھر ایک روز امجد اسے ایک دکان سے خرید لایا۔ امجد کی باتوں سے اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اب اسے بھی ایک عظیم مقصد کے لیے جلنا تھا۔ اس کی باتیں سن کر موم بتی میں ایک خوشگوار احساس پیدا ہو چکا تھا اور وہ جس خلوص سے اس کے لیے دعا مانگ رہا تھا تو اسے محسوس ہوا کہ دنیا میں کوئی چیز بھی نکمی نہیں ہے۔ اسے خیال آیا کہ وہ کوشش کرے تو ساری رات جل سکتی ہے۔

یہ سوچتے سوچتے موم بتی نے خود کو دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ آہستہ آہستہ اس کا وجود ختم ہو رہا ہے۔

اس طرح تو میں ساری رات جل نہیں سکتی، پھر تو میں امجد کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔“

اس نے سوچا۔ مایوسی نے اسے بری طرح جکڑ لیا تھا۔ وہ امجد کے لیے قربانی دینا چاہتی تھی مگر اب یہ سب ناممکن نظر آ رہا تھا۔ یکا یک تیز ہوا کا ایک جھونکا اس کی طرف بڑھا تو وہ اپنے خیالات سے باہر نکلی۔ اس کی روشنی مدھم پڑنے لگی تھی۔ امجد نے فکرمند نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بے بس نظروں کو موم بتی نے بھی دیکھ لیا اس نے فوراً ہی خود کو سنبھالا اور جلنے لگی۔ اسے پھر سرگوشی سنائی دی کہ تمہارے اندر کچھ خفیہ صلاحیتیں بھی ہیں، فوراً ہی اس نے اپنے اندر ایک طاقت محسوس کی پھر اس کی روشنی بڑھنے لگی۔ امجد نے اسے دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔ وقت آہستہ آہستہ بیت رہا تھا۔ موم بتی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چھوٹی ہو رہی تھی۔ اسے اپنی کوئی فکر نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی قربانی سے امجد جہالت کی تاریکیوں سے نکل کر علم کی روشنی سے پورے گاؤں کو جگمگائے گا۔

امجد جب پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا تو اسے ایک انجانی سی خوشی محسوس ہوتی۔ رات کے ابتدائی پہر سے جلنے کی وجہ سے اب اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ساری رات جل سکتی مگر اس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ جلے گی۔ اچانک اسے امجد کے بابا کے کراہنے کی آواز آئی۔ امجد فوراً ان کی طرف لپکا۔ وہ بابا کی خدمت سے غافل نہ تھا۔ امجد کو بابا کی خدمت کرتے دیکھ کر موم

بتی بہت خوش ہوئی۔ اچانک تیز ہوا کی ایک لہر موم بتی سے ٹکرائی۔ اس کی بدحواسی میں اضافہ ہوگیا۔ اس کی روشنی مدہم پڑنے لگی۔ امجد اس وقت کمرے میں نہ تھا۔ اس کی روشنی بجھنے ہی والی تھی کہ وہ واپس کمرے میں آ گیا۔ موم بتی کو دیکھ کر وہ چونکا۔ پریشانی اور اداسی نے اسے گھیر لیا۔ موم بتی کو تیزی سے پگھلتے دیکھ کر وہ خاصا فکرمند ہوا۔ خود موم بتی کو بھی معلوم تھا کہ وہ اب اس کا ساتھ زیادہ دیر تک نہیں دے سکتی اور کسی بھی وقت بجھ سکتی ہے۔ تیز ہوا اس کی روشنی بار بار مدہم کر رہی تھی۔ ہوا کی وجہ سے موم بتی کو جلنا اور امجد کو پڑھنا بہت دشوار ہوگیا تھا۔ امجد نے اپنے ننھے ہاتھوں کو کٹورے کی شکل دے کر اور اس کے گرد پھیلا دیا۔ اس کے ہاتھوں نے اسے طاقت بخشی اور موم بتی کی روشنی میں اضافہ ہوگیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا تم ساری رات جلتی رہوگی؟''

اچانک ہی موم بتی کو ایک کرخت آواز سنائی دی۔ وہ چونک گئی

''کون؟'' اس کے منہ سے فوراً نکلا۔

''جہالت ۔۔۔'' آواز آئی۔

''جہالت، مگر تم ہو کہاں؟ مجھے نظر کیوں نہیں آ رہی؟''

موم بتی پریشان ہوگئی۔

''میں نظر نہیں آتی مگر ہر اس جگہ رہتی ہوں جہاں علم داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے اور مجھے دربدر پھرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اگر تم بجھ جاؤ تو امجد پڑھ نہیں سکے گا اور میں کامیاب ہو جاؤں گی اور یہاں سے کبھی نہیں جاؤں گی۔''

جہالت کی باتیں موم بتی کو زہر لگ رہی تھیں۔ وہ اسے جواب دینا چاہتی تھی کہ اس کی نظر امجد پر پڑی۔ جس کا چہرہ کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ کافی دیر گزرنے کے باوجود بھی اس کے شوق میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ امجد کو اس طرح پڑھتے دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ وہ اور چھوٹی ہوچکی ہے۔ اس نے اپنی قوتیں جمع کیں۔ روشنی پھر بڑھنے لگی۔ امجد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ روشنی بڑھتے دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ موم بتی کو بھی یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ جہالت کی باتیں اس نے بھلا دی تھیں۔ وقفے وقفے سے جہالت اسے روشنی پھیلانے سے باز رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ وہ سخت غصے میں تھی اور اسے اس کے انجام سے خبردار کر رہی تھی مگر موم بتی نے جہالت کے غصے کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ اچھائی کے راستے سے ہٹانے کے لیے کیسے کیسے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔

''جلنے سے تمہیں کیا ملے گا۔ علم سے تمہارا کیا واسطہ۔ تم نے تو ختم ہو جانا ہے، مگر میری زندگی تو ختم نہ کرو۔

اگر تم ابھی بجھ گئی تو کچھ اور وقت زندہ رہ لوگی۔ ''

اس نے موم بتی کو لالچ دیا۔ یہ اس کا آخری حربہ تھا۔ یکا یک موم بتی کے دل میں خیال آیا۔

''جہالت کہتی تو ٹھیک ہے۔ مجھے بجھ جانا چاہیے تا کہ میں پھر کبھی جل سکوں۔'' پھر موم بتی نے اپنی روشنی کم کی۔

''ہاں، ہاں، شاباش۔''

جہالت کہہ رہی تھی۔ کم روشنی دیکھ کر امجد ایک بار پھر چونکا۔ اس کے چہرے پر فکر کی ایک لہر نمودار ہوئی۔

''پیاری موم بتی تمہیں پتا نہیں کہ تم میرے لیے کتنی اہم ہو۔ تم ایک اہم مقصد کے لیے جل رہی ہو۔ دنیا میں جب بھی قربانیوں کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں ایک موم بتی کی قربانی بھی لکھی جائے گی کہ اس نے ایک غریب بچے کے لیے جل کر خود کو اس لیے قربان کیا کہ وہ بچہ علم حاصل کرنا چاہتا تھا اور موم بتی نے اس کی مدد کی تھی۔''

امجد کی باتیں سن کر موم بتی کو ندامت ہونے لگی۔ امجد کی باتیں اسے جہالت کی پُر فریب باتوں سے باہر لے آئی تھیں۔ امجد کی باتوں نے اس کے سوئے ہوئے جذبے کو پھر بیدار کر دیا تھا۔

''ہاں، امجد ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے، اس کا مقصد نیک ہے۔ مجھے جلنا چاہیے۔''

اس نے اپنے آپ سے کہا پھر فوراً ہی روشنی بڑھ گئی۔

''ہاں، شاباش۔۔۔ پیاری موم بتی!'' امجد اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ امجد کے شاباش اور جہالت کے شاباش میں کتنا فرق ہے اس نے سوچا۔ امجد کے شاباش میں پیار، خلوص اور یقین ہے اور جہالت کے شاباش میں مکاری، نفرت اور حسد کے سوا کچھ بھی نہیں۔ پھر موم بتی جہالت کی باتوں پر کان نہ دھرتے ہوئے ساری رات روشن رہی۔

موم بتی نے اپنے آپ کو دیکھا، اس کا وجود بھی تاریکی کے ساتھ ختم ہو رہا تھا۔ اور اب اسے کسی بھی وقت بجھ جانا تھا۔ صبح کی روشنی کے سامنے وہ ٹھہر نہیں سکتی تھی۔ تاہم موم بتی اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔ وہ اپنے مقصد کی کامیابی میں سرشار تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کے مقصد نے امجد کو ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیا تھا جہاں علم کی روشنی تھی، جہاں ظلمتوں کا کوئی وجود نہ تھا۔ جہاں ہر طرف پیار، مسکراہٹ اور خلوص تھا۔ تاریکی مٹ چکی تھی اور اب اسے دنیا کی خوبصورتی اور اس کی شادابی میں مزید اضافہ کرنا تھا۔ اس کی روشنی مدھم ہوتی جا رہی تھی مگر اب موم بتی کو کوئی پرواہ نہیں تھی کیونکہ اب علم کی روشنی ہر طرف پھیل چکی تھی۔

فاروق حسن چانڈیو

عید مُبارک

”نثار بیٹے، اسکول سے واپس آنے کے بعد قریبی گاؤں جا کر اپنی خالہ سے سویاں بنانے والی مشین لا کر دینا تا کہ میں عید کے لیے سویاں بنالوں“ نثار کی امی نے کہا۔

نثار کو اس وقت تو کوئی بہانہ نہیں سوجھا تھا۔ اس لیے ہامی بھر لی تھی مگر اسکول سے واپس آنے کے بعد اس نے کہا ”امی جان آج ماسٹر صاحب نے ہوم ورک بہت زیادہ دیا ہے۔ اس لیے میں خالہ کے گھر سویوں والی مشین لینے نہیں جا سکتا۔ کل لے آؤں گا۔ ویسے بھی عید آنے میں ابھی پانچ چھ دن باقی ہیں۔“

اس کی امی نے اس کی بات پر اعتبار کر لیا اور چپ ہو گئیں۔ دوسرے دن اسکول میں نثار نے پڑھائی سے دھیان ہٹا کر پھر سے نیا بہانہ سوچنا شروع کیا۔ اس نے پہلے تو سوچا کہ سر درد کا بہانہ کروں۔ مگر خود ہی اس بہانے کو رد کر دیا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ امی جان کے پاس سر درد کے علاج کے لیے بہت ہی کڑوی دوائی موجود ہے۔ جو انھوں نے حکیم صاحب سے لی ہوئی ہے۔ دراصل اس کی امی کے سر میں اکثر درد رہتا تھا۔ اس بہانے کو رد کرنے کے بعد اس نے دوسرا بہانہ تلاش کرنا شروع کیا۔ کافی دیر سوچنے کے بعد آخر کار اس نے ایک جھوٹی کہانی گھڑ لی اور گھر پہنچ کر والدہ سے کہا ”امی جان، آج اسکول کے پاس خالہ زاد بھائی ثناءاللہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ ان کی ایک پڑوسن آج ہی ایک دن کے لیے سویاں بنانے والی مشین مانگ کر لے گئی ہے۔“

اس کی امی یہ سن کر پریشان ہو گئی اور کہا ”یہ تو بہت برا ہوا۔۔۔ عید میں اب صرف تین چار دن رہ گئے ہیں۔ کم سے کم تین دن سویاں بناؤں گی تب جا کر اتنی بن سکیں گی جو اپنی ضرورت کے لیے اور محلے کے چند گھروں میں ایک ایک پلیٹ دینے کے لیے کافی ہوں گی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ کل ضرور مشین لے آنا پھر جلدی جلدی بنانے کی کوشش کروں گی۔“

”جی امی جان۔ آپ بے فکر رہیں کل تو ضرور مشین لے آؤں گا“ نثار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی جھوٹی کہانی کی کامیابی پر بہت خوش تھا۔

تیسرے دن نثار بہت پریشان تھا۔ کوئی نیا بہانہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور وہ دو میل پیدل خالہ کے گھر مشین لینے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سویاں ویسے بھی اس کو اچھی نہیں لگتی تھیں۔ والدہ بہنیں یا پڑوسی کھائیں یا نہ کھائیں اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ بغیر کسی بہانے کے انکار کرنے پر جوتیاں پڑنے کا خطرہ تھا۔

سوچتے سوچتے چھٹی ہو گئی مگر وہ کوئی بہانہ بنانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اب وہ گھر جاتے ہوئے خود کو دو میل پیدل خالہ کے گھر جانے اور پھر مشین کندھے پر اٹھا کے دو میل واپس آنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا۔ ابھی وہ گھر سے کچھ ہی دور تھا کہ اسے اپنا ایک دوست سلیم نظر آیا جو لنگڑاتا ہوا ایک طرف جا رہا تھا۔ نثار نے پوچھا۔ ”یار سلیم! کیا بات ہے؟ آج لنگڑا کیوں رہے ہو؟“

”یار، پاؤں میں موچ آ گئی ہے۔ بابا ولی سے مالش کروانے جا رہا ہوں“ سلیم نے جواب دیا۔

یہ جواب سن کر نثار کو اچانک خیال آیا کہ وہ بھی پاؤں میں موچ آنے کا بہانہ بنا کر خالہ کے گھر جانے سے بچ سکتا ہے۔ اب وہ بے فکر ہو کر گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے لنگڑانا شروع کر دیا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر والدہ اور بہنوں نے پریشان ہو کر پوچھا: ”کیا ہوا؟ کیوں لنگڑا رہے ہو؟ کیوں کراہ رہے؟“۔

نثار نے شدید درد کی اداکاری کرتے ہوئے اپنا سوچا ہوا جھوٹ سنایا۔

”اللہ خیر کرے میرے لعل! بیٹا جا کے تم بابا ولی سے مالش کروا لو۔ انشاءاللہ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جاؤ گے“ اس کی امی نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

”مگر امی جان! اب سویاں بنانے والی مشین کون لائے گا؟ ہماری تو خیر ہے مگر پڑوسیوں کو ایک ایک پلیٹ نہ بھیجی تو وہ کیا سوچیں گے؟ یہاں شہر تو قریب ہے نہیں کہ بنی بنائی سویاں لے لی جائیں۔ بڑی بیٹی عالیہ نے پریشان ہو کر کہا۔

”اب نثار تو اس حال میں جانے سے رہا“ والدہ نے اتنا بول کر سوچنا شروع کیا۔ پھر کچھ دیر بعد کہا ”اب تو ہم ماں بیٹی کو ہی جانا پڑے گا!“

نثار اپنی امی کی یہ بات سن کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا مگر ظاہر میں کراہتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اچھا امی جان! میں بابا ولی سے مالش کروانے جا رہا ہوں۔“

وہ لنگڑاتا ہوا اوپر اوپر سے منہ کو کرب ناک بنائے مگر اندر سے خوش خوش گھر سے نکلا۔ اسے بابا ولی کی

طرف جانے کے لیے میدان پار کر کے جانا تھا مالش تو خیر اس نے کروائی نہیں تھی مگر والدہ کو دکھانے کے لیے جانا اسی طرف ہی تھا۔ ابھی اس نے آدھا میدان ہی پار کیا تھا کہ اسے گرد باد (چکر کھاتی ہوئی ہوا) نظر آیا۔ وہ دھول سے بچنے کے لیے رک گیا تا کہ گرد باد گزر جائے۔ جب گرد باد اس کے قریب سے گزرنے لگا تو اسے اس میں اڑتا ہوا ایک کرنسی نوٹ نظر آیا۔ اس کے خیال میں یہ پانچ سو یا ہزار کا نوٹ تھا اڑتی ہوئی مٹی کے درمیاں ہونے کی وجہ سے وہ ٹھیک سے پہچان نہیں پا رہا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر گھر کی طرف دیکھا کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ گھر کا دروازہ بند پا کر وہ خوش ہو گیا اور گرد باد کی طرف لپک پڑا۔

نوٹ بہت اونچا اڑ رہا تھا۔ وہ گرد باد کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ نوٹ جب چکر کھا کر نیچے آئے تو وہ لپک کر پکڑ لے۔ اس کی آنکھوں میں مٹی پڑ رہی تھی مگر وہ زبردستی آنکھیں کھولے نوٹ پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ نوٹ کبھی چکر کھا کر نیچے آ جاتا کبھی اوپر چلا جاتا۔ مگر اتنا نیچے نہیں آتا تھا کہ وہ لپک کر اسے پکڑ سکے۔

اب تو اس کی آنکھوں میں مٹی کے ساتھ ساتھ تنکے بھی پڑ رہے تھے۔ اسے اپنی آنکھوں میں شدید جلن محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے انھیں کھولے رکھنا بہت ہی مشکل ہو رہا تھا مگر وہ پوری قوت سے آنکھیں کھولے ہوئے تھا اور گرد باد کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک اس کو زوردار جھٹکا لگا اور دھڑام سے نیچے گڑھے میں گر پڑا نظر نوٹ کی طرف ہونے کی وجہ سے راہ میں آنے والا گڑھا اسے نظر نہیں آیا تھا۔ اسے بہت سی چوٹیں لگیں تھیں۔ کچھ دیر تک تو اُٹھ کر گرد باد کے پیچھے جانے کی اس میں ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ مگر پھر نوٹ کی کشش نے اسے اتنی قوت بخش دی کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا درد کی ٹیسوں کی پروا کیے بغیر وہ ایک بار پھر گرد باد کی طرف دوڑ پڑا۔ اور کچھ ہی دیر میں اس تک پہنچ گیا۔

تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے نوٹ بھی اڑتا ہوا نظر آ گیا۔ کچھ دیر بعد ہوا کا چکر اچانک نوٹ کو نیچے لے آیا۔ نثار نے چھلانگ لگا کر اسے پکڑ تو لیا مگر بری طرح منہ کے بل نیچے جا گرا۔ وہ اتنی زور سے گرا تھا کہ اس کی پیشانی پر گومڑہ سا بن گیا۔ اس کا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ مگر نوٹ مل جانے کی خوشی میں اسے درد نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ البتہ اب آنکھوں کو مزید کھولے رکھنا اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں نوٹ کو دبائے ہوئے تھا اور دوسرے سے آنکھوں کو مل رہا تھا۔ تا کہ جلن کچھ کم ہو تو وہ نوٹ کو اچھی طرح سے دیکھ سکے۔ اور جان سکے کہ وہ پانچ سو کا نوٹ ہے یا ہزار کا۔ کافی دیر ملنے کے بعد آخر وہ آنکھیں کھولنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے دامن سے آنسو صاف کیے اور نوٹ کو دیکھا۔

نوٹ دیکھتے ہی اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے یہ ایک ہزار کا کھلونا نوٹ تھا۔ جس پر لکھا ہوا تھا ”عید مبارک“ یہ الفاظ عام حالات میں تو بہت بھلے لگتے ہیں لیکن اس وقت وہ الفاظ نثار کو انتہائی برے لگ رہے تھے۔ ساتھ ہی اب اسے درد کی شدید ٹیسیں بھی محسوس ہونے لگیں۔ کافی دیر تک وہ وہیں بیٹھا ہانپتا اور کراہتا رہا۔ آخر کار اس نے گھر جانے کا سوچا۔ وہ کسی طرح اٹھ تو گیا مگر جب قدم اٹھایا تو پاؤں میں شدید درد کی ٹیسیں اٹھیں۔ اسے معلوم ہوا کہ پاؤں میں موچ آ گئی ہے۔ احساس ہوتے ہی اسے وہ جھوٹ یاد آ گئے جو وہ اکثر اپنی والدہ سے بولتا تھا۔ اب اس کو خیال آیا کہ اسے یہ سزا اللہ نے والدہ سے جھوٹ بولنے کی وجہ سے دی ہے۔ وہ بہت شرمندہ ہوا۔ اس نے دل میں پکا ارادہ کیا کہ آئندہ کسی سے بھی جھوٹ نہیں بولے گا اور والدہ جو بھی کام کہیں گی وہ فوراً کرے گا۔ اس مثبت سوچ کے ساتھ وہ گھر کی طرف چل پڑا۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ مگر کسی نہ کسی طرح لنگڑاتا ہوا گھر پہنچ گیا۔ اس کی والدہ اس وقت خالہ کی طرف جا چکی تھیں۔ جب وہ واپس آئیں تو نثار نے پاؤں کو پکڑ کر ان سے معافی مانگی اور اپنی حالت دکھا کر کہا کہ میں نے آپ سے موچ آنے کا جھوٹ بولا تھا۔ اللہ نے مجھے سزا کے طور پر موچ کے ساتھ اور بھی بہت سی چوٹیں دی ہیں۔ میں نے اللہ سے گناہوں پر معافی مانگ لی۔ امی جان آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔“

”میرے پیارے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمھاری آنکھیں جلد کھل گئی ہیں اور تم راہ راست پر آ گئے ہو“ امی نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆☆

فوزیہ طاہرہ

زرد پتھر

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہمارا سارا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آ کر اورنگ ٹاؤن سے کوئی پندرہ میل پرے ایک چھوٹے سے قصبے میں آن بسا---اس وقت میری عمر کوئی 13 سال کے لگ بھگ ہو گی-- جبکہ میری دو چھوٹی بہنیں ننھی اور بے بی مجھ سے کوئی دو دو سال چھوٹی تھیں۔ ہمارے نئے گھر کی تین منزلیں تھیں سب سے نچلا حصہ ہمارے پاس تھا جبکہ دوسری منزل پر چچا شمشاد اپنی فیملی کے ساتھ قابض ہوئے اور تیسری منزل یعنی سب سے اوپر کی منزل میں میری بڑی پھوپھو معہ اپنے شوہر رہنے لگیں---مکان کے کمروں کی ترتیب بھی بڑی عجیب تھی یعنی ہر کمرے میں سے دوسرے کمرے کا دروازہ نکلتا تھا یوں سمجھئے کہ جیسے ریل گاڑی کے ڈبے ہوں---گھر پرانی طرز کا بنا ہوا تھا لیکن اس وقت یہ بھی غنیمت تھا کہ سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ تو ملی---چچا شمشاد کا بیٹا قیصر میرا ہم عمر تھا جبکہ میری بڑی پھوپھو بے اولاد تھیں اس لیے وہ ہم تینوں بہن بھائیوں اور قیصر کے ساتھ بہت محبت کرتی تھیں---یوں بھی ہمارے اس چھوٹے سے کنبے میں بڑا اتفاق تھا اکثر رات کا کھانا سارے ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔ شروع شروع میں تو اس بوسیدہ سے گھر سے خاصا ڈر محسوس ہوا خاص طور پر آخری کمرے سے جو ابھی تک بند تھا اس کے دروازے پر موٹا سا زنگ آلود تالا ہزار جتن کے بعد بھی کھلنے میں نہیں آ رہا تھا۔

میں اور قیصر جب دروازے کی درزوں کے اندر جھانکنے کی کوششیں کرتے تو سوائے گھپ اندھیرے کے کچھ بھی سجھائی نہ دیتا تھا۔ میمونہ چچی کا مشورہ تھا کہ اس کمرے کو بند ہی رکھا جائے۔ یقیناً اندر جن بھوتوں کا بسیرا ہو گا جو نہیں چاہتے ہوں گے کہ تالا کھلے اور ان کے آرام میں خلل واقع ہو---لیکن ابا جان نے ان کی یہ بات سنی ان سنی کر دی---ایک سہ پہر غالباً بدھ کا روز تھا ہم سب بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ڈاکیا ایک خط لے کر آیا---مجھے ہی پڑھنے کے لیے کہا گیا---خط کی عبارت بالکل اجنبی سی تھی---لکھا تھا

محترم انکل----

نمسکار

میں آپ کو ایک راز کی بات بتانا چاہتا ہوں کہ یہ مکان جس میں آج کل آپ رہ رہے ہیں یہ کبھی ہمارا

ہوا کرتا تھا۔ مختصر یہ کہ اس مکان کی پہلی منزل کے سب سے آخری کمرے میں خزانہ دفن ہے۔ آپ فوراً زمین کھودیں اور گاگروں میں بھرے ہوئے زیورات نکال لیں----

آپ کا خیر خواہ
کرشن موہن

خط کیا تھا اچھی بھلی لاٹری تھی---سب کے منہ حیرت اور خوشی سے کھلے کے کھلے رہ گئے---بڑی پھوپھو کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں---

"ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے--جبھی تو اتنا بھاری تالا لگایا گیا تھا--"بڑی پھوپھو نے اپنی ماہرانہ رائے دیتے ہوئے کہا--

"اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو نے ہمارے دن پھیر دیئے---"

میمونہ چچی نے آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا کر دعائیہ انداز میں کہا---ناصر پھوپھا اور شمشاد چچا ابا جان کو تالا توڑنے کے نت نئے طریقے بتانے لگے---اب تو سب کی کوشش یہی تھی کہ تالا بھلے نہ ٹوٹے دروازہ ہی اکھیڑ دیا جائے---تاکہ جلد از جلد کھدائی کا کام شروع کیا جاسکے---لیکن ساتھ ہی ساتھ ابا جان نے ہم سب کو اس بات کی بھی ہدایت کی کہ اس بات کو صیغہ راز میں رکھا جائے---ورنہ سارا خزانہ حکومت کے قبضے میں چلا جائے گا---یہ بھی طے پایا گیا کہ کھدائی کے لیے کسی دوسرے شہر سے مزدو بلائے جائیں تاکہ مقامی لوگوں کو اس کی خبر نہ ہو---لیکن امی جان کو یہ تجویز پسند نہ آئی ان کا اصرار یہ تھا کہ کھدائی کا کام گھر کے مرد خود ہی کریں تو بہتر ہے---اگرچہ کام خاصا مشکل تھا اور مشقت طلب بھی لیکن دولت کی خوشی میں ناصر پھوپھا اور چچا شمشاد نے تو فوراً حامی بھرلی---گویا کھدائی کا کام آدھی رات کو شروع کیا جائے اور صبح تڑکے تک جاری رکھا جائے تاکہ محلے والوں کو کانوں کان خبر نہ ہو----

"چچا جان! دن کے شور میں کھدائی کریں---تاکہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے کہ کھدائی کی آواز کہاں سے آرہی ہے---"

منھی نے بزرگوں کی طرح سے مشورہ دیتے ہوئے کہا----

"ارے بھئی واقعی---منھی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے رات کی تاریکی میں تو آواز زیادہ دور تک جاتی ہے----

ہمیں دوپہر کے وقت کھدائی کا کام کرنا چاہیے اور وہ بھی صرف دو تین گھنٹے کے لیے---تاکہ کسی کو

شک نہ پڑے۔۔۔ناصر پھوپھا نے بات آگے بڑھائی۔۔۔اگلے ہی دن مزدور کو بلایا گیا اور کمرے کا دروازہ یہ کہہ کر نکلوا دیا گیا کہ نیا دروازہ لگوانا چاہتے ہیں۔۔۔کمرے کے اندر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔۔۔لیمپ کی روشنی میں سب اندر داخل ہوئے فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔۔۔ہم چاروں بچے کمرے کی دہلیز پر ہی کھڑے رہے کمرے سے عجیب وحشت ٹپک رہی تھی۔۔۔سب سے پہلے تو وہاں بجلی بحال کی گئی۔۔۔پھر نیا دروازہ خرید کر لگایا گیا تا کہ ہر روز کھدائی کے بعد دروازہ بند رکھا جا سکے۔۔۔رات کے اندھیرے میں کدالیں خریدی گئیں اور بوریوں میں لپیٹ کر یوں لائی گئیں جیسے اغوا شدہ بچے ہوں۔۔۔چچا شمشاد کی کریانے کی دکان تھی، جس سے گزر بسر ہوتی تھی، ناصر پھوپھا کسی زمانے میں آرمی آفیسر تھے اور ریٹائرمنٹ لے چکے تھے، پنشن سے گھر چل رہا تھا۔۔۔میرے والد صاحب کی دو کپڑے کی کھڈیاں تھیں۔۔گویا متوسط طبقے میں ہمارا شمار ہوتا تھا۔۔۔اس لیے سب کی ہی یہ شدید خواہش تھی کہ جلد از جلد خزانہ ہاتھ آئے اور اپنے اپنے حصے کی رقم سے زندگی کے باقی دن بہتر طور پر گزار سکیں۔۔۔کھدائی کا کام شروع کر دیا گیا۔۔کمرے کے عین وسط میں چوکور نشان لگایا گیا تا کہ گھر کی بنیادوں پر کوئی منفی اثر نہ پڑے۔۔۔ہم چاروں بچوں کی ڈیوٹی میں یہ شامل تھا کہ مٹی تسلوں میں بھر بھر کر کمرے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ پھینکتے جائیں۔۔۔۔امی جان اور میمونہ باجی سب کے لیے کھانا پکانے میں مصروف ہو گئیں اور بڑی پھوپھو ہاتھ میں تسبیح لے کر کمرے کی دہلیز پر پیڑھی رکھ کر بیٹھ گئیں۔۔۔سب کے چہروں پر ایک نیا جوش اور ولولہ دکھائی دے رہا تھا۔۔۔زمین خاصی سخت تھی، اوپر سے گرمیوں کے دن، پنکھا بھی نہیں لگایا جا سکتا تھا، ورنہ ساری مٹی اڑ اڑ کر سر میں پڑتی۔۔۔ناصر پھوپھا 50 کے لگ بھگ ہوں گے جلد ہی ہانپنے لگے۔۔۔ننھی بھاگ کر گئی اور پانی کا گلاس بنا کہے لے آئی۔۔۔اگرچہ ایک ایک فٹ زمین کھودی جا چکی تھی ابھی مزید کھودنے کی چنداں ضرورت تھی۔۔۔

سب کے کان دروازے پر ہی لگے رہتے تھے کہ کوئی بن بلایا مہمان یا اڑوس پڑوس سے ہی نہ کوئی آ جائے۔۔۔ مجھے تو بے بی کی طرف سے دھڑکا لگا تھا کہ کہیں بھولپن میں مولوی صاحب کو ہی نہ کچھ بتا ڈالے۔۔۔ایک خیال آیا بھی کہ ابا جان سے کہوں کہ کچھ دن کے لیے بے بی کو مسجد میں سپارہ پڑھنے کے لیے مت بھیجیں۔۔۔لیکن پھر چپ رہا۔۔۔کیونکہ ابا جان بار بار ہم سب کو اس بارے میں سختی سے تاکید کر چکے تھے۔۔۔ پہلا دن کھدائی میں گزارا۔۔۔دوسرا دن۔۔۔پھر تیسرا دن۔۔۔اب تک تین ساڑھے تین فٹ زمین کھودی جا چکی تھی۔۔۔ابا جان اور ناصر پھوپھا جب تھک کر بیٹھ جاتے تو چچا شمشاد اپنی باری پر لگ جاتے۔۔تیسرے دن تو حد ہی ہو گئی۔۔۔چچا شمشاد اکیلے ہی اندر کھدائی میں مصروف تھے کہ بے ساختہ ایک

نعرہ سنائی دیا۔۔۔

’’الٰہی خیر۔۔۔‘‘ بڑی پھوپھو سلیپر گھسیٹتی ہوئی اسی آواز کی جانب دوڑیں۔۔۔ ابا جان اور ناصر پھوپھا بھلا پیچھے کب رہنے والے تھے اور ہم چاروں بچے۔۔۔ اسی خوشی کے نعرے پر جیسے اچھل ہی پڑے۔۔۔ کمرے میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ چچا شمشاد کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو رہا ہے۔۔۔ منہ سے الفاظ صحیح طور پر ادا نہیں ہو رہے۔۔۔ ہاتھ کے اشارے سے زمین کی طرف سب کی توجہ مبذول کروائی۔۔۔

’’ارے واقعی! یہ تو پیتل کی گاگر معلوم ہو رہی ہے۔۔۔‘‘ امی جان نے زمین میں دھنسے ہوئے پیتل کے ٹکڑے کو ہاتھ سے محسوس کرتے ہوئے کہا۔۔۔ چچا شمشاد اس وقت بری طرح نڈھال ہو چکے تھے اور یوں بھی سہ پہر ہونے کو تھی اس لیے مزید کھدائی کا کام فی الحال روک دیا گیا۔۔۔ کچھ دیر تینوں بڑے کھسر پھسر کرتے رہے اور پھر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔۔۔ چونکہ ہم چاروں کے سکول میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اس لیے ہم اکثر رات دیر تک شرارتیں کرتے رہتے یا ایک دوسرے کو کہانیاں سنایا کرتے۔۔۔ لیکن آج کل ہمارا موضوع بھی آخری کمرہ اور اس کا خزانہ تھا۔۔۔

’’طارق بھیا! بڑی پھوپھو پھوپھا جان سے کہہ رہی تھیں کہ ہم اپنا حصہ لے کر حج کرنے جائیں گے۔۔۔ بے بی نے بڑی رازداری سے سب کو بتایا۔۔۔ بے بی بڑی پھوپھو کی بڑی چہیتی تھی اور زیادہ وقت انہیں کے پاس گذارتی تھی اس لیے تیسری منزل کی پوری پوری رپورٹ سب کو لفظ بلفظ سنا ڈالتی۔۔۔۔

اور میرے ابو کہہ رہے تھے کہ خزانے سے ہمیں جو حصہ ملے گا ہم اس رقم سے ایک پلازہ بنائیں گے۔۔۔ قیصر نے کندھے اچکا کر کہا۔ ’’اگر میرے ابا جان نے تمہارے ابو کو حصہ نہ دیا تو۔۔۔‘‘

ننھی نے ناک سکیڑتے ہوئے ناراضی سے کہا۔۔۔

’’تو پھر۔۔۔ ہم مقدمہ کر دیں گے۔۔۔ میرے ابو نے تو اپنے ایک وکیل دوست سے چپکے چپکے بات بھی کر رکھی ہے جناب۔۔۔‘‘ قیصر نے بڑ مارتے ہوئے ننھی کو چڑانے کی کوشش کی۔۔۔ سب اپنی اپنی بگھار رہے تھے۔۔۔ رات سب نے آنکھوں میں کاٹی۔۔۔ اگلا دن ابھی سوا نیزے کو بھی نہیں پہنچا ہو گا کہ چچا شمشاد اور ناصر پھوپھا کھدائی کے لیے آ گئے۔۔۔ سب کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے، جس گھڑی کا انتظار تھا آخر وہ آن ہی پہنچی۔۔۔۔ بڑی پھوپھو کی انگلیاں تسبیح کے دانوں پر مزید تیزی سے پھرنے لگیں۔۔۔ میرے دل میں ایک انجانا سا خوف بھی بار بار سر اٹھا رہا تھا کہ اگر دولت کا بٹوارہ دیانتداری سے نہ ہوا تو۔۔۔؟۔۔۔ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا۔۔۔ ناصر پھوپھا چونکہ ابا جان اور چچا شمشاد نسبت عمر میں

بڑے تھے اس لیے وہ گاگر نکالنے میں پہل کرنا چاہتے تھے --- لہٰذا اللہ کا نام لے کر انہوں نے کدال سے ایک بھرپور ضرب جو لگائی تو بڑی بری طرح سے پیچھے کی جانب کمر کے بل کدال سمیت جا پڑے --- پیتل کا ایک چار انچ لمبا ٹکڑا اڑ کر بڑی پھوپھی کی پیڑھی کے قریب جا گرا ----

''ہائے ہائے --- یہ کیا ---؟ ---'' بڑی پھوپھو اچھل کر ایک طرف ہولیں --- ابا جان اور چچا شمشاد نے ناصر پھوپھا کو سنبھالا دیا جن کی کمر بری طرح چھل گئی تھی ---

سب کے چہرے یکدم مایوسی سے لٹک گئے --- ہم جس کو پیتل کی گاگر سمجھ رہے تھے وہ تو رف پرانی دھات کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا جو زمین میں دھنسا ہوا تھا --- اب تو سب کی ہمت جواب دے چکی تھی --- ناصر پھوپھا تو خاصے مایوس دکھائی دے رہے تھے --- سب نے اپنے اپنے حصہ کی کھدائی بڑی بے دلی سے کی --- اب یقین ہو چلا تھا کہ ساری محنت اکارت جائے گی --- چچا شمشاد نے کئی دن سے اپنی دکان بھی نہیں کھولی تھی --- لہٰذا وہ اپنی دکان پر گئے ---- وہاں پر بھی دل نہ ٹھہرا --- جانے کہاں سے گھوم پھر کر شام کو گھر لوٹے تو کچھ پر امید دکھائی دے رہے تھے --- ابا جان کے ساتھ جانے کیا کھسر پھسر کی کہ یکدم ابا جان کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا ---

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا --- ہم مسلمان ہیں --- ہم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے ---'' ہم سب سہم گئے --- ابا جان آپے سے باہر ہو کر چچا شمشاد پر گرج رہے تھے --

''آخر ہوا کیا ہے شمشاد بھائی ----؟ --- مجھے بھی تو کچھ بتایئے ---؟ امی جان نے ڈرتے ڈرتے چچا جان سے پوچھا ---

''روزی بھابھی! میں نے ایک پنڈت سے اس بارے میں مشورہ کیا تھا تو وہ کہنے لگا کہ اگر کالی مایا کے نام پر 4 بکرے قربان کریں گے تو خزانہ جلد ہی ہاتھ آ جائے گا ---'' چچا شمشاد نے ساری تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا ----

''خدا نہ کرے جو ہم ایسا کریں ---'' امی جان بھی جھٹ بول اٹھیں ----

''بھابھی! میں نے تو صرف پنڈت کی بات بتائی ہے --- ضروری نہیں کہ ہم ان کے مذہب کے مطابق قربانی دیں ہم تو اللہ کے نام پر قربانی دیں گے --- مقصد تو صدقہ اتارنا ہے ---''

ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھلا میں ایسا شرک کیونکر کروں گا ---'' چچا شمشاد نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ناصر پھوپھا بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے --- آخر کار چار بکرے خریدے گئے اور اللہ

کے نام پر ایک قریبی یتیم خانے میں دے دیئے گئے۔۔۔ اگلے ہی دن سب پھر کھدائی کے کام پر جت گئے۔

چھ دن اسی تگ و دو میں گزر گئے۔۔۔ اگرچہ سب کی ہمت جواب دے چکی تھی لیکن صدقہ اتارنے کے بعد ایک بار پھر سب کی امید بندھ گئی کہ اب خزانہ نکلا ہی نکلا۔۔۔ امی جان نے آیت کریمہ پڑھنے کے لیے مجھے مسجد سے گٹھلیاں لینے کے لیے بھیجا۔۔۔ بے بی ضد کر کے چل پڑی۔۔۔ مولوی صاحب کو یہی بتایا گیا کہ گھر میں رزق میں برکت کے لیے ہم آیت کریمہ پڑھانا چاہتے ہیں چچی جان اور امی جان کے ساتھ ساتھ بڑی پھوپھو نے بھی آیت کریمہ کا ورد شروع کر دیا۔۔۔ ننھی اور بے بی سر پر رومال باندھ کر بیٹھ گئیں اگرچہ انہیں تفصیل تو معلوم نہیں تھی البتہ اتنا ضرور جانتی تھیں کہ عنقریب ہم امیر ہونے والے ہیں۔۔۔ کسی کسی وقت کمرے سے ضرب لگنے پر ایسی گونج سنائی دیتی جیسے کسی سخت چیز پر ضرب لگی ہو۔۔۔ دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ تقریباً پانچ فٹ تک زمین کی کھدائی ہو چکی تھی۔۔۔ چند ہی دنوں میں کمرہ ایک عدد کنواں دکھائی دینے لگا تھا۔۔۔ ناصر پھوپھا اور ابا جان نے بھی محسوس کیا کہ اب مزید کھدائی مشکل نظر آنے لگی ہے کیونکہ عین وسط میں ایک اچھا خاصا بھاری پتھر دھنسا ہوا تھا جس کے باعث زمین مزید کھودنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔۔۔ یکدم باہر کا دروازہ کھٹکنے کی آواز سنائی دی۔۔۔ ابا جان ناصر پھوپھا اور چچا شمشاد اپنی اپنی کدالیں چھوڑ کر جلدی سے باہر صحن میں آ بیٹھے۔۔۔ اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔۔۔ دروازے پر پھر دستک ہوئی ابا جان نے جا کر دروازہ کھولا تو سامنے مسجد کے امام نور بخش کو پایا۔۔۔۔

”آپ۔۔۔ امام صاحب۔۔۔ آیئے آیئے۔۔۔“ ابا جان مولوی صاحب کو دیکھ کر بری طرح گھبرا گئے نا چاہتے ہوئے بھی انہیں اندر آنے کی دعوت دی۔۔۔ مولوی صاحب نے میرے سر پر بھی ہاتھ پھیر کر پیار دیا۔۔۔

آپ کے ہاتھ کی تکلیف اب کیسی ہے مولوی صاحب۔۔۔؟

ناصر پھوپھا بھی قریب آ گئے اور رسمی سی گفتگو کرنے لگے۔۔۔ ”ڈاکٹروں کے پاس تو اس مرض کا کوئی علاج نہیں بیٹا۔۔۔ پانی کے استعمال سے گریز کرتا ہوں۔۔۔ وضو کے لیے تیمم کر لیتا ہوں۔۔۔ اللہ تعالیٰ شفا دینے والا ہے۔۔۔“

مولوی صاحب نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ جنہیں گزشتہ دس سال سے ایگزیما کا مرض لاحق تھا۔۔۔ کبھی ہاتھوں پر خارش اس قدر بڑھ جاتی کہ زخم سے بن جاتے۔۔۔

مولوی صاحب اللہ والے اور عالم انسان تھے ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔۔۔

ارشاد میاں! بھئی وہ جگہ ہمیں بھی تو دکھاؤ۔۔۔ بے بی بیٹا بتا رہی تھی کہ۔۔۔۔ "مولوی صاحب نے ابا جان کو مخاطب کرتے ہوئے ابھی اپنی بات مکمل بھی نہ کی تھی کہ ابا جان سمجھ گئے کہ بات باہر نکل چکی ہے اور بے بی کی زبانی پول کھل چکا ہے۔۔۔ اس لیے مولوی صاحب جیسے پرہیزگار انسان سے جھوٹ بولنے کی بھلا کس کو جرات تھی۔۔۔ بلا چوں و چرا ساری حقیقت بتانے میں ہی عافیت سمجھی۔۔۔ مولوی صاحب کو اندر کمرے میں لے جایا گیا۔۔۔ اور کھدائی والا حصہ دکھایا۔۔۔ لیکن یہ دیکھ کر سارے دم بخود رہ گئے کہ زمین میں دھنسے ہوئے پتھر سے پانی کا چشمہ ابل رہا تھا چونکہ پتھر کا رنگ زردی مائل تھا اس لیے پانی بھی پیلا ہٹ میں تھا۔۔۔۔۔

"الحمد اللہ" پتھر سے ابلتا چشمہ دیکھ کر مولوی صاحب نے بے اختیار کہا۔۔۔ شمشاد چچا نیچے گہرائی میں اتر گئے اور دونوں ہتھیلیوں کی اوک بنا کر پانی میرے ہاتھوں پر ڈالنے لگے۔۔۔ پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ میرے جسم میں یکدم سردی کی لہر دوڑ گئی۔۔۔ شمشاد چچا نے پانی کی اوک مولوی صاحب کے ہاتھوں پر بھی ڈالی لیکن جلد ہی انہیں شرمندگی محسوس ہوئی کہ مولوی صاحب کے ہاتھوں پر اگیزیما ہے اور انہیں تو پانی کے استعمال سے گریز کے لیے کہا گیا ہے۔۔۔ اس سے پہلے کہ چچا جان معذرت کرتے یا مولوی صاحب ناراضی کا اظہار کرتے۔۔۔ مولوی صاحب کے چہرے پر یکدم ایک خوشگوار سی تبدیلی محسوس ہوئی۔۔۔ وہ اپنے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔۔۔۔

خیریت تو ہے نا۔۔۔ مولوی صاحب۔۔۔" بڑی پھوپھو نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پریشان ہو کر پوچھا۔۔۔

عجیب بات ہے پہلے پانی چھوتے ہی میرے ہاتھوں کی جلن بڑھ جایا کرتی تھی لیکن اس پانی سے میرے ہاتھوں کی جلن کم ہو گئی ہے۔۔۔ یہ تو۔۔۔ بہت بڑا معجزہ ہے اس پانی میں یقیناً شفائی تاثیر ہے۔۔۔ "مولوی صاحب کی تو خوشی کی کوئی انتہاء ہی نہ رہی تھی۔۔۔ ہم سب بھی ہکا بکا ہو کر یہ منظر دیکھ رہے تھے اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا۔۔۔ مولوی صاحب کے ہاتھوں کے زخموں پر چند ہی لمحوں میں کھرنڈ سے آ گئے تھے۔۔۔ مولوی صاحب نے بار بار ہاتھوں پر پانی ڈلوایا۔۔۔ کچھ دیر میں پانی کی سطح دو فٹ سے اونچی ہو گئی۔۔۔ اگرچہ اب خزانے کی امید بے کار تھی۔۔۔ سوچا کیا تھا اور کیا ہو گیا۔۔۔ کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا۔۔۔۔ سب کمرے سے باہر آ گئے مولوی صاحب بار بار آسمان کی طرف دیکھ کر خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔۔۔

کبھی اپنے ہاتھوں کے خشک زخموں کو دیکھتے کبھی بے بی کا ماتھا چومتے کہ اس کے بتانے پر انہیں شفا

نصیب ہوئی۔۔۔۔

”آخر ہمیں فائدہ کیا ہوا۔۔۔ اتنے دن کی محنت اکارت گئی۔۔۔ اس ٹھنڈے پانی کے کنویں کا ہم کیا کریں گے۔۔۔ اسے کہتے ہیں۔۔۔ کھودی زمین نکلا پتھر۔۔۔ وہ بھی زرد پتھر“ ناصر پھوپھا مایوس ہو کر مولوی صاحب سے مخاطب ہوئے اور کہا۔۔۔ بڑی پھوپھو نے اپنے شوہر کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔۔۔ ایسا مت کہو بیٹا۔۔۔ یہ زرد پتھر کوہ نور ہیرے سے بڑھ کر قیمتی ہے۔۔۔ اس کی وجہ سے پانی میں شفائی اثرات ہیں اور بیمار آدمی کے لیے صحت ہی خزانہ ہے۔۔۔“ مولوی صاحب یہ کہہ کر اپنے گھر چل دیئے۔۔۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں کی شفایابی کا معجزہ جانے کس کس کو سنایا پھر تو لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔۔۔ دنوں ہی دنوں میں اس شفائی چشمے کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔۔۔ بعض حضرات نے تو زرد پتھر کی بھاری سے بھاری قیمت بھی لگائی لیکن ابا جان نہ مانے اور خدمت خلق کے لیے کنوئیں کا پانی مفت فراہم کرنے کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔۔۔ خارش اور ایگزیما کے مریض جب مکمل طور پر شفایاب ہوتے تو بڑے بڑے نذرانے پیش کرنا چاہتے لیکن ابا جان انکار کر دیتے پھر مجھے یاد نہیں کہ ہمارے حالات دن بدن کس طرح بہتر ہونے لگے۔۔۔۔ رزق میں برکت پڑتی گئی۔۔۔ شمشاد چچا کی کریانے کی دوکان شمشاد مارکیٹ میں بدل گئی۔۔۔ ہماری کھڈیوں کا بنا ہوا کپڑا پورے ملک میں مشہور ہو گیا اور یوں ہم نے رفتہ رفتہ ٹیکسٹائل مل لگا لی۔۔۔ ناصر پھوپھا اور بڑی پھوپھو کو اللہ تعالی نے حج اکبر کی سعادت نصیب کی۔۔۔ اور دونوں نے مستقل طور پر مدینہ منورہ میں ہی سکونت اختیار کر لی۔۔۔ وسیع کاروبار کی وجہ سے ہمیں لاہور شفٹ ہونا پڑا جبکہ شمشاد چچا پہلے ہی یہاں آ چکے تھے۔۔۔ پرانے گھر سے شفٹ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں آنے والے مریضوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ کئی کئی دن پانی حاصل کرنے کی باری نہیں آتی تھی اس لیے ابا جان نے مولوی نور بخش کو اس کنوئیں کی دیکھ بھال کا ذمہ سونپ دیا۔۔۔ کچھ عرصے بعد مولوی صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ کرشن موہن کے باپ نے تحریری طور پر معذرت کی تھی کہ اس کے بیٹے نے شرارتا خزانے کے بارے میں لکھا تھا جبکہ اس میں ذرہ برابر بھی حقیقت نہیں تھی۔۔۔

ابا جان یہ بات سن کر دھیمے سے مسکرا دیئے اور بولے۔۔۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔۔۔

☆☆☆☆

فوزیہ عباس

بقا کا راز

”تم موٹے ہمیشہ اپنے بڑا ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہو، آ لینے دو امی کو بتاؤں گا انھیں کہ تم نے ہم تینوں کے حصے کے انگور بھی کھا لیے ہیں۔“

گھر میں داخل ہوتے ہی فاتی بیگم کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے میرو کی آواز سنائی دی۔

”چھوڑو یار کوئی فائدہ نہیں ہے امی کو بتانے کا، وہ بھی ہمیشہ اسی کی حمایت کرتی ہیں“ میرو بولا ”دیکھو چھنکے میرے بات......“

”مت کہا کرو تم مجھے چھنکا، سخت برا لگتا ہے مجھے یہ لفظ......اور تم بھی......“ چھنکے نے تڑخ کر جیرو کی بات کاٹی۔

”کیا بات ہے؟ کس لیے جھگڑا ہو رہا ہے؟“ فاتی بیگم نے اندر داخل ہو کر پوچھا۔

”امی دیکھیں ناں جیرو ہم تینوں کے حصے کے انگور بھی کھا گیا ہے“ بیرو ماں کی جانب دیکھ کر جلدی سے شکایتی انداز میں بولا۔

”پتا نہیں اس کا پیٹ ہے یا کنواں، صبح سے شام تک کھاتا رہتا ہے لیکن پھر بھی نہیں بھرتا“ بیرو کے خاموش ہوتے ہی چھنکا پھر غصے سے بولا۔

”جیرو.....کھا گیا ہے.....اس کا پیٹ کنواں ہے.....ٹھونستا رہتا ہے“ فاتی دونوں بچوں کے جملے دہرا کر بولی ”یہی سکھا رہی ہوں میں تمھیں کہ بڑے بھائی کا نام لے کر یوں بدتمیزی سے اس کے ساتھ بات کرو......اور میرو تم!“ فاتی بیگم نے میرو کی جانب دیکھا۔“

”کیا کہہ رہے تھے تم کہ امی کو بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے وہ ہمیشہ جیرو کی حمایت کرتی ہیں“

”ارے بے وقوفو، ماں تو ماں ہوتی ہے جو اپنے سارے بچوں کو ایک جیسا چاہتی ہے۔ رہی انگوروں کی بات تو تم تینوں سو رہے تھے اس لیے میں نے تم لوگوں کا حصہ الگ رکھ دیا تھا۔“

ماں کی بات سن کر تینوں بچوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور شرمندہ ہو کر سر جھکا دیے مگر فاتی

جانتی تھی کہ بچوں کی یہ شرمندگی وقتی ہے کیوں کہ یہ کوئی ایک دن کی بات تو تھی نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر یہ چاروں اکثر یونہی جھگڑتے، ایک دوسرے پر الزام لگاتے یا بدگمان ہو جایا کرتے تھے۔

یہ جھگڑا ایک بہت بڑے جنگل میں بیری کے گھنے درخت کی مضبوط شاخوں میں بنے فاختہ یعنی فاتی بیگم کے گھونسلے میں اس کے چاروں بچوں کے درمیان ہو رہا تھا، فاتی بچوں کی یہ حرکتیں دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھی کیوں کہ وہ تو امن، شرافت اور عقل مندی کی وجہ سے جنگل بھر میں مشہور تھی اور جنگل کے تمام چھوٹے بڑے جانور اور پرندے اپنے اختلافات اور چھوٹے موٹے لڑائی جھگڑوں میں فاتی بیگم سے صلاح مشورہ ضرور کرتے اور اس کی رائے کو اہمیت دیتے تھے۔ سوائے چیلو بیگم کے۔ اس وقت بھی فاتی اپنی ایک سہیلی بلبل بیگم اور اس کی پڑوسن کوئل خانم کے درمیان صلح کروا کر آئی تھی مگر اس کے اپنے بچے ماں کا الٹ تھے۔ کانوں کے کچے، ضدی، ہٹ دھرم، غصے کے تیز اور نادان۔ خاص طور پر چھنکا تو ذرا ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔ اب تو کچھ عرصے سے فاتی اس میں ایک اور تبدیلی محسوس کر رہی تھی اور وہ تھی بات بے بات اپنے گھر، ماں اور بھائیوں سے نفرت اور بیزاری کا اظہار۔

’’نوکر نہیں ہوں میں ان کا، جسے دیکھو اٹھتے بیٹھتے مجھے ہی حکم دیتا رہتا ہے۔‘‘

’’لیکن تمھیں تو میں چاول لانے کو کہہ رہی ہوں اور پھر بھلا اس میں نوکر ہونے کی کیا بات ہے۔ بھائی ہی بھائیوں کے کام کرتے ہیں۔‘‘ چھنکے کی بات سن کر فاتی نے اسے سمجھایا۔

’’نہیں میں نہیں جاؤں گا، آپ جیرو سے منگوا لیں‘‘ چھنکے نے ہٹ دھرمی سے انکار کیا تو فاتی کو بھی غصہ آ گیا مگر وہ جانتی تھی کہ اس طرح بات اور بگڑ جائے گی اس لیے تحمل سے بولی۔

’’وہ ابھی بیرو کے لیے دوا لے کر آیا ہے اور پھر وہ تمھارا بڑا بھائی ہے۔ بیٹا میں نے تمھیں کتنی مرتبہ سمجھایا ہے یوں بدتمیزی سے بڑوں کا نام نہ لیا کرو، بری بات ہوتی ہے۔‘‘

’’بڑے، بڑے، بڑے آخر کتنے بڑے ہیں یہ تینوں مجھ سے؟ دس سال؟ بیس سال؟ یا سو سال؟ صرف یہی فرق ہے نا ان میں اور مجھ میں کہ یہ تینوں انڈوں سے مجھ سے پہلے نکلے تھے، پھر کیوں آپ ہر وقت ان کے بڑا ہونے کا رعب جماتی رہتی ہیں۔‘‘

چھنکے کی بات سن کر فاتی ششدر رہ گئی، وہ تو ہمیشہ اپنے بچوں کو مل جل کر پیار محبت سے رہنے اور ایک دوسرے کی عزت و احترام کرنے کی تلقین کرتی تھی پھر یہ چھنکا کیسی باتیں کر رہا تھا۔

اصل میں اس دن بیرو کے پیٹ میں درد تھا، فاتی نے جیرو کو حکیم جی کے پاس بھیجا تو انھوں نے دوا دینے کے ساتھ کہا کہ بچے کو کھانے میں ہلکی غذا مثلاً دلیہ یا کھچڑی وغیرہ کھلائیں، مونگ کی دال گھر میں موجود تھی، صرف چاول لانے تھے۔ میرو اپنے دوست کے ساتھ کہیں گیا ہوا تھا اس لیے فاتی نے چھکے سے کہا کہ وہ بھاگ کر چاول لا دے۔ بس اتنی سی بات پر وہ بھڑک اٹھا تھا۔

"چھکے کیوں بدتمیزی کر رہے ہو، جاؤ امی کو چاول لا کر دو، گھر کے کام کرتے ہوئے تو تمھاری جان نکلتی ہے" جیرو جو اندر بیرو کے پاس بیٹھا تھا، باہر آ کر بولا۔

"ہاں نکلتی ہے میری جان، تمھیں کوئی تکلیف ہے، میرو ہر وقت گھومتا رہتا ہے اسے تو کوئی کچھ نہیں کہتا، سب کے کام کرنے کے لیے بس میں ہی رہ گیا ہوں۔"

"بیٹا کیسی باتیں کر رہے ہو؟ گھر کے کام تو سب مل جل کر ہی کرتے ہیں ناں" فاتی نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھکے کو پیار سے سمجھایا۔

"بالکل..... اگر تمھیں اس گھر میں رہنا ہے تو باقی سب کی طرح تمھیں بھی کام کرنا پڑے گا" جیرو تیزی سے بولا۔ اب کہنے کو تو اس نادان نے بے وقوفی کی بات کر دی تھی مگر اس کے نتیجے میں چھکے کے ردعمل نے نہ صرف جیرو کو بلکہ فاتی کو بھی حیران کر دیا۔

"ہاں ہاں میں تو جیسے مرا جا رہا ہوں تم سب کے ساتھ رہنے کے لیے...... اور یہ گھر ہے؟" چھکے نے چاروں طرف اشارہ کرتے ہوئے نفرت سے کہا "اس کو گھر کہتے ہیں، میرا تو دم گھٹتا ہے یہاں، اس قدر پابندیاں ہیں...... یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، یہاں نہ جاؤ اس سے نہ ملو، اُس سے نہ ملو، بھاگ بھاگ کر سب کے کام کرو، اِس پر نوابوں کے نخرے الگ...... اور صبح شام نصیحتیں سن سن کر تو میرے کان پک گئے ہیں۔"

"کیا ہو گیا ہے چھکے تمھیں؟ یہ کیسی باتیں سوچنے لگے ہو بیٹا تم؟" فاتی پریشان ہو کر بولی۔ ایک چھوٹی سی بات نے سنجیدہ جھگڑے کی صورت اختیار کر لی تھی۔

"مت کہیں آپ مجھے بیٹا، اور میں آپ کا چھکا بھی نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے اس گھر میں کسی کو مجھ سے محبت نہیں ہے تو مجھے بھی آپ سب کے ساتھ رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے، اب میں اپنا الگ گھر بنا کر سکون سے اپنی مرضی کی زندگی گزاروں گا" دوٹوک الفاظ میں کہہ کر چھکا باہر جانے کے لیے مڑا تو فاتی تڑپ کر آگے بڑھی اور اسے روک کر بولی۔

"خبردار جو تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا، ارے نادانوں تم چاروں تو میری جان ہو، ہزار مصیبتیں اور مشکلیں جھیل کر تنکا تنکا جوڑ کر میں نے یہ آشیانہ بڑے ارمانوں اور اُمیدوں کے ساتھ بنایا تھا، کیسے کیسے خواب دیکھے تھے میں نے کہ تم سب یہاں مل جل کر پیار محبت سے رہو گے، تم کیا سمجھتے ہو اس اتنے بڑے جنگل میں جہاں بھانت بھانت کی مخلوق بستی ہے اس گھر سے نکل کر تم اپنی الگ شناخت بنالو گے! یہ تمھاری بھول ہے۔ یاد رکھو یہ گھر جیسا بھی ہے تمھاری واحد پناہ گاہ یہی ہے۔ جو تحفظ اور سکون اتحاد و اتفاق میں ہے وہ تنہا رہنے میں نہیں۔ میرے بچے گھر بنانے سے زیادہ اس کو بسانا اور اس کی حفاظت کرنا مشکل ہوتا ہے، چلو آؤ غصہ تھوک دو، شاباش"

فاتی ماں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جہاں دیدہ فاختہ بھی تھی، جو جنگل کے دستور اور طریقوں سے بخوبی واقف تھی، مگر جب خودسری اور بدگمانی حد سے بڑھ جائے تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی، یہی حال چھکے کا تھا۔ وہ فاتی کے سمجھانے اور روکنے کی پروا کیے بغیر یہ کہتا ہوا گھر سے نکل گیا کہ "میں اب ایک منٹ بھی یہاں نہیں رکوں گا اور آپ سب کو اپنا الگ گھر نہ صرف بنا کر بلکہ بسا کر بھی دکھاؤں گا۔"

چھکے کے یوں ایک معمولی سی بات پر ہنگامہ کھڑا کر دینے اور گھر چھوڑ کر چلے جانے کی وجہ سے فاتی کو شدید صدمہ پہنچا تھا، چھکے کا سارا سارا دن گھر سے باہر رہنا، اس کا بدلا بدلا رویہ غرض کہ گزشتہ چند ماہ کے تمام حالات و واقعات جب ایک ایک کر کے یاد آتے تو وہ بے چین ہو جاتی تھی مگر پھر اپنے گھر کو مزید بکھرنے سے بچانے کے لیے اسے سنبھلنا پڑا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جنگل میں بھی اس غیر معمولی واقعے کی بازگشت سنائی دینا بند ہو گئی اور زندگی معمول کے مطابق رواں دواں ہو گئی تھی۔

ادھر گھر سے نکلتے ہی چھکے کی تو گویا کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر شہتوت کے ایک درخت پر اپنا گھونسلا بنایا، اسے خوب سجایا اور سنوارا اور مزے سے رہنے لگا۔

"ہونہہ گھر بنانے سے زیادہ اس کو بسانا مشکل ہوتا ہے۔" چھکا اکثر فاتی کی بات یاد کر کے اپنے سجے سجائے خوب صورت بڑے سے گھر کو دیکھ کر فخر سے سوچتا "اب آ کر دیکھیں ناں میرا گھر تو پتا چلے انھیں۔"

چھکے کے دن دوستوں کے ساتھ ہنسی خوشی گزر رہے تھے، وہ اپنے گھر، ماں اور بھائیوں کو بھی تقریباً بھول چکا تھا۔ یہاں تک کہ جب ایک دن جیروا سے منا کر گھر لے جانے آیا تو وہ اس کیساتھ بھی بہت بدتمیزی سے پیش آیا تھا۔

"گھر؟ کون سا گھر؟ میرا گھر تو یہ ہے اور میں اب یہیں رہوں گا، اچھی طرح دیکھ لو یہ گھر تمھارے گھر سے کہیں زیادہ بڑا اور خوب صورت ہے۔ اس میں سہولت اور ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ یہاں میرے سونے جاگنے، کھانے پینے اور آنے جانے پر پابندیاں ہیں اور نہ نصیحتوں کے انبار، جاؤ چلے جاؤ اب میرا تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے" چھکے نے گھر میں موجود دوستوں کی پروا کیے بغیر رکھائی سے کہا۔

"چھکے ضد چھوڑ و اور گھر چلو، امی تمھارے لیے بہت پریشان رہتی ہیں" جیرو نے بھائی کو آمادہ کرنے کی آخری کوشش کی۔

"کسی کو میرے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، یہاں سب میرے دوست ہیں خاص طور پر چوچو اور اس کے گھر والے مجھ سے بہت پیار کرتے اور میرا خیال رکھتے ہیں۔"

اور چھکے کی یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ چوچو واقعی اس کا گہرا دوست تھا اور اس کی امی بھی چھکے کو بالکل اپنے بچوں کی طرح سمجھتی تھیں۔ اسی لیے تو گھر چوڑنے کے بعد وہ سیدھا انھی کے گھر گیا تھا، پھر نئے گھونسلے کے لیے جگہ اور درخت کے انتخاب سے لے کر اسے بنانے اور سجانے سنوارنے تک ہر ہر موقع پر چوچو کی امی نے چھکے کی رہ نمائی اور مدد کی تھی اور اب بھی وہ ہر روز اس کے پاس آتیں اور اس کے کھانے پینے اور دوسرے ضرورتوں کا خیال رکھتی تھیں۔

اس رات موسم بے حد خراب تھا، گرج چمک کے ساتھ خوب طوفانی بارش ہو رہی تھی، فاتی کا دل اپنے چھکے کے لیے بہت پریشان تھا، طرح طرح کے خیال اور وسوسے اسے دہلا رہے تھے۔ جب کہ چھکا اپنے گھر میں اردگرد سے بے خبر مزے سے خوب گہری نیند سو رہا تھا۔ اچانک زور سے بادل گرجے تو اس نے کسمسا کر کروٹ بدل لی، دوبارہ بادلوں کی گرج کے ساتھ جب بجلی بھی چمکی تو چھکے نے ذرا سی آنکھیں کھولیں اور پھر موندتے ہی چونک کر پٹ سے کھول دیں۔ مگر پھر اگلے ہی پل اسے اپنا وہم جان کر اور یہ سوچ کر کہ "بھلا آدھی رات کو اتنی تیز بارش میں ان کا یہاں کیا کام" وہ سر جھٹک کر دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ پر نیند نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اچانک چھکے کو ایسا لگا جیسے کوئی آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس پر تیز ہواؤں کا شور، بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور لحظہ لحظہ کسی کے قریب سے قریب تر ہونے کا احساس، چھکے کا سانس رکنے لگا۔ وہ ایک دم گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ عین اسی وقت زور سے بجلی چمکی اور ایک ساتھ دو چیخیں جنگل میں گونجیں۔ ایک گھٹی گھٹی اور دوسری بہت کرخت۔ جس سے حملے

میں ناکامی کے بعد شکار کو اپنے خونی پنجوں میں دبوچنے اور چیر پھاڑ کر ہڑپ کر جانے کی بے تابی چھلکتی تھی۔

''کیا یہ آپ ہیں چیلو خالہ؟'' چھٹکے کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایک کونے میں دبک کر سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ہاں یہ میں ہوں چوچو کی ماں چیل عرف چیلو بیگم''

بجلی کی چمک میں چھٹکے نے چیلو بیگم کو بڑے بڑے پر پھیلائے آواز کے تعاقب میں اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو اندھیرا چھاتے ہی جگہ بدل لی، اسے ابھی تک اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر چیلو بیگم نے خود ہی اپنے چہرے سے پیار محبت، ہمدردی اور خلوص کا نقاب اتار دیا اور مکاری سے قہقہہ لگا کر بولی۔

''نادان بچے! میں نے اسی دن کے لیے تو یہ سارے پاپڑ بیلے تھے، کب سے منتظر تھی میں اس لمحے کی۔ یہ میری پہلی کامیابی ہے۔ ایک ایک کر کے میں فاتی سے اس کے سارے بچے چھین لوں گی اور پھر اسے بھی ختم کر کے اس کے درخت اور گھونسلے پر قبضہ کر لوں گی۔''

اصل میں شروع دن سے ہی چیلو بیگم کی نظر فاتی کے گھونسلے پر لگی تھی کیوں کہ اس کا اپنا گھونسلا ایک بے حد سوکھے سڑے درخت کی کمزور ٹہنیوں پر تھا جس پر پتے تھے اور نہ ہی کوئی پھل لگتا تھا۔ جب کہ فاتی کا گھونسلا بیری کے گھنے سرسبز درخت پر تھا جس پر خوب موٹے موٹے لال رس سے بھرے ہوئے میٹھے بیر لگتے تھے جو چیلو بیگم اور اس کے بچوں کو بہت پسند تھے اور اب تو فاتی کے چار چھوٹے چھوٹے گول مٹول بچے بھی تھے جن پر چیلو بیگم کی رال ٹپکتی رہتی تھی۔ فاتی ہمیشہ چیلو بیگم کے ہر حربے اور حملے کو اپنی عقل مندی سے ناکام بناتی رہی تھی۔ چناں چہ اس مرتبہ اس نے خوب سوچ سمجھ کر یہ منصوبہ بنایا تھا کہ پہلے باری باری فاتی کے چاروں بچوں کو ماں کے خلاف بھڑکا کر ٹھکانے لگائے گی اور پھر جب فاتی ان کے غم سے نڈھال ہو کر مزاحمت کرنے کے قابل نہیں رہے گی تو اسے بھی مار کر اس کے گھونسلے پر قبضہ کر لے گی۔

چیلو بیگم کا منصوبہ سنتے ہی چھٹکے کو اپنی حماقت کا احساس ہو گیا اور اسے امی کی باتیں یاد آنے لگیں جو اکثر کہا کرتی تھی کہ:

''میرے بچو! جس دن سے میں نے یہ گھونسلا بنایا ہے دشمن ہماری تاک میں ہے۔ تم سب آپس میں لڑ جھگڑ کر اس کا کام آسان کرنے کے بجائے مل جل کر کیوں نہیں رہتے۔ یاد رکھو اتفاق و اتحاد میں بڑی طاقت ہے اور اسی میں تمھاری اور اس گھونسلے کی بقا ہے۔''

بارش اور طوفان تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے، چھنکا ایک کونے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں چھپتا پھر رہا تھا۔ اندھیرے نے اسے ابھی تک تو چیلو بیگم کے پنجوں میں جانے سے بچا رکھا تھا لیکن آخر کب تک۔ روشنی پھیلتے ہی چیلو بیگم نے اس کے نرم لذیذ گوشت کا ناشتا کر لینا تھا۔ بس یہی سوچ کر چھنکے نے ایک فیصلہ کیا اور اپنی تمام ہمت اور طاقت جمع کر کے اس پر عمل کر گزرا۔

ادھر چھنکے کے لیے فاتی کی بے چینی لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا دل ایک ماں کا دل تھا جو اس وقت کسی انجانے خوف سے لرز رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر چھنکے کی سلامتی کے لیے دعائیں تھیں۔ وہ بار بار یہ سوچ کر خود کو بہلا رہی تھی کہ صبح ہوتے ہی وہ جیرو کے ساتھ جا کر اپنے بیٹے کو منا لائے گی۔

”امی……امی مجھے بچالیں……امی جان……ام……م……ی ی ی“

اچانک فاتی کو چھنکے کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی وہ تھکن سے نڈھال، بارش میں بھیگا ہوا گھر میں داخل ہوا اور اماں سے لپٹ گیا۔ فاتی اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی مگر چیلو بیگم کی آواز سنتے ہی سارا قصہ جان گئی جو چھنکے کے پیچھے پیچھے یہاں تک پہنچ گئی تھی اور وار خالی جانے پر غصے سے بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔ تب فاتی نے اپنے تینوں بچوں کے ساتھ مل کر چیلو بیگم کو خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اسے اتنا مارا کہ وہ الٹے پاؤں جان بچا کر بھاگی۔

”امی جان مجھے معاف کر دیں۔ میں نے چیلو بیگم کی باتوں میں آ کر آپ کا بہت دل دکھایا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی آپ کو اور اس گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا اور بڑے بھائیوں کا بھی احترام کروں گا۔ واقعی اتحاد میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اگر آج آپ سب مجھے نہ بچاتے تو چیلو بیگم تو مجھے کھا جاتی۔“

”خدا نہ کرے میرے بچے، ایسی بری باتیں منہ سے مت نکالو“ فاتی نے آگے بڑھ کر چھنکے کو سینے سے لگایا تو وہ بھائیوں کی جانب دیکھ کر بولا۔

”خدارا آپ سب بھی مجھے معاف کر دیں۔ میں تو آپ کا چھنکا ہوں ناں۔‘

”ہررے…… ہمارا چھنکا زندہ باد“ جیرو، میرو اور بیرو نے زوردار نعرہ لگایا تو چھنکا مطمئن ہو کر فاتی کے پروں میں کچھ اور سمٹ گیا۔

اس واقعے نے تو جیرو کی سوچ بھی بدل ڈالی تھی۔ جس کا دل چھنکے کا بڑا سا گھونسلا اور ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر علیحدہ ہونے کے لیے مچلنے لگا تھا، آج اس نے بھی اپنی بقا اور سلامتی کا راز جان لیا تھا۔

قانتہ رابعہ

اب دکھ پھر سکھ

”غریب آباد“ کے نام سے یہ بستی ریلوے اسٹیشن سے صرف پانچ سات منٹ کے فاصلے پر آباد تھی۔ کہنے کو بستی کا نام غریب آباد، لیکن اس کے باسیوں کے دل بہت امیر تھے۔ حد درجہ مہمان نواز، ملنسار اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں دل و جان سے کام آنے والے۔ فاطمہ اکثر سوچتی محض ایک دولت نہ دے کر اللہ نے انہیں کتنی خوبیوں سے نواز رکھا ہے۔ اور شاید ایسے بھی ہو جائے۔۔!!! (لیکن اس صورت میں باقی خوبیاں ایک ایک کر کے رخصت ہو جائیں!!) ”غریب آباد“ میں زیادہ تر مکان کوارٹروں کی طرز پر بنائے گئے تھے دو اڑھائی مرلہ سے چار پانچ مرلہ تک کے ان مکانات میں وہ تمام سہولتیں موجود تھیں جو بڑے گھروں اور بنگلوں میں ہوتی ہیں پنکھے، ایئر کولر، واشنگ مشین، کمپیوٹر، کیبل۔۔ اور جن کے بیٹے پاکستان سے باہر درہم ڈالر کما رہے تھے ان کے گھروں میں قالین، اے سی بھی موجود تھے۔ سردیوں کے موسم میں سردی کی شدت کو کم کرنے کے لیے ہیٹر، گیزر، کپڑے سکھانے کے لیے ڈرائیر تک کی سہولت تھی۔ ان گھروں میں زیادہ تر نچلے درجہ کے سرکاری ملازم رہتے تھے اور جو سرکاری ملازمت کے اہل نہ تھے وہ چھوٹے موٹے کاروبار کے ذریعہ زندگی کی گاڑی کھینچ رہے تھے۔ زندگی کے دن بہت عیش و عشرت اور خوشحالی میں نہ سہی تو برے اور تنگی میں بھی نہ تھے۔

انہی گھروں میں ایک گھر فاطمہ کا بھی تھا جس کا میاں سبزی منڈی سے علی الصبح سبزی اور پھل لاتا اور ٹھیلے پر فروخت کرتا۔

فاطمہ کے چار بچے تھے جن میں سب سے بڑی بیٹی میٹرک کا امتحان دے کر فارغ تھی اور سب سے چھوٹا بیٹا کلاس سوئم کا طالب علم تھا۔

فاطمہ کے ساتھ والا گھر صغریٰ کا تھا جو اس کی سگی بہن تھی اس کا میاں بھی فاطمہ کے میاں کی طرح پھلوں اور سبزیوں کا ٹھیلہ لگاتا۔ اتفاق سے اس کے بھی چار بچے تھے اور مزید اتفاق یہ کہ اس کی بڑی بیٹی نائلہ فاطمہ کی بڑی بیٹی کی ہم جماعت تھی۔ البتہ فاطمہ کی طرح اس کے ہاں دوسرے نمبر کی بیٹی نہیں بیٹا تھا بے حد کھلنڈرا،

موڈی اور لاپرواہ۔۔۔

دونوں بہنوں کے مزاج میں زمین آسمان کا سا فرق تھا۔ فاطمہ ہر وقت تربیت کا ڈنڈا سرہانے رکھتی۔ اس کے دل میں بلاشبہ اولاد کے لیے محبت کے فوارے ابلتے لیکن نظریں عقاب کی سی تھیں۔ ہر کام میں اس کی ہدایات شامل ہوتیں۔ یہ کیوں ہوا؟ ایسے کیوں نہیں کیا؟؟؟ کی گردان میں دن گزر جاتا۔ ہمہ وقت خود بھی مصروف رہتی اور بچوں کو بھی مصروف رکھتی۔ جوتا ٹوٹ گیا۔۔ فاطمہ بیگم گھر میں ہی کیل، دھاگے کی مدد سے جوتے گانٹھ لیتیں۔ اچار، چٹنیاں، مربے سب گھر میں بنتے۔ اگر قسمت سے کوئی بچہ ایک منٹ کے لیے فارغ ہوتا وہ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو جاتی۔

''ارے یہ کیا! لڈو کھیلی جا رہی ہے؟؟ خدا کا خوف کرو چھوڑو یہ سب کھیل تماشے۔۔ اٹھو ندا بیٹا تم کپڑے پریس کرو اور ضحیٰ تم لہسن چھیلو۔ اور۔۔ اور تم وہ اپنے بیٹے ابوبکر کی طرف متوجہ ہوتیں۔ اس کو دیکھو بجائے بہنوں کو مت (عقل) دینے کے خود ساتھ وقت برباد کر رہا ہے چلو جلدی سے جاؤ اور سرف کی تھیلی لے کر آؤ مجھے کپڑے دھونا ہیں۔

منہ بسورتی، روتی دھوتی بیٹیوں پر فاطمہ کو ذرہ بھر ترس نہ آتا۔ کئی دفعہ بڑی بیٹی ندا غصے سے دھپ دھپ کر کے پاؤں اٹھاتی، برتن پٹختی لیکن مجال ہے جو فاطمہ پر اثر ہو یوں لگتا ہے جیسے کانوں میں تیل ڈال رکھا ہے کوئی منت سماجت اس پر اثر نہ کرتی۔ فاطمہ دبلی پتلی چھوٹے سے قد کی تھی لیکن بہت چست اور توانا۔۔ ایک ہاتھ سے پنکھے کا بٹن آف کیا دوسرے سے صفائی ستھرائی ہو رہی ہے۔۔ کمروں میں سیور بلب تھے جو اس وقت جلانے کی اجازت تھی جب اندھیرا پھیلنا شروع ہو جائے۔۔ ندا اور ابوبکر کی نظروں میں وہ حد درجہ ظالم، جابر اور جلاد صفت عورت تھی۔۔ جبکہ ضحیٰ کا نظریہ مختلف تھا۔۔

وہ اکثر ٹوکتی۔

''نہیں آپی۔ امی پیار کتنا کرتی ہیں اور مہمان نواز کتنی ہیں۔۔ کتنی بیمار عورتوں کو کھانا بنا کر بھجواتی ہیں۔

ندا منہ بناتی۔۔۔ ''ہاں جی تم ان کی تعریف نہیں کرو گی تو کون کرے گا۔۔۔ لیکن مجھے یہ پسند نہیں۔۔ ہر وقت ٹوکتی رہتی ہیں۔۔ گرمیوں میں ایک ہی کمرے کا پنکھا چلے گا دوسرے کمرے میں جانے اور پنکھا چلانے کی اجازت نہیں۔۔

ضحیٰ مسکراتی۔۔ آپ کو تو پتہ ہے آپی بجلی کی جتنی چیزیں بیک وقت چلیں گی میٹر کو پہیے لگ جائیں گے

ویسے بھی ان کا خیال ہے کہ اولاد آپس میں مل بیٹھ کر رہے تو پیار محبت بڑھتا ہے ۔۔ بجلی کا بل بھی کم آتا ہے دو فائدے ملتے ہیں ۔۔“

دو فائدے ملتے ہیں ۔۔ کنجی کا مذاق اڑایا جاتا جس وقت مہمان آئیں تو مہمان خانے کا پنکھا چلا دو ۔ بچوں کا بند کر دو ۔۔ اس میں کتنے فائدے ہیں؟

دروازہ کھلا اور فاطمہ اندر آئی ۔۔۔ ندا کو سینے سے لگایا بیٹے آج تو نہیں کل آپ کو ضرور فائدے نظر آئیں گے ۔ کبھی کبھار پنکھا بند کر کے بیٹھنے کا صرف اس لیے کہتی ہوں کہ انسان کو ہنگامی حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے ۔۔ آج تو جیسے تیسے گزر جائے گا کل کس نے دیکھا ہے!! رہی دوسری بات کہ ہر وقت تم لوگوں کو ٹوکتی ہوں ۔۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ۔۔ بس مجھے یہ بتا دو میں نے صغریٰ کے بچوں کو کبھی نہیں ٹوکا ۔۔ تم لوگوں کو برے کام سے روکنا میری عادت نہیں ضرورت ہے ۔۔ تم برا مانو یا بھلا ۔۔ بے کار کاموں پر میں روکوں گی ۔۔

ندا بس صبر کا گھونٹ پی کر چپ کی چپ رہ گئی ۔ صغریٰ خالہ ان کی آئیڈیل بنتی جا رہی تھیں ۔۔۔ گھی کے کنستر کیوں نہ بہہ جائیں مجال ہے جو اولاد کو ایک لفظ کہیں کیا افسانوں ڈراموں والا ماحول ہے گھر کا ہر وقت ہنسی، قہقہے، موج میلہ ۔۔ مزے ہی مزے نہ روک ٹوک نہ بختی ۔ خالہ کے گھر پر رشک بھرے جذبات سے ندا کی آنکھوں میں ستارے سے چمکنے لگے ۔

سنبھالیں اپنے شاہزادوں کو، میں جا رہی ہوں ۔۔ چار دن رکھیں گے تو آٹے دال کا بھاؤ خود ہی معلوم ہو جائے گا ۔۔۔ صغریٰ کی تیز آواز دیوار کے اس پار فاطمہ کو سنائی دی ندا امی کے ساتھ کپڑے دھلوا رہی تھی ۔ بے اختیار بولی ۔

یا اللہ خیر ۔۔ خالہ کا آج صبح ہی پارہ ہائی ہو گیا ہے ۔ ہاں تو جاؤ ۔۔ جہاں جانا چاہتی ہو جاو، میں نہیں روکوں گا ۔ خالو نے کہا، غضب خدا کا گھر ہے یا شاہی محل، جتنا خرچ تم کرتی ہو اس میں تو دس گھر چل جائیں ۔۔ مجھ سے پوچھو ۔۔ جو خون پسینہ ایک کر کے کماتا ہے ۔۔ ایک روپیہ خرچ کرنے سے پہلے دس دفعہ سوچتا ہوں اور بیگم کا حال یہ ہے کہ کھلا خرچہ کرتی ہیں کوئی چھابڑی ٹھیلے والا آئے خالی نہیں جانے دیتیں ہزار دفعہ سمجھایا ہے سوچ سمجھ کر خرچ کرو، آنے والے وقت کا کسی کو کیا علم کچھ جمع ہونا چاہیے ۔۔۔ مجال ہے جو ۔۔۔

فاطمہ، ندا کا ہاتھ پکڑ کر اندر کمرے میں لے گئی ۔۔۔۔ صغریٰ کا میاں بہت کم غصے میں آتا تھا لیکن

جب غصے میں آتا تھا اگلی پچھلی کسر نکال دیتا تھا۔۔۔۔فاطمہ نہیں چاہتی تھی ندا کے کانوں میں لڑائی کی آوازیں جائیں۔

چند ہی لمحوں کے بعد کسی نے فاطمہ کے گھر کا دروازہ دھڑ دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔۔۔ابوبکر کی ڈیوٹی گھر کا دروازہ کھولنے کی تھی جونہی اس نے دروازہ کھولا، صغریٰ کا میاں کاغذات کا پلندہ لیے داخل ہوا۔

اس کے چہرے پر وحشت ناک حد تک غصے اور مایوسی کی کیفیت طاری تھی۔۔

ندا نے جلدی سے کرسی آگے رکھی۔

خالو جان پہلے بیٹھ جائیں۔۔ضحیٰ جلدی سے ٹھنڈے شربت کا گلاس لے آئی۔

سارے ماحول پر سناٹا طاری تھا۔۔

بہت ضبط کرنے کے بعد صغریٰ کے میاں بولے۔

آپا اپنی بہن کو سمجھائیں، میں کسی ملک کا بادشاہ نہیں ہوں نہ ہی کمانے والی مشین ہوں جتنا بے جا خرچ وہ کرتی ہے اس سے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جائے۔۔۔آج تو یہ دور ہے کہ ہر فرد کمانے کی مشین بن جائے تو بھی گزارہ نہیں ہوتا، میں دن رات کماتا ہوں اور یہ پلک جھپکنے میں اڑا دیتی ہیں۔

بھائی بات تو بتائیں، فاطمہ نے آہستہ سے کہا

”یہ۔۔یہ دیکھیں، بجلی کا بل۔۔اس نے بل ہوا میں لہرایا۔دو ماہ پہلے بل آیا تو میں نے اسے رقم دی اور تاکید کی کہ منصور کو دے کر ادائیگی کروا دینا۔۔۔میں بے فکر ہو گیا۔پچھلے ماہ جب ہزاروں میں اتنا بھاری بھرکم بل دیکھا تو میں حیران پریشان رہ گیا۔۔۔دیکھا تو دو ماہ کا تھا۔۔پوچھنے پر فرمایا وہ پیسے تو نائلہ کی پارٹی پر سوٹ، جوتے اور جیولری لینے میں خرچ ہو گئے تھے۔۔لاحول ولاقوۃ۔۔بھلا کوئی تک بنتی ہے۔۔پندرہ ہزار روپے بل۔۔۔میں نے اِدھر اُدھر سے پکڑ کر پندرہ ہزار روپے دیئے اور تاکید کی اس دفعہ یہ اللوں تللوں میں نہ لگا دینا۔۔۔دو چار دن کے بعد پتہ چلا کہ بل تو کہیں رکھ کے بھول گئی ہیں۔۔۔آخری تاریخ بھی گزر چکی ہے۔ پورا مہینہ بجلی میکہ کا تحفہ سمجھ کر استعمال کی۔۔۔کوئی پنکھا ایک منٹ کے لیے بند نہیں ہوا۔۔ٹی وی۔کیبل کمپیوٹر چل جائے تو چوبیس گھنٹے بند نہیں ہوتا۔۔۔بچوں کے منہ سے جو فرمائش نکلے وہ پوری کرنا اس کا فرض ہے۔۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں۔۔۔کل سارا دن موسلا دھار بارش کی وجہ سے کوئی گاہک نہیں آیا میں ٹھیلا شیڈ کے نیچے لے جا رہا تھا کہ سارے پھل گندے نالے میں گر گئے۔۔۔تباہی ہی تباہی گھر آیا تو پتہ چلا بجلی نہیں۔۔

پوچھا کب سے جواب ملا صبح سے۔۔ میں سمجھا شاید لوڈشیڈنگ ہے وہ تو چھوٹی بیٹی نے بتایا کہ واپڈا والے بجلی کی تار کاٹ گئے ہیں اس ماہ کے دس ہزار اور پچھلے ماہ کے پندرہ دے کر معاملہ حل کروالیں۔ پھر ایک دم خالو دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو دیئے۔۔

مجھے لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گا کوئی بچت نہیں کوئی امید نہیں پچیس ہزار کہاں سے لاؤں؟؟ آپ اسے سمجھاتی کیوں نہیں؟؟

ندا کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔

ہائے اگر آج امی کا ڈنڈا سر پہ نہ ہوتا تو یہی منظر ان کے گھر کا بھی ہو سکتا تھا اور ابھی تو خالو جان کو یہ بھی علم نہیں کہ ہمارے ہاں بل کتنا ہے۔۔۔۔۔۔نو سو چالیس روپے اگر یہ علم ہو جائے تو شاید ایک جنگ اور برپا ہونے کو ہے جو پچھلی تمام جنگوں پہ حاوی ہوگی۔۔۔۔ بے اختیار اس کا دل چاہا امی کا منہ چوم کر ان کو خراج عقیدت پیش کرے۔

☆☆☆☆

کہف الوری رانا

چھڑی کا جادو

شمس کے گھر والے پکنک پر جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ شمس بھی وہاں دوڑا دوڑا آیا اور کہنے لگا کہ ہم شہر کے سب سے بڑے پارک ''گروپ پارک'' میں پکنک منانے جائیں گے لیکن اس کے دو بھائی اور دو بہنیں آ کر کہنے لگیں کہ نہیں، پارک میں تو کئی بار جا چکے ہیں اس بار ہم شہر سے باہر جنگل میں خیمے لگا کر پکنک منائیں گے۔ امّی، ابّو بولے کہ چار لوگ جنگل میں پکنک منانے کا کہہ رہے ہیں جبکہ ایک پارک جانے کا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ جنگل میں ہی چلتے ہیں۔

شمس اداس ہو گیا مگر کچھ بول نہیں سکا۔ پھر وہ سب ضروری سامان باندھ کر جنگل کی طرف چل پڑے۔ جنگل ان کے گھر سے 7 گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ جنگل میں پہنچ کر انہوں نے دو بڑے بڑے خیمے لگائے، انہوں نے ایک خیمے میں کھانے پینے کا سامان رکھا اور دوسرے خیمے میں آرام کرنے چلے گئے۔

تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد امّی اور ابّو کھانے کا سامان لینے کے لیے دوسرے خیمے میں چلے گئے۔ اچانک شمس نے دونوں بہنوں کو مارنا شروع کر دیا کہ انہوں نے پارک جانے کی بجائے جنگل میں پکنک منانے کا کیوں کہا۔ وہ دونوں زور زور سے رونے لگیں۔ امّی ان کے رونے کی آواز سن کر بھاگی بھاگی آئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ دو بھائی خیمے سے باہر ہیں اور شمس انہیں بھی مار رہا تھا وہ دونوں چیخ رہے تھے۔ امّی کو یہ سب کچھ دیکھ کر شمس پر بہت غصہ آیا اور ایک چھڑی اٹھا کر لے آئیں۔ اتنے میں ابّو بھی آ گئے۔ امّی نے غصے میں آ کر وہ چھڑی شمس کے ہاتھ پر دے ماری۔ چھڑی سے روشنی نکلنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے شمس بوڑھا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر سب حیران اور پریشان ہو گئے۔ امّی بولیں، میں نے تو اسے ایک چھڑی ہی ماری ہے مگر یہ کیا ہو گیا ہے؟

بہنیں بولیں، امّی جان، یہ دیکھیں، چھڑی سے روشنی نکل رہی ہے، وہ چھڑی خود بخود امّی کے ہاتھ سے گر گئی۔ شمس کے دونوں بھائی بولے کہ ہمیں لگتا ہے کہ یہ کوئی جادو کی چھڑی ہے اور اس کا استعمال بہت خطرناک ہے، اب شمس گھر کس طرح جائے گا؟

ابّو سخت پریشانی کے عالم میں بولے کہ اب تو رات ہونے کو آ گئی ہے ہمیں کچھ کرنا ہو گا مگر کیا کیا جائے؟

اچانک ایک نوجوان خیمے کے پاس سے گزرا جو بہت خوش خوش نظر آ رہا تھا۔ شمس کے ابّو نے اسے روک

کر پوچھا کہ تم یہاں کے ہی ہو یا ہماری طرح پکنک منانے آئے ہو۔ نوجوان مسکراتے ہوئے بولا کہ میں بھی پکنک منانے آیا تھا مگر آپ لوگ مجھے بہت پریشان لگ رہے ہیں۔ مجھے بتائیں میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں۔ ابّو اسے خیمے میں لے آئے اور تمام ماجرا کہہ سنایا۔

نوجوان نے غور سے چھڑی کو دیکھا اور بولا کہ یہ چھڑی تو میری ہے اور میں ہی اسے یہاں پھینک کر گیا تھا۔ دراصل میں ایک بوڑھا آدمی تھا، اور جوان ہونے کے لیے یہ جادو کی چھڑی یہاں پھینک گیا تھا۔ یہ جادو کی چھڑی شمس کو لگی تو شمس بوڑھا ہو گیا اور میں جوان۔ اب یہ چھڑی اگر آپ مجھ پر استعمال کریں گے تو شمس اپنی اصلی عمر کا ہو جائے گا اور میں پھر سے بوڑھا ہو جاؤں گا لیکن ابھی میں آپ کو ایسا کچھ نہیں کرنے دے سکتا کیونکہ میں کچھ دنوں کے لیے جوان ہونا چاہتا تھا مگر اب صرف ایک رات کے لیے جوانی کا مزہ لے لوں پھر خود آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔

بھائی بولے مگر ہم تم پر کس طرح یقین کریں کہ تم واپس آؤ گے۔ وہ بولا میں ایک نیک اور نمازی بندہ ہوں اور کبھی بھی نہ تو جھوٹ بولتا ہوں اور نہ ہی اپنے وعدے سے پھرتا ہوں۔ اگر مجھے جھوٹ بولنا ہوتا تو میں تمہیں چھڑی کا راز ہی نہ بتاتا اور جوانی کے خوب مزے لیتا۔ مجھے آپ لوگوں کا خیال آ رہا ہے اس لیے اب میں صرف ایک رات کے لیے جوان رہنا چاہتا ہوں۔

وہ بولے، اچھا ٹھیک ہے ہم تمہارا انتظار کریں گے۔

رات ہو چکی تھی اور وہ لوگ اپنے خیمے میں چلے گئے، ابّو نے شمس کو اپنے ساتھ ہی سلا لیا۔ صبح ہوئی تو وہ نوجوان خیمے کے باہر کھڑا ان لوگوں کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا، وہ سب جاگ گئے تو نوجوان بولا، اب مجھے میری زندگی دے دو اور اپنے بچے کو بھی اس کی اپنی زندگی دے دو۔

امّی نے نوجوان کے ہاتھ پر ہلکی سی چھڑی ماری اور وہ بوڑھا ہو گیا انہوں نے دوسری جانب پلٹ کر دیکھا تو شمس دوبارہ اپنی عمر میں آ چکا تھا۔ بوڑھا اس بات پر خوش تھا کہ اس نے بڑھاپے میں بھی ایک رات کی جوانی جی لی تھی اور وعدہ خلافی یا جھوٹ سے بھی بچا رہا اور شمس کے گھر والے اس بات پر خوش تھے کہ ان کا بیٹا ٹھیک ہو گیا تھا۔ سب نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ شمس نے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کسی سے بھی جھگڑا نہیں کرے گا اور امّی نے عہد کیا کہ آئندہ غصے میں آ کر بچوں کو سزا دینے کے لیے کسی غلط چیز کا استعمال نہیں کریں گی۔

☆☆☆☆

انجینئر مالک اشتر

ٹیکسلا کی روایتی کہانی

کہتے ہیں کہ کبھی سیالکوٹ کی راج دھانی جو قدیم دور میں ساکالا کہلاتی تھی کے تحت پر سالباہن کے خوبرو بیٹے راجا رسالو کی حکومت تھی۔ وہ نہایت رحم دل اور انصاف پسند حکمران تھا۔ رعایا اس کی بہادری کے گن گاتے نہ تھکتی اور دن رات راجا کی سلامتی کی دعائیں مانگتی۔ ادھر سیالکوٹ سے کوسوں دوری پر جہلم کا مہان دریا اپنی دھن میں مست صدیوں سے نہ ختم ہونے والا سفر طے کر رہا تھا۔ یہ دریا کشمیر کی سرسبز و شاداب وادیوں کے چرن چھوتا ہوا پنجاب کے نشیبی علاقے میں داخل ہوتا تو ایک تیز موڑ کاٹتے ہوئے نیم دائرے کی شکل اختیار کر لیتا۔ بہاؤ کے اس کٹاؤ کی وجہ سے دریا کی مغربی جانب ایک افقی ٹیلا ابھر آیا تھا جس کی ڈھلوان کے ساتھ ساتھ مرمریں مونگوں کی قدرتی صناع کاری کچھ اس ڈھب سے ہو گئی تھی کہ دھوپ کی چکاچوند میں روشنی کی فصیل کا گمان گزرتا۔ برسات کے موسم میں ندی میں خوب طغیانی آتی اور پانی کی موجیں اپنے ساتھ زرخیز مٹی بہا کر لاتیں جس سے دریا کے دونوں جانب کی زمین خاصی شاداب ہو گئی تھی۔ جب فصلیں پک کر تیار ہوتیں تو سنہری خوشے، کنواریوں کی بالیوں کی طرح ککلی کلیر کھیلتے انگور، آم، انار اور سیب کے پیڑوں کی بہتات تھی۔ خودرو جنگلی پھول بھی ہوا کے دوش پر گریباں چاک کئے اٹکھیلیاں کرتے اور خوشبوئیں لٹاتے نظر آتے۔ فضا پرندوں کے سریلے نغموں سے معمور تھی۔ امن و آشتی کا ماحول دیکھ کر گماں گزرتا کہ جیسے کرشن کنہیا بانسری کی مدھر دھنیں چھیڑ رہے ہیں اور فضا میں دھنک کے رنگ رقصاں ہیں۔ شاید یہی وہ قدرتی کشش تھی جو قرب و جوار سے نقل مکانی کر کے آنے والے لوگوں کو یہاں کھینچ لائی تھی۔ انہوں نے اونچے نیچے ٹیلے ہموار کیے، مکانات کی تعمیر کی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں آباد ہو گیا۔ یوں لوگ "مانک پور" میں ہنسی خوشی بسنے لگے۔

راجا رسالو کے کانوں تک جب اس گاؤں کی شہرت پہنچی تو اس کا دل بھی وہاں جانے کے لیے مچلنے لگا۔ کافی دنوں تک موقع کی تاک میں رہا اور پھر ایک روز اس کی ضد کے سامنے ماں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے خاموشی سے رخت سفر باندھا تا کہ راج دھانی میں کسی کو راجا کی غیر حاضری کی کانوں کان خبر نہ ہو۔ اس کے وفادار گھوڑے نے بھی اسے پہچاننے میں ذرا تامل سے کام لیا کیونکہ بھیس بدلنے میں راجا کا حلیہ کافی حد

تک تبدیل ہو چکا تھا۔ اس نے گھوڑے کی کمر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر مانک پور کی جانب ہوا ہو گیا۔

ایک تھکا دینے والے سفر کے بعد جب راجا رسالو مانک پور کی حدود میں داخل ہوا تو اس وقت شام کا ہلکا ہلکا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ ناویں ناویں پرندوں کی ٹولیاں واپسی کی اڑان بھر رہی تھیں۔ آسمان کی وسعتوں میں چند آوارہ بدلیاں الف لیلوی کہانیوں کے جادوئی قالین کی مانند تیرتی نظر آ رہی تھیں۔ فضا میں گہرا سکوت طاری تھا، آبادی سے بلند ہونے والی دھوئیں کی واضح لکیر ہوا میں آڑے ترچھے خطوط کھینچ رہی تھی جسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے قدرت کا صناع ہاتھ میں برش تھامے آسمان کے وسیع و عریض کینوس پہ کچھ لکھ کر سمجھانے کی سعی کر رہا ہے۔

گاؤں میں قدم رکھتے ہی جیسے راجا رسالو کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ ٹھٹھک کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ مانک پور کی حالت زار دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ جس گاؤں کی شہرت کا تذکرہ سن کر وہ یہاں وارد ہوا تھا یہ تو اس کے عشر عشیر بھی نہیں تھا۔ محبت کے لافانی گیت گانے والی سرمئی فاختاؤں کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ فضا میں کسی انجانے خطرے کی بازگشت گونج رہی تھی۔ چاروں طرف ہُو کا عالم اور دور دور تلک ویرانی راج کر رہی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تمام گھروں کے کواڑ وا تھے۔ دکانیں کھلی تھیں اندر کوئی انسان موجود نہیں تھا حتیٰ کہ کسی آوارہ کتے نے بھی اس کی راہ میں مزاحم ہونے کی کوشش نہیں کی۔

راجا رسالو مٹی سے لیپے پوتے خالی گھروں کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھا تو دفعتاً کسی کے رونے کی درد بھری صدا اس کی سماعت سے ٹکرائی وہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے آواز کی سمت لپکا۔ روتی روتی نسوانی آواز یکایک گانے میں تبدیل ہو گئی۔ اس عجیب و غریب طرز عمل سے راجا کا دماغ گھوم گیا وہ خاصے مخمصے کا شکار تھا کہ آخر یہ خاتون کون ہے جو گاہے ہنستی ہے اور گاہے رونے لگتی ہے۔؟

موڑ کاٹتے ہی راجا کو سامنے مٹی کا تندور جلتا نظر آیا جس کا دھواں آسمان سے باتیں کر رہا تھا وہاں ایک ادھیڑ عمر خاتون آنکھوں میں آنسو لیے روٹیاں پکا رہی تھی۔ آہٹ پا کر اس نے واپس مڑ کر دیکھا اور ایک اجنبی شخص کو اپنے سامنے پا کر یوں مبہوت رہ گئی جیسے ایک طویل عرصے کے بعد اس نے کسی انسان کو دیکھا ہو۔ راجا نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے بتایا کہ گاؤں

کے قریب ہی کہیں سے ایک آدم خور قبیلہ آ کر آباد ہو گیا ہے۔ یہ خاندان تین بھائی اور چار بہنوں پر مشتمل ہے۔ بھائیوں کے نام سرکپ، سرسُکھ اور اَمبا ہیں جب کہ بہنیں کپی، کلپی، مُنڈا اور مان دھی کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔ یہ راکشس ہر روز گاؤں سے ایک شخص کو اٹھا کر لے جاتے ہیں اور اس کے تکا بوٹی کر ڈالتے ہیں۔ آج میرے بیٹے کی شادی ہے اس لیے میں خوش ہوں اور گانے گا رہی ہوں مگر جب یہ خیال آتا ہے کہ راکشس اس کا خون کر ڈالنے کو بے تاب ہیں تو فرطِ غم سے نڈھال ہو کر رونے بیٹھ جاتی ہوں" وہ سینے پر دوہتھڑ مارتے ہوئے کہنے لگی کہ بہت سے لوگ مار ڈالے گئے باقی اپنی جان بچا کر بھاگ گئے۔ کیا ڈر کر بھاگ نکلنا جواں مردوں کو زیب دیتا ہے۔۔۔؟ مجھے بھگوان سے قوی امید ہے کہ ایک دن وہ نیلے امبر سے ایک سورما کو بھیجے گا جو ان راکشسوں کا کام تمام کر دے گا اور پھر اس گاؤں کی پرانی رونقیں دوبارہ لوٹ آئیں گی"۔

راجا رسالو کو بھی اپنی بہادری پر بڑا ناز تھا مگر ان راکشسوں سے نمٹنا بھی اتنا آسان کام نہیں تھا تاہم اس نے خاتون کو تسلی دی اور خود گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ نہایت تدبر اور فراست سے اس طرح منصوبہ بندی کرنا چاہتا تھا کہ ہر آدم خور کو نہایت ہوشیاری سے ٹھکانے لگایا جا سکے۔ بالآخر راجا رسالو کی حکمت عملی کامیاب رہی اس نے رات ہوتے ہی تمام حملہ آوروں کو ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا، صرف ایک راکشس بچ رہا جسے گندگھر نامی پہاڑ کی ایک غار میں قید کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سے اب بھی اس کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

گندگھر (گنگری) کا پہاڑی سلسلہ ٹیکسلا سے چند کوس کے فاصلے پر عین شمال کی جانب واقع ہے یہاں آج بھی متعدد غاریں موجود ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بعض کے دہانے بند ہو چکے ہیں مگر ان میں سے اکثر اب بھی خوفناک اژدھاؤں کی مانند یوں منہ کھولے کھڑی ہیں جیسے ابھی کوئی قریب سے گزرا تو اسے پلک جھپکتے ہی ہڑپ کر لیں گی۔

سرکپ کا نیا روپ راجا رسالو کے لیے خاصے اچنبھے کا باعث بنا۔ دراصل وہ ماضی میں ٹیکسلا کی ریاست کا حکمران تھا اور تخت و تاج سے محروم ہونے کے بعد اپنے خاندان کے ہمراہ گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ سرکپ بڑا شاطر اور چالباز حکمران تھا اور اپنے آپ کر چوپٹ کے کھیل کا ماہر سمجھتا تھا۔ وہ اپنی مکارانہ چالوں سے مقابل کو شکست دے کر اسے جان سے مار ڈالتا۔۔۔ معصوم لوگوں کی زندگیوں سے خون کی ہولی کھیلنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ رعایا اس کے ظلم و ستم سے عاجز آ چکی تھی مگر جان کے خوف کی وجہ سے ہونٹوں پر

تالے لگا رکھے تھے۔

راجا رسالو جیسے رحم دل حکمران کو جب سرکپ کے ہاتھوں ڈھائے جانے والے ظلم و جبر کے واقعات کا علم ہوا تو وہ خاصا دل گیر ہوا اور مظلوموں کی دادرسی کی تدبیریں سوچنے لگا اور پھر ایک روز دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سرکپ کی سرکوبی کے لیے نکل کھڑا اور کشمیر کے پہاڑوں سے ہوتا ہوا سری کوٹ پہنچا۔

سری کوٹ دریائے سندھ کے مشرق اور ٹیکسلا کے شمال میں تربیلا کے قریب واقع ہے، یہ شہر گندگھر (گنگری) کے پہاڑی سلسلے کے پہلو میں صدیوں سے آباد چلا آتا ہے۔ یہاں رسالو کی ملاقات سرکپ کے حقیقی بھائی سرسکھ سے ہوئی، وہ بھی اپنے بھائی کے ہاتھوں خاصا دلبرداشتہ نظر آتا تھا۔ اس نے جب راجا رسالو کے خطرناک تیور دیکھے تو اسے سرکپ سے ٹکر لینے کے ارادے سے باز رہنے کا مشورہ دیا مگر راجا کہاں ہمت ہارنے والا تھا۔ چنانچہ اس کے بے حد اصرار پر سرسکھ نے ایک عدد بلی اور پسلی کے ہڈی کے چند ٹکڑے یہ کہ کر اس کے حوالے کیے کہ بلی راستے بھر ہڈیوں کے چٹخارے لیتی رہے گی اور اس کا اصل کام اس وقت شروع ہوگا جب ٹیکسلا کی راجدھانی میں سرکپ کے ساتھ چوپٹ کی بازی جمے گی۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ چوپٹ کھیلنے کے دوران سرکپ کی بیوی اچاردی اور تین نوجوان بیٹیاں چندی (ماہ پارہ) بھگدی (خوش قسمت) اور سنگراں (عقل مند) مخالف کھلاڑی کے مقابل براجمان ہو جاتی ہیں اور اسے اپنے حسن سے لبھاتی ہیں۔ اس طرح توجہ بٹنے سے کھلاڑی بازی ہار جاتا ہے اور شرائط کی رُو سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اگر وہ پھر بھی مقابلہ جاری رکھے تو سرکپ اپنے سدھائے ہوئے چوہوں کے جوڑے ہربنس اور ہربنسی کو اشارے سے بلاتا ہے جو پھونک مار کر دیئے کی لو بجھا دیتے ہیں اور اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر سرکپ چال تبدیل کر دیتا ہے۔ نتیجتاً مخالف بازی ہار جاتا ہے اور یوں اس کا سر قلم کر دیا جاتا ہے۔

راجا رسالو سرسکھ کی آشیرباد پانے کے بعد سفر کی صعوبتیں جھیلتا ہوا سرکپ کے دربار میں پہنچا اور چوپٹ کھیلنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ سرکپ نے اس کی ذہانت کا امتحان لینے کے لیے چند پہیلیاں پوچھیں۔ راجہ رسالو نے درباریوں کے سامنے تمام معمے حل کر کے دکھا دیئے چنانچہ محل کے ایک گوشے میں مقابلے کا میدان سجا دیا گیا۔

ابتدا میں راجا رسالو سے چند غلطیاں سرزد ہوئیں مگر وہ جی کڑا کر کے مقابلے پر ڈٹ گیا اور میدان اس کے ہاتھ رہا۔ ادھر جب آخری حربے کے طور پر سرکپ نے دیا بجھانے کے لیے چوہوں کو آزاد کیا تو رسالو نے

آستین کی جیب میں چھپی ہوئی بلی کو فوراً باہر نکالا جو دیکھتے ہی دیکھتے ایک چوہے کو ہڑپ کر گئی جبکہ دوسرا چوہا دم دبا کر بھاگ گیا۔

آہ و بکا اور منت سماجت سے مجبور ہو کر راجا رسالو نے اس کی جان بخش کر دی اور اس کی سب سے چھوٹی بیٹی" کوکلا" کو جسے سرکپ اپنے لیے بدنصیبی کی علامت سمجھتا تھا اور قتل کر دینے کے درپے تھا اپنے ساتھ لے گیا اور اس سے دھوم دھام سے بیاہ رچا لیا اس طرح میٹھی اور مدھر آواز والی کوئل یعنی راج کماری کوکلا راجہ رسالو کی بیوی کی حیثیت سے سیالکوٹ کی رانی بن گئی۔

سرکپ اور اس کا خاندان اب ماضی کی روایات کی حصہ بن کر تاریخ کے اوراق میں دفن ہو چکا ہے تاہم سرکپ اور سرسکھ کے نام سے منسوب دو اجڑے ہوئے شہر آج بھی ٹیکسلا کے اطراف میں موجود ہیں جو ان رومانوی کرداروں سے وابستہ بیتے ہوئے دنوں کے دلچسپ و عجیب قصے زبانِ خموش سے سناتے نظر آتے ہیں۔ راجا سرکپ کے نام سے مشہور اس شہر میں آٹھ خانوں والے چوپٹ کے کھنڈر کی باقیات بھی موجود ہیں۔ کھنڈرات کے آس پاس ان لق و دق ویرانوں میں آج بھی مقامی نوجوانوں کے مابین چوپٹ کی بازیاں جمتی ہیں۔

الغوزے کی مخصوص دھن پر راجا رسالو کے منظوم قصے گا کر سنائے جاتے ہیں مگر فرق صرف اتنا ہے کہ اب یہاں شیریں اور رسیلے لہجے والی کوئی کوکلا نہیں رہتی۔

☆☆☆☆

پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی

گرم گرم روٹیاں

رات کا کھانا لگ چکا تھا۔

ابا میاں ہاتھ دھو کر دسترخوان پر آنے ہی والے تھے۔ ہم سب دسترخوان پر ابا میاں کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ ابا میاں اللہ جانے دن میں کتنی مرتبہ ہاتھ دھوتے ہیں۔ اخبار پکڑ کر، اخبار پڑھ کر، دروازہ کھول کر، باہر سے آنے والے سے ہاتھ ملا کر، چولھا، چمٹا چھو کر، کپڑے استری کر کے، فریج کی بوتلیں بھر کر، غرض دفتر میں تو اللہ جانے کس طرح رہتے ہوں گے، لیکن مغرب سے کچھ پہلے گھر تشریف لاتے اور منٹ منٹ پر ہاتھ دھو کر مہنگے سے مہنگا صابن بھی دو چار روز میں گھسا ڈالتے۔ دادی جان بارہا فرماتیں ''ارے ہے لڑکے! کیا باؤلی کا ڈول بنا ہے۔ گھڑی پانی اور صابن، دماغ تو ٹھیک ہے؟ میاں! صفائی بے شک آدھا ایمان ہے، لیکن اسلام اعتدال کا بھی درس دیتا ہے، سکھلاتا ہے۔ میاں! یہ کیا حرکت ہے گھڑی گھڑی ہاتھ دھوئے جاتے ہو۔ پانی اللہ تبارک وتعالیٰ کی نادرو بہترین نعمت ہے۔ قدر کرو بیٹا!''

دادی جان چونکہ ابا میاں کی والدہ محترمہ تھیں، اس لیے ابا میاں شرمندہ ہو گئے اور فرمایا ''میں معذرت چاہتا ہوں اماں، دراصل ایسا لگتا ہے کہ ہاتھوں پر جراثیم چپک گئے ہیں۔''

''دور کرو اس سوچ کو۔'' دادی جان عاجز آ کر بولیں۔

اب عالم یہ تھا کہ گرما گرم روٹیاں اور وہ بھی خمیری روغنی نان دسترخوان پر آ چکے تھے۔ مرغ کا قورما اور دال چاول الگ خوشبوئیں بکھیر رہے تھے اور ہم سب بھوکی نظروں سے کھانے کی قابوں کو دیکھ رہے تھے اور منہ میں آیا ہوا پانی نگل رہے تھے۔

امی محترمہ نے جل بھن کر ابا میاں کو پکارا ''ارے اب آ بھی جائیں۔ کیا ناشتے تک ہاتھ دھلیں گے آج؟''

آپی گرما گرم چپاتیاں لے آئیں ''دادی جان! بسم اللہ فرمایئے۔''

انھوں نے ہاٹ پاٹ دادی جان کے سامنے رکھا۔ دادی جان کو ہائی بلڈ پریشر کی شکایت تھی۔ وہ

نافتان، قورمے سے پرہیز کرتی تھیں اور سادہ سبزی اور چپاتی کھاتیں۔ ان کی صحت ماشاءاللہ ہم مرغ قورما کھانے والوں سے بہتر تھی۔ سچ ہے سادگی میں عافیت ہے۔ ابا میاں کی گرج دار آواز آئی ”شروع کرو بیگم! میں آ رہا ہوں۔ لو میں آ گیا۔ کدھر ہے میری پلیٹ؟ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔“

ابا میاں سلیپر گھسیٹتے ہوئے اندر آ گئے۔ اچانک بجلی چلی گئی۔

”ہائے اللہ!“ ہمارے آنسو نکل پڑے۔

جی چاہا ابا میاں کو کھری کھری سنائیں۔ گھنٹہ بھر سے ہاتھ دھو رہے تھے۔ ننھا اتنی دیر میں دس مرتبہ نہا کر آ جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کانوں اور گردن پر لگا ہوا صابن کا جھاگ تولیے سے صاف کرتا ہے۔

”ہائے، اب اندھیرے میں مرغی کی ٹانگ کیسے ڈھونڈوں؟“ کامران رو دینے کے قریب تھا۔

”اری نسیمہ! او نسیمہ! روٹی اور نہ پکاؤ، موم بتیاں لے آؤ۔“ ابا میاں نے آپی کو آواز دی۔

”ٹھہرو! میں شمع دان لے کر آتا ہوں۔“

گھپ اندھیرے میں روغنی نافتانوں کی اشتہا انگیز خوش بو مزید تیز ہو گئی۔ یوں لگا جیسے ابا میاں نے شیرمالوں کا عطر لگا لیا ہو یا قورمے کے ڈونگے کو الٹ دیا ہو۔

وہ چلے گئے۔ امی اور دادی بڑبڑاتی رہیں۔

”گھنٹہ بھر ہاتھ دھلے۔ کم بخت ماری بجلی دفعان ہو گئی۔“

”ارے نگوڑا کھا لیتا دو نوالے چین سے۔ دن بھر دفتر میں خوار ہوتا ہے۔“ دادی جان نے اس انداز سے کہا کہ ہمیں بھوک اور تکلیف کے باوجود ہنسی آنے لگی۔ آپی خدا معلوم کس جگہ شمع دان تلاش کر رہی تھیں۔

امی نے کہا ”نسیمہ! او نسیمہ! شمع دان چھوٹے فریج کے اوپر رکھا ہے۔ ابا کہاں چلے گئے تمہارے؟“

”امی! شمع دان ابا میاں لے گئے ہیں۔ باہر کوئی بلی تھی۔ اسے بھگا رہے ہیں، ورنہ کھانے کے دوران کمرے میں آ کر ہم سب کو تنگ کرے گی۔“

”غضب میرے اللہ! رزق کی کیسی ناقدری ہے۔ دستر خوان پر پڑا پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور کھانے والے غائب ہیں۔ اللہ ان سب نادانوں کو معاف فرما دیں۔“ دادی جان مسلسل غصے سے بولتی جا رہی تھی۔

”ارے میرے اللہ! میرا بیٹا نہ ٹھیک سے کھاتا ہے، نہ ٹھیک سے سوتا ہے۔ موئی میمونہ کی ماں کی نظر تو نہیں لگ گئی۔ ہر وقت ہاتھ دھوتا رہتا ہے۔ دل و دماغ اس کے قابو میں نہیں رہتا، بڑبڑاتا رہتا ہے۔“ دادی

بڑبڑائیں۔

”اے ہے۔ ساٹھا پاٹھا مشہور ہے اماں بی! اس بچپن سال کی عمر میں عشق تو ہونے سے رہا۔ دن رات میں اور بچے خدمت کرتے رہتے ہیں۔ تنخواہ ماشاءاللہ شان دار ہے۔ میمونہ کی ماں سے آپ نے ان کے رشتے کی بات پینتیس سال پہلے کی تھی۔ اب بس بھی کریں۔“ امی جل کر بولیں۔

”اری بنورانی! آ بھی چکو، کیا خود سرتا پا شمع بنی باپ کے لیے جل رہی ہو۔ بھوکا مارو دگی بچوں کو۔“ امی نے آپی کو آواز دی۔

”آئی امی!“

”لو میں آ گیا بیگم! میں آ گیا اماں بی!“ ابا میاں قریب سے بولے۔ اچانک لائٹ آ گئی۔

ابا میاں کچھ گھبرائے، کچھ شرمائے تھے۔ خیر، لائٹ آتے ہی سب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دسترخوان کی جانب ہاتھ بڑھا دیئے۔

”ہائیں۔“

”ارے!“

”اُفوہ! یہ کیا۔“

”ارے میرے اللہ، یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔“

ہم سب بے ہوش ہونے کے قریب تھے۔

سارے کے سارے قتان، روغنی نان اور قورما غائب۔ دسترخوان پر صرف دادی جان کی لوکی کی بھاجی اور چپاتیاں رکھی تھیں۔ باقی برتن غائب تھے۔ کٹوردان تھا، مگر قتان غائب۔

”ارے کھانا کہاں گیا؟“

ہر کوئی ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹٹول رہا تھا۔

ننھا ہر ایک کو شک کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا آپ نے کوئی مذاق کیا ہے؟“ امی جان نے ڈرتے ڈرتے ابا میاں سے پوچھا تو وہ ناراض ہو کر دسترخوان سے اٹھ گئے۔

دادی جان نے بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کر دیا۔

خیر دال چاولوں سے پیٹ بھر اگیا۔ اللہ میاں کا شکر ادا کیا گیا۔

یہ راز نہ کھلا کہ کھانا کہاں گیا؟ برتن تو خیر دھلے دھلائے باورچی خانے میں ہی مل گئے۔

سردیوں کے دن تھے۔ چار دن بعد رات کے کھانے کے لیے امی جان نے مچھلی کے کباب بنائے۔ خوشبو ہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ عین کھاتے وقت ابا میاں ہاتھ دھو کر دسترخوان تک آئے ہی تھے کہ لائٹ چلی گئی۔ ابا میاں کھدبد کرتے دسترخوان سے شمع دان لانے اٹھے۔ لائٹ آئی تو مچھلی کے کباب غائب تھے۔ پھر تو پلاؤ، نرگسی کوفتے، شامی کباب، مرغ سب غائب ہوتے رہے۔ لائٹ جاتی تو کھانا دسترخوان پر ہوتا۔ لائٹ آتی تو کھانا غائب۔

امی اور دادی دن دن بھر گھر میں موجود پاکیزہ جنوں پر پڑھ پڑھ کر دم کیا کرتیں۔ اکیلے کمرے میں جن کے لیے سوجی کا حلوا بنا کر رکھتیں کہ کھا کر خوش ہوں گے۔

ننھا پابندی سے وہ حلوا کمرے میں گھس کر چھپ کر کھاتا اور کہتا "جن کے لیے حلوا رکھا تھا گ انہوں نے شارا کھالیا۔" (یعنی جن لوگوں کے لیے وہ حلوا رکھا تھا انہوں نے وہ سارا کھالیا)

ہم کبھی مسکراتے، کبھی روتے، کبھی ہنستے۔ ایک دن پڑوس کی آمنہ خالہ ہمارے ہاں آئیں۔ آتے ہی امی سے لپٹ گئیں۔ ہم بچوں کو خوب خوب پیار کیا اور دعائیں دیں۔

امی نے حیران ہوتے ہوئے کئی سوالات ایک ساتھ کر ڈالے۔ "خیر تو ہے بہن! گھر میں تو سب خیریت ہے؟ نظام بھائی کیسے ہیں؟ ان کی ٹانگ کا درد کیسا ہے؟ نوکری لگی یا نہیں؟"

"جی باجی! ان کو اب نوکری مل گئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب ٹانگ کا پلستر کھل گیا ہے۔ ہم نے بڑے برے دن دیکھے ہیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے آپ کا کہ آپ پابندی سے گزشتہ دو ماہ سے بھائی صاحب کے ہاتھ رات کا کھانا، نقدی، دودھ، ڈبل روٹی بھجواتی رہیں۔ اللہ آپ کو اور آپ کے گھر کو ہمیشہ خوش اور شاد آباد رکھے۔" آمنہ خالہ نے امی کو گلے سے لگالیا۔

"میں کچھ سمجھی نہیں آمنہ!" امی ایک جھٹکے سے ان سے علیحدہ ہوگئیں۔

اب تو آمنہ خالہ حیران رہ گئیں۔

"ارے بہن! کیا ہوگیا آپ کو؟ آپ ہی تو دو ماہ سے ہمارے گھر میں تافتان، کباب، پلاؤ، کھیر بھیج رہی ہیں۔ بھائی صاحب آتے اور نظام صاحب کی خیریت پوچھتے اور بچوں کو یہ کھانے اور پیسے دے جاتے، لیکن

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ بھائی صاحب جب بھی کھانا لے کر آتے آپ کے گھر میں اندھیرا ہوتا، لیکن آپ لوگوں کے بولنے کی آوازیں آتی رہتیں۔ بھائی صاحب کہتے کہ سب سو چکے ہیں۔ اندھیرے میں ٹی وی چلا کر آئے ہیں۔ پورے محلے کی لائٹ آتی رہتی، لیکن آپ کے ہاں اندھیرا رہتا۔ ساتھ میں کبھی نسیمہ (آپی) بھی آجاتیں۔ دودھ، ڈبل روٹی وغیرہ لے کر۔ بھائی صاحب اور نسیمہ برتن فوراً ہی خالی کروا کر لے جاتے اور پھر آنے کا کہہ جاتے۔ میں سوچ رہی تھی کہ آپ کا شکریہ کس منہ سے ادا کروں گی۔" امی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

دادی جان بھی وہاں آچکی تھیں۔ ان کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ روتے ہوئے بولیں "اے میرے پروردگار! ہمیں معاف کر دیجئے کہ پڑوسی کا خیال نہ رکھ سکے۔ میرا عظیم بیٹا کاہے کو دماغی مریض ہوتا۔ لعنت ہے ان گرما گرم روٹیوں پر جو بھوکے پڑوسی کے پیٹ کو نہ بھر سکیں۔ اے اللہ! ہمیں معاف فرما۔"

آپی روتے ہوئے بولیں "مجھے معاف کر دیجئے۔ ابا میاں ڈانٹ کر مجھ سے مین سوئچ آف کروادیا کرتے تھے۔"

ہم سب ہکا بکا کھڑے تھے۔

☆☆☆☆

محمد امتیاز عارف

گھر آباد رہے گا

کمرے کی چھت کے قریب دیوار کا پلستر اکھڑ گیا تھا۔ معمولی سا کام تھا، میں نے سوچا مستری کو بلانے کی بجائے مرمت کا یہ کام خود ہی کرلوں۔ سیمنٹ کا مسالہ اور کرنی لے کر میں سیڑھی پر چڑھا اور درز کو بھرنے لگا۔ اچانک پُھر سے ایک چڑیا اندر سے نکلی اور میری ناک سے ٹکرا کر اڑتی ہوئی صحن میں لگے خزاں رسیدہ امرود کے درخت پر بیٹھ کر چوں چوں کا غل مچانے لگی۔

میں نے چھت کے اس گوشے میں غور سے دیکھا تو درز میں تنکوں اور گھاس پھوس کا ایک گھونسلا نظر آیا۔ اندر انڈے پڑے نظر آئے۔ چڑیا کے ناک سے ٹکرانے کی گھبراہٹ میں کرنی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری تھی۔ میں دوبارہ مسالہ لینے کے لیے سیڑھی سے اُترا تو چڑیا امرود کی شاخ سے اڑی اور پُھر پُھر کرتی ہوئی کمرے میں گردش کرنے لگی۔ اڑتے ہوئے بھی اس کی گردن میری جانب جھکی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے گہرے سائے تھے جیسے کہہ رہی ہو کیوں میری پرسکون زندگی میں تلاطم برپا کرنے پر تلے ہوئے ہو۔

میں مسالہ لے کر دوبارہ سیڑھی پر چڑھا تو وہ پُھر پھر اور چیں چیں کرتے ہوئے کمرے سے نکل کر اُدھ کھلے کواڑ پر جا بیٹھی۔ اس کی معصوم آواز پر اور کئی چڑیاں آ گئیں اور اپنی پریشان ساتھی کی حمایت میں صدائے احتجاج بلند کرنے لگیں۔ ان کے شور سے بے پرواہ میں کرنی میں مسالہ اٹھا کر اکھڑے ہوئے پلستر کی جگہ پر لگانے ہی والا تھا کہ اچانک بے تاب چڑیا کواڑ سے اڑی اور تیزی سے میرے مسالے والے ہاتھ سے ٹکرائی۔ اس کے اڑتے ہی چڑیوں کی چوں چوں کے غل میں تیزی آ گئی۔ چڑیا کے ٹکرانے سے مسالے والا ہاتھ ہلا اور کرنی کے ٹیڑھا ہوتے ہی مسالہ پھر فرش پر گر گیا۔

”ظفر! تھوڑا سا مسالہ تو دینا۔“ میں نے اپنے ماموں زاد سے کہا جو صحن میں ایک جانب کرسی ڈالے ہوم ورک میں مصروف تھا۔ وہ اندر آیا اور چڑیوں کو دیکھ کر بولا:

لگتا ہے یہاں چڑیا نے گھونسلا بنایا ہوا ہے، بڑی پریشان لگتی ہے۔“

''اسے فکر ہے کہ کہیں اس کا گھر تباہ نہ ہو جائے۔'' میں نے کہا۔

''گھونسلا نکال کر پھینک دیجئے۔ چڑیا خود ہی چلی جائے گی۔''

ظفر نے رائے دی میں نے گھونسلے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک دم کئی چڑیاں اڑیں، انہوں نے میرا ارادہ بھانپ لیا تھا۔ میرے سر کے گرد پھڑ پھڑاتے ہوئے انہوں نے اتنی تیزی سے چکر کاٹا کہ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری آنکھیں ہی نوچ لیں گئیں۔ میں سب کچھ بھول کر چہرہ بچانے لگا۔ چڑیوں کی پھڑ پھڑاہٹ سے ریت کے ذرے اڑ کر میری آنکھوں میں جا پڑے۔ چبھن کی شدید لہر آنکھوں میں پیدا ہوئی اور میں آنکھیں ملتا ہوا تیزی سے نیچے اتر آیا۔ آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی کو رومال کے کونے سے صاف کرتے ہوئے میں نے ادھ کھلی آنکھوں سے دیوار اور امرود کے پودے پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کو دیکھا۔ وہ سب خاموشی سے میری جانب بغور دیکھ رہی تھیں جیسے میرے اگلے قدم پر اپنے ردِعمل کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔

''ننھی چڑیو! تم کیوں پریشان ہو رہی ہو؟'' میں نے پوچھ ہی لیا۔ ان کی حالت پر مجھے ترس آنے لگا تھا۔

''چوں۔۔۔چوں۔۔۔چوں' چڑیا بولی جیسے کہہ رہی ہو کہ میرا گھر تباہ کر رہے ہو اور پوچھ بھی رہے ہو کہ میں کیوں پریشان ہوں۔''

''میں کیا کروں۔ گھر مرمت کر کے اسے رہنے کے قابل بنانا چاہتا ہوں۔''

''شوق سے کرو لیکن ہمیں تو بے گھر نہ کرو۔ تمہیں اس سے کیا ملے گا؟''

''لیکن یہ شگاف بند نہ ہو گا تو دیوار پر صحیح طرح سے پلستر نہ ہو سکے گا۔' میرا جواب تھا۔

''تو کیا ہوا؟ یہ تھوڑی سی جگہ یوں ہی چھوڑ دو۔''

''پھر تو یہ کمرہ بدنما کا بدنما ہی رہے گا۔''

''تو کیا تم کمرے کی خوش نمائی کی خاطر میرا گھر اجاڑ دو گے؟ مجھے بے گھر کر دو گے؟''

''تمہارا کیا ہے تم کہیں اور گھونسلا بنا لو گی، یہ دنیا بہت وسیع ہے۔''

''دنیا وسیع ضرور ہے، لیکن دل کی دنیا بھی تو وسیع ہونی چاہیے۔ دل تنگ ہو جائیں تو یہ دنیا ایک نقطے سے بھی مختصر ہے۔ تم جس وسیع دنیا کی بات کرتے ہو، ہمارے لیے وہ بہت تنگ ہے۔ ہم جب سے دنیا میں آئے ہیں، دنیا کی وسیع دامانی کے باوجود اجڑتے ہی رہے ہیں درختوں پر گھونسلا بنایا تو بارش، طوفان اور آسمانی بجلی کا

نشانہ بن گئے۔ دانہ دنکا کی تلاش میں نکلے تو ہمارے بچے سانپوں کا نوالہ بن گئے یا تمہارے بچے کھیلنے کے لیے انہیں گھونسلوں سے اٹھا کر لے گئے۔ تم کس وسیع دنیا کی بات کرتے ہو۔

یہ وسعت دنیا ہمارے کس کام کی۔ ہاں اگر کچھ سکون ملا تھا تو تمہارے اس کمرے میں، عرصے سے میں یہاں گھر بنا کر رہ رہی تھی۔ میرے ساتھی میری قسمت پر رشک کرنے لگے تھے لیکن۔۔۔ آج۔۔۔ آج میری تباہی کا پروانہ بھی آ گیا۔"

"پیاری چڑیا! اب تم ہی بتاؤ۔ میں گھونسلے والی دیوار کو پلستر کے بغیر کیسے چھوڑ دوں۔ جب گھر کی مرمت ہوتی ہے تو تمام توڑ پھوڑ کی مرمت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اب تمہارا گھونسلا یونہی رہنے دیا جائے تو یہ کمرہ بھدا لگے گا ہی کمرے میں گھونسلے کے تنکے اور بیٹ وغیرہ بکھرے ہوں گے تو یہ سب کچھ کیا اچھا لگے گا؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔۔" چڑیا اُداس لہجے میں بولی:

"تم اشرف المخلوقات ہو بڑی بڑی غلطیاں کر لیتے ہو پھر یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیتے ہو کہ انسان خطا کا پتلا ہے لیکن ہم حیوانوں کی چھوٹی سے غلطی کو بھی درگزر کے قابل نہیں سمجھتے۔ تمہارے بچے کپڑے اور بستر خراب کر دیں تو تم انہیں معاف کر دیتے ہو، گھر سے تو نہیں نکال دیتے انہیں، تم اپنے جس گھر کی خاطر میرا گھر اُجاڑ رہے ہو، مجھے معلوم ہے تمہیں اس سے کتنی محبت ہے! جب تک تمہارے اندر اس سے بڑا اور خوب صورت گھر بنانے کی گنجائش نہیں ہوتی، تم یہیں رہو گے لیکن جیسے ہی تمہارے ہاتھ میں مال آئے گا تم سب سے پہلے اس گھر کو بدلو گے اور اس گھر کو جہاں تم نے زندگی بسر کی ہے، فراموش کر کے کہیں اور جا بسو گے، ارے یہ گھر کیا! تمہیں تو اپنے اس پیارے وطن سے بھی محبت نہیں جو تمہارے لیے قدرت کا بہت بڑا انعام ہے۔ وطن بھی تو گھر ہی کی ایک صورت ہے۔ وہ وطن جسے تمہارے بزرگوں نے لاکھوں جانوں کی قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے، اپنی بے حسی سے تم لوگوں نے اس کی حالت خراب کر دی ہے۔ آزادی حاصل کرنا مشکل ضرور ہے، جدوجہد جاری رہے تو جلد یا بہ دیر آزادی مل ہی جاتی ہے لیکن زیادہ مشکل کام آزادی حاصل کرنے کے بعد اسے برقرار رکھنا ہے۔ آزادی پا کر یہ سمجھ لینا کہ منزل حاصل ہو گئی ہے، بہت بڑی بھول ہے۔ آزادی برقرار رکھنے اور وطن عزیز کو خوشحال، ناقابل تسخیر اور عظیم سے عظیم تر بنانے کے لیے شب و روز کی مستقل جدوجہد درکار ہوتی ہے۔ تمہارا وطن ہر یوم آزادی پر تم سے پوچھتا ہے کہ کیا تم نے مجھے اس لیے حاصل کیا تھا کہ میرے ساتھ یہ سلوک کرو۔ اس سے قبل کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے تمہیں بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح کے

سنہری افکار ایمان، اتحاد اور تنظیم کو سختی سے اپنا شعار بنا لینا چاہیے تا کہ تمہارا پیارا وطن پاکستان مضبوط اور خوشحال بنیادوں پر قائم رہے اور تمہارے گھر آباد رہیں۔ ‘‘

’’کیا ہوا؟ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ گھونسلا صاف کر کے دیوار کی درز تو بند کریں۔ ‘‘

ظفر نے کہا۔ میں چونک پڑا۔ محویت کا تانا بانا ٹوٹا تو میں نے جانا کہ میں تو اپنے آپ سے محو گفتگو تھا۔

’’درز بند نہیں ہو گی۔ گھونسلا ایسے ہی رہے گا۔ ہمارے گھر کے ساتھ چڑیا کا گھر بھی آباد رہے گا۔ ‘‘ میں نے وہاں سے بانس کی سیڑھی ہٹاتے ہوئے کہا۔

ظفر نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ سیڑھی ہٹاتے ہی چڑیا آئی اور آرام سے گھونسلے میں انڈوں پر بیٹھ گئی، جیسے اس کو یقین ہو گیا ہو کہ اب اس کا گھر محفوظ ہے۔ وہ اس طرح میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میرا شکریہ ادا کر رہی ہو۔

☆☆☆☆

محمد زبیر ارشد

پاکستان زندہ باد

صائم بیٹا سنو، میں جونہی گھر سے باہر جانے کو نکلا دادا جان کی آواز نے میرے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی رک گیا اور کہا جی دادا جان، یہ بات مجھے بہت ناگوار ہے جب مجھے گھر سے باہر نکلتے وقت کوئی روک لے اور یہ دادا کا روز کا معمول بن گیا تھا۔ ہر بات میں روک ٹوک کرنا اس سے کیوں ملے، وہاں کیوں گئے، دیر سے گھر کیوں آئے، میری اپنی لائف ہے جیسے چاہوں رہوں اور اب دادا کا مجھے روکنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ میں اس وقت کہاں جا رہا ہوں۔ مجھے اپنے دادا نوردین سے کبھی محبت نہیں رہی وجہ یہ ہے کہ وہ وقت بے وقت سب گھر والوں، عزیزوں، رشتہ داروں غرض ہر ملنے والوں کو سارا دن پاکستان بننے کے حالات و واقعات سنایا کرتے اور یہ واقعات سن کر میرا جی اکتا گیا تھا اور میں دل میں سوچتا کہ دادا کو اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں اور اس طرح وہ ہر کسی کو جذباتی بلیک میل کرتے رہتے ہیں۔ دادا جان بتایا کرتے کہ یہ پاکستان ہمیں پلیٹ میں رکھ کر نہیں ملا بلکہ اس کے حصول کے لیے ہمارے بڑوں نے اپنی جانوں کی قربانیاں دیں، ان کی آنکھوں کے سامنے وحشیانہ انداز میں انہیں شہید کیا گیا۔ معصوم بچوں کو نیزوں میں پرو دیا گیا۔ بیٹا جس دشمن ملک کی تم دن رات ثقافت دیکھتے ہو اور ان کے گرویدہ ہو رہے ہو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا غیرت مندی اور احساس مسلمانیت کا یہی تقاضا ہے؟ اس لیے کہتا ہوں صائم کہ اس ملک کی قدر کرو، تم اللہ کا شکر ادا کرو کہ تم آزاد وطن کی آزاد فضا میں سانس لے رہے ہو، جدھر جب چاہتے ہو با آسانی گھوم پھر لیتے ہو مگر اس وقت ایسا بالکل ناممکن تھا۔ دادا کہتے کہ ہندوؤں نے ہمارے پیاروں کو تو دبا دیا مگر جذبہ آزادی کو نہ دبا سکے، بیٹا تم خوش قسمت ہو کہ تم اس پیارے وطن میں آزاد شہری کی حیثیت سے آزاد فضاؤں میں رہ رہے ہو اب اس ملک کی باگ ڈور تمہارے ہاتھوں میں ہے تم اس گلشن کے معمار ہو۔ اسے اب تم نے سنبھالنا ہے، دادا جان اب بس کریں اور بھول جائیں سب کچھ، نیا زمانہ ہے نئے انداز ہیں اب دشمنی دوستی میں بدل رہی ہے سرحد پار لوگ ایک دوسرے سے ملنے کو بے تاب ہو رہے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ وہ ہمارے دشمن ہیں اور میں نے دیکھا کہ دادا جان کا چہرہ تانبے کی طرح سرخ ہو گیا اور روز ضبط کرتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی اور میں نے کہا دادا جان میں نے یہاں نہیں رہنا۔ یہ کیسا ملک ہے جہاں آئے روز خودکش حملے

ہو رہے ہوں، فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے ہوں۔ لوگ بغیر کسی جرم کے اٹھا لیے جائیں اور راہ چلتے کسی اندھی گولی کا نشانہ بن جائیں کم از کم میں تو یہاں نہیں رہوں گا۔ یہ ملک آپ کو ہی مبارک ہو، میرا ایف ایس سی کا رزلٹ آنے والا ہے اور میں نے بابا سے کہہ دیا ہے کہ میڈیکل کی تعلیم کے لیے میرے سب دوست کرغزستان کی میڈیکل یونیورسٹی میں داخلہ لیں گے تو میں نے بھی ان کے ساتھ حامی بھر دی ہے اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے اور بس یہ کہہ کر میں باہر آ گیا۔ چند دن بعد رزلٹ آ گیا اور میری ضد کے آگے سب مجبور ہو گئے اور انہیں ہار ماننا پڑی۔ ایئر پورٹ پر میں بہت پر جوش ہو رہا تھا کیونکہ میں اس ملک کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر جانے والا تھا اور اپنے نئے سہانے مستقبل کے سپنے حقیقت میں بدلنے کا منتظر تھا۔ سب سے فرداً فرداً ملا۔ دادا نے مجھے زور سے گلے لگاتے ہوئے نم آنکھوں سے پیار کیا اور کہا جاؤ بیٹا اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو اور تم جس مقصد کے لیے جا رہے ہو، اس میں کامیابی حاصل کرو، خوب دل لگا کر پڑھو اور اس ملک کا نام روشن کرو مگر ایک بات یاد رکھنا کہ تمہاری شناخت، تمہاری پہچان پاکستان ہے اور یہ تمہیں مرتے دم تک حاصل ہو گی اور تم اگر کھرونچ کر بھی اپنے اوپر سے پاکستان کا لیبل اتار پھینکو تو پھر بھی تم پاکستانی رہو گے اور جو بھی قدم اٹھانا یہ ضرور سوچ لینا کہ پہلے پاکستان کی عزت و ناموس اور اس کے بعد تم، یہ دھرتی تمہاری ماں اور یہ تمہاری منتظر رہے گی تمہیں اپنے اندر سمیٹ لینے کو بے چین رہے گی اور۔۔۔۔۔۔ دادا جان ایک بار پھر مجھے جذباتی بلیک میل کرنے لگے اور میں ان کی باتوں کو سنی ان سنی کرتا لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔ جہاز میں بیٹھتے ہی دل ایک انجانی خوشی سے سرشار ہونے لگا۔ وقت پر لگا کر اڑتا رہا اور میں نے دل لگا کر میڈیکل کی تعلیم کے حصول میں مگن ہو کر گھر والوں کو یکسر بھلا دیا۔ گھر میں سے کوئی رابطہ کر کے خیریت معلوم کرتا تو الگ بات میں نے خود سے اپنی خیریت نہ بتائی تھی۔ میں یہاں بہت مزے کے دن گزار رہا تھا، جب کبھی دوستوں کے جلو میں یونیورسٹی سے باہر تفریح کی غرض سے جانا پڑتا تو بلند و بالا عمارتیں، صاف ستھری آب و ہوا، کشادہ سڑکیں، بہترین ٹریفک کا نظام، نہ دھماکوں اور نہ خودکش حملوں کا ڈر، غرض ہر طرف لوگ بہت پر امن زندگی گزار رہے تھے۔ میرے خواب پورے ہونے کے دن قریب آ چکے تھے اور میں میڈیکل کے آخری سال میں تھا۔

ایک روز حسب معمول سیر و تفریح سے واپس آ کر سونے گئے ہی تھے کہ چند گھنٹے کے بعد دروازہ زور زور سے پیٹا جانے لگا، میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور پوچھا کہ کون ہے اور اس قدر رات گئے کیا ہو گیا ہے تو جواب میں میرا دوست گھبرائے ہوئے بولا، صائم جلدی کرو دروازہ کھولا تو فضل ہادی نے بتایا کہ پورے شہر میں اچانک نسلی فسادات شروع ہو گئے ہیں اور یہاں کے شدت پسند غیر ملکیوں کو چن چن کر مار رہے ہیں مجھے ابھی میسج آیا ہے

کہ ہوسٹل کے روم نمبر دو سو سترہ کے کامران بشیر کو قتل کر دیا گیا ہے اور اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو ہاسٹل فوراً چھوڑ دو اور وہ باقی طلبا و طالبات کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں خیریت چاہتے ہو تو جلدی میرے ساتھ چلو ہم اس وقت سخت خطرے میں گھر گئے ہیں۔ اس کے یہ الفاظ تھے یا بم جو میرے اوپر آ گرے تھے اور جلدی سے خود کو سمیٹا اور اس کے ساتھ چل دیا۔ چھپتے چھپاتے ایک نسبتاً محفوظ مقام پر پہنچ گئے یہاں بہت سے پاکستان سے آئے ساتھی موجود تھے اور ہر آنکھ نمناک تھی اور کوئی پتہ نہ تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہونے لگے، دادا کی باتیں شدت سے یاد آنے لگیں تھیں، میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ جس مصیبت سے جان چھڑا کر یہاں آ بسنے کی خواہش لے کر آیا تھا وہ اس طرح ٹوٹ کر بکھر بھی جائے گی۔ سب دوست خاموش تھے مگر ہر لمحہ موت کے منہ میں جا رہا تھا، ہر ہونے والی آہٹ سے دل مٹھی میں آ جاتا تھا، نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا پھر ایک روز چند لوگ آئے اور ہمیں حفاظتی حصار میں لے کر ایک بڑے محل میں لے جایا گیا راستے میں بھی جگہ جگہ حملہ ہوا مگر اللہ کی رحمت سے بچ گئے اب دل کہہ رہا تھا کہ میں اپنے وطن جلد سے جلد پہنچ جاؤں آنکھوں میں آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے، دل میں بس ایک ہی آرزو بسی تھی کہ خیریت سے اپنے گھر اپنے وطن پہنچ جاؤں لیکن وہاں تک تو تب پہنچتا جب یہاں سے خیریت سے نکل جاتا۔ یہ خواہش بار بار سر اٹھا رہی تھی کہ دادا سے جلد ملوں۔

نسلی فسادات نے پورے شہر میں خوف و ہراس برپا کر رکھا تھا جو جہاں تارکین وطن موجود تھا وہیں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر اسی بڑے محل کے لوگوں نے اپنی کڑی نگرانی میں ہمیں ایئر پورٹ تک پہنچایا اور جہاز میں بٹھایا، جہاز میں بیٹھتے ہی اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں ان بلوائیوں کے ہتھے چڑھنے سے بچ گیا تھا میں جس دھرتی کو رلا کر برا بھلا کہہ کر اس سے منہ موڑ آیا تھا آج اسی دھرتی ماں کی گود میں پناہ لینے جا رہا تھا سارا راستہ دادا کی آوازیں دل و دماغ میں گونجتی رہیں۔ آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور وہ بدقسمت ہے جو اس نعمت کی قدر نہیں کرتا اور میں نے بھی اس وطن کی قدر نہ کی تھی۔ چند گھنٹوں کا سفر میلوں کا لگ رہا تھا اور اب جہاز پاکستان کی سرزمین پہ پہنچ گیا میں باہر آنے کو بے چین تھا جونہی باہر آیا اور سیڑھیوں سے نیچے اتر کر وطن کی سرزمین پہ سجدہ ریز ہو گیا مٹی کو چوما، اس کی حقیقی قدر آج محسوس ہو رہی تھی میری بے قرار نگاہیں اپنے دادا کو ڈھونڈ رہیں تھیں۔ دادا کا نورانی چہرہ نظر آیا تو خوشی سے ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ شدت جذبات سے میں نے بھرپور نعرہ لگایا۔

پاکستان زندہ باد۔۔۔ دادا جان زندہ باد۔

محمد شعیب مرزا

بھول

(ایک ایسی بھول جس کی اب تلافی ممکن نہ تھی)

وہ حیران و پریشان کھڑا تھا۔ اس کے سامنے نہایت ہی دلکش منظر تھا۔ رنگا رنگ پھولوں کے باغات، مختلف قسم کے پھلوں سے لدے ہوئے درخت، سرسبز پہاڑ، خوبصورت وادیاں اور دودھ کی نہریں۔ وہ منظر اس کے سامنے حدنگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس نے آج تک ایسا حسین نظارہ نہیں دیکھا تھا۔

وہ اس خوبصورت منظر میں کھونا چاہتا تھا۔ وہ درختوں پر لگے انواع و اقسام کے پھل کھانا چاہتا تھا۔ نہروں میں بہتا دودھ پینا چاہتا تھا۔ پھولوں سے بھرے باغات میں ٹہلنا چاہتا تھا، لیکن اس کے سامنے ایک غیر مرئی دیوار حائل تھی۔ وہ جونہی آگے بڑھنے لگتا، ایک نہ دکھائی دینے والی دیوار سے ٹکرا جاتا۔ وہ دائیں بائیں بڑی دور تک گیا لیکن کہیں سے بھی اسے اندر جانے کا راستہ نہ ملا آخر کار وہ تھکاوٹ سے چور ہو کر مایوسی کے عالم میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔

☆☆☆

اسے اپنا ماضی یاد آنے لگا۔ اس کا باپ ایک فیکٹری میں ملازم تھا۔ اس کی ماں بڑی شفیق عورت تھی۔ وہ اپنی ماں کی بڑی خدمت کرتا تھا۔ اس نے کئی جگہ پڑھا تھا کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ یہ بات اس کے ذہن میں بیٹھ گئی تھی۔ وہ اکثر اپنی ماں کے پاؤں دباتا اور ہر طرح سے اپنی ماں کا خیال رکھتا تھا، کبھی کبھی تو وہ اپنی سوتی ہوئی ماں کے قدموں کو چوم لیا کرتا تھا۔

لیکن اپنے باپ کے ساتھ اس کا رویہ کچھ ٹھیک نہ تھا۔ اپنے باپ کی بات سنی ان سنی کر دیتا۔

اگر اس کا باپ کبھی زیادہ کام کی وجہ سے گھر دیر سے آتا اور اس کی ماں اسے کہتی کہ تمہارا باپ تھکا آیا ہے اس کی ٹانگیں دبا دو تو وہ کہتا کہ آج ہمارا میچ تھا اس لیے میں خود تھکا ہوا ہوں۔ اسے شکوہ تھا کہ اس کا باپ اسے کہیں سیر کے لیے نہیں لے کر جاتا، اسے وقت نہیں دیتا، حالاں کہ اس کا باپ اس کے بہتر مستقبل کے لیے زیادہ سے زیادہ کام کرتا اور اکثر چھٹی کے دن بھی وہ کام پر چلا جاتا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ بیمار بھی رہنے لگا لیکن اس کے باوجود وہ کام پر چلا جاتا۔

وہ اپنے باپ کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسے ایک ادارے میں اچھی

ملازمت مل گئی۔ اس نے ایک خوبصورت گھر بنوایا۔ شادی بھی ہو گئی اس دوران میں اس کا باپ محنت و مشقت کی وجہ سے شدید بیمار ہو گیا۔ بیماری کے دوران میں اس نے اپنے باپ پر خاص توجہ نہ دی۔ وہ یہی سوچتا رہا کہ اس نے کون سا میرا خیال رکھا تھا۔ اس بیماری کے دوران میں اس کا باپ فوت ہو گیا۔ باپ کی وفات کے بعد وہ اپنی ماں کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگا۔ اگر وہ بیمار ہوتی تو ساری رات جاگ کر اس کی تیمارداری کرتا۔ اس کی بیوی کا اگر کبھی اس کی ماں سے جھگڑا ہو جاتا تو وہ اپنی بیوی کو سخت برا بھلا کہتا۔ کبھی کبھار اس کی بیوی اسے کچھ کہہ دیتی کہ آپ کا باپ بیماری میں عدم توجہ کی وجہ سے فوت ہو گیا، اس کا کبھی آپ نے خیال نہیں رکھا لیکن اپنی ماں کی دن رات خدمت کرتے رہتے ہو ہر صحیح غلط بات پر اس کی طرف داری کرتے ہو۔ اپنی بیوی کی ایسی باتیں سن کر وہ طیش میں آ جاتا اور کہتا کہ میرے باپ کو ساری زندگی صرف پیسہ کمانے کی فکر رہی۔ میں بیمار ہوتا تو میری ماں ہی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتی اور ساری ساری رات میرے سرہانے بیٹھی رہتی۔ میرا باپ رات کو دیر سے آتا۔ بس چند لمحے میرے پاس بیٹھ کر میرا حال پوچھتا اور جا کر سو جاتا اور صبح دیر سے پھر کام پر چلا جاتا۔ اسے میری پرواہ ہی کب تھی میری ماں میری جنت ہے۔ میں اس کی خدمت کر کے حاصل کر کے رہوں گا۔ میں اپنی ماں کے خلاف کسی کی بات برداشت نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی اس کی ماں بھی اسے سمجھاتی کہ تمہارا باپ دن رات تمہارے لیے اتنی محنت کرتا تھا۔ وہ تمھیں بڑا آدمی بنانا چاہتا تھا۔ وہ تمھیں اعلیٰ تعلیم دلانے اور ہر طرح کی آسائش فراہم کرنے کے لیے یہ تو دو شفٹوں میں کام کرتا تھا۔ وہ تمھیں ڈاکٹر کے پاس اسی لیے نہیں لے کر جاتا تھا کہ چھٹی کی وجہ سے اس کی تنخواہ کٹ جاتی تھی، لیکن یہ تو سوچو کہ تمھارے علاج پر اسی کا کمایا ہوا پیسہ خرچ ہوتا تھا۔ تمھاری خواہشوں پر اس نے اپنی ضرورتوں کو قربان کر رکھا تھا۔ اور تمھارے سنہرے مستقبل کے لیے اس نے اپنی ساری زندگی گزار دی۔ آج تم جس مقام پر ہو یہ تمھارے باپ کی دن رات کی محنت کا ہی نتیجہ ہے، لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ کہتا آج میں جس مقام پر ہوں، وہ میری محنت کا نتیجہ ہے اگر ذوق وشوق سے تعلیم حاصل نہ کرتا تو آج اس مقام پر نہ ہوتا۔ البتہ تمھاری دعائیں ضرور میرے شاملِ حال تھیں۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں تمھاری وجہ سے ہوں۔ مجھے دنیا کی جنت بھی تمھاری وجہ سے ملی ہے اور آخرت کی جنت بھی تمھاری وجہ سے ملے گی۔ آج جنت اس کے سامنے تھی۔ وہ اسے دکھائی دے رہی تھی لیکن اس کے اندر کا کوئی راستہ اسے نہیں مل رہا تھا۔ کیوں کہ دنیا میں وہ یہ بات بھول گیا تھا کہ باپ جنت کا دروازہ ہے۔

☆☆☆☆

محمد عاصم بٹ

عقل مند کسان

بہت پہلے کی بات ہے ایک ملک میں ایک دریا بہتا تھا جس کا نام دریائے مینو تھا۔ دریائے مینو اور بہت سے علاقوں کے علاوہ آبی سے بھی گزرتا اور اسے سیراب کرتا۔

آبی ایک بہت بڑے گاؤں کا نام تھا جو دریائے مینو کے کنارے آباد تھا۔ آبی میں تمام لوگ کسان تھے۔ وہ کھیتی باڑی کرتے، اناج پیدا کرتے اور دوسری کھانے پینے کی چیزیں بناتے۔ دریا قریب ہونے کی وجہ سے انہیں پانی کا مسئلہ کبھی نہ ہوا وہ نہ صرف پینے کے لیے پانی بہت آسانی سے حاصل کر لیتے بلکہ اپنے کھیتوں کے لیے بھی انہیں پانی با آسانی دستیاب ہو جاتا۔

آبی میں ایک کسان رہتا تھا جس کا نام کانی تھا۔ کانی بہت محنتی اور بہادر انسان تھا۔ اس کے پاس اپنی زمین تھی جس پر کھیتی باڑی کر کے وہ اپنا، اپنی بیوی اور بچوں کا پیٹ پالتا۔ جو فصل پیدا ہوتی اس میں سے کچھ اپنے استعمال کے لیے رکھ لیتا باقی سے ساکھی والوں سے ضرورت کی دوسری اشیا خرید لیتا، یوں تینوں ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔

کانی کو جتنی محبت اپنے بیوی بچے سے تھی اس سے کہیں زیادہ وہ اپنے کھیتوں سے محبت کرتا۔ اپنی زمینوں کی دیکھ بھال وہ اپنے بچوں کی طرح کرتا، ان میں وقفے وقفے سے کھاد ڈالتا۔ پانی دیتا اور ہل چلاتا۔ اسے یہ احساس تھا کہ انہی کھیتوں سے وہ ایسی فصلیں حاصل کرتا ہے جو اسے گاؤں بھر میں ممتاز کرتی ہیں۔ اتنی بہترین فصلوں پر لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں، اور جیسا کھی میں انہی فصلوں کی بہت زیادہ قیمت پڑتی ہے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اگر یہ کھیت نہ ہوں تو وہ اور اس کے بیوی بچے بھوکے مر جائیں۔ اسے سوائے کھیتی باڑی کے اور کوئی کام نہ آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت دل لگا کر کام کرتا اور نتیجتاً بہترین فصلیں اس کے کھیتوں میں پیدا ہوتیں۔

زندگی بڑی پرسکون بسر ہو رہی تھی۔ وقت کا پہیہ اپنی رفتار چل رہا تھا کہ اچانک ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے دونوں علاقوں کے لوگوں کی زندگی میں ہلچل مچا دی۔

ہوا یوں کہ کچھ عرصہ تک بارش نہ ہوئی، لوگوں کو کیا پتہ تھا کہ بارش نہ ہونے سے ان پر مصیبتوں کے پہاڑ

ٹوٹ پڑیں گے۔ انہوں نے اسے کچھ زیادہ اہمیت نہ دی۔ اور سوچا کہ کچھ عرصہ بعد موسم بہتر ہو جائے گا۔ لیکن جب پورا ایک سال بغیر بارش کے گزر گیا اور دریا میں پانی کی سطح گرنے لگی تو لوگوں کو فکر لاحق ہوئی، ذہنوں میں اندیشے اور وسوسے سر ابھارنے لگے اور بڑے بوڑھے متوقع خطرات کا سوچ سوچ کر غمزدہ ہونے لگے۔

دریائے ٹیموآ ہستہ آ ہستہ سوکھ رہا تھا۔ فصلیں تباہ ہوگئیں، اناج کے ذخیرے ختم ہونے لگے، پانی کی بوند بوند کے لیے لوگ تڑپنے لگے تو آبی کے بڑے بوڑھوں نے فیصلہ کیا کہ ہم سب کو یہاں سے کوچ کر جانا چاہیے ورنہ کوئی زندہ نہ بچے گا۔

آبی کے تمام لوگ سامان باندھ کر گھروں سے نکل کھڑے ہوئے، اور قافلوں کی صورت میں دوسرے علاقوں کی طرف جانے لگے۔ تقریباً سارا گاؤں خالی ہو چکا تھا، لیکن ایک گھر اب بھی ایسا تھا جس میں سے دھواں اٹھتا تھا اور چند لوگ رہتے تھے اور وہ کانی کا گھر تھا۔

کانی یہاں سے جانے کو تیار نہ تھا۔ وہ اپنے کھیت چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا، اپنی اُجڑتی ہوئی فصلیں اور بنجر کھیت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ انہیں چھوڑ کر چلے جانے کو بے وفائی سمجھتا اور سوچتا، ہو سکتا ہے وہ انہیں یوں چھوڑ کر جائے اور اگلے دن بارش ہو جائے تو پھر کس منہ سے واپس آئے گا کہ ساری عمر ان کھیتوں سے فائدہ اٹھاتا رہا اور مشکل وقت آیا تو چھوڑ کر چلا گیا اور جب پھر سے آسانی پیدا ہوئی تو فائدہ اٹھانے آ گیا بے وفا! یہ سوچ کر ہی وہ کانپ اٹھتا، بے وفا کہلانے سے بہتر تھا کہ وہ یہیں مر جائے۔

کانی کی بیوی ولگا پہلے تو چپ رہی لیکن جب دیکھا کہ بات بہت بڑھ گئی ہے تو پھٹ پڑی۔ کانی کو پانی کا گلاس دکھاتے ہوئے بولی

”پانی کا صرف یہ ایک گلاس بچا ہے، منا پانی مانگے گا تو یہ دے دوں گی لیکن جب دوبارہ اسے پیاس لگی تو کیا دوں گی ہم تو صبر شکر کر لیں گے۔ پانچ سال کا بچہ پیاس نہیں برداشت کر سکے گا۔ اناج کا بھی ایک دانہ نہیں بچا۔ صبح سے منا بھوکا ہے۔۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تم دوسرے گاؤں کیوں نہیں چلتے۔ یہاں کیا پڑا ہے تمہارا اب تک ٹکے ہوئے ہو۔ خود بھی مرو گے اور ہمیں بھی مار کے دم لو گے“

پھر وہ رونے لگی، سسکیاں بھرنے لگی۔

کانی اسے روتا دیکھ کر فکر مند ہو گیا وہ تو عرصے سے اسے سمجھا رہا تھا کہ منے کو ساتھ لے کر اپنے بھائی شنالا کے پاس چلی جائے۔ لیکن وہ راضی نہ ہوئی کانی کو چھوڑ کر جانے کو وہ تیار نہ تھی۔ لیکن اب جب ولگا زار و قطار

رونے لگی تو کانی سوچنے پر مجبور ہوگیا وہ جانتا تھا کہ ولگا اسے چھوڑ کر نہیں جائے گی یہیں اس کے ساتھ مر جائے گی۔ اور ساتھ منا بھی۔ وہ اپنی بیوی بچے کا دشمن نہ تھا۔ اپنی خواہش کے لیے ان کی جان نہیں لے سکتا تھا۔ منانے والے لہجے میں بولا

''اچھا۔ ٹھیک ہے بھلی مانس۔۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں اگر کل تک بارش نہ ہوئی تو ہم یہ گاؤں چھوڑ دیں گے۔ راضی ہو اب۔۔ جہاں اتنے روز انتظار کیا وہاں ایک روز اور سہی۔۔ چلو اب آنسو پونچھ ڈالو اور منے کو پکڑو، رو رہا ہے۔''

یہ سن کر ولگا کو کچھ ڈھارس بندھی۔ اس نے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور پانی کا گلاس ڈھک کر منڈیر پر رکھ کر منے کو گود میں اٹھا لیا۔ کانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا دوسرے گاؤں میں جا کر وہ کوئی اور کام شروع کر دے گا۔ کھیتی باڑی اور اپنی زمینیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گا۔ کھیتوں سے اس غداری کے بعد نہ وہ ہل کو ہاتھ لگائے گا اور نہ کبھی اس گاؤں میں واپس آئے گا۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک ٹھک سے کچھ گرنے کی آواز پیدا ہوئی۔ ایک کوا جو شاید اس گاؤں کو چھوڑ کر جا رہا تھا، اڑتا ہوا کانی کے گھر کی منڈیر تک پہنچا تو اس کا ایک پیر گلاس سے ٹکرا گیا اور پانی کا بھرا ہوا گلاس نیچے گرنے سے سارا پانی سوکھی زمین پر بہہ گیا جو فوراً مٹی میں جذب ہو گیا۔

ولگا تیر کی طرح تیزی سے اُدھر لپکی اور اسے کوسنے لگی ''کلمُوا، کم بخت، بد بخت کہیں کا، اللہ کرے اسے گاؤں سے باہر نکلنا نصیب نہ ہو۔'' اور چند قطرے پانی کے جو گلاس میں بچ گئے تھے بچے کے منہ میں ٹپکا کر خود سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ کانی جو اتنی دیر سے دم سادھے بیٹھا تھا، یکدم اٹھ کھڑا ہوا ''وہ مارا'' وہ اچھلتے ہوئے بولا ''وہ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے تم ذرا اس طرف دیکھو جہاں پانی گرا تھا'' ولگا نے اس طرح دیکھا تو اسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جسے دیکھ کر وہ اس قدر خوش ہو رہا تھا بولی ''کیا ہے''۔

''وہ دیکھو۔ جہاں پانی گرا تھا۔ وہاں زمین ایسے سوکھی ہے۔ جیسے پانی کبھی گرا ہی نہ ہو''

''تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ زمین پیاسی تھی سارا پانی پی گئی''

ولگا بولی۔ ''ہاں یہی بات۔۔۔ بالکل یہی بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں۔۔ سارا پانی زمین کے اندر چلا گیا۔ سارا پانی زمین کے اندر چلا جاتا ہے۔۔ سنو'' کانی نے چونکا کھلکا کر ولگا کے قریب کر لیا ''میری بات غور سے سنو! جب بارش ہوتی ہے تو بارش کا پانی۔۔۔ تو دریاؤں وغیرہ میں مل جاتا ہے لیکن جو زمین پر گرتا ہے

زمین کے نیچے جمع ہو جاتا ہے کسی ۔۔۔ جگہ میں جو پانی جذب نہیں کر سکتی ۔ سمجھیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہزاروں سالوں سے جب بارش ہو رہی ہے تو اتنا سارا پانی زمین کے اندر ہی موجود ہوگا کیوں ٹھیک ہے نہ ۔۔ ہم وہ پانی نکال سکتے ہیں ولگا ۔

”تو کیا تم پانی نکالو گے ۔ یہیں رہو گے میں جانتی تھی تم کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر یہاں رہنا چاہتے ہو تمہیں بس ان زمینوں سے محبت ہے ان کے لیے تم اپنی بیوی بچے تک کو بھوکا پیاسا مار سکتے ہو ۔ لیکن میں اب یہاں نہیں رکوں گی ۔ منے کو لے کر آج ہی بلکہ ابھی اسی وقت یہاں سے جا رہی ہوں، تمہاری بیوقوفیوں پر اپنے پھول جیسے بیٹے کو قربان نہیں کر سکتی ۔“ ولگا بولتی گئی ۔

”تم مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی ہو ولگا، میں بہانہ نہیں بنا رہا ۔۔ لیکن ٹھیک ہے تم جاؤ ۔ تمہیں جانا ہی چاہیے میں سب کو پانی نکال کر ہی دکھاؤں گا، میں جانتا ہوں پانی ضرور نکلے گا ۔ ”ضرور“ ۔ کانی بیلچہ اٹھا کر گھر سے نکل گیا اور اپنی زمینوں کے قریب ایک نسبتاً نرم جگہ دیکھ کر کھودنے لگا ۔

کانی بہت خوش تھا ۔ ایک تو اسے ایک ایسا خیال ملا تھا جس کی بناء پر وہ زمین میں سے پانی نکال سکے گا اور دوسرے یہ کہ اب ولگا اور منے کی طرف سے بھی اس کی پریشانی ختم ہو جائے گی ۔ وہ سوچ رہا تھا ۔ پانی نکلنے کے بعد اس کا گاؤں اس کے کھیت پھر سے ہرے بھرے ہو جائیں گے ۔ پھر سے فصلیں لہرائیں گی ۔ اب بارش نہ ہونے کے باوجود اس کا گاوں آباد رہا کرے گا، لوگوں کو پانی کی قلت کبھی محسوس نہ ہوگی ۔

وہ انہی خوشگوار خیالوں میں مست کھدائی کا کام کر رہا تھا کہ اسے لگا کہ مٹی پر ایک ساتھ دو بیلچے ٹکرائے ہیں ۔ ایک اس کا اور دوسرا ۔۔۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ولگا کھڑی تھی ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے ۔ بولی

”کیا تم مجھے اپنا بے وفا سمجھتے ہو ۔ تم اپنی زمینوں سے بے وفائی نہیں کر سکتے اور میں تم سے ۔ جب مرنا ہی ہے تو کیوں نہ تمہارے ساتھ مروں، میں یہاں سے نہیں جاؤں گی ۔“

فکر کی لکیریں ایک بار پھر کانی کے چہرے پر کھنچ آئیں وہ نہیں چاہتا تھا کہ ولگا یہاں رہے ۔ اس نے منے کو درخت کے نیچے لیٹے دیکھا اور پھر سے کام میں جُت گیا ۔

سارا دن دونوں کھدائی کرتے رہے اور کافی گہرا گڑھا کھود لیا، کانی مٹی کھودتا جاتا اور ولگا کڑاہی میں ڈال ڈال کر پرے پھینکتی جاتی ۔ شام تک اتنا گہرا گڑھا کھود لینے کے بعد جب پانی کے دور دور تک آثار نظر نہ آئے تو ولگا مکمل طور پر ہمت ہار بیٹھی ۔ اسے یقین ہو گیا کہ کانی ایک بے کار کوشش کر رہا ہے ۔ جس کا انجام تینوں

کی موت کے سوا کچھ اور نہیں۔ وہ نڈھال ہو کر درخت کے نیچے منے کے ساتھ لیٹ گئی۔ کانی دھن کا پکا تھا، اپنی دھن میں رات گئے تک کام کرتا رہا۔ پھر ولگا کے اصرار پر تینوں گھر کی طرف چل پڑے۔ منا پیاس سے رو رو کر سو چکا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے کانی نے دور ایک قافلہ جاتے دیکھا۔ بھاگا بھاگا قافلے کے سردار کے پاس گیا اور اس سے پانی مانگا، سردار اس اکیلے کو گاؤں میں دیکھ کر حیران ہوا اور اسے پانی کی چھوٹی مشک دی۔ باتوں باتوں میں پتا چلا کہ قافلہ اسی گاؤں کی طرف جا رہا ہے جہاں ولگا کا بھائی شالا رہتا ہے۔ کانی نے سردار سے درخواست کی کہ اس کی بیوی اور بچے کو بھی ساتھ لے جائے وہ راضی ہو گیا۔

سردار نے کانی کو بھی چلنے کو کہا لیکن اس نے انکار کر دیا، یہ سن کر ولگا نے سردار سے کہا ”آپ منے کو لے جایئے میں بھی یہاں سے نہیں جاؤں گی“ کانی نے بہت زور دیا کہ وہ چلی جائے لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہی کہ کانی کے بغیر نہیں جائے گی۔ سردار حیران تھا یہ دونوں کیوں ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ اس نے منے کو پکڑا اور ہمراہ قافلے میں لے گیا۔

کانی اور ولگا نے بیلچے اٹھائے، پانی کی مشک پکڑی اور کھیتوں پر آ کر دوبارہ کھدائی کرنے لگے۔

کانی کو پیاس لگتی تو خواہش سے کم پانی پیتا اور اپنے حصے کا بھی ولگا کو پلا دیتا۔ دونوں کو کھدائی کرتے چار روز بیت چکے تھے لیکن پانی کے دور دور تک آثار نہ تھے۔ مشک بھی خالی ہوتی جا رہی تھی۔ ان چار روز میں ولگا میں بہت زیادہ کمزوری آ گئی تھی۔ شروع میں تو کانی کے ساتھ کام کرتی رہی لیکن اب بہت کم کانی کا ہاتھ بٹاتی اکثر درخت کے نیچے نڈھال لیٹی رہتی۔ کانی بہت سخت جان تھا۔ خود اندر سے ٹوٹ چکا تھا لیکن ظاہر نہ کرتا بلکہ ولگا کی ہمت بندھاتا رہتا اور کھدائی میں سارا سارا دن جتا رہتا۔

یونہی کام کرتے آٹھ دن گزر گئے اور نواں دن چڑھا۔ ولگا اب ہر وقت آنکھیں موندے درخت کے نیچے پڑی رہتی۔ اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ اٹھ کر بیٹھ سکے، پانی کی مشک رات ہی کو خالی ہو گئی تھی۔ کانی نے مشک نچوڑ کر پانی کے آخری قطرے اس کے منہ میں ٹپکا دیئے تھے۔

کانی ایک زندہ لاش کی طرح تھا، اس کی سوچنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔ بس ایک ہی کام، ایک لگن تھی کہ کھودنا، کھودنا، اور کھودنا ہے۔ اس لیے وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ وہ جسمانی طور پر اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ کسی وقت بھی گر سکتا تھا۔

اُدھر سردار بچے کو لے کر چھ دن کے سفر کے بعد ولگا کے بھائی سنالا کے پاس پہنچا اور اسے وہ سب حالات بتائے جو اس نے وہاں دیکھے تھے۔ سنالا یہ سن کر تڑپ اٹھا، فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور چند ساتھیوں کی جماعت لے کر تیز رفتار گھوڑوں پر آبی کی جانب روانہ ہوگیا۔

یہ دسواں دن تھا جب ولگا نے آخری بار آنکھیں کھولیں اور کانی کو کھدائی کرتے دیکھا۔ اس نے پکارنے کی کوشش کی لیکن الفاظ سوکھے لبوں سے باہر نہ نکل سکے۔ پھر اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں۔ کانی نے ولگا کی سانس رکی ہوئی دیکھی تو اس کی رہی سہی ہمت ٹوٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے وہ اپنے آپ کو ولگا کا قاتل سمجھ رہا تھا۔ اس کی موت کا ذمہ دار۔

اس نے بیلچا اٹھایا اور پھر سے اپنے کھودے ہوئے گڑھے میں اتر گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیلتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے چند ایک بار بیلچے سے مٹی کھودی اسے محسوس ہوا جیسے مٹی میں سے پانی رس رہا ہے۔ پھر اسے کچھ بھائی نہ دیا اور یہ چکرا کر منہ کے بل گر گیا۔ آخری بار کانی کے کانوں میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔

سنالا نے گھوڑے سے اتر کر چھاگل بہن کے منہ سے لگا دیا لیکن اسے بہت دیر ہو چکی تھی، وہ تیزی سے گڑھے میں اتر گیا۔ جہاں مردہ کانی جیسے اپنی کامیابی پر مسکرا رہا تھا، وہ کامیاب ہوگیا تھا۔ زمین میں سے پانی رس رہا تھا۔ سنالا نے چند ایک بیلچے مارے تو پانی کی پھوار پھوٹ پڑی۔

ولگا نے اپنے شوہر سے اور کانی نے زمین سے محبت کا حق نبھا دیا۔ کانی کا مقصد پورا ہوگیا۔ اس کا خواب سچ ہوگیا، لیکن وہ اپنی کامیابی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہا۔ وہ اپنی دھن کا پکا تھا۔ اس لیے کامیاب ہوا۔ لوگوں نے اس گڑھے کا نام کانی کے نام پر کنواں رکھا۔

سچ ہے جس میں لگن ہوتی ہے وہی کامیاب ہوتا ہے۔

☆☆☆☆

محمد نوید مرزا

مقدر کا ستارہ

ڈاکٹر اسفند یار اور ڈاکٹر فیصل دونوں بڑے گہرے دوست تھے۔ ان کی یہ دوستی بچپن سے تھی اور دونوں ایک ساتھ پروان چڑھے تھے۔ اپنے وطن میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد دونوں جدید کورسز کے لیے ملک سے باہر گئے تھے اور کچھ عرصہ قبل ہی یورپ سے بچوں کے مخصوص امراض میں سپیشلائزیشن کر کے واپس آئے تھے۔ انھیں شہر کے دو مختلف بڑے ہسپتالوں میں ملازمت کی پیش کش ہوئی تھی۔ جسے انھوں نے قبول کر لیا تھا اور ان دنوں ان کی پریکٹس جاری تھی۔ ڈاکٹر فیصل ناک کان گلہ کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ نوزائیدہ بچوں کے علاج میں بھی خصوصی مہارت رکھتے تھے جبکہ ڈاکٹر اسفند یار ہڈیوں کے امراض کے ماہر سرجن اور پولیو سے متاثرہ بچوں کے امراض کے جدید اور کامیاب آپریشن میں کمال دسترس رکھتے تھے۔ ڈاکٹر اسفند یار جیسی ہنر مندی رکھنے والے چند ایک ڈاکٹر ہی ملک میں موجود تھے۔

دونوں دوستوں کو اپنے وطن میں ملازمت کرتے ہوئے ابھی چند مہینے ہی ہوئے تھے لیکن اپنے وطن کے نظام میں موجود خرابیوں پر وہ اکثر بہت کڑھتے تھے۔ فیصل نے تو کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو اس ماحول کا عادی بنا لیا تھا مگر ڈاکٹر اسفند یار کی طبیعت کی حساسیت انھیں اندر ہی اندر اپنے ملک کے ماحول سے بیزار کر رہی تھی اور وہ ڈاکٹر فیصل سے اس بات کا ذکر کرتے کہ "میں ان حالات میں زیادہ دیر تک ملازمت جاری نہیں رکھ سکتا اور بہت جلد یہ ملک چھوڑ جاوں گا۔" ڈاکٹر فیصل یہ باتیں سن کر انھیں اکثر سمجھاتے کہ انھیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ "یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے معاشرے کے نظام میں بہت سی خرابیاں ہیں جس کی وجہ سے ایک فرض شناس، ایماندار اور بااصول آدمی کے لیے یہاں کام کرنا مشکل ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اس صورتِ حال سے دلبرداشتہ ہو کر ملک ہی چھوڑ دے۔ اگر ہمارے ملک کے ہنر مند ماہر اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک افراد اسی طرح بیرونِ ملک جانے کا سوچتے رہے تو ہمارا ملک تو خالی ہو جائے گا اور اس کا مستقبل تباہ ہو کر ایسے مسائل کا شکار ہو جائے گا کہ جن کا حل دشوار ہوگا۔ اس لیے ہمیں یہاں رہ کر نہ صرف ان مسائل کو حل کرنا ہے بلکہ بہت سی خرابیوں کو بھی دور کرنا ہے اور آپ تو لوگوں کو نہ صرف امید کی کرن دکھا رہے ہیں بلکہ ان کی

محرومی دور بھی کر رہے ہیں۔ مَیں نے یہ جذبہ بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے جس کا صلہ دنیا و آخرت دونوں میں ملے گا‘‘۔ لیکن ڈاکٹر فیصل کی اس طویل اور حوصلہ افزا گفتگو کے باوجود ڈاکٹر اسفندیار مطمئن نہ ہوئے۔

ایک دن ڈاکٹر فیصل اپنے بیٹے کی سالگرہ کی دعوت دینے ڈاکٹر اسفندیار کے گھر گئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ اداس اور بجھے بجھے سے ہیں۔ کچھ رسمی گفتگو کے بعد ڈاکٹر فیصل نے اسفندیار سے ان کی اداسی کا سبب پوچھا جس کے بعد ان کے چہرے پر کچھ ناگواری کے تاثرات اُبھرے اور کچھ توقف کے بعد وہ بولے ’’یار فیصل! آپ کو تو پتہ ہے کہ مجھے روزانہ چار پانچ بچوں کے آپریشن کرنے ہوتے ہیں کیونکہ ہمارے شعبے میں مریضوں کی تعداد باقی شعبوں سے زیادہ ہے۔ آج کل پولیو کے خاتمے کے لیے تیزی سے پھیلتی ہوئی مہم کے باوجود ملک میں بہت سے متاثرہ بچے موجود ہیں۔ جن کا کئی دوسری علاج گاہوں کے ساتھ ساتھ ہمارے ہسپتال میں بھی علاج اور آپریشن ہو رہا ہے اور مریض صحت یاب بھی ہو رہے ہیں۔ ان مریضوں میں زیادہ تر تو بچے ہیں لیکن کچھ ایسے نوجوان بھی ہمارے ہسپتال میں آتے رہتے ہیں جن کا بر وقت علاج نہیں ہو سکا۔ مگر ہمارے ہسپتال کا نظام بہت عجیب ہے اور چند ڈاکٹروں نے اپنی اجارہ داری قائم کی ہوئی ہے۔ اکثر اوقات جب مَیں شیڈول کے مطابق آپریشن کرنے جاتا ہوں تو میرے آپریشن کا وقت تبدیل کر دیا جاتا ہے اور جب مَیں تبدیل شدہ وقت کے مطابق آپریشن تھیٹر جاتا ہوں تو اس وقت وہاں کوئی اور ڈاکٹر اپنے مریض کے ساتھ آپریشن میں مصروف ہوتا ہے اور مجھے شدید اُلجھن اور ذہنی تکلیف ہوتی ہے۔ اس طرح میرا وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور مریض کے لواحقین بھی متاثر ہوتے ہیں اور ان کی امید جیسے وقتی طور پر ٹوٹ جاتی ہے۔ ان کی مایوسی دیکھ کر مجھے اس قدر اذیت ہوتی ہے کہ مَیں خود کو ان کا مجرم سمجھنے لگتا ہوں۔

دراصل چند ڈاکٹر میری بڑھتی ہوئی شہرت کی وجہ سے پیشہ وارانہ رقابت کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور مَیں اس طرح پورے ہفتے میں بمشکل پانچ یا چھ آپریشن کر رہا ہوں اور وہ بھی اس طرح کہ بعض اوقات نہ تو لواحقین موجود ہیں اور نہ میرا مطلوبہ عملہ دستیاب ہوتا ہے۔ مَیں نے کئی مرتبہ ایم ایس سے شکایت بھی کی ہے لیکن وہ یہ کہہ کر مجھے خاموش کر دیتے ہیں کہ خود کو اس نظام کا حصہ بنانے کی کوشش کرو۔ پرسوں جب مَیں دوبارہ ان کے پاس اپنی شکایت لے کر پہنچا تو وہاں موجود ڈاکٹر فرید نے مجھے کہا کہ آپ کو اپنے سینئر ڈاکٹرز کا احترام کرتے ہوئے ان سے پوچھ کر شیڈول بنانا چاہیے اور اگر کسی دن کوئی آپریشن رہ جائے تو اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔

مجھے ان کی یہ بات سن کر بڑی مایوسی ہوئی اور یہاں بھی ایم ایس صاحب چپ رہے تو مَیں نے بھی مزید

کوئی بات نہیں کی۔ ‘‘

’’یہ تو واقعی بڑی تشویش کی بات ہے۔ تمھیں چیئر مین صاحب اور سینئر ایم ایس صاحب سے بات کرنی چاہیے کیونکہ انھوں نے ہی تمھیں اس ملازمت کی پیش کش کی تھی اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ تمھارا متبادل ملنا آسان نہیں۔ ‘‘ ڈاکٹر فیصل نے اپنے دوست کی طویل گفتگو سننے کے بعد کہا۔

’’چھوڑیں جی ...... میرے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا مَیں نے تو استعفیٰ دینے کا فیصلہ کرلیا ہے اور اس کا مجھے کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ مجھے غیر ملک میں یہاں سے کئی گنا زیادہ تنخواہ بھی ملے گی اور ذہنی سکون بھی حاصل ہوگا یہاں تو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہے اور مَیں مزید غلط روّیے بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ ‘‘ ڈاکٹر اسفند یار نے گویا اپنا فیصلہ سنا دیا۔

’’نہیں بھئی مَیں اپنے پیارے دوست کو اس طرح وطن چھوڑنے نہیں دوں گا۔ مَیں جانتا ہوں کہ ہمارے ملک میں کسی بھی کام کی پذیرائی اس قدر نہیں جتنا ایک باصلاحیت انسان اس کا مستحق ہے لیکن پھر بھی آپ کے جانے سے بہت سے معصوم اور بیمار مریضوں کا نقصان ہو جائے گا۔ وہ لوگ جن کی نظریں آپ جیسے ہمدرد اور محبِّ وطن انسان پر لگی ہوئی ہیں ان کے لیے کون مسیحا بنے گا‘‘ ۔؟ ڈاکٹر فیصل بھی انتہائی جذباتی ہو رہے تھے۔

نہیں بھئی ...... مَیں اب یہاں نہیں رہ سکتا .... مجھے اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ اس وطن اور ان پھول سے بچوں کو میری ضرورت ہے لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس ملک کا سارا نظام کھوکھلا ہو چکا ہے اور صحیح سمت سفر کرنے والوں کی یہاں پر کوئی جگہ نہیں ہے۔ مَیں تو یہاں خدمت کے جذبے سے آیا تھا لیکن انتہائی رنجیدہ ہو کر یہاں سے جانے کا فیصلہ کر رہا ہوں‘‘ ۔ ڈاکٹر اسفند یار دُکھ بھرے لہجے میں بولے۔

’’اسفند بھائی! مَیں بھی اپنے ہسپتال میں چند مسائل کا شکار رہوں لیکن آپ بہت حساس آدمی ہیں اس لیے ان رکاوٹوں کی وجہ سے کڑھتے ہوئے مایوسی کا شکار ہو گئے ہیں، لیکن پھر بھی آپ کو ہر قیمت پر یہاں رکنا ہوگا۔ ‘‘ ڈاکٹر فیصل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا جس پر اسفند یار ان کی باتوں کے کسی حد تک قائل ہو گئے اور بولے ’’بھئی جانا تو مَیں خود بھی نہیں چاہتا لیکن مجبور ہو کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ مجھے خود اپنے وطن اور اس کے نونہالوں سے بڑی محبت ہے۔ اگر آپ کے پاس میرے مسئلے کا کوئی حل ہے تو مجھے بتا دیں۔ ‘‘

’’کیوں نہ ہم دونوں مل کر اپنا ایک چھوٹا سا ہسپتال بنا لیں۔ ‘‘ ڈاکٹر فیصل نے کہا ’’آپ کی تجویز تو بہت

اچھی ہے لیکن اس کے لیے اتنا سرمایہ کہاں سے آئے گا۔"

"آپ ہاں تو کریں خدا نے چاہا تو سارا بندوبست ہو جائے گا۔" ڈاکٹر اسفندیار اپنے دوست ڈاکٹر فیصل کی بات مان گئے اور ڈاکٹر فیصل نے انھیں اگلے دن اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

دوسرے دن شام کے وقت ڈاکٹر فیصل اور ڈاکٹر اسفندیار کار میں بیٹھے ہوئے شہر کی معروف ترین سڑک سے گزر رہے تھے۔ راستے میں ڈاکٹر فیصل نے بتایا کہ وہ اس وقت ایک نیک اور متمول شخصیت حاجی عثمان سے ملنے جا رہے ہیں جو میرے انتہائی قریبی واقف کار ہیں اور خدا نے انھیں بے شمار دولت کے ساتھ ایک سخی دل بھی عطا کیا ہے۔ ان کی سربراہی میں ہمارے ملک میں کئی ٹرسٹ ہسپتال کام کر رہے ہیں۔ مَیں چاہتا ہوں کہ ہم ان سے قرض لے کر اپنا ایک چھوٹا سا ہسپتال قائم کر لیں۔ میری اس سلسلے میں ٹیلی فون پر ان سے بات ہو چکی ہے" ڈاکٹر اسفندیار اپنے دوست ڈاکٹر فیصل کی یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوئے۔ حاجی عثمان نے ان دونوں کا پرتپاک استقبال کیا اور ہسپتال بنانے کے لیے اپنے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا اور انھیں ہسپتال کے لیے کوئی مناسب جگہ دیکھنے کے لیے کہا۔ جس کے بعد دونوں ڈاکٹرز وہاں سے روانہ ہو گئے۔ تین دن کی ان تھک محنت کے بعد انھوں نے شہر کے وسط میں ہسپتال کے لیے ایک انتہائی مناسب جگہ تلاش کر لی اور حاجی عثمان کو بھی جگہ کے متعلق بتا دیا۔ جس پر وہ بہت خوش ہوئے اور دونوں کے جوش و جذبے کی بہت قدر کی۔ حاجی عثمان نے انھیں قرض کی رقم کا چیک دیتے ہوئے کہا "بھئی میں تمھاری لگن اور ان تھک محنت سے بہت متاثر ہوا ہوں تم واقعی اپنے وطن سے محبت کرنے والے نوجوان ہو قوم کو تم جیسے نوجوانوں کی بڑی ضرورت ہے جو آنے والی نسلوں کی حفاظت کریں۔ میری دعا ہے کہ خدا تمھیں کامیابی عطا کرے۔" اس کے بعد چند ضروری کاغذات پر دستخط ہوئے اور دونوں دوست حاجی عثمان کی طرف سے دی گئی رقم کا چیک لے کر پرسکون انداز میں واپس آ گئے۔

اگلے چند دنوں میں انھوں نے ہسپتال کے لیے دیکھی ہوئی جگہ خرید لی اور ایک ہفتے بعد جب ایک پروقار تقریب میں ہسپتال کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تو وہاں حاجی عثمان اور شہر کے دوسرے معزز افراد بھی موجود تھے۔ یہ لمحے دونوں ڈاکٹرز کے لیے انتہائی خوشی کے تھے اور ڈاکٹر اسفندیار خصوصی طور پر چشمِ تخیل سے اپنے ملک کے تمام پولیو سے معذور ہونے والے بچوں کو اپنے قدموں پر چلتا ہوا اور بھاگتا ہوا دیکھ رہے تھے اور ان کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔

☆☆☆☆

نازیہ انور شہزاد

رقم کا معما

’’میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر اتنی بڑی رقم گئی تو کہاں گئی۔ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔‘‘ عامر صاحب کا غصے کے مارے برا حال تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ انھوں نے اپنا پرانا گھر بیچا تھا اور جو رقم ملی تھی، وہ انھوں نے گھر میں ہی رکھی تھی۔ ارادہ تھا کہ اگلے دن بینک میں جمع کروا دیں گے۔ سارے گھر والوں کو پورے ملک کی سیر کرانے کا بھی ارادہ تھا۔ حالاں کہ سب نے ہی سمجھایا تھا کہ گھومنے کو چھوڑیں، اس رقم کو کسی کاروبار میں لگا دیں تاکہ آپ کو بھی فائدہ پہنچے، مگر عامر صاحب جو ایک بار ٹھان لیتے تو پیچھے ہٹنے کو تیار ہی نہ ہوتے۔ اب رقم غائب ہو جانا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نہ کوئی چوری ہوئی، نہ کوئی گھر میں آیا۔

عامر صاحب اور ان کی بیگم کمرے میں ہی سو رہے تھے، جب کہ ان کے تینوں بچے پندرہ سالہ ابتسام، تیرہ سالہ شہباز اور دس سالہ بینش بھی اپنے کمرے میں ہی تھے۔ دادی جان کو تو نظر ہی کم آتا تھا۔

باقی رہ گئے ملازمین تو وہ لوگ رقم آنے سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ عامر صاحب نے وہ رقم اپنے کمرے میں ہی رکھی تھی۔ عامر صاحب کے والد بھی گاؤں گئے ہوئے تھے۔

عامر صاحب نے جھجکتے ہوئے پوچھا: ’’بیگم! سچ سچ بتا دیں، کہیں رقم آپ نے تو نہیں چھپائی؟‘‘

’’کیا، آپ ...... آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں!‘‘ صدمے کی زیادتی سے بیگم نسرین کی آواز گنگ ہو گئی۔

’’نہیں بخدا میرا یہ مطلب نہ تھا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا......‘‘

’’بس، بس ...... یہی کچھ سننا باقی رہ گیا تھا۔‘‘ وہ ناراض سی ہو کر ان کی بات کاٹتے ہوئے بولیں اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

عامر صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ پورے پندرہ لاکھ روپے تھے۔

گھر کا ہر فرد پریشان تھا۔ پولیس میں رپورٹ درج کرا دی تھی، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ عامر صاحب کو کسی پر شک بھی نہ تھا۔

رقم کو گم ہوئے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ عامر صاحب سخت ذہنی الجھن میں مبتلا تھے۔ رقم کا کوئی سراغ نہ ملا۔ وہ اس وقت کو کوس رہے تھے جب انھوں نے وہ رقم گھر میں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

عامر صاحب کا کپڑے کا اچھا خاصا چلتا کاروبار تھا۔ روپے پیسے کی کبھی تنگی نہیں ہوئی تھی۔ بچے بھی اعلیٰ تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم تھے۔ والدین بھی حج کر چکے تھے۔ رقم کا معما حل نہ ہو سکا۔ رو دھو کر سب صبر کر کے بیٹھ گئے۔

وقت گزرتا رہا اور بچے بڑے ہو گئے۔ دادی ماں کا انتقال ہو گیا۔ دادا بھی کافی بوڑھے ہو گئے تھے کہ ایک دن عامر صاحب کی دکان میں شارٹ سرکٹ سے آگ لگ گئی۔ لمحوں میں برسوں کی محنت مٹی میں مل گئی۔ دکان راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ حالات بگڑتے چلے گئے۔

”یہ کیا ہو گیا بیگم! میری برسوں کی محنت مٹی میں مل گئی۔ سوچا تھا بچوں کے لیے کچھ چھوڑ جاؤں گا، مگر آہ!“ عامر صاحب سسک پڑے۔

”فکر نہ کریں۔ اللہ کو جب اپنے پیارے بندوں سے آزمائش لینی ہوتی ہے تو وہ انہیں مصیبتوں میں مبتلا کر دیتا ہے، تاکہ وہ دیکھے کہ اس کے نیک بندے اب بھی اس کے شکرگزار ہیں یا نہیں۔ کبھی وہ آرام دے کر آزماتا ہے تو کبھی چھین کر۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ بیگم نسرین نے تسلیم دیتے ہوئے انہیں سمجھایا۔

”مگر بیگم! قرض خواہوں کی رقم ادا کرنے کے بعد سب جمع پونجی ختم ہو گئی۔ اب تو بس اللہ ہی کا آسرا ہے۔ دوبارہ کاروبار شروع کرنے کے لیے کافی سرمایہ چاہیے، وہ میں کہاں سے لاؤں گا۔“ وہ پریشان تھے۔

”آپ کوشش تو کریں، کسی دوست سے مدد مانگیں۔“ انھوں نے نئی راہ دکھائی۔

”ہاں دیکھتا ہوں، مگر آج کے دور میں کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔“ وہ مایوس تھے۔

حالات جوں کے توں تھے۔ کوئی بہتری کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ابتسام میڈیکل کے فائنل ایئر میں تھا۔ اس کی فیس بھرنی تھی۔ شہباز فوج میں جانا چاہتا تھا اور بینش بھی کالج میں پڑھ رہی تھی۔

عامر صاحب نے رات کے کھانے پر سب کو ایک ساتھ دیکھ کر کہا: ”میں چاہتا ہوں کہ یہ گھر بیچ کر کوئی دوسرا چھوٹا مکان لے لیں، کیوں کہ اب پیسوں کی بہت ضرورت ہے۔“

کھانا کھاتے ہوئے سب کے ہاتھ رک گئے۔

ابتسام نے اپنا خیال پیش کیا: ’’مگر پاپا! آپ بینک سے قرض لے لیں، جب کاروبار چل جائے گا، تب آرام سے اتار دیجیے گا۔‘‘

دادا کی پر رعب آواز گونجی: ’’نہیں میں یہ گھر کسی قیمت پر بیچنے نہیں دوں گا۔‘‘

عامر صاحب نے حیرت سے کہا: ’’ابا جان! سارے حالات آپ کے سامنے ہیں، پھر بھی آپ یہ کہہ رہے ہیں۔‘‘

’’بس میں نے جو کہہ دیا اور ہاں ایک اور بات تم کل صبح ہی گاؤں جاؤ گے اور وہاں کی زمینوں کے معالات دیکھو گے کم از کم ایک مہینے تک اسی طرح تم کچھ پیسے کما سکو گے۔‘‘ دادا جی نے عامر صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

’’مگر ابا جان! مجھے ان معاملات سے دور رکھیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں اس طرف کوئی رجحان نہیں ہے۔‘‘ انھوں نے دوٹوک انداز میں گویا بات ہی ختم کر دی۔

’’تو پھر ٹھیک ہے، اگر تم نہیں گئے تو میں ہمیشہ کے لیے گاؤں چلا جاؤں گا اور کبھی اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔‘‘ دادا جی کرسی چھوڑ کر کھڑے ہوئے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

عامر صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

بیگم نسرین نے ڈرتے ڈرتے کہا: ’’ایسا کریں آپ ابا جان کی بات مان لیں۔ یہاں تو ویسے بھی آپ پریشان ہو گئے ہیں۔‘‘

’’ہنھ!‘‘ عامر صاحب بھی غصے میں اٹھ کر باہر نکل گئے تو وہ سب ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہ گئے۔

ابتسام الگ پریشان تھا کہ اس کی فیس بھرنے کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔

ٹھیک ایک مہینے بعد عامر صاحب نے گاؤں سے واپس آ کر بتایا کہ وہاں معاملات صحیح چل رہے ہیں۔

’’آج رات کو تیار رہنا۔ گھر میں ایک پارٹی ہے جس میں تم میزبان خصوصی ہو۔‘‘ دادا جی نے مسکرا کر کہا۔

’’ابا جان! یہ پارٹی کس سلسلے میں دی جا رہی ہے۔‘‘ عامر صاحب حیران ہوئے۔

’’سرپرائز ہے۔‘‘ سارے بچے بھی معنی خیز انداز میں مسکرانے لگے۔

بینش نے مسکراتے ہوئے کہا: ’’دادا جان! ہمارے لیے دادی لا رہے ہیں۔‘‘

’’کیا؟‘‘ عامر صاحب کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''تم کچھ بھی سمجھ لو، شام کو تیار رہنا۔ تمہارے سارے دوست بھی آئیں گے۔'' دادا جی نے کہا اور مسکراتے ہوئے باہر چل دیے۔

اس موقع پر گھر کو دلھن کی طرح سجایا گیا تھا۔ عزیز رشتے دار، دوست احباب سب جمع تھے۔ مختلف کھانوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہر کوئی پوچھ رہا تھا کہ یہ پارٹی آخر کس سلسلے میں دی جا رہی ہے۔ عامر صاحب خود نہیں جانتے تھے تو انہیں کیا بتاتے۔

''معزز خواتین و حضرات!'' دادی جی کی پر رعب آواز گونجی۔ سب لوگ متوجہ ہو گئے۔

''جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میرے بیٹے عامر کی کپڑے کی دکان جل گئی تھی۔ اس کے بعد مالی مشکلات آ گئیں، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ وہ عارضی پریشانیاں تھیں۔ آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ آج کی یہ تقریب کس سلسلے میں ہے۔ اصل میں عامر کی جلی ہوئی دکان میں نے دوبارہ تعمیر کروا دی ہے۔ آج اس کا افتتاح ہے۔ ملازمین بھی رکھ لیے گئے ہیں۔ یہاں جمع ہونے والے لوگ اس افتتاحی تقریب میں شریک ہو کر دعاؤں سے نوازیں گے۔ شکریہ۔''

دادا جان نے عامر صاحب کے حیران چہرے کو دیکھا اور مسکرانے لگے۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

عامر صاحب نے بے یقین ہو کر کہا: ''ابا جان! یہ سب کیا چکر ہے۔''

''چکر نہیں بیٹا! یہ سچ ہے، جب تم گاؤں گئے تھے تب میں نے اور ابتسام نے مل کر یہ کام کروایا ہے۔ رہا پیسوں کا مسئلہ تو یاد کرو بہت سال پہلے تمہارے پندرہ لاکھ کھو گئے تھے۔'' دادا جی نے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

عامر صاحب ماضی میں کھو گئے اور پھر انہیں یاد آیا کہ اس گم شدہ رقم کے بارے میں کچھ پتہ نہ چل سکا تھا۔

وہ بے تابی سے بولے: ''ہاں ہاں ابا جان! کیسے ملی وہ رقم!''

انھوں نے رک رک کر کہا: وہ رقم کھوئی یا چوری نہیں ہوئی تھی۔''

وہ چونکے: ''کیا مطلب''

''اصل میں تم سارے پیسے فضول خرچی میں اڑانا چاہتے تھے۔ کیا فائدہ ایسا گھومنے پھرنے کا جس میں اتنی بڑی رقم ضائع ہو جائے۔ میں نے سوچا کہ میں ہی کچھ کروں۔ جس رات تم رقم لے کر آئے اتفاق سے میں بھی اسی دن گاؤں سے آیا تھا۔ میں نے اتفاق سے تمھاری باتیں سنی تھیں۔ پھر موقع پا کر میں تمہارے کمرے

سے وہ رقم لے گیا۔" وہ ایک لمحہ سانس لینے کو رکے۔

عامر صاحب نے کہا: "کیا ابا جان! آپ نے ایسا کیا تھا۔ میرا ذہن اس طرف جا ہی نہیں سکتا تھا۔"

دادا جان نے بات جاری رکھی: "دوسرے دن صبح میں وہ رقم لے کر بینک میں گیا اور تمہارے نام سے ایک اسکیم میں رقم جمع کروا دی۔ اس سکیم کے مطابق جتنی رقم ہوگی، کچھ برسوں میں وہی رقم دگنی ہو جائے گی۔ اب جب کہ اس رقم کو جمع کرائے کافی عرصہ گزر گیا ہے اور اب ضرورت بھی تھی، لہٰذا میں نے وہ دگنی رقم نکلوالی۔ اس سے میں نے تمھاری دکان پھر سے بنوائی اور تمام قرض بھی ادا کر دیا۔ کچھ روپے میرے اپنے بھی تھے۔ وہ بھی تمھاری دکان میں لگا دیے۔ آج تمھاری دکان کا افتتاح ہے۔" دادا جی نے بات مکمل کر کے ان سب لوگوں کے چہروں کی طرف دیکھا۔

ابتسام کے علاوہ عامر صاحب بینش، شہباز اور نسرین بے یقینی سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔" عامر صاحب کو شدید بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا دیکھ کر ابتسام آگے بڑھا:

"پاپا یہ سچ ہے۔ میں بھی دادا جی کے ساتھ تھا اور مجھے یہ ساری تفصیل معلوم تھی مگر میں نے دادا جی کے کہنے پر یہ راز اپنے تک ہی رکھا تھا، مگر میرا خیال ہے اس وقت اس بہتر اس رقم کا مصرف اور کوئی نہیں تھا۔ "ابتسام کے چہرے پر خوشی کی چمک تھی۔

"ابا جان! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ پیسے اگر میں فضول کاموں میں خرچ کر دیتا تو آج مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ اس موقع پر اپنے بھی پرائے ہو گئے۔ دوست دشمن کا فرق صحیح معنوں میں میری سمجھ میں اب آیا ہے۔ واقعی اس وقت میں اپنی کیفیت لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔" شدت جذبات سے عامر صاحب کی آواز بوجھل ہو گئی اور آنسوؤں سے ان کا گریبان بھیگ گیا۔

"نہیں میرے بیٹے! سیر و تفریح اچھی بات ہے۔ اس سے طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے، مگر تفریح کی خاطر پیسوں کا بے تحاشا استعمال صحیح نہیں ہے۔ کچھ پیسے مشکل وقت کے لیے بچا کر رکھنے چاہئیں، کیوں کہ برا وقت کبھی بتا کر نہیں آتا۔ میں رہوں نہ رہوں، یہ بات یاد رکھنا۔" دادا جی نے عامر صاحب کو گلے لگا لیا۔
دکان کے افتتاح کا وقت ہو رہا تھا۔ ایک بڑی بس کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ اسی میں سب لوگ نئی دکان کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆☆

نجمہ معراج

باپ پر پوت

تنویر اور صالح دو بھائی تھے۔ دونوں سارا دن اکٹھے کھیلتے اور اکٹھے پڑھتے تھے۔ شروع میں جب وہ اسکول میں داخل ہوئے۔ دوسرے سال جب تنویر دوسری جماعت میں چلا گیا تو صالح داخل ہوا۔ صالح تنویر سے چھوٹا بھی تھا اور ایک جماعت پیچھے بھی تھا لیکن پھر بھی وہ ضد کرتا کہ میں نے تنویر کے پاس بیٹھنا ہے۔ لہٰذا صالح کا والد تنویر کے اساتذہ کو کہہ کر آتا کہ اسے کچھ دن تنویر کی جماعت میں بٹھا لیا کریں۔ پھر کچھ دن بعد صالح کو سمجھ آ گئی اور وہ اپنی جماعت میں بیٹھنے لگ گیا۔

قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ تنویر تیسری جماعت میں فیل ہو گیا جب کہ صالح دوسری جماعت کو پاس کر کے تیسری جماعت میں چلا گیا۔ اب دونوں بھائی ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے اور اکٹھے اسکول جاتے تھے۔ لیکن ان دونوں کی عادتوں میں کافی فرق تھا۔ صالح شروع سے ہی انتہائی ایمان دار، صلح پسند اور قناعت پسند تھا لیکن تنویر کو کسی پنسل وغیرہ کی ضرورت بھی پڑتی تو وہ ابو سے کہنے یا کسی سے مستعار لینے کے بجائے کسی نہ کسی بچے کی چرا لیتا۔ اگر کبھی صالح کو پتا چل جاتا تو وہ امی کو بتا دیتا جس پر تنویر کی خوب پٹائی ہوتی۔ لیکن وہ پھر بھی اپنی ان چھوٹی موٹی چوریوں سے باز نہ آیا۔

ان کے ابو کھیتی باڑی کرتے تھے۔ جس سے ان سب کی گزر بسر ہو رہی تھی۔ مگر ان کی ذاتی زمین نہیں تھی۔ اس لیے انھیں بہت زیادہ آمدن نہیں ہوتی تھی۔ مہنگائی دن بدن بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اس لیے اب صرف کھیتی باڑی سے گھر چلانا مشکل ہو رہا تھا۔

اب دونوں بھائی میٹرک کر چکے تھے۔ میٹرک میں دونوں نے اچھے نمبر حاصل کیے۔ وہ چاہ رہے تھے کہ آگے بھی تعلیم حاصل کریں۔ ادھر ان کے دل میں ابھی داخلے کا شوق موجزن ہی تھا کہ ان کے ابو دوپہر کو گھر آئے تو ان کے ساتھ ایک پینٹ شرٹ میں ملبوس مہمان تھا۔ اسے صحن میں رنگین پایوں والی چارپوئی پر بٹھایا گیا۔ گھر میں جو سب سے اچھا تکیہ تھا، دیا گیا اور اس کی خوب خاطر مدارت کی گئی۔ حسبِ توفیق پر تکلف کھانا کھلایا گیا۔ جب وہ کھانے پینے کی مصروفیات سے فارغ ہوا تو ابا جان نے آواز دی۔

’’تنویر، صالح! ادھر آؤ‘‘

دونوں خوشی خوشی ابا جان کے پاس گئے کہ شاید ان کے داخلے کی بات ہو رہی ہے۔ انھوں نے مہمان کو سلام کیا۔ تو اس نے وعلیکم السلام کے ساتھ ہی کہ دیا۔ ’’اچھا تو دونوں بھائیوں نے فیکٹری میں کام کرنا ہے۔‘‘

پھر اس مہمان نے ان کے والد سے مخاطب ہو کر کہا صبح آپ ان دونوں کو شہر پہنچا دینا۔ انشا ءاللہ کام بن جائے گا۔‘‘

ان کے والد صاحب تو خوش ہو گئے لیکن وہ دونوں مایوسی سے منہ لٹکائے واپس چلے گئے۔ مہمان کے چلے جانے کے بعد دونوں بھائیوں نے ابو سے کہا ’’ہم پڑھیں گے، ملازمت نہیں کریں گے۔‘‘

ابو نے اپنے دونوں بیٹوں کے سر پہ پیار دیا اور نم آنکھوں کے ساتھ اپنے پاس بٹھا لیا اور کہنے لگے ’’بیٹا میری بات سنو، میں اب بوڑھا ہو رہا ہوں۔ مجھ میں اب محنت کرنے کی ہمت دن بدن کم ہو رہی ہے۔ اور اگر آپ محنت سے کام کریں گے تو تب ہی گھر کے اخراجات پورے ہو سکیں گے‘‘

تنویر تو لاپروائی سے والد کی ساری بات سنتا رہا۔ صالح کے دل پر والد کی باتوں کا بہت اثر ہو رہا تھا، جوں جوں اس کا والد باتیں کرتا جا رہا تھا اس کے آنسو زمین پر گرتے جا رہے تھے۔ اس کے والد کی بات بھی صحیح تھی لیکن اس کو پڑھائی کا دکھ بھی بہت تھا۔

اب دونوں بھائی اگلی صبح اپنے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر بس میں سوار ہوئے اور کچھ میلوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد فیکٹری کے گیٹ پر جا اترے۔ دونوں نے دل جمعی سے کام شروع کر دیا۔ چند مہینوں میں ان کی اچھی کارکردگی پر ان کی تنخواہ بڑھا دی گئی۔ وقت گزرتا گیا اور اب وہ مل میں کافی ترقی کر گئے تھے اور ان کی تنخواہ بھی کافی ہو گئی تھی۔

مل سے جب چھٹی ہوتی تو مل کے مین گیٹ پر سب مزدوروں کی جامہ تلاشی لی جاتی۔ مگر تنویر اور صالح کی اچھی کارکردگی پر اب گیٹ پر ان کی تلاشی بھی نہیں ہوتی تھی۔ تلاشی لینے یا نہ لینے کا صالح کی صحت پر تو کوئی اثر نہ پڑا البتہ تنویر اس بات سے بڑا خوش ہوا۔ اب تنویر کا یہ معمول تھا کہ وہ روزانہ مل سے کوئی نہ کوئی چیز جیب میں ڈال کر چپکے سے لے آتا تھا۔ حالاں کہ جو چیز وہ مل سے لاتا تھا وہ اس کے کسی کام کی نہیں ہوتی تھیں مگر نہ جانے وہ پھر بھی کیوں لے آتا تھا۔

بہر حال وہ ایک عرصہ تک مل میں کام کرتے رہے۔ پھر ان دونوں کی شادیاں اپنی خالہ کے گھر ہو گئیں

اور وہ دونوں راضی خوشی زندگی گزارنے لگے۔ جب دونوں بھائیوں کو اللہ تعالٰی نے دو دو تین تین بچے عطا کر دیے تو بچوں کی آپس میں اکثر لڑائی ہوتی رہتی۔ کبھی کھلونوں پر تو کبھی پڑھائی کی چیزوں پر۔ ایک شام تنویر اور صالح بھائی اکٹھے مل سے واپس آئے تو ان کے والد نے بلایا اور بڑے پیار سے کہا ''تنویر بیٹا، آپ کا بیٹا گلزار، اور صالح بیٹا آپ کا بیٹا حنیف جو دونوں آپ کے پلوٹھی کے بچے ہیں، میں دیکھتا ہوں کہ وہ اکثر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ دونوں علیحدہ ہو جائیں۔ ویسے بھی میں اور آپ کی ماں ہی تو رہ گئے ہیں۔ ہم دونوں ہی کے گھر میں باری باری رہ لیا کریں گے۔ میں تو کہتا ہوں کہ جائیداد بھی میری زندگی میں ہی علیحدہ علیحدہ کر لو۔ مجھے خدشہ ہے کہ یہ جائیداد کہیں میری وفات کے بعد آپ کے آپس میں جھگڑے کا باعث نہ بنے''

اس طرح اس رات سے دونوں بھائی باپ کے کہنے پر اپنے بیوی بچوں سمیت علیحدہ علیحدہ رہنے لگے۔

ایک روز مل میں اعلٰی کارکردگی دکھانے والے مزدوروں کے اعزاز میں کھانا کھلانے کا پروگرام بنایا گیا۔ وقت اور پروگرام سب کو بتا دیا گیا۔

صبح مل میں سب لوگوں نے اکٹھے ہونا تھا اور یہاں سے مل کر لاہور کے لیے روانہ ہونا تھا۔ مل کے سب ملازم طے شدہ وقت پر اکٹھے ہوئے اور پھر لاہور کی طرف روانہ ہو گئے ان کے ساتھ تنویر اور صالح بھی ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ کھانا کافی اچھا تھا اور کھانے کے بعد ان کو سویٹ ڈش کے طور پر آئس کریم بھی کھلائی گئی جو بہت پیارے اسٹیل لیس اسٹیل کے چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں پیش کی گئی۔ اب تنویر کے دماغ میں آیا کہ وہ یہ چھوٹا گلاس ادھر سے چوری کرے اور اپنے بچے کے لیے لے جائے۔ اس نے سب کی آنکھ بچا کر وہ گلاسی (چھوٹا گلاس) جیب میں ڈال لی۔ گھر آ کر یہ گلاسی اس نے اپنے بیٹے گلزار کو دے دی۔

اس واقعہ کو تقریباً ایک سال ہو گیا تھا۔ یہ گرمیوں کی ایک دوپہر تھی۔ دونوں بھائیوں، تنویر اور صالح، کے بچے اکٹھے کھیل رہے تھے۔ تنویر کے بیٹے گلزار نے اپنی جیب میں سے گلاسی نکالی اور حنیف کو دکھائی۔ حنیف نے جب گلاسی ہاتھ میں پکڑ کر دیکھی تو اس کا دل للچایا۔ وہ سوچنے لگا کہ کاش یہ گلاسی میرے پاس ہوتی۔ اس نے فوراً گلزار سے پوچھا ''یار، یہ گلاسی تو نے کہاں سے لی ہے؟''

وہ حیرت سے بولا ''تمہارے ابو تمہارے لیے نہیں لائے؟''

حنیف فوراً بولا ''نہیں تو! یہ تمھارے ابو کہاں سے لائے ہیں؟''

’’میرے ابو جب لاہور گئے تھے ناں، ہوٹل میں دعوت کھانے، تب لے کے آئے تھے‘‘ گلزار نے بڑے فخر اور تکبر کے ساتھ کہا۔

حنیف نے اچھا کہتے ہوئے مایوسی کے ساتھ گلاسی گلزار کو واپس کر دی اور اسے دل ہی دل میں اپنے والد پر بہت غصہ آیا کہ گلزار کے ابو اس کے لیے گلاسی لے آئے ہیں اور میرے ابو نہیں لے کر آئے۔ وہ لحہ بھر سوچ میں پڑا رہا پھر کھیل میں لگ گیا۔ جب شام کو حنیف کے ابو فیکٹری سے گھر آئے تو حنیف نے ناراضی کا اظہار کیا۔ اس نے اپنے ابو کو حسب معمول سلام بھی نہ کیا۔ ابو نے پریشان ہو کر پوچھا ’’کیا بات ہے؟ حنیف بیٹا، ٹھیک تو ہو‘‘۔

حنیف اپنے باپ کا یہ فقرہ سن کر رونے لگ پڑا اور کہنے لگا: ابو آپ لاہور گئے تھے تو میرے لیے گلاسی کیوں نہیں لے کے آئے؟‘‘

حنیف کے ابو بولے ’’گلاسی؟ کون سی گلاسی بیٹا؟‘‘

’’وہی جو گلزار کے لیے اس کے ابو لائے ہیں‘‘

’’یہ گلاسی کیا ہوتی ہے بیٹا، مجھے کچھ بتاؤ تو سہی، میں بھی اپنے بیٹے کو لا دوں گا‘‘ صالح نے اپنے بیٹے کو اسے ساتھ لگاتے ہوئے اس کے گال تھپ تھپا کر کہا۔ جب حنیف نے اپنے ابو کو بتایا کہ وہ چھوٹا سا بڑا پیارا گلاس ہے تو انھوں قدرے سوچتے ہوئے اس سے کہا ’’جاؤ گلزار سے وہ گلاس لا کر مجھے دکھاؤ‘‘

حنیف بھاگ کر اپنے چچا کے گھر گیا اور گلزار سے وہ چھوٹا سا گلاس مانگ لایا۔ مگر اس کے ساتھ ہی گلزار بھی آ گیا۔ حنیف کا باپ وہ گلاس دیکھ کر پریشان سا ہو گیا اور وہ آہستہ آہستہ اپنے منہ میں ہی کہنے لگا ’’بھائی نے بچپن کی عادت ابھی تک نہیں چھوڑی۔ اسکول میں بھی وہ لوگوں کی چھوٹی موٹی چیزیں چرا لیا کرتا تھا۔‘‘

پھر حنیف کے والد نے گلاسی گلزار کو دیتے ہوئے قدرے اکتاہٹ کے ساتھ کہا ’’جاؤ بیٹا، یہ گلاسی اپنے گھر لے جاؤ‘‘۔

جب گلزار چلا گیا تو صالح نے اپنے بیٹے حنیف کو پاس بلایا اور پیار کیا۔ پھر بتایا کہ یہ گلاسی بازار سے نہیں ملتی۔ اگر بازار سے ملتی ہوتی تو وہ اسے ضرور لا دیتا۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنے بیٹے کو چوری کی یا حرام کی کوئی چیز لا کر دوں کیوں کہ چوری کرنے والے اور حرام کھانے والے لوگوں کے بچے بھی چور اور ڈاکو ہی بنتے ہیں۔

حنیف اپنے باپ کی باتیں سن کر چپ تو ہو گیا مگر اس کے دل میں گلاسی نہ ملنے کی محرومیت ابھی تک

باقی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ حنیف کی چھوٹی بہن چھٹی جماعت میں پہنچ گئی اور کافی لائق تھی۔ اس کا والد چاہتا تھا کہ یہ آگے بھی پڑھے۔ لڑکیوں کو چھٹی جماعت کے لیے گھر سے دس میل دور جانا پڑتا تھا۔ اس لیے صالح نے سوچا کہ کیوں نہ وہ شہر منتقل ہو جائے۔ لہذا وہ بیوی بچوں کو لے کر شہر چلا گیا۔ وہاں اس کے سب بچے اسکولوں میں داخل ہو گئے۔ اب صالح اور تنویر تو آپس میں ملتے رہتے تھے لیکن ان دونوں بھائیوں کے بچوں کو آپس میں ملے ہوئے کئی کئی سال گزر جاتے۔ صالح کے بچے پوری نیک نیتی کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے مگر ادھر گاؤں میں گلزار دسویں جماعت میں فیل ہو گیا اور پھر اس نے کھیتی باڑی کرنے کے بجائے ادھر اُدھر آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔ جب کہ حنیف پڑھ لکھ کر وکیل بن گیا اور اب اس کا کام جرائم کی دنیا کی فیچر نگاری تھا۔ وہ دعوتوں، کچہریوں، عدالتوں، حوالاتوں، جیلوں اور ایسی مختلف جگہوں پر جاتا جہاں سے اسے مجرموں کے بارے میں نئی سے نئی خبریں مل سکتی تھیں۔ چند سال پہلے تنویر اور صالح کے درمیان کسی بات پر ان بن ہو گئی تھی جس کی وجہ سے صالح نے گاؤں جانا چھوڑ دیا تھا۔

اس طرح ایک مدت سے حنیف اور گلزار بھی ایک دوسرے کے حالات سے بالکل بے خبر رہے تھے۔ ایک روز حنیف کو اپنے اخبار کی طرف سے فیچر تیار کرنے کے لیے: ”ہماری جیلیں جرائم کی آماج گاہ“ کا موضوع دیا گیا“ وہ، اب میاں والی کی جیل کے صدر دروازے کے سامنے کھڑا قیدیوں کے نام پڑھ رہا تھا۔

حنیف نے جب سب سے اوپر گلزار کا نام پڑھا تو اسے شک گزرا کہ یہ اس کا تایا زاد گلزار ہی نہ ہو۔ حنیف جلدی سے آگے بڑھا اور اجازت لے کر جیل کے اندر چلا گیا۔ اندر جب اس کی نظر گلزار ڈاکو پر پڑی تو اس کو بہت دکھ ہوا۔ اس کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ وہ اسے اپنا تعارف کروائے بغیر ہی واپس چلا گیا۔ حنیف نے ابھی اپنے فیچر کے لیے اور بہت ساری معلومات اکٹھی کرنا تھیں مگر نہ جانے اس کے ذہن کو کیا ہو گیا تھا۔ اب اس کا کچھ کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ لہذا اس نے اب سب کام چھوڑ چھاڑ کر گھر کا رخ کیا۔

جب حنیف گھر پہنچا تو بہت پریشان تھا۔ باپ نے حنیف سے پریشانی کی وجہ پوچھی تو حنیف کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ کہنے لگا ”ابو، آپ ٹھیک ہی تو کہتے تھے کہ چوری کرنے والوں اور حرام کھانے والوں کی اولاد چور اور ڈاکو ہی بنتی ہے۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں جو آپ نے ہم سب بہن بھائیوں کو محنت کی کمائی کھلائی اور حرام اور چوری کے لقمے سے محفوظ رکھا۔ شاید اسی لیے میں آج بڑی عزت کی زندگی گزار رہا ہوں۔

آج مجھے گلزار کو جیل میں دیکھ کر بہت دکھ ہوا''

حنیف کے ابو جلدی سے بولے ''بیٹا'' وہ بھائی تنویر کا بیٹا گلزار جیل میں ہے؟ یہ نہیں ہو سکتا بیٹا! وہ کیوں گرفتار ہوا ہے؟''

حنیف نے ٹھنڈی آہ بھری اور کہا ''ابا جان'' ہاں گلزار جیل میں ہی ہے۔ اب وہ پہلے والا گلزار نہیں رہا بلکہ وہ بہت بڑا ڈاکو بن چکا ہے'' پھر حنیف کہنے لگا ''ابا جان، مجھے گلزار کو جیل میں دیکھ کر گلاسی والا واقعہ بہت یاد آیا کہ تایا جان اس طرح کی چھوٹی موٹی چوریاں نہ کرتے تو ان کی اولاد بھی شاید خوب اچھی طرح پڑھ لکھ جاتی اور آج چور ڈاکو نہ بنتی۔ کسی نے یہ سچ ہی کہا ہے کہ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ یعنی ہر شخص پر اپنے والدین کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے۔

حنیف کا والد بولا ''ہاں بیٹا، آپ کو بھی میں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ بچوں کو تھوڑا کھلا لینا، کم پہنا لینا لیکن حرام کا لقمہ اور چوری کی ہوئی چیز نہ دینا۔ یہ گلزار کی زندہ مثال آپ کے سامنے ہے۔ چور کا بیٹا اکثر چور ہی بنتا ہے۔ بہرحال اللہ سے دعا ہے کہ وہ گلزار کو ہدایت دے۔ باپ اور بیٹے، دونوں نے آمین کہا اور پھر حنیف فیچر نگاری کے لیے جانے کی تیاری کرنے لگا۔

☆☆☆☆

نذیر انبالوی

ایک تھی شانی

شانی چڑیا اللہ تعالی کی حمد و ثنا سے فارغ ہوئی تو سورج کی کرنیں آسمان پر نمودار ہو چکی تھیں۔ شانی نے رانی اور چکیلی کو جگایا۔ رانی نے تو اپنی ماں کی آواز سن کر ہی آنکھیں کھول دیں جب کہ شانی چکیلی گھاس پھونس میں منہ چھپائے سوئی رہی۔

"چکیلی! اب آنکھیں بھی کھولو، دیکھو سورج نکل آیا ہے۔"

"ماں! مجھے سونے دو۔" "چکیلی! اٹھ بھی جاؤ، میں نے تم دونوں کے لیے دوپہر اور رات کے لیے بھی کچھ کھانے کا بندوبست کرنا ہے۔" "میں تو دوپہر میں چاول کھاؤں گی۔" چکیلی نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔

"اچھا دوپہر میں چاول ہی کھا لینا مگر اب تو آنکھیں کھولو، کل شام میں تم دونوں کے لیے ڈبل روٹی کے ٹکڑے لائی تھی۔" ماں کی بات سن کر رانی بولی۔ "میں ڈبل روٹی کھاؤں گی۔"

"میں بھی ڈبل روٹی کھاؤں گی۔" یہ کہہ کر چکیلی نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

پھر تینوں نے معراج پلازا کے ایک روشن دان میں بنے اپنے چھوٹے گھونسلے میں ناشتہ کر کے اللہ تعالی کا شکر ادا کیا۔ رانی اور چکیلی نے کچھ عرصہ قبل ہی اس گھونسلے میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کو ابھی اچھی طرح اڑنا نہیں آتا تھا، اس لیے وہ اپنی ماں کے جانے کے بعد گھونسلے ہی میں رہتی تھیں۔ ناشتے کے بعد شانی نے دونوں کو پیار کیا اور جاتے ہوئے کہا۔

"میں تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گی، گھونسلوں میں شرارتیں نہ کرنا، میں تم دونوں کے لیے مزے دار چاول لاؤں گی۔"

دونوں نے اپنی ماں کو کافی دور تک اڑتے ہوئے دیکھا۔ شانی کا رخ نہر کنارے ایک برگد کے درخت کی طرف تھا۔ وہاں بہت سے لوگ پرندوں کے لیے چاول اور مختلف دالوں کے دانے درخت کے نیچے ڈالتے تھے۔ شانی پہلے بھی کئی بار وہاں سے رانی اور چکیلی کے لیے چاول لائی تھی۔

……

عبداللہ نے اپنے بیٹے دانیال کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ دانیال بخار سے تپ رہا تھا۔ عبداللہ کی جیب میں

اتنے پیسے نہیں تھے کہ بیٹے کے لیے دوا لا سکتا۔ گھر کی ہر چیز سے غربت جھلکتی تھی۔ اس کی بیگم پریشانی میں دانیال کے سرہانے بیٹھی تھی۔ ’’آپ کچھ کریں۔‘‘

’’میں جال لے کر جا رہا ہوں، جال میں کچھ چڑیاں آ گئیں تو انہیں بیچ کر دانیال کے لیے دوا لے کر آ ؤں گا۔ تم پانی میں کپڑا بھگو کر اس کے ماتھے پر رکھو، اس طرح اس کا بخار کم ہو جائے گا۔ میں جلد واپس لوٹ آ ؤں گا۔‘‘

عبداللہ یہ کہہ کر جال اور چھوٹا سا لوہے کا پنجرا لے کر گھر سے چل پڑا۔ اس کا رخ نہر کنارے برگد کے درخت کی طرف تھا۔ وہ اس سے قبل بھی وہاں سے بہت سی چڑیوں کا شکار کر چکا تھا۔ صبح کے وقت وہ آسانی سے وہاں سے بہت سی چڑیوں کا شکار کر چکا تھا۔ صبح کے وقت وہ آسانی سے وہاں جال بچھا سکتا تھا کیوں کہ جب نہر کے پاس پارک میں مالی آ جاتے تھے تو وہ اسے چڑیاں پکڑنے نہیں دیتے تھے۔ اب اس کے لیے راستہ صاف تھا۔ وہ جال لگا کر جھاڑی کی اوٹ میں چھپ کر چڑیوں کا انتظار کرنے لگا۔ شانی نے ابھی چاول کا ایک دانہ اپنی چونچ میں پکڑا تھا کہ وہ دوسری بہت سی چڑیوں کے ساتھ جال میں پھنس گئی۔ وہ دوسری چڑیوں کے ساتھ جال میں بہت پھڑ پھڑائی مگر جال سے نکلنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ عبداللہ نے ایک ایک کر کے چڑیوں کو پنجرے میں منتقل کر کے دوبارہ جال لگا دیا۔ تین چار مرتبہ ہی جال میں اتنی چڑیاں آ گئیں کہ لوہے کا پنجرا چڑیوں سے بھر گیا۔ جال کو ایک تھیلے میں رکھنے کے بعد وہ پنجرے کو پکڑے پارک سے باہر آنے لگا تو شریف مالی اس کے سامنے تھا۔

’’تم پھر ان بے زبانوں کو پکڑ کر لے جا رہے ہو، باز آ جاؤ اس کام سے، کسی روز ان کی بد دعا لگ جائے گی تمہیں۔‘‘

’’میں ان کو کون سا ہمیشہ کے لیے پنجرے میں رکھتا ہوں، ابھی بازار جاؤں گا اور کوئی اللہ والا ان پر رحم کھا کر انہیں آزاد کروا دے گا۔‘‘

عبداللہ بولا۔

’’تم خود تو انہیں آزاد نہیں کرو گے، پیسے لو گے پیسے، ان کی بد دعا سے بچ۔‘‘ شریف مالی نے اسے گھورا۔

’’بیٹا بیمار ہے میرا، اس کے لیے دوا لے کر جانی ہے، کوئی ہنر ہاتھ میں نہیں، بس یہی ایک کام آتا تھا۔‘‘

’’چھوڑ دو یہ کام، مت کرو ان ننھی جانوں کو پنجرے میں قید، چھوڑ دو ان کو۔‘‘ شریف مالی کی باتوں کا کوئی جواب دیے بغیر عبداللہ چڑیوں کا پنجرا لے کر بازار کی طرف چل پڑا۔

بازار بھی بند تھا۔ وہاں سے دودھ اور اخبار بیچنے والے گزرتے دکھائی دے رہے تھے۔ عبداللہ چوک میں ایک تھڑے پر چڑیوں کا پنجرا رکھ کر گاہکوں کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

''ظالم شخص! یہ پنجرا کھولو، میری رانی اور چمکیلی میرا انتظار کر رہی ہیں۔'' شانی کی پکار بھلا عبداللہ کیا سمجھ سکتا تھا۔

''میں یہ پنجرا توڑ کر اڑ جاؤں گی، میری چمکیلی نے چاول کھانے ہیں۔'' شانی کی یہ حالت دیکھ کر ایک بڑی عمر کی چڑیا نابو نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''تم میں اتنی طاقت نہیں کہ لوہے کے اس پنجرے کو توڑ سکو، ہمارے پاس اب ایک طاقت ضرور ہے جس سے یہ پنجرا کھل سکتا ہے۔''

''کون سی ہے وہ طاقت؟ شانی نے پوچھا۔

''دعا کی طاقت، دعا کرو اللہ اس کے دل میں ہمارے لیے رحم ڈال دے یا کوئی ایسا مہربان بھیج دے جو ہمیں اس قید سے آزاد کروائے۔ ہاں دعا سے ہر مشکل ٹل سکتی ہے۔''

''اللہ میاں جی! مجھے میری چمکیلی اور رانی سے ملا دے۔ مجھے اس پنجرے سے آزاد کروا دے۔'' شانی کی زبان پر دعا تھی۔

پنجرے میں ایک چھوٹے سے پیالے میں باجرے کے دانے پڑے تھے۔ کسی چڑیا نے باجرے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ شانی نے برگد کے درخت کے نیچے سے جو چاول کا دانہ اٹھایا تھا، ابھی تک اس کی چونچ میں تھا۔ وہ یہ دانہ کس طرح کھا سکتی تھی، یہ دانہ تو اس کی پیاری چمکیلی کے لیے تھا۔

آہستہ آہستہ بازار میں دکانیں کھلنا شروع ہوئیں تو عبداللہ کو لوگوں کی چہل پہل دیکھ کر امید بندھی کہ جلد کوئی مہربان آ کر پنجرے سے چڑیاں آزاد کروائے گا۔ تھڑے کے ساتھ نان چنے والا بھی اپنی ریڑھی لے کر آ گیا تھا۔

''عبداللہ کیا حال ہے؟'' جمال نے عبداللہ کو مخاطب کیا۔

''جمال بھائی! میں تو ٹھیک ہوں، دانیال کو شدید بخار ہے۔''

''کوئی دوا دارو کیا یا نہیں؟''

دوا کہاں سے لیتا، جیب تو بالکل خالی ہے۔''

''بے زبانوں کی بد دعا لے گا تو جیب تو خالی رہے گی، چھوڑ دے یہ دھندا، لگ جا میرے ساتھ مگر تم یہ کام

کس طرح کر سکتے ہوں، تم تو آرام طلب ہو، ادھر چڑیاں پکڑیں اور تھوڑی دیر میں بیچ کر ہوٹل میں بیٹھ کر تاش کھیلنے لگے۔ جو کمایا وہیں اڑا دیا۔ جب گھر سے نکلے جیب خالی، جب گھر گئے جیب خالی۔"

"جمال بھائی! بس کریں بس۔"

"سچ سننے کا حوصلہ نہیں تم میں، چھوڑ دو ننھی چڑیوں کو۔"

جمال کی باتیں عبداللہ کو بہت بری لگ رہی تھیں۔ اس نے چڑیوں کا پنجرا اٹھایا اور ویگن کے اڈے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کو رہ رہ کر دانیال کا خیال آ رہا تھا۔ ابھی تک اس کی جیب میں ایک روپیہ تک نہ آیا تھا۔

"ظالم انسان! مت ہم پر ظلم کر، ہمیں آزاد کر دے، ہمیں اپنے گھونسلوں میں جانے دو، کھول دو اس پنجرے کا دروازہ۔"

شانی پنجرے سے سر ٹکرا ٹکرا کر التجا کرنے لگی۔

عبداللہ بھلا کب ان ننھی جانوں کی زبان سمجھتا تھا۔ دس بجے کے قریب پہلے تو ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہوئی اور پھر یکایک آسمان پر سیاہ بادل چھا گئے۔ بادل اتنے گھرے تھے کہ دن کے وقت بھی اندھیرا چھا گیا تھا۔ پھر بارش کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ دو گھنٹے مسلسل بارش برسی۔ بازار میں پانی کھڑا ہو گیا۔ عبداللہ چڑیوں کا پنجرا لے کر ایک مارکیٹ میں کھڑا ہو گیا تھا۔ صبح سے اب تک ایک گاہک بھی اس کے پاس نہ آیا تھا۔ بارش تو تھم گئی تھی مگر ابھی تک تیز ہوا چل رہی تھی۔ سورج نکلتے ہی گرمی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ عبداللہ امید کا دامن پکڑے چڑیوں کا پنجرا لے کر بڑی مارکیٹ کے پاس چلا گیا۔ وہاں بارش کا پانی کافی حد تک نکل چکا تھا۔ وہ ابھی گاہکوں کا منتظر تھا کہ ایک آدمی نے آ کر اس کو بتایا کہ محکمہ "انسدادِ بے رحمی حیوانات" کے کچھ بندے اس طرف ان لوگوں کو پکڑنے کے لیے آ رہے ہیں جو بے زبان چرند پرند قید کرتے ہیں۔"

یہ سننا تھا کہ عبداللہ کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے پنجرا اٹھایا اور ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔ وہ بار بار پیچھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اللہ کرے یہ ظالم پکڑا جائے۔" سونی چڑیا بولی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" شانی نے سونی چڑیا کی ہاں میں ہاں ملائی۔

نابو چڑیا نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"بد دعا نہیں صرف اور صرف دعا کرو۔"

عبداللہ کافی دیر تک تنگ گلی میں چھپا رہا۔ بارش کے بعد اس تنگ گلی میں حبس کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ گلی اتنی تنگ تھی کہ پنکھوں کے چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جس کے باعث عبداللہ پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ ایک گھر کے باہر لگے ایک نل سے اس نے پانی پیا اور بوجھل قدم اٹھاتا ہوا گلی سے باہر آ گیا۔ ایک دم اس کی نظر محکمہ ”انسدادِ بے رحمی حیوانات“ کے ٹرک پر پڑی تو وہ الٹے پاؤں گلی میں واپس آ گیا۔ خوف سے اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ گلی میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ گلی میں لوگوں کی آمدورفت بہت کم تھی۔ وہ پنجرے میں قید چڑیوں کو دیکھ رہا تھا کہ سامنے والے گھر سے آوازیں اس کے کانوں میں پڑیں۔

”بانو! جلدی سے پنکھا بند کر دو۔“ رخسانہ چلائی۔

”کیوں کیا ہوا ہے؟“ بانو نے پوچھا۔

”ایک چڑیا کا بچہ کمرے میں آ گیا ہے۔“

”تو پھر کیا ہوا؟“

”چڑیا کا بچہ پنکھے سے ٹکرائے گا تو مر جائے گا، جلدی سے پنکھا بند کرو۔“

اس سے قبل کہ بانو پنکھا بند کرتی، چڑیا کا بچہ پنکھے سے ٹکرا کر مر چکا تھا۔ اس کا سر تن سے جدا ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مردہ چڑیا گھر کے باہر پڑی تھی۔ پنجرے میں بند چڑیوں نے مردہ چڑیا کو دیکھ کر ”چوں۔۔ چوں۔۔ چوں“ کا شور مچایا۔ اسی اثنا میں ایک چڑیا مردہ چڑیا کے پاس آئی اور اسے دیکھ کر بے چینی سے اِدھر اُدھر اڑنے لگی۔ عبداللہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ چڑیا نے اس کی آنکھوں کے سامنے اس مردہ چڑیا کے بچے کو اپنی چونچ سے چوما۔ اس نے یہ عمل کئی بار دہرایا۔ آخر وہ بے دم ہو کر وہیں ڈھیر ہو گئی۔ عبداللہ سمجھا کہ چڑیا گرمی کے باعث بے ہوش ہو گئی ہے، اس نے آگے بڑھ کر چڑیا کو اٹھایا تو وہ مر چکی تھی۔ عبداللہ نے مردہ چڑیا اور اس کے بچے کی گردن تن سے جدا دیکھی تو اس کے دل میں رحم آ گیا۔ اس نے پنجرے میں بند چڑیوں کو دیکھا تو ہر چڑیا اس کو بے قرار دکھائی دی۔

”تم ظالم ہو۔۔ تم ظالم ہو۔“ اس کے کانوں میں چڑیوں کی یہ آواز گونجنے لگی۔ ”میں ظالم نہیں۔۔ میں ان ننھی جانوں کو آزاد کر دوں گا۔ میں ظالم نہیں۔“

یہ کہہ کر عبداللہ نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ چند لمحوں میں پنجرا چڑیوں سے خالی ہو گیا تھا۔ نابو چڑیا کی دعا اثر لائی تھی۔ شانی کی چونچ میں ابھی تک چاول کا دانہ تھا۔ شانی کا گھونسلا بھی اسی علاقے میں تھا، جہاں نابو چڑیا کا گھونسلا تھا۔ وہ نابو چڑیا کے ساتھ اڑ رہی تھی۔ شانی نے ایک چھت سے کچھ اور چاول کے دانے بھی

چن لیے تھے۔

عبداللہ خالی پنجرے اور خالی جیب کے ساتھ گھر پہنچا تو دانیال صحن میں ہوائی جہاز کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک تھا۔

”دانیال کو کوئی دوا دی ہے۔“ عبداللہ نے اپنی بیگم سے پوچھا۔

”نہیں تو۔“

”پھر یہ کیسے ٹھیک ہو گیا ہے۔“

”گھنٹہ پہلے تو یہ بے سدھ پڑا تھا، پھر آہستہ آہستہ اس کا بخار کم ہونا شروع ہو گیا۔ اب یہ آپ کے سامنے ہے بھلا چنگا۔“

”یہ تو ان چڑیوں کی دعاؤں کا اثر ہے جن کو میں نے گھنٹہ بھر پہلے کوئی دام وصول کیے بغیر آزاد کیا تھا۔ میں آئندہ کبھی بھی چڑیوں کو قید کر کے ان کے دام وصول نہیں کروں گا۔“ اب عبداللہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

جب شانی کا گھونسلا آ گیا تو اس کی آواز سن کر رانی اور چمکیلی نے ”چوں۔۔چوں“ کرنا شروع کر دیا۔

”بی نابو! میرے گھونسلے میں آؤ، ہمیں کچھ خدمت کا موقع دو۔“

”بس میں چلتی ہوں میرے پوتے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میری یہ بات پلے سے باندھ لو کہ تم دعا کی طاقت جب بھی استعمال کرو گی، جلد یا دیر کامیاب ہو جاؤ گی۔ جب بھی کسی مشکل کا سامنا ہو اس طاقت کو ضرور آزمانا۔“

”بی نابو! میں ایسا ہی کروں گی۔“

نابو چڑیا کے جانے کے بعد شانی نے رانی اور چمکیلی کو جی بھر کے پیار کیا اور سارا دن اس پر جو بیتی وہ انہیں۔

”اب تو ہمیں بھوکا ہی سونا پڑے گا۔“ چمکیلی کی یہ بات سن کر شانی بولی۔

”ایک ماں کے ہوتے ہوئے ایسا بھلا کس طرح ہو سکتا ہے اس کے بچے بھوکے سوئیں۔ منہ کھولو اور کھاؤ مزے دار چاول۔ کھولو منہ۔“

”چوں۔۔چوں۔۔چوں“ کرتے ہوئے رانی اور چمکیلی کے منہ میں شانی نے چاول کے دانے ڈالے تو وہ خوشی سے چاول کھاتے ہوئے بولے۔

”ماں ہو تو ہماری ماں جیسی۔۔۔“

نگہت سلیم

ایک تھا شہزادہ

ایک تھا لکڑہارا۔ بالکل شہزادوں جیسی صورت والا۔ اس نے یہ پیشہ اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ اور باپ کی ناگہاں موت نے اسے ایک مکمل لکڑہارے کا روپ دے دیا تھا۔ جس ملک میں لکڑہارا رہتا تھا۔ وہ ملک امن و آشتی کا گہوارہ تھا۔ ہر طرف لہلہاتے کھیت کھلیان اور ان میں مشقت کرنے والے صحت مند اور پر سکون کسان۔ وجہ یہ تھی کہ اس ملک کا بادشاہ عدل و انصاف اور رحم و سخاوت کو ہمیشہ یاد رکھتا تھا۔ یہ اس کے اصول بھی تھے۔ اور اس کی اعلی حکمرانی کے راز بھی۔ بادشاہ سے سب خوش تھے۔ لیکن لکڑہارا جس کا نام نوشیروان تھا، بادشاہ کی گذرتی زندگی سے مطمئن نہ تھا اور وجہ یہ کہ بادشاہ کا ایک شہزادہ بھی تھا۔ جس کا نام شہزادہ فیروز تھا اس کی عمر تو لکڑہارے نوشیروان جتنی تھی لیکن شکل و صورت میں نوشیروان سے بہت کم تھا۔ بات صورت شکل کی نہیں ہوتی یہ اللہ کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ اصل بات تو سیرت اور ذہانت کی ہوتی ہے۔ رعایا میں مشہور تھا کہ شہزادہ اپنے باپ کی طرح انصاف پسند اور رحم دل نہیں ہے۔ نہ اس میں سخاوت کا جذبہ ہے اور نہ ہی وہ ذہین ہے۔ حالاں کہ اسے ملک کے چوٹی کے استاد پڑھانے آتے تھے۔ لیکن اسے علم سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ اور یہ بات پورے ملک میں مشہور ہو گئی تھی۔ کہ بادشاہ اپنے ولی عہد سے بہت مایوس اور رنجیدہ ہے۔ اسی لیے جب بادشاہ کی سواری گزرتی اور ساتھ ہی شہزادہ سر پر چھوٹا سا تاج سجائے سواری کے ساتھ گزرتا تو لکڑہارا نوشیروان اسے دیکھ کے افسردہ ہو جاتا۔ اور سوچتا کہ کاش اس کی جگہ میں شہزادہ ہوتا میں جو لوگوں کی اتنی خدمت کر سکتا ہوں اتنا ذہین اور محنتی ہوں اللہ نے مجھے شہزادوں جیسی صورت دی مگر قسمت لکڑہاروں جیسی۔ لکڑہارا نوشیروان رات کو جب سونے لگتا تو دیر تک یہ سوچا کرتا کہ اگر وہ شہزادہ بن جائے تو کتنا اچھا ہو، نیند میں اسے جو خواب دکھائی دیتے۔ ان میں اس کے سر پر تاج ہوتا وہ شاہانہ ہاتھی پر سوار ہوتا اور فیل بان آواز لگا رہا ہوتا، ہٹو راستہ دو شہزادے کی سواری آ رہی ہے، انھی خوابوں میں رات بیت جاتی صبح مرغ کی اذان پر اس کی آنکھ کھلتی تو وہ خود کو ایک کھردری چارپائی پر پاتا جس پر نہ نرم گدے ہوتے نہ تکیے۔ وہ اپنی کلہاڑی اٹھاتا اور جنگل کی طرف نکل جاتا بھوک لگتی تو جنگلی پھل کھا لیتا چشمے کا پانی پی لیتا اور صبح کے چہچہاتے پرندوں سے باتیں کر لیتا دوپہر سے

پہلے وہ لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھا کر آبادی کی طرف نکل آتا اور لکڑیاں بیچتا۔

ایک صبح کا ذکر ہے۔ لکڑہارا نوشیروان جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہا تھا اور پرندوں سے باتیں کر رہا تھا اتنے میں ایک بزرگ دکھائی دیے نوشیروان لکڑیاں کاٹتے کاٹتے رک گیا بزرگ قریب آئے تو ٹھہر گئے اور بولے بیٹا تم کون ہو --- میں ---؟ نوشیروان نے حیرت سے انھیں دیکھا پھر بولا، کوئی بھی مجھے دیکھ کے کہہ سکتا ہے کہ میں لکڑہارا ہوں لیکن میرا نام نوشیروان ہے جو ایک بادشاہ کا نام تھا کاش میں بھی اس کی طرح ایک مشہور بادشاہ ہوتا --- اور ملک میں عدل و انصاف کرتا ---، بزرگ مسکرائے اور بولے کیوں کیا تمھارا بادشاہ ظالم ہے کیا وہ عدل و انصاف نہیں کرتا ---، نوشیروان نے کہا، ہمارا بادشاہ بہت اچھا ہے لیکن آپ خود سوچیں جب اس کے بعد اس کا بیٹا یعنی شہزادہ فیروز بادشاہ بنے گا تو اس ملک کا کیا ہوگا۔ اس لیے کہ شہزادہ فیروز نہ ذہین ہے نہ عادل و منصف --- کیا یہ بات انصاف کے خلاف نہیں کہ مجھ میں شہزادہ بننے کی تمام خوبیاں ہیں، اور میں لکڑہارا ہوں اس میں شہزادہ بننے کی کوئی خوبی نہیں لیکن وہ شہزادہ ہے --- بزرگ پھر مسکرائے اور بولے میری بات غور سے سنو ہر انسان کے شانے پر ایک تاج رکھا ہوا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر انسان کو صلاحیت دیتے ہیں۔ کہ وہ اس تاج کو اٹھا کے اپنے سر پر پہن سکے۔ لیکن اس کے لیے محنت کی ضرورت ہوتی ہے، نوشیروان نے کہا تاج پہننے کے لیے اور شہزادہ بننے کے لیے کس قسم کی محنت کی ضرورت ہوتی ہے؟ بزرگ بولے یہ بات تمھیں خود دریافت کرنی ہوگی --- اتنا کہہ کے انھوں نے کہا اچھا مجھے راستہ تو دکھا دو مجھے آبادی تک پہنچنا ہے --- نوشیروان نے اپنی کلہاڑی زمین پر رکھی اور بولا آیئے میرے پیچھے پیچھے میں آپ کو آبادی تک چھوڑ آتا ہوں واپس آ کر میں اپنا کام کرلوں گا۔ یہ کہہ کے نوشیروان آگے آگے اور بزرگ پیچھے پیچھے چلنے لگے نوشیروان کے ذہن میں بس یہی بات گونج رہی تھی کہ ہر انسان کے شانے پر ایک تاج رکھا ہوا ہوتا ہے اچانک اس نے مڑ کے دیکھا کہ بزرگ سے کچھ اور پوچھ سکے لیکن یہ کیا بزرگ تو غائب ہو چکے تھے۔ نوشیروان حیران سا کھڑا رہ گیا اس کے دل میں جیسے چپکے سے یہ بات آئی کہ بزرگ اس سے راستہ پوچھنے کے لیے نہیں۔ بلکہ اس کو راستہ بتانے کے لیے آئے تھے۔ وہ مسکرا کے واپس اپنی کلہاڑی اور لکڑیوں کی طرف بڑھا لیکن اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ اپنے شانے پر رکھے ہوئے تاج کو ایک دن ضرور اپنے سر پر رکھے گا ----

اس دن کے بعد سے لکڑہارا نوشیروان نہ صرف اپنا کام اور زیادہ محنت سے کرنے لگا بلکہ اب وہ شہزادے کی سواری اور شہزادے کے سر پر رکھا ہوا تاج دیکھ کے افسردہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اپنے سے زیادہ غریب

لوگوں کو دیکھتا تو ان کی مدد کرتا اس طرح آہستہ آہستہ نوشیروان اپنے ملک کے لوگوں میں مقبول ہونے لگا اب لوگ اسے لکڑ ہارے کی بجائے ایک ہمدرد اور مخلص انسان کی حیثیت سے جاننے لگے جس کو بھی کسی مدد کی ضرورت ہوتی لکڑ ہارا نوشیروان اپنی استعداد سے زیادہ اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتا ۔۔۔

ایک دن ایک مسافر اس ملک میں داخل ہوا وہ ایک چھوٹا تاجر تھا اور بازاروں گلیوں میں گھوم پھر کر اپنا چھوٹا موٹا سامان بیچنا چاہتا تھا لیکن اسے کسی کی مدد کی ضرورت تھی ایسے شخص کی جو اسے چند دن کے لیے رہنے کی جگہ اور کھانا دے سکے اس ملک کے راستے سمجھا سکے اور لوگوں سے ملوا سکے تا کہ تاجر کا سامان آسانی سے فروخت ہو جائے لوگوں نے اس مسافر کو لکڑ ہارے نوشیروان کا پتا دیا کہ وہ نوشیروان سے مدد حاصل کر سکے، نوشیروان مسافر سے بہت خوش دلی سے ملا اور اسے اپنے گھر ٹھہرایا ۔ مسافر کے پاس ایک بڑی سی پوٹلی تھی جس میں بیچنے والا سامان تھا ایک ڈبہ تھا اور ایک پنجرہ جس میں طوطا بند تھا ۔ مسافر نے نوشیروان کو بتایا کہ یہ اس کا پالتو طوطا ہے جو نہ صرف باتیں کرتا ہے بلکہ اتنا ذہین ہے کہ اسے اچھے اچھے مشورے بھی دیتا ہے اس لیے وہ اپنے طوطے کو ہمیشہ ساتھ رکھتا ہے تا کہ دل بھی بہلا رہے اور ہر بات میں مشورہ بھی ہو سکے ۔

نوشیروان کا گھر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی پر مشتمل تھا ۔ اس نے گھر کا سب سے آرام دہ حصہ مسافر کو دے دیا اور اسے رات کا کھانا کھلانے کے بعد کہنے لگا کہ اب تم آرام کرو جب صبح ہو گی تو میں شہر کی گلیوں بازاروں میں تمھیں لے چلوں گا تا کہ راستے سے بھی تم واقف ہو جاؤ اور جو لوگ ملیں ان سے تمھارا تعارف بھی کرا دوں ۔ اس طرح لوگ تم پر اعتماد کر سکیں گے اور اپنی ضرورت کا سامان تم سے خرید لیں گے ۔۔۔۔

مسافر یہ سن کے بہت خوش ہوا ۔ اتنا کہہ کے نوشیروان کوٹھڑی کے دوسرے حصے میں آ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا اتنے میں اسے کسی کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں ۔ اس نے ذرا سا اُٹھ کے دیکھا کہ مسافر اپنے طوطے سے باتیں کر رہا تھا ۔ نوشیروان کے دل میں تجسس پیدا ہوا ۔ اس نے خاموشی سے باتیں سننے کی کوشش کی طوطا کہہ رہا تھا ۔ مالک تم اتنا تھکا دینے والا سفر طے کر کے یہاں کیوں آئے ہو اور یہ چھوٹا موٹا سامان بیچ کے تم کیا کرو گے ۔ تمھارے بادشاہ نے تو تمھیں بہت ساری دولت دی ہے ۔ کیا وہ تمھارے لیے کافی نہیں ۔ طوطے کی بات سن کے مسافر ہنسا اور بولا تم میرے پیارے دوست ۔۔۔ کوئی کسی کو خوامخواہ دولت نہیں دیتا، چاہے کتنا ہی سخی بادشاہ کیوں نہ ہو ۔ آج کل کے زمانے میں نوشیروان بادشاہ جیسے لوگ پیدا نہیں ہوتے وہ دولت بادشاہ نے مجھے ایک خاص مقصد کے لیے دی ہے ۔ وہ مقصد کیا ہے؟ تم مجھے نہیں بتاو

گے؟ طوطے نے پوچھا۔ مسافر بولا تم میرے وفادار دوست ہو اس لیے مَیں تمھیں بتاتا ہوں کہ وہ مقصد کیا ہے لوسنو یہ ملک جس میں ہم مسافر بن کے آئے ہیں ہمارا بادشاہ اس ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ نوشیروان نے سنا تو احتیاط سے اور آگے آ گیا اور توجہ سے ساری بات سننے لگا مسافر نے کہا، کہ یہاں کے لوگ بہت صحت مند اور ذہین ہیں۔ اگر انھیں ہمارے ارادوں کا علم ہو گیا تو یہ ہمیں مار بھگائیں گے، لیکن مالک طوطا بولا: پہلے زمانے میں اگر کسی بادشاہ کو کسی ملک پر قبضہ کرنا ہوتا تھا تو لڑائی لڑتا تھا اور اپنی فوجیں اس ملک سے لڑنے کے لیے بھیجتا تھا۔۔۔ مسافر مکاری سے ہنسا ہاں میرے دوست فوجیں تو وہ اب بھی ہمارے بادشاہ نے بھیجی ہیں اور وہ اس ڈبے کے اندر بند ہیں۔ یہ کہہ کے اس نے ڈبا اُٹھا کے چوم لیا، لیکن مالک یہ کیسی فوجیں ہیں۔ جو ڈبے کے اندر بند ہیں۔ مسافر کہنے لگا یہ ایسی فوجیں ہیں جن سے اس ملک کے لوگ پیار کریں گے اس لڑائی میں ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ پس یہ قوم کمزور اور بیمار ہو جائے گی۔ یہاں حکمران اور بادشاہ پیدا ہونا بند ہو جائیں گے، پھر یہ لوگ ہماری فوجوں کے غلام بن جائیں گے، پھر ہمارا بادشاہ اس ملک پر قبضہ کر لے گا۔

نوشیروان واپس اپنے بستر پر آیا اور سوچنے لگا کہ اس خطرناک دشمن سے کیسے نپٹا جائے۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ یہ جنگ وہ لڑے گا اپنے شانے پر رکھے ہوئے تاج کو اپنے سر پر رکھ کے، ایک بہادر شہزادے کی طرح۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس جنگ میں وہ ہر صورت دشمن کو شکست دے گا۔ مگر کیسے۔؟ یہ تو اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ اس کے مدِ مقابل کس قسم کی فوجیں ہیں۔

رات جب گہری ہو گئی تب نوشیروان لکڑہارا اپنے بستر سے اُٹھا اور مسافر کی طرف آیا، مسافر گہری نیند سو رہا تھا طوطا بھی پروں میں منہ چھپائے سو رہا تھا نوشیروان دبے پاؤں آگے آیا اور اس نے چپکے سے وہ ڈبہ اٹھا لیا۔ واپس اپنے بستر کی طرف آ کے اس نے آہستہ سے ڈبہ کھولا اور روشنی میں لا کے اسے دیکھا مگر یہ کیا؟ ڈبے کے اندر تو بے شمار چھوٹی چھوٹی پڑیاں رکھی ہوئی تھیں اور ان پڑیوں کے اندر سفوف نما کوئی چیز تھی۔ یہ یقیناً کوئی خطرناک سفوف ہے، نوشیروان نے سوچا، کوئی زہریا نشہ ہے، یہ سوچتے ہی نوشیروان جھٹ سے اٹھا۔ اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی تھی۔ یہ ایسی ترکیب تھی جس سے دشمن کی چال بے اثر ہو سکتی تھی۔ نوشیروان نے گھر میں پڑی ہوئی چکنی مٹی کو پیس کر اس کا سفوف بنایا، پھر ڈبے کے اندر سے ساری پڑیاں نکالیں ان کا سفوف ایک جگہ اکٹھا کیا اور سفوف کی جگہ چکنی مٹی کا سفوف اسی مقدار میں پڑیوں میں بھرتا چلا گیا یہ سارا کام اس نے ایک گھنٹے کے اندر مکمل کر لیا۔ پھر پڑیوں کو احتیاط سے ڈبے کے اندر اسی طرح رکھ کے آہستہ سے ڈبہ مسافر کے

سرہانے واپس رکھ آیا۔ اب وہ ایک بڑے مرحلے سے گزر چکا تھا۔

صبح ہوئی تو مسافر بیدار ہوا طوطا بھی جاگ چکا تھا اور ٹیں ٹیں کر رہا تھا۔ نوشیروان نے مسافر اور اس کے طوطے کو ناشتہ کرایا مسافر بہت خوش تھا اور بار بار نوشیروان سے اردگرد کے لوگوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ نوشیروان نے اسے بتایا کہ اس ملک کے لوگ بہت بہادر اور محنتی ہیں لیکن یہاں تو کچھ کچھ غربت کے آثار ہیں۔ مسافر نے کہا، ہاں۔ دراصل آبادی بہت بڑھ گئی ہے اس لیے غریبی بڑھتی جا رہی ہے۔ نوشیروان نے اسے جواب دیا، پھر نوشیروان نے مسافر سے پوچھا کہ اس گٹھڑی میں تو سامانِ تجارت ہے لیکن اس ڈبے میں کیا ہے۔ مسافر مکاری سے ہنسا اور بولا اس میں جادو کی ایک چیز بند ہے۔ جادو کی چیز۔؟ نوشیروان حیران ہوا۔ ہاں، ایک بہت قیمتی سفوف۔ اگر اسے تم ذرا سا کھا لو تو مزا آ جائے۔ مسافر بولا مگر کیسا مزہ، نوشیروان نے پوچھا اسے کھا کے بہت خوب صورت خواب دکھائی دیتے ہیں۔ انسان خود کو ہواؤں میں اُڑتا محسوس کرتا ہے۔ مسافر نے بتایا تو پھر تم اسے کھا کے بتاؤ۔ نوشیروان نے کہا۔ نہیں نہیں۔۔۔ یہ تو مَیں تمھارے ہم وطنوں کے لیے اپنے وطن کا تحفہ لایا ہوں۔ مسافر تھوڑا سا گھبرا گیا تھا۔ لیکن میرے ہم وطن خواب دیکھنا نہیں چاہتے بلکہ محنت کرنا چاہتے ہیں کام کرنا چاہتے ہیں نہیں۔ تم ابھی بچے ہو، ناسمجھ ہو، ابھی دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کچھ نہیں کرنا چاہتے صرف خواب دیکھنا چاہتے ہیں مَیں ایسے ہی لوگوں کے لیے اس ڈبے میں خواب بند کر کے لایا ہوں۔ یہ کہہ کے مسافر اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد مسافر اور نوشیروان آبادی کے گلی کوچوں میں سامانِ تجارت بیچ رہے تھے نوشیروان اسے بڑی مارکیٹ لے گیا یہاں کچھ لوگوں سے اس نے مسافر کا تعارف کرایا یونہی مسافر کے پاس کوئی گاہک آتا مسافر اسے غور سے دیکھتا پھر مناسب سمجھتا تو ایک پڑیا نکال کے اس کے آگے بڑھا دیتا اور پڑیا کی بہت تعریفیں کرتا۔ نوشیروان دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ جب دوپہر ہو گئی تو نوشیروان نے مسافر سے کہا کہ چلو اب گھر چل کے کھانا کھاتے ہیں، پھر کچھ آرام کریں گے، اس کے بعد مَیں لکڑیاں کاٹنے جنگل جاؤں گا۔ اگر مناسب سمجھو تو تم بھی میرے ساتھ چلنا۔ مسافر راضی ہو گیا۔ دونوں گھر گئے طوطا بھی بہت بھوکا تھا۔ نوشیروان نے مسافر اور طوطے کو کھانا کھلایا، خود بھی کھایا پھر ایک مشروب کا بڑا گلاس لے کر مسافر کے پاس آیا اور بولا: اس مشروب کو میرے وطن کے لوگوں کی طرف سے ایک غیر وطن کے مسافر کے لیے تحفہ سمجھو، مسافر نے خوش ہو کے مشروب لیا۔ زیادہ کھانے اور نیند کے غلبے کی وجہ سے مسافر کچھ نڈھال سا ہو تھا۔ ایک ہی

سانس میں شروب چڑھا گیا تا کہ جلد سے جلد آرام کر سکے ۔ نوشیروان نے تھوڑا سا شروب طوطے کی کٹوری میں بھی ڈال دیا تھا ۔ طوطے نے ایک ہی گھونٹ پینے کے بعد ہی چلانا شروع کر دیا مالک اسے نہ پیا، وہ برابر بولے جا رہا تھا اور مسافر مدہوش سا بیٹھا تھا ۔ طوطے نے اپنا مشورہ دینے میں بہت دیر کر دی تھی ۔ مسافر نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں نوشیروان سے کہا: او۔۔۔لکڑ ہارے۔۔۔۔یہ تو نے مجھے کیا پلا دیا ۔ نوشیروان مسکرا دیا اور بولا عالی جناب۔۔۔مَیں نے عرض کیا تھا نا کہ میرے ہم وطن خواب دیکھنا نہیں بلکہ محنت کرنا چاہتے ہیں اس لیے آپ کا تحفہ مَیں نے آپ کو لوٹا دیا ہے ۔ وہ سفوف جو آپ میرے وطن کے لوگوں میں بانٹنا چاہتے تھے ۔ اسی کو پانی میں گھول کے مَیں نے آپ کو پلا دیا ہے ۔ مسافر یہ سن کے چیخنے لگا، مگر جلد ہی اس کی آواز ڈوب گئی ۔

نوشیروان نے تھوڑی دیر بعد مدہوش مسافر کو اپنے کندھے پر اُٹھایا اس کی گٹھڑی بھی اُٹھائی اور طوطے سے کہا، عقل مند لیکن کاہل دوست تُو بھی چل یہ کہہ کے اس کا پنجرہ پکڑا اور جنگل کی طرف چل دیا ۔ نوشیروان صحت مند اور توانا تھا جب کہ مسافر درمیانی قد کاٹھ کا مالک تھا ۔ جنگل کے دوسرے سرے پر نوشیروان نے ایک جگہ مسافر کو کندھے سے اتارا ۔ اس کی گٹھڑی اور طوطے کا پنجرہ رکھا اور طوطے سے بولا ۔ پیارے طوطے تمھارا مالک جب اپنے ہم جنسوں سے وفاداری نہیں کر سکتا تو تم سے کیا وفاداری کرے گا ۔ تمھارا پنجرہ کھول رہا ہوں ۔ طوطا پنجرے سے باہر نکلا اور اُڑ کے اس کے کندھے پر بیٹھ گیا اور بولا جہاں تم جیسے بہادر عقل مند اور وفادار رہتے ہوں ۔ مَیں بھی وہیں رہنا چاہتا ہوں ۔

یہ ایک الگ کہانی ہے کہ کس طرح مسافر ہوش میں آیا اور کس طرح گرتا پڑتا واپس اپنے ملک پہنچا ۔ لیکن اس دن کے بعد سے جنگل کے اس پار رہنے والے لوگ یہی سمجھتے تھے ۔ کہ نوشیروان کے وطن میں رہنے والا ہر بچہ شہزادہ ہے اس کے شانے پر تاج رکھا ہوتا ہے ۔ جسے وہ جب چاہے اٹھا کر اپنے سر پر پہن سکتا ہے ۔ یعنی وہ اچھے حکمرانوں کی طرح اپنے ملک کی حفاظت کر سکتا ہے ۔

☆☆☆☆

سید وقار عظیم

کہاوتوں کی کہانیاں

کہانی کے لفظ میں بھی کتنی مٹھاس ہے۔ بچے جب کچھ ہوش سنبھالتے ہیں اور اُنھیں اپنے آس پاس کی چیزوں سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے تو کھیل کود کے علاوہ ان کی تفریح کی سب سے بڑی چیز کہانیاں ہوتی ہیں۔

کہانی چاہے کیسی ہو۔ سچی ہو یا جھوٹی۔ کسی کی ہو:

جن، دیو، پری، مینڈک، بکری، بیل، چڑیا۔

اور کسی نے کہی ہو:

نانی اماں نے، دادی نے، ماسٹر صاحب نے یا کلاس کے کسی ساتھی نے، نہایت دلچسپی کے ساتھ سُنی جاتی ہے، اور ایسی دلچسپی سے سُنی جاتی ہے کہ کہانی کے آگے کھانے پینے اور سونے جاگنے کی بھی بالکل سُدھ بُدھ نہیں رہتی۔

کہانیوں سے انسان کی یہ دلچسپی بچپن سے لے کر بڑھاپے تک یکساں قائم رہتی ہے، اور عورت، مرد، جوان اور بُوڑھے سب ہی کہانی پر جان دیتے ہیں۔

فرق بس اتنا ہی ہے کہ چھوٹوں اور بڑوں کی کہانیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔

بڑے بُوڑھے جب ساتھ بیٹھتے ہیں تو وہ چڑیا چڑے کی کہانی نہیں کہتے، وہ لال پری اور کالے دیو کا پُراسرا قصہ بھی نہیں سنتے۔

اُن کی کہانیاں اکثر آپ بیتیاں ہوتی ہیں۔ جو جس پر گزری ہے وہ مزے لے لے کر سُناتا ہے۔

کبھی دوسروں کی زندگی کی باتیں اس طرح سُنی اور سُنائی جاتی ہیں کہ کیا کوئی پریوں اور شہزادے شہزادیوں کی کہانیاں سنائے گا۔

کہاوتیں ہم میں سے ہر ایک استعمال کرتا ہے اور ہم میں سے ہر ایک کو کتابیں اور مختلف قسم کے رسالے پڑھتے وقت ان کہاوتوں سے اکثر سابقہ پڑتا ہے۔

کہاوت جہاں کہیں بھی آتی ہے۔ عبارت میں ایک فن پیدا ہو جاتا ہے، اور بات کی تاثیر دُگنی ہو جاتی

ہے۔ لیکن یہ تاثیر اُس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے، جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ کہاوت عبارت میں آئی ہے، وہ پہلے پہل بنی کب اور کیسے تھی۔

ہر کہاوت کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے اور اصل میں یہی کہانی بات کی تاثیر میں کئی گنا اضافہ کرتی ہے۔ جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ کوئی کہاوت پہلے پہل کب استعمال ہوئی تھی اور اس کے ساتھ کون سی کہانی شامل ہے۔ انھیں اس بات میں بڑا لطف آتا ہے۔

یُوں تو اُردو میں ایسی سینکڑوں کہاوتیں ہیں جو مشہور ہیں لیکن ہم تین کہاوتوں کی کہانیاں آپ کو بتاتے ہیں۔

کہانیاں پڑھو، کہانیوں کا لطف اٹھا اور ساتھ ساتھ یہ بھی سوچو کہ جو کہاوت تم نے کتابوں میں پڑھی تھی، اس کے معنی بھی تمھیں معلوم تھے، لیکن اب جب کہ تم کو اس کہاوت کی کہانی بھی معلوم ہو جائے گی تو تمھیں اندازہ ہوگا کہ اس کہاوت کے معنی تمھارے لیے کتنے گہرے اور اس کی تاثیر کتنی تیز ہو گئی ہے۔

ایک مشہور کہاوت ہے:

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے

اس کہاوت کے معنی یہ ہیں کہ جب آپس میں پھوٹ پڑ جائے تو یہ چیز طرح طرح کی خرابیاں پیدا کرتی ہے۔ خاص کر دشمن کو اس سے بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ یا دوسرے معنی یہ ہے کہ جو آدمی ہمارے بھید سے واقف ہو، اس کی دشمنی ہمارے لیے بڑے نقصان کا سبب بنتی ہے۔ اس کہاوت کے معنی تم بھی جانتے ہو اور کوئی کچھ تم میں سے بہت سے اسے بے تکلفی سے عبارت میں استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن شاید یہ سب کو نہ معلوم ہو کہ اس کہاوت کے پیچھے تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ چھپا ہوا ہے۔

قصہ یوں ہے کہ اب سے کئی ہزار برس پہلے شری رام چندر جی ہندوؤں کے ایک بڑے راجا تھے، انھوں نے اپنی ایک رانی کے کہنے سے اپنے رام چندر جی کو چودہ برس کے لیے بن میں بھیج دیا، جب رام چندر جی بن کو جانے لگے تو ان کے بھائی لچھمن اور ان کی بیوی بھی ان کے ساتھ ہی گئے۔

یہ لوگ جنگل میں رہتے تھے ایک دن رام چندر جی شکار کو گئے ہوئے تھے۔ اُن کی بیوی سیتا جی اپنی جھونپڑی میں اکیلی تھیں کہ ایک فقیر بھیک مانگنے آیا۔ سیتا جی اسے بھیک دینے کے لیے جھونپڑی سے باہر نکلیں تو وہ فقیر اُنھیں زبردستی اُٹھا کر لے گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ یہ آدمی فقیر نہیں تھا، بلکہ وہ لنکا کا راجہ راون تھا۔

راون سیتا کو لے گیا۔

رام چندر جب شکار سے واپس لوٹے اور انہیں اس بات کا پتہ چلا تو انھوں نے راون سے لڑائی کرنے کی ٹھانی۔ وہ کئی برس تک راون سے لڑائیاں لڑتے رہے۔ لیکن چوں کہ راون بڑا راجہ تھا اور اس کی طاقت ہر حوالے سے چندر جی سے زیادہ تھی اس لیے رام چندر کو لڑائی میں ہر بار شکست ہو جاتی تھیں۔

بالآخر یہ ہوا کہ راون کا بھائی بھبھیکن رام چندر جی سے مل گیا۔ اور اس کی مدد سے رام چندر جی کو بہت سے ایسے بھید معلوم ہو گئے، جن کی مدد سے انھوں نے لنکا کی لڑائی جیت لی۔

یہ لڑائی چوں کہ راون اپنے بھائی کی وجہ سے ہارا جو اس کے سارے بھیدوں سے واقف تھا۔ اس لیے یہ کہاوت اب اس موقع پر استعمال ہونے لگی ہے جواب تمھیں بھی معلوم ہے۔ اس کہاوت کا علم کہانی میں کتنی جان دال دیتا ہے۔

لو، دو کہاوتوں کی کہانیاں اور پڑھ لو۔

ایک سیدھی سادی سی کہاوت ہے:

لینا ایک نہ دینے دو۔

یہ کہاوت ایسے موقعوں پر استعمال کرتے ہیں جب یہ کہنا ہو کہ ہمیں اس جھگڑے سے کوئی واسطہ نہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ آدمی کا نہ کسی چیز سے کوئی تعلق ہو نہ واسطہ وہ مفت میں کسی جھگڑے میں پھنس جائے:

کہتے ہیں کسی امیر آدمی کے بچوں کو کچھوے بہت پسند تھے۔ وہ بچے کچھوؤں سے کھیلا کرتے تھے۔

ایک دن بچوں نے کھیلتے ہوئے شرارت ہی میں بے زبان کچھوے کو اُٹھا کر گلی میں پھینک دیا۔ امیر کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے نوکر سے کہا:

جاؤ کچھوے کو لے جا کر دریا میں ڈال آؤ

نوکر نے کچھوے کو اُٹھا کر دریا میں ڈال دیا۔

امیر آدمی نے کچھوے پر جو یہ احسان کیا تو اُس نے سوچا:

اس احسان کا بدلہ کسی طرح چکاؤں۔ آخر دریا سے ایک نہایت قیمتی موتی نکالا۔ اس نے وہ موتی اپنے منہ میں رکھا اور رینگتا ہوا امیر آدمی کے گھر میں پہنچا۔ امیر آدمی نے جو دیکھا کہ کچھوے صاحب پھر رینگتے چلے آ رہے ہیں تو اسے بڑا تعجب ہوا۔ وہ کچھوے کی طرف بڑھا۔ اتنے میں کچھوا بھی پاس آ پہنچا۔

کچھوا، امیر آدمی کے قدموں پر سر رکھ کر لوٹنے لگا، تو منہ سے وہ قیمتی موتی اُگل دیا۔

امیر آدمی نے جب وہ موتی دیکھا تو اس کی آب و تاب دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔

امیر آدمی نے کچھوے کو پکڑا کر کہا:

کچھوے میاں! اِس موتی کا بہت بہت شکریہ! مگر مزا تو جب ہے کہ اس کی جوڑی بھی ہو۔ اس لیے اگر رہائی چاہتے ہو تو اس کے ساتھ کا دوسرا موتی بھی لاؤ۔

کچھوا، امیر آدمی کی یہ بات سُن کر بہت گھبرایا، لیکن فوراً ہی اسے ایک ترکیب سوجھی۔

کچھوا، امیر آدمی سے کہنے لگا:

آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے:

میں اُسے زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اس کا بدلہ چکانے کے لیے دو موتی تو کیا، ایسے سینکڑوں موتی آپ کے قدموں پر نثار ہیں، لیکن مجھے دریا تک جانے کی اجازت دیجیے۔ یہ موتی میں اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں، اس کے ساتھ کا دوسرا موتی بھی لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔

امیر صاحب کچھوے کی باتوں میں آ گئے اور کچھوے کو موتی دے کر جانے کی اجازت دے دی۔

کچھوے صاحب نے موتی منہ میں دبایا اور دریا کی طرف چل دیے۔

امیر آدمی نے اپنے ایک نوکر کو بھی ساتھ کر دیا۔ نوکر کچھوے کے ساتھ ساتھ دریا تک گیا۔ کچھوا دریا میں کود پڑا۔ اور نوکر باہر کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد کچھوے نے پانی میں سے سر باہر نکالا اور امیر آدمی کے نوکر سے کہا:

میاں جاؤ! یہاں کھڑے کھڑے اکڑ جاؤ گے۔ اپنے آقا سے میرا سلام کہنا اور ان کی مہربانی کا شکریہ ادا کرنا، انھیں لینا ایک نہیں، مجھے دینے دو نہیں! کچھوے نے یہ کہا اور پانی میں ڈبکی لگا گیا۔ نوکر اپنا سا منہ لے کر رخصت ہوا۔

اس کہانی کی بدولت ایک مزے دار اور دلچسپ کہاوت ہماری زبان کے ہاتھ آئی۔ اب ہم اور تم اسے بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ جس نے ہمیں یہ کہاوت دی۔

اس سلسلے کی ایک کہانی اور، اور پھر بس!

کہاوت ہے:

''تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو!''

یہ کہاوت ایسے موقعوں پر استعمال ہوتی ہے جب ہم کسی سے یہ کہنا چاہیں کہ ابھی جلدی مت کرو۔ پورا نتیجہ یا انجام دیکھ لو۔

لیکن اس کہاوت کے یہ معنی کیسے ہوئے۔ اس کہاوت کی کہانی ان دو کہانیوں سے زیادہ مزے دار اور دلچسپ ہے جو پہلے بیان کی گئی ہیں۔

کہانی یہ ہے:

ایک تھا شہزادہ اس کے چار دوست تھے۔ ان سب کا ہر وقت ایک ساتھ اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ کسی وقت ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے، کھانے پینے، سونے جاگنے میں سب ایک دوسرے کے شریک تھے، ان دوستوں میں ایک تو سپاہی تھا، ایک مولوی صاحب تھے، ایک اُونٹ والا تھا، اور ایک تیلی تھا۔

ایک دن اچانک شہزادے کے والد کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ شہزادہ بادشاہ ہوا۔

شہزادے نے اپنی دوستی کا حق اس طرح ادا کیا کہ بادشاہ بنتے ہی اس نے اپنے چاروں دوستوں کو اپنا وزیر بنا لیا، اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

لیکن قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ آس پاس کے کئی بادشاہوں نے مل کر اس ملک پر حملہ کر دیا۔ اب تو بادشاہ سلامت گھبرائے اور اپنے چاروں وزیروں سے صلاح مشورہ کرنے بیٹھے۔

سپاہی نے کہا:

سرکار! اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ بس ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کیجیے۔

فتح انشا ءاللہ ہماری ہوگی۔

مولوی صاحب بولے:

صاحب مجھے تو اس رائے سے اتفاق نہیں۔ جنگ ہوئی تو ہزاروں بندگانِ خدا کا خون ہوگا اور ان سب کا عذاب آپ کی گردن پر ہوگا۔ اس لیے آپ اس ناحق جھگڑے میں نہ پڑیے۔ زیادہ یہی تو ہوگا نا کہ ملک چھن جائے گا۔ چھن جانے دیجیے، اللہ کسی اور طرح رزق دے گا، اونٹ والے نے ان دونوں کی باتیں سُنیں تو کہنے لگا:

حضور؟ آپ گھبراتے کیوں ہیں؟ ہر بات کی مہار اللہ میاں کے ہاتھ میں ہے۔ آپ تو یہ دیکھیے اونٹ کس کل بیٹھتا ہے۔

اب تیلی کی باری آئی ۔ اُونٹ والے دوست کی بات سُن کر وہ اُچھل پڑا ۔

کہنے لگا:

جہاں پناہ: میاں ساربان کی بات لاکھ روپے کی ہے ۔ کسی کام میں جلدی نہیں کرنی چاہیے: ابھی تیل دیکھیے تیل کی دھار دیکھیے!

معلوم نہیں بادشاہ نے کس کی بات مانی، کس کی نہ مانی، اور تمھیں اس سے غرض بھی نہیں ۔

بچو! ہمیں تو بس یہ یاد رکھنا ہے کہ ساربان اور تیلی نے ہمارے کہاوتوں والے قیمتی اور بیش بہا خزانے میں دو قیمتی کہاوتیں اور بڑھائیں ۔

ایسی ایسی سینکڑوں کہاوتیں ہماری زبان میں ہیں، اور ہر کہاوت کا رشتہ ایک دل چسپ کہانی سے جڑتا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کہانی تاریخ کا کوئی واقعہ ہو یا گزرے ہوئے زمانے کی داستان یا محض خیالی افسانہ! اس لیے کہ کبھی کبھی کہاوتیں اس طرح مٹتی ہیں، کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی اور لاکھ کھوج لگانے پر بھی آدمی کو اس کہاوت کی اصل نسل کا پتہ نہیں چلتا ۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر توصیف تبسم

ایک اکیلا، دو گیارہ

کہتے ہیں کہ کسی پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ بچے، بوڑھے، عورت، مرد ملا کر بھی آبادی دو اڑھائی ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ زیادہ تر لوگ کھیتی باڑی کرتے۔ نہر کا پانی جو بڑے دریا سے کاٹ کر نکالی گئی تھی، ان کے کھیتوں کے سیراب کرتا۔ محنتی لوگ تھے اور زمین زرخیز، تھوڑی سی محنت سے فصلیں اچھی ہو جاتی تھیں، گاؤں کا اپنا ایک چھوٹا سا بازار تھا جہاں روزانہ ضرورت کی ہر چیز کم و بیش مل جاتی تھی۔ بڑا شہر، سڑک کے راستے کوئی پانچ گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ وہ لوگ جو شہروں میں ملازمت کرتے عید، بقر عید چھٹی لے کر اپنے گھر آتے اور اپنے عزیزوں سے مل ملا کر، پھر اپنی نوکریوں پر واپس چلے جاتے۔ شہر کی بھاگ دوڑ کی زندگی سے یہاں آنے والے اپنی پریشانیوں کو چند روز کے لیے بھول جاتے۔ غرض یہاں ہر طرف امن چین اور سکون کا دور دورہ تھا۔

پھر اچانک کیا ہوا، جیسے گاؤں میں زلزلہ آ گیا ہو یا جیسے کسی نے جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینک دیا ہو۔ ابھی بچے سکول سے واپس نہیں آئے تھے کہ کچھ لوگ سرکاری جیپ پر آئے، ان کے پاس لاؤڈ اسپیکر تھے، انھوں نے بازار کے چوک میں اعلان کیا کہ دریا کا بند ٹوٹ گیا ہے۔ پانی کا ریلا تیزی سے اس طرف آ رہا ہے۔ اتنا پانی ہے کہ گھر، دکانیں، راستے، یہاں تک کہ وہ درخت جو زیادہ اونچے نہیں ہیں، سب کے سب پانی میں ڈوب جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ ہے۔ اپنا قیمتی اور ضروری سامان جو ساتھ لے جا سکو، لے کر پہاڑی پر چڑھ جاؤ، ورنہ سمجھو کہ جان گئی۔ جان کس کو پیاری نہیں ہوتی۔ جس نے سنا اور جو بھی اس کے ہاتھ لگا، جان بچانے کے لیے پہاڑی کی طرف بھاگ پڑا۔ گاؤں کی وہ زندگی جو ذرا دیر پہلے سکون ہی سکون تھی، دیکھتے دیکھتے قیامت کا نمونہ بن گئی۔ جسے دیکھو، بے تحاشا بھاگا چلا جا رہا ہے۔ ہر شخص کو بس اپنی ہی فکر تھی۔ ایک افراتفری کا عالم تھا، کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔

اسی گاؤں میں دو فقیر بھی تھے۔ ایک بیچارا اندھا تھا اور دوسرا اپاہج، چلنے پھرنے سے بالکل معذور۔ یہ دونوں بازار جانے والے راستے پر، جہاں دن بھر لوگ آتے جاتے رہتے تھے، بیٹھے رہتے اور ہر آنے جانے

والے سے بھیک مانگتے۔ عورتیں جو دوپہر کو کھیتوں پر کھانا لے کر جاتیں، وہ ایک آدھ روٹی، ان فقیروں کو بھی دے دیتیں۔ کچھ پیسے مل جاتے اور کچھ کھانے کو۔ غرض اس طرح ان کی زندگی بھی گذر رہی تھی۔ اب جو گاؤں میں یہ ہنگامہ اور شور وغل ہوا، پہلے پہل تو ان کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ ماجرہ کیا ہے، اندھے فقیر نے، اپنے ساتھی فقیر سے پوچھا۔ بھیا! یہ شور کیسا ہے، اس نے جواب دیا، سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ سب لوگ گھبراہٹ کی حالت میں ایک طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ ضرور کوئی آفت آنے والی ہے۔

ایک دکان والا، جلدی جلدی کچھ سامان اکٹھا کر رہا تھا۔ اپاہج فقیر نے ہانک لگائی: میاں جی کیا بات ہے۔ یہ سب لوگ کہاں بھاگے جا رہے ہیں؟ تو دکان والے نے سب بات بتائی۔ اب تو ان بے چاروں کو بھی بڑی پریشانی ہوئی۔ جان کس کو پیاری نہیں ہوتی، مگر مصیبت یہ آ پڑی کہ ایک اندھا اور دوسرا اپاہج۔ کریں تو کیا کریں۔ کوئی شخص بیل گاڑی میں سامان اور اپنے گھر والوں کو اس میں لادے جب ادھر سے گذرا تو اپاہج فقیر نے گڑگڑا کر کہا: میاں جی! خدا تمھیں سلامت رکھے، ہمیں بھی ساتھ لے چلو۔ مگر وہ شخص بالکل نہیں ٹھہرا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ وقت گذرتا جا رہا تھا، اب کریں تو کیا کریں۔ اندھے فقیر نے اپنے ساتھی سے کہا: ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے۔ میں دیکھ نہیں سکتا اور تم چل پھر نہیں سکتے۔ ایسا کرتا ہوں کہ میں تمھیں اپنے کندھے پر اٹھا لیتا ہوں۔ جس طرف تم اشارہ کرو گے، اسی طرف تم کو لے چلوں گا۔ دونوں اس ترکیب پر خوشی سے اچھل پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد آدمیوں کے ریلے میں وہ دونوں فقیر بھی شامل تھے جو پہاڑی پر تھے، اسی لیے تو کہتے ہیں کہ ایک اکیلا، دو گیارہ۔ یعنی وہ کام جو ایک آدمی سے نہیں ہو سکتا۔ آپس میں مل کر وہ کام کیا جا سکتا ہے، گویا اتفاق میں بڑی طاقت ہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر توصیف تبسم

دودھ کا دودھ، پانی کا پانی

اس کہاوت کا مطلب ہے پورا پورا انصاف ہونا __________ نام تو اس کا کرم دین تھا مگر سب اس کو کرمو، کرمو کہہ کر پکارتے تھے، بات دراصل یہ ہے کہ بچپن ہی میں اگر کسی کا کوئی نام پڑ جائے تو پھر ذرا مشکل ہی سے بدلتا ہے۔ کرمو، بڑا محنتی شخص تھا۔ گاؤں میں اس کے باپ رحمت دین کی خاصی زمین تھی مگر اس کے مرنے کے بعد جب زمینیں، اس کے بہن بھائیوں میں تقسیم ہوئیں تو اس کے حصے میں ایک چھوٹا سا ٹکڑا آیا۔ وہ اگر اس پر کھیتی باڑی کرتا تو اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کتنے دن چلتی۔ اس نے سوچا کہ کوئی ایسا کام کیا جائے کہ آرام سے گذر بسر ہو سکے۔ چنانچہ اس نے کچھ زمین بیچ کر، ایک بھینس خریدی۔ زمین کے باقی ٹکڑے پر اس نے چری لگائی تاکہ بھینس کی خوراک کا انتظام ہو سکے۔

کرمو ہر روز صبح سویرے اٹھتا۔ بھینس کو چارہ ڈالتا، اس کا دودھ دوہتا۔ اور اس دودھ کو ایک کنستر میں بھر کر سر پر رکھ کر شہر کا رخ کرتا۔ جو وہاں سے زیادہ سے زیادہ گھنٹہ بھر کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں میں لوگوں کے پاس اپنے دودھ والے جانور، گائے، بھینس اور بکریاں تھیں، اس کا دودھ کون خریدتا، پہلے پہل تو وہ دودھ ایک حلوائی کو دے دیتا اور جو پیسے ملتے، لے کر گاؤں واپس آجاتا۔ پھر اس نے سوچا کہ جب شہر آتا ہی ہوں تو کیوں نہ گلیوں میں گھوم پھر کر خود لوگوں کے ہاتھ دودھ بیچوں تاکہ چار پیسے زیادہ ملیں۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ جو پیسے اس کو دودھ بیچ کر ملے، وہ اس کے گذارے کے لیے کافی تھے، اس لیے دودھ میں پانی ملانے کا خیال کبھی اس کے دل میں نہیں آیا۔ جن لوگوں کو خالص دودھ ملتا، وہ سب اس کی تعریف کرتے، اب دوسرے لوگ بھی کرمو سے کہتے، بھیا، ہم کو بھی دودھ دے دیا کرو۔ وہ جواب دیتا، فالتو دودھ میرے پاس ہے ہی نہیں، دوں تو کہاں سے دوں۔ بار بار تقاضے سے اس کو خیال آیا کہ اگر ایک بھینس اور ہوتی تو ان لوگوں کی ضرورت بھی پوری ہو سکتی تھی۔ مگر اتنے ڈھیر سارے روپے کہاں سے آتے۔ دودھ سے حاصل ہونے والی آمدنی تو بس اس کے لیے ہی کافی تھی۔ پھر اس نے سوچا کہ کیوں نہ دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا دیا کروں۔ کسی کو کیا پتا چلے گا، آخر اور لوگ بھی تو یہی کرتے ہیں، زیادہ روپے ملیں گے تو ان کو جمع کر کے نئی بھینس خریدی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے پہلے پہل تھوڑا سا پانی ملایا۔ پھر رفتہ رفتہ پانی کی مقدار بڑھتی گئی اور ادھر اس کے پاس پیسے جمع ہوتے

گئے۔ پرانے زمانے میں نوٹ تو چلتے نہیں تھے۔ چاندی کے روپے ہوا کرتے تھے۔ کھن کھن کرتے چاندی کے سکے۔ ایک دن جب اس نے اپنی پونجی کو گنا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی، وہ پورے پندرہ سو روپے تھے، اتنے روپوں میں ایک کیا دو بھینسیں خریدی جا سکتی ہیں۔ یہ سوچ کر اس نے وہ سارے روپے ایک پوٹلی میں باندھ لیے اور گاؤں سے شہر کی راہ لی، جہاں جانوروں کا بازار لگتا تھا۔

گرمی کے دن تھے، دھوپ بھی خاصی تیز تھی۔ وہ چلتے چلتے تھک گیا۔ راستے میں ایک جھیل پڑتی تھی۔ جھیل کے کنارے اونچے اونچے سایہ دار درخت تھے۔ وہ جب وہاں سے گذرا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس کے بدن پر لگی تو مزہ آ گیا۔ درختوں پر طرح طرح کے پرندوں کے گھونسلے تھے۔ طوطے، بئے، فاختائیں، اور جنگلی کبوتر۔ بیوں کے گھونسلے جن کو گنے کے باریک ریشوں سے بنا گیا تھا، درختوں پر لٹکتے ہوئے نظر آئے تو اس کو چھوٹے سے پرندے کی ہنر مندی کا قائل ہونا پڑا۔ جھیل کے اندر بگلے، سارس اور دوسرے پانی کے پرندے تھے۔ وہ قریب سے گذرا تو وہ شور مچانے لگے۔ ان کا شور سن کر وہ بندر جو درختوں کے سایے میں زمین پر سے کچھ اٹھا اٹھا کر کھا رہے تھے، اچھل اچھل کر درختوں پر چڑھ گئے اور لگے شور کرنے۔ اس نے سوچا کہ ابھی کافی دور جانا ہے، موسم بھی گرم ہے، کیوں نہ کچھ دیر ان درختوں کی چھاؤں میں آرام کر لیا جائے۔ تازہ دم ہو کر دوبارہ سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنی موٹی چادر درخت کے نیچے بچھائی اور روپوں کی پوٹلی کو حفاظت کے خیال سے سر کے نیچے رکھا اور لیٹ گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگی تو نیند آ گئی۔ معلوم نہیں کتنی دیر سوتا رہا۔ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی، کسی نے روپوں کی پوٹلی اس کے سر کے نیچے سے کھینچ لی تھی۔ وہ سمجھا کوئی چور ہے مگر وہ تو بندر تھا جس نے پوٹلی دیکھی تو یہی سمجھا کہ شاید اس پوٹلی میں کھانے پینے کی کوئی مزیدار چیز بندھی ہوئی ہے۔ وہ بندر کے پیچھے بھاگا مگر وہ کہاں ہاتھ آتا، یہ جا، وہ جا۔ بندر ایک درخت پر جا بیٹھا، اور لگا پوٹلی کو کریدنے۔ کرمو نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح وہ روپوں کی پوٹلی واپس مل جائے مگر بندر تو آخر بندر ہوتا ہے، جب تک دیکھ نہ لے کہ اس میں کیا کچھ بندھا ہوا ہے، اس کو چین کہاں۔ دانتوں کی مدد سے اس نے جلد ہی پوٹلی کو پھاڑ ڈالا۔ اب وہ ایک روپیہ نکالتا۔ آنکھوں کے قریب لے جا کر غور سے اسے دیکھتا، چبانے کی کوشش کرتا اور نیچے پھینک دیتا۔ زمین پر تو نہیں گر رہے تھے۔ کچھ روپے جھیل کے پانی میں گرتے یا لڑھکتے ہوئے پانی میں چلے جاتے۔ جب روپے ختم ہو گئے تو کرمو زور زور سے قہقہے لگانے لگا ہنسا اور ہنستا چلا گیا۔ کسی راہ گیر نے پوچھا۔ بھیا! کیوں ہنس رہے ہو، آخر بات کیا ہے تو کہنے لگا۔ دیکھتے نہیں دودھ کے روپے زمین پر گرے اور پانی کے روپے پانی میں چلے گئے۔ قدرت کا انصاف بھی عجیب ہے۔

زاہد حسن

جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے

کسی گاؤں میں ایک کسان اپنی بیٹی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ لوگوں کے کہنے پر اس نے ایک ایسی بیوہ عورت سے شادی کر لی جس کی اپنی بھی ایک بیٹی تھی۔ شادی کو ابھی کچھ عرصہ ہی گزرا ہو گا کہ اس نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ اپنی بیٹی کو تو وہ اچھا کھلاتی، پلاتی، مگر کسان کی بیٹی کو بس سوکھی روٹی پر ہی گزارا کرنا پڑتا۔

ایک دن وہ کسان کی بیٹی سے کہنے لگی:

سامنے وہ جو پہاڑ ہے اس پر بہت میٹھے انگوروں کی بیلیں ہیں، جاؤ وہاں سے انگور توڑ لاؤ۔

پہاڑوں پر برف جمی ہوئی تھی اور سوتیلی ماں اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر لڑکی پہاڑوں تک پہنچ بھی گئی تو زندہ واپس نہ آئے گی۔ اس نے کاغذ کا لباس پہلے سے ہی تیار کر رکھا تھا وہ لڑکی کو پہنایا اور سوکھی روٹی کے چند ٹکڑے دے کر اسے گھر سے رخصت کر دیا۔

لڑکی گرتی پڑتی اور سردی سے کانپتی ہوئی اس پہاڑ کی چوٹی کے پار پہنچ گئی جس کا پتہ سوتیلی ماں نے بتایا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر اس نے انگوروں کی بیلوں کو بہت تلاش کیا مگر وہاں نہ تو انگوروں کی بیلیں تھیں اور نہ ہی کوئی اور دوسرا درخت۔ سردی کی شدت سے اس کے دانت بج رہے تھے اور بدن پر کپکپی طاری تھی۔ اچانک اس کی نظر دور بیٹھے چار سایوں پر پڑی۔ جب وہ ان کے قریب پہنچی تو اس نے دیکھا چار بونے ایک الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس نے انھیں سلام کیا اور خود بھی الاؤ کے قریب جا بیٹھی۔ جب اس کے بدن کو کچھ حرارت پہنچی تو اس کی بھوک بھی چمک اٹھی۔ اس نے اپنے تھیلے سے سوکھی روٹی کے ٹکڑے نکالے اور انھیں چبانے لگی۔

اسے روٹی کھاتے ہوئے دیکھ کر ایک بونا بولا:

بیٹی مجھے بھی تھوڑی سی روٹی دو۔ اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا بونے کو پکڑا دیا۔ یہ دیکھ کر دوسرا بونا بھی بولا:

مجھے بھی روٹی دو۔ لڑکی نے ایک ٹکڑا اسے بھی دے دیا۔

اب تیسرا کہنے لگا:

مجھے بھی بھوک لگی ہے۔

لڑکی نے روٹی کا ایک ٹکڑا اسے بھی دے دیا۔ یہ دیکھ اب چوتھا بھی بول اٹھا:

مجھے بھی بھوک لگی ہے۔ لڑکی نے روٹی کا ایک ٹکڑا اسے بھی دے دیا اور اس کے بعد جو تھوڑی سی بچ رہی وہ اس نے خود کھالی۔ پھر کچھ دیر آگ سینکنے کے بعد جب وہ اٹھنے لگی تو ان میں سے ایک بونا بولا:

بیٹی تو نے ہمیں روٹی کھلائی ہے یہ تیرا ہم پر احسان ہے۔ اب ہم پر ایک نیکی اور کرتی جا۔

لڑکی نے کہا:

آپ حکم دیں، میں آپ کی ہر قسم کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔

بونا بولا:

ہمارے گھر کے سامنے بہت برف جمی ہوئی ہے، اسے ذرا وہاں سے ہٹا تو دو۔

لڑکی نے پاس ہی رکھا ہوا بیلچہ اٹھا لیا اور برف ہٹانا شروع کر دی۔ جب وہ ساری برف ہٹا چکی تو اسے برف کے نیچے دبی ہوئی انگوروں کی ایک ٹوکری ملی۔

بونے اس سے کہنے لگے:

یہ ٹوکری تمھارے لیے ہے۔ یہ سن کر لڑکی بہت خوش ہوئی اور جب وہ ٹوکری اٹھا کر وہاں سے چلنے لگی تو ایک بونا بولا:

بیٹی میری یہ دعا ہے کہ تو حسین سے حسین تر ہوتی جائے۔

دوسرا بونا بولا:

خدا ہمیشہ تجھے خوش رکھے۔

تیسرے نے کہا:

خدا تجھے بادشاہ کی ملکہ بنائے۔

چوتھا بولا:

خدا کرے جب تو بات کرے تو تیرے منہ سے لعل و جواہر گریں۔

لڑکی ان بونوں کی دعائیں لے کر وہاں سے رخصت ہوگئی۔ رات گئے جب وہ گھر پہنچی تو اسے دیکھ کر

سوتیلی ماں آگ بگولہ ہو گئی۔

کہاں لگا دی تم نے اتنی دیر، تجھے موت کیوں نہ آ گئی، سوتیلی ماں نے اس کے بال کھینچتے ہوئے کہا۔ لڑکی جب اپنے سفر کا حال سنانے لگی تو اس کے منہ سے لعل و جواہر گرنے شروع ہو گئے۔ یہ دیکھ کر سوتیلی ماں کے اندر رشک کی آگ مزید بھڑک اٹھی اور اس نے لڑکی کی اچھی خاصی پٹائی کر دی۔

دوسرے روز اس نے اپنی بیٹی کو میٹھے پراٹھے بنا کر دیے، اسے گرم کپڑے پہنائے اور کہا:

بیٹی اب تو بھی اس پہاڑ پر جا۔

اس کی لڑکی بھی اب وہاں جا پہنچی۔ اس نے نہ تو بونوں کو سلام کیا نہ دعا اور جا کر الاؤ کے قریب بیٹھ گئی۔ جب اس کے بدن کو کچھ حرارت پہنچی تو اس نے میٹھے پراٹھے نکالے اور انھیں مزے سے کھانے لگی۔ اسے پراٹھے کھاتے ہوئے دیکھ کر ایک بونا بولا:

بیٹی مجھے بھی دے۔

چل، دور، میں کوئی یہ پراٹھے تمھارے لیے لائی ہوں لڑکی نے اسے دھتکار دیا۔

اب دوسرا بونا کہنے لگا:

چل بیٹی مجھے ہی دے دو۔

’’میں کوئی آپ کی نوکر ہوں، کہ آپ کو پراٹھے لا کر کھلاؤں، لڑکی نے جواب دیا۔

تیسرے نے بھی کہا:

اچھا تو پھر مجھے ہی دے دو۔ چوتھا بھی بول اٹھا:

میں نے بھی کھانے ہیں۔

میں آپ سے پہلے بھی یہ بات کہہ چکی ہوں کہ یہ پراٹھے میں اپنے لیے لائی ہوں، آپ کے لیے نہیں، لڑکی نے غصے سے کہا۔ اس کی بات سن کر بونے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

اپنے سارے پراٹھے کھانے کے بعد جب لڑکی اٹھنے لگی تو بونے بولے:

بیٹی ہمارے گھر کے سامنے بہت برف جمی ہوئی ہے برائے مہربانی اسے ہٹاتی جا۔

میں کوئی آپ کے باپ کی نوکر ہوں جو آپ کی برف ہٹاؤں لڑکی نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

اچھا تو یہ بات ہے، ایک بونا بولا:

میری دعا ہے کہ تیرے منہ پر لعنت پڑے اور تو دنیا کی بدصورت ترین لڑکی بن جائے۔

خدا کرے تو کنواری ہی مرے، دوسرے نے کہا۔

تیسرا بولا:

خدا کرے جب تو بولے تو تیرے منہ سے مینڈک گریں۔

خدا کرے تو دنیا سے ایسے ہی جائے جیسا انھوں نے کہا ہے، چوتھے نے بھی اسے بد دعا دی۔

رات گئے جو لڑکی خالی ہاتھ گھر لوٹی تو ماں کے پوچھنے پر وہ اپنے سفر کا حال سنانے لگی تو اس کے منہ سے چھوٹے چھوٹے مینڈک گرنے شروع ہو گئے۔ یہ دیکھ کر اس کی ماں نے اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا۔

دوسرے دن وہ سوتیلی بیٹی سے پھر کہنے لگی:

وہ سامنے جو دور پہاڑ نظر آ رہا ہے اب تم وہاں جاؤ، سنا ہے وہاں کے انگور بہت میٹھے ہوتے ہیں۔

لڑکی بے چاری بغیر احتجاج کیے گھر سے چل پڑی۔ ابھی وہ کچھ ہی دور گئی ہو گی کہ راستے میں اسے بادشاہ کی سواری جاتی ہوئی نظر آئی۔ بادشاہ کی نظر جب اس لڑکی پر پڑی تو وہ اس کا عاشق ہو گیا۔ اس نے اپنے دل کا حال وزیر کو بھی بتا دیا اور اسے کہا کہ وہ لڑکی کے پاس جائے اور اس سے پوچھ کر آئے کہ وہ کون ہے۔ جب وزیر نے لڑکی سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنی سوتیلی ماں کے ظلم کی ساری داستان وزیر کو سنا دی۔ جب وہ بول رہی تھی تو اس کے منہ سے لعل و جواہر گرنے شروع ہو گئے۔ وزیر نے وہ سبھی لعل و جواہر اٹھا کر اپنے رومال میں باندھ لیے اور لڑکی سے پوچھا کہ وہ بادشاہ کی ملکہ بننا پسند کرے گی۔ لڑکی نے جب اثبات میں سر ہلایا تو بادشاہ بہت خوش ہوا اور اسے اپنے ساتھ محل میں لے آیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد اس کی شادی بڑے دھوم دھام سے بادشاہ کے ساتھ ہو گئی۔

کئی دن گزر جانے کے بعد بھی جب وہ لڑکی گھر نہ پہنچی تو اس کی سوتیلی ماں یہی سمجھی کہ راستے میں کہیں مر گئی ہو گی۔ مگر یہ بات تو وہ جانتی ہی نہ تھی کہ اب اس کی سوتیلی بیٹی بادشاہ کے محل کی رانی بن چکی ہے۔

(پنجابی لوک کہانی)

☆☆☆☆

مجتبیٰ حسین

پہاڑ اور بچہ

راوی: میرے بچو! --- زمین کی سدا لہلہاتی ہوئی کھیتو! زم و معصوم کلیوں کی کھلتی ہوئی بستیو ---
زندگانی کی راتوں میں اڑتے ہوئے جگنوؤں
میرے خوابوں کی تعبیر دیتے ہوئے سورجوں
آنکنوں میں اترتی ہوئی چاندنی
مانگتی ہے تمہارے ہی چہروں سے نور
شہر کی رونقوں
جگمگاتا ہے تم سے ہر اک بام و در
گاؤں کے بادلوں
تم سے موتی برستے ہیں ہر باغ پر
میرے بچو --- تمہیں اک کہانی سناتی ہوں
آؤ سنو
(بانسری پر نغمہ جو پس منظر میں جاری رہتا ہے)
ایک تھا گاؤں جس میں رہتے تھے لوگ --- بہت سیدھے سادے اور اسی گاؤں میں
اک ذرا فاصلے پر پہاڑی کے دامن میں --- اک مدرسہ --- چھوٹے بچوں کو تعلیم
دینے کی خاطر بڑے پیار سے --- اپنی آغوش کھولے ہوئے۔
پیارے بچو سے کہتا تھا آؤ یہاں
یہاں دولتِ علم پاؤ گے بچو
یہاں صدق کے گیت گاؤ گے بچو
یہیں روشنی ہے
یہیں راستی ہے

یہیں چاند سورج کی ہے انجمن
اسی در سے پاتا ہے قوت وطن
یہاں بچے تعلیم پاتے تھے سب
(بچوں کا شور وغل ۔۔۔۔اسکول کا تاثر ۔۔۔گھنٹی کی آواز)
کھیلتے کودتے اور گاتے تھے سب
(بچوں کا شور وغل up ہوتا ہے اور اس میں بچوں کا نغمہ شامل ہو جاتا ہے)
علامہ اقبال کی مشہور نظم "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" جس کے ختم ہونے پر رباب ۔
سب تو پڑھتے تھے دل لگا کے مگر
ایک لڑکا بہت ہی نٹ کھٹ تھا
پڑھنے لکھنے سے بھاگتا تھا وہ
جنگلوں وادیوں میں دن دن بھر
وقت اپنا گذارتا تھا وہ
ایک دن شام کے ہنگام
حسب دستور اس پہاڑی پر
جا کے بیٹھا تھا
اور نغمہ کوئی اس کے ہونٹوں سے موج بن بن کر
پتھروں پہ پھسلتا جاتا تھا ۔۔۔۔
(بچے کی آواز میں نغمہ)

ترجمہ: دیکھو میں کبوتر ہوں اور فضاؤں میں قلابازیاں کھا رہا ہوں ۔ میرے پر پریوں کی طرح
حسین ہیں اور میں آسمان سے گری ہوئی بجلی ہوں ۔ مجھے تم کیوں غصے میں گھور رہے ہو اور
میری آنکھوں میں کیا تلاش کر رہے ہو میں تمہارے ساتھ اڑنے میں پیچھے نہیں رہوں گا ۔ یہ
زمانہ فصلوں کے بیج بونے کا ہے جو مجھے بے حد پسند ہے ۔۔۔ دیکھو میں کبوتر ہوں ۔

راوی: دفعتاً وہ پہاڑی ہلنے لگی ۔
نغمہ ہونٹوں پہ اس کے ٹوٹ گیا

(پہاڑی کی گڑگڑاہٹ کی آواز)
گڑگڑاہٹ فضا میں پیدا ہوئی
خوف سے ہاتھ پاؤں کانپ اٹھے۔
اور پسینہ بدن پہ چھوٹ گیا۔
گاؤں کی سمت بھاگنے کے لیے
اٹھا گھبرا کے وہ کہ۔۔۔اک آواز
خوفناک ومہیب آنے لگی
یہ چٹانوں کی تھی صدائے مہیب
جو بہت دور اور بہت ہی قریب
گونجتی جا رہی تھی۔۔۔۔چار طرف

پہاڑ: (یہ آواز پورے غنائیے میں ECHO کے ساتھ آئے گی)
تو کہاں جا رہا ہے اے لڑکے
میں ہوں آواز اس پہاڑی کی
تو یہاں دور سے بھاگا ہوا
روز آ کر پناہ لیتا ہے
میرے سینے کا کھولتا لاوا
پھٹ پڑے گر تو بھسم ہو جائیں
تو بھی اور تیرے گاؤں والے سب
تو اگر چاہتا ہے بچ جائیں۔۔۔تو بھی اور تیرے گاؤں والے سب
میں تجھے ایک دن بتاؤں گا
لاوا پھٹنے سے ایک دن پہلے
ایک ترکیب ہے کہ بچ جائیں
بچے۔۔۔بوڑھے۔۔۔جوان سب کے سب
لیکن اک شرط ہے کہ تو ہر روز

گھر سے جائے گا مدرسے کو ضرور
دل لگا کر وہاں پڑھے گا سبق
اور پھر شام کو یہاں آ کر
گیت اپنے سنائے گا مجھ کو
میرے سینے کی آگ گیتوں سے
کچھ نہ کچھ کم تو ہو ہی جاتی ہے۔
راوی: جب پہاڑی یہ کہہ چکی سب کچھ (پس منظر میں بانسری)
خامشی چھا گئی فضاؤں میں
خوف کی لہر ہو گئی پیدا
شام کی نرم رو ہواؤں میں
لڑکا سہما ہوا اترنے لگا
پاؤں میں تھرتھری---تو چہرہ فق---ذہن بھٹکا ہوا---قدم بوجھل
جب پہاڑی سے وہ اتر آیا
پہلے چپکے سے گاؤں کی جانب
دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگا
جب ذرا دور وہ نکل آیا
پاؤں پھر تیز تیز اٹھنے لگے
اس کو محسوس یہ ہوا جیسے
کوئی پیچھے سے دے رہا ہو صدا (ایکو میں)
پہاڑ: شرط یہ ہے کہ مدرسہ ہر روز
یاد رکھنا ہماری باتوں کو (بانسری پس منظر میں)
راوی: تیرگی بڑھ رہی تھی وادی میں
گاؤں میں جھلملا رہے تھے چراغ
اپنی جانب بلا رہے تھے چراغ

مدرسے کا چراغ سب سے الگ
اک ذرا دور جگمگاتا تھا
اس اندھیرے میں رہ دکھاتا تھا
پھر یکایک ہی اس کے کانوں میں
دوڑنے کی صدائیں آنے لگیں
کون آتا ہے اس اندھیرے میں
کوئی بھی تو نہیں ہے ۔۔۔کوئی نہیں
یہ تو اس کے ہی دوڑنے کی صدا
آ رہی ہے
ڈرا رہی ہے اسے

(بانسری CHANGE OVER ہو کر فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

راوی: گھر پہنچ کر وہ ہو گیا بے ہوش
صبح اٹھا تو باپ نے اس کے
اس سے پوچھا کہ

باپ: ماجرا کیا تھا

لڑکا: کچھ نہیں

راوی: بات وہ چھپانے لگا

باپ: کچھ تو تھا۔۔۔تم تھکے ہوئے تھے بہت
آتے ہی گھر میں ہو گئے بے ہوش
بولو کیا بات تھی؟ چھپاؤ نہیں

لڑکا: بات کچھ بھی نہیں تھی ۔۔۔کہہ تو دیا
پڑھتے پڑھتے میں تھک گیا تھا بہت
مدرسے سے نکل کے میداں کو
کھیلنے کے لیے چلا جب میں

پاؤں کمزور میرے پڑنے لگے
جیسے بیمار ہوں کئی دن کا
سانس گھٹنے لگی تھی سینے میں
تھی یہی بات اور کچھ بھی نہیں
باپ: میں تو یہ جانتا تھا پہلے ہی
میں تو پہلے ہی تھا خلاف بہت
مدرسہ جب یہاں پہ کھولا گیا
لڑکے بیمار ہوتے جائیں گے
پڑھتے جائیں گے اور گھر کے لیے
سخت بے کار ہوتے جائیں گے
کام گھر کے پڑے رہیں گے سب
آج سے بند ہے پڑھائی تری
مدرسہ بزدلی سکھاتا ہے
بے ادب رات دن بناتا ہے
میں ہوں سردار گاؤں والوں کا
حکم میرا چلے گا بستی میں
یہ مکاں جس میں مدرسہ ہے ترا
میں نے ہی دے رکھا تھا اس کے لیے
گو کرایہ وصول کرتا تھا
پھر بھی دل میں یہ وسوسہ تھا مرے
سب گھروں میں تباہی آئے گی
جتنی تعلیم بڑھتی جائے گی
آج خالی کراؤں گا یہ مکاں
تو یہاں گھر میں بیٹھ ---- کر آرام

میں چلا۔۔۔گاؤں والوں سے
بات اس مسئلے پہ کرنے کو

(Change over)

(بچوں کا شور و غل۔۔۔سکول کی گھنٹی کی آواز تھوڑی دیر پس منظر میں رہ کر فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

راوی: میرے بچو! یہ ہے گاؤں کا مدرسہ
چھوٹے بچوں کی باتوں سے گونجا ہوا۔۔۔پھول کھلتے ہوئے
علم کے پھول کھلتے ہوئے
خوشبو پھیلی ہوئی۔۔۔ایسی خوشبو جو پھولوں میں ملتی نہیں
یہیں چاند سورج سناتے ہیں نغمے
یہیں آسماں بات کرتا ہے آکر
یہیں راز اپنے بتاتی ہے بوڑھی زمیں
یہیں شمعیں جلتی ہیں ایسی جو بجھتی نہیں
آؤ نغمے سنو۔۔۔زندگانی ترانے سناتی ہے۔۔۔۔

بچوں کا کورس

تعلیم بڑی چیز ہے سب جانے زمانہ
تعلیم ہے اے دوستو انمول خزانہ
صبح سویرے بستہ لیکر پڑھنے کو ہم جائیں
چھٹی ہو تو دوڑے دوڑے بھاگے گھر کو آئیں
پھر اپنی امی ابا کو اپنا سبق سنائیں
تعلیم بڑی چیز ہے سب جانے زمانہ
تعلیم ہے اے دوست انمول خزانہ

راوی: میرے بچو! فضا میں یہ نغمہ گھٹا کی طرح چھا رہا تھا۔ کہ آواز آنے لگی۔۔۔ہوش سب کے اڑانے لگی۔

(پس منظر میں موسیقی)

باپ: بند کرو یہ گانا بجانا
(رک کر کرخت آواز میں)

کیا قیامت ہے مدرسہ یہ بھی
ایک آفت ہے مدرسہ یہ بھی
آج سے بند سب پڑھائی ہے
حکم میرا ہے اس کی ہو تعمیل
یہ مکاں آج ہی کرو خالی
بلکہ اسی وقت ہی کرو خالی
اپنا سارا عذاب لے جاؤ
یہ حساب و کتاب لے جاؤ
لیکن میرا مکان خالی کرو

راوی: میرے بچو۔۔۔یہ آواز گونجی ادھر۔۔۔اور بچوں کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے
بام و در پہ خموشی سی چھانے لگی
اور جہالت لگانے لگی قہقہے (بھیانک قہقہوں کی آواز)

راوی: میرے بچو۔۔۔ادھر تو یہ محشر بپا تھا
پہاڑی کے اوپر وہ لڑکا
جا کے بیٹھا تھا افسردہ و مضمحل
سخت حیران تھا اور پریشان تھا وہ
مدرسہ اس کی آنکھوں میں پھرنے لگا
دفعتاً پھر پہاڑی سے آواز آنے لگی (ایکو میں)
تو یہاں آج آ گیا اس وقت
یہ تو آنے کا تیرے وقت نہ تھا
تجھ سے میں نے کہا تھا پڑھنے کو
چھوڑ کر مدرسہ یہاں پہنچا

پھر اسی راستے پر چلنے لگا
میں تجھے آج ہی جھلس دوں گا
(سسکیوں کی آوازیں)
خون میرا بہت ہے کھولا ہوا
اپنا لاوا یہیں اگل دوں گا (لہجہ بدل کے)
ارے تو رو رہا ہے ---- بات ہے کیا
لڑکا: میں یہاں لے کے آیا ہوں فریاد
مدرسہ ہونے والا ہے برباد
آج وہ بند ہونے والا ہے ---- میں کہاں جاؤں کس سے درد کہوں
لوگ خالی کرائیں گے وہ مکان
جس میں پڑھتے ہیں گاؤں کے بچے
مدرسہ کر رہا ہے، یہ فریاد!
کوئی کرتا نہیں میری امداد
پہاڑ: (ایکو میں)
کیا کہا بند ہونے والا ہے
مدرسہ بند ہونے والا ہے (گڑگڑاہٹ کی آواز)
اچھا اچھا سن --- میرے بچے --- مجھ سے سن --- پونچھ کے آنسوؤں کو دامن سے
اور فوراً اتر کے گاؤں کو جا
گاؤں والوں کو یہ سنا دے پیام
چند گھنٹوں میں اس پہاڑی سے
آگ برسے گی سارے میداں میں
پھٹ پڑیں گی چٹانیں اور لاوا ---- کھولتا --- گونجتا --- گونجتا ہوا
گاؤں کی سمت بہتا جائے گا ---- سب کو پھونکے گا اور جلائے گا
مدرسے میں پناہ لے گا، جو اُن سے کہنا امان پائے گا

مدرسے کے سوا کہیں بھی کوئی، پا سکے گا اماں نہ وادی میں
جا کے جلدی پیام دے دینا
جیسے ہی تو وہاں پہ پہنچے گا
ایسی آواز۔۔۔وہ دہل جائیں گے
ایسی چنگھاڑ۔۔۔فیل ڈر جائیں گے

(change over)

لڑکا: گاؤں والو سنو۔۔۔گاؤں والو۔۔۔سنو
مدرسے کو سلامت رکھو۔۔۔اس کی عزت کرو۔۔۔اس کی حرمت رکھو
ایک آفت میں پھنسنے کو ہیں سب کے سب
یہ پہاڑی جو ہے سامنے
اس سے پگھلی ہوئی آگ بہتی ہوئی۔۔۔ایک دریا کی مانند بہتی ہوئی
ہر طرف آئے گی اور پھونکے گی ہر بام و در
جل کے ہو جائیں گے راکھ یہ سارے گھر
بس وہی بچ رہیں گے۔۔۔احاطے میں جو مدرسے کے
چلے جائیں گے لینے فوراً پناہ

(پہاڑی کی گڑگڑاہٹ اور زلزلہ)

آتش فشاں پہاڑ پھٹنا چاہتا ہے اب
شعلوں کے اژدھے کی یہ پھنکار ہے غضب
یہ مدرسہ ہے جائے اماں۔۔۔آؤ اس طرف
جلدی کرو کہ آگ کی موجیں یہ صف بہ صف
بڑھتی ہی آ رہی ہیں۔۔۔فضا خشمناک ہے
کچھ دیر کی ذرا بھی تو بس قصہ پاک ہے

(لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں۔۔۔گرج پہاڑی کی، گڑگڑاہٹ دھیرے دھیرے خاموشی چھا جاتی ہے)

(پس منظر میں موسیقی جس سے خوشی کا تاثر ملتا ہے)

راوی: میرے بچو! کہانی یہ اب ختم ہے گاؤں والوں نے لی مدرسے میں پناہ
سب کی جانیں بچیں ۔۔۔۔۔سب نے اللہ کا شکر پیہم کیا

(موسیقی بلند)

(کلاس روم کا تاثر ، استاد بچوں کو پڑھا رہا ہے ۔ بچے استاد کے ساتھ ساتھ جملے دھراتے ہیں ۔

(پس منظر میں موسیقی)

استاد: اللہ ایک ہے
اللہ ایک ہے
وہ ہم سب کا خالق ہے
وہ ہم سب کا خالق ہے
ہمیں ہر وقت اس کا شکر ادا کرنا چاہیے
ہمیں ہر وقت اس کا شکر ادا کرنا چاہیے
اس نے ہمیں علم کی دولت سے نوازا
اس نے ہمیں علم کی دولت سے نوازا

(موسیقی بلند ہوتی ہے)

میرے بچو کوئی علم سے بڑھ کر ضامن نہیں
اس سے بڑھ کر کوئی اور گلشن نہیں
اس کے دامن میں ملتی ہے سب کو پناہ
اس سے بہتر کوئی اور دامن نہیں

(موسیقی بلند ہوتی ہے)

☆☆☆☆

میرزا ادیب

گمشدہ فریادی

(ایک بادشاہ فریادی کا منتظر تھا اور وزیر فریادی کی تلاش میں سرگرداں تھا۔)

شہنشاہ کا دربار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دربار میں ایک بڑی شان دار کرسی بچھی ہے، یہ شہنشاہ کے لیے ہے ۔ ۔ ۔ اسی کرسی کے اردگرد چند عام کرسیاں بھی ہیں۔

شاہی کرسی کے دائیں جانب وزیر اعظم کی کرسی ہے، وزیر اعظم اپنی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ باقی کرسیوں پر بھی درباری بیٹھے ہیں ۔ ۔ ۔ ان کرسیوں سے کچھ دور دروازہ ہے جس پر ایک ریشمی پردہ لٹکا ہوا ہے۔ دروازے کا پردہ الگ ہوتا ہے اور حاجب اندر آکر اور دروازے کے پاس ہی رُک کر بلند آواز سے کہتا ہے:

باادب، باملاحظہ ہوشیار۔

باادب، باملاحظہ ہوشیار ۔ ۔ ۔ شہنشاہ تشریف لاتے ہیں۔ وزیر اعظم اور درباری فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شہنشاہ آتے ہیں، سب کہتے ہیں شہنشاہ زندہ باد۔ شہنشاہ مسکرا کر بڑے وقار سے سر ہلاتے ہیں اور اپنی کرسی کی طرف قدم اٹھانے لگتے ہیں۔ حاجب شہنشاہ کے آگے آگے آرہا ہے ۔ ۔ ۔ کرسی کے قریب پہنچ کر وہ ادب سے سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے، شہنشاہ آکر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کے بیٹھتے ہی وزیر اعظم اور درباری بھی بیٹھ جاتے ہیں۔

شہنشاہ: وزیر اعظم!

(وزیر اعظم جھک کر مؤدبانہ کھڑا ہو جاتا ہے اس کے ساتھ ہی درباری کھڑے ہو جاتے ہیں)

وزیر اعظم: جی عالی جاہ!

شہنشاہ: ہماری طبیعت کچھ خراب ہے۔

وزیر اعظم: کیوں عالی جاہ! نصیب دشمناں طبیعت کیوں خراب ہے؟

شہنشاہ: (درباریوں کو مخاطب کر کے) اس کی وجہ تم لوگ بتاؤ۔ ہم سمجھتے ہیں ہمارے درباری بڑے عقل مند ہیں۔

ایک درباری: حضور! میں سمجھتا ہوں رات پلاؤ میں نمک ذرا زیادہ تھا۔

شہنشاہ: غلط ہے۔

دوسرا درباری: میرا خیال ہے عالی جاہ! زردے میں میٹھا کچھ کم تھا اور جب زردے میں میٹھا کم ہو تو سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔

شہنشاہ: بالکل غلط۔

تیسرا درباری: عالی جاہ! میں سمجھتا ہوں اصل وجہ کیا ہے؟

شہنشاہ: شاباش! تم بہت عقل مند ہو، بتاؤ کیا وجہ ہے؟

تیسرا درباری: عرض کرتا ہوں حضور! وہ حضور! شوربے میں بوٹیاں کچھ کچی رہ گئی تھیں۔ شوربے میں بوٹیاں کچی ہوں تو حضور۔۔۔ یعنی کہ حضور!

شہنشاہ: بکواس بند کرو! ۔۔۔ وزیر اعظم!

وزیر اعظم: جی حضور!

شہنشاہ: تم وزیر اعظم ہو تمھاری رائے کیا ہے ہماری طبیعت کیوں خراب ہے؟

وزیر اعظم: عالی جاہ! میں رات شاہی دسترخوان پر حاضر ہی نہ ہو سکا (رونے کے انداز میں) بیمار تھا حضور! بے مزا کھچڑی کھانی پڑی۔ سچ کہتا ہوں بڑی بے مزا کھچڑی تھی۔

شہنشاہ: تم سب چٹخورے ہو۔

وزیر اعظم: چٹخورے تو نہیں حضور۔۔۔ یعنی کہ ہم۔۔۔ حضور ہم چٹخورے نہیں ہیں!

شہنشاہ: کیا کہا گویا ہم غلط کہتے ہیں؟

وزیر اعظم: یہ بات نہیں حضور! میں کہنے والا تھا کہ ہم بھوکے ندیدے ہیں۔۔ سچ مچ ہم بھوکے ہیں۔۔ صرف بھوکے ہی نہیں ندیدے بھی ہیں اور بھی بہت کچھ ہیں۔

شہنشاہ: درست کہتے ہو تم! ہم اصل وجہ بتاتے ہیں۔

وزیر اعظم: جی حضور!

شہنشاہ: ہم نے محل کے دروازے پر عدل کی زنجیر لٹکا رکھی ہے۔ ہمارا فرمان ہے کہ ہر فریادی ہر وقت اس زنجیر کو کھینچ کر انصاف طلب کر سکتا ہے، مگر اب تک کسی نے اس زنجیر کو نہیں کھینچا۔ ہمارے کان گھنٹے کی آواز سننے کے لیے ترس گئے ہیں۔

وزیراعظم: حضور اس کا مطلب یہ ہے کہ پوری سلطنت میں کوئی فریادی ہی نہیں ہے۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے حضور! بڑی خوشی کی بات ہے!

پہلا درباری: حضور انصاف ہر جگہ ہو رہا ہے۔

شہنشاہ: گویا ہم نے بے کار ہی عدل کی زنجیر لٹکا رکھی ہے؟

وزیراعظم: بات یہ ہے حضور! ۔۔۔ کوئی بات ہی نہیں ہے۔

شہنشاہ: کیا کہا کوئی بات ہی نہیں ہے؟

وزیراعظم: نہیں عالی جاہ! باتیں تو بہت سی ہیں مگر اس معاملے میں کوئی بات نہیں ہے ۔۔۔ میرا مطلب ہے اس خاص معاملے میں!

☆☆☆☆

ابصار عبد العلی

دُھواں

کردار

استاد
پہلوان
اصلی پہلوان
لکڑہارا
موٹا لکڑہارا
معذور بوڑھا

بیوی
نوجوان لڑکی
بچی (چھے سال کی)
بغلول
افیمی

منظر ــــــ پہلا

(ایک پگڈنڈی جو بستی سے جنگل میں آنے اور جانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ پگڈنڈی کے کنارے ایک درخت ہے۔ پس منظر میں بھی بہت سے درخت ہیں جن کی اوٹ سے دور بستی کے چند مکان نظر آ رہے ہیں۔ استاد اور پہلوان بائیں جانب سے داخل ہوتے ہیں۔ پہلوان جو جھاڑو کے تنکے کی طرح باریک ہے، ہاتھ میں دو لاٹھیاں لیے ہوئے ہے)

استاد: پہلوان! یہ ہے وہ درخت۔ سمجھ گئے نا؟

پہلوان: ایسا ویسا۔ (یہ پہلوان کا تکیہ کلام ہے) بس اسی کے سایے میں اپنا ٹیم ٹام سجائے لیتے ہیں۔

استاد: اور یہ رہا وہ راستہ۔ اسی راستے سے لوگ جنگل میں لکڑیاں کاٹنے داخل ہوتے ہیں اور۔۔۔

پہلوان: اسی سے واپس بھی آتے ہیں۔

استاد: ہاں، اور ہمیں ان کے واپس آنے سے دلچسپی ہے۔ سمجھ گئے نا؟

پہلوان: ایسا ویسا۔ فکر ہی نہ کرو استاد۔ برسات سے پہلے سارا جنگل کاٹ ڈالیں گے اور۔۔۔

استاد: پھر جاڑے کی وجہ سے دام بھی بڑھ جائیں گے۔

(دونوں ہنستے ہیں)

پہلوان: مگر استاد ہم کلہاڑی تو لائے نہیں۔

استاد: ڈنڈے تو لائے ہیں۔

پہلوان: ایسے ویسے۔

استاد: بس انھی سے کام چلے گا۔

پہلوان: استاد! لوہے سے لوہا تو کٹ سکتا ہے مگر ڈنڈے سے لکڑی نہیں کٹ سکتی۔۔ نہ۔۔ بالکل نہیں۔

استاد: ڈنڈے سے سب کچھ ہو سکتا ہے پہلوان!

پہلوان: ہونہہ! سمجھا۔ تو مطلب یہ کہ ہم ان لوگوں کی لکڑی چھین لیں گے جو جنگل سے لکڑی کاٹ کر اس راستے سے گزریں گے۔

استاد: ٹھیک سمجھے۔

پہلوان: لیکن استاد اگر انھوں نے شور مچایا۔۔۔ ہائے میں لٹ گیا۔ مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ۔ تو ان کا منہ کیسے بند کرو گے؟

استاد: کہہ جو دیا کہ ڈنڈے سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔

پہلوان: سمجھا۔ سمجھا محنت ان کی مال ہمارا۔

استاد: ہاں! ہمارے کاروبار کا یہی سنہری اصول ہوگا، بس تیار ہو جاؤ۔ شکار آ رہا ہے۔

(دائیں جانب سے ایک بوڑھا اور اس کی بیوی داخل ہوتی ہے۔ بوڑھا ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ اور لکڑی کے سہارے چل رہا ہے۔ اس کی بغل میں تھوڑی سی لکڑیاں ہیں بیوی کے سر پر لکڑیوں کا بڑا گٹھا ہے۔)

استاد: ٹھہر جاؤ!

بوڑھا: کیا بات ہے میاں؟

استاد: یہ لکڑیاں یہاں رکھ دو۔

بیوی: مگر یہ تو ہماری ہیں۔

استاد: لیکن اب ہماری ہیں۔

پہلوان: ہاں بحقِ پہلوان ضبط۔

بوڑھا: دیکھو نا میاں! میرے بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔

پہلوان: کہہ رہے ہوں گے، ابا حلوا لاؤ۔ پراٹھے لاؤ۔

بوڑھا: وہ بچارے تو صرف نمک اور روٹی کا انتظار کرتے ہیں۔

بیوی: یہ لکڑیاں ہماری دن بھر کی محنت ہیں چند ٹکوں میں بیچ کر پیٹ کا دوزخ بھر لیں گے۔

پہلوان: یہ لکڑیاں اتنی گناہ گار نہیں کہ انھیں دوزخ میں بھیجا جائے۔ یہیں رکھ دو۔

بیوی: محنت ہماری ہے، اس لیے مال ہمارا ہے۔

استاد: (ڈنڈا دکھا کے) ڈنڈا ہمارا ہے، اس لیے مال ہمارا ہے۔

پہلوان: رکھ دے لکڑیاں

بوڑھا: نہیں۔

استاد: نہیں؟

(ڈنڈا بوڑھے کے بازو پر رسید کرتا ہے۔ بوڑھا زمین پر گرتا ہے۔ سہارے کی لکڑی اور جلانے کی لکڑیوں کا گٹھا بھی زمین پر گر جاتے ہیں)۔

بوڑھا: محنت کرنے والے کے ہاتھ نہ توڑ ظالم! دنیا کا کاروبار نہیں چل سکے گا۔

پہلوان: اچھا! تو تو چل یہاں سے دنیا کے ٹھیکے دار۔

استاد: (بیوی سے) چل تو بھی رکھ دے لکڑیاں۔

بیوی: نہیں۔

استاد: نہیں؟ (بیوی کے سر پر ڈنڈا مار کر لکڑیاں گرا دیتا ہے) اٹھاؤ، پہلوان یہ لکڑیاں بھی سمیٹو۔

پہلوان: (لکڑیاں سمیٹتے ہوئے) عرض کیا تھا، بھئی ڈنڈے کو آنکھ مت دکھا۔ نہیں مانی۔

استاد: پھر مل گیا نا مزہ؟

پہلوان: ایسا ویسا۔

بیوی: (شوہر کو سہارا دے کر اٹھاتی۔ خود اس کے اپنے ماتھے سے بھی خون بہہ رہا ہے) ظالمو! وہ لکڑی تو دے دو جس کے سہارے یہ معذور چلتا ہے۔

پہلوان: ڈنڈا البتہ مل سکتا ہے۔۔۔ دنیا تو استاد ایک اس کے سر پہ۔

بوڑھا: تمہیں اللہ سمجھے گا۔ تم نے ہم مجبوروں کی آہ لی ہے۔

پہلوان: جھوٹ نہ بول۔ ہم نے صرف لکڑیاں لی ہیں۔

استاد: اور وہ ہم واپس نہیں کریں گے۔

بیوی: میرے دل سے جو دھواں اٹھ رہا ہے! کاش!

استاد: (بات کاٹ کر) چل چل۔ دھواں اٹھ رہا ہے۔ ہمیں تو نظر نہیں آتا۔

بیوی: (رو پڑتی ہے) نظر آئے گا۔ ظالم!۔۔۔ نظر آئے گا۔

بوڑھا: اور دھویں کے بادل جب چھٹیں گے تو تجھے راکھ ملے گی۔

بیوی: (شوہر کو سہارا دے کر اٹھاتی ہے اور جانے کو مڑتی ہے) تو نے ایک غریب کے چولہے میں آگ نہ جلنے دی۔ اللہ تیرے گھر کو جلا کر راکھ کر دے گا۔

استاد: جا جا۔ راستہ لے اپنا۔

پہلوان: کیوں ہمارا وقت لیتی ہے۔ مصروف لوگ ہیں ہم۔ جا بھئی جا۔ مغز نہ چاٹ۔ جا۔

(بوڑھا اور بیوی چلے جاتے ہیں)

پہلوان: استاد! لکڑی کے دام، اس بستی میں تو اچھے ملنے سے رہے۔

استاد: اوہو! ذخیرہ ہونے دو۔ بادشاہ کے باورچی کو بلا کر کچھ دے دلا کر، کچھ کھلا پلا کر، اچھے داموں اکٹھا سودا کر لیں گے۔

پہلوان: ایسا ویسا۔

فہمی: تو پھر ٹھہر جاؤ بھئی! کیا پتا شربت پانی کو پوچھ رہے ہوں۔

استاد: لکڑیاں زمین پر رکھ دو۔

بغلول: کیوں رکھ دیں جی؟ شربت پلانا ہے تو کھڑے کھڑے پلا دو۔

فہمی: بلکہ مشک دو مشک ساتھ بھی کر دو۔

بغلول: راستے بھر نوش فرماتے چلے جائیں گے۔

استاد: اس بستی میں رہنا ہے یا نہیں؟

بغلول: جی تو نہیں لگتا۔۔۔ بس والدہ کے اصرار پر رہ رہا ہوں۔

استاد: کیا کہتی ہیں تمھاری والدہ؟

بغلول: بچوں کی والدہ سرکار! ان کی بڑی عزت کرتا ہوں حضور!

استاد: بیوی سے ڈرتے ہو؟

بغلول: (ڈنڈے کی طرف اشارہ کر کے) سرکار ان کے ہاتھ میں بھی یہی رہتا ہے جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔

استاد: اچھا! چلو، رکھو لکڑیاں زمین پر۔

افیمی: حضور بڑی مشکل سے لادی تھیں۔

پہلوان: بس اب نہیں لادنی پڑیں گی، رکھو جلدی۔

(دونوں لکڑیاں زمین پر رکھ دیتے ہیں خوف سے کپکپارہے ہیں)

پہلوان: مرغا بن جاؤ دونوں۔

افیمی: پھر آپ فرمائیں گے اذان بھی دو۔

پہلوان: نہیں فرمائیں گے۔

بغلول: نہیں۔ کیا پتا فرما ہی دیں۔

استاد: بکواس بند کر دو۔۔۔ دفان ہو جاؤ۔

افیمی: اے حضور! سر سے بوجھ اترا تو نیند آنے لگی تھی۔۔۔ خیال تھا ذرا قیلولہ کر لیں گے۔

استاد: قیلولے کے بچے! جاؤ، چلو یہاں سے۔۔۔ جاؤ۔

بغلول: اور حضور لکڑیاں؟

پہلوان: بحقِ استاد ضبط۔

بغلول: اچھی ہے نا؟

پہلوان: ایسی ویسی۔

بغلول: بتاؤ۔ بتاؤ۔

پہلوان: گندھا ہوا آٹا کووں کو کھلا دو۔ نہ آٹا ہوگا نہ لکڑی کی ضرورت پڑے گی۔

بغلول: ترکیب تو ٹھیک ہے (جانے کو مڑتا ہے) مگر حضور ایک لکڑی تو دے ہی دیں۔

استاد: کیا کرو گے؟

بغلول: کتے بہت ہیں راستے میں۔

افیمی: ہاں سرکار! یہ تو بھاگ بھی لیتا ہے، لیکن میں حضور! بس کیا عرض کروں۔۔

پہلوان: عرض ورض مت کرو۔ خدمت کرو استاد کی۔۔۔چلو۔۔شاباش۔

استاد: مل جائے گی ایک ایک لکڑی۔۔ ٹانگیں دباؤ ہماری۔

(بغلول اور افیمی بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

استاد: (کڑک کر) چلو۔۔۔جلدی کرو۔۔

(بغلول سہم کر استاد کی ٹانگ دبانے لگتا ہے۔ مگر افیمی اپنی جگہ سے نہیں ہلتا)

استاد: تم بھی چلو۔۔۔جلدی کرو۔

افیمی: سرکار! والد صاحب مالشیے ضرور تھے۔ لیکن صرف سر دبایا کرتے تھے۔ ٹانگیں دبانا ان کی اور میری دونوں کی توہین ہے حضور!

استاد: ابے گڑ کھائے اور گلگلوں سے پرہیز؟

پہلوان: (ڈنڈا دکھا کر) کیا بکتا ہے!

افیمی: (جلدی سے استاد کی دوسری ٹانگ دبانے لگتا ہے) کچھ نہیں حضور! کچھ نہیں۔۔۔

استاد: کہہ جو دیا کہ ایک ایک لکڑی مل جائے گی۔۔۔پھر بھی نخرے، (چپت لگاتا ہے)

بغلول: حضور ایک ایک لکڑی عنایت کریں گے نا؟

استاد: ہاں۔ کہہ تو دیا۔

بغلول: تو حضور کیا مضائقہ کہ مجھے دو عنایت کر دیں۔

استاد: کیوں؟

بغلول: حضور کیا پتا کتے دو طرف سے حملہ کر دیں۔

استاد: اچھا لے لینا بابا!۔۔۔دو ہی لے لینا۔۔۔یہ ٹانگ اچھی طرح دباؤ۔۔ایسے۔

افیمی: ایک بات میرے بھی خیال شریف میں آئی ہے حضور۔

استاد: بکو؟

افیمی: کتے جب دو طرف سے حملہ کر سکتے ہیں تو چار طرف سے بھی کر سکتے ہیں۔

استاد: مطلب بیان کرو۔

افیمی: کیا مضائقہ کہ مجھے چار لکڑیاں عنایت کردیں۔ چاروں طرف سے جان بچالوں گا حضور۔

استاد: چلو، چار لے لینا۔۔۔ ذرا دب کے دباؤ۔

افیمی: استاد کے بچے جئیں۔۔ استاد کے بچے جئیں۔

(تھوڑی دیر ٹانگیں دباتے رہنے کے بعد)

افیمی: سرکار اب آپ کی ٹانگیں دُکھ گئی ہوں گی۔

استاد: اچھا جاؤ۔ دفان ہوجاؤ۔

افیمی: (خوش ہوکر کھڑا ہوجاتا ہے) اور لکڑیاں حضور؟۔۔ چار کا وعدہ فرمایا ہے سرکار نے۔

استاد: مل جائیں گی۔

بغلول: پھر حضور میں نے کیا خطا کی ہے؟ مجھے بھی اتنی ہی عنایت ہوں۔

استاد: تمھیں بھی چار مل جائیں گی (آنکھ مار کر) پہلوان! دے دونوں کو چار چار۔

پہلوان: ایسی ویسی۔۔۔ گن کر دوں گا؟

بغلول: سخی کے ہاتھوں ایک آدھ زیادہ بھی مل جائے تو کیا مضائقہ۔

استاد: کوئی مضائقہ نہیں۔۔۔ دے دے پہلوان ایک آدھ زیادہ دے دے۔۔۔ کھڑے ہوجاؤ دونوں ساتھ ساتھ۔

(پہلوان لکڑی اٹھا کر دونوں کو مارنا شروع کرتا ہے)

پہلوان: ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔

افیمی: اللہ میری توبہ۔۔ نئیں پہلوان جی۔۔ معافی دو۔

بغلول: ہائے مار ڈالا! اللہ میری۔۔ توبہ! توبہ! استغفار!

(دونوں بھاگ جاتے ہیں۔ پہلوان اور استاد دونوں زوردار قہقہہ لگاتے ہیں)

پہلوان: یہ کاروبار تو اچھا ہے۔۔ لے لے آؤ دھر دھر جاؤ۔

استاد: ہاں! اسے کہتے ہیں کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ۔۔

پہلوان: چوکھا۔

استاد: لو بھئی! اور آ رہے ہیں۔

(موٹا لکڑہارا پیٹھ پر لکڑیاں لادے داخل ہوتا ہے)

پہلوان: لے کے آئے ہونا؟ (استاد ڈنڈا دکھاتا ہے اور پہلوان گٹھا نیچے گرا دیتا ہے) دھرتے جاؤ۔ ہاہاہا۔

(دونوں موٹے لکڑہارے کے بے تحاشا گدگدی کرتے ہیں۔ پریشان ہو کر وہ بھاگ جاتا ہے)

استاد: شام ہو گئی بھئی! لکڑیاں لو اور گھر چلو۔

(تحلیل)

منظر ـــــــ دوسرا

(دوسرا دن ہے ایک کمزور لکڑہارا لکڑیاں لادے داخل ہوتا ہے۔ استاد اور پہلوان کل کی طرح آج بھی کھڑے ہیں)

استاد: ٹھہر جاؤ۔ (ڈنڈا دکھاتا ہے)

لکڑہارا: (گڑگڑا کر) جی مائی باپ؟

استاد: رکھ دو یہ لکڑیاں یہاں۔

(لکڑہارا فوراً لکڑیاں زمین پر رکھ کر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

پہلوان: مرغا بن جاؤ۔

(لکڑہارا مرغا بننے لگتا ہے)

استاد: (قہقہہ لگا کر) جاؤ ـــ جاؤ ـــ چلو ـــ بھاگو ـــ اور لکڑیاں کاٹ کر لاؤ۔

(لکڑہارا اٹھ کر ایسا بھاگتا ہے کہ گھوم کر بھی نہیں دیکھتا۔ دونوں شیخی میں سینہ تانے کھڑے ہیں)

پہلوان: (گھبرا کر) استاد! یہ ـــ یہ تو اصلی پہلوان آ رہا ہے۔

استاد: کافی لکڑیاں ہیں اس کے پاس۔

پہلوان: مگر ڈنڈا بھی تو ہے۔

استاد: فکر نہ کرو ـــ شام ہو گئی ہے بس اس سے نمٹ کر گھر چلتے ہیں۔

(ایک لمبا چوڑا اصلی پہلوان کمر پر لکڑیوں کا بھاری بوجھ لادے ہاتھ میں بڑا سا ڈنڈا لیے داخل ہوتا ہے)

استاد: (گرج کر) ٹھہر جاؤ!

اصلی پہلوان: (گرج کر) کیوں؟

پہلوان: مطلب یہ کہ شربت پانی ـــ پہلوان صاحب!

استاد:　ہاں پہلوان! سخت گرمی ہے۔

اصلی پہلوان: گرمی ہمارا کیا کرے گی۔

پہلوان:　ہم نے راہ میں سبیل اسی لیے لگا رکھی ہے سرکار پینے والے کا بھی بھلا اور نہ پینے والے کا بھی بھلا۔

اصلی پہلوان: اچھا لاؤ پانی

پہلوان:　(پانی دیتا ہے) لیجیے پہلوان صاحب! (اپنے دامن سے اصلی پہلوان کا پسینہ پونچھنے لگتا ہے) یہ لکڑیاں زمین پر رکھ دیجیے۔ رستم صاحب، سہراب صاحب!

استاد:　ہاں ذرا ستا لیجیے۔

اصلی پہلوان: (لکڑیاں زمین پر رکھ کر) اور دو پانی۔

(پہلوان پانی دیتا ہے اصلی پہلوان پانی پی کر پھر لکڑیاں اٹھانے لگتا ہے)

پہلوان:　نا رستم صاحب سہراب صاحب! آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں؟

استاد:　یہ چھوکرا آپ کے گھر چھوڑ آئے گا۔

پہلوان:　ہاں جی دارا صاحب، سکندر صاحب! آپ یہ بوجھ کہاں اٹھاتے پھریں گے۔

اصلی پہلوان: (ڈنڈا تان کر دوسرے ہاتھ سے پہلوان کی گردن پکڑتا ہے) اوئے چھوکرے! میں تو تجھ کو بھی ناخن پر اٹھا لوں گا۔

استاد:　ہائیں ہائیں پہلوان صاحب کیا کرتے ہیں ۔۔۔ بے موت مر جائے گا ۔۔۔ چل بے اٹھا لکڑی کیا سمجھتا ہے تو پہلوان صاحب کو۔

اصلی پہلوان: (گردن چھوڑ دیتا ہے) اونہیں جی۔ ہم خود لے جا سکتے ہیں۔

استاد:　نہیں پہلوان صاحب! اس چھوکرے نے گستاخی کی ہے اسے سزا ملنی چاہیے۔ چل بے۔ پہنچا کے آ پہلوان کے گھر ۔۔۔ خادم ہیں جی تمھارے نوکر ہیں ۔۔۔ لو بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔

اصلی پہلوان: اچھا جلدی کرو پھر ۔۔۔ ہمیں اکھاڑے بھی جانا ہے۔

استاد:　(اصلی پہلوان سے گلے کر) خدا حافظ! مگر دیکھو پہلوان یہ ڈنڈا لے کر ہم جیسے دوستوں سے ملنے نہ آیا کرو۔

اصلی پہلوان: (ڈنڈا گھٹنے پر رکھ کر توڑ دیتا ہے) جب دوست کہہ دیا تو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

پہلوان:　قسم کھاؤ کہ اب ہم پر ڈنڈا نہیں اٹھاؤ گے۔

اصلی پہلوان: مرد کی زبان ایک۔ خدا حافظ۔ (چلا جاتا ہے)

استاد: یہ ٹوٹا ہوا ڈنڈا بھی اٹھا کر لکڑیوں میں رکھ لو اور لکڑیاں اپنے گھر لے چلو۔۔۔ پہلوان صاحب اکھاڑے گئے ہیں۔ پہلوان کا بچہ!

(دونوں قہقہہ لگاتے ہیں)

(تحلیل)

منظر۔۔۔ تیسرا

(تیسرا دن، وہی جگہ، کافی لکڑیاں اب بھی وہاں پڑی ہیں)

استاد: لکڑیاں ٹھیک سے لگا دی تھیں؟

پہلوان: ایسی ویسی استاد! آپ کے گھر کے چاروں طرف لکڑیوں کا اتنا ڈھیر لگ گیا ہے کہ اچھی خاصی چار دیواری بن گئی ہے۔

استاد: شاباش!۔۔۔ بس بہت جلد اس کا سودا کر ڈالوں گا۔

پہلوان: کل ہی کر ڈالیں۔ رقم سیدھی کریں استاد جی! لکڑی تو آتی ہی رہے گی۔

استاد: ٹھیک ہے۔

پہلوان: نو نقد نہ تیرہ اُدھار۔ آئیں! یہ کیا؟ لو استاد وہ اصلی پہلوان صاحب پھر نازل ہو رہے ہیں۔

(اصلی پہلوان دائیں جانب سے داخل ہوتا ہے)

اصلی پہلوان: السلام علیکم استاد صاحب! چھوکرے صاحب!

استاد:

پہلوان: وعلیکم السلام۔

(دونوں باری باری گلے ملتے ہیں)

اصلی پہلوان: بھئی ہماری لکڑیاں ابھی تک گھر نہیں پہنچیں؟

پہلوان: آپ کا ڈنڈا کہاں ہے اصلی پہلوان صاحب؟

اصلی پہلوان: مرد کی زبان ایک، وہ تو کل ہی توڑ دیا تھا۔

پہلوان: دوسرا تو کہیں نہیں چھپا رکھا ہے؟

اصلی پہلوان: (ہنس کر) نہیں۔۔۔ مرد کی زبان ایک۔ میں تو قسم کھا چکا ہوں۔

استاد: قسم توڑو گے تو نہیں؟

اصلی پہلوان: کبھی نہیں۔ مرد کی زبان ایک۔

استاد: تو سن لو کہ تمھاری لکڑیاں ہم نے لے لیں۔

اصلی پہلوان: خیر کوئی بات نہیں (کچھ سوچ کر) مگر کیوں؟

استاد: (اکڑ کر) مرضی ہماری۔

اصلی پہلوان: (غصے میں آ جاتا ہے) لکڑی نہیں دو گے؟

پہلوان: راستہ البتہ دے سکتے ہیں۔

اصلی پہلوان: راستہ نہیں چاہیے۔ لکڑی چاہیے۔ اور اگر لکڑی نہیں تو رقم چاہیے۔

استاد: ہم رقم بھی نہیں دیں گے۔

اصلی پہلوان: تو پھر کون دے گا؟

استاد: (ڈنڈا آگے کر دیتا ہے) اس سے مانگ لو۔

پہلوان: یا یہی مانگ لو۔

اصلی پہلوان: (غصے سے اپنے ہی بال نوچتا ہے (مرد کی زبان ایک، قسم نہ کھائی ہوتی تو تمھاری بوٹی بوٹی کر کے کھا جاتا)

استاد: فی الحال تو آپ ہوا کھائیں۔

پہلوان: ویسے اکھاڑے میں جا کر قلابازی کھانے کا بھی خیال برا نہیں۔

(اصلی پہلوان غصے میں پھنکارتا چلا جاتا ہے دونوں قہقہے لگاتے ہیں۔ ایک نوجوان لڑکی لکڑیاں اٹھائے داخل ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ چھ سات سال کی بچی بھی ہے، وہ بھی چند لکڑیاں بغل میں دبائے ہے)

استاد: ٹھہر جاؤ۔

لڑکی: کیوں ٹھہر جاؤں؟

پہلوان: مت ٹھہرو۔ مگر لکڑیاں رکھتی جاؤ۔

لڑکی: لکڑیاں تو ہماری ہیں۔

استاد: لیکن اب ہماری ہیں۔ اٹھا لو پہلوان۔

لڑکی: ہوں! حلوائی کی دکان اور دادا جی کا فاتحہ۔ گرہ سے خرچ کر کے خرید کیوں نہیں لیتے؟

پہلوان: ہمارا سنہری اصول ہے کہ جب پیٹ بھرے یوں۔ تو محنت کریں کیوں؟

لڑکی: پھر ڈوب مرو چلو بھر پانی میں۔

استاد: زبان مت چلا چھوکری! سیدھی لکڑیاں یہاں رکھ دے۔

لڑکی: نہیں رکھوں گی۔

استاد: نہیں۔

لڑکی: نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔

(استاد لڑکی کی چوٹی پکڑ کر دھکا دیتا ہے، لڑکی گر پڑتی ہے، لکڑیاں بکھر جاتی ہیں)

استاد: آپے سے باہر ہوئی جا رہی ہے۔

لڑکی: (رونے لگتی ہے) کمینے تو نے میری ماں اور معذور باپ پر بھی یہی ظلم ڈھایا تھا۔ کمزوروں پر ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آتی۔

استاد: تیری زبان بھی تیری ماں کی طرح چلتی ہے۔۔۔ چل جا۔۔ ورنہ بتیسی باہر کر دوں گا۔ (پہلوان سے) پہلوان! اس دوسری چھوکری سے بھی لکڑیاں لے لو اور چلتا کرو انھیں۔

(پہلوان چھوٹی بچی سے جو سہمی کھڑی ہے لکڑیاں چھین لیتا ہے۔ نوجوان لڑکی زمین سے اٹھ کر اپنی چھوٹی بہن کے پاس آتی ہے۔ اور اس کی انگلی پکڑ کر غصے سے استاد کو گھورتی ہے)

لڑکی: مجبور کی آہ کبھی خالی نہیں جاتی۔ (چلی جاتی ہے)

استاد: اگر یہی رفتار رہی تو لکڑیوں کا ڈھیر آسمان سے باتیں کرنے لگے گا۔

پہلوان: ایسا ویسا۔ بس ہم راتوں رات امیر ہو جائیں گے۔

استاد: ارے تو اب کون سے کم ہیں۔

پہلوان: استاد! دوپہر ہو گئی، بھوک لگ رہی ہے۔

استاد: ارے ہاں! جا میرے گھر سے گرم گرم حلیم لے آ۔ جلدی جا پہلوان!

پہلوان: (بستی کی طرف جانے کو مڑتا ہے) ارے استاد! یہ دھواں کیسا ہے بستی میں؟

استاد: بادل ہوں گے۔

پہلوان: دھویں کے بادل ہیں استاد!

استاد: واقعی! مگر---مگر---کیا مطلب؟

(بے تحاشا بھاگنے لگتا ہے۔ پیچھے پیچھے پہلوان بھی گھبرایا ہوا بھاگ رہا ہے۔ دونوں گھوم کر کبھی اس درخت کو دیکھتے ہیں جہاں ان کا ڈیرا ہے اور کبھی بستی کو)

(تبدیل)

منظر----چوتھا

(استاد کا گھر پہلوان اور استاد داخل ہوتے ہیں۔ یہاں ہر چیز جل چکی ہے اور دھواں اٹھ رہا ہے)

استاد: یہ کیا ہو گیا میرے گھر کو

پہلوان: صبح تم چولہے میں آگ چھوڑ گئے تھے، کوئی چنگاری شاید مکان کے چاروں طرف رکھی ہوئی لکڑی پر پڑ گئی۔

(استاد کی آنکھیں ڈبڈبا آتی ہے۔ اسے معذور بوڑھے اور بیوی کے الفاظ یاد آرہے ہیں)

بیوی: (آواز) میرے دل میں جو دھواں اٹھ رہا ہے۔ کاش----

استاد: (جیسے خود سے کہہ رہا ہے) چل چل---دھواں اٹھ رہا ہے---ہمیں تو نظر نہیں آتا۔

بیوی: (آواز) نظر آجائے گا---ظالم---نظر آجائے گا۔

بوڑھا: (آواز) اور دھویں کے بادل جب چھٹیں گے تو تجھے راکھ ملے گی۔

لڑکی: (آواز) مجبور کی آہ کبھی خالی نہیں جاتی---مجبور کی آہ کبھی خالی نہیں جاتی۔

(دھویں کی اوٹ سے استاد کا چہرہ نظر آرہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو ہیں۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔)

☆☆☆☆

ڈاکٹر احسان اکبر

اپاہج

گھر کے ساتھ قریبی گراؤنڈ میں بچوں کا شور
(ایک کمرے کا سین)
معذور بچہ اپنے گھر میں خصوصی کرسی (Wheel Chair) پر بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔
بڑے انہماک سے باہر کا نظارہ کھڑکی میں سے دیکھ رہا ہے۔
ماں کیمرے کے سامنے آتی ہے۔

ماں: (نوکر بلاتے ہوئے) شرفو! ارے شرفو! کہاں کھپ گیا ظالم۔ میں نے کتنی بار کہا ہے...... (بیٹے سے مخاطب ہوتے ہوئے) میری جان! اس مردار کھڑکی میں سے کیوں جھانکتے رہتے ہو۔ سردی لگ جائے گی۔

بچہ: امی! آج کل تو ابھی گرمیاں ہیں۔ ہوا اچھی لگتی ہے۔ آپ نے سامنے---

ماں: بیٹے سردی تو نہیں مگر تم گر تو سکتے ہو کھڑکی میں جالی تک تو ہے نہیں۔

بچہ: امی آپ نہیں دیکھ رہیں ان بچوں کو گرنے کا خطرہ تو نہیں ہو سکتا ہے دیکھیے بچہ کس طرح اچھل کر بال کو اپنے سر پر لے رہا ہے-- امی--- میں کیا کروں گا؟

ماں: (بچے کے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر سینے سے لگاتے ہوئے) ہائے میری جان! تو ایسی چیزیں دیکھ دیکھ کیوں سوچتا رہتا ہے۔ جا تھوڑی دیر کے لیے تو بھی کہیں اور گھوم پھر آ۔ (مڑتے ہوئے) اے شرفو! تو کہاں تھا۔

شرفو: جی رسوئی میں تھا۔

ماں: چل اب کام سے بھی لگ چھوٹے صاحب کو ذرا لان تک چھوڑ دو۔

بچہ: امی جان ایک وعدہ کریں۔

ماں: ہاں بچے وعدہ ہے۔ کیا بات ہے۔

بچہ: شرفو مجھے روز باہر تک سڑک کی سیر کرا کے لایا کرے۔ میں سہ پہر کو خواہ مخواہ اداس ہو جاتا ہوں۔

ماں: ہاں بچے روز سہ پہر کو۔ شرفو سن رہا ہے۔

شرفو: جی-----

ماں: اچھا اب انھیں لے جا، دیکھنا کرسی آہستہ آہستہ دھکیلنا۔

اگلا سین

(گھر کے باہر کا سین۔ بچہ وہیل چیئر پر سڑک پر جا رہا ہے۔)

بچہ: (شرفو سے) ۔شرفو! تم مجھے روز معذوروں کے سکول تک لے آیا کرو گے۔

شرفو: ٹھیک ہے۔

بچہ: سڑک پر کھڑے ہو کر دوسروں کو کھیلتے ہوئے دیکھتے رہنے سے اچھا ہے کہ ہم ساتھ کے لوگوں میں آ جائیں یا اپنی ٹانگ کی طاقت بحال کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ مگر تم امی کو یہ کہو گے کہ میں معذور بچوں میں شامل ہو کر تلاش کر رہا تھا تو وہ ناراض ہوں گی۔ امی مجھے معذور نہیں کہتیں۔ ایسا نہیں کہنے دیتیں۔ یہ سب نہیں مانیں گی تو میری معذوری کا علاج کیسے ہو گا۔

(بچہ انسٹی ٹیوٹ میں اپنی ٹانگ کو حرکت میں لانے کے سلسلے میں ورزشیں کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔)

اگلا سین

بچہ مشین کے سہارے سے زمین پر قدم جماتا ہوا۔

اگلا سین

بچہ مشین کے ساتھ قدم قدم چلتا تھا۔

(وہیل چیئر پر بیٹھ کر دوسرے معذور بچے کے ساتھ پنگ پانگ کھیلتے ہوتے بچہ انسٹی ٹیوٹ کے جلسے میں تقریر کرتا ہوا۔)

”میں ادارہ اطفال کے منتظمین کرام کا بہت شکرگزار ہوں جنہوں نے مجھے یہ موقع دیا کہ میں نہ صرف یہاں آ کر جسمانی ورزشوں میں حصہ لوں بلکہ آج کے جلسے میں آپ حضرات سے خطاب کا موقع بھی عطا کیا۔ ان مہربانیوں کے جواب میں میرے پاس کوئی چیز نہیں۔ مگر ایک علم کی نعمت ایسی ہے جس کی میرے ساتھیوں کو یہاں بھی ضرورت ہوتی۔ میں اس وقت پانچ درجے پاس کر چکا ہوں۔ میرے ننھے منے ساتھی جو یہاں بریل کے اکھڑے ہوئے حرفوں سے سیکھنا شروع کریں گے انھیں اُردو

انگریزی کے حروف سیکھ کر لفظ بنانے میں مفت اور بغیر معاوضے کے مدد دینے کو تیار ہوں۔ اسی طرح جس طرح بلا معاوضہ یہاں کی ورزشوں اور کھیلوں میں مجھے شامل ہونے کی اجازت حاصل ہے۔

(تالیاں)

(سکول کے سربراہ بچے کی پیشکش قبول کر لیتے ہیں۔)

بچہ: امی جان! یہ کھڑکی کھول دیجیے۔ (وہی پہلے سین والا کمرہ)

ماں: بیٹے! کھڑکی۔۔۔ کے سامنے بیٹھنے سے کیا حاصل۔ آج چھٹی کا دن ہے اور ابھی پہلا پہر ہے ابھی سے کھڑکی میں بیٹھ گئے تو لکھائی کا کام کرنا بھول ہی جاؤ گے۔

(سمجھاتے ہوئے) میری جان! جب تمھیں اب باہر گھومنے پھرنے کا موقعہ نصیب ہے تو باہر کی دنیا کو کھڑکی سے تکتے رہنے سے کیا حاصل؟

بچہ: اور! آپ سوچ رہی ہیں کہ میں باہر کی دنیا کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہوں۔ نہیں امی۔ آج اتوار ہے اور دو سکولوں کی ٹیموں کا میچ ہونے والا ہے۔ میں یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ ان مقابلہ کرنے والی ٹیموں کو شاید لمبا تھرو throw پھینکنا آتا ہو۔ ورنہ امی جان محلے کی ٹیم کے لڑکے تو یوں تھرو کرتے تھے جیسے بازوؤں میں جان ہی نہ ہو۔

امی: (کھڑکی کھولتے ہوئے) اتنی طاقت سے تھرو پھینکتے ہو کہ ادارہ اطفال کے سالانہ دن کے موقع پر خود ان کے پرنسپل نے تمھاری throw پھینکتے ہوئے تین تصویریں خود اتاریں۔

بچہ: جی ہاں! امی جی محلے والی ٹیم کا میچ تو دیکھنے کے قابل نہیں ہوتا۔

امی: اور ہاں تم نے سرٹیفکیٹ تو دیکھا ہی نہیں جو ادارہ اطفال کے پرنسپل نے کل ہی دوپہر کو بھجوایا۔

بچہ: کیا امی؟

ماں: خود دیکھ لینا بیٹے (سرٹیفکیٹ لینے جاتی ہے)

(دوبارہ آتے ہوئے) تمھارے Braille بریل کلاس کے تمام طالب علم سالانہ امتحان میں کامیاب ہو گئے۔

بچہ: (خوشی سے تالی بجاتے ہوئے) امی مبارک۔ مبارک ہو آپ کو۔

ماں: جیتے رہو بیٹے خدا ایسی مبارک گھڑیاں تمھیں آٹھوں پہر نصیب کرے۔

بچہ: امی جی لائیے دیکھوں تو کس کلاس کا نتیجہ ہے۔

ماں: (کاغذ دیتے ہوئے) بیٹے پہلی کلاس کا۔

بچہ: امی! دوسری جماعت والوں کے ساتھ میں ٹائپ بھی سیکھتا رہا ہوں۔ اب میں بریل میں کتابیں بھی لکھوں گا۔ نابینا بچوں کے لیے۔ اور امی جی آپ مجھے میٹرک کے بعد نابینا بچوں کو پڑھانے کا کورس کروادیں گی؟

ماں: ہاں بیٹے ضرور کرادوں گی۔ ووکیشنل ایجوکیشن کی ڈگری دلوادوں گی۔ مگر پہلے میرا بچہ بی۔ اے کرے۔

بچہ: ٹھیک ہے امی جان! ابو کہتے تھے ناں کہ میں ان کا نام روشن کروں گا۔
میں اندھے لوگوں کو روشنی ڈھونڈنے میں مدد دوں گا۔ علم کی روشنی دوں گا۔

ماں: (آبدیدہ ہوتے ہوئے) خدا تجھے اپنے نیک ارادوں میں برکت دے میرے بچے۔

بچہ: امی ایک خوشی کی خبر دوں۔

بچہ: میں کرسی میں بٹھا رہتا تھا تو اس سے میرا نچلا دھڑ وزنی اور زیادہ بے حس ہونے لگا تھا۔ میں نے ادارۂ اطفال میں ورزشیں شروع کر دی تھیں۔ جن سے جسم بدصورت نہیں ہوا۔ مگر امی ایک اور بڑا فائدہ ہوگیا۔

ماں: وہ کیا؟

بچہ: وہ یہ کہ امی اب میں ٹانگ پر لکڑی کا سہارا لے کر بوجھ ڈال سکتا ہوں اور کمر کو سیدھا تو۔۔۔

ماں: (حیرت سے) خدایا؟۔ خدایا؟
تو بچے وہ سٹک stick تم ہی لائے تھے۔

بچہ: جی امی۔

ماں: بڑھ کر بیٹے کا منہ چوم لیتی ہے اور خدا کے حضور جھولی پھیلا دیتی ہے۔

ماں: خداوندا! تیرے شکریے کے لیے منہ کہاں سے لاؤں۔ خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ تیرا لاکھ لاکھ احسان ہے۔

بچہ: اور امی جی ایک قصور کی معافی دے دیجیے گا: وہ یہ کہ ہم شروع شروع میں آپ سے سیر کرنے کی اجازت لے کر ادارۂ اطفال کے کھیلوں میں جا کر شریک ہوا کرتے تھے۔ ہم نے پوری بات نہیں بتائی تھی۔ آپ ناراض ہو جاتی تھیں نا؟ اب معاف کر دیجیے گا۔

ماں: بچے کو سہارا دے کر اٹھاتی ہے اور گلے سے لگا لیتی ہے "ہاں معاف کر دیا"۔

☆☆☆☆

ارشد چہال

مکڑی

کردار

نازیہ : ایک پندرہ سالہ خوبصورت مغرور لڑکی
عبداللہ : نازیہ کا باپ، ایک نیک آدمی
ملکہ : ایک ادھیڑ عمر خوبصورت اور باوقار خاتون
خاتون نمبر 1 : ایک ادھیڑ عمر کی امیر خاتون
خاتون نمبر 2 : ایک اور ادھیڑ عمر کی امیر خاتون

مقامات

شاہی محل کا کمرہ : جہاں ملکہ عام لوگوں سے ملتی ہے
عبداللہ کا گھر : نازیہ کا کڑھائی کا کمرہ + سونے کا کمرہ + صحن

……

منظر نمبر 1 شاہی محل کا کمرہ ـــ دن

(ملکہ ملاقات کے کمرے میں بیٹھی کشیدہ کاری کا شوق پورا کر رہی ہوتی ہے ۔ ایک خادمہ اندر آتی ہے ۔ آداب بجا لاتی ہے ۔)

خادمہ: ملکہ عالیہ آپ کا پرانا خادم عبداللہ باریابی چاہتا ہے ۔

(ملکہ کڑھائی کرتے کرتے رک کر سوچتی ہے ۔)

ملکہ: عبداللہ، ہاں بلاؤ اسے، بہت نیک آدمی ہے ۔

(خادمہ جاتی ہے ۔ تھوڑی دیر کے بعد عبداللہ اپنی بیٹی نازیہ کے ساتھ اندر آتا ہے ۔ آداب بجا لاتا ہے ۔ ملکہ کڑھائی چھوڑ کر عبداللہ کے پاس آتی ہے اس کی بیٹی کو دیکھتی ہے ۔)

ملکہ: کہو، عبداللہ، کیسے آنا ہوا۔

عبداللہ: ملکۂ عالیہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ اسے اپنی غلامی میں لے لیں تا کہ یہ کوئی ہنر سیکھ جائے۔

ملکہ: کیوں نہیں عبداللہ، تم نے تمام عمر ہماری خدمت کی ہے۔ میں تمھاری بیٹی کو ایک ایسا ہنر سکھا دوں گی کہ یہ ساری زندگی یاد کرے گی۔

عبداللہ: ملکہ عالیہ، مجھ ناچیز پر یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا۔

(نازیہ کو دیکھتے ہوئے)

ملکہ: کیا نام ہے تمھارا لڑکی۔

نازیہ: نازیہ۔

(ہنستے ہوئے)

ملکہ: بہت پیارا نام ہے۔ مگر زندگی میں کبھی کسی چیز پر حد سے زیادہ ناز نہ کرنا۔

(نازیہ ہاں میں سر ہلاتی ہے---)

ملکہ: تم جاؤ عبداللہ، نازیہ آج سے شاہی محل کی طالبات کے ساتھ رہے گی۔ میں خود اسے کشیدہ کاری کا ہنر سکھاؤں گی۔

عبداللہ: بہت بہت شکریہ، ملکہ عالیہ، بہت شکریہ۔

(عبداللہ دعائیں دیتا ہوا جاتا ہے۔ ملکہ، نازیہ کے سامنے کڑھائی کرنے لگتی ہے۔)

________cut_________

منظر 2 شاہی محل کا کمرہ_____دن

(نازیہ ایک طرف کھڑی کشیدہ کاری کا ایک نمونہ دیکھ رہی ہے۔ اس پر چوبدار کی آواز اوور لیپ ہوتی ہے۔ نازیہ مودب ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے۔)

آواز: باادب، ملکہ عالیہ تشریف لاتی ہیں۔

(ملکہ کمرے میں آتی ہے۔ نازیہ کو دیکھتی ہے۔)

ملکہ: ہوں تو نازیہ تم نے میری کشیدہ کاری کے نمونے دیکھ لیے۔

نازیہ: جی ملکہ عالیہ، یہ نمونے تو اتنے پیارے ہیں کہ یقین ہی نہیں آتا۔

ملکہ: لڑکی کسی بھی فن کا کمال یہی ہوتا ہے کہ اسے دیکھ کر کسی کو یہ یقین ہی نہ آئے کہ انسانی ہاتھ بھی ایسی ہنر کاری کر سکتے ہیں۔

نازیہ: ملکہ عالیہ کیا میں بھی ایسی کڑھائی کرسکوں گی۔

ملکہ: کیوں نہیں، بس تمھیں محنت اور توجہ سے یہ کام سیکھنا ہوگا۔

(نازیہ کے **تاثرات**) جب تمھارا ہاتھ صاف ہو جائے گا تو اس کام میں تمھاری دلچسپی خود بڑھتی چلی جائے گی۔۔۔ میں نے یہ کام اپنی نانی بی سے سیکھا تھا۔ مگر اب یہ کام مری تنہائیوں کا ساتھی ہے۔ میں جب امورِ سلطنت سے اکتانے لگتی ہوں تو میرے ہاتھ خود بخود کشیدہ کاری کے لیے بے تاب ہونے لگتے ہیں۔

(شوق سے)

نازیہ: ملکہ عالیہ۔ آپ کی باتوں سے تو میرے اندر بہت زیادہ شوق پیدا ہو گیا ہے۔ اب تو میرے ہاتھ بھی یہ ہنر سیکھنے کے لیے بے تاب ہونے لگے ہیں۔

(ملکہ، نازیہ کو دیکھ کر مسکراتی ہے۔ رنگ برنگے دھاگوں کے گولے اٹھا کر اس کے سامنے ڈھیر کر دیتی ہے۔ نازیہ کے ہاتھ سلوموشن میں دھاگے کے گولوں سے کھیلنے لگتے ہیں۔)

______cut______

منظر 3 عبداللہ کا گھر______دن

(عبداللہ اپنے گھر کے صحن میں ایک چارپائی کی ادوان کھینچ رہا ہوتا ہے۔ نازیہ شاہی محل سے واپس گھر کھینچ رہا ہوتا ہے۔ نازیہ شاہی محل سے واپس گھر آتی ہے۔ عبداللہ اسے دیکھ کر خوشی سے آگے ہو کر ملتا ہے۔)

عبداللہ: تم آ گئی ہو بیٹی تمھارے بغیر تو میں اکیلا اس گھر میں بہت اداس ہو گیا تھا۔

نازیہ: ہاں بابا میں آ گئی ہوں اور کشیدہ کاری کا ایسا ہنر سیکھ کر آئی ہوں۔ جو اس شہر میں شاید ہی کسی اور کو آتا ہوگا۔

عبداللہ: خدا بھلا کرے ملکہ عالیہ کا، بڑی نیک دل اور خدا ترس ملکہ ہیں۔ اس کی مہربانی سے آج میری بیٹی بھی ایک ہنر سیکھ گئی ہے۔

نازیہ: بابا کیا بتاؤں میں نے کتنی جلدی یہ ہنر سیکھا۔ میرے کاڑھے ہوئے پھول، بوٹے اور تصویریں دیکھ کر تو ملکہ بھی حیران رہ گئی۔ بابا سچ کہہ رہی ہوں ایسی تصویریں تو آپ کی ملکہ عالیہ بھی نہیں بنا سکتی جیسی مجھے بنانی آ گئی ہیں۔

عبداللہ: ہاں بیٹی، مگر وہ تمھاری محسن اور استاد ہیں۔ اپنے محسنوں اور استادوں کا نام بہت ادب سے لیا جاتا ہے۔

نازیہ: بس بابا۔۔۔ کیا بتاؤں۔۔۔ مجھے تو اس ہنر کا نشہ سا ہو گیا ہے۔ میں آج ہی آپ کے ساتھ بازار جاؤں گی۔ بہت سارے رومال اور رنگ برنگے دھاگے خریدوں گی۔ اور پھر بابا دیکھنا۔ میں ان پر کیسی کیسی تصویریں بناؤں گی۔ کیسے کیسے پھول کاڑھوں گی۔

عبداللہ: ضرور بیٹی ضرور، میں آج ہی تمھارے ساتھ چلوں گا۔

(نازیہ کمرے میں جاتی ہے۔ عبداللہ، اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس کی بیٹی بھی کاری گر بن گئی۔)

عبداللہ: اے اللہ میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں۔ تو نے میری بیٹی کو ایک ہنر سے بہرہ مند کر دیا۔

______cut______

MONTAGE 4 منظر

1۔ نازیہ عبداللہ کے ساتھ بازار جاتے ہوئے۔

2۔ رنگ برنگے دھاگوں کے گولے چن چن کر ایک ٹوکری میں ڈالتے ہوئے۔

3۔ مختلف کڑھائی کی سوئیاں دیکھتے ہوئے۔

4۔ کشیدہ کاری کے فریم پسند کرتے ہوئے۔

5۔ کشیدہ کاری کے لیے رومال اور دیگر کپڑے خریدتے ہوئے۔

_______cut _______

منظر 5 عبداللہ کا گھر______رات

(نازیہ اپنے کڑھائی کے کمرے میں بیٹھی ایک بڑے فریم پر کوئی تصویر کاڑھ رہی ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد عبداللہ اندر آتا ہے۔)

عبداللہ: نازیہ بیٹی بس کر، کیا ساری رات کڑھائی کرتی رہو گی۔ اس طرح تو تمھاری آنکھیں خراب ہو جائیں گی۔ کچھ کام کل دن میں کر لینا۔

نازیہ: نہیں بابا، یہ کام تو میں مکمل کر کے ہی سوؤں گی۔

عبداللہ: اچھا جیسے تمھاری مرضی۔

نازیہ: بابا ادھر تو آئیں، دیکھیں میں نے کیا زبردست نمونہ تخلیق کیا ہے، ملکہ دیکھے گی تو دیکھتی رہ جائے گی۔

عبداللہ: بٹی عقل کی بات کرو، بھلا تمھارا اور ملکہ عالیہ کا کیا مقابلہ۔

نازیہ: نہیں بابا ملکہ چاہے بھی تو ایسا نمونہ تخلیق نہیں کر سکتی۔

عبداللہ: بٹی تم میری بات سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ اب کبھی ایسی بات نہ کرنا۔ اگر ملکۂ عالیہ کو پتہ چل گیا تو انھیں بہت دکھ ہوگا۔ وہ ہمیں احسان فراموش سمجھیں گی۔

(عبداللہ جاتا ہے، نازیہ کندھے اچکا کر پھر کڑھائی کرتی ہے۔ جیسا سے کسی کی پروانہیں ہے۔)

______cut______

منظر 6 عبداللہ کا گھر______دن

(ایک امیر عورت، نازیہ کے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ بہت خوش ہوتی ہے۔ نازیہ آتی ہے۔)

عورت: لڑکی تم تو واقعی بہت اچھی کڑھائی کرتی ہو۔ میں نے اس شہر میں بہت کم ایسی لڑکیاں دیکھی ہیں۔ جو اتنی صفائی اور خوبصورتی سے کام کرتی ہیں۔

نازیہ: آپ نے درست فرمایا، میں واقعی بہت صفائی اور خوبصورتی سے کام کرتی ہوں۔ آپ نے دیکھا میں نے کتنے سلیقے سے رنگ استعمال کیے ہیں۔

عورت: تم ٹھیک کہہ رہی ہو پیاری لڑکی۔ اس رومال پر تم نے اتنی نفیس کڑھائی کی ہے۔ مجھے یقین ہے یہ ہنر تمھیں ملکۂ عالیہ نے سکھایا ہوگا۔

(طنزیہ)

نازیہ: ملکہ بے چاری بھلا مجھے کیا سکھا سکتی ہے۔ ملکہ تو ملکہ میں تو کہتی ہوں دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں جو مجھ سے بہتر کڑھائی کر سکتا ہو۔

عورت: لگتا ہے تمھیں اپنے ہنر پر بہت ناز ہے۔

نازیہ: کیوں نہ ہو، ایسا ہنر تو کسی کسی کو ملتا ہے۔

عورت: اچھا ٹھیک ہے۔ میں تمھارے یہ رومال اور نمونے خریدنا چاہتی ہوں۔

نازیہ: مگر میں منہ مانگی قیمت لوں گی۔

عورت: ٹھیک ہے، تم جو مانگو گی میں تمھیں دے دوں گی۔ مگر ایک شرط پر۔

نازیہ: کیا؟

عورت: تم اپنی کڑھائی کے نمونے میرے علاوہ کسی کے ہاتھ نہیں بیچو گی۔

نازیہ: اگر کسی نے آپ سے بڑھ کر رقم دی تو میں شرط پر قائم نہیں رہوں گی۔

عورت: مجھے منظور ہے۔

(امیر عورت نمونے لے کر نازیہ کو ایک بڑی رقم دیتی ہے---)

______cut______

منظر 7 عبداللہ کا گھر______دن

(عبداللہ ایک لوٹے سے چلمچی میں ہاتھ دھوتا ہے۔ اپنی پگڑی کے پلو سے ہاتھ صاف کر کے نازیہ کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھتا ہے۔ دستر خوان پر عمدہ کھانے سجے ہوتے ہیں۔)

عبداللہ: بٹی یہ اتنے سارے کھانے----

نازیہ: بابا ہم بہت جلد امیر ہونے والے ہیں۔ مجھے اپنی کڑھائی کے نمونوں کی منہ مانگی قیمت مل رہی ہے۔ اب ہم بھی ملکہ کی طرح----

(بات کاٹتے ہوئے)

عبداللہ: وہ تو ٹھیک ہے بٹی مگر تم ملکہ عالیہ کے ساتھ اپنا مقابلہ نہ کیا کرو۔ آج تم جو کچھ بھی ہو اس عظیم ملکہ کی وجہ سے ہو۔ جو ہم جیسے غریبوں کی مدد کرتی ہے۔

نازیہ: نہیں بابا، جو نمونے میں نے فروخت کیے ہیں وہ ملکہ نے نہیں، میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائے تھے۔

عبداللہ: مگر یہ سب تمھیں سکھایا تو ملکہ عالیہ نے ہے۔

(نخوت سے)

نازیہ: سکھانے کا کیا ہے بابا۔ سکھا تو کوئی بھی سکتا ہے۔ اصل بات تو سیکھنے والے کی ہوتی ہے کہ وہ اسے کتنا سیکھتا ہے۔

عبداللہ: بس بٹی میں تو کہتا ہوں اللہ تمھارے حال پر رحم فرمائے۔

(پلیٹ بڑھاتے ہوئے)

نازیہ: بابا لو ناں، یہ مرغ تو میں نے آپ کے لیے منگوایا ہے۔ آپ کو مرغ کھانے کا شوق تھا ناں۔ اب جی بھر کے کھاؤ اور اپنی بٹی پر فخر کرو۔

(عبداللہ کھانا کھاتے ہوئے حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ نازیہ کو دیکھتا ہے۔)

_______cut_______

منظر 8 عبداللہ کا گھر ـــــ دن

(نازیہ ایک دوسری امیر عورت کے ساتھ اپنے کڑھائی کے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔)

نازیہ: بیگم صاحبہ میں آپ کو اپنی کڑھائی کے نمونے دکھا تو سکتی ہوں، مگر فروخت نہیں کر سکتی۔

عورت: کیوں؟

نازیہ: میں کسی اور کے ہاتھ فروخت کرنے کا وعدہ کر چکی ہوں جو مجھے ان کی منہ مانگی رقم ادا کرتی ہیں۔

عورت: تم نمونے تو دکھاؤ، ہو سکتا ہے۔ میں اس سے زیادہ رقم ادا کر دوں۔

نازیہ: ہاں زیادہ رقم ملنے پر سوچا جا سکتا ہے۔

(نازیہ باری باری دو تین نمونے دکھاتی ہے جنھیں امیر عورت دیکھ کے دنگ رہ جاتی ہے)

عورت: تمھارے نمونے دیکھ کر مجھے تو بڑی حیرت ہو رہی ہے۔

نازیہ: کیوں بیگم صاحبہ۔

عورت: ایسی باریکی اور صفائی یا تو میں نے ملکہِ عالیہ کے نمونوں میں دیکھی ہے یا پھر تمھارے نمونوں میں۔

(ملکہ سے چڑتے ہوئے)

نازیہ: اگر آپ لوگوں کا خیال ہے کہ میں ملکہ سے بہتر کڑھائی نہیں کر سکتی تو میں ملکہ سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں بیگم صاحبہ، ملکہ مجھ جیسی خوبصورت اور نفیس کڑھائی نہیں کر سکتی۔ مزا تو جب آئے کہ میں اور ملکہ ایک ساتھ بیٹھ کر کڑھائی کریں۔ پھر آپ کو پتہ چلے کہ کون بہتر کڑھائی کر سکتی ہے۔

(عبداللہ دروازے کے پاس گزرتے ہوئے نازیہ کی بات سنتا ہے)

(ٹوکتے ہوئے)

عورت: اچھا لڑکی ایسی باتیں نہ کر، ٹھیک ہے تم اچھی کڑھائی کرتی ہو۔ مگر تم ملکہِ عالیہ تو نہیں ہو سکتی ہے۔

(غرور سے)

نازیہ: کیوں نہیں ہو سکتی، میں اپنے ہنر کی ملکہِ عالیہ ہوں۔

عورت: توبہ توبہ لڑکی اتنا غرور، تمھارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے تم سے کچھ نہیں لینا۔

(امیر عورت نازیہ کے غرور سے ڈر کر چلی جاتی ہے۔ نازیہ اسے جاتے ہوئے دیکھ کر ہنستی ہے۔)

_______cut_______

منظر 9 عبداللہ کا گھر ــــــــ رات

(عبداللہ صحن میں پریشان بیٹھا حقہ پی رہا ہوتا ہے۔ نازیہ آتی ہے۔)

نازیہ: کیا بات ہے بابا۔ آج باہر کیوں بیٹھے ہو بابا۔

عبداللہ: نازیہ، میں باہر تمھارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔

نازیہ: میرے بارے میں! کیوں؟

عبداللہ: نازیہ مجھے تم سے ڈر لگنے لگا ہے۔

ہنستے ہوئے

نازیہ: کیوں بابا، میرے کیا سینگ نکل آئے ہیں۔

عبداللہ: ہاں بیٹی، کبھی کبھی انسان کے سر پر ایسے سینگ بھی نکل آتے ہیں، جو نظر تو نہیں آتے لیکن وہ انسان کو انسان نہیں رہنے دیتے۔ سچ مچ حیوان بنا دیتے ہیں۔

نازیہ: بابا یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟

عبداللہ: بیٹی آج تم اس امیر عورت سے جو باتیں کر رہی تھیں وہ میں نے سن لی ہیں، یہ امیر عورتیں تو ملکہ عالیہ کی ہر تقریب میں جاتی ہیں۔ اگر کسی نے تمھاری وہاں شکایت کر دی تو ملکہ عالیہ سخت ناراض ہوں گی اور اس گستاخی پر تمھیں کڑی سزا دیں گی۔

(غصے سے اٹھتے ہوئے)

نازیہ: وہ مجھے سزا کیوں دیں گی۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔ یہی کہ وہ مجھ جیسی کڑھائی نہیں کر سکتیں۔ اگر اس بات پر وہ مجھے سزا دینا چاہتی ہیں تو دیں۔ میں ان سے کڑھائی میں مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔

(شاؤٹ کرتے ہوئے)

عبداللہ: نازیہ تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

(چیختے ہوئے)

نازیہ: ہاں ہاں ـــ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ سارا شہر یہ جان چکا ہے کہ وہ میرے جیسی کڑھائی نہیں کر سکتیں ـــ نہیں کر سکتیں۔

(ڈانٹتے ہوئے)

عبداللہ: تم بہت گستاخ اور بدتمیز ہو گئی ہو۔ تمھیں تمھاری گستاخی کی سزا ضرور ملے گی۔

(نازیہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں جاتی ہے۔ کھڑکی پر پردے برابر کرتی ہے اور بستر پر جا کر لیٹ جاتی ہے۔)

_______cut_______

منظر 10 عبداللہ کا گھر___دن

(نازیہ اپنے کمرے میں مصروف ہوتی ہے، ایک برقعہ پوش عورت اس کے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ جو بظاہر ایک عام عورت دکھائی دیتی ہے۔ نازیہ کام روک کر اسے دیکھتی ہے۔)

ملکہ: لڑکی میں نے سنا ہے تم ہماری ملکہ کی شان میں گستاخی کرتی ہو۔

نازیہ: تم کون ہوتی ہو پوچھنے والی؟

ملکہ: دیکھو لڑکی، ملکہ تو تمھاری استاد ہے اور استادوں سے بے ادبی نہیں کرتے۔ کیا تم نے سنا نہیں با ادب با نصیب اور بے ادب بے نصیب ہوتے ہیں۔

نازیہ: میں ایسی کسی بات کو نہیں مانتی۔

ملکہ: دیکھو اگر تم اپنی غلطی مان لو تو ملکہ تمھیں معاف بھی کر سکتی ہے۔

نازیہ: تجھے ان باتوں سے کیا مطلب ہے۔ چل جا، اپنا راستہ لے۔ میرا قیمتی وقت برباد مت کر۔

ملکہ: ملکہ کا وقت بھی تو بہت قیمتی تھا۔ اس نے بھی تو آخر کچھ وقت نکال کر ہی تمھیں سکھایا تھا۔
(گردن اکڑاتے ہوئے)

نازیہ: ملکہ نے مجھے کیا خاک سکھانا تھا۔ یہ کام میں نے خود سیکھا ہے۔ ذرا دیکھو۔۔۔ مجھ جیسا خوبصورت اور نفیس کام ملکہ کر سکتی ہے۔ اسے تو سیدھی طرح سے ٹانکا لگانا بھی نہیں آتا۔

ملکہ: ہائے ہائے لڑکی تو یہ کیسی باتیں کر رہی ہے۔
(غرور سے)

نازیہ: اگر شک ہے تو جا اپنی ملکہ سے کہہ مجھ سے مقابلہ کر لے۔

(نازیہ کا چیلنج سن کر ملکہ پرانا برقعہ اتار پھینکتی ہے اور زرق برق لباس میں ملبوس ملکہ سامنے آجاتی ہے۔ نازیہ اسے دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ پھر سنبھل کر ملکہ سے مخاطب ہوتی ہے۔)

نازیہ: اچھا تو ملکہ عالیہ تشریف لائی ہیں۔
(غصے سے)

ملکہ: ہاں گستاخ لڑکی ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے لوگوں کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا ۔ اس لیے خود چلی آئی ۔

(ہنستے ہوئے)

نازیہ: تو کیا ملکہ عالیہ مجھ سے مقابلہ کرنے آئی ہیں؟

ملکہ: بے وقوف لڑکی، میں تجھ سے مقابلہ کرنے سے ہرگز نہیں ڈرتی ۔ لا مجھے ایک فریم دے میں دیکھتی ہوں تو میرے مقابلے میں کیا بناتی ہے؟

(نازیہ ایک فریم اٹھا کر ملکہ کی طرف پھینکتی ہے ۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر اپنے اپنے رومالوں پر تصویر کاڑھنے لگتی ہیں ۔ نازیہ ایک بدصورت عورت کا چہرہ کاڑھتی ہے ۔ جب کہ ملکہ ایک مکڑی کا جالا جس میں ایک مکڑی بیٹھی ہوتی ہے، منظر ڈراؤنا ہوتا ہے، دونوں اپنی تصویریں مکمل کر کے اٹھتی ہیں ۔)

ملکہ: ذرا دکھا تو مغرور لڑکی، آخر تو نے کیا بنایا ہے ۔

(نازیہ اپنا رومال دکھاتی ہے)

ملکہ: یہ کیا ہے؟

(مذاق اڑاتے ہوئے)

نازیہ: یہ تمھارے اندر کی خوفناک ملکہ ہے ۔ جس نے لوگوں کے لیے بظاہر ایک خوبصورت چہرہ سجا رکھا ہے ۔

(غصے سے)

ملکہ: گستاخ لڑکی تو مجھے بدصورت ثابت کرنا چاہتی ہے ۔

نازیہ: ملکہ عالیہ غصہ نہ کریں اور ذرا دکھائیں تو سہی کہ آپ نے کیا شاہکار تخلیق کیا ہے ۔

(ملکہ غصے سے اپنا فریم اٹھا کر دکھاتی ہے ۔ نازیہ حیرت سے دیکھتی ہے ۔)

نازیہ: یہ کیا ہے؟ مکڑی!

ملکہ: نہیں گستاخ لڑکی یہ مکڑی نہیں ہے ۔ یہ بھی کبھی تمھاری طرح کی لڑکی تھی جسے بننے پر بہت غرور تھا ۔ اب یہ بی مکڑی بنی ہوئی ہے اور گھر گھر میں جال بنتی ہے ۔ اتنے باریک تاروں کا جس کا تو تصور بھی نہیں کر سکتی ۔

نازیہ: مگر میں تو مکڑی نہیں ہوں ۔

ملکہ: اے گستاخ اور بے وقوف لڑکی ۔ مانا کہ تو بہت اچھا بنتی ہے مگر تو بہت مغرور اور بے ادب ہے ۔ تو اپنے استادوں کا مذاق اڑاتی ہے ۔ تیرا دنیا میں اس طرح رہنا خطرے سے خالی نہیں ۔ اس لیے میں تجھے یہ

سزا دیتی ہوں کہ تو ہمیشہ مکڑی ہی رہے گی۔

(ملکہ غصے سے اپنا رومال جھاڑ کر نازیہ پر پھینکتی ہے۔ جو مکڑی کے جال کی طرح اس پر تن جاتا ہے نازیہ کے سر کے بال جھڑ جاتے ہیں اس کا قد چھوٹا ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جال کے اندر سمٹ کر ایک مکڑی بن جاتی ہے۔)

(نازیہ خوف سے چیخ کر اٹھتی ہے۔ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتی ہے۔ عبداللہ نازیہ کے کمرے میں آتا ہے۔ کھڑکی کے پردے ہٹاتا ہے۔ نازیہ کے پاس بیٹھتا ہے۔)

عبداللہ: کیا ہوا بیٹی، تم نے کوئی خواب دیکھا کیا۔

(خوف سے روتے ہوئے)

نازیہ: ہاں بابا خواب، مگر بہت ہی بھیانک خواب۔ بابا میں نے دیکھا ملکہ نے مجھے مکڑی بنا دیا۔ اور میں گھر گھر میں جا کر جالے بن رہی ہوں۔۔۔ بابا۔۔۔ بابا۔۔۔ میں آئندہ کبھی ملکہ کی شان میں گستاخی نہیں کروں گی۔۔۔ نہیں کروں گی۔

(عبداللہ نازیہ کے سر پہ ہاتھ رکھ کر اسے دلاسہ دیتا ہے۔ منظر فریز ہو جاتا ہے۔)

_______the end_______

سید صفدر رضا رضوی

اقدار

(ایک متوسط گھرانے کا منظر جہاں صبح کے اوقات میں خاتونِ خانہ جلدی جلدی اپنے بچے کو اسکول کے لیے تیار کر رہی ہیں جب کہ اسی وقت میں ان کے شوہر کو بھی آفس کے لیے نکلنا ہوتا ہے۔)

کردار:

صاحب خانہ
خاتونِ خانہ
بچہ
دادی اماں

صاحب خانہ: بیگم! میری Blue والی ٹائی کہاں رکھی ہے۔

خاتونِ خانہ: وہیں الماری کے اوپر والے حصے میں پڑی ہے، پلیز وہیں دیکھ لیں ناں۔

صاحب خانہ: (غصے سے) نہیں مل رہی ہے، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، آ کر ڈھونڈ کر دو مجھے۔ آفس کے لیے دیر ہو رہی ہے۔ ابھی میری آفس کی VAN آ جائے گی۔

خاتون خانہ: (معذرت کے ساتھ) میں کامی کو تیار کر رہی ہوں اس کے اسکول کی VAN پہلے آتی ہے آپ سے۔

صاحب خانہ: (کوفت کے ساتھ) اوہو! کتنی بار منع کیا ہے کہ میری چیزوں کو مت کیا کرو اِدھر اُدھر۔ مگر تم جانے کہاں رہتی ہو۔ مجال ہے جو کوئی چیز کبھی وقت پر مل جائے۔ ارے یہ کیا میری آفس VAN آ گئی۔ آج بورنگ ٹائی لگا کر جانا پڑے گا، میں جا رہاں ہوں۔ خدا حافظ۔

خاتون خانہ: ارے سنیے ناشتہ تو کرتے جایئے، ٹیبل پر پڑا ہوا ہے۔

بچہ: (پریشانی سے) پتہ نہیں بیٹا! آج تو خاصی LATE ہو گئی ہے تمھاری وین، رکو میں وین ڈرائیور کو فون کر کے اس سے معلوم کرتی ہوں کہ وین کہاں رہ گئی۔

دادی: ارے بہو! کل رات کو ٹیلی ویژن سے خاصی دیر میں اناؤنس ہوا تھا کہ حالات کی خرابی کی بنا پر بچوں کے اسکول ایک ہفتے کے لیے بند رہیں گے۔ میں اتفاق سے نماز کے بعد اپنے کمرے میں وظیفہ پڑھ رہی تھی۔ میں سمجھی کہ تم نے سن لیا ہوگا یا پھر ٹی وی پر صبح دیکھ لیا ہوگا ورنہ تمھیں پہلے بتا دیتی کہ کامی کو تیار مت کرو۔

خاتونِ خانہ: (پریشانی سے) امی! صبح ہی صبح ٹی وی دیکھنے کا وقت کہاں ملتا ہے، بس ہر چیز میں جلدی جلدی کرنا پڑتی ہے۔ ہائے میرے اللہ! کاش میں کامی کے پاپا کو ناشتہ تو کروا دیتی۔ آج ان کی ٹائی بھی نہیں ملی۔ وہ ناراض ہو کر آفس گئے ہیں وہ بھی خالی پیٹ۔ اللہ خیر کرے۔ ان کا پورا دن اچھا گزرے۔ میں شام کو ان کی آمد پر سوری کر لوں گی۔

بچّہ: (شکایتی انداز میں) امی میں بھی تو کئی مرتبہ خالی پیٹ اسکول جاتا ہوں، مگر آپ پریشان تو نہیں ہوتیں۔

خاتونِ خانہ: (صفائی دیتے ہوئے) بیٹا تم اپنے ساتھ لنچ لے کر تو جاتے ہو ناں، اور ویسے بھی صبح ایک گلاس دودھ بھی تو پی لیتے ہو صبح اُٹھ کر۔ مگر تمھارے پاپا تو صرف صبح کا ناشتہ کرتے ہیں اور پھر رات کو کھانا کھاتے ہیں دوپہر میں وہ کچھ نہیں کھاتے۔

دادی: (تسلی دیتے ہوئے) بہو! تم پریشان ہو کر اپنا جی مت ہلکان کرو۔ وہ ناشتہ آفس میں ہی کر لے گا اور چائے ناشتہ سب ملتا ہے اس کے آفس میں اور کون سا تم نے اُسے جان بوجھ کر بھوکا آفس بھیجا ہے تم خود کامی کو کتنی مشکل سے تیار کرتی ہو۔ ایک تو ان صاحب کا صبح اُٹھنا ہی ایک بہت بڑا میدان سر کرنے کے مترادف ہے۔

بچّہ: (اٹھلاتے ہوئے) دادی اماں! میں اُٹھ تو جاتا ہوں۔

خاتونِ خانہ: حالاں کہ میں کامی کو رات میں محض اس لیے جلدی سلاتی ہوں مگر اس کی نیند تو جیسے صبح کے وقت شروع ہوتی ہے واقعی۔ کامی کتنی مشکل سے اُٹھتے ہو تم۔ اوپر سے تمھیں تیار کروانے کا مشکل ترین مرحلہ اور ساتھ میں تمھارے پاپا کے آفس جانے کا ٹائم۔ صبح کے وقت تو مجھے خود نہیں پتہ ہوتا ہے کہ میرا ایک بازو کچن میں اور دوسرا تمھارے پاپا اور تمھاری تیاریوں میں مصروف رہتا ہے۔

دادی: بہو اس دنیا کی ساری مائیں ایسا ہی کرتی ہیں۔ قوم الگ، نسل اور مذہب سے ہٹ کر۔ یہ محنت اور اولاد کے کام کاج میں ماں کی اولاد سے محبت کی دلیل ہیں۔

بچہ: (معصومت سے) دادی اماں کیا پاپا بھی آپ کو بچپن میں تنگ کرتے تھے، جس طرح امی کے بقول میں ان کو تنگ کرتا ہوں۔

دادی: (مسکراتے ہوئے) ہاں بیٹا! بالکل اسی طرح بلکہ ہمارے وقتوں میں نہ تو GAS کے چولہے تھے نہ گرم پانی کے گیزر، مائیکرو ویو اوون اور نہ جھٹ پٹ تیار ہونے والے کھانے۔ ہمیں تو صبح سویرے منہ اندھیرے اُٹھ کر لکڑی کا چولہا جلانا پڑتا تھا، پھونکیں مار مار کر اکثر سانس بند ہو جایا کرتی تھی اوپر سے تمھارے اللہ بخشے دادا ابو کی فرمائش اور ان کو دیکھ کر تمھارے پاپا اور ان کے 3 بہن بھائیوں کی ضدیں۔ میرے چاروں بچوں میں تمھارے پاپا بہت ضد کیا کرتے تھے۔ سو تم بھی لاڈلے اور ضدی ہو۔

بچہ: دادی اماں! کیا پاپا آپ کو تنگ کرتے تھے۔

دادی: نہیں بیٹا! کیا تنگ کرنا، دراصل یہ تو دنیا کا دستور ہے۔ کل تمھارے پاپا چھوٹے تھے تو ہم انھیں پیار سے منا منا کر نہلاتے تھے۔ وہ خوب روتے تھے کیوں کہ نہانے کے چور جو تھے آنکھ میں اگر صابن چلا جاتا تو سمجھو قیامت۔ اُس وقت تو صابنوں کی اتنی ورائٹی بھی نہیں ملتی تھی۔ پھر انھیں تولیہ میں لپیٹ کر کمرے تک لایا جاتا جہاں کپڑوں کے انتخاب اور کپڑے پہناتے وقت تمھارے پاپا کی ہزاروں ضدیں۔ مت پوچھو کہ کس طرح اپنے چاروں بچوں کے لیے اِدھر اُدھر بھاگتی رہتی؟ ایک کا جوتا نہیں ملتا تو دوسرے کا موزہ۔ کوئی کتاب کہیں رکھ کر بھول جاتا تو اسے تلاش کرنے میں وقت نکل جاتا۔ کسی کا انڈہ دیکھ کر آلو کھانے کا دل چاہتا تو اور کسی کا رات کا سالن دیکھ کر چائے پاپا کھانے کا دل چاہتا۔ بس بیٹا مائیں یہ ساری باتیں اس لیے کرتیں کہ وہ اپنے بچوں کی بہت اچھی پرورش کریں۔ وہ خود دکھ اُٹھا کر اولاد کے لیے سکون کا سامان کرتی ہے۔ اب دیکھو ناں تمھارے پاپا میرا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ دوائیں لانا، پھل کپڑے، دودھ سب کچھ ہی تو لاتے ہیں۔

بچہ: دادی اماں! میری امی بھی تو آپ کا سر دباتیں ہیں۔ آپ کو نہلاتی ہیں۔ پاؤں میں مالش کرتی ہیں آپ کو اچھے اچھے کھانے بنا کر دیتی ہیں ناں۔

دادی: ہاں بیٹا! تمھاری امی یہ سب کچھ اس لیے کرتی ہیں کہ انھوں نے تمھارے پاپا کو خدمت کرتے دیکھا اور اسی طرح شوہر کی راہ پر چل پڑی۔ آج تم چھوٹے ہو۔ تم جو کھانے پینے،

نہانے دھونے، کپڑے بدلنے، کھیل کود اور صبح اٹھنے میں اتنی دیر لگاتے ہو۔ یاد رکھنا کل جب تم بڑے ہو گے تو تمھارے امی اور پاپا ہماری طرح بوڑھے ہو جائیں گے۔ جب تم ان کا بھی اسی طرح خیال رکھو گے، جیسے وہ آج تمھارا رکھتے ہیں کیوں کہ اگر تم نے اپنے والدین کی خدمت کی تو اللہ تعالیٰ تم سے بہت خوش ہوں گے اور تمھیں دنیا کی ساری خوشیاں عطا کر دیں گے ساتھ میں آخرت کا اجر بھی ہوگا۔

بچہ: دادی اماں! میرا آپ سے یہ وعدہ ہے کہ میں بالکل اپنے پاپا اور امی کی طرح ان کا خیال رکھوں گا آپ کا بھی، آپ لوگ تو میرے لیے ویسے بھی آئیڈل ہیں۔ I am proud of my Family میرا آپ سے بھی یہ عہد ہے کہ میں اب آپ سے کبھی ضد نہیں کروں گا۔ کیوں کہ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ آپ میری وجہ سے صبح اور پھر پورے دن پریشان رہتی ہیں۔

خاتون خانہ: ارے نہیں بیٹا! ایسا نہیں کہتے۔ تمھاری شرارتیں اور فرمائش تو ہم سب گھر والوں کی جان ہیں۔ تمھارا بچپن ہی تو ہے کہ تم شرارتی ہو۔ بیٹا بچپن میں حاصل کی جانے والی تعلیم یقیناً اگر اچھی ہو تو آگے چل کر کام آتی ہے۔

بچہ: امی میں نے یہ جان لیا ہے کہ مائیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ وہ چاہے میری امی ہوں یا میرے پاپا کی۔

MOM I LOVE YOU

ماں تجھے سلام ---ماں تجھے سلام!!!

☆☆☆☆

صائمہ الٰہی

پانی ابالنا ضروری ہے

کردار:

سہیل: عمر ۸ سال شرارتی مگر سمجھدار
فرید خان: سہیل کے ماموں، عمر 28 سال، نیوز رپورٹر
آرنلڈ: سہیل کا دوست
اجے: سہیل کا دوست
شیریں: سہیل کی امی

سین نمبر 1

(سہیل کے گھر کا منظر۔۔۔ سہیل کے ڈرائنگ روم میں اجے اور آرنلڈ بیٹھے ہیں۔ سہیل اپنے کمرے میں کولڈ ڈرنک کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوتا ہے اور کہتا ہے)

سہیل: لو آ گئی ہماری ڈرنکس۔۔۔"(سہیل نے ٹرے ٹیبل پر رکھ دی)

اجے: زبردست، تو اب کیا کریں۔"

آرنلڈ: پئیں گے اور کیا۔۔۔"(ہاتھ آگے بڑھا کر ڈرنک کا گلاس اٹھاتے ہوئے)

سہیل: رکو۔۔۔"(چونکا دینے والے انداز میں)

آرنلڈ: "(فوراً رک کر)" کیا ہوا؟"

سہیل: "رکھو اسے نیچے۔"

آرنلڈ: "مگر کیوں؟"

سہیل: "میں نے کہا نا، رکھو اسے نیچے۔"(تحکمانہ لہجے میں)

آرنلڈ: "کیا مذاق ہے یار، کوئی اپنے دوست کے ساتھ ایسا سلوک کرتا ہے بھلا۔"

اجے: "سہیل کے ہاں یہ ممکن ہے۔"

سہیل: ”تم رکھو تو اسے۔“ (گلاس لے کر ٹیبل پر رکھ دیتا ہے)

آرنلڈ: تم یہ ڈرنکس کیا صرف ٹیبل پر سجانے کے لیے لائے ہو۔“ (شکایتی لہجے میں)

سہیل: ”بڑے بے صبرے ہو۔“

اجے: گرمی سے پسینے بہہ رہے ہیں۔“

سہیل: ”مرے کیوں جا رہے ہو یہ تمھارے لیے ہی ہیں۔“

آرنلڈ: ”تو پینے کیوں نہیں دیتے ہو؟“

سہیل: ”کیوں کہ میں بھول گیا ہوں۔“

اجے: ”مطلب؟“ (مچل کر)

آرنلڈ: ”کیا بھول گئے ہو اب تم؟“ (تندی سے)

سہیل: ”میں بھول گیا ہوں کہ میں نے کون سی گلاس میں سے مکھی نکالی تھی۔“

اجے: ”کیا! مکھی؟“ (مینڈک جیسی آنکھیں بنا کر)

آرنلڈ: ”کیا یار، ہمارے گھر میں روز پینے کے پانی میں مکھی دکھائی دیتی ہے۔“

اجے: ”پینے کے پانی میں ---“ (چہرے پر حیرت)

سہیل: ”چھی چھی ---“ (ایسی صورت بناتا ہے کہ جیسے بدہضمی ہو گئی ہو)

آرنلڈ: ”تو اور کیا، اکثر تو کھانے کی پلیٹ میں بھی گر جاتی ہے۔“

اجے: ”کیا بول رہا ہے۔“

آرنلڈ: ”اب ایک مکھی کی وجہ سے سارا پانی اور کھانا پھینک دیں کیا؟“

سہیل: ”پر مکھی تو گندی ہوتی ہے، چھی چھی جانے کہاں بیٹھتی ہو گی۔“

اجے: ”ایک مرتبہ کیا ہوا، پتا ہے۔“

سہیل: ”نہیں پتا۔“

اجے: ”تو سنو، میرے پڑوس کے گھر میں اکثر جایا کرو ویسے تو وہاں دیکھنے میں بہت صفائی کا خیال رکھا جاتا تھا ---“

سہیل: (بات کاٹ کر) ”اچھی بات ہے۔“

اجے: ”بڑے ہی عالی شان گھر کے مالک تھے وہ ---“

سہیل: ‘‘کون؟’’

ا ج: ‘‘بھئی میرے پڑوس والے جن کے گھر۔۔۔۔’’

سہیل: ‘‘اچھا اچھا ہاں، پھر؟’’

ا ج: ‘‘ایک روز میں اپنے والد کے ساتھ ان کے ہاں دعوت پر گیا۔’’

آرنلڈ: تو کیا کھانے میں مکھیوں کا سالن تھا۔’’(مذاقاً)

ا ج: ‘‘سنو تو، ایسا ہی کچھ تھا مگر۔۔۔۔’’

سہیل: کیا؟ اس کا مطلب تم نے مکھیوں کا سالن کھایا۔
(ناک اور بھنویں اوپر چڑھاتے ہوئے پھرتی سے بولا)

ا ج: مجھے بات تو کہنے دو اللہ کے بندہ۔

آرنلڈ: (بات کاٹ کر)’’تو جلدی جلدی کہنا، ورنہ یہ ڈرنکس گرم ہو جائیں گی۔

ا ج: ‘‘بچی بڑے مزے کے کھانے تھے وہاں لیکن جب میں میٹھا کھانے لگا تو۔۔۔۔’’

آرنلڈ: ‘‘اب میٹھے کو کیا ہو گیا؟’’

ا ج: ‘‘بس یار کیا بتاؤں، ایک صاحب ہر رس گلا کھانے کے بعد الٹیاں کیے جا رہے تھے۔’’

سہیل: مگر کیوں؟’’

ا ج: ‘‘اصل میں وہ ان کے گھر کا نوکر تھا جو خوب ڈٹ کر کھا رہا تھا۔’’

سہیل: بات کچھ سمجھ نہیں آئی۔

آرنلڈ: اوئے اجے کے بچے شرافت سے پوائنٹ پر آ جاو رنہ۔۔۔’’(نتھنے پھلاتے ہوئے)

ا ج: ‘‘آ تو رہا ہوں بے صبرو۔۔۔۔تو میں کہاں تھا۔’’

سہیل: ‘‘نوکر کیوں رس گلے کھا کر الٹیاں کر رہا تھا؟’’
(تجسس بھرے انداز میں)

ا ج: ‘‘یہی سوال میرے اور میرے ابو کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔’’

سہیل: :’’تو پھر۔۔۔’’

ا ج: ‘‘میرے ابو نے اس سے پوچھا تو وہ بولا کہ وہ مجبور ہے’’

سہیل: ‘‘اجی مجبوری ہے۔’’

آرنلڈ: ''چل چل آگے بڑھ۔۔۔'' (تنگ آکر)

ا۔ ج: ''اس نے بتایا کہ اس نے چینی کھلی چھوڑ دی تھی۔''

سہیل: ''چینی؟''

ا۔ ج: ''ہاں چینی کھلی چھوڑنا مکھیوں کو دعوت دینا ہے۔''

سہیل: ''صحیح بولا۔''

آرنلڈ: سہیل تو بار بار بیچ میں کیوں بولتا ہے، جلدی اسے قصہ ختم کیوں نہیں کرنے دیتا۔

سہیل: تجھے جلدی کیا ہے؟'' (سر پہ ہاتھ مار کر)

ا۔ ج: آگے تو سنو۔

ا۔ ج: اس چینی کی بوری میں اتنی مکھیاں آئیں، اتنی کہ۔۔۔

سہیل: جتنے جنگ میں فوجی۔'' (خوش ہوکر)

ا۔ ج: ہاں اور ساری مکھیوں نے ایک ہی رات میں ساری چینی چٹ کر لی۔

سہیل: یہ تو کمال ہو گیا بھئی۔ ہمیں تو ان مکھیوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ان کی فوج بنا کر دشمنوں پر چھوڑ دینی چاہیے۔

آرنلڈ: کون سے دشمن کہاں کے دشمن کیوں فضول کی بک بک کر رہے ہو تم دونوں۔
(اکتاہٹ کا شکار ہو کر سر پکڑ لیتا ہے)

ا۔ ج: آگے سنو، مالک چینی دیکھنے کے لیے جیسے ہی گودام میں آیا اپنی چینی کی کھلی بوری پر ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں مکھیوں کو دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا اور غصے میں تمام مکھیوں کو قید کروا دیا۔

سہیل: مطلب کہ مکھیاں قیدی بنا دی گئیں۔

ا۔ ج: ہاں

سہیل: مگر اس نے ایسا کیوں کیا، بدلہ لینے کے لیے۔

ا۔ ج: ہاں بدلہ لینے کے لیے۔

سہیل: مگر کس نے نوکر، سے یا مکھیوں سے؟'' (سوچتے ہوئے)

ا۔ ج: دونوں سے۔

آرنلڈ: (ہاتھ جوڑ کر) خدا کے واسطے! کیوں مکھیوں کے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہو، جانے دو اسے پلیز۔

ا۔ج: قسم سے میں نے تو ہاتھ نہیں دھوئے۔ (چھیڑتے ہوئے)

سہیل: نہ میں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا ہوں، یہ قصہ ہے، سمجھا کر۔

آرنلڈ: (سر پکڑ کر) ’’اف خدا میں کہاں پھنس گیا۔‘‘

سہیل: تم کہاں پھنسے ہو؟ پھنسی تو مکھیاں ہیں۔ (شرارت کرتے ہوئے)

ا۔ج: ہاں۔۔۔اس کے بعد مالک نے نوکر سے کہا کہ مکھیاں ضائع نہیں کی جائیں گی۔‘‘

سہیل: تو پھر کیا کیا جائے گا؟‘‘ (آنکھیں پھاڑ کر)

ا۔ج: بھئی شوگر کا مسئلہ تھا پوری چینی ان مکھیوں نے چٹ کر لی تھی تو ضائع کیسے کر دی جاتی۔

سہیل: واقعی چینی بہت مہنگی ہے، مگر ان مکھیوں کا کیا فائدہ تھا؟‘‘

ا۔ج: یہی بات تو ہم پر عیاں ہوئی کہ وہ نہایت ہی کنجوس مالک تھا۔‘‘

سہیل: مطلب کہ اس نے۔۔۔آ۔۔۔‘‘ (کہتے کہتے بھول جاتا ہے)

ا۔ج: ’’رہنے دو یار میں بتا رہا ہوں۔ تو اس نے رس گلے کے لیے شیرا ان مکھیوں کا ہی بنوایا۔

سہیل: نہیں نہیں تو اب پھینک رہا ہے۔

آرنلڈ: میں کیا یوں ہی بک رہا تھا، اس سے بڑھ کر پھینکنے والا اور کون ہوگا۔‘‘ (خوش ہو کر جیسے کوئی مقابلہ جیت لیا ہو)

ا۔ج: قسم سے یار یقین کر نوکر اپنے مالک کی دی ہوئی سزا کا شکار تھا۔‘‘

سہیل: اللہ چینی سب کو دے مگر ایسا مالک کسی کو نہ دے۔

آرنلڈ: اللہ ایسا گھٹیا قصہ بھی کسی اور کو نہ سنائے، آمین ثم آمین۔

سہیل: مجھے سمجھ نہیں آ رہا آج آرنلڈ اتنا جلا ہوا کیوں ہے۔

ا۔ج: گرمی میں انسان کے ساتھ ساتھ جانور بھی ہڑبڑا جاتے ہیں۔

آرنلڈ: تیرا مطلب کیا ہے؟ (منہ بنا کر)

سہیل: ’’مطلب چھوڑ یہ شربت پی، مجھے یاد آ گیا ہے کہ جس گلاس میں مکھی گری تھی وہ شربت میں نے پھینک دیا تھا۔‘‘

آرنلڈ: ’’بہت جلدی یاد آ گیا ہے۔۔۔اتنی بکواس سننے کے بعد۔‘‘ (ناراضگی والے انداز میں)

سہیل: اب بتا تو دیا نا۔۔۔‘‘

اجے: (جلے پر نمک چھڑکنے کے لیے) ''اور نہیں تو کیا پیا ہے پیو ورنہ۔۔۔''

سہیل: (بات کاٹ کر) ورنہ پینے والے اجے جیسے بھی ہیں۔

(کمرے میں سہیل کی امی داخل ہوتی ہے)

امی: تم لوگوں نے شربت ابھی تک نہیں پیا!۔'' (حیرت سے)

آرنلڈ: ''آنٹی یہ سب ان دونوں کی کارستانی ہے۔''

اجے: ''آنٹی سہیل بھی شربت اچھا بنا لیتا ہے۔''

(سہیل کی امی سہیل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہیں، سہیل اشارے سے اپنی امی کو خاموش رہنے کو کہتا ہے)

سین نمبر 2

(سہیل کی امی کچن میں کام کر رہی ہیں اسی دوران میں میں گرمی کی شکایت کے لیے کچن میں آتا ہے)

سہیل: اف یہ گرمی۔۔۔'' کھجلی کرتے ہوئے)

امی: (طنز کرتے ہوئے) ''گرمی میں گرمی نہیں تو کیا سردی ہوگی۔''

سہیل: (روہانسے لہجے میں) ''گرمی تو تھی ہی، اب لائٹ بھی چلی گئی۔''

امی: ''ایسا بھی ہوتا ہے بیٹا'' (تسلی دیتے ہوئے)

سہیل: کیوں ہوتا ہے؟ (طیش میں آکر)

امی: ارے غصہ مت کرو، ورنہ دماغ گرم ہو جائے گا۔''

سہیل: تو کیا کروں۔

امی: لو یہ شربت پی لو تھوڑا سکون ملے گا۔ (فریج سے گلاس نکال کر دیتے ہوئے)

سہیل: ابھی تو پیا تھا۔ (واپس فریج میں رکھ دیتا ہے)

امی: ہوں۔۔۔ویسے تم نے اپنے دوستوں سے جھوٹ کیوں بولا؟''

سہیل: کیسا جھوٹ؟ (ان جان بنتے ہوئے)

امی: شربت والا جھوٹ جو تم نے اپنے دوستوں سے بولا۔

سہیل: اچھا اچھا وہ، وہ تو بس میں نے ایسے ہی۔۔۔

امی: خبردار آئندہ کسی بھی طرح کا جھوٹ بولا تو۔۔۔۔

سہیل: امی وہ چھوٹا سا مذاق تھا۔

امی: جھوٹ کا سائز نہیں ہوتا جھوٹ جھوٹ ہے، سمجھے؟

سہیل: آپ ناراض نہ ہوں میں آیندہ خیال رکھوں گا۔

امی: شاباش! (تھپکی دیتی ہیں)

سہیل: آپ یہاں گرمی میں کیا کر رہی ہیں؟

امی: دیکھتے نہیں پانی ابل رہا ہے۔

سہیل: تو اسے ابال کیوں رہی ہیں، امی جان؟

امی: بیٹا آج کل پانی بے حد بدبودار اور آلودہ آ رہا ہے اس لیے ابال رہی ہوں۔

سہیل: اس کا مطلب پانی ابالنے سے صاف ہو جاتا ہے۔

امی: ہاں، کیوں کہ صحت زندگی کے لیے صحت افزا پانی ضروری ہے۔

سہیل: اگر میں پانی بغیر ابالے پی لوں تو کیا ہوگا؟''

امی: تمھیں پیٹ کی مختلف بیماریاں آ گھیریں گی۔

سہیل: (گھبرا کر) ''پیٹ کی بیماریاں؟''

امی: ہاں ان بیماریوں میں پیٹ درد، قے ہونا، گیسٹرو، ٹائیفائڈ، یرقان، انتڑیوں کی سوزش وغیرہ شامل ہیں۔

سہیل: اتنی ساری بیماریاں، وہ بھی صرف پانی سے۔

سہیل: اس کا مطلب پانی بھی انسان کے لیے خطرہ بن رہا ہے۔

امی: بیٹا پاکستان میں 4 فی صد متعدی (Communicable) بیماریاں پینے کے پانی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

سہیل: امی کیا اس سے موت بھی واقع ہو جاتی ہے؟''

امی: بالکل اگر احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو پھر ڈاکٹر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔

سہیل: ارے باپ رے! یہ تو بڑی غور طلب بات نکلی۔

(ابلتے پانی کو گھورتے ہوئے سہیل پانی کو مسلسل گھورے جا رہا تھا۔)

امی: تم کیا سوچنے لگے؟''

سہیل: میں سوچ رہا ہوں اب اسکول میں پانی پیوں یا نہیں۔

امی: تو کیا تم اسکول کا گندہ پانی پیتے ہو، میں جو تھرماس بھر کے دیتی ہوں کیا تم وہ نہیں پیتے؟''
(تعجب کا اظہار کرتے ہوئے)

سہیل: وقفہ بریک سے قبل ہی ختم ہو جاتا ہے۔

امی: تمھیں مجھے بتانا تو چاہیے تھا۔

سہیل: آپ مجھے تو دے دیں گی مگر دوسرے لوگ بھی وہی پانی پیتے ہیں۔

امی: اس کے بارے میں تمھارے اسکول کی انتظامیہ کو سوچنا چاہیے۔

سہیل: مگر وہ آپ کی طرح نہیں سوچتے۔

امی: سوچیں گے بھئی تمھاری تو پرنسپل صاحب سے دوستی ہے نا، تم ان سے بات کرو۔

سہیل: مجھے واقعی انھیں اس اہم معاملے کی طرف متوجہ کرنا چاہیے۔

امی: اور بچوں کو بھی آگاہ کرو۔

سہیل: (مچل کر) ''ابھی تو مجھے پیاس اور گرمی لگ رہی ہے۔''

امی: یہ لو ٹھنڈا پانی، گرمی میں زیادہ سے زیادہ پانی پیو۔

سہیل: اچھا امی جی۔

سین نمبر 3

(سہیل اپنے ماموں فرید کے گھر بیٹھا ہے فرید ماموں اپنے روم میں کمپیوٹر پر اپنے کسی پروجیکٹ کو بنانے میں بزی ہیں، سہیل کمرے میں منہ لٹکائے آتا ہے اور چپ چاپ بیڈ پر بیٹھ جاتا ہے۔۔۔ماموں سہیل کی غیر معمولی خاموشی دیکھ کر بولے)

فرید: (کمپیوٹر سے نظر ہٹائے بنا) ''کیا ہوا جناب کو؟''

سہیل: (دبی آواز میں) ''کچھ نہیں۔''

فرید: ہار کر آ رہے ہو کیا؟

سہیل: (بگڑ کر) ہار کر! مقابلے کے بغیر جیت کیسی؟''

فرید: تو مسئلہ کیا ہے؟

سہیل: مسئلہ پانی کا ہے۔

فرید: کیوں بھئی، یہاں کسی نے پانی پینے پر پابندی لگا دی ہے کیا؟

سہیل: یہاں کسی کی مجال جو مجھے پانی پینے سے روکے۔
(برا منہ بناتے ہوئے)

فرید: صحیح کہا، یہ کام تو تمھارا ہے۔ (چھیڑتے ہوئے)

سہیل: دیکھیں ماموں آپ زیادہ مجھے غصہ نہ دلائیں، میں ویسے بھی۔۔۔۔''

فرید: (بات کاٹ کر) 'جانتا ہوں پریشانی چہرے سے ٹپک رہی ہے۔''

سہیل: (معصومیت سے) ''کیا میرے چہرے سے پریشانی ٹپک رہی ہے؟'' (ہاتھ چہرے پر ملتے ہوئے)

فرید: آئینہ دیکھ لو پتا لگ جائے گا۔

سہیل: رہنے دیں (غمگین لہجے میں) یہ کوئی مسئلہ نہیں۔''

سہیل: ''میری کوئی نہیں سنتا، آپ بھی نہیں۔''

فرید: تو اتنی دیر سے کس الو کی سن رہا ہوں۔

سہیل: مجھے نہیں پتا۔

فرید: (کمرے سے باہر دھکیلتے ہوئے) ''نہیں پتا تو چلو نکلو باہر۔ مجھے کام کر دو۔''

سہیل: سوری سوری، مجھے پتا ہے۔''

فرید: بولو ذرا جلدی، وقت قیمتی ہے میرا۔

سہیل: اندر آنے تو دیں، آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ (اندر آ کر)

فرید: (نشست سنبھال کر) بولو۔

سہیل: میں نے اسکول کے بچوں کو پانی ابال کر پینے کا حکم دیا تو میری کسی نے نہیں سنی۔''

فرید: تمھیں حکم دینے کی ضرورت کیا تھی، شرافت سے بات نہیں ہوتی، ہر جگہ (Dictatorship) کام نہیں آتی۔''

سہیل: ''میں تو ایسا ہی ہوں۔ اب''

فرید: تو ایسا نتیجہ ملے گا، اچھا کیا تم نے پانی ابال کر پینے کی وجہ بتائی تھی؟''

سہیل: نہیں۔

فرید: ننھے سہیل سب تمھارے جیسے ہی ہیں۔

سہیل: کیا؟

فرید: بے خبر۔

سہیل: میں سب جانتا ہوں، امی نے مجھے باخبر کیا ہے۔

فرید: بدھو اگر تمھیں امی نہ بتاتیں تو پتا کیسے چلتا۔
(سہیل کی ناک کھینچتے ہوئے)

سہیل: تو یہ ہے تو اب میں کیا کروں۔

فرید: اگر معلومات سے آگہی دینی ہے تو، کیا کیوں کیسے کے فارمولے کو سمجھو۔

سہیل: ایسا میں نے سوچا ہی نہیں۔

فرید: انھیں بتاؤ کہ پانی آلودہ ہے، پھر اس کے پینے سے کیا مضر اثرات ہو سکتے ہیں اور پھر اس کے حل میں یہ بتاؤ کہ ہم پانی کو اچھی طرح ابال کر پئیں تو صحت مند رہ سکتے ہیں۔

سہیل: اب میں سمجھ گیا۔

فرید: تو بیٹھے کیوں ہو، نکلو یہاں سے۔۔۔'' (باہر نکالتے ہوئے)

(فرید سہیل کو کمرے سے باہر نکال کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔۔۔ تھوڑی دیر بعد سہیل پھر اندر گھس کر مذاقاً پوچھتا ہے)

سہیل: ماموں، ہم پانی کو ابالنے کی بجائے دھو کر استعمال کریں تو۔۔۔''

فرید: لگتا ہے مجھے تمھیں دھونا پڑے گا۔'' (سہیل کے پیچھے لپکتے ہیں، سہیل جان بچانے کو دوڑتا ہے۔۔)

☆☆☆☆

سیّد احمد شاہ پطرس بخاری

لندن کی ٹیوب

لندن دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہاں کی آبادی اس قدر گنجان ہے اور بازاروں میں اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ آمدورفت مشکل ہو جاتی ہے۔ تمام بازار اِس کنارے سے اُس کنارے تک موٹروں سے بھرے رہتے ہیں۔ صبح کے وقت جب لوگ کاروبار کے لیے گھر سے نکلتے ہیں یا شام کے وقت جب وہ اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں تو بازاروں میں اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ موٹروں کو بہت آہستہ آہستہ چلانا پڑتا ہے۔

اِس مشکل کو دُور کرنے کے لیے زمین کے نیچے بھی ریل گاڑیاں چلتی ہیں۔ لندن کے بڑے بڑے بازاروں کے نیچے کئی میل لمبی سرنگیں کھدی ہیں۔ ان میں ریل گاڑیاں بجلی کے ذریعے بہت تیز رفتاری سے سفر کرتی ہیں۔

سٹیشن زمین کے اوپر بنا ہوتا ہے۔ یہاں پہلے ٹکٹ خریدتے ہیں اور پھر ایک کمرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جو تار کے رسوں سے لٹکا ہوتا ہے۔ جب سب لوگ اس کمرے میں آ جاتے ہیں تو دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ پھر بجلی کے ذریعے یہ کمرہ زمین کے نیچے چلا جاتا ہے۔ اِس کمرے کو لفٹ کہتے ہیں۔ لفٹ نیچے اُترتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آدمی اُس گہرائی تک پہنچ جاتا ہے جہاں ریل کی سُرنگیں بنی ہیں۔

یہاں لفٹ کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے لوگ باہر نکل آتے ہیں۔ اب سامنے ریل کا پلیٹ فارم ہے۔ جہاں پہلے سے کئی لوگ گاڑی کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ پلیٹ فارم اور ریل کی پٹڑی سب کچھ زمین کی سطح سے کئی سو فٹ نیچا ہے۔ پھر بھی بجلی کی روشنی سے بالکل دن چڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہوا کی آمدورفت کا انتظام اتنا اچھا ہوتا ہے۔ کہ بعض اوقات کپڑے اُڑنے لگتے ہیں۔

ریل آ کر پلیٹ فارم پر ٹھہر جاتی ہے۔ تو ہر ایک ڈبے کا دروازہ بجلی کے ذریعے خود بخود کُھل جاتا ہے۔ پہلے اُترنے والے اُتر جاتے ہیں۔ پھر نئے مسافر سوار ہو جاتے ہیں۔ دروازے پھر بند ہو جاتے ہیں اور گاڑی روانہ ہو جاتی ہے۔

اس گاڑی کی رفتار اس قدر تیز ہوتی ہے کہ چلتی گاڑی میں کھڑا ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ بعض اوقات بھیڑ

زیادہ ہوتی ہے اور سب کے بیٹھنے کو جگہ نہیں ہوتی اس لیے بعض لوگوں کو کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ اس لیے چھت سے تسمے لٹکے رہتے ہیں تا کہ لوگ ان کو تھام لیں اور گرنے نہ پائیں۔

آن کی آن میں ریل اگلے سٹیشن پر پہنچ جاتی ہے۔ وہاں لوگ ریل سے اُتر کر لفٹ میں داخل ہو جاتے ہیں اور پھر یہ لفٹ اوپر کو چڑھنا شروع کرتا ہے۔ تھوڑی دیر میں مسافر زمین کے اوپر آجاتے ہیں۔

یہ سُرنگیں زمین کی سطح سے اس قدر نیچی ہیں کہ اگر انسان سیڑھیوں کے ذریعے چڑھے اُترے تو بہت ہی تھک جائے۔ اس لیے لفٹ استعمال کیے جاتے ہیں۔ بعض جگہ سیڑھیاں بھی لگی ہیں۔ لیکن ان پر اُترنا چڑھنا نہیں پڑتا۔ سیڑھیاں خود ہی نیچے اُترتی چلی جاتی ہیں۔ مسافر سیڑھی پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور بغیر قدم اٹھائے نیچے پہنچ جاتے ہیں۔ اوپر چڑھنے کے لیے بھی اسی طرح کی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔

اس ریل کو انگریزی میں ٹیوب کہتے ہیں۔ ٹیوب کے معنی نلکی کے ہیں۔ چوں کہ یہ ریل سُرنگ میں چلتی ہے جو بہت بڑی نلکی کی طرح ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا یہ نام پڑ گیا۔

☆☆☆☆

شفقت تنویر مرزا

احمد خان کھرل

ستمبر کے مہینے کی بعض تاریخیں پاکستان کے لیے بڑی اہم ہیں۔ مثلاً ۱۹۶۵ء میں بھارت سے پاکستان کی سترہ روز کی جنگ ہوئی تھی۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت نے پاکستان (لاہور۔۔۔واہگہ کا محاذ) پر اس لیے حملہ کر دیا تھا کہ پاکستان نے بھارت سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرنے والے کشمیریوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس سے پہلے ۱۹۴۸ء میں پاکستان بننے کے صرف ایک سال بعد ۱۱ ستمبر کو قائداعظم محمد علی جناح کا انتقال ہو گیا تھا اور اس محرومی کے سبب کے ساتھ ہی یہ نیا جنم لینے والا ملک اچھے لیڈروں سے محروم ہو گیا اور اس محرومی کے سبب ہی پاکستان ۱۹۷۱ میں دو ٹکڑے ہو گیا آج بھی پاکستان کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ اسے قائداعظم جیسا دوسرا لیڈر نصیب نہیں ہوا۔

پاکستان کے لیے ستمبر کا مہینہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف پورے برصغیر پاک و ہند میں جو بغاوت یا جنگ آزادی شروع ہوئی تھی اس کا انجام قریب آ رہا تھا۔ اصل میں یہ جنگ ان فوجیوں نے شروع کی تھی جو ۱۸۵۷ء سے انگریز کے ساتھ تھے ان میں ہندو مسلمان بھی شامل تھے اور اس فوج میں زیادہ تر نفری بھارتی صوبہ یوپی، مدراس اور نیپالی گورکھوں کی تھی۔ ان فوجیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تو ان کی جگہ اپنے پرانے حاکموں (مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر) کو دوبارہ اصلی حاکم بنانے کا اعلان بھی کیا۔

پاکستان کا صوبہ پنجاب اور سرحد انگریزوں نے ۱۸۴۶ء میں فتح کیا تھا، برصغیر کے باقی سارے علاقے (سندھ بلوچستان سمیت) انگریزوں نے ۱۸۴۰ سے ۱۸۵۷ء کے درمیان فتح کر لیے تھے۔ پنجاب پر قبضے کے بعد ۱۸۵۷ء کی بغاوت شروع ہو گئی۔ چناں چہ دیسی فوج نے سیالکوٹ، لاہور، جہلم، راولپنڈی، ایبٹ آباد، ملتان وغیرہ میں آنکھیں دکھائیں باقاعدہ لڑائی اور بعض جگہوں پر انگریزوں نے خوف کے تحت ان سے ہتھیار رکھوا لیے۔

غیر فوجی حلقوں میں جن غیر مسلح دیسی لوگوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا ان میں سب

سے نمایاں ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ، ضلع فیصل آباد اور جھنگ، ضلع اوکاڑہ اور ضلع پاک پتن اور ضلع ساہیوال میں تین بڑے قبیلے کھرل، وٹو اور سیال تھے جو ساٹھ ستر سال بوڑھے سردار احمد خان کھرل کی سرداری میں اکٹھے ہوئے اور دیسی ہتھیاروں (تلوار، ڈانگ، اور کہیں کہیں پرانی قسم کی بندوق) کے ساتھ ہی توپ اور بندوق والی انگریزی فوج کے ساتھ بھڑ گئے۔

احمد خان کھرل ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ قصبہ جھامرہ کا رہنے والا تھا جو اپنے قبیلے کا چھوٹا سردار بھی تھا۔ احمد خان نے سکھوں کے اقتدار کا زمانہ بھی دیکھا تھا جب سکھوں کا حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ ادھر سے گزر کر ملتان گیا تھا تو اس کے سپاہیوں کا کھرلوں سے جھگڑا ہو گیا۔۔۔ سکھ فوج کچھ کھرلوں کو پکڑ لے گئی احمد خان کو خبر ہوئی تو اس نے مہاراجہ کی فوج کا پیچھا کیا اور مہاراجہ تک پہنچ کر کہا کہ اس کے بندے چھوڑ دیئے جائیں ورنہ رنجیت سنگھ اور اس کی فوج کو ادھر سے گزرنے ہی نہیں دیا جائے گا۔ رنجیت سنگھ کو کھرلوں خاص کر احمد خان کی مخالفت اور مزاج کا علم تھا اس نے قید کیے گئے کھرل اسی وقت رہا کر دیے جو احمد خان کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔

رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد سکھ حکومت، حکومت کی بجائے افراتفری بن گئی، اس زمانے میں پنجاب اور سرحد کے لوگ اس افراتفری سے سخت بیزار ہو گئے پھر سکھوں کے اندر ہی ایک دوسرے کے مخالف دھڑوں نے انگریز کی مدد سے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی سازشیں شروع کر دیں، ان سازشوں کے باعث انگریزوں نے پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا اور افراتفری کے مارے پنجابیوں اور پٹھانوں نے جو سکھوں کے ہاتھوں پریشان تھے، نئے آنے والوں کا کچھ ساتھ دیا جن میں احمد کھرل بھی شامل تھے۔

لیکن پانچ سات سال کے اندر احمد خان کھرل جیسے لوگوں کو محسوس ہوا کہ انگریزوں نے بنگال سے لے کر دہلی اور پھر پنجاب تک ہر جگہ مسلمانوں سے اچھا سلوک نہیں کیا ان کے کچھ مقابلے میں ہندوؤں اور دوسرے لوگوں سے سلوک بہتر تھا۔ دراصل انگریز سرکار کی سیاست یہی تھی اور یہی ہو سکتی تھی۔ احمد خان پنجاب میں انگریز کی حکومت سے بےزار ہو گیا اور جب آگرہ کی جیل سے رہا ہو کر آنے والے ضلع ساہیوال ہی کے باشندے نے کھرل کو بتایا کہ میرٹھ اور دلی میں فوجوں نے بغاوت کر دی ہے تو احمد خان نے علاقے کے قبائلی سرداروں کو للکارا علاقے میں زمین اور مالیہ دینے کے سوال پر لوگ خصوصاً وٹو قبیلہ پہلے ہی پریشان تھا اور مالیہ دینے سے انکار (بائیکاٹ) پر بہت سے وٹو جیل میں ڈال دیئے گئے تھے۔ لوگوں میں یہ بےچینی موجود تھی، احمد خان نے اپنی کوشش سے بہت سے لوگوں کو اکٹھا کیا اور انگریز حاکموں، ان کے دیسی ایجنٹوں کے خلاف گوریلا

جنگ، شروع کردی یہ جنگ بھی مئی ۱۸۵۷ء ہی کے دنوں میں شروع ہوگئی۔

انگریز نے اپنی فوج، سکھوں اور علاقے کے ہندوؤں کی مدد سے احمد خان کھرل اور بے شمار دوسرے لوگوں کو دھوکے سے گرفتار کر کے گوگیرہ جیل (اس وقت ضلع کا ہیڈ کوارٹر گوگیرہ میں تھا) میں رکھا۔ جولائی اگست انگریزوں سے لڑنے میں گزرے، انگریزوں نے لاہور اور ملتان سے بڑی کمک بھی طلب کر لی، احمد خان کھرل نے ساتھ کے علاقے ریاست بہاول پور کے نواب سے امداد مانگی مگر نواب صاحب نے انگریز سے دوستی نبھائی اور کھرل کو مایوس کر دیا۔ احمد خان کھرل اور اس کے لشکر کو چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش جاری تھی جب کہ احمد خان کھرل نے ہڑپہ اور جھامرہ چیچہ وطنی، گوگیرہ کے درمیان بار ہا سرکاری فوجوں کو زچ کیا اور ان کے درجنوں سپاہی اور افسر ہلاک کر دیے۔ دلی میں جنگ آزادی ۱۲ستمبر تک ختم ہو چکی تھی، بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو انگریز نے برطرف کر کے قید کر لیا تھا۔ لیکن پنجاب میں یہ جنگ ابھی جاری تھی۔

۲۱ستمبر ۱۸۵۷ء کو گشکوری کے جنگل کے پاس احمد خان کھرل اور سرکاری فوج کے درمیان بڑا مقابلہ ہوا انگریز فوج کے کئی آدمی مارے گئے، وہ پیچھے ہٹ گئے، احمد خان کھرل اور اس کے ساتھیوں نے ان کا پیچھا کیا تاہم جب خطرہ ٹل گیا تو نماز پڑھنے کے لیے رک گیا۔۔۔ گشکوری کے جنگل کے پاس ۲۱ستمبر کی سہ پہر کو احمد خان کھرل نماز پڑھتے ہوئے انگریزی فوج اور انگریز ایجنٹ جاگیردار گلاب رائے بیدی کی گولی سے شہید ہوئے۔ یوں ۱۸۵۷ء میں پنجاب میں جنگ آزادی کا ایک بے مثال لیڈر اور کمانڈر شہید ہوا، جس کے جوان بچوں اور سپاہیوں کو کالا پانی بھیج دیا گیا، جس کے گاؤں (جھامرہ) کو آگ لگا دی گئی اور جس کی لاش کے ٹکڑے کر کے مختلف جگہوں پر چھپا کر دفن کر دیے گئے تا کہ اس کے پیروکاروں کا پتہ نہ چل جائے اور وہاں مجمعے نہ لگنے شروع ہو جائیں۔

☆☆☆☆

طالب ہاشمی

ایک درویش وزیر

پاکستان کے قیام سے پہلے ہندوستان میں بیسیوں ریاستیں تھیں، جن پر انگریزوں کی منظوری سے راجے اور نواب حکومت کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر ریاستیں ہندوؤں کی تھیں۔ مسلمانوں کی ریاستیں بہت کم تھیں۔ ان ہی میں ایک ریاست بھوپال تھی۔ جس کا رقبہ تقریباً سات ہزار مربع میل تھا۔ یہ ایک خوش حال ریاست تھی۔ ۱۸۴۴ عیسوی میں بھوپال کے نواب جہانگیر محمد خاں نے وفات پائی۔ ان کا کوئی لڑکا نہیں تھا، اس لیے ان کی بیوہ سکندر بیگم بھوپال کی حکمران بنیں (سکندر بیگم، بھوپال کے پچھلے حکمران نواب نظیر محمد خاں کی بیٹی تھیں) نواب سکندر بیگم کے بعد نواب شاہ جہاں بیگم اور ان کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم بھوپال کی حکمران رہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نہ نواب سکندر بیگ کا کوئی بیٹا تھا اور نہ نواب شاہ جہاں بیگم کا۔) ۱۸۴۷ء میں ریاست بھوپال کے بڑے وزیر (وزیر اعظم) فوج دار محمد خاں نے استعفیٰ دیا تو ان کی جگہ منشی جمال الدین خاں ریاست کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ منشی صاحب بڑے عالم فاضل، پرہیز گار تھے، سادہ مزاج اور علم دوست آدمی تھے۔ لائق اتنے تھے کہ جب وزیر اعظم بنے تو ریاست کی مالی حالت بہت خراب تھی، لیکن انھوں نے ریاست کا انتظام ایسے اچھے طریقے سے چلایا کہ اس کی آمدنی پندرہ لاکھ سالانہ سے بڑھ کر ساٹھ لاکھ تک پہنچ گئی۔

منشی صاحب کہنے کو تو وزیر اعظم تھے اور ان کو بڑے اختیار حاصل تھے، لیکن وہ اتنے سادہ مزاج تھے کہ انھوں نے اپنے دفتر سے ایسا تمام سامان اٹھوا دیا، جس سے شان و شوکت ظاہر ہوتی تھی اور اس کی جگہ سادہ فرش بچھوا کر گاؤ تکیے رکھوا دیے تاکہ وزیر اعظم اور عام حاضرین میں کوئی فرق معلوم نہ ہو۔ لباس اتنا سادہ ہوتا کہ کوئی ناواقف آدمی ان کو دیکھ کر یقین نہیں کرتا تھا کہ وہ ریاست کے وزیر اعظم ہیں۔ اگر کبھی ریاست کی والیہ کی طرف سے قیمتی کپڑے تحفے میں ملتے تو وہ ان کپڑوں کو غریبوں میں بانٹ دیتے تھے اور خود اپنے سادہ لباس ہی میں رہتے تھے۔ خوشامد کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

ایک بار کوئی صاحب اپنا ایک کام لے کر آئے اور کام بتا کر کہنے لگے: ''منشی صاحب! آپ بڑے آدمی ہیں۔ سب کچھ آپ کے اختیار میں ہے۔''

یہ سن کر انھوں نے دفتر کے ملازم سے کہا: ”نیچے بڑھئی کام کر رہے ہیں، کسی بڑھئی سے کہنا کہ ذرا آری اور تیشہ لے کر یہاں آ جائے۔ جب بڑھئی آ گیا تو اس سے کہا: ”یہ صاحب کہتے ہیں کہ میں بڑا آدمی ہوں، میں ان کے برابر کھڑا ہو جاتا ہوں تو کاٹ چھانٹ کر کے مجھے ان کے برابر کر دے۔“

اب بڑھئی خاموش اور وہ صاحب اپنی جگہ حیران کہ وزیرِ اعظم صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ پھر منشی صاحب نے ان صاحب سے کہا: ”بھائی! انسان انسان سب برابر ہیں۔ بڑا وہی ہے جو اللہ کے نزدیک بڑا ہو۔“ منشی صاحب ہمیشہ مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے۔ اگر کبھی کسی وجہ سے مسجد جانے میں دیر ہو جاتی وہ اپنی آستینیں اسی طرح چڑھائے ہوئے دوسری مسجد میں جا کر پوچھتے کہ جماعت ہو گئی؟ اگر جواب ملتا ”نہیں“ تو مسجد کے اندر جا کر جماعت میں شریک ہو جاتے اور اگر جواب ملتا کہ جی ہاں، ہو چکی ہے تو تیسری اور چوتھی مسجد میں جا کر پوچھتے، یہاں تک کہ کہیں نہ کہیں جماعت مل جاتی۔ کہتے ہیں کہ اگر اس مقصد کے لیے ان کو سارے شہر کی مسجدوں تک پیدل جانا پڑتا تو وہ چلے جاتے۔ حفاظت کرنے والے سپاہی اور ملازم ان کے پیچھے پیچھے بھاگتے رہتے۔

منشی صاحب عام طور پر محل کے قریب مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ وہاں کبھی کبھی جمعے کی نماز سے پہلے وعظ بھی کرتے تھے۔ ایک جمعے کا ذکر ہے کہ وہ منبر پر کھڑے ہوئے اور یوں وعظ شروع کیا:

”بھائیو! آپ ہمیں جانتے ہیں ہم اس ریاست کے وزیرِ اعظم ہیں۔ اتنی بڑی ہماری تنخواہ ہے۔ اتنی بڑی ہمیں جاگیر ملی ہوئی ہے۔ ہم شاہی محل میں رہتے ہیں۔ ہماری حفاظت کے لیے فوج اور پولیس کے دستے مقرر ہیں۔ ہم جسے چاہیں جاگیر دے دیں اور جس کی جاگیر چاہیں ضبط کر لیں۔ ہمارا یہ اختیار ہے اور وہ اختیار ہے۔“

ان کی تقریر سن کر نمازی حیران تھے کہ یہ آج منشی جی کو کیا ہو گیا۔ کیسی غرور اور تکبر والی باتیں کر رہے ہیں۔ اب ایسی باتوں کے بعد یکایک منشی صاحب نے اپنی تقریر کا رنگ بدل دیا اور بولے:

”آپ نے ہماری شان و شوکت کا حال سن لیا۔ اب ہماری اصل حقیقت بھی سن لیجیے۔ آپ جیسے صاحبوں کے ٹکڑوں پر پل کر کئی سال تک طالب علمی کرتے رہے۔ پڑھ لکھ کر جگہ جگہ کی خاک چھانی، مگر کسی نے ہمیں نوکری کے قابل نہ سمجھا۔ بھوپال میں ایک بیمار اونٹنی پر سوار ہو کر آئے۔ یہاں بھی کسی نے گھاس نہ ڈالی۔ بہت دنوں کے بعد ایک معمولی سی نوکری مل گئی، پھر اللہ تعالیٰ نے اس درجے تک پہنچا دیا، لیکن بیگم صاحب

(ریاست کی حکمراں) ذرا ناراض ہو جائیں تو ہمیں فوراً نوکری سے جواب دے دیں۔ ہماری جاگیر ضبط کر لیں۔ ہمیں محل سے نکال دیں اور ایک معمولی سپاہی ہمیں ریاست کی سرحد سے باہر چھوڑ آئے اور ہم وہی جمال الدین رہ جائیں جو پہلے تھے۔ تو بھائیو! یہ ہے حقیقت ہماری عزت اور ہمارے عہدے کی، جس پر ہم اتنا ناز کر رہے تھے اور جسے ایک عورت ایک لمحے میں چھین سکتی ہے۔ یاد رکھو، اصل عزت وہ ہے جو ہمیشہ قائم رہے۔ اس عزت کو حاصل کرنے کے لیے اپنے خالق و مالک کو راضی کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ عزت اور ذلت صرف اسی پاک ذات کے ہاتھ میں ہے۔" یہ تقریر سن کر لوگوں کے دلوں میں منشی صاحب کی عزت اور بڑھ گئی۔

ایک بار ایک دعوت میں حکومت کے سارے وزیر، امیر اور عہدے دار جمع تھے اور دسترخوان ان کے سامنے بچھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک بھنگی آیا اور منشی صاحب کے پاس جا کر کہنے لگا کہ جناب! میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں، آپ مجھے مسلمان کر لیں۔ منشی صاحب نے فوراً کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا اور خادم سے کہا: "اسے ہمارے گھر سے اچھا سا لباس لے کر پہنا دو اور اس کے ہاتھ دھلوا کر دسترخوان پر لاؤ۔" خادم نے ایسا ہی کیا، مگر جس وقت بھنگی دسترخوان پر آیا تو بعض لوگ ناک بھوں چڑھانے لگے۔ ان کو یہ بات پسند نہ آئی کہ ایک بھنگی ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائے۔ یہ دیکھ کر منشی صاحب کو بہت دکھ ہوا اور انھوں نے فرمایا: "حضرات! آپ بے فکر رہیں، یہ کھانے میں آپ کے ساتھ شریک نہیں ہوگا، بلکہ یہ میرے ساتھ کھانا کھائے گا۔ آپ اس نعمت کے قابل نہیں کہ ایک ایسے پاک، بے گناہ آدمی کے ساتھ کھائیں جو گویا آج ہی پیدا ہوا ہے اور جس نے ابھی تک کوئی گناہ نہیں کیا۔ اللہ کے فضل سے یہ نعمت میں حاصل کروں گا۔" یہ کہہ کر منشی صاحب نے ایک پیالے میں اس نئے مسلمان ہونے والے شخص کے ساتھ کھانا کھایا۔ منشی صاحب کے سامنے کوئی معمولی سے آدمی بھی سچی بات کہہ دیتا تو وہ برا نہ مانتے تھے۔ ایک بار وہ نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوئے تو امام صاحب سلام پھیر چکے تھے۔ منشی صاحب نے کہا: "ذرا مجھے اطلاع کر دی ہوتی تاکہ میں بھی جماعت میں شریک ہو جاتا۔"

ایک سپاہی جو جماعت میں شریک تھا، بلند آواز میں بول اٹھا: "اذان ایک اطلاع ہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد کسی اطلاع کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔"

منشی صاحب بولے: "اگر ہم جیسے غافلوں کو الگ اطلاع دے دی جائے تو کیا حرج ہے؟"

اس سپاہی نے پھر جواب دیا: "اذان غافلوں کے لیے ہی دی جاتی ہے۔ ورنہ جنھیں نماز کی فکر ہوتی ہے، وہ تو اذان سے پہلے ہی مسجد میں آ جاتے ہیں۔"

منشی صاحب نے کہا: ''ہاں بھئی! تم ٹھیک کہتے ہو۔''

یہ کہتے ہوئے مسجد سے باہر آئے اور جماعت کی تلاش میں دوسری مسجد کی طرف دوڑے۔

منشی صاحب نے وزیرِاعظم بننے کے بعد سب سے پہلے اپنی جیب سے خرچ کر کے ایک عالی شان مسجد بنوائی اور اس کے ساتھ ہی ایک دینی مدرسہ بھی تعمیر کرایا۔ اس میں طالب علموں کے لیے نہ صرف مفت قیام اور کھانے کا انتظام تھا، بلکہ ان کو کتابیں اور وظیفے بھی دیے جاتے تھے۔ تعلیم دینے کے لیے اونچے درجے کے علما مقرر کیے گئے، جن کو بھاری تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ اس مسجد اور مدرسے کے علاوہ منشی صاحب نے ریاست امیں ور بھی مسجدیں اور مدرسے بنوائے علم کے پھیلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ انھوں نے قرآن پاک کا پشتو میں ترجمہ کرایا۔ اس کے علاوہ قرآن پاک کے فارسی اور ترکی ترجمے چھپوا کر ترکستان اور افغانستان میں تقسیم کرائے۔ منشی صاحب نے نیکی اور لوگوں کی بھلائی کے اور بے شمار کام بھی کیے۔ انھوں نے ۱۸۸۱ء میں بیاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت نواب شاہ جہاں بیگم بھوپال کی حکمران تھیں۔ (وہ ۱۸۶۸ء میں نواب سکندر بیگم کے بعد حکمران بنی تھیں اور انھوں نے بھی منشی صاحب کو ان کے عہدے پر قائم رکھا تھا۔) منشی صاحب سے لوگوں کو اس قدر محبت تھی کہ ان کے جنازے کی نماز میں شریک ہونے کے لیے لوگوں کا آنا ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ مجبور ہو کر ان کی نماز جنازہ گیارہ مرتبہ پڑھائی گئی۔

☆☆☆☆

مولوی عبدالحق

املی کا درخت

ہمارے گاؤں سے ذرا فاصلے پر املی کا ایک پرانا درخت تھا۔ بہار کے موسم میں ہرا بھرا ہو جاتا۔ یہ بڑا مسافر نواز تھا۔ تھکے ماندے مسافر اس کے سائے میں دم لیتے۔ کبھی کبھی کوئی کارواں یا بنجاروں کا قافلہ بھی اس میں آ کر ٹھہر جاتا۔ پاس کے جوہڑ میں نہاتے دھوتے، اپنے جانوروں کو پانی پلاتے، خود آگ سلگا کر، چولہے جلاتے، کھانا پکاتے اور کھا پی کر سو جاتے اور تڑکے سویرے اپنا سامان بیلوں پر لاد کر کوچ کر جاتے۔

یہ درخت گاؤں والوں کو بہت عزیز تھا۔ گاؤں کے لڑکے بالے شام کو کبڈی یا کوئی دوسرا کھیل کھیلتے اور اندھیرا ہونے پر گھر واپس چلے جاتے۔ چاندنی راتوں میں یہ کھیل رات کو بھی جاری رکھتے۔ جب اس درخت میں پھول آتے اور پھل لگنا شروع ہوتے تو بچے پتھر مار کر گراتے اور کھٹے کٹارے مزے لے کر کھاتے۔ گاؤں کے مکھیا بھی کبھی کبھی اس کے سائے میں آ کر بیٹھتے اور گاؤں کے معاملات میں مشورہ کرتے۔ کہن سال بڈھوں کا کہنا تھا کہ ہمارے باپ دادا کہتے تھے کہ ہمارے وقتوں میں بھی یہ درخت ایسا ہی تھا نہ جانے اس نے گاؤں کی کتنی نسلیں دیکھی تھیں۔ دوسرے گاؤں والے اس گاؤں کا اتا پتا بتاتے وقت اسی کا نشان دیتے۔

ایک دن گیارہ بجے کے بعد اس زور کی آندھی چلی کہ سارے گاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ گھروں کے چھپر اڑ گئے۔ ٹین کی چھتیں بھی اکھڑ کر دور جا گریں۔ غریبوں کے جھونپڑوں کے نام و نشان تک مٹ گئے کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ بچے ڈر کے مارے چارپائیوں کے نیچے گھس گئے۔ بڑے بوڑھے دعائیں مانگنے لگے۔ ساری رات جاگتے کٹی۔ پانچ بجے کے قریب خدا خدا کر کے آندھی تھمی۔ اب گھر سے نکل کر گاؤں کا حال دیکھا تو لوگوں کو بہت دکھ ہوا اور گھر گھر جا کر ایک ایک کی خیریت دریافت کی۔ اب آگے بڑھے تو یہ دیکھ کر انہیں بہت صدمہ ہوا کہ ان کا پرانا درخت جس نے ان کے بزرگوں کی آنکھیں دیکھیں تھی زمین پر اکھڑا پڑا ہے۔ اس وقت وہ اپنا دکھ بھول گئے اور سب اس کا ماتم کرنے لگے۔ اب انہیں اس کی قدر ہوئی سب کے سب آندھی کو برا کہنے لگے اور عورتوں نے کوسنا شروع کیا۔

چھوٹے بڑے سب آندھی کو برا کہہ رہے تھے اور روتے جا رہے تھے۔ کیا سچ مچ قصور آندھی کا تھا؟ اگر

یہ بات ہے تو چوپال کے پاس نیم کا درخت اچھا خاصا کھڑا ہے۔ وہ کیوں نہیں گرا؟ اور بھی کئی درخت ہیں۔ رات بھر آندھی کی چوٹیں سہتے رہے گرے نہیں صحیح سلامت رہے ہم آندھی کو دوش دیتے ہیں پر یہ نہیں دیکھتے کہ ان درختوں کی جڑیں کھوکھلی ہوگئی تھیں آندھی کے تھپیڑے جو پڑے تو درخت اوندھے منہ زمین پر آگرے۔

یہی حال قوموں کا ہے جب کسی قوم کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں تو لوگ اپنی ذات کو مقدم سمجھنے لگتے ہیں۔ قوم کے مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان کرنے سے بالکل نہیں ہچکچاتے۔ اقتدار اور زر کی ہوس میں اندھے ہوجاتے ہیں کہ ناجائز ذرائع بھی استعمال کرنے میں باک نہیں ہوتا۔ وہ خلق خدا کو لوٹ لوٹ کر اپنے عزیزوں اور دوستوں کے گھر بھرتے ہیں۔ بداعمالی اور بدکرداری کا دور دورہ ہوجاتا ہے۔ انصاف اٹھ جاتا ہے۔ حق گوئی، اخلاقی جرات اور قوت ایمانی باقی نہیں رہتی۔ ملک میں نفاق اور انتشار پیدا ہوجاتا ہے۔ زندگی دشوار ہوجاتی ہے۔ قوم میں ضعف آجاتا ہے۔ اس کی جڑیں بھی کھوکھلی ہوجاتی ہیں۔

☆☆☆☆

عبدالسلام خورشید

طلبہ کی سرگرمیاں

میں ان افراد میں شامل ہوں۔ جنھوں نے قراردادِ پاکستان سے تین سال پہلے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس کی فیڈریشن کی بنیاد رکھی تھی اور پاکستان کو اپنا نصب العین بنا کر کام کیا تھا۔ اس وقت ہم نے جو تحریک اٹھائی تھی اس کا یہ پہلو خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جو کچھ کیا۔ کسی بزرگ کے حکم پر نہیں، بلکہ دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے کیا۔ ہم خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور جو تاثر مجھے اب تک یاد ہے اُس کے چند نکات یہ ہیں۔

۱۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں سوچتا تھا کہ پاکستان بننے پر ہمیں ذاتی طور پر کیا ملے گا۔ بس یہی دُھن ذہن میں سمائی ہوئی تھی کہ ایک اسلامی مملکت بن جائے، جہاں انصاف کا دور دورہ ہو۔

۲۔ ہم امیروں سے چندہ نہیں مانگتے تھے بلکہ اپنی جیب سے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اخراجات پورے کرتے تھے، جب کبھی جماعت کے خرچ پر دورہ کرتے تو گاڑی کے تھرڈ کلاس میں سفر کرتے۔ سواریوں کے تانگے میں بیٹھتے اکیلا تانگہ نہ لیتے بلکہ تانگے میں چار سواریاں بیٹھتیں اور اپنا اپنا کرایہ ادا کرتیں۔ شہروں کے اندر ہم پیدل گھومتے یا اپنی اپنی سائیکلوں پر سفر کرتے۔

۳۔ جتنا فنڈ ہوتا۔ بنک میں جمع کرایا جاتا۔ اور صدر، خزانچی اور سیکرٹری کے دستخطوں سے نکلوایا جاتا۔

۴۔ قوم کی ایک پائی بھی ضائع نہ ہونے دی۔

۵۔ قومی جدوجہد کے ساتھ ساتھ پڑھائی پر بھی پوری توجہ دیتے تھے۔

ہماری آرزو ہے کہ آج کے طلبہ بھی ہلڑبازی کی بجائے یہی تعمیری روش اپنائیں۔

☆☆☆☆

مقبول انور داؤدی

پہلا موجد بچہ

یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ دُنیا کب پیدا ہوئی اور کس طرح ظہور میں آئی ۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم وحوا کو پیدا کیا اور جنت میں رہنے کو جگہ دی اور کہا کہ اس درخت کے پاس نہ جانا ۔ لیکن وہ چلے گئے یعنی خدا کی نافرمانی کی ۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کو جنت سے نکلا کر زمین پر پھینک دیا اور اُس سے دُنیا آباد ہوئی ۔

سائنسی نقطۂ نظر سے زمین سورج کا ایک حصہ تھا ۔ کسی حادثے میں یہ حصہ سورج سے الگ ہو کر گر پڑا، جو مدّت تک اپنی ہی آگ میں جلتا رہا اور جب ٹھنڈا ہوا تو اسی نے زمین کی شکل اختیار کر لی، جو جگہیں اُونچی رہ گئی تھیں وہ پہاڑ بن گئی ۔ ہموار جگہ میدان کہلائی اور جو نشیبی علاقے تھے، بھاپ کی گرمی سے بادل بن کر برسے اور نشیب میں پانی جمع ہو کر سمندر بنے ۔

یہ تو تھی زمین کی ابتدا اب سائنس دان نے تلاش وتجسس کے بعد یہ نقطہ نکالا کہ سب سے پہلے پانی میں زندگی کی لہر پیدا ہوئی اور ابتدا فرن یا کائی سے ہوئی ۔ پہلے پانی کے جانور بنے اور جب انھی جانوروں کو کسی سبب سے خشکی پر رہنا پڑا تو انھوں نے خشکی پر رہنے کے طور طریقے سیکھ لیے اور اس طرح حیوانیت نے ترقی کرتے کرتے انسانیت کی شکل اختیار کر لی ۔

دنیا کیسے ہی پیدا ہوئی ہو، ہمیں اس سے بحث نہیں ۔ البتہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ انسان نے جب دنیا میں قدم رکھا تو اس کے پاس نہ رہنے کو مکان تھا نہ پہننے کو کپڑا اور کھانے کو خوراک ۔ اس کی زندگی بھی جنگلی جانوروں سے کسی طرح بہتر نہیں تھی ۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ انسان کا ابتدائی مسکن مشرق وسطیٰ ہے اور یہ درست بھی ہوگا اس کی وجہ یہ ہے لازماً انسان نے سب سے پہلے گرم علاقوں میں ہی جنم لیا ہوگا بلکہ گرم مرطوب علاقوں میں جہاں وہ سردی کی شدت سے محفوظ رہ سکے ۔ جہاں ندی نالے ہوں تاکہ اپنی پیاس بجھا سکے ۔ جنگلی درخت ہوں، جن کے پھل، پھول پتوں سے اپنے پیٹ کی آگ کو مدھم کر سکے ۔

چناں چہ پہلا انسان ایسے ہی علاقے میں پیدا ہوا۔ ندی نالوں کا پانی پی کر اور درختوں کے پھل پھول کھا کر زندگی بسر کرتا رہا۔ اولاد ہوئی تو اس نے ماں باپ کی روش اختیار کی۔ لیکن ایک بڑی دقت یہ تھی کہ انھی جنگلوں میں جہاں انسان رہتا تھا، جنگلی درندے بھی تھے۔ انسان ان سے کہیں کمزور تھا۔ نہ تو اُس کے پاس ہتھیار تھے اور نہ ہی اس کی عقل کو ابھی کوئی جلا ملی تھی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ اور اس کے بچے جنگلی جانوروں کا شکار ہو جاتے۔

تاہم انسان کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ درندے اور چرندے درختوں پر نہیں چڑھ سکتے اور ایک دفعہ جب کچھ بچے ایک بڑے درخت کے پاس کھیل رہے تھے جس کی ایک موٹی شاخ قدرے جھکی ہوئی تھی۔ ایک لڑکا اس پر چڑھ گیا۔ پھر کیا تھا سب لڑکے اس پر چڑھ گئے اور جب بچوں نے بڑوں کو درخت پر چڑھنا سکھایا تو ان کے ماں باپ نے درندوں سے بچنے کے لیے درختوں پر مچانیں بنا کر رہنا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ جانوروں کا لُقمہ بننے سے ایک حد تک بچ گئے۔

کھیلنا بچے کی فطرت ہے۔ جس طرح آج کے بچے کھیلتے ہیں۔ وہ بھی کھیلتے تھے۔ دُنیا کے مہذب ہو جانے پر بھی بچہ اپنے آبائی کھیل یعنی مٹی میں کھیلنے کو نہیں بھولا۔ تو یوں ہی کھیلتے کھیلتے ایک بچے نے دوسرے بچے کو ایک پتھر مارا وہ دوسرے پتھر پر پڑا۔ پتھروں سے چنگاریاں پھوٹیں۔ قریب ہی سوکھی ہوئی گھاس پڑی تھی۔ جس میں آگ لگ گئی۔ بچوں کے لیے یہ ایک نیا تماشا تھا۔ شام کا وقت ہو رہا تھا۔ کچھ خنکی بڑھ رہی تھی انھوں نے تاپا تو سکون محسوس کیا۔ وہ اس گھاس میں گھاس پتے ڈالنے لگے۔ کچھ لکڑیاں بھی آگ میں پڑ گئیں۔ پھر تو ایک الاؤ روشن ہو گیا اور ان کو معلوم ہو گیا کہ لکڑی بھی جل سکتی ہے۔

شام کو جب ان کے ماں باپ آئے اور بچوں کے آگے آگ جلنے کا تماشا دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اور جب آگ کے قریب آئے تو اس میں سکون محسوس کیا۔ اتنے میں ایک درندہ بھی اُدھر آ گیا۔ آگ کی خوشی میں وہ درختوں پر چڑھنا ہی بُھول گئے تھے۔ اب تو وہ بہت گھبرائے لیکن یہ دیکھ کر ان کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا کہ وہ درندہ آگ سے ڈر کر بھاگ گیا اور انسان نے معلوم کر لیا کہ جانور آگ سے ڈرتے ہیں۔

درختوں کی چھتوں پر سے اکثر بچے اور جوان سوتے میں گر جاتے تھے۔ آگ دریافت ہوئی تو انھوں نے اس میں پناہ لی۔ اب ان کی عورتیں اور بچے جنگل سے لکڑیاں لاتے۔ اور الاؤ کو قائم رکھتے۔ رات ہوتی تو اپنے اردگرد آگ پھیلا کر مزے کی نیند سوتے کوئی درندہ ان کے قریب بھی نہ پھٹکتا۔

اس وقت تک انسان کچا گوشت ہی کھاتا تھا۔ کھانے کے فن سے واقف نہ تھا۔ ایک دن الاؤ جل رہا تھا۔ ہر ایک اپنے حصے کا گوشت لے کر اپنے تیز دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھا رہا تھا اور گپ شپ بھی ہو رہی تھی کہ اتنے میں ایک بچے کے چیخنے اور رونے چلانے کی آواز آئی۔ جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ اس کا ٹکڑا آگ میں گر گیا ہے۔ اب سب کے حصے تقسیم ہو چکے تھے۔ اگر اُس بچے کو اس کا حصہ نہ ملتا۔ تو وہ بے چارا رات بھوکا رہتا اس لیے سب نے کوشش کی کہ اس بچے کا گوشت کا ٹکڑا جلد از جلد مل جائے۔ ٹکڑا مل گیا۔ مگر اب تو اس کی شکل وصورت اور ذائقہ بھی بدلا ہُوا تھا۔ اب وہ ایک خستہ اور پکا ہُوا لذیذ گوشت تھا جس کے کھانے میں آسانی تھی۔

جب لوگوں نے اس بھنے ہوئے گوشت کا مزا چکھا تو بہت خوش ہوئے۔ اُس دن سے انسان آگ پر بُھون کر گوشت کھانے لگا اور اسی آگ پر آج تم لذیذ سے لذیذ کھانے پکا کر کھاتے ہو۔

☆☆☆☆

نیاز فتح پوری

زندگی کا بوجھ

ایک دن میں سمندر کے کنارے پر پہنچی اور وہاں ایک بڑی چٹان دیکھ کر اس کے سائے میں بیٹھ گئی۔

میں ابھی اس چٹان کے پاس جا کر بیٹھی ہی تھی کہ چٹان کو یہ کہتے ہوئے سنا:

زندگی کا بوجھ بھی کیسا ناگوار بوجھ ہے۔ ایک فصل کے بعد دوسری فصل آتی ہے، ایک زمانے کے بعد دوسرا زمانہ آتا ہے، وہی آسمان، وہی زمین، وہی سورج کا یکساں طلوع و غروب، اور وہی چاند کا ایک ہی طرح گھٹنا اور بڑھنا، وہی ستاروں کا رات کو چمکنا اور دن کے وقت آنکھیں بند کر لینا۔۔۔۔!

گرم ہوا آتی ہے اور میرے اندر اپنی گرمی چھوڑ جاتی ہے۔ ٹھنڈی ہوا چلتی ہے اور اپنی سانسوں سے مجھے بھی ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ بادل اُٹھتا ہے اور مجھ پر ناراض ہو کر برس پڑتا ہے، لیکن میں اس کے خلاف احتجاج بھی تو نہیں کر سکتی اور میں صرف ٹھنڈی آہیں بھر کر رہ جاتی ہوں۔۔۔

چڑیاں چاروں طرف سے آتی ہیں، میرے سر پر بیٹھ کر خوب لڑتی جھگڑتی ہیں۔۔۔ جشن مناتی ہیں اور میں یہ سب کچھ چپ چاپ خاموشی سے دیکھتی رہتی ہوں، یہ جو میرے آس پاس بڑے بڑے درخت ہیں، یہ اپنی جڑوں سے مجھے روز بروز جکڑے جا رہے ہیں۔۔۔ اور اپنے پتے گرا گرا کر مجھے داغ دار بناتے جاتے ہیں اور میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔۔۔ میں اس زندگی سے باز آئی۔۔۔ اے سمندر! میرے حال پر رحم کر۔۔۔ اور جلد مجھے نگل لے۔

اور پھر میں نے دیکھا، کہ اچانک سمندر کی ایک بہت بڑی موج بلند ہوتی ہوئی آئی اور چٹان کے اُوپر سے گزر گئی۔

کچھ دن گزرنے کے بعد ایک روز میں پھر سمندر کے کنارے پر گئی تا کہ اس سے ایک موتی طلب کروں۔۔۔ اتفاق سے میں اسی چٹان پر پہنچی۔۔۔ چٹان کے چاروں طرف کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔۔۔ پتیوں کے ڈھیر کیچڑ سے لتھڑے پڑے تھے، میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہیں کیچڑ میں ایک موتی بھی پڑا ہوا ہے۔۔۔ میں بہت خوش ہوئی۔ میں موتی اٹھانے کے لیے جھکی تو چٹان بولی:

زندگی کا بوجھ بھی کیسا ناگوار بوجھ ہے۔۔۔ وہی کیچڑ وہی سڑی ہوئی پتیاں، وہی مچھلیاں، وہی لہریں اور وہی بےقرار موجیں۔۔۔ وہی جو کل تھا آج بھی ہے۔ جو آج ہے، وہ کل بھی ہوگا۔ کاش! میں اندھی ہوتی کہ بار بار ایک ہی چیز کو نہ دیکھ سکتی۔ نہ ایک ہی بات سن سکتی۔ اے سمندر! مجھے اس قید سے نجات دے اور آزادی کی سانس لینے دے۔

دفعتاً موجیں۔ پیچھے ہٹ گئیں، مچھلیاں غائب ہو گئیں، آفتاب نے کیچڑ خشک کر دی اور ہوا پتیاں اُڑا کر لے گئی۔۔۔ سمندر کے تلاطم میں سکون آ گیا۔

کئی روز گزر گئے۔۔۔ میں ایک دن پھر سمندر کے ساحل پر گئی۔۔۔ دیکھا کہ چٹان پر بہت سی چڑیاں بیٹھی ہوئی دھوپ لے رہی ہیں۔ درخت دونوں طرف جھکے ہوئے اپنی شاخوں سے چاروں طرف پھول ہی پھول بکھیر رہے تھے۔ میں پھول چننے کے لیے جھکی تو چٹان نے کہا:

زندگی کا بوجھ بھی کیسا ناگوار بوجھ ہے۔ میں اس یکساں حالت سے تنگ آ گئی ہوں۔ اے سمندر تو مجھے نگل لے۔

چٹان کا یہ جملہ ختم نہ ہوا تھا کہ اچانک فضا میں چمک پیدا ہوئی اور بجلی نے اسے ریزہ ریزہ کر کے تمام ذرات ہوا میں پھیلا دیے۔ چٹان تو اب نظر نہ آتی تھی لیکن اس کی یہ آواز ضرور گونج رہی تھی کہ:

آہ! یہ نیا وطن تو اور زیادہ تکلیف دہ ہے، یہ نئی زندگی تو کہیں زیادہ پریشان و منتشر ہے۔

☆☆☆☆

آئی۔ اے رحمان

نیولے کی تلاش

ایک بوڑھے پاکستانی کے لیے دو کہانیاں یاد کرنا جو اس نے بچپن میں سنی تھیں آسان کام نہیں ہے۔ مصیبت میں پھنسی ہوئی دوشیزاؤں کی مدد کے لیے آنے والے مہم جوؤں کے کارناموں یا ظالم لوگوں کے جیل خانوں سے فرار ہونے والے بے گناہ لوگوں کے قصے ان خوفناک کہانیوں کے نیچے دب گئے ہیں جو دوسری عالمی جنگ یا دوسری چھوٹی موٹی لڑائیوں کے دوران میں سننے میں آئیں۔ یہ کام بالخصوص اس شخص کے لیے مشکل ہے، جس نے پیشتر کہانیاں اپنے والد سے سنی تھیں۔ جسے پری کی کہانیوں یا کسی بھی قسم کے قصے کہانیوں سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ جس کی کہانیوں کا ذخیرہ زیادہ تر 1857ء کی بغاوت کے دوران میں میں ظلم وستم اور بہادری اور زیادہ تر آئرلینڈ کے لوگوں کی بغاوت کی کہانیوں پر مشتمل تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ بھی ایک نجومی کی حیثیت سے ایک طوفان میں پھنسے ہوئے جہاز پر حسن بن صباح کی کامیابی یا شہنشاہ شاہجہاں کے بارے میں بتا سکتے تھے۔ جسے ایک غریب لڑکی صرف اس کے پاؤں سے پہچانتی تھی کیوں کہ وہ اس کے پاؤں دھویا کرتی تھی اب بھی یادداشت کے کونوں میں ان لمحات کی جھلکیاں اُبھر کر آتی ہیں جب ایک معمر خاتون کی میٹھی باتوں سے سخت سردی کا احساس جاتا رہتا تھا۔ ان میں سے بعض جھلکیوں میں ان شیطانوں کی شکلیں اُبھر کر آتی ہیں۔ جو ماموں کے کہنے پر دوست بن جاتے تھے۔

ایسے نوجوانوں کی کہانیاں بھی تھیں۔ جو صحراؤں میں جاتے تھے جادوگروں سے لڑتے تھے انھیں شتر مرغ کے انڈے ملتے تھے اور جو راہ میں پریوں سے تقریباً اظہار محبت کرتے تھے ان کہانیوں کے مختلف نام تھے مختلف طریقہ سے شروع ہوتی تھیں لیکن ہمیں ایک جیسی معلوم ہوتی تھیں۔ بعض اوقات نانی اماں کو بتانا پڑتا کہ وہ اپنی کہانیوں کو غلط ملط کر رہی ہیں کیوں کہ اس وقت کسی کو یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ نانی اماں کو اپنی طرف سے گھڑ کے کہانیوں میں کتنا کچھ لگانا پڑے گا۔

بہرحال ایک واقعہ جو ذہن میں ایسا اٹک کر رہ گیا ہے خاصا انوکھا ہے۔ ایک نوجوان پانچ یا سات بھیدوں کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بھید کی کنجی ایک بوڑھی عورت کے پاس تھی جو کہتی تھی کہ وہ یہ راز

صرف اس شخص کو بتائے گی جو اسے چوسر میں شکست دے گا اور جو شخص اس سے ہار جائے گا اس کا سر قلم کر دیا جائے گا یا اسے عمر بھر کے لیے غلام بنایا جائے گا۔ اس نے اپنی جیت کا انتظام اس طرح کیا ہوا تھا کہ وہ چراغ ایک بلی کے سر پر رکھتی (وہ ہمیشہ رات کو کھیلتی تھی) اور اپنی آستین میں ایک چوہا رکھتی۔ وہ جب بھی دیکھتی کہ وہ ہار جائے گی وہ ہوشیار عورت چوہے کو باہر نکال دیتی اور بلی فوراً چوہے کے پیچھے جاتی اور چراغ گر پڑتا اس طرح وہ چوسر کی بازی میں گڑبڑ کر دیتی اور اپنی جیت یقینی بنا لیتی۔ اب وہ ہیرو آیا، جسے اس عورت کی چال کا پتہ تھا اس نے نیولہ لیا۔ اور اسے آستین میں چھپا لیا وہ چوسر بھی اچھی طرح جانتا تھا اور عورت کی آستین میں نگاہ مار سکتا تھا۔ جس میں چوہا تھا جوں ہی اس عورت نے چوہا باہر نکالنے کی کوشش کی اس نے نیولے کا سر ننگا کر دیا چوہا باہر نہیں نکلا۔ بلی نے حرکت نہیں کی اور چراغ نہیں گرا۔ وہ نوجوان چوسر میں جیت گیا اس چالاک عورت سے راز معلوم کر لیا اور تمام معمے حل کر دیے اور اس طرح اس مغرور شہزادی سے شادی کر لی۔ جس نے اسے بظاہر ایک مشکل کام پر بھیجا تھا۔

اس کہانی کا حاصل یہ تھا کہ چالاک لوگوں سے عہدہ برآ ہوتے وقت اپنی آستین میں نیولہ رکھیں۔

میں یہ کہانی بھی بھول گیا ہوتا لیکن یہ میرے ذہن میں آتی رہتی ہے کیوں کہ متعدد مواقع پر میں نے محسوس کیا ہے کہ چوسر کے کھلاڑیوں کی جو پاکستان کے حالات پر چھائے رہتے ہیں ترکیبوں کو نا کام بنانے کے لیے کسی شخص کے پاس نیولہ رہے۔

میری خواہش ہے کہ کاش کسی شخص کے پاس نیولا ہوتا کہ وہ ان دھوکے بازوں کا سدباب کرتا جن کی آستینوں میں چوہے ہیں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد نسیم صدیقی

جانور ہمارے دوست

جانور ہمارے آج کے دوست نہیں ہیں۔ یہ ہمارے زمین پر آنے کے ساتھ ہی زندگی کا حصہ بن گئے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ جانوروں کی وجہ سے ہماری زندگی کا پہیہ چلتا تھا۔

انسان شروع میں شکاری تھا۔ جانوروں کا شکار کر کے خوراک حاصل کرتا تھا۔ لباس، رہائش، شکار کے اوزار، علاج معالجہ، غرض کہ ساری ضروریات جانوروں کے شکار سے حاصل کرتا تھا۔

جوں ہی انسان نے جانوروں اور پودوں کو پالتو کرنا شروع کیا انسان کی دنیا ہی بدل گئی۔ جانور اور پودے پالتو کرنے سے حضرتِ انسان کو فرصت میسر آ گئی۔ آج زندگی کی جو چکاچوند نظر آتی ہے یہ سب اُس کا کرشمہ ہے۔ حلال گوشت کھاتے ہیں۔ باربرداری کا کام لیتے ہیں۔ چوروں کو دور رکھنے کے لیے کتے پالتے ہیں، ہاتھی دانت اور ہڈی سے طرح طرح کی چیزیں بناتے ہیں۔ لباس، جوتے، پرس غرض کہ آپ گنتے جائیں، جانوروں کا ہماری زندگی میں عمل دخل کی فہرست بڑھتی جائے گی لیکن آج ہم اُن کو ایک اور انوکھے اور دلچسپ انداز میں دیکھیں گے۔

یہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہیں۔

بگلا بھگت مچھلیوں پر تو داؤ لگاتے ہی ہیں لیکن لندن کے ایک ٹاؤن میں بگلے نے چپس چرانے شروع کر دیے۔ روزانہ آتے اور تین پیکٹ اُڑا لے جاتے۔ مالک دکان تنگ آیا۔ چپس چور سے بچنے کے لیے ملازم رکھنا پڑا۔

ایک اخباری خبر کے مطابق ایک سال سے پُراسرار طور پر خاموش طوطے نے چور کو پکڑوایا۔

تین چور گھر میں داخل ہوئے۔ طوطے نے فوراً انسانی آواز میں خبردار کیا۔ ”رُک جاؤ ورنہ گولی ماردوں گا۔“ مالک مکان کا مال و اسباب بچ گیا اور طوطے کی آواز لوٹ آئی۔

اس طوطے سے بھی زیادہ افریقن بھورے رنگ کا طوطا انسان کی آواز دُہرانے سے لے کر الفاظ اور معنی جوڑنا، سیدھے سادے فقرے بنانا، یہاں تک کہ ایلکس (Alex) نامی طوطا چیزوں کی شناخت کرنا، ان کو بیان کرنا، شمار کرنا، سوالات کا جواب دینا مثلاً کسی چیز میں لال خانوں کو اسی (80) فی صد صحیح بتا دینا سکھایا گیا ہے۔

اس سے بھی زیادہ ماہر ’ن کسی (N-Kise) تھا۔ ایک ہزار الفاظ پر مشتمل حافظہ رکھتا تھا۔ الفاظ تخلیق کر سکتا اور ان کا استعمال صحیح تناظر اور فعل (Tense) میں کرتا تھا۔

یوں لگتا یہ طوطا ادبیات یا لسانیات کا پروفیسر ہے!

طوطا ہی نہیں کوا بھی بڑا نقالچی ہے۔ دوسرے جانوروں کی نقل اُتارتا ہے۔ طوطے کی طرح اُس کو بولنا سکھایا جا سکتا ہے۔ انسان کی آواز کی نقل اُتار سکتا ہے۔ ہر کوے کی اپنی بولی ہے جس سے وہ اپنے ساتھی کی شناخت کرتا ہے۔

کوا چالاک ہے یا عقل مند یہ بھی، آیئے دیکھتے ہیں۔

کوا اخروٹ کے سخت چھلکے کو کیسے توڑتا ہے اور گری کھاتا ہے؟

جاپان میں کوے میاں اخروٹ چونچ میں دبائے کسی چوراہے پر ٹریفک سگنل لال ہونے کا انتظار کرتے ہیں، جوں ہی سگنل لال ہوا، اخروٹ سڑک پر رکھ دیا۔ سبز ہونے پر کار اور دوسری گاڑیوں کے نیچے آئے ہوئے اخروٹ سے گری نکالی اور کھالی۔

کوے کی عقل مندی کا ثبوت آکسفورڈ یونیورسٹی کی تجربہ گاہ سے آیا۔

ایبل اور بیٹی نام کے دو کووں کو ٹیوب میں خوراک دی گئی۔ دونوں کو ایک ایک تار دیا گیا۔ ایک تار پر ہک تھا اور دوسرا سیدھا تھا۔ ایبل نے ہک والے تار سے خوراک نکال لی۔ بیٹی نے سیدھے تار پر چونچ سے ہک بنایا اور خوراک نکال لی۔ بار بار اس تجربہ کو دُھرایا گیا۔ بیٹی نے ہر دفعہ پہلے سے بہتر ہک بنایا۔

چمپینزی اور بندر کو یہی کام دیا گیا وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ چالاک کوے اود بلاؤ کو بھی غُچہ دے جاتے ہیں۔ اود بلاؤ نے مچھلی شکار کی۔ منہ میں دبائے کنارے پر آئے۔ ایک کوے نے اود بلاؤ کی دم نوچی، اس نے مُڑ کر دیکھا۔ دوسرا اس کے منہ سے گری مچھلی لے کر یہ جا وہ جا۔ اود بلاؤ منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اود بلاؤ کی ہی نہیں وہ ماہی گیر کی مچھلی پر بھی ہاتھ صاف کر جاتے ہیں۔

مصوری انسان ہی نہیں کرتا۔ کیلی فورنیا میں ایک کتا (Ziggy) اپنے دانتوں میں برش لے کر دو منٹ میں ماہرانہ طریقے سے نمونے تیار کرتا ہے۔ کتے کی مالکہ کو گلہ ہے کہ زگی میاں من موجی ہے، اپنی مرضی ہو تو تصویر بناتا ہے۔

کتے مصور ہی نہیں عبادت گزار بھی ہوتے ہیں۔ جاپان میں اوکی نادا کے بدھ مندر میں ایک کتا روزانہ مذہبی رسومات میں شرکت کے لیے آتا۔ وہ اپنی دونوں ٹانگوں کو کھڑا کر کے اور اگلی ٹانگوں کو ناک کے قریب

رکھتا جس سے لگتا کہ وہ عبادت میں شریک ہے۔ اس عبادت گزار کتے کو معجزہ سمجھ کر عبادت کے لیے آنے والوں کی تعداد بڑھ گئی۔

کبوتر بازی عام لوگوں کا ہی نہیں بادشاہوں کا بھی مشغلہ رہا ہے۔ ترکستان کے بادشاہوں سے لے کر اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگزیب تک کبوتر بازی کا شوق رکھتے تھے۔ اکبر بادشاہ کے پاس ہر رنگ اور نسل کے کبوتر تھے۔ ان کے مختلف نام شیرازی، کاشانی، قُمری وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ اس شوقِ شاہی کو دیکھتے ہوئے اُمرا اور سفیر حضرات کبوتر کا تحفہ بادشاہ کو پیش کرتے تھے۔

اُڑیسہ کے چودہ سو (1400) کبوتر بے روزگار ہو گئے۔ سرکار نے تیرہویں صدی سے جاری کبوتر ڈاک سروس ختم کر دی۔ یہ ڈاک ہرکارے بارش، طوفان، پہاڑ، میدان، صحرا ہر موسم میں ڈاک لے جاتے تھے۔

شاید بے روزگاری سے تنگ آ کر افریقہ کے کان کنی کے مزدور کبوتروں کو ہیروں کی سمگلنگ میں استعمال کر رہے ہیں۔ کانوں سے نکلنے والے چھوٹے چھوٹے ہیرے سدھائے ہوئے کبوتر کے پیر کے ساتھ باندھ دیتے ہیں۔ منزلِ مقصود پر ہیرے وصول کر لیتے ہیں۔

بے چارے کبوتر تو بے روزگار ہو گئے اور سمگلر حضرات کے ہتھے چڑھ گئے لیکن بی بلی کی موج آ گئی۔ انگلینڈ کے رائل کورٹ تھیٹر نے بلیوں کی سکیورٹی فورس قائم کر دی۔ شو ختم ہوتے ہیں بلیاں جھپٹ کر چوہوں کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔

شیکسپیئر کے مشہور تھیٹر گلوب میں دس بلیاں دو شفٹوں میں کام کرتی ہیں۔ اچھی خوراک ملتی ہے۔ بیمار ہونے کی صورت میں علاج معالجہ کی سہولت بلی مالک کی ذمہ داری ہے۔

بعض اوقات شو کے دوران میں بلیاں لڑ پڑتی ہیں جس سے اداکار اور گلوکار اپنی لائن یا گیت بھول جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک واقعے میں اداکار نے غصے میں آ کر بلی کو پنج مارا۔ تماشائی اداکار کے پیچھے پڑ گئے۔ اداکار نے معافی مانگ کر جان چھڑائی۔

طوطا فال نکالتا ہے، قسمت کا حال بتاتا ہے لیکن اب آکٹوپس یا ''ہشت پا'' نے یہ کام شروع کر دیا۔ میچ میں کس کی فتح ہوگی یا نہیں؟ جرمنی کے ایک ایکوریم یا مچھلی گھر میں پال نامی آکٹوپس نے فٹ بال میچ میں فتح کس ٹیم کی ہوگی پیشن گوئی شروع کر دی جو کہ صحیح ہوتی تھی۔

گزشتہ فٹ بال میچ میں سپین کے ہاتھوں جرمنی کی ٹیم کی سیمی فائنل میں شکست کی پیشن گوئی کی تھی۔ جرمن شائقین نے اگلے میچ میں پال کی پیشن گوئی غلط ہونے کی دعا مانگنی شروع کر دی۔

افسوس! پال اب وفات پا گیا ہے۔ اس کو ایکوریم کے خالی پلاٹ میں دفن کیا گیا ہے اور اس پر ایک دستاویزی فلم بنانے کا منصوبہ ہے۔

جب پیٹ بھرا ہو تو انسان کو طرح طرح کی باتیں سوجھتی ہیں۔

امریکہ کی ریاست وسکونسن میں گائے کی طرح آواز نکالنے کا مقابلہ ہوا۔ گائے گائیکی کے اس مقابلے میں ایک نوجوان نے مقابلہ جیت کر ایک ہزار ڈالر کا انعام جیتا۔

عالمی سطح پر خواتین کا مقابلۂ حُسن ٹی وی پر دیکھا یا اخبار میں پڑھا ہوگا۔

اردن کے عوام اپنی بکریوں کے حُسن سے متاثر ہو کر ہر سال بکریوں کا مقابلۂ حُسن کراتے ہیں۔ جس میں دوسرے عرب ممالک کی بکریاں بھی سج دھج کر آتی ہیں۔ ان میں شامی نسل کی بکریاں اپنے حُسن و جمال کے لیے مشہور ہیں اور قیمت 25 ہزار ڈالر تک ہوتی ہے۔

کنویں کا مینڈک محاورہ ضرور سنا ہوگا لیکن ایسا بھی نہیں۔ مینڈک میاں چھلانگ لگا کر کہیں سے کہیں جا سکتے ہیں۔

ایسا ایک میلہ امریکہ کی ایک ریاست میں گزشتہ پچاس سال سے ہو رہا ہے۔ زمین بجا کر اور شور و غل مچا کر مینڈک کو لمبی لمبی چھلانگ لگانے پر اُکسایا جاتا ہے۔ اس لانگ اور ہائی جمپ کے ہیرو کے مالک کو فاتح قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سراسر ناانصافی ہے۔ فاتح تو مینڈک میاں ہوتے ہیں۔

سب طرح کے دن منائے جاتے ہیں، گدھے کیوں پیچھے رہیں؟

گزشتہ 43 سال سے میکسیکو میں ”گدھوں کا دن“ منایا جاتا ہے۔ سج دھج کے گدھے کیٹ واک یا یہ کہیے کہ خرواک کرتے ہیں۔

خر نوازی میں پاکستانی بھی کسی سے کم نہیں۔ لیاری، کراچی میں گدھا گاڑی ریس ہوتی ہے۔ جو اَب ثقافتی میلے کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

ٹیڈی بیر بچوں کا محبوب کھلونا اور ساتھی ہے۔ اس کی معصوم صورت دیکھ کر سب کو پیار آتا ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ٹیڈی بیر ماشاءاللہ سو (100) سال کے ہو گئے ہیں۔ ان کی پیدائش کب، کہاں اور کیسے ہوئی؟ ایک روایت کے مطابق امریکہ کے صدر روزویلٹ ریچھ کے شکار کے لیے امریکہ کی جنوبی ریاست میں گئے، شکار ہاتھ نہ آیا۔ میزبان حضرات نے ایک ریچھ کا بچہ درخت سے باندھ دیا کہ صدر صاحب شکار کا شوق پورا کر لیں۔ صدر صاحب کو معصوم بچے کو مارنا اچھا نہ لگا۔ ایک کارٹونسٹ نے اپنے کارٹون میں اس کا مذاق اُڑایا۔

ٹیڈی صدر روزویلٹ کا لقب یا بچپن کا نام (Nick Name) تھا۔

دوسری روایت کے مطابق ایک مصنوعی ریچھ کا بچہ بنا کر درخت سے لٹکایا کہ صدر صاحب پھیڈی شکاری ہیں اگر اصلی ریچھ کا شکار نہیں کر سکے تو اس سے اپنا شوق پورا کر لیں۔

لیکن ٹیڈی بیر کے نئے دعوے دار ایک جرمن صاحب ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ٹیڈی بیر کا تخیل ان کا ہے۔ ثبوت کے طور پر ان کا کہنا ہے کہ ڈرائنگ بورڈ پر اس کی آؤٹ لائن آج بھی موجود ہے۔

ٹیڈی بیر نہ امریکن ہے اور نہ ہی جرمن، یہ بچوں کا دوست اور ساتھی دنیا بھر میں ہے۔

اسلامی کیلنڈر قمری ہے اور ہجرت سے شروع ہوتا ہے۔ عیسوی کیلنڈر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔

چینی کیلنڈر کئی ہزار سال پرانا ہے۔ روایت ہے کہ مہاتما بدھ نے تمام جانوروں کو نئے سال پر آنے کی دعوت دی۔ بارہ جانور، خرگوش، ڈریگن، سانپ، گھوڑا، بھیڑ، بندر، مرغا، کتا، فوک (سور)، چاہا، بیل، چیتا حاضر ہوئے۔ اس پر سال کے نام رکھے گئے۔ چینی حضرات کا عقیدہ ہے کہ انسان جس جانور کے سال میں پیدا ہوتا ہے اس کی خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں۔

آپ اپنے سالِ پیدائش سے اپنی خصوصیات کا حال معلوم کریں۔

2011 تین فروری سے چینی سال خرگوش شروع ہوا۔ نجومی حضرات اس سال کو مصالحت کا سال۔ لوگوں کے لیے موج میلے کا سال قرار دے رہے ہیں۔ خرگوش سال میں پیدا ہونے والے رحم دل، نرم خو، باوقار، لائق اور حسنِ ذوق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆

پروفیسر نذیر احمد

زمین

کہیں کھلے میدان میں کھڑے ہو کر زمین اور آسمان کو دیکھیں تو زمین ایک بہت بڑی تھالی کی طرح اور آسمان ایک بہت بڑے گنبد جیسا معلوم ہوتا ہے۔ اس آسمانی گنبد اور زمین کے کنارے دور ملتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ دن کے وقت سورج اور رات کے وقت چاند اور ستارے مشرق سے مغرب کی طرف سفر کرتے معلوم ہوتے ہیں۔

شروع شروع میں انسان نے یہی دیکھا اور سمجھا کہ زمین ایک تھالی کی طرح گول ہے اور سورج، چاند اور ستارے بھی اسی طرح گول ہیں اور زمین کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کے خیال میں زمین اس تمام کارخانے کا مرکز تھی۔

اگرچہ دیکھنے میں زمین ایک بے حرکت تھالی اور آسمان گنبد کی طرح دکھائی دیتے ہیں اور چاند، سورج اور ستارے مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، پھر بھی یہ باتیں درست نہیں۔ ہمارے علم نے ترقی کی اور ہمیں معلوم ہوا کہ جو کچھ ہم نے عام نظر سے دیکھا اور سمجھا وہ غلط تھا۔ زمین تھالی کی طرح گول نہیں بلکہ گیند کی طرح گول ہے اور آسمان گنبد کی طرح نہیں بلکہ ہماری نظر کی حد ہے۔ ہم زمین کے کسی بھی مقام سے اس حد کا ایک وقت میں صرف ایک حصہ دیکھ سکتے ہیں۔

انسان برس ہا برس تک آسمان، زمین، چاند اور ستاروں کو دیکھتا رہا اور ان کے بارے میں سوچتا رہا، پھر کہیں جا کر اس پر یہ بات کھلی کہ زمین اور آسمان تک کے یہ گولے، گیند کی طرح گول ہیں اور شروع ہی سے اپنے اپنے راستوں پر چکر کاٹتے چلے آ رہے ہیں۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ ہماری زمین ان کے درمیان میں واقع نہیں ہے۔ بلکہ وہ بھی ایک گولے کی طرح ہے جو سورج کے خاندان کی دوسری آٹھ زمینوں کی طرح ہے۔ زمینیں سورج کے گرد مختلف فاصلوں پر اپنے اپنے راستوں پر چکر کاٹتی رہتی ہیں۔ سورج کے گرد ان کے سفر کی رفتار ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

خود سورج اور زمین کے یہ گولے اپنے گرد بھی لٹو کی طرح گھومتے رہتے ہیں۔ جس طرح ہماری زمین

کے ساتھ ایک چاند ہے، اسی طرح سورج کے خاندان کی دوسری زمینوں کے ساتھ بھی چاند ہیں۔ کسی زمین کے ساتھ ایک اور کسی کے ساتھ ایک سے زیادہ۔ یہ سب کے سب چاند اپنی اپنی زمین کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ ہی اپنے گرد بھی گھومتے رہتے ہیں۔ زمین سے حد نظر تک یعنی آسمان تک کے فاصلے کو خلا کہتے ہیں خلا کی ان گیندوں میں سے چاند کا گولہ ہمارا سب سے قریبی ہمسایہ ہے۔ لیکن پھر بھی ہم سے تقریباً ڈھائی لاکھ میل دور ہے۔

زمین کی کہانی اس کے خلائی رشتوں کے بغیر پوری نہیں ہوتی۔ رات کے وقت آسمان میں چمکنے والے لاتعداد ستارے روشنی کے نقطے سے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن یہ اتنے چھوٹے نہیں۔ یہ سب کے سب بھی ہمارے سورج سے بھی کہیں بڑے ہیں لیکن ہم سے بہت دور ہونے کی وجہ سے اتنے چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ان کے خاندان کی زمینیں اور ان زمینوں کے ساتھ ان کے چاند ہیں۔

رات کے وقت آسمان میں چاند ستاروں کے علاوہ آپ نے ستاروں کا بادل بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے خلا میں جانے کو کوئی راستہ ہو لیکن نہیں، یہ کوئی راستہ نہیں اور نہ ہی اس کی اصلی صورت ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ یہ ستاروں کا ایک بہت بڑا جھرمٹ ہے جو خلا میں اپنے مقام کی وجہ سے، ہمیں ایسا دکھائی دیتا ہے ہم اس بادل کو کہکشاں کہتے ہیں۔

اصل میں ہمارا سورج اور اس کے خاندان کی زمینیں اور چاند، سبھی انھی کہکشاؤں کا ایک بہت چھوٹا سا حصہ ہیں۔ آسمان میں رات کو جتنے ستارے دکھائی دیتے ہیں وہ انھی کہکشاؤں کا حصہ ہیں۔ اتنی دور کہ بڑی بڑی دوربینوں کی مدد کے بغیر دکھائی نہیں دیتیں، خلا میں ایک کہکشاں کے ستارے ایک دوسرے سے اتنے دور ہیں کہ ان کی دوری میلوں کے عام پیمانے سے نہیں بتائی جا سکتی۔ اسی لیے خلا کے فاصلوں کے لیے روشنی کے سالوں کا پیمانہ استعمال کیا جاتا ہے۔ روشنی کے سال سے مراد وہ فاصلہ ہے جو روشنی ایک سال میں طے کرتی ہے۔ یاد رہے کہ روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار دو سو بیاسی میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اب آپ اندازہ کر لیں کہ روشنی ایک سال میں کتنا فاصلہ طے کرے گی۔ پھر ایک کہکشاں سے دوسری کہکشاں کے دو ستاروں کا زیادہ سے زیادہ فاصلہ روشنی کے ایک لاکھ سال کے برابر ہے، اور ہمارے سورج سے نزدیک سے نزدیک ستارے کا فاصلہ روشنی کے چار سال چار ماہ کے برابر ہے۔

کہتے ہیں کہکشاں سائیکل کے ایک پہیے کی طرح ہے جس کے درمیان میں گرم گیسی مادہ ہوتا ہے۔ اس کے باہر تاروں کے چکر اور عین درمیان میں ستاروں کے بڑے بڑے جھنڈ ہوتے ہیں۔

اب آپ شاید یہ جاننا چاہیں گے کہ زمین کب اور کیسے پیدا ہوئی؟ کیا زمین کبھی سورج کا ایک حصہ تھی؟ سورج اور اس کے خاندان کی زمینیں اور ان زمینوں کے چاند کس طرح پیدا ہوئے؟ ہمارا علم ابھی کم ہے۔ اس لیے ان سوالات کے یقینی جوابات تو ابھی نہیں دیے جا سکتے، لیکن ہم اپنے علم کی روشنی میں بعض اندازے ضرور لگا سکتے ہیں۔

مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے سورج کے خاندان کے تمام ارکان کے مادے کو اگر سو حصوں میں تقسیم کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ ان سو حصوں میں سے ۹۹ حصے تو سورج میں موجود ہیں اور باقی صرف ایک حصہ اس کی زمینوں اور ان زمینوں کے چاند بنانے میں صرف ہوا ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سب گولے سورج کے گرد ایک ہی طرف کو گھومتے ہیں۔ پس کسی مقام پر گیسی مادے کے بادل جمع ہو جاتے ہیں اور پھر چکر کھانے لگتے ہیں۔ جیسے جیسے اس کے چکر کھانے کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے۔ اس کے کناروں سے مادے کے ٹکڑے تھالیوں کی صورت میں کٹ کٹ کر دور گرنے لگتے ہیں۔ اس تھالی کی شکل کے مادے کے باہر کے حصے ٹھنڈے ہو ہو کر ایک دوسرے سے الگ ہو ہو کر زمینوں کے گولوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور درمیانی حصہ سورج کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح گیس کے بادل سے لاکھوں سورج اور ان کے خاندان پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ سبھی خاندان آخر بائسیکل کے ایک پہیے کی شکل اختیار کر کے کہکشاں کہلاتے ہیں۔

ایک اور خیال جو بعض سائنس دانوں نے اس سے پہلے پیش کیا تھا، یہ تھا کہ ہمارے سورج کے خاندان کی تمام زمینیں اور ان کے چاند یوں پیدا ہوئے کہ کوئی بہت بڑا ستارہ ہمارے سورج کے نزدیک سے گزرا۔ اگر چہ وہ اتنا نزدیک تو نہ تھا کہ دونوں میں ٹکر ہو جاتی، لیکن اتنا نزدیک ضرور تھا کہ اس نے بڑی طاقت سے ہمارے سورج کو اپنی طرف کھینچا، جس سے ہمارے سورج کے مادے میں طوفان اٹھے اور اس کا گرم مادہ ایک کریلے کی صورت ابھر آیا۔ پھر یہی ابھارا یا کریلا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کٹ کٹ کر نو زمینوں اور ان کے چاندوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہمارے سورج کے خاندان میں نو زمینیں ہیں جن میں سے ہماری زمین سورج سے اپنے فاصلے کے لحاظ سے تیسرے درجے پر ہے۔ اس کے بعد باقی زمینیں سورج سے زیادہ سے زیادہ

فاصلے پر اپنے اپنے راستے پر سورج کے گرد گھومتی رہتی ہیں۔ پس اس وسیع خلا میں گیس کے بادلوں سے پیدا ہونے والی بے شمار کہکشائیں ہیں۔ ان میں سے ایک کہکشاں کے کروڑوں ستاروں میں درمیانے درجے کے ایک ستارے، یعنی سورج کے خاندان کی نو زمینوں میں سے ایک زمین یہ جس پر ہم بستے ہیں۔ یہ زمین بھی سورج کے دوسرے زمینی گولوں میں درمیانے درجے کی حیثیت رکھتی ہے۔ بعض زمینیں اس سے چھوٹی اور بعض اس سے بڑی ہیں۔ خلا میں جتنی کہکشائیں اور سورج، زمینیں، چاند اور دوسرے گولے موجود ہیں ان سب کی خصوصیت ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ سب کے سب حرکت میں ہیں، اور کوئی بھی تمام وقت ایک جگہ پر نہیں رہتا۔ چاند زمین کے گرد گھومتا ہے اور اپنے گرد بھی۔ زمین اپنے گرد گھومتی ہے اور اپنے اپنے چاند ساتھ لیے سورج کے گرد بھی۔ سورج اپنے گرد گھومتا ہے اور اپنے خاندان کی زمینیں اور ان کے چاند اپنے ساتھ لیے کہکشاؤں کے اندر ایک سو پچاس میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چکر کاٹتا ہے اور آخر میں کہکشاں اپنے تمام سورج اور ان کے خاندانوں کو ساتھ لیے حرکت میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرکت اور صرف حرکت ان کا سب سے بڑا کام ہے۔

زمین اپنی ابتدا میں، اپنی زندگی کے حالات اور اس پر بسنے والے طرح طرح کے جان داروں کے ہوتے ہوئے بھی خلا میں ایک ذرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس جیسی بلکہ اس سے بڑی کروڑوں زمینیں خلا میں موجود ہیں۔

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ زمین، سورج اور اس کے خاندان کے دوسرے گولے آج سے تقریباً ساڑھے چار سو کروڑ سال پہلے گرم گیس کے مادے سے پیدا ہوئے۔ اس عرصے میں ہماری زمین ٹھنڈی ہو ہو کر اور جان داروں کو جنم دے دے کر اپنی آج کی صورت کو پہنچی ہے۔

چوں کہ ہماری زمین سورج کے گرد انڈے کی شکل کے راستہ پر گھومتی ہے اس لیے سورج سے اس کا فاصلہ کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتا ہے۔ سورج سے زمین کا کم سے کم فاصلہ نو کروڑ پندرہ لاکھ میل اور زیادہ سے زیادہ نو کروڑ پینتالیس لاکھ میل ہوتا ہے۔

زمین پورے چوبیس گھنٹے میں اپنے گرد ایک چکر پورا کرتی ہے۔ وہ اس چکر میں ہمیں بھی اپنے ساتھ لیے پھرتی ہے۔ اس چکر میں اس کی رفتار ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ اس رفتار اور

حرکت کا ہمیں بالکل احساس نہیں ہوتا ۔ اس لیے کہ زمین کے ساتھ اس کی ہر شے بلکہ اس کی ہوا بھی حرکت کرتی ہے اور پھر راستے میں نہ کوئی رکاوٹ ہوتی ہے اور نہ کہیں ٹھوکر لگتی ہے ۔ اس حرکت کا احساس ہمیں صرف چاند، سورج اور ستاروں کی بدلتی ہوئی جگہ سے ہوتا ہے جو مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے، دکھائی دیتے ہیں ۔ اصل میں جب زمین اپنے گرد مغرب سے مشرق کی طرف گھومتی ہے تو چاند، سورج اور ستارے مشرق سے مغرب کی طرف جاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔

رات اور دن کا باری باری ظاہر ہونا، ستاروں کی آسمان میں حرکت، چاند کا نکلنا اور چھپ جانا، سبھی زمین کے اپنے گرد گھومنے کا نتیجہ ہے ۔

زمین اپنے گرد گھومنے کے علاوہ سورج کے گرد بھی ایک انڈے کی شکل کے راستے پر گھومتی ہے ۔ یہ راستہ زمین پورے ایک سال میں طے کرتی ہے ۔ اس راستے پر اس کی رفتار چھیاسٹھ ہزار میل فی گھنٹہ ہے ۔ گویا ایک سال میں زمین اس راستے پر ستاون کروڑ اکیاسی لاکھ ساٹھ ہزار میل کا فاصلہ طے کرتی ہے ۔ اس حرکت کا یہ مطلب بھی ہے کہ زمین پر سے سال کے مختلف حصوں میں ستاروں کے مختلف جھنڈ دکھائی دیں گے ۔

زمین کی اس حرکت سے موسم بدلتے ہیں ۔ کبھی گرمی، کبھی سردی، کبھی بہار اور کبھی خزاں کے موسم اسی حرکت سے پیدا ہوتے ہیں ۔ پھر یوں بھی ہے کہ جب زمین کے شمالی نصف حصے میں گرمی کا موسم ہوتا ہے تو جنوبی نصف حصے میں سردی کا موسم ہوتا ہے ۔ اور جب شمالی نصف حصے میں سردی کا موسم ہوتا ہے تو جنوبی نصف حصے میں گرمی کا موسم ہوتا ہے ۔ زمین کے شمالی اور جنوبی حصوں میں موسموں کا فرق ان حصوں کی سورج سے دوری یا قرابت کی وجہ سے ہوتا ہے، کبھی راتیں چھوٹی ہوتی ہیں اور دن بڑے ہوتے ہیں اور کبھی راتیں بڑی اور دن چھوٹے، جب کہ کبھی دن اور رات برابر ۔ یہ تبدیلیاں زمین کی سورج کے گرد کی حرکت سے ہی پیدا نہیں ہوتیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ زمین سورج کے گرد اپنے راستے پر کس قدر تیز چلتی ہے ۔ اس کے ٹیڑھے ہونے کی وجہ سے اس کے مختلف حصوں کی روشنی کبھی سیدھی اور کبھی ترچھی پڑتی ہے ۔ جس کی وجہ سے سردی اور گرمی کے موسم اور دن اور رات کے وقتوں میں فرق ظاہر ہوتا ہے ۔

خلا میں زمین کی حیثیت کچھ بھی ہو، پھر بھی ہمارے نزدیک وہ اتنی چھوٹی بھی نہیں ۔ اس کے درمیانی حصے پر ایک طرف سے دوسری طرف بیچوں بیچ کا فاصلہ کوئی سات ہزار نو سو ستائیس میل ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے

کہ زمین بالکل گیند کی مانند گول نہیں بلکہ سنگترے کی طرح اوپر اور نیچے کی جانب اندر کی طرف پچکی ہوئی ہے۔ اس کی خشکی کے علاقے بھی ہموار نہیں۔ برصغیر پاک وہند کے شمال میں ہمالیہ، جنوبی امریکہ میں انڈیز اور شمالی امریکہ میں راکیز کے اونچے اونچے پہاڑوں کے علاوہ سینکڑوں چھوٹے چھوٹے پہاڑوں نے زمین کے چہرے کو کہیں اونچا اور کہیں نیچا کر رکھا ہے۔

وہ چھپی ہوئی زنجیر، جس نے ہمیں زمین کے ساتھ باندھ رکھا ہے اور جو ہمیں زمین سے خلا میں اڑ جانے یا گر جانے سے روکتی ہے، کشش ثقل کہلاتی ہے، یہ وہی طاقت ہے جو نہ صرف سیب کو شاخ سے نیچے کھینچ لیتی ہے بلکہ چاند، سورج اور خلا کے دوسرے گولوں پر بھی چھائی ہوئی ہے۔ اور ایک کو دوسرے سے باندھ کر خاص راستوں پر چکر کاٹنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کشش کے باعث جو اشیا ہوا میں اوپر کی طرف پھینکی جاتی ہیں، واپس زمین پر آ رہتی ہیں۔ لیکن شاید آپ کو معلوم ہو کہ آج ہم اس زنجیر کو توڑنے میں کامیاب ہو چکے ہیں اور اس سے پورے طور پر آزاد ہو سکتے ہیں۔ کشش کی اس زنجیر کو توڑنے کے لیے ضروری تھا کہ ہماری ابتدائی رفتار سات میل فی سیکنڈ ہو اور یہ رفتار صرف آج کے راکٹ اور اس میں جلنے والا ایندھن ہی حاصل کر سکتا ہے۔

آج زمین کے چوتھے حصے پر خشکی کے بڑے بڑے ٹکڑے ہیں اور باقی چوتھائی حصے پر گہرے اور وسیع سمندر ہیں۔ خشکی پر آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ ہیں۔ ان پہاڑوں پر برف وباراں سے ندیوں اور دریاؤں میں پانی آتا ہے۔ یہ پانی خشکی پر سے گزر کر پھر سمندر میں چلا جاتا ہے۔ زمین کے ہوائی غلاف میں آکسیجن اور نائٹروجن گیسیں خاصی مقدار میں موجود ہیں۔ اس سے ہوا میں خشکی کے جان دار سانس لیتے ہیں اور جلنے کا کام ممکن ہوتا ہے آکسیجن گیس کے بغیر نہ کوئی چیز جل سکتی ہے اور نہ ہی سانس لی جا سکتی ہے۔

زمین کی خشکی پر اور اس کے سمندروں، دریاؤں، جھیلوں اور ندی نالوں میں قسم قسم کے حیوانات اور نباتات اپنی اپنی زندگی کے دور پورے کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر شاید آپ سوال کریں کہ زمین اور اس کے حیوانات اور نباتات کی صورت ابتدا سے ایسی ہی ہے یا یہ کہ اس کی آج کی صورت کروڑوں سالوں میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے۔

سنو: زمین شروع میں اپنے پھیلاؤ کے لحاظ سے آج کے مقابلے میں دو ہزار گنا بڑی تھی۔ لیکن اس کی ساڑھے چار سو کروڑ کی عمر میں اس کی بھاری دھاتیں اس کے اندر درمیان میں چلی گئیں۔ اس درمیانی حصے کے

گرد ہلکی گیسوں کا غلاف لپٹا رہا۔ یہ گیسیں زیادہ تر ہیلیم اور ہائڈروجن تھیں۔ اس دوران میں سورج بھی چھوٹا ہوتا رہا اور ایک وقت ایسا آپہنچا کہ جب وہ اپنے گاڑھے پن کے ایسے نقطے پر پہنچ گیا کہ اس میں ایٹم ٹوٹنے لگے اور پھر آپس میں ملنے بھی لگے۔ اس عمل سے سورج کی گرمی اور روشنی ہر طرف پھیلنا شروع ہوئی۔ اس سے پہلے سب کچھ تاریکی میں ہو رہا تھا۔ لیکن اب سورج کی روشنی اور گرمی قریب کی زمینوں سے ان کے گیسی غلاف اڑا لے گئی۔ زمینیں گرم ہونا شروع ہو گئیں۔ کروڑوں سالوں کے اس عمل سے قریب کی زمینیں ننگے اور گرم گولوں میں بدل گئیں اور صرف دور کی زمینوں کا گیسی غلاف بچا رہا۔

زمین کے گاڑھے درمیانی حصے کے اور زیادہ گاڑھا ہونے کی صورت میں بعض ایٹمی طاقت مہیا کرنے والی دھاتوں کی موجودگی نے اس کی گرمی میں اضافہ کرنا شروع کر دیا اور زمین ایک پگھلے ہوئے مادے کا گولہ بن گئی۔ لیکن جوں ہی زمین کا مادہ زیادہ گاڑھا ہونے سے رک گیا اور ایٹمی طاقت مہیا کرنے والی دھاتیں ختم ہو گئیں تو اس نے ٹھنڈا ہونا شروع کر دیا، جو عمل آج تک جاری ہے۔

زمین کو اپنے ابتدائی گرم دور کے بعد ٹھنڈا ہونے کے لیے بہت وقت کی ضرورت تھی۔ یہ کروڑوں سال ٹھنڈی ہوتی رہی اور اس نے ٹھوس صورت اختیار کی۔ پھر اور ٹھنڈی ہوئی تو بجلی، بارش اور ہواؤں کے سخت طوفان اٹھے۔ سمندروں کی گہرائیاں پانی سے بھر گئیں۔ بعض گیسیں اتنی ٹھنڈی نہ ہو سکیں کہ مائع بن جائیں اور وہ آج بھی فضا میں اسی طرح موجود ہیں۔ زمین کا یہ دور، چار سو کروڑ سالوں تک جاری رہا۔ اس دور میں زمین کے اندر سے پگھلا ہو گرم مادہ باہر نکل کر بہتا رہا۔ اس کے خشکی کے ٹکڑے بنتے اور بگڑتے رہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب زمین کے پتھر اور مٹی کے غلاف پر پہاڑ اور جھیلیں ظاہر ہوئیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ سب ایک دفعہ پیدا ہو گئے۔ بلکہ ان کو ان کی آج کی صورت کو پہنچنے کے لیے لاکھوں سال لگ گئے۔ پہاڑ زمین کے پیٹ سے آہستہ آہستہ باہر نکلے اور لاکھوں سالوں میں اونچے ہو ہو کر اپنی آج کی صورت کو پہنچے۔ تب زمین پر کسی قسم کی زندگی کے نشان نہ تھے۔ اس دور کی چٹانوں میں صرف نہایت سادہ قسم کی سمندری کائی اور بعض سمندری کیڑوں کے نشانات ملتے ہیں۔ اسی دور میں لوہے اور تانبے جیسی دھاتیں بھی بن چکی تھیں۔

اس کے بعد زمین کی کہانی کا دور آیا جو آج سے ساٹھ کروڑ سال پہلے شروع ہوا تھا اور آج سے تینتیس کروڑ سال پہلے تک جاری رہا۔ اس دور کی عمر اس لحاظ سے سینتیس کروڑ سال بنتی ہے۔ اس دور میں خشکی سے

گھرے ہوئے سمندروں میں "مٹی کی تہیں جمتی چلی گئیں اور پہاڑ اونچے ہوتے چلے گئے ۔ ریگستان پیدا ہوئے ۔ شمالی امریکہ اور یورپ میں وسیع جنگلات اُگ آئے جن میں کوئلے کے ذخیرے جمع ہوئے ۔ خشکی کے بہت سے حصے پانی کے نیچے چلے گئے ۔ ان کے ساتھ ساتھ سمندر میں کئی قسم کے پودے اور بغیر ہڈی کے جانور پیدا ہو گئے ۔ پھر سمندر میں مچھلیاں ظاہر ہوئیں اور خشکی پر مکڑا اور مچھر پیدا ہوئے ۔ اس کے بعد مینڈک کی قسم کے جانور پیدا ہوئے اور زمین کے پودوں نے جنگلوں کی صورت اختیار کی ۔ مینڈک کی قسم کے جانوروں کی پانی کے نزدیک خشکی پر کثرت ہوئی اور پانیوں میں مچھلیاں سب سے نمایاں ہوئیں ۔ پھر ایک مدت بعد چیل کی قسم کے پودے خشکی پر ہر جگہ پھیل گئے ۔ خشکی کے جانوروں میں مینڈک کی قسم کے جانوروں کے علاوہ رینگنے والے جانوروں نے سر نکالا ۔ کئی بڑے بڑے کیڑے پیدا ہوئے اور زمین پر ہر طرف پھیل گئے ۔ اسی دور میں رینگنے والے جانوروں میں سے ہاتھی سے بھی بڑے بڑے جانور پیدا ہوئے اور زمین پر ہر طرف پھیل گئے ۔ اسی دور کے آخر میں کچھ سادہ سے دودھ پلانے والے جانور بھی پیدا ہوئے جو انڈے دیتے تھے اور اپنے بچوں کو دودھ پلاتے تھے ۔

اس دور کے بعد آج سے تیئس کروڑ سال پہلے سے لے کر ایک کروڑ سال پہلے تک کا دور شروع ہوا ۔ اس دور میں پہاڑ پہلے کی طرح بڑھتے رہے اور کوئلے کی کانیں بننا شروع ہوئیں ۔ اسی دور میں برفانی دور بھی شروع ہوا اور خشکی پر بڑی بڑی جھیلیں پیدا ہوئیں ۔ رینگنے والے بڑے بڑے جانور سردی برداشت نہ کر سکے اور دنیا سے ختم ہونا شروع ہو گئے ۔ اس کی جگہ پرندوں اور دودھ پلانے والے جانوروں نے لے لی ۔ یہ جانور اپنی تعداد اور اقسام میں بڑھنے شروع ہو گئے ۔ اب پھولوں والے پودے بھی پیدا ہو گئے اور ان کی تعداد اور اقسام میں بھی اضافہ ہوا ۔ امریکہ سے بندروں کا خاتمہ ہو گیا ۔ گھوڑوں نے امریکہ سے ایشیا اور یورپ اور شمالی امریکہ سے افریقہ جانا شروع کیا ۔ گھاس کی کئی اقسام پیدا ہوئیں اور گھاس کھانے والے جانوروں میں بہت اضافہ ہوا ۔ اس دور کے ختم ہونے کے قریب یعنی کوئی ایک کروڑ تیس لاکھ سال پہلے اس زمانے کے گھوڑے پیدا ہوئے اور اونٹ اور ہاتھی اپنی آج کی صورت کو پہنچے ۔

کوئی ایک کروڑ سال پرانی چٹانوں میں ابتدائی قسم کے انسان کی ہڈیوں کے نشان ملتے ہیں ۔ ہاتھی شمالی امریکہ میں پھیلے اور پھر غائب ہو گئے ۔ اب گیارہ ہزار سال سے انسان جانوروں میں سب سے اہم اور زمین پر

ان سب کا سردار ہے۔ زمین اور اس کی زندگی کی یہ مختصر سی کہانی انسان نے ان نشانات سے پوری کی ہے جو اس نے زمین کی چٹانوں میں پائے۔

زمین سورج کے خاندان کا سب سے زیادہ گاڑھا گولہ ہے۔ اس کا گاڑھا پن پانی سے تقریباً پانچ گنا ہے۔ زمین کے مرکز کا گاڑھا پن اس کی چٹانوں کے گاڑھے پن سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی مٹی اور چٹانوں کا غلاف جب بھی کہیں سے پھٹ جاتا ہے تو زلزلے آتے ہیں۔ جب تک زمین کے اندر کا حصہ ٹھنڈا ہو ہو کر چھوٹا ہوتا رہے گا۔ زمین کے باہر کا غلاف پھٹتا رہے گا اور زلزلے آتے رہیں گے۔

زلزلے کی لہروں اور ان کی پیمائش کے آلات کی مدد سے معلوم ہوا ہے کہ زمین کی مٹی اور چٹان کا غلاف سمندر کی تہ سے تین میل سے لے بیس میل تک نیچے چلا گیا ہے۔ لیکن زمین کی خشکی پر سے اس کی موٹائی تقریباً بیس سے لے کر چالیس میل تک چلی جاتی ہے۔ زمین کے اس غلاف کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ بھاری چٹانوں کا ہے جو ساری زمین کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے اور دوسرا حصہ اس کے اوپر ہے اور ہلکی چٹانوں کا ہے۔ زمین کے اوپر سے اس کے مرکز تک کا فاصلہ تقریباً چار ہزار میل کا ہے اور ہماری گہری سے گہری کانوں کی گہرائی دو میل سے زیادہ نہیں۔ مٹی اور چٹانوں کے غلاف کے نیچے بھاری چٹانوں کا ایک غلاف اور بھی ہے جو پانی سے تقریباً پانچ گنا گاڑھا ہے اور اس کی گہرائی اٹھارہ سو میل تک چلی گئی ہے۔ اس کے نیچے ایک ہزار تین سو پچاس میل گہری پگھلے ہوئے لوہے کی تہ ہے۔ جس کے بعد زمین کے مرکز تک آٹھ سو میل تک پھر نکل اور لوہے کا ٹھوس گولہ ہے۔ اپنے گاڑھے پن کے لحاظ سے زمین کا مرکزی حصہ سب سے بھاری اور گاڑھا ہے اور زمین کا وزن زیادہ تر اسی کی وجہ سے ہے۔ اس کے اتنے وزنی ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زمین پر سے ہر ساٹھ فٹ کی گہرائی پر گرمی ایک درجہ فارن ہائیٹ بڑھ جاتی ہے اور زمین کے مرکز میں گرمی تقریباً چار ہزار درجہ فارن ہائیٹ سے لے آٹھ ہزار درجہ فارن ہائیٹ تک ہو جاتی ہے۔

زمین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایک مقناطیس کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس کے شمالی حصے میں زمینی مقناطیس کا شمالی سرا اور جنوبی حصے میں مقناطیس کا جنوبی سرا ہوتا ہے۔ زمین کے شمالی حصے کو ہم قطبِ شمالی اور جنوبی حصے کو قطبِ جنوبی کہتے ہیں۔

زمین کا ہوائی غلاف اگرچہ دکھائی نہیں دیتا لیکن ہوا کا یہ غلاف زمین کو اپنی حفاظتی لپیٹ میں لیے ہوئے

ہے۔ یہ غلاف سورج اور خلا سے آنے والی بعض مہلک شعاعوں کو ہم تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ خلا سے گرنے والے پتھر اور لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اسی غلاف میں جل کر راکھ ہو جاتے ہیں یہ غلاف زمین کو خلا کی سردی سے محفوظ رکھتا ہے اور سورج سے حاصل کی ہوئی گرمی کو ضائع ہونے سے روکتا ہے۔ فضا کا وہ حصہ جس میں ہم بستے ہیں زمین سے صرف پانچ دس میل تک اوپر کی طرف پھیلا ہوا ہے اس میں ہوائی لہریں چلتی ہیں جن سے موسموں میں تبدیلی آتی ہے۔ اس سے اوپر دس سے پندرہ میل تک ہوا کی ایسی تہ ہے جس میں گندھک کے مرکبات پائے جاتے ہیں۔ یہ ذرے بارش کے برسنے میں مدد دیتے ہیں اس کے اوپر اوزون (آکسیجن کی ایک قسم) گیس کی ایک تہ آتی ہے جو سورج سے آنے والی مہلک شعاعوں کو روکتی ہے اس طرح زمین پر جانداروں کو زندہ رہنے میں مدد ملتی ہے۔ اوزون سے اوپر کی ہوا میں خلا سے گرنے والے پتھر اور لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد چھ سو پچاس میل کی اونچائی تک آکسیجن موجود ہوتی ہے اگرچہ اس کی مقدار نیچے سے اوپر جاتے ہوئے لگاتار کم ہوتی جاتی ہے۔ چھ سو پچاس میل کی اونچائی سے اوپر بائیس سو میل کی اونچائی تک ہائیڈروجن گیس کے ذرات پائے جاتے ہیں۔ اس اونچائی تک کی تمام گیسیں زمین کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی رہتی ہیں۔

یہی وہ فضا ہے جس میں بادل پیدا ہوتے ہیں اور بجلی چمکتی اور کڑکتی ہے۔ اس میں تیز ہوائیں چلتی ہیں اور سمندروں میں طوفان آتے ہیں۔ لیکن جاندار اس فضا کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔ سانس لینا یعنی آکسیجن حاصل کرنا زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے جو صرف فضا سے پوری ہوتی ہے۔

سمندر اپنی وسعت میں خشکی سے کہیں بڑا ہے۔ زمین پر خشکی پانی کی صرف ایک تہائی ہے۔ سمندروں کی گہرائیاں مختلف جگہوں پر مختلف ہیں۔ اس کی زیادہ سے زیادہ گہرائی سات میل ہے۔ اس کے مقابلے میں اونچے سے اونچا پہاڑ چھ میل سے کچھ کم اونچا ہے۔ سمندروں کی وسعت خشکی پر آب وہوا کو اعتدال پر رکھتی ہے۔ ان کے پانی دور دور کی خشکیوں کو جہاز رانی کی مدد سے ملا دیتے ہیں۔ یہ پانی کا ایک ایسا ذخیرہ ہے۔ جس سے سورج کی گرمی بخارات بناتی ہے اور فضا کی ہوائیں ان کو بادلوں کی صورت میں اڑا کر لے جاتی ہیں جو پہاڑوں پر میدانوں میں بارش برساتے ہیں۔ زمین کی پیاس بجھاتے ہیں اور ندی نالوں اور دریاؤں کے ذریعے پھر سے سمندروں میں چلے جاتے ہیں۔ انسان کی کھیتی باڑی اور پینے کے پانی کا یہی اصل ذریعہ ہیں۔

زمین کی خشکی اور سمندر کے پانی میں قدرت نے دھات اور کوئلے کے ذخیرے جمع کر رکھے ہیں۔ جہاں اس کے چٹانی غلاف میں لوہا، کوئلہ، اور تیل جگہ جگہ موجود ہے، وہاں سمندر کے پانی میں بھی اس دولت کی کمی نہیں ہے۔ اس کے پانی میں مچھلیاں اور دوسرے کئی اقسام کے جانور ہیں۔ ان میں خاص اقسام کے پودے اگتے ہیں جو انسان کے لیے خوراک کا ایک ختم نہ ہونے والا ذریعہ ہیں۔

اب شاید آپ یہ سوال کریں کہ آخر یہ زمین اور سورج کب تک ایسے ہی رہیں گے جیسے کہ آج ہیں۔ کیا سورج ہمیشہ زمین پر اپنی گرمی اور روشنی بکھیرتا رہے گا؟ اور انسان یہاں ہمیشہ اسی صورت میں رہے گا؟ یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ کوئی چیز ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی اور وقت کے گزرنے سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ یہ زمین اور سورج بھی ایسے کے ایسے رہیں؟ سائنس دانوں نے آنے والے کروڑوں سالوں کے متعلق بھی کچھ غور و فکر کیا ہے اور مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ زمین پر ہونے والے واقعات بہت کچھ سورج سے متعلق ہیں۔ سائنس دانوں نے خلا میں سورج کے سے کئی ستاروں کو ان کی ابتدائی حالتوں سے لے کر ان کی آخری حالتوں تک کی تمام صورتوں کو آسمان میں دیکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تقریباً پانچ سو کروڑ سال بعد جب سورج اپنے ہائیڈروجن کے ایٹمی ایندھن کے ساتویں حصے کو ہیلیم گیس میں تبدیل کر چکے گا تو ہیلیم کی راکھ اس کے مرکز میں پھر سے جل اٹھے گی، جو پہلے سے زیادہ گرم ہوگی اور اس کی وجہ سے سورج کی روشنی اور گرمی زیادہ تیزی سے نکلنا شروع ہوگی۔ سورج خون کی طرح سرخ ہونا شروع ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ پھیلتا چلا جائے گا۔ وہ اپنے پھیلاؤ میں اپنی قریب کی زمینوں تک پہنچ جائے گا۔ تب اس کی گرمی اس قدر ہوتی ہے کہ اس میں سکہ، ٹین اور جست سبھی پگھل کر پانی بن جاتے ہیں۔ تب سمندروں کے پانی زمین کے گرد بھاپ کا ایک غلاف بن جائیں گے۔

اپنے پھیلاؤ کے بعد سورج آہستہ آہستہ چھوٹا ہونا شروع ہو جائے گا۔ سورج کی حرارت میں کمی کی وجہ سے بھاپ کا غلاف ایک بار پھر زمین پر بارش کے طوفان پیدا کر دے گا۔ سورج چند کروڑ سال اپنی نیلی نیلی روشنی زمین پر بھیجتا رہے گا اور اپنے ایٹمی ایندھن کو دھاتوں میں تبدیل کرتا رہے گا۔

اپنے بڑھاپے کے زمانے میں سورج اپنی بے ترتیب حالتوں سے گزرے گا جن کے دوران میں اس کے باہر کے غلاف کے پھٹنے سے اس کے اندر کے شعلے زمین پر مہلک شعاعوں کے تیر برساتے رہیں

گے۔ آخر کار جب یہ اپنی ساری طاقت خرچ کر چکے گا تو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گا۔ زمین کے پانی سردی کی وجہ سے پھر برف میں بدل جائیں گے اور جیسے جیسے سورج ٹھنڈا ہوتا چلا جائے گا، وہ اپنے ہی وزن کے نیچے دب کر چھوٹا بھی ہوتا چلا جائے گا۔ لیکن پھر بھی کئی کروڑ سال تک مدھم سی روشنی سے چمکتا رہے گا۔ سورج کے چھوٹا ہو جانے سے زمین کے اس کے گرد چکر کاٹنے کے راستے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ آخر سورج اپنی چھ ہزار کروڑ سال کی زندگی گزارنے کے بعد سیاہ رنگ کے ایک معمولی گولے میں بدل جائے گا لیکن پہلے کی طرح خلا میں چکر کاٹتا رہے گا۔ اگرچہ وہ چھوٹا ہو جائے گا پھر بھی اس کے مادے کی مقدار میں معمولی کمی واقع ہو گی اور اسی لیے وہ زمین کو اپنی غلامی سے آزاد نہیں کرے گا۔

آپ حیران ہوں گے کہ انسان ان حلات میں کیا کرے گا۔ انسانی علم کی آج کی ترقی آپ کے سامنے ہے۔ آپ اندازہ کر لیں کہ آج سے پانچ کروڑ سال کے بعد انسانی علم نے کیا کچھ کر لیا ہو گا، ممکن ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ انسان اس وقت تک سورج کی گرمی اور اس کی مہلک شعاعوں سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنے کے قابل ہو چکا ہو اور سورج کی گرمی ختم ہو جانے پر سردی اور تاریکی کے مقابلہ کے لیے بہت بڑی ایٹمی طاقت حاصل کرنے کا بندوبست کر چکا ہو گا۔

خیال ہے کہ اس وسیع خلا کی تسخیر انسان کی تقدیر ہے اور اس کی فنا کا فی الحال کوئی امکان نہیں۔

☆☆☆☆

ذوالفقار احمد تابش

سخاوت

ہارون رشید کا وزیر جعفر برمکی اس کا بڑا چہیتا وزیر تھا۔ ہارون اسے بے حد عزیز رکھتا تھا اور کوئی کام بھی اس کے مشورے کے بغیر نہ کرتا تھا۔ ایک طویل عرصے تک یہی حال رہا کہ جعفر ہارون کو اور ہارون جعفر کو جب تک دیکھ نہ لیتے انھیں چین نہ آتا۔ وہ آقا اور ملازم سے زیادہ ایک دوسرے کے دوست اور بھائی تھے۔

جعفر جہاں اتنا عزت اور مرتبے والا آدمی تھا وہاں اللہ نے اس کے دل میں سخاوت کا جذبہ بھی کوٹ کوٹ کر بھر رکھا تھا۔ کوئی بھی سوال کرنے والا اس کے دروازے سے خالی لوٹ کر نہ جاتا تھا۔ بلکہ مانگنے والا ہمیشہ اپنی توقع سے کہیں زیادہ پاتا تھا۔ اس کی سخاوت کے چرچے سارے عرب بلکہ ساری دنیا میں تھے اور لوگ دور دور سے اس کے پاس اپنی حاجت لے کر آتے تھے۔ جعفر بھی انھیں کبھی مایوس نہ کرتا تھا۔

لیکن ایک بار ایسا ہوا کہ ہارون رشید جعفر سے ناراض ہو گیا۔ یہ ناراضی اس حد تک بڑھی اور ہارون کا غصہ اس انتہا کو پہنچ گیا کہ اس نے جعفر کو پھانسی دلوا دی۔ یہی نہیں اس نے حکم دیا کہ اس کی ساری جائیداد ضبط کر لی جائے اور اگر کوئی اس کو یاد کرے یا اس کی یاد میں روئے اسے بھی پھانسی دے دی جائے۔ چناں چہ لوگ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ لیکن لوگوں کے دلوں اور حافظوں میں جعفر کی سخاوت اور رحم دلی کے قصے اسی طرح محفوظ رہے۔

ایک عرب بدو دور ریگستان میں رہتا تھا اور ہر سال جعفر کی شان میں قصیدہ لکھ کر لایا کرتا تھا جعفر اسے بہت سا انعام دے کر رخصت کیا کرتا تھا اور وہ بدو خوش خوش اپنے بال بچوں میں لوٹ جایا کرتا تھا۔ سچی بات ہے کہ جعفر کی سخاوت پر ہی اس کی اور اس کے بال بچوں کی گزر بسر ہو رہی تھی۔ اس سال جب وہ ہر معاملے اور اس حادثے سے بے خبر اپنا قصیدہ لے کر بغداد میں آیا تو اس نے دیکھا کہ جعفر کے مکان کی جگہ ایک کھنڈر ہے اور جعفر کی جگہ اس کی لاش لٹک رہی ہے۔

یہ دیکھ کر بدو کو جو صدمہ ہوا بیان نہیں ہو سکتا۔ اس نے لاش کے قریب پہنچ کر اپنی اونٹنی روکی اور نیچے اتر کر بہت رویا۔ چوں کہ رات کا وقت تھا اس لیے کسی نے اسے نہ دیکھا ورنہ بادشاہ کے مقرر کیے ہوئے جاسوس

اسے فوراً پکڑ کر لے جاتے۔

بدو دیر تک جعفر کی لاش کے پاس روتا رہا۔ حتیٰ کہ اسے نیند آ گئی۔ خواب میں اس نے جعفر کو دیکھا جو اس سے کہہ رہا تھا۔

"اے دوست تو اس بار بھی قصیدہ لے کر ہمارے پاس آیا لیکن اس حال میں پایا......... تیری اس تکلیف کا ہمیں بے حد افسوس ہے مگر تو مایوس نہ ہو۔ اس بار بھی ہم تجھے خالی ہاتھ نہ بھیجیں گے۔ تو ایسا کر کہ بصرے چلا جا۔ وہاں اس نام کا ایک سوداگر ہے اس کے پاس جا کر ہمارا نام لینا اور سلام کہنا۔ اسے بتانا کہ جعفر اب اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے مگر اس نے مجھے خواب میں پیغام دیا ہے کہ پھلیوں کے بدلے میں مجھے کچھ دے۔"

اتنا خواب دیکھ کر بدو کی آنکھ کھل گئی۔ وہ روتا ہوا اپنی اونٹنی پر بیٹھا اور اسی وقت بصرے کو روانہ ہو گیا۔

بصرے پہنچ کر اس نے جعفر کے بتائے ہوئے نام کا سوداگر بھی تلاش کر لیا۔ تب اس نے سوداگر کو بتایا کہ تیرا دوست جعفر اس دنیا میں نہیں۔ اسے ہارون الرشید نے مروا دیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ وہ سوداگر سر پیٹنے اور زور زور سے رونے لگا۔ وہ بے چارا دیر تک روتا رہا۔ جب اس کے حواس قدرے بہتر ہوئے تو اس نے بدو کو بڑی عزت کے ساتھ بٹھایا۔ بدو نے اسے جعفر کا پیغام دیا۔ پیغام سن کر سوداگر پھر دیر تک روتا رہا اور جعفر کو یاد کرتا رہا۔

تین دن تک سوداگر نے بدو کو اپنا مہمان رکھا اور اس کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ تب بدو نے رخصت کی اجازت مانگی۔ سوداگر نے اسے ڈیڑھ ہزار دینار پیش کیا اور کہا۔

"ایک ہزار دینار تو جعفر کے حکم پر پیش کرتا ہوں۔ یہ پانچ سو دینار میری طرف سے ہیں۔"

بدو نے اس کا شکریہ ادا کیا تو سوداگر بولا۔

"دوست میرا شکریہ مت ادا کر کیوں کہ جو کچھ میرے پاس ہے جعفر ہی کی طفیل ہے۔ شکریہ اس کا ادا کر اور ہاں تو معمول کی طرح ہر سال آیا کر اور اسی طرح ایک ہزار دینار لے جایا کر۔"

بدو بڑا خوش ہوا اور اس کی نیک دلی اور سخاوت کی تعریف کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"مگر بھائی یہ تو بتا کہ یہ پھلیوں کا قصہ آخر ہے کیا؟"

تاجر کچھ دیر تک تو خاموش سوچتا رہا پھر بولا "یہی تو وہ قصہ ہے جہاں سے میری تقدیر بنی اور ایک معمولی

انسان سے بصرے کا بہت بڑا تاجر بن گیا۔ ‘‘

’’وہ قصہ مجھے بھی سنا۔ ‘‘ بدو نے کہا۔

’’ہوا یوں کہ ایک زمانہ تھا جب میں ایک بالکل معمولی آدمی تھا اور بے حد غریب۔ میرا کوئی ذریعہ روزگار نہ تھا۔ چھابڑی میں چیزیں رکھ کر بیچتا تھا اور جو چار پیسے بچ جاتے تھے انھی سے میری بھلی گزر بسر ہو جاتی تھی لیکن تنگ دستی شدید تھی اور میں بے حد پریشان رہتا تھا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ موسم بہت خراب تھا۔ میں اپنی چھابڑی اٹھا کر گھر سے پھلیاں بیچنے نکلا۔ لیکن اچانک بارش شروع ہو گئی۔ سردی پہلے ہی کافی تھی۔ میرے بدن پر اتنے کافی کپڑے بھی نہ تھے جو مجھے سردی اور بارش سے بچا سکتے چناں چہ میرا بدن کانپ رہا تھا اور بالکل بھیگا ہوا گلیوں میں پھر رہا تھا۔ ایسے میں بھلا میری مونگ پھلیاں کون خریدتا۔ میں سخت پریشان تھا کہ شاید آج رات بھوکا ہی سونا پڑے۔

اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت جعفر اپنے محل کے چھجے تلے بیٹھا تھا۔ اس کے دوست اور کنیزیں اس کے پاس تھیں اور وہ سب بارش کا نظارہ کر رہے تھے۔ اسی وقت میں بھی وہاں سے گزر رہا تھا۔ اچانک جعفر کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے جو مجھے اس برے حال میں دیکھا تو اسے ترس آ گیا۔ اس نے نوکر کو میرے پیچھے دوڑایا جو مجھے بلا کر لے گیا۔

جعفر نے مجھے دیکھا تو کہا ’’ہم مونگ پھلیاں خریدنا چاہتے ہیں۔ ‘‘

’’بسم اللہ‘‘ میں نے کہا ’’میں بیچنے کے لیے ہی نکلا ہوں۔ ‘‘

اب یوں ہوا کہ جعفر کے سارے دوست اور اس کی کنیزیں باری باری مجھ سے مونگ پھلیاں لینے لگے۔ میں ایک برتن میں ناپ ناپ کر مونگ پھلیاں انھیں دیتا جاتا تھا اور ان میں ہر ایک اس برتن کو اشرفیوں سے بھر کر مجھے واپس کر دیتا تھا۔ یوں تھوڑی ہی دیر میں مونگ پھلیاں ختم ہو گئیں اور میرے پاس اتنی اشرفیاں جمع ہو گئیں کہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی ہوں گی۔ اتنے میں جعفر بولا۔

’’کیا اور مونگ پھلیاں بھی ہیں؟ ‘‘

میں نے کہا: ’’جی نہیں! ختم ہو گئیں۔ ‘‘ لیکن اچانک میری نظر ایک مونگ پھلی پر پڑی جو ٹوکرے میں ایک طرف پڑی تھی۔ میں نے وہ اٹھا کر جعفر کی خدمت پیش کر دی۔

جعفر نے وہ مونگ پھلی ہاتھ میں لے کر اسے دو ٹکروں میں تقسیم کر دیا ایک حصہ خود رکھ لیا اور دوسرا اپنی

ایک کنیز کو دیتے ہوئے پوچھا۔

’’بول یہ آدھی مونگ پھلی تو کتنے میں خریدتی ہے؟‘‘

’’اس نے کہا ان دگنی اشرفیوں میں جتنی اب اس کے پاس ہیں۔‘‘

میں تو یہ سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ کیوں کہ میرے پاس تو ڈھیر ساری اشرفیاں تھیں اور کنیز ان سے دگنی اشرفیوں میں صرف آدھی مونگ پھلی خرید رہی تھی۔ اتنے میں کنیز نے اپنی ایک نوکرانی کو اشارہ کیا اور اس نے میری اشرفیاں گنیں اور فوراً اس سے دوگنی اشرفیاں لا کر میرے حوالے کر دیں۔ کنیز نے آدھی مونگ پھلی خرید لی۔ میں نے اب ساری اشرفیاں ایک جگہ جمع کیں اور چاہا کہ اجازت لے کر چلوں مگر جعفر نے کہا۔

’’ٹھہرو بھئی! ابھی آدھی مونگ پھلی جو ہمارے حصے میں آئی ہے اس کی قیمت ادا کرنا باقی ہے۔ ہم یہ آدھی مونگ پھلی ساری اشرفیوں سے دوگنی اشرفیوں میں خریدتے ہیں۔ چناں چہ جتنی اشرفیاں اس وقت میرے ہاں تھیں ان سے دوگنی اشرفیاں مجھے پھر مل گئیں۔ میں جعفر کو اور اس کے بال بچوں، دوستوں اور کنیزوں کو دعائیں دیتا ہوا ساری اشرفیاں اٹھا کر وہاں سے چلا آیا۔ پھر میں بغداد چھوڑ کر بصرے چلا آیا اور اس دولت سے تجارت شروع کر دی۔ خدا نے برکت دی اور اب حال یہ ہے کہ میرا شمار بصرے کے بڑے تاجروں میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ سارا احسان جعفر کا ہے...... اسی کے سبب یہ عزت، یہ دولت اور نیک نامی مجھے حاصل ہے۔ اگر وہ اس روز سخاوت نہ کرتا تو میں شاید آج بھی بغداد کے گلی کوچوں میں مونگ پھلیاں بیچتا ہوتا۔ اب اگر میں جعفر کے نام پر تجھے ایک ہزار دینار سال کے سال دے دیا کروں تو یہ بڑی معمولی بات ہوگی۔‘‘

بدو نے جب اپنے محسن جعفر کے احسانوں اور اس کی سخاوت کی ایک اور کہانی سنی تو بڑا متاثر ہوا اور بولا:

’’جعفر واقعی بڑا سخی تھا۔ اس جیسے سخی روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ اس کی سخاوت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے مجھے اپنی وفات کے بعد بھی اپنے دروازے سے خالی نہیں جانے دیا۔ بلکہ پہلے مجھے ہزار دینار ملتے تھے آج وہ مجھے ڈیڑھ ہزار دینار دے کر بھیج رہا ہے۔ اس جیسا سخی اب کبھی پیدا نہیں ہوگا۔‘‘

☆☆☆☆

احمد ندیم قاسمی

بچپن مجھے عزیز ہے!

افلاس وتمول (یعنی غربت اور خوشحالی) کا ایک دردناک مرکب ہونے کے باوجود مجھے میرا بچپن عزیز ہے۔ کبھی کبھی سوچنے لگتا ہوں کہ اگر میرا بچپن مسلسل امارت میں گزرتا تو مَیں وہ شدتِ احساس کہاں سے لاتا، جو اچھے ادب کی تخلیق کا نہایت اہم عنصر ہے۔ پھر خیال آتا ہے کہ اگر مفلسی کے ماحول میں مجھے امارت کی جھلکیاں دکھائی نہ دیتیں تو تقابل کی وہ تڑپ کہاں سے آتی جس کے بغیر زندگی صرف روتے بسورتے یا صرف ہنستے گزر جاتی ہے۔

ساڑھے چار برس کی عمر میں اپنے گاؤں کی مسجد میں عربی پڑھنے بیٹھا تو میرے ہم سبق میرا نیا نیا اور اچھا اچھا لباس دیکھ کر میری عزت کرنے اور کچھ اسی وجہ سے دور رہنے لگے۔ جب مَیں نے ایک روز باجرے کی روٹی میں ملی ہوئی سرخ مرچوں کی گیندی نکالی اور مزے سے کھانے لگا تو میرے ہم سبق حیران ہو کر میرے قریب کھسک آئے اور مجھے اپنا سمجھنے لگے۔

موٹا سا، تھن متھنا بچہ دیکھ کر مولوی جی نے پہلے ہی روز اعلان کر دیا کہ یہ لڑکا غبی (یعنی کند ذہن) ثابت ہوگا۔ ”موٹے لڑکے ذہین نہیں ہوتے، میرا ساٹھ برس کا تجربہ ہے۔“ لیکن یہاں تو امی کی طرف سے ہدایت ملی تھی کہ اچھا نہ پڑھو گے تو ہر روز بعد از دوپہر بھنے ہوئے چنوں اور گڑ کا ”راشن“ بند کر دیا جائے گا۔۔۔۔ اور ”بیٹا! جو بچے نالائق ثابت ہوتے ہیں انھیں مرنے کے بعد دوزخ میں جلایا جاتا ہے۔“ ایسے حالات میں جی لگا کر نہ پڑھنا زندگی اور آخرت دونوں سے دشمنی تھی۔

پانچ برس کی عمر میں پرائمری اسکول میں داخل ہوا اور پہلی جماعت کے ادنیٰ و اعلیٰ درجوں سے جو ”مانیٹری“ شروع کی ہے تو دسویں جماعت تک یہ ”ٹر“ میرے ساتھ رہی۔ اس کے بعد آب کاری کا سب انسپکٹر بنا، پھر اڈیٹر بنا۔ زندگی کی وہ آسائشیں اور ”عیاشیاں“ جو بچپن سے منسوب کی جاتی ہیں اور انسانی جسم کے نشوونما اور انسانی ذہن کے ارتقا کے لیے اہم سمجھی جاتی ہیں، میری دسترس سے دور رہی ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ بہت دیر تک رونے کے بعد جب مجھے ریوڑیاں خریدنے کے لیے ایک پیسہ ملا

تھا اور میں آنسوؤں کو ملے بغیر اسی حالت میں ریوڑیاں سے تل اتار کر ایک ننھی سی کنکری اٹھائی، اس پر ریوڑی کی شیرینی کو محنت سے رگڑا اور پھر اس پر تل چپکا کر یہ ”ریوڑی“ میں نے ایک دوست کو پیش کر دی۔ اس سنگین ریوڑی کو چباتے ہی وہ چلا چلا کر رویا تو آن کی آن میں سارا محلّہ میری شرارت کی نوعیت معلوم کر کے قہقہوں سے چھلک اٹھا۔

اب تو زندگی بہت آگے نکل آئی ہے، بچپن دُھندلا چکا ہے۔ نظریات بدل چکے ہیں۔ ماحول تبدیل ہو چکا ہے۔ بچپن کے کئی ساتھی ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکے ہیں۔ ساٹھ برس کا تھا تو ابا جو آخر عمر میں مجذوب سے ہو گئے تھے، چل بسے۔ بھائی جان کے بارے میں اتنا یاد ہے کہ ان کا تھپڑ میرے سامنے نیلے نیلے ستاروں کا ایک فوارہ چھوڑ دیتا تھا اور ان کی تھپکی مجھے ان سے لپٹ لپٹ کر رونے پر مجبور کر دیتی تھی۔ میری امی تو خیر میرے احساسات کی تشکیل کی سب سے بڑی معاون ہیں۔ انھوں نے مجھے خودداری، صداقت، غیرت مندی اور اولوالعزمی کے نہایت خاموش، مگر بے حد موثر سبق دیے اور اب میں اپنے بچپن کا تصور کرتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھ پر میری امی نے اپنے بازوؤں سے چھاؤں کر رکھی ہے۔

☆☆☆☆

اصغر ندیم سیّد

دُعا کا پلّو

مَیں ایک ڈرا ہوا بچہ تھا۔ مجھے دنیا کی ہر شے سے خوف آتا تھا۔ گھر سے باہر گلی میں گزرنے والا آدمی مجھے بچے اغوا کرنے والاخر کار لگتا تھا۔ گھر کے اندر اپنے والد سے ڈرتا تھا۔ ان کی موجودگی میں ہم سب بہن بھائی اِدھر اُدھر دبکے رہتے تھے۔ ایسے میں جس ہستی کے گرم گرم پَروں کے نیچے ہمیں پناہ ملتی وہ ہماری ماں تھیں۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ مَیں ان کے متعلق کچھ لکھ سکوں گا۔ جس ہستی کا عکس یا سایہ میرے پوری ذات میں گھل مل گیا ہو۔ اس سے محسوس تو کیا جا سکتا ہے اسے اظہار میں نہیں لایا جا سکتا۔ شاید مَیں اپنی ماں کی شخصیت کا بہت ہی مختصر حصہ اس تحریر میں دریافت کر سکوں۔ میری ساری یادیں کچی مٹی میں گندھی ہوئی ہیں۔ مَیں ایک کچے گھر میں پروان چڑھا ہوں اور مٹی میں سوتا جاگتا رہتا ہوں۔ ویسے بھی ملتان مٹی کا بنا ہوا شہر ہے اور شاید اسی وجہ سے اس کی بوباس میں صدیوں پرانی تہذیب اور تاریخ سانس لے رہی ہے۔ اس مٹی کی بڑی لذت ہے۔ اس میں آدمی کو اداسی ملتی ہے، عشق ملتا ہے، فقیری ملتی ہے، درد ملتا ہے، عاجزی ملتی ہے۔ اس شہر کے رہنے والوں کی نس نس میں رچی بسی ہے۔ مَیں نے ملتان کو اپنی ماں کے مزاج سے سمجھا ہے۔

میری ماں ایک غریب گھر سے دوسرے گھر میں خاموشی سے اُٹھ آئی جہاں اللہ نے انھیں جو پہلی اولاد بخشی وہ مَیں تھا اُوپر نیچے ہم پانچ بہن بھائیوں کو زندگی کے گرم اور سرد موسموں سے بچاتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر کبھی کس قسم کا شکوہ نہ اپنے خدا سے پیدا ہوا، نہ اپنے مجازی خدا سے۔ وہ ان ماؤں کی نمائندہ ماں ثابت ہوئی جو اپنے گھر کا ہر کام خود اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں۔ اور یاد رہے یہ وہ زمانہ تھا جب گھروں میں گیلی لکڑیوں کی آگ پر بغیر پریشر ککر کھانا پکا کرتا تھا اور دالیں ذرا دیر میں گلا کرتی تھیں۔ اپنی آدھی سانسیں وہ ہمیں گرمی مہیا کرنے کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔ آج بھی ان کی دعائیں چھتری بن کر میرے سر پر تنی ہوئی ہیں۔ وہ اللہ کے فضل سے آج بھی سارا کام اپنے ہاتھوں سے انجام دے رہی ہیں اور آج بھی ان کے ہاتھ کے کھانے کی لذت اسی طرح قائم ہے۔

اسی خوشبو کو جب مَیں نے اپنی بیوی کے کھانوں میں ڈھونڈنے کی کوشش کی تو بہت مشکل پیدا ہوئی۔ ہر

آدمی بیوی تو اپنی مرضی کی چاہتا ہے، لیکن اس کے ہاتھ میں ذائقہ ماں کا دیکھنا چاہتا ہے۔ شروع شروع میں مجھے اپنی بیوی کو کھانے کے ذائقے اور ترکیبیں سمجھانے میں کچھ وقت لگا، لیکن چوں کہ وہ خود بھی کھانے پکانے کا بہت شوق رکھتی تھی۔ اس لیے اس نے میری ماں کی طرح کھانوں میں روایتی لذت کو دریافت کر لیا۔

ہم نے سادہ زندگی دیکھی جو سائیکل کے دو پہیوں پر سوار ہوتی ہے اور اسی کی رفتار سے چلتی رہتی ہے۔ ہم نے آج کے ٹی وی پر دکھائے جانے والے گلیمر کی کوئی جھلک نہیں دیکھی تھی۔ اس لیے ہماری ماں نے ہمیں بڑے بڑے خواب نہیں دکھائے۔ اسے نہیں پتہ تھا کہ پاکستان کی سماجی زندگی میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہونے والی ہیں۔ اور کہاں کہاں سے ناجائز دولت گھروں میں گھر کرنے والی ہے اور گھر کیسے بدلنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ کیوں کہ اس کی ہتھیلی پر کوئی ایسی رقم نہیں آئی تھی جو مستقبل کے خواب خرید سکتی، اس لیے اس نے اپنے ہاتھ اپنے جھاڑو اور ڈوئی پر مضبوطی سے پیوست رکھے اور نظر اپنی اولاد کی چال پر رکھی۔ اس نے اپنے روزانہ خرچے والی صندوقچی کو تالا تو لگایا، مگر چابی کہیں کہیں آس پاس ہی رہنے دی تا کہ ضرورت مند بچوں کو پیسے نکالنے میں سہولت رہے۔ اس نے پنجیری اور سوہن حلوے کو چھپا کے رکھا مگر جس گھر میں چھپانے کے لیے دو چار ہی جگہیں ہوں وہاں کوئی شے چھپی نہیں رہتی، اور اس بات کا ہماری ماں کو پتہ تھا۔ اس لیے وہ چھپائی ہوئی چیز کو دوبارہ وہاں ڈھونڈنے نہیں جاتی تھیں۔

اگر ماں کو یہ پتہ نہ ہو کہ اس کے بچے کس وقت کیا چاہتے ہیں اور اس کے اندر کی خواہشیں انھیں کہاں کہاں پریشان کر رہی ہیں تو مَیں سمجھتا ہوں وہ ایک مکمل ماں نہیں ہوتی۔ میری ماں کو میرے اندر چلنے والی خواہش سے پہلے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اب میرا مطالبہ کیا ہو گا اور اس کے لیے کی گئی بھوک ہڑتال کتنی دیر رہے گی۔ اس لیے وہ مقررہ وقت پورا ہونے سے ذرا پہلے کھانا لے کر آتی تھی اور جھوٹا سچا وعدہ کر کے میری بھوک ہڑتال ختم کرانے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ مَیں نے بچپن اور لڑکپن میں اپنی ماں کو بہت تنگ کیا ہے، جوانی میں البتہ مَیں نے انھیں کوئی تکلیف نہیں دی۔ نہ تو محلّے سے کوئی شکایت ان تک پہنچی نہ ہی انھیں رشتہ ڈھونڈنے اِدھر اُدھر جانا پڑا۔ اچھی خاصی پڑھی لکھی بہو کو ان کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ شاید میری یہ بات میرے بچپن کے گناہوں کا کفارہ بن سکے۔ میری ماں کو معلوم تھا کہ اس کے بچوں کو کوئی چیز احتجاج اور ضد کے بغیر نہیں مل سکتی، اس لیے اسے روزانہ ہماری ضدوں اور بھوک ہڑتال کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور وہ ہماری بھوک ہڑتال توڑنے کے نسخے بھی جانتی تھی۔ ہمارا حال یہ تھا کہ اگر ہمیں سردیوں کے لیے سوٹ سلوانا ہے تو پینٹ

ایک سردیوں میں ملتی تھی تو کوٹ دوسری سردیوں میں نصیب ہوتا تھا۔ اس لیے سردیوں کی چیز کے لیے ہم گرمیوں میں ضد کرنا شروع کر دیتے تھے اور اپنے والد سے مار کھانے کی ابتدا کرتے تھے۔ مَیں نے اپنے باپ سے بہت مار کھائی ہے، لیکن مجھے یاد نہیں کہ کبھی ماں نے مجھے جھوٹ موٹ بھی ہاتھ مارا ہو۔

شاید یہی وجہ ہے کہ والد کے گھر سے جانے کے بعد خوشی کی جو لہر ہمارے اندر اٹھتی تھی اس کا اثر پورے گھر پر پڑتا تھا، لیکن ماں کو ہمارے بابا کی زیادہ غیر حاضری میں چھپے ہوئے خطرے کی دھمک جلدی سنائی دینے لگتی تھی۔ اس کے شک کی کچھ بنیادیں بھی تھیں۔ اس لیے وہ ہمارے بابا میں کسی اور عورت کی شراکت سے خوف کھاتی تھی۔ ساری زندگی وہ اس مسئلے سے دوچار رہی۔ اسے کسی بات نے نہیں ڈرایا۔ وہ کم پیسوں سے کبھی پریشان نہیں رہی۔ کم کپڑوں اور کم خوراک اور کچے گھر میں وہ گیندے کے پھول کی طرح خوشی سے کھل اٹھتی تھی لیکن اس بات کو وہ کبھی قبول نہ سکی کہ کوئی ہمارے بابا کو پسند آئے یا کوئی ہمارے بابا کو پسند کر لے۔ بہرحال زندگی کا وہ وقت اب گزر چکا ہے اور ان کے شکوک ختم ہو چکے ہیں۔ اور وہ زندگی میں ایک کامیاب خاتون ثابت ہو چکی ہیں۔ وہ یقیناً اس وقت بہت خوشی محسوس کر رہی ہوں گی کہ ان کے سب بچے اپنی اپنی منزل کی طرف رواں ہیں۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ میری ماں کا نام اقبال بیگم ہے۔ انھیں اقبال مند ہونا ہی چاہیے تھا۔ لیکن اپنی ماں کسے اچھی نہیں لگتی اور اس کی خوبیاں ہی خوبیاں ہر ایک کو نظر آتی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں ماں اگر اچھی ساس بن جائے تو پھر بیٹوں کے بہت سے مسائل خود بہ خود حل ہو جاتے ہیں۔ یہی میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔ ماں نے ہر روپ میں اپنے بیٹوں کے خوابوں کی حفاظت بہت اچھے طریقے سے کی ہے۔ مَیں نے اپنی پسند کی شادی کی ہے جسے انھوں نے قبول ہی نہیں کیا بلکہ بہو کو یہ احساس بھی دلایا کہ وہ ان کی بھی پسند بن گئی ہے۔

مجھے ذرا ذرا سا یاد ہے کہ مجھے اپنی ماں کا پلّو پکڑ کے چلنے کی عادت تھی۔ مَیں ایک لمحے کے لیے ان سے الگ نہیں ہوتا تھا۔ گھر میں کوئی مہمان یا رشتے دار آ جاتا تو مَیں ان کے پیچھے چھپ جایا کرتا تھا۔ شاید مجھے یہ احساس تھا کہ ماں کی ہستی صرف میری ہے اور کسی کا ان پر کوئی حق نہیں ہے۔ یہ احساس اتنا پختہ ہو گیا کہ جب ایک شام کسی شادی میں شریک ہونے کے لیے ماں تیار ہوئی اور زیور پہنا تو مَیں رونے لگا اور بہت رویا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مَیں کیوں رو رہا ہوں۔ مَیں نے ماں کو پہلی بار زیور اور شادی کے کپڑے پہنے دیکھا تھا۔ مجھے لگا کوئی میری ماں کو مجھ سے چھین رہا ہے۔ جب ماں نے زیور اتارے تو مجھے سکون آیا۔ پھر ایک

زمانے تک مَیں نے انھیں اس عالم میں دوبارہ نہیں دیکھا۔

مَیں بہت خرچیلا تھا۔ اِدھر اُدھر گھر کے سودا سلف سے پیسے مارنے کی مجھے عادت پڑ گئی تھی اور پھر مَیں ان پیسوں کو باہر ہی ٹھکانے لگا آتا تھا۔ گول گپے، دہی بڑے، چھوٹے خوانچے والوں کو کھٹی میٹھی چیزیں، شکر قندی، موسمی پھل، جو ہاتھ لگ جاتا تھا یا جو ان پیسوں میں آسانی سے مل جاتا تھا، وہ کھا پی کر گھر آتا تھا، محلّے داریوں میری ماں کی ساکھ کتنی اچھی تھی یا ان کی ایمانداری اور دیانت داری کا کیا عالم تھا، اس کی ایک مثال مجھے آج بھی یاد ہے۔ مَیں اور میرا ماموں زاد تصویریں خریدنے اور البم بنانے کے خبط میں مبتلا ہو گئے۔ اتنے پیسے کہاں سے آتے۔ ہم نے محلّے کے ہر گھر سے اپنی ماں کے نام پر قرضہ لے لیا۔ ہر گھر سے ہمیں بغیر تصدیق کیے مطلوبہ پیسے ملتے گئے اور ہم خرچ کرتے گئے۔ یہ بھول گئے کہ کسی نہ کسی دن تو یہ راز کھلے گا۔ تقریباً ایک ڈیڑھ ماہ بعد سب نے اپنے پیسوں کے متعلق ہماری ماں سے بات کی تو ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ماجرا ہے، کیوں کہ انھوں نے زندگی میں کبھی کسی سے ادھار نہیں لیا تھا۔ اپنی خواہشوں کو اپنے مجازی خدا کی آمدنی کے تابع رکھا۔ ضرورت سے زیادہ ایک ململ کا دوپٹہ نہیں خریدا۔ بلکہ کبھی گھر سے باہر قدم ہی نہیں نکالا۔ انھیں بازار کا راستہ تک معلوم نہ تھا۔ جو کچھ بابا لے آتے وہی انھوں نے پہن لیا۔ جب انھیں پتہ چلا کہ یہ میرا کام ہے تو انھوں نے وہ پیسے ہر گھر میں پہنچا دیئے اور میری کوئی شکایت بابا سے نہیں کی۔ وجہ یہی تھی کہ اس پر جو سزا مجھے ملنی تھی وہ انھیں منظور نہیں تھی۔

ہمارے گھر میں پہلی خوشی اس وقت داخل ہوئی جب میرے چھوٹے بھائی نے میٹرک میں بورڈ میں پوزیشن لی گھر میں پہلی بار کسی اخبار کا نامہ نگار داخل ہوا۔ پہلی بار گھر کے باہر کسی اخبار کا کیمرہ مین آیا۔ وہ دن اور آج کا دن میری ماں کو خدا نے بے شمار خوشیاں دے دی ہیں۔ اخبار کا نامہ نگار اور کیمرہ مین گھر پر دستک دیتا ہے تو ماں کو وہ پہلی خوشی یاد آ جاتی ہے۔ وہ اپنے نام کی طرح اقبال مند ہوتی ہیں اور شاید ان کے نام کی برکت میرے حصے میں باقی بہن بھائیوں سے زیادہ آئی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مَیں نے ان کے پلّو کو بہت پکڑا ہے۔ ابھی تک میرے ہاتھ میں ان کی دُعاؤں کا پلّو ہے اور مَیں اس کو تھام کر انشا ءاللہ بہت دور تک جاؤں گا۔ میری ہر خوشی پر ان کا سایہ ہے، میرے ہر لفظ میں ان کی عطا کی ہوئی فقیری ہے اور فقیروں کے پاس بہت دولت ہوتی ہے۔

☆☆☆☆

اقبال اے سیّد

بیتے ہوئے دنوں کی یاد

میرے بچپن کی خوبصورت یادیں ان دنوں سے تعلق رکھتی ہیں جو میں نے سیکرڈ ہارٹ اسکول میں گذارے تھے۔ یہ اسکول جی۔ پی۔ او کے نزدیک تھامپٹن روڈ پر واقع ہے۔ یہ سڑک سینٹرل ٹیلی گراف آفس کے پیچھے ہے۔ ۲۰ویں دہائی کے آخر میں عام طور پر تا رکول کیا جاتا تھا۔ یہ اسکول سسٹرز آف چیر مین آف جسٹس اینڈ میری چلاتی ہے۔ بیلجیم کا ایک کیتھولک مشن ہے۔

جب میں سیکرڈ ہارٹ میں داخل ہوا تو میری عمر بہ مشکل چار سال تھی۔ جب میں اسکول کے دروازے میں داخل ہوا تو اسکول کی عمارت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ یہ پہلی نظر میں محبت والا معاملہ تھا، دائیں جانب گوتھک طرزِ تعمیر کا گرجا گھر تھا۔ اسکول کی عمارت کے نوآبادیاتی طرز کے برآمدے تھے۔

بائیں جانب کلاس کے کمروں کے سامنے کھیلنے کا بہت بڑا میدان ہے۔ جس کے فرش پر اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ میدان اونچے اونچے پام اور املتاس کے درختوں سے سجا ہوا تھا۔

ایک شفیق راہبہ جس نے ایک مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے میری کنڈر گارٹن کلاس میں لے کر گئی۔

چھوٹے چھوٹے لڑکے کلاس روم میں علیحدہ علیحدہ بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے پیچھے ڈیسک پر جو لڑکا بیٹھا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام سید ضمیر شاہ ہے۔ ہم سب جلد ہی اچھے دوست بن گئے۔

ہماری استانی جو ایک راہبہ تھی ہمیں انگریزی کے حروف تہجی کی بنیادی باتیں پڑھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ماحول میں خاموشی اور نظم و ضبط نظر آیا تھا۔ میرے سوا سب، بچے توجہ سے سن رہے تھے۔ میری توجہ کلاس روم کے درمیان ایک بڑے سے گڑیا گھر نے اپنی طرف مبذول کرا کھی تھی۔

یہ گڑیا گھر چھوٹے فرنیچر دروازوں کھڑکیوں جن پر رنگ دار شیشے لگے ہوئے تھے۔ ریشمی پردوں اور دوسری چیزوں سے آراستہ تھا۔ اسکول میں لنچ کا وقفہ ایک معاشرتی تقریب کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوپہر کے بعد صاف ستھری وردیاں اور پگڑیاں باندھے ہوئے خان ایک گھریلو ملازم جن کے ہاتھوں میں بڑے ٹفن کیریا اور تھرموس ہوتے تھے۔ درخت کے نیچے اور برآمدوں پر اپنی اپنی مقرر جگہ پر آ جاتے اس کے بعد وہ دریاں بچھاتے اور اس کے بعد سفید چادریں بچھا دیتے دوپہر کے کھانے کے وقفہ کا اعلان کرنے کے لیے ایک

بڑی سی گھنٹی بجتی بچے اپنی کلاس کے کمروں سے بھاگتے ہوئے نکلتے اور اس جگہ بیٹھ جاتے۔ جہاں ان کے ملازم ان کا انتظار کر رہے ہوتے تھے۔ ایک پکنک کا سا سماں ہوتا تھا۔ لنچ کے بعد کھیلنے کے لیے کافی وقفہ ہوتا تھا۔ ان ہی کھیلوں کے دوران میں میں مجھے اپنی شناخت کا مستقل نشان ملا۔ یہ میری دائیں بھوں کے اوپر ایک نشان ہے۔ میں برآمدے میں اپنے دوست ضمیر کا پیچھا کر رہا تھا۔ جہاں میں ایک برآمدے کے ستون سے ٹکرایا۔

میری بھوں پھٹ گئی۔ اور اس سے خون نکل کر میرے منہ پر پھیل گیا۔ سیکرڈ ہارٹ بنیادی طور پر لڑکیوں کا اسکول تھا۔ لڑکوں کو صرف آٹھ سال کی عمر تک پڑھنے کی اجازت تھی۔ اس کے بعد اپنی اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے سینٹ انتھونی جیسے دوسرے اسکول تلاش کرنے پڑتے تھے۔ میں نے اس کے بعد ایک ایسے سکول میں جانے کا فیصلہ کیا۔ جہاں ماحول کی تبدیلی کے بغیر میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکوں جب میں نے سکول ہمیشہ کے لیے چھوڑا تو اپنے دوست ضمیر کو الوداع کہا اور ہم ایک دوسرے سے ملے بغیر جدا ہو گئے۔ ہم اس وقت بچے تھے اور یہ بات ہمیں زیادہ اہم نہیں معلوم ہوئی جب میں بڑا ہوا تو میں اپنے دوست کو یاد کرتا ہوں اور سوچتا ہوں وہ کہاں ہو گا۔ اس سے رابطہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ میٹرک کے بعد میں گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گیا۔ یہ کالج میرا پہلا دن تھا۔ کلاس انتظار کر رہی تھی کہ اتنے میں ڈاکٹر صادق آمین نے انگریزی کی کلاس لی۔

میرے ساتھ بنچ پر ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ کتاب پر اس نے اپنا نام لکھا تھا۔ سید ضمیر حسن شاہ اس طرح میں غیر متوقع طور پر اپنے سیکرڈ ہارٹ کے سکول کے دنوں کے دوست سے ملا۔ اس طرح مل کر ہم دونوں کو حیرت اور بے پناہ خوشی ہوئی۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر انور سدید

میری زندگی کی کہانی

یہ میری زندگی کا سفر کب شروع ہوا؟ اس کی صحیح تاریخ اور وقت شاید اب بتانا مشکل ہے۔ اسکول کے سرٹیفکیٹ میں میری تاریخ پیدائش ۴ دسمبر ۱۹۲۸ء درج ہے لیکن والدہ بتاتی تھیں کہ دریائے جہلم کی بڑی طغیانی کے دنوں میں پیدا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے میری پیدائش وسط جولائی ۱۹۲۷ء کے لگ بھگ پڑی ہے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی چھ سات سالوں کا کوئی واقعہ میرے ذہن میں موجود نہیں۔ ایک دن کھیلتا ہوا گھر آیا تو آنگن میں والدہ چارپائی پر لیٹی ہوئی تھیں اور ان کے پہلو میں کپڑے میں لپٹی ہوئی گول مٹول سی سرخ و سفید گڑیا پڑی تھی جو ہلتی بھی تھی اور سانس بھی لیتی تھی اور روتی بھی تھی، یہ میری سب سے چھوٹی بہن فضیلت تھی جو مجھ سے چھ سال چھوٹی بتائی جاتی ہے۔ والدہ کی چارپائی کے گرد جو عورتیں بیٹھی تھیں انھوں نے بتایا کہ یہ گڑیا اللہ میاں نے بھیجی ہے۔ والدہ کے سرہانے تانبے کے پیسے پڑے تھے اور وہ ایک ایک پیسہ محلے کے بچوں میں تقسیم کر رہی تھیں۔ میرے بچپن کی یہ سب سے پرانی یاد ہے۔

بچپن کی دوسری تصویر اسلامیہ پرائمری سکول سرگودھا کی ہے جہاں میں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس مدرسے میں تعلیم ہر صبح قرآن پاک کی تلاوت سے شروع ہوتی، پھر اقبال کی مشہور دعائیہ نظم ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' پڑھی جاتی اور بعد میں قرآن مجید کی آخری سورتیں حفظ کرائی جاتیں۔ میں نے آخری دس سورتیں اسی زمانے میں یاد کی تھیں۔ اس زمانے کے ایک استاد مولوی صاحب کا سراپا بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے لیکن یہ محبت بھری یاد نہیں۔ مولوی صاحب بڑے جابر استاد تھے، داڑھی کو رنگ کرتے اور اوپر پٹے باندھ کر کلاس میں آ بیٹھتے۔ ذرا سی غلطی یا غفلت پر مارنے کو آتے۔ میرا ایک ہم جماعت عبدالمجید ایک روز جماعت میں حاضر نہیں تھا۔ اگلے روز آیا تو اتنی مار پڑی کہ وہ سکول سے ہی بھاگ گیا اور پھر کبھی پڑھنے کے لیے نہیں آیا۔ عبدالمجید ابھی زندہ ہے اور اس بات پر متاسف کہ وہ مولوی صاحب کی مار سے بھاگ گیا اور پڑھائی نہ کر سکا۔ مجھے یہ تو علم نہیں کہ میں کیسا طالب علم تھا لیکن یہ یاد ہے کہ میں نے مولوی نور محمد صاحب سے کبھی سزا نہیں پائی۔ ان کا خوف اتنا ہوتا تھا کہ میں ان کے ہر فرمان کی تعمیل کر کے سکول جاتا تھا یعنی روز کا کام

بنا ڈالتا تھا۔

بچپن کے اساتذہ میں مرزا ہاشم الدین بھی مجھے اچھی طرح یاد ہیں، مرزا صاحب بھی سخت گیر استاد تھے لیکن مشفق اور مہربان بھی تھے۔ وہ طلبہ کی پوری شخصیت پر نظر رکھتے تھے۔ ایک دن میں نے گھر میں کچھ شرارتیں کیں، ان کی خبر مرزا صاحب کو ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ جب زبانی املا لکھائی اور اس میں میری کوئی غلطی نہ نکلی تو بھی چھڑی سے مجھے پیٹ ڈالا کہ میں نے لفظ "ن" کا دائرہ ٹھیک نہیں بنایا تھا۔ اس پٹائی نے مجھ اپنا خط درست کرنے میں بڑی مدد دی۔ مرزا صاحب نے ہمیں نصاب سے باہر کی کتابیں محض اس لیے پڑھائیں تاکہ بچوں کی اردو درست ہو جائے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی "قصص الہند" میں نے لفظاً لفظاً ان سے چوتھی جماعت میں پڑھی تھی اور لمبے عرصے تک مجھے یاد رہی، چھٹی جماعت میں عربی کے استاد مولوی محمد بخش صاحب ہمیں اردو پڑھاتے تھے۔ انھوں نے غالبؔ، داغؔ، حالیؔ اور اقبالؔ کے متعدد اشعار ہمیں ازبر کرا دیے تھے۔ مولوی صاحب ہمارے محلے میں رہتے تھے۔ اور مغرب میں نماز کے علاوہ رمضان شریف میں نماز تراویح کی قیادت بھی کرتے تھے۔ وہ جب گھر سے نکلتے تو سب لڑکے مودب ہو جاتے اور مولوی صاحب کو سلام کرتے۔ مولوی صاحب سلام کا جواب محبت سے دیتے لیکن کوئی ننگے سر نظر آ جاتا تو اپنی چھڑی اس کے سر پر مارتے۔ وہ بالوں کی انگریزی وضع کی کٹائی پسند نہیں کرتے تھے اور سر اگر بالکل گھٹا ہوا ہوتا تو خوش ہوتے۔ ان کے گھر پر شام کو لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ بہت بحث مباحثہ ہوتا۔ میں کسی پچھلی چارپائی پر بیٹھا سنتا رہتا لیکن کوئی بات سمجھ نہ آتی۔ پھر نماز مغرب کا وقت ہو جاتا اور سب لوگ مسجد کی طرف چل پڑتے۔ مرزا ہاشم الدین، مرزا محمد منور کے والد تھے اور مولوی محمد بخش، خالد اقبال یاسر کے نانا تھے۔ دونوں اقبال کے شیدائی تھے۔ میرے دل میں ان دو اساتذہ نے ہی ادب کی قندیل روشن کی۔ مرزا ہاشم الدین کی پٹائی میں میں بے قصور تھا لیکن یہ چوں کہ پہلی پٹائی تھی اس لیے مجھے یاد ہے۔

میری دوسری پٹائی ساتویں جماعت میں ہوئی۔ چھٹی جماعت گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا سے پاس کرنے کے بعد میں مزید تعلیم کے لیے اپنے بڑے بھائی میاں فیروزالدین نور کے پاس ڈیرہ غازی خان چلا گیا تھا۔ وہ اس زمانے میں محکمہ زراعت میں کلرک تھے اور معززین شہر میں شمار ہوتے تھے۔ میرا داخلہ پہلے ہندوستانی سکول میں کرانے کا ارادہ کیا گیا۔ اس سکول میں ایک پیریڈ اپدیش یعنی نصیحتوں کا ہوتا تھا۔ پہلے ہی روز اپدیش کے استاد نے بچوں کو کہا کہ کوئی بیت یاد ہو تو سناؤ ۔۔۔ کسی بچے نے کوئی بیت سنایا ۔۔ میں نے یہ

شعر پڑھا۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

لالہ جی نے کہا، معنی بتاؤ۔ میں نے کہا معنی تو نہیں آتے۔ عربی ماسٹر صاحب نے یہ شعر سنایا تھا۔ میں نے یاد کرلیا۔ بولے جس شعر کے معنی نہیں آتے اسے یاد کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ پھر پوچھا: کوئی اور شعر بھی آتا ہے؟ میں نے شعر پڑھا:

یا رب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

لالہ جی بہت خوش ہوئے، مجھے شاباش دی، سب لڑکوں کو شرمندہ کیا لیکن نقصان یہ ہوا کہ چھٹی کے بعد سب ہندو لڑکے میرے گرد جمع ہو گئے اور مجھے اجنبی سمجھ کر چھیڑنے لگے۔ اتنے میں ایک ہندو ماسٹر کا ادھر سے گزر ہوا دوسرے لڑکے تو بھاگ گئے۔ مجھے بھاگنے کا راستہ معلوم نہ تھا۔ لالہ جی نے سمجھا کہ میں ہی شرارتیں کر رہا تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ دو جڑ دیں۔ میں روتا ہوا گھر پہنچا تو بڑے بھائی صاحب نے اگلے روز مجھے گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خان میں داخل کرا دیا جو مسلمانوں کا مدرسہ شمار ہوتا تھا۔

اس مدرسے کے قریباً سب اساتذہ نے میرے ساتھ محبت کا سلوک کی لیکن ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ اس سکول میں داخل کرانے کیلیے جو لڑکا مجھے ساتھ لے گیا تھا وہ اسکول کے نالائق ترین طلبہ میں شمار ہوتا تھا۔ ماسٹر صاحب نے پہلے اقبال کو گھور کر دیکھا اور پھر مجھے دیکھا۔ فرمایا۔ جاؤ آخری بینچ پر بیٹھ جاؤ۔ یہ مولوی محمد عثمان صاحب تھے جو الجبرا پڑھا رہے تھے۔ اس وقت مجھے الجبرے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ انھوں نے پہلا سوال لکھوایا تو کوئی طالب علم بھی اسے درست حل نہ کر سکا۔ مولوی صاحب طلبہ کی سلیٹ دیکھتے، کسی کو دھپہ مارتے، کسی کو دھول جماتے، کسی کے کان کھینچتے۔ میری باری آئی تو سلیٹ اٹھا کر باہر پھینک دی اور فرمایا ایک اور کودن آ گیا ہے۔ پھر انھوں نے یہی سوال تختہ سیاہ پر حل کیا اور اسی قسم کا ایک اور سوال حل کرنے کے لیے دیا۔ طلبہ نے یہ سوال بھی غلط حل کیا۔ صرف میرا جواب درست نکلا۔ مولوی صاحب عثمان خوش ہو گئے۔ سب کو میری سلیٹ دکھائی اور جماعت کے لائق ترین لڑکے وید پرکاش کے ساتھ سب سے اگلے بینچ پر جگہ دے دی۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے ہمیشہ میرے ساتھ میرے والد جیسا سلوک کیا اور ہر مشکل میں

میری مدد کی۔

اس سکول کے اساتذہ میں سے مجھے مولوی پیر بخش بھی بہت یاد آتے ہیں۔ انھوں نے مجھے کلاس لائبریری کا انچارج بنا دیا تھا۔ کتابیں اور رسالے وافر مقدار میں پڑھنے کے لیے مل جاتے۔ منشی پریم چند، راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم، پنڈت سدرشن اور خواجہ حسن نظامی کی کتابیں میں نے اسی لائبریری سے مستعار لے کر پڑھیں اور یہیں سے ان سے میری محبت بڑھی۔ میں اس زمانے میں بزم ادب کا سیکرٹری بھی تھا اور ہر ہفتے ایک مضمون پڑھتا۔ پھر مولوی پیر بخش صاحب نے زبانی تقریر کرنے کی عادت ڈالی۔ طلبہ میں سیاسی مزاج پیدا کرنے کے لیے اس اسکول میں طلبہ کی ایک اسمبلی بھی بنائی گئی تھی۔ جس کے ارکان باقاعدہ الیکشن سے منتخب ہوئے تھے۔ مجھے اپنی کلاس کے نمایندوں میں سے سب سے زیادہ ووٹ ملے۔ اسد علی شاہ، جو اب ریونیو بورڈ کے رکن ہیں، اس اسمبلی میں وزیرِ تعلیم کے عہدے پر متعین ہوئے تھے۔ میں ان سے ایک سال جونیر تھا مجھے ان کا سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ میں جب آٹھویں جماعت میں تھا تو سکول میں یومِ اقبال منایا گیا۔ میں نے اخبارات کی مدد لے کر اقبال پر ایک مضمون لکھا اور اس مجلس میں پڑھا۔ سکولوں کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر صادق شاہ صاحب جو آج کے جنرل اسلم شاہ کے والد تھے صدارت کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے شاباش دی اور ایک روپیہ انعام دیا۔ دو روپے کا پہلا انعام اسلم شاہ کو ملا تھا جو ان کے فرزند تھے اور زبانی تقریر میں ملکہ رکھتے تھے۔

آٹھویں جماعت میں پہنچ کر میں نے اینگلو ورنیکولر فائنل کا امتحان بھی دیا اور درجہ اوّل میں پاس ہوا لیکن مجھے وظیفہ نہیں ملا۔ اس امتحان کا ایک واقعہ مجھے اب بھی یاد ہے۔

امتحان سے ایک روز قبل مولوی لال خان ہمیں حساب کی مشق کرا رہے تھے۔ امتحان میں پرچہ حل کرنے کے عملی گر بتاتے بتاتے اچانک رکے اور بولے:

دیکھو بچو، تم سب مسلمان ہو اور تمھارا مقابلہ ہندو سکول کے طلبہ کے ساتھ ہے۔ کوئی لڑکا کمرہ امتحان میں نقل نہ کرے اس سے ہمارے سکول کی عزت گر جائے گی اور اگر کوئی نگران کمرہ امتحان میں ہندو سکول کے کسی لڑکے کی مدد کرتا نظر آئے تو فوراً کھڑے ہو کر بڑے نگران کو بتاؤ کہ نقل کرائی جا رہی ہے۔

میں ہال کمرے میں لمبے ٹاٹ کی آخری نشست پر بیٹھا تھا۔ پہلے تو میں پرچہ حل کرنے میں مگن رہا لیکن جب فرصت ملی اور میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ ایک نگران ہندو سکول کے ایک لڑکے کو سوال حل کرا رہا تھا۔ میں اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا اور با آواز بلند اس نگران کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ صاحب نقل

کرا رہے ہیں۔

بڑے نگران بھی ہندو تھے، دوڑے دوڑے آئے اور مجھے سختی سے بٹھا دیا لیکن اس کے بعد کسی کو نقل کرانے کی جرات نہ ہوئی۔ پرچہ ختم ہوا تو سب طلبہ نے اس واقعے کی اطلاع مولوی لعل خان کو دی۔ وہ ہمیں ہیڈ ماسٹر مولوی رسول بخش صاحب کے پاس لے گئے، پھر تو ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسی وقت بڑے نگران کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ بات سچ تھی۔ اس لیے افسران بالا کو اس واقعے کی خبر کر دی گئی اور اگلے روز عملہ تبدیل کروا دیا گیا۔ اتفاق کی بات دیکھیے کہ یہ نگران وہی ماسٹر صاحب تھے جنہوں نے مجھے ہندو ہائی سکول میں نا کردہ گناہ کی سزا پر مارا تھا۔

میرا بچپن خاصی عسرت میں گزرا۔ ہمارا گھرانہ متوسط طبقے کا مسلمان گھرانہ تھا۔ والد صاحب محنت کش انسان تھے۔ ان کے دو بھائی مولوی شمس الدین اور مولوی سراج الدین فوت ہو چکے تھے تیسرے بھائی مولوی کرم دین انگریز دشمن سیاسی تحریکوں کے سرگرم کارکن تھے اور تحریک خلافت اور تحریک کشمیر میں قید و بند کی سزا بھی کاٹ چکے تھے۔ ان سب کے بچوں کے کفیل والد صاحب تھے ہمارا کنبہ کم و بیش بیس افراد پر مشتمل تھا۔ لیکن یہ زمانہ صبر و قناعت کا تھا۔ روکھی سوکھی روٹی مل جاتی تو شکر ادا کیا جاتا۔ ہمارے گھر پر کبھی فاقے کی نوبت تو نہیں آئی لیکن میں نے دولت کی فراوانی بھی نہیں دیکھی۔ ہر شام والد صاحب کے ساتھ ایک دو مسلمان ضرور ہوتے اور وہ ہمارے گھر پر کھانا کھاتے، جس روز کوئی مسلمان نہ ہوتا تو والد صاحب مسجد سے کسی مسافر کو لے آتے اور کھانا کھانے میں شریک کر لیتے، میرے والد مولوی امام الدین نے تریسٹھ سال کی عمر پائی دو حج کیے، زندگی کے آخری دو سال مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں گزارے۔ ۱۹۵۴ء میں اپنی ایک پوتی کی شادی کرنے کے لیے آئے تو سرگودھا ہی میں پیوند خاک ہو گئے۔ انھوں نے زندگی بھر رزق حلال سے اتنے بڑے کنبے کی کفالت کی تھی، پورے شہر میں عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ شام کی نماز اکثر اپنے محلے کی مسجد میں پڑھتے تھے۔ لوگ ان کے تقویٰ کی بنا پر ان سے امامت کرواتے تھے۔ انھیں کی وجہ سے لوگ ہمیں بھی میاں صاحب کہتے ہیں حالاں کہ ہمارا خاندان محنت کش راجپوتوں کا خاندان ہے میرا بچپن ان کے گھنے مقدس سائے میں گزرا۔ معمولی پڑھے لکھے انسان تھے لیکن اقبال اور مولانا روم کو اپنا مرشد تصور کرتے تھے۔ والد صاحب فوت ہو گئے تو یوں محسوس ہوا کہ ایک گھنا چھتنار ٹوٹ گیا ہے۔ اور میں بچپن کی سرحد عبور کر کے یک دم بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو گیا ہوں اور اب روز بروز مزید بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں۔

توفیق رفعت

کیا یہ ایک بھوت تھا!

میری عمر چھ یا سات سال ہوگی جب مجھے بھوتوں کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ ہم گھر کے سارے چھوٹے بچے چھت پر سو رہے تھے۔ ہماری مائیں ایک دوسرے سے زیادہ تر بھوتوں کے بارے میں باتیں کرتی تھیں۔ وہ بھوت جو سروں کے اوپر اڑتے تھے۔

ان سب میں میری ماں سب سے زیادہ اونچی آواز سے بولتی تھی۔ وہ موت کے بارے میں باتیں کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ بھوت جو سروں کے اوپر اڑتے ہیں مرے ہوئے لوگوں کی روحیں ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتی کہ ابھی جو اوپر سے بھوت اڑتا ہوا گزرا ہے وہ فلاں شخص کی روح تھی۔ میں اکثر آسمان کی طرف اس امید کے ساتھ دیکھتا کہ کوئی بھوت نظر آئے گا۔

ہم دوسرے دن واپس آ گئے تھے ایک دن جب میں سیر سے واپس آ رہا تھا تو میں نے جھاڑیوں میں سرسراہٹ کی آواز سنی۔ مجھے امید تھی کہ بھوت کسی بھی لمحے آ جائے گا۔ میں نے انتہائی تیزی سے چلنا شروع کر دیا لیکن سرسراہٹ کی آواز جاری رہی۔ میں نے بھاگنا شروع کر دیا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں گھر کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک کتا میری طرف بھاگتا ہوا آیا۔ میں نے ایک لکڑی اٹھائی اور اسے ڈرا کر بھگا دیا۔ بالآخر میں گھر پہنچ گیا۔

سرسراہٹ کی آواز بند ہو گئی تھی۔

میں آج تک یہ نہیں جان سکا کہ آیا یہ بھوت تھا جو سرسراہٹ پیدا کر رہا تھا یا یہ ایک کتا تھا۔

☆☆☆☆

حسن عابدی

کڑوی گُلاب جامن

ایک زمانہ تھا جب میرے بھی دوست ہوتے تھے۔ نہایت شوخ، شریر اور بے تکلف اتنے کہ خدا دشمنوں کو بھی ایسے بے تکلف دوستوں سے محفوظ رکھے۔ مَیں ان دنوں گاؤں سے شہر میں نیا نیا آیا تھا۔ ہم ایک ہی کنبے کے کئی لڑکوں نے مل کر جُل کر کرایے پر مکان لیا اور ساتھ رہنے لگے۔ گاؤں کا باورچی ہم سب کے لیے کھانا پکاتا اور یوں بڑے مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔

مَیں ساتھ رہنے والے لڑکوں میں سب سے چھوٹا اور سب سے زیادہ نا سمجھ تھا۔ بلکہ بے تکلفی معاف، مَیں ہی بے وقوف تھا۔ دوسرے ہم جولی نہ صرف عمر میں بڑے تھے۔ بلکہ چالاک اور ذہین بھی تھے۔ وہ سب مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے اور ہر طرح میرا خیال رکھتے۔ ہاں جب میرے بے تکلف ہم جماعت مجھ سے ملنے کے لیے آتے اور مجھے طرح طرح سے ستاتے تو وہ خاموش رہتے۔ ان کا خیال تھا کہ چھوٹے لڑکوں کی نوک جھونک اور ہنسی مذاق میں ہمارا کیا کام۔

میرے بے تکلف دوست مجھے طرح طرح سے ستاتے، کبھی میرے گنوار پن کا مذاق اڑاتے، کبھی میری کوئی چیز چھپا دیتے۔ لیکن ان کی عادت میرے لیے برداشت سے باہر تھی۔ وہ سب مل کر میری کھانے پینے کی چیزوں پر ٹوٹ پڑتے اور میں ان کا منہ تکتا رہ جاتا۔

سکول میں جب تین چار دن کی چھٹی ہوتی۔ میں بستر لپیٹ کر چھوٹے بہن بھائیوں سے ملنے کے لیے گاؤں روانہ ہو جاتا۔ گھر میں میری خوب خاطر مدارت ہوتی، جتنے دن رہتا چھوٹے بہن بھائی پیچھے لگے رہتے اور امی تو صدقے واری ہوتیں۔ اچھے سے اچھا کھانا خاص طور پر میرے لیے پکاتیں اور اصرار کر کے کھلاتیں۔ چھٹی ختم ہوتی تو میں بجھے ہوئے دل کے ساتھ شہر واپس ہوتا۔ امی میرے لیے اچھی اچھی مٹھائی اور مزے مزے کے پکوان تیار کرتیں اور ساتھ بھیجتیں۔

شہر پہنچتا تو میرے بے تکلف ہمجولی میرے انتظار میں ہوتے۔ وہ مجھے آتا دیکھ کر دور سے ہی خوشی کے نعرے لگاتے۔ لپک لپک کر میرا بستہ اُٹھاتا۔ دوسرا سوٹ کیس سمیٹتا، تیسرا کتابوں کا تھیلا پکڑتا، چوتھا ناشتہ دان

سنبھالتا اور پانچواں مٹھائی کی ٹوکری کی حفاظت اپنے ذمہ لے لیتا۔ اور مجھے کیا ملتا؟ ساری مٹھائی میری جماعت کے بے تکلف دوستوں کے معدوں میں اُتر جاتی اور پکوان ہاتھوں ہاتھ تقسیم ہو کے رہ جاتا۔ مجھے ان میں سے ایک ٹکڑا بھی مل جاتا تو غنیمت سمجھتا۔

کئی بار جی میں آئی کہ ان بے تکلف دوستوں کو ٹوک دوں اور ان سے صاف صاف کہہ دوں کہ یہ بُری بات ہے۔ میری امی اچھی اچھی چیزیں میرے کھانے کے لیے دیتی ہیں، تم انھیں کھانے والے کون؟ لیکن یہ کہنے کی ہمت نہ ہوتی۔ دل کہتا یہ بڑی چھوٹی بات ہے تم اتنے بے شرم کیسے ہو سکتے ہو۔ کھانے پینے کی چیزوں پر روک ٹوک کرنا بھلا شریفوں کا کام ہے؟؟ میں جی ہی جی میں شرمندہ ہو کر صبر کر لیتا۔

پھر ایک بار تو میں نے اپنے دوستوں سے بگاڑنے کا بھی فیصلہ کر لیا۔ ہوا یہ کہ عید کی چھٹی سے واپسی پر امی نے گاجر کا حلوہ میرے سامان کے ساتھ رکھ دیا تھا، مجھے اندیشہ تھا کہ دوست اسے بھی چٹ کر جائیں گے تب خیال آیا کہ ان سے ملتے ہی کیوں نہ لڑائی کر لوں۔ بس یونہی لڑائی کا کوئی بہانہ نکال لوں۔ وہ مجھ سے روٹھ جائیں گے اور یوں میرا سامان ان کی لوٹ مار سے بچا رہے گا لیکن دوستوں کا سامنا ہوا تو سارے کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ وہ اتنے تپاک سے ملے اور یوں گلے لگایا کہ میں کچھ بھی نہ کہہ سکا بلکہ لڑائی کے خیال سے ہی اپنے کمینے پن پر شرمندہ ہوا۔ تب دوستوں نے میرے ناشتہ دان کی تلاشی لی اور میری امی کی کاریگری کی تعریف کر کے سارا حلوہ پلک جھپکتے میں چٹ کر گئے۔ دوسرے دن جب ناشتے میں حلوہ نہ ملا تو مجھے اپنے ان بے تکلف دوستوں سے ایک بار پھر شدید نفرت محسوس ہوئی، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، دل مسوس کر رہ گیا۔ بارے دس ہی دنوں بعد سکول میں چار دن کی چھٹی ہوئی میری طبیعت اچھی نہیں تھی۔ ہاتھ پاؤں میں جگہ جگہ دانے نکل آئے تھے سوچا گاؤں میں رہ کر حکیم جی کا علاج کر لوں گا اور سیر بھی ہو جائے گی۔ بستر لپیٹا اور گاؤں روانہ ہو گیا۔

امی مجھے دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ سینے سے لگایا، بلائیں لیں اور فوراً حکیم جی کو بلا بھیجا۔ انھوں نے میرے جسم پر دانے نکلتے دیکھے تو کہا خون خراب ہے یہاں رہ کر چار دن چرائتا پیو۔ خون صاف ہو جائے گا تو پھر دانے نہیں نکلیں گے۔ دوسرے دن میری مدارت کا سلسلہ شروع ہوا دودھ، دہی، حلوہ پراٹھا اور دوسری مزے مزے کی چیزیں کھانے میں ملنے لگیں۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن چرائتا پی کر اس قدر ابکائی ہوئی کہ کچھ نہ پوچھیے۔ ایسی کڑوی زہر دوا میں نے پہلے کبھی نہیں چکھی تھی۔ ایک ہی دن میں طبیعت ٹھکانے ہونے لگی۔ شام کو کھانے

کے بعد میں نے امی سے کہا:

میرا امتحان قریب ہے گاؤں میں رہ کر پڑھائی نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ اجازت دیں تو کل میں شہر چلا جاؤں۔

امی بولیں: بیٹا! جیسا تمھارا جی چاہے کرو، لیکن شام تک ٹھہر جاؤ تو اچھا ہے میں تمھارے لیے گلاب جامنیں تیار کرلوں گی۔

گلاب جامن کا نام سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا لیکن ان کا انجام سوچ کر آنکھوں سے آنسو چھلک آئے۔ میں نے کہا:

امی رہنے بھی دیجیے، میرے بے تکلف دوست بری طرح میری جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، ساری گلاب جامنیں وہ خود ہی چٹ کر جائیں گے۔

امی یہ بات سن کر حیران رہ گئیں۔ بولیں:

ہائے تم اتنے چھوٹے دل کے ہو، میں تو تمھیں بڑا فراخ دل سمجھتی تھی۔ ارے بیٹے! دوستوں کے کھانے پینے سے بھلا کوئی خفا ہوتا ہے۔ میں ڈھیر سارے گلاب جامنیں بناؤں گی۔

امی کی اس بات سے میرا دل بالکل خوش نہیں ہوا۔ میں نے کہا: امی! اگر آپ میرے دوستوں کے لیے چرائتا ڈال کر کڑوی گلاب جامنیں بنا سکیں تو ضرور بنائیے۔ سچ بڑا مزہ آئے گا، جب وہ کڑوی گلاب جامنیں ہپ ہپ کھا کر تھو تھو کریں گے۔ امی! میری پیاری امی گلاب جامنیں میں چرائتا ضرور ڈالیے۔

لیکن امی کو میری بات بہت بُری لگی۔ انھوں نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور خود گلاب جامنیں تیار کرنے لگ گئیں اور میں چرائتے کے کڑوے گھونٹ پی کر سو گیا۔

صبح ہوئی اور صبح سے شام ہوئی اور امی تمام دن گُلاب جامنیں تیار کرنے میں مصروف رہیں میری روانگی سے پہلے انھوں نے گُلاب جامنو کا ایک ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔ موٹی موٹی کالی کالی گُلاب جامنوں کو شیرے میں تیرتا دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ تب امی نے گُلاب جامن کا ایک دیگچہ بھر کر گھر کے لیے رکھ لیا اور دوسرا میرے لیے الگ کر دیا۔

تب مجھے شرارت سوجھی، نیت میں کھوٹ پہلے ہی تھا۔ امی جونہی کسی کام سے باہر نکلیں میں نے چرائتے کے زُلال کی پوری بوتل گُلاب جامنوں کی اس دیگچی میں انڈیل دی۔ میں اپنے دوستوں سے انتقام لینے کا تہیہ

کر چکا تھا۔

گلاب جامنوں کی دیگچی اور ڈھیر سارے سامان سے لدا پھندا جب شہر پہنچا تو ساتھ رہنے والے دوستوں کو تعجب ہوا کہ اتنی جلدی کیسے آ گئے؟ میں نے کہا:

گاؤں میں کس کا جی لگتا ہے اور پھر اپنے بے تکلف ہمجولیوں کے بغیر تو ایک پل بھی گزارنا محال ہوتا ہے۔

لیکن میرے سامان کے بھوکے بے تکلف ہمجولیوں کو میرے پہنچنے کی خبر ابھی تک نہ ہوئی تھی۔ وہ تمام دن بڑی بے تابی سے گزرا، گھر میں ایک ایک نے پوچھا کہ دوست اس دیگچی میں کیا ہے؟ ہمیں بھی تو چکھاؤ، مگر میں صاف بہانہ کر گیا۔ بھلا ان سے کیسے کہتا کہ وہ کڑوی گلاب جامنیں ہیں۔ میں تو چاہتا تھا کہ وہ نعمت میرے بے تکلف دوست کھائیں اور میں ان کی وحشت کا تماشا دیکھوں۔

دوسرا دن بھی انتظار میں گزرا، وہ دن کی چھٹی پہاڑ بن گئی کہ کسی طرح کاٹے نہ کٹتی تھی۔ ذرا دروازے پر آہٹ ہوتی اور میں اپنی جگہ سے جست لگا کر پہنچتا کہ شاید دوست آ پہنچے۔ خدا خدا کر کے سکول کھلنے کا دن آیا۔ اس دن انٹرول میں، میں نے ایک ایک دوست کو تلاش کیا اور گلے میں بانہیں ڈال ڈال کر بڑے پیارے انداز سے کہتا گیا: امی نے تمھارے لیے خاص طور پر مزیدار گلاب جامنیں بنا کر بھیجی ہیں۔ میں نے اب تک ایک نہیں چکھی۔ آج شام فوراً میرے ہاں پہنچو۔ ایمان سے میری جان مال سب دوستوں کے لیے ہے۔ جب تک وہ ساتھ نہ کھائیں ایک ایک لقمہ زہر بن جاتا ہے۔

دوستوں نے میرے سلوک میں تبدیلی دیکھی تو حیران رہ گئے۔ انھوں نے میری دعوت ہنسی خوشی قبول کر لی اور سرِ شام ایک ہجوم میرے گھر اکٹھا ہو گیا۔ یہ شہاب دھوندو چلے آئے ہیں اور وہ لمبو شجاع۔ یہ لو نکٹے جی بھی آ پہنچے اور سلیم کالیے پہلے ہی آئے بیٹھے ہیں۔ دوستوں نے چاہا کہ گلاب جامنیں خود ہی آپس میں بانٹ لیں لیکن میں نے کہا کہ آپ لوگ تشریف رکھیں میں ابھی حاضر کرتا ہوں۔ مگر دل میں کہا۔ ایسی تیسی تم حرام خوروں کی۔ آج اگلی پچھلی کسر نکال لوں گا۔ چٹورو۔ کمینو۔ بدذاتو! پھر مسکرا کر کھانے کی میز پر گلاب جامنوں کی پلیٹیں سجا دیں جو رائتے میں ڈوبی ہوئی کڑوی زہر گلاب جامنیں دوستوں نے کہا: یار تم بھی تو کھاؤ۔

میں نے جواب دیا: نہیں بھائی یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ سب تمھارے لیے ہیں۔ سچ مچ یہ ساری گلاب جامنیں تمھیں کھلا کر مجھے اتنی خوشی ہو گی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ نوکر اسی دوران میں میرا خط دے گیا تھا جو کچھ دیر پہلے

ڈاک میں آیا تھا۔ خط موڑ کر جیب میں رکھتے ہوئے میں نے اپنی گفتگو جاری رکھی:

یہ گلاب جامنیں تمھارے لیے ہیں ان کا ایک ریزہ بھی میرے لیے حرام ہے۔ تم کھاؤ بس میری یہی خوشی ہے۔

دوست میری تقریر سے بہت متاثر ہوئے۔ لو اب جامنوں کی پلیٹ پر سب سے پہلا ہاتھ سلیم کالیے نے مارا اور ایک سالم گلاب جامن نگل گیا۔ پھر تو سبھی دوست اپنی اپنی پلیٹ کے درپے ہو گئے اور مٹھائی کا گاڑھا شیرا ندیدی بلیوں کی طرح سُڑ سُڑ کر کے پینے لگے۔ میں یہ منظر دیکھ کر حیران ہوا۔ دل میں کہا خدایا یہ آدمی ہیں یا جانور، اچانک میرا ذہن خط کی طرف چلا گیا۔ لفافہ چاک کیا اور خط کا پہلا فقرہ پڑھتے ہی دل اینٹھنے لگا۔ امی نے لکھا تھا۔

تمھاری اس بدتمیزی سے بڑی تکلیف ہوئی کہ یہاں سے جاتے وقت گلاب جامنوں کی دیگچی میں چرائتے کا ڑلال ڈال گئے ہو۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اونٹ کے اونٹ ہو گئے ہو۔ اور ذرا تمیز نہیں سیکھی۔ تمھارے ابا سخت خفا ہیں۔ اگر تم یہاں ہوتے تو اچھی طرح مرمت کرتے۔

دوست جو گلاب جامنوں پر بڑے بڑھ کر ہاتھ مار رہے تھے، بولے:

کیا بات ہے؟ خالی دیگچی باورچی خانے میں بھجواتے ہوئے میں نے جواب دیا:

"کچھ نہیں، گھر سے خط آیا ہے سب خیریت ہے۔"

☆☆☆☆

خواجہ محمد زکریا

میری ابتدائی زندگی

میں امرتسر کے ایک گنجان آباد محلے میں ان دنوں پیدا ہوا جب دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ میری ابتدائی یادوں میں ایک چھوٹا سا گھر، بہنیں، بھائی، والدین اور بلیک آؤٹ شامل ہیں۔ کبھی کبھی کوئی طیارہ اڑتا ہوا گزر جاتا تو کنبے کے افراد جنگ کے بارے میں گفتگو کرنے لگتے۔ مجھے اپنے ایک عزیز کا فقرہ خدا جانے کیوں یاد رہ گیا ہے۔ وہ صاحب ہمارے گھر آئے بیٹھے تھے، رات کا وقت تھا ایک طیارہ گزرا تو جنگ کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ انھوں نے کہا۔

گذشتہ جنگ میں بھی آخر کار جرمن ہار گئے تھے اور اس جنگ میں بھی ایسا ہی ہوگا۔

یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ان کی رائے صدفی صد درست نکلی ہے۔ جنگ کے آخری دو برسوں میں راشن ڈپوؤں پر لوگوں کا ہجوم بھی خوب یاد ہے۔ آٹا، چاول، چینی، مٹی کا تیل، کورس اور فائن کپڑا۔ سب راشن پرمٹ پر ملا کرتا تھا۔

تحریک پاکستان کے آخری دنوں کا جوش و خروش بھی میں زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا۔ ۴۶-۱۹۴۷ء کے انتخابات میں، میں چھوٹی چھوٹی سبز جھنڈیاں سرکنڈوں پر لگا کر مسلم لیگ کے ووٹروں کو پولنگ سٹیشن کی طرف لے جانے والے تانگوں کے پیچھے دوڑ کرتا تھا اور زور زور سے نعرے لگاتا تھا: لے کے رہیں گے پاکستان وغیرہ، پھر ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات بھی اس طرح یاد ہیں، جیسے کل کے واقعات ہوں۔ لوگوں کو قتل ہوتے دیکھا۔ ہمارے محلے پر حملے ہوئے۔ ہندوؤں اور سکھوں کی زبردست دہشت تھی۔ گولیاں ہمارے قریب سے گزریں اور عین ممکن تھا ہمارے آر پار ہو جاتیں، مگر خدا نے کچھ اور دن دکھانے تھے۔ ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کو امرتسر سے بذریعہ ریل لاہور پہنچے۔ گاڑی کے اندر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی بلکہ لوگ چھتوں پر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ واہگے کی سرحد پر پہنچ کر لوگوں کی زبردست نعرہ بازی پاکستان زندہ باد آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔

امرتسر میں تقسیم کے دوران میں میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا۔ ایم۔ بی۔ پرائمری سکول اندرون

سلطان ونڈ گیٹ میں پڑھتا تھا۔ جو جلیاں والا باغ کے ساتھ واقع تھا۔ بچپن میں تحریک آزادی کی اس علامت کے قرب نے خاموشی سے یہ بات ذہن میں بٹھا دی کہ جبر و استبداد کسی شکل میں بھی قابل نفرت ہے۔ ۱۹۴۷ء ہی میں میرے والدین لاہور میں ایک ماہ قیام کرنے کے بعد جھنگ چلے گئے۔ میں نے وہاں چوتھی جماعت میں داخلہ لیا۔ امرتسر کے پرائمری سکول میں سخت گیر اساتذہ کی وجہ سے میں کمزور طلبہ میں شمار ہوتا تھا مگر جھنگ میں مجھے تعلیم سے شغف پیدا ہوا اور میں اپنی کلاس کے لائق طلبہ میں شمار کیا جانے لگا۔

بطور طالب علم میری زندگی کا بہترین دور اسلامیہ ہائی سکول جھنگ میں گزرا۔ وہاں میں ۱۹۴۸ء میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا اور وہیں سے ۱۹۵۴ء میں میں نے میٹرک کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ان دنوں اسلامیہ ہائی سکول درس وتدریس اور نظم وضبط کے لحاظ سے ایک مثالی ادارہ تھا۔ ہیڈ ماسٹر عبدالکریم بھٹی تھے۔ بڑے لائق استاد اور سخت گیر منتظم تھے۔ جن اساتذہ سے براہِ راست پڑھنے کا موقع ملا ان میں سے ماسٹر اسلم میرے لیے ایک ناقابل فراموش استاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نویں جماعت میں اسلم صاحب ہمیں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ لیکن ان کی شہرت ریاضی کے استاد کی حیثیت سے تھی۔ میں انگریزی میں لائق سمجھا جاتا تھا بلکہ سبھی مضامین میں اول یا دوم رہتا تھا مگر ریاضی میں نویں جماعت کا امتحان پاس کیا تو اسلم صاحب نے مجھے اپنے سیکشن میں لے لیا اور یہ الفاظ کہے۔

میں نے تمھارے نویں جماعت کے پرچے دیکھے ہیں۔ تم انگریزی میں اچھے مگر ریاضی میں کمزور ہو، اس لیے میں نے بطور خاص تمھیں اپنے دسویں کے سیکشن میں لیا ہے۔ میں ریاضی میں تمھیں لائق بنا کر چھوڑوں گا۔ حقیقت میں یہ ماسٹر اسلم ہی کا کمال تھا کہ میں بہت جلد ریاضی کے لائق طلبہ میں شمار ہونے لگا۔ ۱۹۵۴ء میں ریاضی کے پرچے بے حد مشکل آئے تھے مگر اس کے باوجود میں نے اسی فیصد نمبر لیے۔ اس میں میری محنت سے زیادہ اسلم صاحب کے طریقۂ تدریس کو دخل تھا۔ اسلم صاحب بے حد محنتی استاد تھے، بخار کی حالت میں بھی سکول آجاتے اور پورے پیریڈ پڑھاتے ساتھ ساتھ دوا بھی کھاتے رہتے۔ لائق لڑکوں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے مگر نالائق لڑکوں کے ساتھ حد سے زیادہ سختی کرتے۔

وہ اکثر کہا کرتے تھے۔ بچو! تم سمجھتے ہو کہ پاس ہونا مشکل ہے؟ میں کہتا ہوں فیل ہونا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ یا تم محنت کرو گے اور پاس ہو جاؤ گے اور یا بھاگ جاؤ گے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ بھاگتا کوئی شاذ ہی تھا۔ سب کے سب محنت کرنے لگتے اور کامیاب ہو جاتے۔ ایسے

اساتذہ اب کہاں ملتے ہیں: بعد میں اسلم صاحب یکے بعد دیگرے ایم۔ اے (اردو) ایم ۔ اے (فارسی اور ایم۔ انگریزی کرنے کے بعد کالج میں لیکچرار ہو گئے ۔ ڈاڑھی ترشوالی ۔ پتلون، بش شرٹس پہننے لگے ۔ شلوار قمیص ترک کر دی مگر وہ کالج میں اتنے کامیاب نہ رہے ۔ کاش ہم لائق معلموں کو سکول ہی میں اچھی تنخواہ دے کر انھیں وہیں رکھ سکیں تا کہ سکولوں سے لائق طلبہ کالجوں میں جائیں ۔

سکول ہی کے زمانے سے شاعری اور کھیلوں میں ایسی دلچسپی پیدا ہوئی جو آج تک برقرار ہے ۔ میں بہت چھوٹی عمر سے مصرع موزوں کر لیتا ہوں ۔ چھٹی ساتویں جماعت میں تھا جب شعر کہنے لگا تھا ۔ ہم جماعت لڑکے ناموزوں شعر پڑھتے تو میں اصلاح کر دیتا تھا ۔ نصاب میں جتنی نظمیں شامل تھیں وہ مجھے تمام کی تمام ازبر ہو جاتی تھیں ۔ اس میں اردو، انگریزی، فارسی کی تخصیص نہیں تھی ۔ دسویں جماعت میں پہنچنے تک مجھے بلا مبالغہ ہزاروں اشعار یاد ہو چکے تھے اور میری اپنی نظمیں بچوں کے رسالوں مثلاً ''تعلیم و تربیت'' وغیرہ میں شائع ہونے لگی تھیں ۔

دوسرا شوق فٹ بال کھیلنے کا تھا ۔ چھوٹی عمر میں بڑی عمر کے لڑکوں کے ساتھ فٹ بال کھیلنا شروع کر دیا تھا ۔ عموماً ۔ بڑی عمر کے لڑکے چھوٹی عمر کے لڑکوں کو ساتھ اس لیے نہیں کھیلاتے کہ کھیل کی رفتار پر برا اثر پڑتا ہے لیکن میرے بڑے بھائی شہر کے نامی گرامی ''فٹ بالر'' تھے اس لیے مجھے بھی کھیلنے کا موقع دیا جاتا تھا ۔ مگر میں دو وجوہ کی بنا پر فٹ بال کا اچھا کھلاڑی نہ بن سکا ۔ ایک سبب تو یہ کہ میں جسمانی طور پر اتنا مضبوط نہیں تھا جتنا کہ فٹ بال کے کھلاڑی کو ہونا چاہیے ۔ دوسری وجہ یہ کہ میں ''فٹ بال'' بغیر ''فاول'' کے کھیلنے کی کوشش کرتا تھا ۔ نتیجہ یہ کہ دھکا دیکر بال چھیننے والے کامیاب ہو جاتے ۔ چنانچہ میں کچھ عرصے کے بعد کرکٹ کھیلنے لگا ۔ جہاں دھکیل کر فائدہ اٹھانے کا کوئی امکان نہیں تھا ۔

گورنمنٹ کالج جھنگ میں جا کر کرکٹ اور شاعری کا شوق فضول مجھے تعلیمی اشغال سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا ۔ مجھے زبردستی سائنس کے مضامین لے دیے گئے جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ میں عموماً سائنس کے پریکٹیکل چھوڑ کر کرکٹ گراؤنڈ میں چلا جاتا ۔ رات کو ''حلقۂ شعرا'' میں شریک ہوتا، واپس آ کر شعر کہتا ۔ دو سال گزر گئے مگر مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کتابوں کے ابتدائی ابواب میں کیا لکھا ہوا ہے؟ امتحان آ پہنچا ۔ میں امتحان کے خوف سے سخت بیمار ہو گیا ۔ علاج سے تندرست تو ہو گیا مگر امتحان نہ دے سکا ۔ دو سال ضائع کرنے کے بعد اپنی مرضی کے مضامین پڑھنے کی اجازت ملی ۔ اب میرے پسندیدہ مضامین تھے اور ان

کے ساتھ شاعری اور کرکٹ بھی۔ ایک سال خوب مزے سے گزرا اور امتحان بھی اول درجے میں پاس کیا۔

انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرتے ہی میں جھنگ سے بیزار ہو گیا اور میں نے اعلان کر دیا کہ اب میں فقط اپنی مرضی کے ادارے میں تعلیم حاصل کروں گا اور وہ ادارہ گورنمنٹ کالج لاہور ہے۔ میری ضد کے آگے والدین سپر انداز ہو گئے اور میں لاہور پہنچ کر گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گیا۔ یہ ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ پھر لاہور تھا اور نصابات اور شاعری اور ادبی حلقے اور سیر و تفریح مگر چوں کہ مضامین میری پسند کے تھے اس لیے میں ہمیشہ لائق طلبہ میں شمار ہوتا رہا، اسی زمانے سے میں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ میں جوانی کی حدود میں داخل ہو گیا ہوں اور مرا لڑکپن کا دور گزر چکا ہے۔

☆☆☆☆

رفیق احمد رفیکا

ایک بالغ کہانی

یہ واقعہ اس سال نیویارک میں جنوری کے پہلے ہفتے میں یخ بستہ سردی میں ہوا مجھے مین ہٹن میں اپنے ایک قریبی دوست کی کال موصول ہوئی۔ اس نے مجھے اپنے پاس آنے کے لیے کہا۔ جس جگہ میں تھا، وہ میرے دوست کی جگہ سے بہت دور تھی۔ لیکن ہماری دوستی اس قسم کی تھی کہ میں انکار نہیں کر سکا میں جس دوست کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا، اس نے مجھے رات کے اس وقت باہر جانے سے منع کیا، نیویارک رات کو جرائم کے لیے بدنام ہے لیکن میں نے اس کی بات نہیں سنی۔

میں قریب ترین سب وے سٹیشن پر پہنچا یہ تقریباً نصف شب کا وقت تھا اور نا قابل بیان حد تک سخت سردی تھی۔ میں نے سردی کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اوپر سے مفلر لپیٹا ہوا تھا چنانچہ میں نے سردی کی پرواہ نہیں کی میں نے مین ہٹن جانے کے لیے سب وے ٹرین کا ٹوکن خریدا اور اپنے خیالوں میں ڈوب گیا۔ جو اس وقت غالباً میری سب سے بڑی غلطی تھی میں ٹرین کے قریب ترین ڈبے میں چلا گیا یہ دیکھے بغیر کہ اس میں کتنے آدمی بیٹھے ہیں۔ ڈبے میں جتنے زیادہ آدمی ہوتے ہیں، یہ اتنا ہی محفوظ ہوتا ہے۔ آپ کو پلیٹ فارم کے کونے میں بھی کبھی نہیں کھڑا ہونا چاہیے کیوں کہ یہ سچ ہے۔ کہ کوئی شخص محض تفریح کی خاطر آپ کو آنے والی ٹرین کے سامنے دھکا دے کر گرا دے جب میں ڈبے میں سوار ہوا تو اس میں تقریباً پندرہ آدمی تھے کچھ لوگ اگلے اسٹیشن پر اُتر گئے اور ڈبے میں صرف سات آدمی رہ گئے میں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا کیوں کہ میں نے جب بھی دیکھا تھا کہ میرے ہینڈ بیگ میں میرا پاسپورٹ اور ٹریولر چیک ہیں، میں ابھی اس بات پر غور کر رہا تھا کہ یہ چیزیں اپنے ساتھ لا کر میں نے کتنی بے وقوفی کی ہے کہ ایک دم ایک جھٹکے سے مجھے معلوم ہوا میں خطرے میں پھنس چکا ہوں۔ ڈبے میں ان سات آدمیوں میں سے، جو اب دو تھے۔ دائیں جانب بالکل آخر میں بیٹھے ہوئے تھے لیکن باقی پانچ آدمی جن کی عمریں 15 اور 20 سال کے درمیان تھیں، بہت قریب تھے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بہت بور ہو رہے ہیں۔ وہ میری طرف آہستہ آہستہ کھسک رہے تھے ان کی یہ حرکت میں نے دیکھ لی ان میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا اور میری طرف آیا۔ دوسرے لوگ جو اپنے لیڈر کی طرف گرینگو

سٹائل میں ملبوس تھے، بڑی بڑی پٹیاں، بڑے بڑے جوتے جنھیں لیتے ہوئے اس کے پیچھے آرہے تھے وہ میری طرف لمبے لمبے قدم اُٹھاتے ہوئے آرہے تھے اور میں اپنی جگہ پر سمٹتا جا رہا تھا اور اپنے بیگ کو اپنے سینے کے ساتھ چمٹا رہا تھا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ خوف کے بجائے میرے ذہن میں سب سے پہلے جو خیالات آئے وہ تشدد کے وہ مناظر تھے، جو میں نے فلموں میں دیکھے تھے، جوں جوں لڑکے قریب آتے گئے، میرے ذہن میں میری زندگی کے اس قسم کے دیگر واقعات اور فلموں میں دیکھے ہوئے مناظر گھوم گئے۔

درایں اثنا میرے اندر ایک آواز نے مجھ سے کہا کہ اب میرا کام تمام ہو چکا ہے، میں نے اپنے حواس مجتمع کیے اور یہ یاد کیا کہ اس ٹرین کو اگلے اسٹیشن پر پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا یہ دو منٹ تیس سیکنڈ دور تھا۔ ان لڑکوں نے چپ کا جو سوانگ رچایا ہوا تھا۔ اس میں تیس سیکنڈ لگے، ان میں سے ایک نے دوسروں کی طرف اپنا سر جھکاکا اور کہا تمھارا بٹوہ کہاں ہے۔ ایک دوسرے نے سر سے سر ملاتے ہوئے کہا، تمھارے پیسے کہاں ہیں! جلدی کرو ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اس کے بعد اس نے میرے بیگ کو دیکھا جسے میں اپنے سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے اندر کیا ہے یہ مجھے دے دو اس نے جھٹکا دے کر بیگ اپنی طرف کھینچا لیکن میں نے اسے زور سے چمٹائے رکھا۔ اس بیگ میں تمام دنیا کی دولت سے بھی زیادہ اہم چیز تھی۔ یعنی میرا پاسپورٹ جو اس اجنبی دنیا میں میری واحد شناخت تھا۔ اب وہ سارے لوگ میرا بیگ زور سے کھینچ رہے تھے۔ ان میں ایک نے اور زیادہ زور سے بیگ کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے چلا کر کہا "بلڈی ایشین" ایک گھونسا میرے جبڑوں پر پڑا جس سے کم از کم ایک دانت ہل کر رہ گیا میرے منہ سے خون بہنے لگا۔ اس نے بڑے زور سے بیگ کھینچنا شروع کر دیا مگر میں بھی اتنی ہی مضبوطی سے اس سے چمٹا رہا۔ اس تمام تگ ودو کا مجھے ہی فائدہ ہوا۔ اس نے مجھے بھی کھینچا اور میں بھی بیگ کے ساتھ بُری طرح چمٹا ہوا تھا۔ وہ مجھے کھینچنے میں اس حد تک کامیاب ہوئے کہ میں سیدھا دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ جب میں گر رہا تھا تو میں نے اپنی گھڑی کی جانب دیکھا اور اب صرف تیس سیکنڈ باقی رہ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے دیکھ لیا اور مجھے زیادہ زور سے مارنا شروع کر دیا۔ انھوں نے چاہا کہ وہ مجھے مار مار کر بے ہوش کر دیں اور بیگ چھین لیں میرا چہرا خون سے بھر گیا تھا حتی کہ میرے پیچھے دروازے پر بھی خون کے چھینٹے پڑ گئے تھے۔ وہ مجھے بُری طرح مار رہے تھے لیکن میں نے پھر بھی بیگ نہیں چھوڑا۔ جب کہ میں تقریباً بے ہوش ہو گیا تھا۔

اس وقت ریل سیٹی بجاتی ہوئی روز ویلٹ اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ دروازے خود بخود کھل گئے اور میں

پلیٹ فارم پر جا کر گرا مجھے بڑی متلی ہو رہی تھی میرا دماغ تقریباً سن ہو گیا تھا لیکن میں محفوظ تھا ٹرین روانہ ہو گئی اور میں نے عجیب قسم کی بے ہوشی محسوس کی میں نے جب اپنی سوجی ہوئی آنکھیں کھولیں تو مجھے اردگرد ٹانگیں نظر آئیں جب میں نے اپنا بازو تھوڑا سا ہلایا تو مجمع میں سے کسی نے کہا کہ یہ زندہ ہے کسی شخص نے مجھے سہارا دے کر بینچ پر بیٹھایا ہر شخص نے میرا حال پوچھا اور غائب ہو گیا بالآخر ایک مہربان سیاہ فام نے میری مدد کی ایک پولیس کے سپاہی کے پاس لے گیا۔ جس نے سطحی طور پر میری رپورٹ درج کی اس کے بعد میری مدد کرنے والے آدمی نے مجھے مین ہٹن پر جانے والی ایک ٹرین پر بٹھا دیا میرے دوست نے جب مجھے اس حالت میں دیکھا تو وہ لرز کر رہ گیا اور مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا جو ٹرین میں آسان نہیں ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ لیکن میں اگلے چند دنوں تک صحیح طریقے سے نہیں سو سکا۔ اس کے بعد میں ٹھیک ہو گیا میں اس تجربے یا واردات کرنے والے افراد کو آسانی سے نہیں بھولوں گا۔ اپنے قیام کے دوران میں مجھے سیاہ فام لوگوں سے دور رہنے کا مشورہ دیا گیا لیکن جن غنڈوں نے مجھے مارا تھا وہ تو سفید فام تھے۔

☆☆☆☆

فیض احمد فیض

اسکول میں پہلا دن

میری عمر تو جب آٹھ نو برس کی ہوگی، لیکن اسکول میں وہ میرا پہلا دن تھا۔ پہلے تین درجوں کی کتابیں میں گھر پر ہی پڑھ چکا تھا اور اس دن پہلے درجے میں نہیں، چوتھے درجے میں داخلے کے لیے تیاری تھی۔ شاید اسی سبب سے گھر کے سب لوگ مجھے اسکول بھجوانے کے لیے ضرورت سے زیادہ اہتمام کر رہے تھے۔

اسکول ہمارے گھر سے ذرا فاصلے پر تھا۔ اس لیے اصطبل سے دو گھوڑوں والی فٹن نکلوائی گئی۔ یہ فٹن ہمارے ابا سال میں صرف دو بار عید گاہ جانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ پھر میری بڑی بہنوں نے لاڈ میں آ کر مجھے بہت ہی بھڑکیلے اور پرتکلف کپڑے پہنائے جو عام طور سے شادی اور بیاہ کے موقعوں پر پہنائے جاتے تھے۔ سُرخ مخمل کا کوٹ اور نیکر، پیازی رنگ کے موزے اور سفید جوتے۔

یہ سب کچھ مجھے آج بھی اس لیے یاد ہے کہ اس دن جو کچھ بھی اسکول میں میرے ساتھ گزری اس میں زیادہ تر ہاتھ اسی لباس کا تھا۔

تو خیر اس براتیوں کی سی وضع قطع میں ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ایک ملازم ہماری کتابیں اُٹھائے ساتھ ہوا، اور ہماری سواری اسلامیہ پرائمری سکول کی پرانی ایک منزلہ عمارت کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔

جیسے ہی ہم اپنی فٹن سے نیچے اُترے تو کچھ لڑکے جو اسکول کے باہر اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے، ہمیں دیکھتے ہی زور زور سے غل مچاتے ہوئے اسکول کے اندر کی طرف بھاگے لڑکوں کا شور سن کر ایک دو ماسٹر صاحبان ہڑبڑا کر باہر نکل آئے۔

یہاں پہلے ہی مارے خوف کے کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ اس شور اور ہنگامے کی وجہ سے اوسان اور بھی خطا ہو گئے۔

ملازم کے پیچھے پیچھے بہت آہستہ اور مری ہوئی چال میں جب ہم نے اسکول کے اندر قدم رکھا تو ہر طرف سے بے شمار آنکھیں یوں گھورتی ہوئی نظر آئیں، جیسے کوئی چڑیا گھر کا جانور سکول میں آ گھسا ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد چوتھے درجے کے ماسٹر صاحب مجھے کمرے میں ساتھ لے گئے اور کہا:

جہاں جی چاہے بیٹھ جاؤ۔

ہمارا شہر بھی غریب تھا اور یہ سکول بھی غریب۔ پڑھنے والے بھی غریب تھے، پڑھانے والے بھی غریب۔

کمرے میں مٹی کے فرش پر کٹا پھٹا سا ٹاٹ بچھا ہوا تھا۔ اور اس پر ویسے ہی کٹے پھٹے کپڑوں والے بہت سے لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی جا کر بیٹھا تو میرا جی چاہا کہ کوئی جن یا پری آئے اور چپکے سے میرے سب کپڑے لے جائے اور مجھا پنے ساتھیوں کا سا پھٹا پرانا کرتا اور پاجامہ لا دے۔

وہ سارا دن میں لڑکوں کے مختلف فقرے اور پھبتیاں سنتا رہا۔ اور میرے ہم جماعت لڑکوں کی آنکھوں سے سارا دن طنز اور حقارت برستی رہی۔

جب مجھے محسوس ہوا کہ زرق برق لباس اور ظاہری ٹھاٹھ باٹھ سے اپنے یا اپنے گھر والوں کے مال اور دولت کی نمائش کرنا بہت ہی گھٹیا اور مہمل بات ہے اور جب سے مجھے ان چیزوں سے نفرت ہو گئی۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ آدمی ٹھیک سے جبھی رہ سکتا ہے، کہ اپنے ساتھیوں، ہم جولیوں اور ہم وطنوں سے مل جل کر، اور ان سا بن کر رہے، دوسروں سے الگ اور بڑھیا نظر آنے کا چاؤ ناپسندیدہ اور تکلیف دہ بات ہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد باقر

بچپن کی یادیں

بچو! بچپن کی یاد بڑی سُہانی ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ بچپن میں سارا وقت صرف خوشیوں ہی میں نہیں کٹتا، لیکن جب آدمی بڑا ہو جاتا ہے تو اُس وقت صرف یہی یاد رہ جاتا ہے کہ اس کا بچپن کا زمانہ کتنا خوب صورت اور سہانا تھا، کاش:

بچپن دوبارہ واپس لوٹ آئے۔

مثلاً مجھے یہ ابھی تک یاد ہے:

اپنی گلی کے تمام لوگوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر میں خود امام مسجد کے پاس حاضر ہوا اور میں نے اُس سے درخواست کی کہ آپ مجھے بھی قرآن اور نماز پڑھائیے۔ میں نے اسے بہت اچھا کام سمجھا اور اب تک سمجھتا ہوں اور آج تک اس پر باقاعدگی سے عمل کر رہا ہوں۔

اچھے کام کی بات آئی ہے تو یہ بتانا بہت مناسب ہوگا کہ جن لوگوں نے بچپن میں میری زندگی پر اچھے اور خوشگوار اثرات ڈالے، اُن میں میری والدہ محترمہ، میری نانی اماں اور میرے محترم استاد تھے۔

میری نانی اماں بیوہ تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کو ایمان کی دولت اور قناعت اس قدر دی تھی کہ ساری عمر خدا کے سہارے کے سوا کسی اور کی محتاج رہ کر نہیں جئیں۔

میری نانی اماں ایک چھوٹے سے زمیندار کی بیوی تھیں۔ اس لیے وہ زمیندارطریق پر بڑی محنت کرتیں اور عزت آبرو سے اپنی روزمرہ کی زندگی گزارتیں۔

میں نے ان کی عملی زندگی سے یہ سبق حاصل کیا ہے، کہ قناعت اور عزت سے زندگی بسر کرنا بڑی اچھی بات ہوتی ہے۔

میری والدہ محترمہ نے بھی عملی طور پر اپنے رہن سہن سے مجھے یہ سکھایا کہ جھوٹ بولنا اور چوری کرنا بہت بُری باتیں ہیں۔ وہ اب بھی زندہ ہیں اور بڑی خداپرست ہیں۔

میری والدہ محترمہ پر جب بھی کبھی کوئی مصیبت آتی تو کئی لوگ انھیں یہ مشورہ دیتے کہ آپ فلاں پیر کے

پاس چلی جائیں اور تعویذ لے آئیں۔ لیکن وہ اس پر کبھی آمادہ نہ ہوئیں۔ وہ مشکل وقت میں ہمیشہ قرآن مجید کا مطالعہ کرتیں۔ نفل پڑھتیں اور خدا کے حضور میں کھڑے ہو کر دعا مانگتیں۔ میں نے دیکھا کہ اُن کی دعا اکثر قبول ہوتی۔

میں نے بھی اپنی والدہ کی اس عادت سے یہ اثر لیا، کہ پیروں فقیروں سے تعویذ لینے کی بجائے محنت اور دعا سے بہت سی مشکلیں حل ہو جاتی ہیں۔

میرے ایک ہندو اُستاد نے ہمیشہ پاکیزگی کی تعریف کی اور عملی طور پر اپنے آپ کو ہمیشہ ہر لحاظ سے ہمارے سامنے ایک پاکیزہ انسان کی شکل میں پیش کیا۔ اس ہندو استاد کی پاکیزہ زندگی نے میرے دل میں پاکیزگی کا احترام پیدا کیا، اور یہ جذبہ ہمیشہ آج تک میری رہنمائی کرتا آرہا ہے کہ آدمی جو کچھ بھی کرے، لیکن کسی بھی صورت میں ناپاک زندگی بسر نہ کرے۔ کیوں کہ اس سے انسانیت کو دُکھ پہنچتا ہے۔

بچپن کی یادوں میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہیں، جن کی بُری زندگی کے نمونے نے ذرا کر نیکی کے راستے پر چلنے میں مدد دی۔

میرے بچپن کے سکول کی دیوار کے ساتھ ایک جوا خانہ تھا، جس میں لوگ بھنگ اور شراب بھی پیتے تھے۔ میں کبھی کبھی سکول سے فارغ اوقات میں اس جوئے خانے میں جا نکلتا اور دیکھتا کہ لوگ بڑی آسانی سے روپیہ جیت اور ہار رہے ہیں۔ جو لوگ روپیہ جیت جاتے، وہ فوراً ہی شراب اور بھنگ پر خرچ کر ڈالتے اور جو ہار جاتے، وہ جیتنے والوں کو بے تحاشا گالیاں دیتے اور کبھی کبھی چاقو نکال کر اُن پر حملہ کرنے کی کوشش بھی کرتے۔ میں اس وقت ڈر کر جوئے خانے سے بھاگ آتا۔

بچپن میں دیکھے ہوئے اس منظر نے مجھے ہمیشہ جوئے اور نشے سے دور رکھا ہے۔ مجھے چاہے کوئی بھی لالچ دے اور یقین دلائے کہ جوا کھیلنے یا شرط لگانے سے روپیہ آسانی سے کمایا جا سکتا ہے، میں کبھی اس لالچ میں نہیں آیا۔ یہاں تک کہ دو چار آنے کا داؤ لگانے سے بھی انکار کر دیتا ہوں۔ اس طرح مجھے نشوں سے بچپن میں ہی اس قدر نفرت پیدا ہوئی کہ آج تک ان کا ہاتھ نہیں لگایا۔

ہمارے بچپن کے زمانے میں بڑے بوڑھوں کی بڑی عزت اور ادب واحترام کیا جاتا تھا۔ آج کل صرف امیر آدمیوں کی عزت کرتے ہیں، لیکن ہم نے بچپن میں ایسے غریب دیکھے ہیں۔ جن کی لوگ اس لیے عزت کرتے تھے کہ وہ بہت نیک اور عقل مند آدمی ہوتے تھے اور اُن کی عمر دوسروں سے زیادہ ہوتی تھی۔ گاؤں کی ہر

مجلس اور محفل میں لوگ انھیں عزت کی جگہ دیتے تھے اور مشکل وقت میں اُن سے مشورہ لینے کے لیے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

ان بزرگوں کا بھی یہ روّیہ ہوتا تھا کہ وہ دولت جمع کرنے کی بجائے لوگوں کی مفت خدمت کرتے تھے، بلکہ چھوٹے اور ناسمجھ بچوں کو مشورہ مانگے بغیر مشورہ دیتے تھے اور انھیں نصیحت کرتے تھے تاکہ ان کی بھلائی ہو۔

ہمارے گاؤں کے ایک بزرگ تھے، وہ بہت نیک اور رحمدل تھے، ایک دن وہ میرا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے:

سچ بتاؤ، حقہ پیتے ہو؟

میرے ایک ہم جماعت نے چند دن ہی پہلے مجھے حقے کی عادت ڈالی تھی۔ ہمارے زمانے میں سگریٹ کا رواج نہیں تھا۔ میں کچھ دیر تو سہم کر کھڑا رہا، لیکن پھر حوصلہ بڑا کر کے میں نے کہہ ہی دیا:

جی ــــــ:

مسکرا کر کہنے لگے:

حقہ پینے سے بچوں کا دل جل جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ بہت نازک ہوتا ہے۔ تم اپنا دل کیوں جلا رہے ہو؟

اور یہ کہہ کر وہ چل دیے۔

میں گھر آ کر سوچ میں پڑ گیا کہ یہ بزرگ گاؤں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ انھوں نے غلط بات نہیں کہی، اُن کی بات میرے دل میں گھر کر گئی اور وہ بزرگ مجھے پہلے سے اچھے لگنے لگے۔

چناں چہ اُس دن سہ پہر کا وقت تھا، میں گھر میں اسکول سے ملا ہوا کام کر رہا تھا کہ میرا وہی دوست جس نے مجھے حقے کی عادت ڈالی تھی، حقہ پینے کی دعوت دینے کے لیے آیا، تو میں نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

وہ کافی دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا، اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے اصرار کرتا رہا لیکن میں نہیں گیا۔

پھر ہندوستان، پاکستان اور یورپ کے کئی ملک اور شہر گھومتے ہوئے سینکڑوں آدمیوں نے مجھے حقہ اور سگریٹ کی دل کش دعوت دی لیکن میں اس کے قریب بھی نہیں گیا۔ بس میرے دل میں یہی خیال جم گیا کہ سگریٹ پینے کی وجہ سے واقعی دل جلتا ہے۔

بچپن کی یادوں میں بہت سے میلوں کی یادیں بھی محفوظ ہیں۔ جن میں بیساکھی کا میلہ خاص طور پر

دلچسپ ہوتا تھا۔

ہم اس میلے میں کئی کئی میل پیدل چل کر پہنچتے، اور پھر سارا دن کھانے پینے، ادھر اُدھر گھومنے پھرنے اور سیر کرنے اور کھیل کود میں بسر کرتے۔

آج کل یہ میلے نہیں لگتے، جن میں بہت سے بچے شامل ہوکر خوشیاں منائیں۔ اس سے زندگی اداس ہو گئی ہے۔ میرا اب بھی ایسے میلوں میں شریک ہونے کا جی چاہتا ہے۔ شاید یہ میرے بڑھاپے کا اثر ہے کہ لوگ کہتے ہیں، بوڑھا آدمی بچہ بن جاتا ہے۔

☆☆☆☆

مسعود حسن

ایک سنسان سڑک پر ہونے والا واقعہ

میرا خیال ہے کہ میری عمر چھ سال تھی جب میں نے اپنی اماں سے ایک عجیب وغریب آدمی کے بارے میں یہ کہانی سنی تھی اور بعد میں یہ کہانی دوبارہ سنانے کے لیے اصرار کرتا رہا بہر حال یہ کہانی جو ہیجان اور خوف سا پیدا کرتی تھی وہ آج تک برقرار ہے۔

میری والدہ ایک گاؤں میں پلی بڑھی تھی اور یہ واقعہ اس وقت ہوا تھا جب وہ خود چھ سال کی تھی یعنی یہ کہانی تقریباً 1912ء کے زمانے کی ہے۔

سردیوں میں ایک دن شام کو میری ماں اپنے والد کے ساتھ گاؤں واپس آ رہی تھی ہم گاؤں کی طرف آنے والی سڑک پر چل رہے تھے اس وقت اندھیرا ہونا اور سائے تاریک ہونے شروع ہو گئے تھے۔ میرے نانا یعنی میری والدہ کے والد تیز چلنے کے عادی تھے اور میری ماں بھی تیز قدم اُٹھا کر ابا کے ساتھ چل رہی تھی گاؤں کو جانے والی سڑک پر دونوں جانب اونچے اونچے درختوں کو دیکھے جا رہی تھی جو ایک دم تیز چلنے والی ٹھنڈی ہوا سے جھوم رہے تھے انھیں یہ درخت غیر معمولی طور پر بڑے اور ڈراؤنے لگ رہے تھے لیکن اپنے والد کے تیز قدموں کی چاپ سے وہ بھی ساتھ ساتھ تیز چلتی رہی۔

چلتے چلتے میری ماں کو محسوس ہوا کہ کوئی شخص ان کے پیچھے آ رہا ہے، شروع میں تو انھوں نے اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی لیکن تھوڑی دیر بعد وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکیں انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ ایک عام دیہاتی ان سے چند قدم پیچھے چل رہا ہے، خیر وہ پھر چلنے لگیں لیکن وہ اب بھی تھوڑی سی بے چین تھیں انھوں نے پھر مڑ کر دیکھا، انھوں نے دیکھا کہ اتنی سی دیر میں ان کے پیچھے آنے والے آدمی کا قد کئی فٹ بڑا ہو گیا ہے، ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہے بہر حال وہ چلتی رہیں۔ ایک دم انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے پیچھے آنے والے کے قدموں کی آواز کئی گنا بڑھ گئی ہے انھوں نے آگے کی جانب دیکھا انھیں امید تھی کہ اب گاؤں نظر آئے گا مگر گاؤں نظر نہیں آیا انھوں نے پھر پیچھے کی طرف دیکھا اب اس آدمی کا قد اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ وہ درختوں کی اُوپر والی شاخوں کے برابر پہنچ گیا تھا۔ میری ماں نے اپنے والد کی آستین کو زور زور سے کھینچنا شروع

کر دیا اور ڈرے ہوئے لہجہ میں آہستہ سے کہا! ابا ذرا اپنے پیچھے دیکھو انھوں نے پیچھے دیکھے بغیر کہا ابھی چلتی رہو۔ ہم ٹھیک رہیں گے۔ جب وہ سڑک کے ایک موڑ پر پہنچے تو وہاں سے گاؤں نظر آیا، گاؤں کے کنارے پر ایک چھوٹی سی مسجد تھی میرے نانا چھوٹے سے صحن میں داخل ہوئے اور وہاں بیٹھ گئے میری ماں نے، جواب بھی خوفزدہ تھی پیچھے کی طرف ایک آخری نظر ڈالی انھوں نے دیکھا کہ وہ دیو جتنا آدمی تیزی سے سکڑ کر ایک عام آدمی کے قد کے برابر ہو رہا ہے وہ آدمی خاموشی سے میری والدہ کے والد کے پیچھے بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد میری والدہ نے جوں ہی پیچھے کی طرف دیکھا تو وہاں کوئی آدمی نہیں تھا۔

☆☆☆☆

مظفر علی سید

ہری بانو اور حیرت انگیز درخت

بچپن میں کہانیاں سننے کا بڑا شوقین تھا لیکن گھر میں کہانیاں سنانے والی کوئی بوڑھی خاتون نہیں تھیں صرف میری ماں اور بڑی بہن تھیں جو ہمیشہ رات تک گھر کا کام کرنے میں مصروف رہتی تھیں۔ لیکن میں ہمیشہ جاگتا رہتا تا کہ ان میں سے ایک مجھے کہانی سنا سکے اور میں سن سکوں۔

وہ ہر رات جو کہانیاں مجھے سناتی تھیں وہ شروع شروع میں تو بڑی مزیدار ہوتی تھیں لیکن تھوڑی دیر بعد بالکل ایک جیسی معلوم ہونے لگتی تھیں۔ آخر میں وہ کہتی کہ اچھی کہانیاں تو بوڑھی عورتیں، جیسی کہ تمھاری دادی اماں سناتی تھی۔ وہ اللہ کے پاس چلی گئی ہیں۔ ہماری نانی اماں ماموؤں کے ساتھ رہتی تھیں اور ہمارے ہاں رات گزارنے کے لیے کبھی کبھار ہی آتی تھیں۔

ایک مرتبہ سردی کا زمانہ تھا وہ ہم سے ملنے کے لیے آئیں۔ اتفاق سے بارش شروع ہو گئی۔ وہ پھر واپس جانا چاہتی تھیں لیکن میری والدہ نے انھیں ٹھہر جانے کے لیے کہا اور ان سے کہا کہ وہ بچے (یعنی میں) کو اچھی سی کہانی سنائیں۔

نانی اماں نے پوچھا کہ جگ بیتی یا آپ بیتی، مجھے ان دونوں کے درمیان فرق نہیں معلوم تھا لیکن میں نے جگ بیتی کے لیے شاید اس لیے کہا کہ یہ نئی چیز ہوگی۔ اچھی بات ہے، کھانا کھانے کے بعد جب ہر شخص اپنا کام ختم کر چکا۔ اس کے بعد بڑی ٹھنڈی ہوا چلنی شروع ہو گئی اور ہر شخص لحاف یا کمبل لے کر سونے کے کمرے میں چلا گیا اس زمانے میں ہیٹر نہیں ہوتے تھے۔ آتش دان میں کوئلوں کی آگ جلا دی گئی اور نانی اماں کا بستر کمرے کے درمیان میں تھا۔ میں اُن کے ساتھ لیٹ گیا اور انھوں نے کہانی سنانی شروع کی۔

ایک مالی تھا جو ملتان شہر کے قریب گاؤں میں رہتا تھا، اس نے پھولوں کے باغ کے کونے میں ایک جھونپڑی بنائی تھی۔ ایک بڑا زمیندار اس باغ کا مالک تھا۔ اس نے ساری زندگی اس باغ کو بنانے اور اس کی دیکھ بھال کرنے میں بسر کی تھی۔

اس نے ہر قسم کے پھولوں کے درخت لگائے تھے اور کنویں سے ان کو پانی دیتا تھا۔ اس میں کچھ ایسے درخت تھے جن پر گرمیوں میں پھول آتے تھے اور کچھ ایسے تھے جن پر سردیوں میں پھل لگتے تھے ---- نارنگیاں، آلوچے، خوبانی اور ان کے علاوہ کیلوں، سیب اور آم کے بھی درخت تھے۔

جب پھل پک جاتے تو زمیندار یہ پھل تڑوا لیتا اور ڈبوں میں بند کر کے شہر کی منڈی میں فروخت ہونے کے لیے بھیج دیتا یہ مالی موسم میں صرف ایک مرتبہ یہ پھل کھاتا تھا اور اس کے بچوں کو صرف وہ پھل کھانے کی اجازت تھی جو ہوا سے جھڑ کر زمین پر گر جاتے تھے۔

اُس مالی کو شریر بچوں اور ان پرندوں کو دور رکھنے میں بڑی دقت پیش آتی تھی جو پھل چرانے آتے تھے۔ مالی انھیں بھگا دیا کرتا تھا لیکن اس سے پہلے وہ کچھ سیب یا نارنگیاں اٹھا لیتے تھے۔ لیکن وہ کسی کو آموں کے درختوں کے جھنڈ کی طرف نہیں جانے دیتا تھا وہ ان کی اپنے بچوں کی طرح دیکھ بھال کرتا تھا۔ درختوں کے اس جھنڈ میں ایک خاص قسم کے آم کا درخت چھپا ہوا تھا جو مالی اور اس کی چھوٹی بچی پری بانو کے سوا اور کسی کو نظر نہ آتا تھا۔

پری اپنے باپ کے ساتھ جھونپڑی میں رہتی تھی اور باغ میں اس کے ساتھ کام کرتی تھی۔ جو بھی اسے کام کرتا ہوا دیکھتا اسے ایک اصلی پری ہی سمجھتا تھا جو بوڑھے مالی کی مدد کرنے کے لیے آسمان سے اُتر آئی تھی۔ مالی کی بیوی مر چکی تھی۔ اسے کھانا پکانا نہیں آتا تھا کیوں کہ پریاں اس ڈر سے آگ کے نزدیک نہیں جاتی تھیں کہ کہیں ان کے پر نہ جل جائیں۔

زمیندار کی بڑی حویلی سے جو پھلوں کے باغ کی دوسری جانب واقع تھی مالی کو اس کی روزانہ اجرت کے طور پر روٹی کے چند ٹکڑے مل جاتے تھے۔ مالی اور اس کی بیٹی اس سادہ روٹی کے ذریعے کس طرح سے زندہ رہ سکتے تھے جس کے ساتھ نہ شوربہ ہوتا تھا اور نہ ہی نمک اور مرچ کی چٹنی۔

لیکن مالی کے دوست اور دوسرے جو لوگ اس سے ملنے آتے ان کی ہمیشہ آم کے رس سے تواضع کی جاتی۔ مالی کہتا کہ یہ آم آسمان سے آتے ہیں اور زمیندار کے آموں کے پیڑ کے نہیں ہیں۔ وہ ہنس دیتے اور اس کی مہمان نوازی کی تعریف کرتے۔

آہستہ آہستہ یہ بات زمیندار تک پہنچ گئی۔ اس نے مالی کی جھونپڑی کی تلاشی لی لیکن وہاں سے کچھ نہیں ملا۔ زمیندار کو شبہ تھا کہ وہ باغ سے پھل چرا رہا ہے لیکن درخت سے پھل توڑنے کا کوئی نشان نہیں تھا اور نہ ہی جھونپڑی کے نزدیک آم کا کوئی چھلکا ملا تھا۔

ایک دن زمیندار کی بیوی نے مالی سے آم کا اچار تیار کرنے کے لیے کہا، اس نے اچار میں ڈالنے کے لیے بہت سارا مصالحہ بھی دیا۔ مالی نے اچار تیار کر دیا جو بہت مزیدار تھا۔

زمیندار کو بھی یہ محسوس ہوا کہ اس نے اتنی مزیدار چیز کبھی نہیں کھائی۔

☆☆☆☆

منیر علی دادا

مالی، کچھوا اور دریا

جب میری عمر چھ یا سات سال تھی تو ہم اپنی دادی کے گھر چند ہفتے گزارنے کے لیے گئے۔ میرا عم زاد بھائی ہم سب دوستوں کے گروہ کا سرغنہ تھا۔ ہم گاؤں کے خوبصورت باغ میں گھومتے تھے اور بہت لطف آتا تھا۔

نمبردار کے پھلوں کے باغ میں سب سے زیادہ اور لذیذ آم تھے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوتی تھی کہ مالی اس کی بڑی باقاعدگی سے دیکھ بھال کرتا تھا اور آم کے درختوں کے نیچے ہی رہتا تھا۔ حتیٰ کہ ان کے نیچے ہی سوتا تھا۔ اس کے پاس ایک بڑا ڈنڈا ہوتا تھا تاکہ کوئی چور اس کے قریب بھی نہ پھٹک سکے۔ ہم نے مالی کو چکمہ دینے اور آم توڑنے کی کئی بار کوشش کی لیکن ہمیں اس میں ہمیشہ ناکامی ہوئی۔ میرے عم زاد، اظہر نے اپنی شہرت برقرار رکھتے ہوئے، ایک ترکیب سوچی۔ ایک شام کو اس نے ایک کچھوا لیا اور اس کی کمر پر دیا جلا کر رکھ دیا۔ دیئے کو اس نے مٹی لگا کر جما دیا۔ ہم نے یہ کچھوا مالی کی چارپائی کے پاس چھوڑ دیا۔

مالی گہری نیند سو رہا تھا۔ اظہر نے ایک ڈھیلا اسے مارا اور وہ اٹھ بیٹھا۔

اس نے جب اندھیرے میں دیئے کی روشنی کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا تو خوف کے مارے اس کی جان نکل گئی۔ اس نے چیخ ماری اور بھوت بھوت کہتا ہوا گاؤں کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ چند منٹ کے بعد تقریباً دو درجن دیہاتیوں کے ساتھ واپس آیا۔ ان دیہاتیوں کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔ دریں اثنا ہم نے آم جمع کر لیے اور جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگے۔

یہ گروہ اس روشنی سے گزوں دور رک گیا اور کسی کو اس کے نزدیک جانے کی جرات نہیں ہوئی۔ بالآخر ایک آدمی نے ہمت کر کے اس روشنی پر اپنا ڈنڈا مارا۔ یہ ایک کڑاکے کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا اور جب انھوں نے ٹوٹا ہوا دیا اور کچھوا دیکھا تو سارا بھید کھل گیا۔

انھوں نے اطمینان کا سانس لیا اور مالی پر ہنسنے لگے۔ مالی بڑی شرمندگی محسوس کر رہا تھا اور ناراض تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ شریر گروہ کا کام ہے۔ اس نے چلا چلا کر اظہر اور دوسرے لڑکوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

ہم بھاگ کر اپنے گاؤں کو واپس آ گئے اور بستروں میں گھس گئے اور سوئے ہوئے بن گئے۔ جب جب یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ مجھے یاد آتا ہے میں مسکرائے بغیر نہیں رہتا۔

میاں بشیر احمد

میری یادیں

نفسیاتی تجزیے کے ماہر فن ہمیں بتاتے ہیں کہ بچپن کی یاد کا مطلب دراصل اپنی موجودہ زندگی سے گریز کرنا ہوتا ہے۔ ہم زمانے کے مقتضیات سے گھبرا جاتے ہیں اور بے اختیار چلا اٹھتے ہیں:

اے عمر رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے؟

عمر رفتہ فی الحقیقت ہمارے حال کی عمر کی ایک رفیق ہے لیکن ایک ایسی رفیق جو رفیقِ حیات نہیں ہو سکتی، اس کا تجربہ محدود ہے، اس کا نقطۂ نظر تنگ ہے، ہم اس سے آگے نکل چکے ہیں وہ ہمیں پیچھے کو گھسیٹتی ہے۔ ایسی رفیق سے محض کبھی کبھی ملاقات کرنی چاہیے اور وہ بھی شاید صرف تفریح کے لیے، نہ کہ صلاح و مشاورت کی خاطر۔

یہ سب کچھ درست ہے لیکن پھر بھی گریز کے ہی کہیے یا خود پسندی کی بنا پر انسان ضرور اپنے بچپن کو یاد کرنا چاہتا ہے، گو دماغ کچھ بھی کہے دل تو گاہے گاہے کہہ دیتا ہے:

ع دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

چلیے آج ایک اسی بہانے سے پھر میں اپنے بچپن کی سیر کر لوں، اس پر اسرار چمنستان کے بعض گوشوں کو چھپا ہی رہنے دوں لیکن اس کی بعض روشوں پر اسی بے تکلفی سے چل پھر لوں۔

اس وقت مجھے بے اختیار وہ تین شعر یاد آ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کم از کم بعض اور دوستوں کے دل میں بھی یہ چٹکیاں لیے ہوں گے پہلا شعر ہمارے اردو کے کورس میں تھا:

ذوق بازی گہ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں
ساتھ بچوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو

اسکول کے دنوں میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ شعر کی اس زمین میں یعنی اس بحر میں جو طفلانہ سی ہے ذوق سے استادِ سخن کو بھی کچھ کہنا پڑا۔ خدا جانے یہ بحر طفلانہ کیوں سمجھی گئی۔ بعد میں زمین کے اس معنی سے طبیعت نے بغاوت کی اور کہا سیدھی سادی بات ہے، کہ شاعر کہتا ہے کہ یہ دنیا تو بچوں کے کھیلنے کی جگہ ہے ہم جیسے پختہ کار بھی بچوں کے ساتھ کھیلنا سیکھ لیں تو وہ اتنے خام نہ رہیں۔ زندگی زیادہ زندہ ہو جائے اور پھر واقعی۔

ع زندگی زندہ دلی کا ہوتا ہے

لیکن اب تو یہ حالت ہے کہ بچے یہاں ہلڑ کے وہاں، جوان ان سے پرے اور بوڑھے ان سے بہت دور ہیں۔ ساری نوعِ انسانی بٹی ہوئی ہے ملکوں کی تقسیم کی طرح سب کے بیچوں بیچ حدود ہیں، رکاوٹیں ہیں، موانع ہیں۔ بچوں کو یہ نہیں کرنا، جوانوں کے لیے یہ مناسب ہے، بوڑھوں کو یوں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔ اگر ان میں جا بجا حدِ فاصل نہ ہو تو نوعِ انسان کی یہ جماعتیں ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جائیں، ایک دوسرے سے لطف اٹھائیں اور مستفید ہوں۔

دوسرا شعر لازم طور پر یاد آتا ہے:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

یہاں فطرت انسانی سے زیادہ واقفیت کا اظہار ہے، یہاں شاعر زیادہ بلندی پر پرواز کرتا دکھائی دیتا ہے۔ دنیا محض بچوں کا ایک کھیل ہے، بڑے آدمی، عقل مند آدمی، ثقہ لوگ جو نہایت متانت سے اس پر غور کرتے ہیں اس میں منہمک رہتے ہیں، شاعر: انہیں چھوٹے آدمی اور بے وقوف لوگ سمجھا جاتا ہے۔ یہ سنجیدگی بے معنی ہے، یہ حقیقت کو جانتی نہیں، فقط مظاہر میں غرق رہتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اس نے اصلیت کو پا لیا یا قریب ہے کہ پا لے گی۔ عقل مند وہ ہے جو اس ساری چیز کو ایک تماشا، ایک ڈرامہ سمجھے۔ جو کچھ بظاہر آنکھوں کے سامنے ہوا ہے، بچوں کا ایک کھیل اور تماشا چاہیے اور بس اور حقیقت کی تلاش ہو تو اسے کسی اور جگہ یا کسی اور طرح تلاش کرے۔

پھر سرور جہان آبادی کی مشہور نظم ہے:

تیرے ایاغ کا ہوں میں جرعہ خوار بچپن
باقی ہے تری مے کا اب تک خمار بچپن

اور پیارا تھا میں باپ اور ماں کا لاڈلا تھا۔ وہ ٹھنڈی ٹھنڈی جھڑیاں اور وہ پھوار بچپن اور لے لے جوانی دے دے پروردگار بچپن۔

یہ نظم جیسی بھی ہے دلکش ضرور ہے۔ اسے یاد کر کے نفسیاتی الجھنیں بھول بھلا جاتی ہیں اور واقعی جی چاہتا ہے کہ بچپن کی بات کچھ لکھیے۔

جوں ہی اپنے بچپن کا ذکر کرنے لگتا ہوں معاً باغبان پورہ کی گلیاں، شالامار باغ کی روشیں، سنٹرل ماڈل اسکول لاہور کے کمرے میری نظروں کے سامنے آ جاتے ہیں۔

بچپن سے میری مراد لڑکپن ہے، ورنہ شیر خوارگی کا زمانہ شاید ہی کسی کو یاد ہوگا، میرا حافظہ اس بارے میں کمزور واقع ہوا ہے۔ مجھے تو اس زمانے کا کوئی واقعہ یاد آتا ہے جب میری عمر چار پانچ برس کی تھی۔ باغبان پورہ میں ایک میاں الہ دین کی مسجد تھی اور اسی مسجد میں کسی زمانے میں میرے والد محمد شاہ دین (ہمایوں) اور میرے خسر سر محمد شفیع اور دیگر بزرگان خاندان میں سے اکثر اصحاب نے تعلیم پائی۔ اس مسجد کے میاں الہ دین دور و نزدیک اپنی سختی الفاظ کے لیے مشہور تھے۔ چنانچہ میرے ہوتے ہوئے انہوں نے ہمارے ہم مکتب کو اس کی شرارت پر یہ سزا دی کہ اسے پیڑھی پر بٹھا کر مسجد کے کنویں میں لٹکا دیا۔ اتفاق سے رسی ٹوٹ گئی۔ یہ دیکھ کر میاں جی حواس باختہ ہو گئے اور خدا خدا کر کے معلق طالب علم کی جان بچائی گئی۔ میاں جی کو اکثر زکام رہتا تھا اور لڑکوں کو ان کے بڑے بڑے تولیہ نما رومال دھونے پڑتے تھے۔

پانچ چھ برس کی عمر میں، میں لاہور کے سنٹرل ماڈل اسکول میں داخل ہوا۔ ہر روز میں اور میرے دو تین ہم عمر ایک بند گاڑی میں باغبان پورہ سے لاہور آیا کرتے۔ ایک واقعہ مجھے اس زمانے کا خاص طور پر یاد ہے۔ میں دوسری یا تیسری جماعت میں تھا اور لوئر پرائمری کی جماعتوں کے لیے اس عمارت کے چند شمالی کمرے مخصوص تھے جہاں اب سنٹرل ٹرینگ کالم ہے۔ ان دنوں خبر آئی کہ ہماری سرکار یعنی ہماری ملکہ معظمہ کی حکومت نے ایک لڑائی جیت لی ہے اور اس خوشی میں اسکول کو چھٹی دی گئی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ہم کونے کے اس کمرے سے اپنے بازو گھماتے اور چھٹی چھٹی کہتے باہر گراؤنڈ کی طرف بھاگے۔ معلوم ہوتا ہے یہ غالباً مئی یا جون ۱۹۰۰ء کا واقعہ ہے جب انگریزوں نے جنوبی افریقہ کی بوئر جنگ میں میفیکنگ یا پریٹوریا کو فتح کیا۔ ظاہر ہے کہ جس ملکہ نے جنگ جیت کر ہمیں چھٹی دلوائی اس کے لیے ہمارے دلوں میں کتنی دعائیں نکلتی ہوں گی۔ لیکن مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب یہی ملکہ مری ۲۲ جنوری ۱۹۰۰ء کو اور مادھو لال حسین (باغبان پورہ) میں پولیس نے آ کر اپنے ہنٹروں سے بسنت میلے کو درہم برہم کر دیا تو ہم نے اس ملکہ کے حق میں کوئی نیک کلمے نہ کہے۔ اسے مرنا تھا کم از کم کسی کام کے دن مرتی کہ ہمیں چھٹی ہی مل جاتی نہ یہ کہ ہماری اچھی بھلی چھٹی اور بھلے میلے کے رنگ میں اس نے بھنگ ڈال دی۔ وہ ملکہ اور وہ پولیس اس دن کے بعد سے میری نظروں سے گر گئی۔ اس وقت میری عمر تقریباً آٹھ سال کی تھی۔

تعجب ہے کہ میں اپنی چھوٹی عمر کے کئی اہم واقعات بھول چکا ہوں لیکن بعض معمولی اور بظاہر بے معنی واقعات ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں، خدا جانے کیوں؟ مثلاً اپنے گاؤں کا ایک واقعہ مجھے اس وقت یاد آ رہا ہے۔ ہمارا باغبان پورہ ان دنوں محض ایک قصبہ تھا لاہور سے الگ تھلگ، یوں ہم تو ابھی تک اسے اپنا گاؤں ہی

کہتے ہیں حالاں کہ اس کی آبادی آج کل پچیس تیس ہزار ہے اور یوں لاہور کارپوریشن کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ ان دِنوں آج سے نصف صدی پہلے اس کی آبادی بہ مشکل دو تین ہزار ہوگی۔ ہاں تو واقعہ محض یہ ہے کہ میں اس گاؤں کے بازار میں شاید گنڈیریاں لینے جا رہا تھا۔ میری عمر شاید ۷ یا ۸ برس کی تھی سامنے ایک غریب عورت آ رہی تھی جو دستور کے مطابق پردہ کیے ہوئے نہ تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور پاس سے گزرتے ہوئے اس کا منہ چڑایا۔ وہ کہنے لگی اے میاں ''اپنا منہ کتنا بھلا ہے اور تو کس طرح اس کو بگاڑ رہا ہے۔''

لیکن میں ایک شریر لڑکے کی طرح ہنستا ہو نکل گیا۔ اب کوئی ماہر نفسیات ہی مجھے بتا سکے گا کہ ہزاروں لاکھوں باتیں بھول کر یہ ذرا سی بات کیوں یاد رکھ سکا؟ شاید یہ ہو کہ ایک متول خاندان کے ایک پابند اخلاق لڑکے کو موقع ملا کہ وہ کسی غریب کا مذاق اڑا سکے اور اس آزادی سے محظوظ ہو۔

ہمارے گاؤں کے چاروں طرف ہمارے مکانات کے بالکل قریب لہلہاتی کھیتیاں ہوتی تھیں اور ہم ایک حد تک اس سے دیہات کا لطف اٹھاتے تھے۔ ہم ہمیشہ لاہور والوں کو طنزاً شہریے کہتے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہم پینڈو (گنوار دیہاتی) نہیں ہیں۔ کیوں کہ باغبان پورہ نہ تو شہر تھا اور نہ دیہہ بلکہ شہر کے قریب ایک قصبہ جو ہمارے خیال میں شہر اور دیہات دونوں سے بہتر تھا۔ باغبان پورہ کے آس پاس دور دور تک قسم قسم کے پھلوں کے باغات تھے اور یہی اس کے نام کی وجہ تسمیہ تھی اور شالامار باغ جو باغبان پورہ سے متصل ہے یہ گاؤں اس کے باغوں اور نگہداروں کی جائے رہائش تھا۔ بچپن میں ہمارے ہم عمر لڑکوں کا ایک شغل شام یا رات کے وقت ان باغوں کے فروخت شدہ پھلوں کی چوری ہوا کرتا تھا۔ جس پر ہمیں فخر تھا لیکن جسے بدقسمتی سے ہمارے بزرگ بہت برا سمجھتے تھے اور ان کی ڈانٹ ڈپٹ ہماری ان یلغاروں میں خواہ مخواہ ایک رکاوٹ بن جاتی تھی۔ اپنے ہم عمروں کے گروہ میں گاؤں میں، میں ہی تقریباً سب سے چھوٹا تھا، اس لیے ان یلغاروں میں یا تو میری شرکت ہوتی ہی نہ تھی یا میری حیثیت محض ایک تماشائی کی ہوا کرتی تھی لیکن پھر بھی میں چاہتا تھا کہ ان کارناموں میں کبھی کبھی میرا نام لیا جائے۔ علاوہ کم عمری کے مجھے یہ دقت بھی تھی کہ والد محترم دوسرے بزرگوں سے زیادہ ان شرارتوں کو ناپسند کرتے تھے اور بڑے چھوٹے سب اس سے حد درجہ جھجکتے اور اس لیے میری شرکت کے معاملے میں زیادہ محتاط ہو جاتے اس کی وجہ سے میں بچپن ہی سے کم از کم آوارگی اور دشت نوردی کی نعمتوں سے محروم ہو گیا۔

لیکن بچپن اور لڑکپن میں ہم سب کو ایک بے نظیر نعمت حاصل تھی، جس کا ہمارے اور ہمارے خاندان اور گاؤں والوں کی نشو و نما پر گہرا اثر پڑا۔ وہ بے بہا نعمت شالامار باغ تھی۔

یہ باغ دراصل سرکاری تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ حکومت کی طرف سے اس باغ کی نگہداشت اور انتظام شاید سینکڑوں برس سے ہمارے بزرگوں کے سپرد تھا اور ہم اسے خاندان کی میراث سمجھتے تھے۔ شالامار باغ ہمارے گاؤں سے اتنا قریب تھا کہ وہ گویا ہمارے گھروں کا مشترکہ صحن بن چکا تھا۔ صبح وشام، گرمیوں میں دوپہر اور سردیوں میں رات گئے بھی ہم اکثر وہاں آتے جاتے تھے۔ چھٹیوں میں دن کا اکثر حصہ وہاں گزارتے۔ باغ میں داخل ہونے اور اس سے نکلنے کے لیے لوگوں کے واسطے ایک بڑا دروازہ تھا لیکن ہمارے لیے وہاں اندر جانے اور باہر نکلنے کے کئی اور راستے بھی تھے۔ کہیں ہم اونچی دیواروں میں اڈے بنا بنا کر چڑھ اتر جاتے کہیں ہم بڑے بڑے دروازوں کے نیچے کنڈے بنا کر گھس جاتے اور کبھی ہم بیرونی درختوں کی شاخوں کے ذریعے سے اس کی چاردیواری کے اندر چھلانگ لگا کر جا دھمکتے باغ کا بڑا تالاب شہریوں کے لیے محض دیکھنے کی ایک چیز تھی۔ لیکن باغبان پورہ والوں کے لیے وہ نہانے، تیراکی سیکھنے، "بادشاہی کھیلنے" اور کئی قسم کی شرارتیں کرنے کی ایک مسرت گاہ تھا۔ شاہ جہاں نے یہ عظیم الشان باغ بنایا، اسے سات تختوں سے آراستہ کیا اور یوں اسے مسلمانوں کی تعمیری تہذیب کا ایک نمونہ بنا کر آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑا۔ سکھ آئے تو انہوں نے اس کے سنگ مرمر اکھاڑے اور انہیں جا اپنے دربار صاحب میں جڑ دیا۔ ان کا زمانہ گزر گیا تو انگریز آئے اور یہ باغ عوام کی ایک سیرگاہ بنا دیا گیا لیکن کم از کم ہم باغبان پورہ کے مسلمان نوجوان اپنے آپ کو گذری اسلامی تہذیبوں کے نمایندے اور اس شاندار مغلئی باغ کے اجارہ دار سمجھتے تھے، جن کا حق ہندوؤں اور انگریزوں دونوں کے حق پر فائق تھا۔ ہم لڑکے عقلیت اور قانون سے بے نیاز تھے۔ یہ باغ ہمارے مسلمان بادشاہوں کی تعمیر تھا، اب اس پر ہم نوجوانوں کا قبضہ تھا، یہ ہمارے گھر کا صحن تھا، یہ ہماری طفلی کا گہوارہ تھا، یہ ہمارے بچپن کی بازی گاہ تھا۔

آج شالامار باغ پاکستان کا ایک مشہور باغ ہے جس میں اسلامی تہذیب کی محبوب جھلک نظر آتی ہے لیکن ہمارے بچپن میں غیر منقسم ہندوستان میں بھی ہماری نگاہ میں یہ پاک تھا۔ بے نظیر تھا اور خالص مسلمانوں کی ملکیت تھا۔

بچپن میں جب کبھی میں بہشت اور اس کی بہشتی نہروں اور اس کے پھلوں کا ذکر سنتا تو میرے دل میں اس کی یہی تصویر اترتی کی وہ ایک شالامار باغ ہے جس کی خوبصورتی اور انوکھا پن اور جادو نت نئی اور دوامی ہے، جہاں کسی گورے اور کالے کا راج نہیں اور جہاں آزاد انسان کھلنڈرے لڑکوں کی طرح آتے جاتے ہیں اور کھیلتے کودتے ہیں۔

ظفر اقبال

اچھو میاں کا جاگنا

یہ ہمارے پوتا صاحب ہیں۔ ان کے معمول کے کارنامے تو اور بھی بہت ہیں، لیکن سکول جانے کے لیے ہر روز صبح اٹھنا ان کے خاص کمالات میں شامل ہے۔ جہاں تک اٹھنے کا تعلق ہے تو کچھ لوگوں کا خیال ہی ہے کہ یہ اٹھتے ہیں ورنہ ان کے سارے مرحلے سوئے سوئے طے پاتے ہیں۔ مثلاً سوئے سوئے ہی منہ ہاتھ دھلوانا، اسی حالت میں سکول کی وردی پہننا اور اسی عالم میں ناشتہ کرنا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ اس وقت سوئے سوئے بھی ہوتے ہیں اور تھوڑے بہت جاگے ہوئے بھی۔ مثلاً ایک دن ان کے منہ سے غلطی سے پھیکی چائے لگادی گئی تو بلند آواز سے بولے ''چینی!''

اگرچہ ان کا بڑا بھائی بھی ساتھ ہوتا ہے لیکن یہ سارا راستہ گاڑی میں بھی سوئے رہتے ہیں اور کہیں سکول پہنچ کر جاگنے کی مہربانی کرتے ہیں۔ ان کا اصل نام ارسل ہے جب کہ پیار کا نام اچھو۔ کھانا جو ساتھ لے کر جاتے ہیں وہ وہیں چوری ہو جاتا ہے اور دوسروں کے کام آتا ہے۔ اپنے سے بڑے لڑکوں کو چھیڑنا اور ان سے پٹائی کروانا ان کی ہابی ہے۔ تین سال کے تھے تو فلمی گانے اور فیض کی گائی ہوئی نظمیں، غزلیں پورے سُر میں گا کر دکھانا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی پوچھتا کہ بڑے ہو کر کیا کرو گے تو جواب ملتا کہ گانے گایا کروں گا۔ آپ کے۔ جی کے ہونہار طالب علموں سے شمار ہوتے ہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک دو بار سن کر پورا یا آدھا گانا پورے سُر میں گا دینا ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا، زیادہ قربت باپ سے ہے اور ماں کو زیادہ منہ لگانا پسند نہیں کرتے، چوں کہ میرے پوتے پوتیوں میں سب سے چھوٹے ہیں اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ یہ وہ روایتی طوطا ہے جس میں میری جان ہے۔ خاندان میں بڑے چھوٹے سب کی آنکھوں کا تارا ہیں لیکن اس بات پر گھمنڈ نہیں کرتے۔ بڑے بھائی کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتے۔ عمر بمشکل چھ سال ہوگی۔ دودھ کے دانت ٹوٹے تو بہت پریشانی کا اظہار کیا اور یہ بات تسلیم کرنے میں کافی دیر لگائی کہ نئے دانت بھی آ جائیں گے۔

ٹی وی کے بہت شوقین لیکن تقریباً اس کے اوپر چڑھ کر دیکھتے ہیں اور اس کے نقصانات کے بارے میں قائل ہونا پسند نہیں کرتے۔ جب سے سکول میں داخل ہوئے ہیں، گانوں پر توجہ کم ہو کر نہ ہونے کے برابر رہ گئی

ہے لیکن اب بھی لہر میں آ جائیں تو اپنی مہارت کا مظاہرہ ضرور کرتے ہیں۔ بڑے بھائی کی اُردو اتنی اچھی نہیں اس لیے اس کی مدد بھی کرتے ہیں البتہ انگریزی میں ذرا نالائق ہیں۔ اپنی ٹیچروں کی بھی آنکھ کا تارا ہیں اور سوشل اتنے کہ آن کی آن میں گھل مل جاتے ہیں اور ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لینا ان کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔

"گھل مل جانے میں عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ آپ عمر کے کسی بھی حصے میں ہوں، گھڑی بھر کے لیے ان کے ہتھے چڑھ جائیں تو نہ صرف آپ سے جملہ معلومات حاصل کرنے میں دیر نہیں لگاتے بلکہ اپنا مفصل تعارف بھی کروانا ضروری خیال کرتے ہیں۔ ہم انھیں 'جن' بھی کہتے ہیں کیوں کہ سب کی متفقہ رائے ہے کہ ان کے اندر کسی جن کی روح حلول کر چکی ہے جو خود بھی ان کی حرکتوں کی وجہ سے خاصے اضطراب میں رہتی ہے۔ بڑے بھائی کو اپنے کپڑوں اور آرائش کا خیال رہتا ہے لیکن آپ اس سلسلے میں خاصے ملنگ واقع ہوئے ہیں، حتیٰ کہ کھانے پینے کے بھی زیادہ شوقین نہیں ہیں۔

سکول میں بچوں کو ترڑی تو لگاتے ہی ہیں کہ پرنسپل میرے دادا ابو کے دوست ہیں۔ لیکن پٹائی پھر بھی ہو جاتی ہے کیوں کہ پنگا کرنے سے باز آنا ان کی ترجیحات میں شامل ہی نہیں ہے، اور، وہ بھی اپنے سے بڑی عمر کے لڑکوں کے ساتھ۔ اپنی تمام تر چالاکی اور ہوشیاری کے باوجود نہ صرف ان کا کھانا چوری ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات جیب خرچ بھی۔ تاہم، گھر آ کر پٹائی کے ہر واقعے کو بھی توڑ مروڑ کر نہایت فاتحانہ انداز میں بیان کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔

چھوٹی بڑی گاڑیوں کے ناموں، ماڈلوں اور قیمتوں کے بارے میں پورے جان کاری رکھتے ہیں اور سب سے بڑی خاصیت، خوبی یا خرابی یہ ہے کہ پرلے درجے کے کہانی گیر ہیں۔ طویل سے طویل کہانی آپ ان سے سن سکتے ہیں جو ان کی اپنی تصنیف یا تخلیق ہوتی ہے اور لازمی طور پر فی البدیہہ بھی۔ ان میں شیروں، ریچھوں، چڑیلوں اور جنوں کی سرپرستی لازمی جزو ہوتا ہے۔

پاپا کے بارے میں ہمیشہ صیغہ واحد حاضر استعمال کریں گے۔ ایک دن کسی بدتمیزی پر ان سے ایک عدد تھپڑ کھا کر ماما کو مخاطب کر کے بولے:

"اس کا ہاتھ کچھ زیادہ نہیں کھلتا جا رہا؟"

یارانہ بھی پاپا ہی کے ساتھ ہے اور اس کے بغیر سوتا بھی نہیں۔ ہیں تو سنگل پسلی لیکن ادائیں ساری پہلوانوں والی ہیں۔ تیز بھاگنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، بے شک کوئی ان کے پیچھے نہ بھاگ رہا ہو۔ یہ ہیں ارسل جنید عرف لٹھو میاں!!!!

محمد ادریس قریشی

کھیر کا دیگچہ

نواب کرم دین آف پاگل پور نے زور زور سے ناک چڑھا کر خوشبو سونگھنے کی کوشش کی اور بڑبڑائے۔ “میرا خیال ہے کہ کھیر پک کر تیار ہو گئی ہو گی۔“

وہ جلدی سے کچن میں داخل ہونے لگے کہ انتہائی موٹا باورچی تیزی سے باہر نکلا، جس سے ٹکر کھا کر نواب صاحب دھڑام سے نیچے گرے اور ان کی لمبی سی ٹوپی دور جا پڑی۔

”ابے نانجار! اگر خدانخواستہ تم ہمارے اوپر گر جاتے تو ہمارا تو بن جاتا فالودہ۔“ نواب صاحب گرجے۔

لیکن مالک اس سردی کے موسم میں فالودہ تو کوئی بھی نہیں کھاتا۔“ باورچی نے لقمہ دیا۔

”بکواس بند کرو جلدی سے بتاؤ کھیر کہاں تک پہنچی ہے؟“

”جناب کھیر دیگچے کے اندر ہے اور ابھی آپ کی توند شریف میں پہنچنے والی ہے۔“

ایک اور ملازم قریب آتے ہوئے بولا ”یہ توند اتنی شریف ہے کہ برادر، پانچ کلو کھیر کھا جاتی ہے۔“

”ارے تم لوگ میرے چھوٹے سے پیٹ کو توند کہہ کر مذاق اڑا رہے ہو، میں تمھیں نکال دوں گا۔ نواب صاحب غصے میں آتے ہوئے بولے۔

”تو پھر نواب صاحب آپ کی کھیر کون پکائے گا یاد رہے کہ پوری ریاست کے باورچی بلا کر آپ نے ان کے درمیان کھیر پکانے کا مقابلہ کرایا تھا اور اس مقابلے میں ہماری پکائی ہوئی کھیر ہی آپ کو پسند آئی تھی۔“

موٹے باورچی نے سر ہلایا۔

”اچھا مذاق بند کرو میں بے تاب ہوا جا رہا ہوں دیگچے کا ڈھکن اٹھاؤ اور مجھے کھیر کی شکل دکھاؤ۔ پورے چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں اور ابھی تک ہم نے کھیر کی شکل نہیں دیکھی۔ نواب صاحب نے لمبی سی چھڑی ہوا میں لہرائی۔

وہ تینوں باورچی خانے میں گھس گئے۔ باورچی نے ایک بڑے سے دیگچے کا ڈھکن اٹھایا تو اس کے منہ

سے ایک تیز چیخ نکلی۔ نواب کرم دین اور دوسرے ملازمین نے بھی دیگچے میں نظر ڈالی تو چلا اٹھے کھیر کا دیگچہ بالکل خالی تھا۔ اس میں کھیر کا نام ونشان تک نہیں تھا۔

”یہ نہیں ہوسکتا ابھی تو اس میں کھیر تھی بلکہ اتنی کھیر تھی کہ اُبل اُبل کر باہر گرنے کو تھی۔“ موٹا باورچی آنکھیں پھاڑے دیگچے کو دیکھے جا رہا تھا۔

”تو پھر کھیر کہاں گئی؟“ نواب صاحب چیخے۔

میرا خیال ہے کہ کھیر ہمیں نظر نہیں آ رہی ہے یہ دیگچے میں ہی ہے چلو ذرا ہاتھ ڈال کر دیکھتے ہیں۔“

موٹے باورچی نے دیگچے میں ہاتھ ڈالا اور پھر انگلی چاٹتے ہوئے بولا ”کھیر بالکل بے مزہ اور پھیکی ہے۔“

”ابے الو کی دم! کھیر تو ہے ہی نہیں۔“ دوسرا ملازم چیخا۔

نواب کرم دین آف پاگل پور کھانے پینے کو بہت شوقین تھے۔ وہ صبح ناشتے میں پانچ بریڈ اور ایک درجن انڈے کھاتے تھے۔ دوپہر کو لنچ میں بکرے کی ایک روسٹ ران سے شغل فرماتے تھے اور رات کو صرف کھیر کھاتے تھے ایک بڑا دیگچہ صبح سے ہی پکنا شروع ہو جاتا تھا۔ کھیر میں بڑے لوازمات یعنی بادام، پستہ، گری اور کھویا وغیرہ ڈالے جاتے تھے اور جب کھیر خوب پک پک کر سرخ ہو جاتی تب نواب صاحب رات کو ڈنر میں کھیر کا پورا دیگچا اکیلے ہی چٹ کر جاتے تھے۔

آج عین کھیر کے وقت اس کے دیگچے سے پکی پکائی کھیر غائب ہو چکی تھی اور وہ ست پٹائے پھر رہے تھے۔

نواب صاحب نے محل کے سارے غلام جمع کر لیے اور چیخ چیخ کر آج ہونے والے نقصان کے بارے میں بتایا۔ ایک پتلے سے ملازم نے کہا۔

”مالک جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔“

”ہاں ہاں بولو، جلدی بولو......“

”وہ جناب میں ایک طریقہ بتاتا ہوں۔ آپ پوری ریاست میں اعلان کرا دیں کہ آپ کی کھیر غائب ہو گئی ہے اور کھیر تلاش کرنے والے کو منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔“

نواب صاحب نے کہا ”ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ یوں کیا جائے ریاست کے دس دانش وروں کو بلایا جائے تاکہ وہ اس اعلان کے بارے میں اپنی رائے دیں تاکہ بعد میں ہماری سبکی نہ ہو۔“

نواب صاحب آپ اعلان کے بارے میں کیا رائے حاصل کرنا چاہتے ہیں؟'' ایک گنجا نوکر بولا۔

''تم خاموش رہو اور دس دانش ور حاضر کیے جائیں۔'' نواب صاحب گرجے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد دس عجیب و غریب حلیوں والے لوگ ایک لائن میں کھڑے کر دیئے گئے۔

نواب صاحب نے اپنی لمبی سی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تم سب عقل مند لوگ ہو۔ میں اپنی ریاست میں کھیر کی گمشدگی کے بارے میں اعلان کروانا چاہتا ہوں۔ تم یہ بتاؤ گے کہ یہ اعلان کیسا ہونا چاہیے۔''

ایک دانش ور نے کہا ''حضرات ایک ضروری اعلان سنیے۔ نواب صاحب کی کھیر غائب ہو گئی ہے اگر کسی کو اس بارے میں کچھ علم ہو تو مطلع فرمائے۔''

''خاموش! نا ہنجار! ایسا اعلان تو بچہ بھی بتا سکتا ہے۔ کوئی دوسرا دانش ور اعلان بتائے۔'' نواب گرجے۔

ایک اور دانش ور نے کھانستے ہوئے کہا ''میرے خیال میں اعلان یوں ہونا چاہیے۔ نواب صاحب کی کھیر دیگچے سے کسی نے چرائی ہے چور خود حاضر ہو جائے اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

''خاموش۔'' نواب صاحب چیخے۔ ''چور کو ہم جان سے ماردیں گے، تم کہہ رہے ہو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اگلا دانش ور اعلان بتائے۔''

اسی طرح باری باری تمام دانش اعلان بتاتے رہے لیکن نواب صاحب ان پر سخت برہم ہوتے رہے لیکن آخری دانش ور کے اعلان پر نواب صاحب پھڑک اٹھے ''ہاں بالکل یہ ٹھیک ہے۔ اس سے اچھا اور خوب صورت اعلان ہو ہی نہیں سکتا۔''

اعلان یہ تھا ''حضرات نواب صاحب کے دیگچے سے کھیر نکل کر کہیں بھاگ گئی ہے اگر کھیر اعلان سنے تو خود ہی واپس آ جائے، ورنہ نواب صاحب کو کھیر کے بجائے کھیرے کھا کر سونا پڑے گا۔''

بس پھر کیا تھا یہ اعلان بتانے والے دانش ور کے گلے میں موتیوں کے ہار ڈالے گئے اور محل کے دو ملازم ایک بانس پر لاؤڈ سپیکر لگا کر ریاست کی سڑکوں اور گلیوں پر اعلان کرتے ہوئے گزرنے لگے۔ رات کا اندھیرا ابھی اچھی طرح نہیں پھیلا تھا پھر بھی روشنیاں جلنا شروع ہو چکی تھیں۔ جو کوئی بھی اعلان سنتا دانت نکال نکال کر ہنستا۔

دو گھنٹے تک اعلان ہوتا رہا لیکن کھیر واپس نہیں آ سکی۔ آخر نواب صاحب نے ایک بڑے سے کمرے میں میٹنگ بلائی اور سب مشیر حاضر کر لیے گئے۔

’’اگر میری کھیر نہیں ملی تو میں تم سب کو محل سے نکال دوں گا کیوں کہ تم میں سے کوئی بھی کھیر کا چور ہو سکتا ہے۔ ‘‘

ایک مشیر نے کہا’’نواب صاحب میں آپ کو ایک طریقہ بتاتا ہوں۔ آپ محل کے سب ملازموں کو باری باری حاضر کریں اور ان کی مونچھیں غور سے دیکھیں۔ جس کسی نے بھی آپ کی کھیر چاٹی ہوگی ضرور اس کی مونچھوں پر کھیر بھی لگی ہوگی۔ ‘‘

’’ہوں! تم نے یہ ترکیب پہلے کیوں نہیں بتائی۔ ‘‘تمھیں سزا کے طور پر قید کیا جاتا ہے تا کہ تم آیندہ وقت پر صحیح ترکیب بتا سکو۔ ‘‘نواب صاحب نے غصے سے کہا۔

’’نہیں نواب صاحب نہیں! یہ فیصلہ انصاف کے مطابق نہیں ہے، میرے ذہن میں جوں ہی یہ ترکیب آئی، میں نے آپ کے گوش گزار کر دی ہے۔ براہ کرم مجھے قید خانے میں مت ڈالا جائے کیوں کہ ابھی میری آپ کو ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ‘‘مشیر گھبرا کر جلدی جلدی بولا۔

’’اچھا، اچھا۔ یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔ چلو اب یوں کیا جائے سارے ملازموں کو باری باری حاضر کیا جائے تا کہ ہم ان کی مونچھوں کا معائنہ کر سکیں۔ ‘‘نواب صاحب نے کہا۔

سب سے پہلے ایک ملازم کو اندر پیش کیا گیا تو اس کی مونچھیں ایسے صاف تھیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

’’ابے ناہنجار! تیری مونچھیں کہاں گئیں؟ نواب صاحب چیخے۔

’’نواب صاحب اصل میں میری مونچھوں میں جوئیں پڑ گئی تھیں اس لیے میں نے شیو کرا دی ہے۔ ‘‘وہ منمنایا۔

’’ہوں! ‘‘اگلے ملازم کو حاضر کیا جائے۔

اگلا ملازم اندر آیا تو وہ بھی کلین شیو تھا۔ مونچھ ڈاڑھی صفا چٹ۔

’’تمھاری مونچھیں کہاں ہیں بے وقوف؟ ‘‘نواب صاحب زور سے چلائے۔

’’نواب صاحب اصل میں میری مونچھیں چوہے کی دم جیسی تھیں۔ میری بیگم کو چوہے سے بہت ڈر لگتا ہے لہٰذا اس نے میری مونچھیں سوتے ہوئے نائی بلوا کر صاف کرا دیں۔ ‘‘اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’ہوں، اب ہم کیا کریں چلو اگلا ملازم بھیجا جائے۔ ‘‘وہ بولے۔

تیسرا ملازم اندر آیا تو نواب صاحب اٹھ کر زور زور سے سر ادھر ادھر مارنے لگے۔ اس کی بھی مونچھ تھی نہ ڈاڑھی۔

’’شیطان کی دم! تمھاری مونچھیں کہاں دفع ہو گئی ہیں۔‘‘

’’جناب عالی! آج دوپہر تک تو میری مونچھیں موجود تھیں۔ اب مجھے خود پتا نہیں چل رہا کہ یہ کہاں گئی ہیں لیکن میرا اندازہ ہے کہ میری مونچھیں آپ کی کھیر کو تلاش کرنے چلی گئی ہیں۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’خاموش نابنجار! بھلا مونچھوں کے کوئی ٹانگیں ہوتی ہیں جو وہ خود چل کر چلی گئی ہیں۔‘‘ نواب صاحب نے کہا۔

’’نواب صاحب حضور! اگر مونچھوں کے ٹانگیں نہیں ہوتی ہیں تو کھیر کی بھی تو ٹانگیں نہیں ہوتی ہیں جو وہ خود دیگچے سے نکل کر بھاگ جائے۔‘‘ اس نے کہا۔

’’ہاں یہ تو تم نے عقل مندی کی بات کی مگر تم نے یہ بات اتنی دیر سے مجھے کیوں بتائی تمھاری سزا یہ ہے کہ تمھیں بھی قید خانے میں۔‘‘

’’معافی حضور معافی! قید خانے میں ان دنوں کافی مچھر ہیں وہ کاٹتے ہیں تو ڈینگی بخار ہو جاتا ہے اور آپ کے نوکر کو ایسا ہو جائے یہ آپ کے شایان شان نہیں ہے۔‘‘ وہ جلدی سے بولا۔

ہاں بالکل میرے کسی ملازم کو ملیریا نہیں ہونا چاہیے میں ابھی ریاست کے تمام ڈاکٹروں کو حکم دیتا ہوں کہ میرے محل میں مچھر مارنے کا بندوبست کیا جائے تاکہ ملیریا میرے محل میں داخل نہ ہو سکے۔‘‘ نواب صاحب نے کہا ان کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں پھر وہ نیچے بچھے ہوئے ایک موٹے قالین پر گر پڑے اور زور زور سے خراٹے لینے لگے۔

ان سے کچھ ہی فاصلے پر ایک کمرے میں کھیر کے دیگچے کے ارد گرد موٹا باورچی اور دوسرے کچھ ملازم جلدی جلدی دونوں ہاتھوں سے مزے دار کھیر چاٹنے میں مصروف تھے۔

☆☆☆☆

محمد فہیم عالم

چچا تیز گام نے آم کھائے

گاؤں سے شیر محمد کا خط کیا آیا، چچا تیز گام نے تو سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ جمن اور استاد کی تو گویا شامت ہی آ گئی۔ جمن اُس وقت کو کوس رہا تھا جب اُس نے چچا تیز گام کو خط پکڑایا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ چچا تیز گام جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے، جمن تیر کی طرح اُن کی طرف لپکا۔

”مالک خط......“

اے...... ہے۔ کیا، کیا......“ چچا تیز گام چلا اُٹھے۔

”دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا، میں تمہیں خط نظر آتا ہوں۔“

”نن...... نہیں...... مم...... مالک...... آ...... آپ خط نہیں مم...... میرا مطلب ہے مالک خط۔“ چچا تیز گام کے گھورنے پر جمن بوکھلا گیا۔

”پھر وہی...... کیا تمہاری آنکھیں نہیں ہیں، دن دیہاڑے میں تمہیں خط نظر آتا ہوں۔“

”مالک! تو کیا آپ رات کو خط نظر آتے ہیں۔“ استاد نے حیرت سے چچا تیز گام کی طرف دیکھا۔

”اف خدایا...... کیسے پاگلوں سے پالا پڑا ہے۔“ چچا تیز گام جھلاہٹ سے اپنے گال پیٹتے ہوئے بولے۔ ”بیگم...... بیگم...... تم کہاں ہو؟“ چچا تیز گام نے بیگم کو پکارا۔

”کیوں چلا رہے ہیں، کیا ہوا؟“ بیگم باورچی خانے سے نکلتے ہوئے بولیں۔

”بیگم یہ پوچھو کیا نہیں ہوا، ان ناہنجاروں کو دیکھو، میں ان کو خط نظر آتا ہوں۔“ چچا تیز گام غصے سے لال پیلے ہو رہے تھے۔

”آپ انہیں خط نظر آتے ہیں، کیا مطلب؟“ بیگم حیرت سے بولیں۔

”مطلب تو تم ان ہی سے پوچھو!...... چچا تیز گام بولے۔

”جمن بتاؤ! کیا بات ہے؟“

”بیگم صاحب! آج ڈاکیا مالک کے نام ایک خط دے کر گیا تھا۔ میں تو مالک کو وہ خط دے رہا تھا۔ مالک میری پوری بات سنے بغیر ہی مجھ پر بگڑنے لگے کہ میں انہیں خط کہہ رہا ہوں۔“ جمن معصوم سی شکل بنائے بولا۔

“جمن! تم نے کیا کہا ہمارا خط آیا ہے۔ ارے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔”

“آپ سنتے تو بتاتا ......” جمن جل کر بولا۔

“بس ......بس ......اب زیادہ باتیں نہ بناؤ، لاؤ ہمارا خط۔”

چچا تیز گام نے تیزی سے جمن کے ہاتھ سے خط جھپٹ لیا اور لگے اُسے جلدی جلدی کھولنے۔

“مالک ذرا خط آرام سے کھولیے، کہیں خط پھٹ ہی نہ جائے۔” چچا تیز گام کو تیزی سے خط کھولتے دیکھ کر استاد بول پڑا۔

“اچھا تو اب تم مجھے خط کھولنا سکھاؤ گے۔” یہ کہتے ہوئے چچا تیز گام نے جلدی سے خط کھولا تو چر کی آواز آئی۔ چچا تیز گام نے چونک کر خط کی طرف دیکھا تو وہ پھٹ چکا تھا۔

“جاؤ جا کر سکاچ ٹیپ لے کر آؤ۔”

چچا تیز گام غصے سے بولے۔ جمن دوڑ کر سکاچ ٹیپ لے آیا۔

“تم خط کو پکڑ کر رکھو میں ٹیپ لگاتا ہوں۔” چچا تیز گام ٹیپ لیتے ہوئے بولے۔ پھر جمن خط کو جوڑنے کے لیے دونوں ٹکڑوں کو ملانے لگا۔ چچا تیز گام سے بھلا کہاں صبر ہوتا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جلدی سے ٹیپ کاٹ کر خط پر لگادی۔

“اوہ ......مالک آپ نے کیا کر دیا ......” جمن کے منہ سے نکلا۔

“اندھے ہو کیا، دیکھتے نہیں ہم نے خط کو جوڑا ہے۔” چچا تیز گام بولے۔

“دیکھ لیں، آپ نے کس طرح خط جوڑا ہے۔” جمن الٹے جڑے ہوئے خط کو چچا تیز گام کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔

“تم سے آج تک کوئی کام سیدھا ہوا بھی ہے، اب دیکھو خط اُلٹا جڑوا دیا۔” چچا تیز گام اُلٹا جمن پر برس پڑے۔

“لاؤ مجھے دو خط ...... میں جوڑتا ہوں ......” چچا تیز گام غصے سے جمن کی طرف دیکھتے ہوئے بولے اور خط جمن کے ہاتھ سے لے لیا۔

“مالک خط پر لگی ہوئی ٹیپ ذرا احتیاط سے اتاریے گا۔”

جمن کے اس مشورے پر چچا تیز گام نے کھا جانے والی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا، لیکن منہ سے کچھ نہ بولے اور ٹیپ اتارنے لگے۔ جب ٹیپ اتر چکی تو انھوں نے اس مرتبہ پوری احتیاط کے ساتھ ٹیپ لگائی اور یوں خدا خدا کر کے خط جڑا۔ پھر چچا تیز گام خط پڑھنے لگے۔ خط کی عبارت پڑھ کر وہ مارے خوشی کے اچھل پڑے۔

“اوہ ......مارا ......” چچا تیز گام نے پُر جوش انداز میں نعرہ لگایا۔

’’کوئی مچھر بھی آج تک آپ نے نہیں مارا، آج کس کو مار دیا ......‘‘ چچا کا نعرہ سن کر بیگم باورچی خانے سے باہر نکل آئیں۔

’’بیگم تم بھی بس بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہو۔ ہمیں کیا پڑی ہے جو کسی کو ماریں۔ اوہ مارا کا نعرہ تو ہم نے خوشی سے لگایا ہے۔ کیوں کہ گاؤں سے ہمارا جگری یار شیر محمد آ رہا ہے۔‘‘

’’شیر محمد وہی نا! جسے ملنے آپ گاؤں گئے تو وہ آپ کے گاؤں جانے سے پہلے ہی کہیں چلا گیا تھا۔‘‘ بیگم طنزیہ لہجے میں بولیں۔

’’ہاں ......ہاں ......وہی ......‘‘ چچا تیز گام زور سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔

’’بیگم وہ گاؤں چھوڑ کر نہیں گیا تھا بلکہ ......بلکہ ......‘‘ چچا تیز گام اچانک کچھ کہتے ہوئے رُک گئے۔

’’کیا بلکہ ......‘‘ بیگم نے پوچھا۔

’’بلکہ یہ کہ، بلکہ کچھ بھی نہیں۔‘‘ چچا تیز گام فوراً بولے۔

اب بھلا وہ کیسے بتاتے کہ گاؤں میں شیر محمد سے اس لیے ملاقات نہیں ہوئی تھی کہ وہ بغیر اطلاع کیے گاؤں پہنچ گئے تھے۔

’’یہ کیا بات ہوئی؟‘‘ بیگم نے عجیب نظروں سے چچا تیز گام کی طرف دیکھا۔

’’بیگم بات کو چھوڑو اور ہمارے جگری یار شیر محمد کا خط سنو!

آہا ......کیا پیارا خط لکھا ہے۔‘‘ چچا تیز گام بات ٹالتے ہوئے بولے: ’’پیارے دوست تنویر احمد!

’’مجھے یہ جان کر بے حد دُکھ ہوا کہ آپ گاؤں آئے اور میں آپ کو نہ مل سکا کیوں کہ میں کراچی ایک شادی میں گیا ہوا تھا۔ آپ بھی تو ......ب ......بغیر ......ا ......ط ......‘‘

چچا تیز گام نے پڑھتے پڑھتے یک دم بریک لگا دی۔ کیوں کہ آگے شیر محمد نے چچا تیز گام سے گاؤں آنے کی اطلاع نہ دینے کی شکایت کی تھی۔ چچا تیز گام نے وہ سطر چھوڑ دی اور پینترا بدل کر اگلی سطر پڑھتے ہوئے بولے: ’’ہاں ......تو آگے لکھا ہے۔‘‘

’’آگے کا تو آپ بعد میں بتایئے گا ...... پہلے یہ تو بتائیں کہ اس سے پیچھے کیا لکھا ہے۔ جو آپ نے چھوڑ دیا ہے۔‘‘ بیگم مشکوک نظروں سے چچا تیز گام کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

’’ہم کیوں چھوڑنے لگے ......‘‘ بیگم کے جملے پر چچا تیز گام گڑبڑا گئے۔

’’اچھا تو آپ گاؤں شیر محمد کے پاس بغیر اطلاع دیے چلے گئے تھے۔‘‘ بیگم انہیں گھورتے ہوئے بولیں۔

’’بیگم ......تم بھی کیا پرانی باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔ آگے تو سنو! کیا پیاری بات لکھی ہے ہمارے جگری یار

شیر محمد نے ......'' چچا تیز گام نے بات بدلی اور آگے خط پڑھنے لگے: '' پیارے تنویر احمد! میرے باغوں کے آم پک چکے ہیں۔ میں ان شاء اللہ آپ کے لیے آموں کی پیٹیاں لے کر خود آپ کے پاس آؤں گا۔ آنے کی اطلاع میں آپ کو فون کے ذریعے دے دیتا لیکن اُس دن ریل گاڑی میں آپ جلدی میں اپنا ایڈریس دیتے ہوئے اپنا فون نمبر دینا بھول گئے تھے۔ میں 9 تاریخ کو آؤں گا اور تمہارے لیے ڈھیر سارے آم لاؤں گا۔ تمہارا دوست شیر محمد۔''

چچا تیز گام نے خط ختم کر کے خوشی کا اظہار کیا:

'' آہا......اب آئے گا مزہ......''

'' بڑے بڑے...... پیلے، پیلے......رس بھرے آم......اور وہ بھی کئی پیٹیاں ......واہ بھئی واہ......'' چچا تیز گام خیالوں میں رس بھرے آم کھا رہے تھے۔

'' اچھا تو یہ بات ہے۔'' یہ کہہ کر بیگم باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔

کچھ دیر بعد چچا نے جمن اور استاد کو طلب کر کے کہا:

'' دیکھو! گاؤں سے ہمارا جگری یار شیر محمد آ رہا ہے۔ ہمارے دوست کے استقبال کی تیاریاں ابھی سے شروع کر دو۔ ہمارے دوست کے استقبال میں کوئی کمی نہیں رہنی چاہیے۔ ہمارا دوست پوری آن، بان، شان اور آموں کی پیٹیوں کے ساتھ آ رہا ہے۔ ہم خود شیر محمد کو لینے اپنی چاند گاڑی پر اسٹیشن جائیں گے، ارے......لیکن ہم آموں کی پیٹیاں اسٹیشن سے کیسے لائیں گے؟'' چچا تیز گام بولے۔

'' شیر محمد آموں کی ایک آدھ پیٹی ہی لائیں گے اُسے آپ اپنی چاند گاڑی ہی پر رکھ کر لے آئیے گا۔'' جمن بولا۔

'' ہا......ہا......ایک آدھ پیٹی ......اماں جاؤ......گاؤں میں شیر محمد کے بہت سے باغات ہیں۔ وہ بہت سی آموں کی پیٹیاں لے کر آئے گا۔'' چچا تیز گام ہاتھ نچاتے ہوئے بولے۔

'' آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے آپ کے دوست شیر محمد اپنا پورا باغ ہی آپ کے لیے اٹھا لائیں گے۔'' باورچی خانے سے بیگم کی آواز سنائی دی۔

'' ہاں تو جمن میں کہہ رہا تھا کہ آموں کی بہت سی پیٹیاں ہم اسٹیشن سے کس طرح لائیں گے؟'' چچا تیز گام بیگم کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولے۔

'' مالک پھر ہم ایک وین کرائے پر لے لیتے ہیں......'' استاد نے مشورہ دیا۔

'' وین......ہاں ......یہ ٹھیک ہے۔''

استاد! لگتا ہے تم ہماری صحبت میں رہتے ہوئے کافی عقل مند ہو گئے ہو۔ ہاں تو یہ طے ہو گیا کہ شیر محمد کو ہم اپنی چاند گاڑی پر لائیں گے اور آموں کی پیٹیاں جمن وین میں لائے گا اور وین میں آموں کی حفاظت کے فرائض جمن سرانجام دے گا۔" چچا تیز گام تیز تیز بولتے چلے گئے۔

"آپ مجھے آموں کا محافظ بنانا چاہتے ہیں یعنی مینگو گارڈ۔ واہ بھئی واہ......مزہ آ گیا ......مینگو گارڈ۔" جمن کو یہ خطاب کچھ زیادہ ہی پسند آ گیا تھا۔

"لیکن! خبردار جو تم نے آموں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو۔" چچا تیز گام نے جمن کو آنکھیں دکھائیں۔

"مگر مالک نظریں اٹھائے بغیر میں آموں کی حفاظت بھلا کس طرح کر سکوں گا؟"

"ٹھیک ہے تم نظریں اٹھا لینا، لیکن خبردار میلی نظروں سے آموں کی طرف مت دیکھنا......" چچا تیز گام بولے۔

"جی مالک میں ایسا ہی کروں گا۔"

اب گھر میں شیر محمد کی آمد کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ چچا تیز گام نے کئی بار شیر محمد کا خط پڑھا۔ اس میں آنے کی تاریخ 9 لکھی ہوئی تھی۔ اب تو اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر جگہ چچا کو آم ہی آم دکھائی دیتے تھے۔ ان کے بھی دوست آم کے رسیا تھے اس لیے انہوں نے 9 تاریخ کو سب دوستوں کو اپنے ہاں مدعو کر لیا۔ گلو میاں اور پہلوان جی اس آم پارٹی سے بہت خوش تھے۔ 8 تاریخ کی شام کو تیاریاں مکمل تھیں۔ چچا خود ایک ایک چیز کا تفصیلی جائزہ لے رہے تھے۔

"جمن! تم نے برف کے لیے طفیل کو کہہ دیا ہے۔"

"جی سرکار! برف کے دو بلاک 9 تاریخ کو صبح ہی آ جائیں گے۔"

اور استاد! ٹینٹ والوں کو بڑے ٹب لانے کے لیے کہہ دیا ہے۔"

"جی مالک! ٹب وقتِ مقررہ پر پہنچ جائیں گے۔"

"شاباش، شاباش۔" چچا نے مسکرا کر کہا۔

9 تاریخ کو چچا کے ہاں خاصا رش تھا۔ رشتے داروں کے ساتھ ساتھ دوست اور ہمسائے بھی اس آم پارٹی میں بلائے گئے تھے۔ چچا بے مقصد ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ آموں کے لیے ٹب موجود تھے، ان میں برف تو تھی مگر آم نہیں تھے۔ جب کافی دیر ہو گئی تو پہلوان جی نے پوچھا:

"شیر محمد نے کتنے بجے آنا ہے؟"

"یہ تو خط میں نہیں لکھا بس یہی لکھا ہے کہ وہ 9 تاریخ کو آئے گا، یہ نہیں لکھا کہ کتنے بجے آئے گا، میں جمن کے ساتھ شیر محمد کو لینے اسٹیشن جا رہا ہوں، استاد تم یہاں کے انتظامات دیکھنا۔"

دو گھنٹے بعد چچا اور جمن تو آ گئے مگر ان کے ساتھ شیر محمد نہ تھا، پھر دوپہر سے شام ہو گئی مگر شیر محمد نہ آیا۔ مہمان آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ کچھ کا خیال تھا کہ چچا تیز گام نے اُن کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ چچا ہر ایک کو تسلی دے رہے تھے کہ شیر محمد اور آم بس آنے ہی والے ہیں۔ جب کافی دیر ہو گئی تو پہلوان جی نے چچا کو گھورتے ہوئے کہا:

”لاؤ دکھاؤ، تمہارے دوست کا خط کہاں ہے؟“

”یہ رہا خط، خود پڑھ لو اس پر صاف صاف لکھا ہے کہ شیر محمد نے 9 تاریخ کو آنا ہے۔“

چچا نے شیروانی کی جیب سے خط نکال کر پہلوان جی کی طرف بڑھایا۔ پہلوان نے خط پڑھنا شروع کیا اور اس سطر کو بغور دیکھنے لگے جس پر 9 تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ خط کو ٹیپ سے جوڑا گیا تھا اس لیے 9 کا ہندسہ واضح نہیں پڑھا جا رہا تھا۔

”خط کو ٹیپ کس نے لگائی ہے؟“ پہلوان جی نے پوچھا۔ اس کے جواب میں چچا نے ساری بات بتا دی۔

”آپ تیزی نہ دکھائیں تو آپ کو چچا تیز گام کون کہے۔“

”کیا مطلب؟“

”ابھی مطلب بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر پہلوان جی نے نہایت احتیاط کے ساتھ ٹیپ اتاری اور کاغذ کو آپس میں ملا کر دکھاتے ہوئے کہا:

”اب دیکھو کیا تاریخ پڑھی جا رہی ہے؟“

”یہ......یہ......تو......ہاں یہ تو 9 کی بجائے 19 پڑھا جا رہا ہے۔“

”جی ہاں شیر محمد نے 19 تاریخ کو آنا ہے، آپ نے ٹیپ لگاتے ہوئے ایک کے ہندسے کو نیچے دبا دیا تھا۔“

”اب کیا ہوگا؟“ چچا نے پہلوان جی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اب بے عزتی ہوگی، مہمان باتیں بنائیں گے اور آپ کو بُرا بھلا کہتے ہوئے یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔“

”کیا ایسا ہی ہوگا؟“

”جی، بالکل ایسا ہی ہوگا، آپ کو تیزی کی کچھ تو سزا ملنی چاہیے۔“

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مہمانوں میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ پریشانی کی وجہ سے چچا کا سر چکرانے لگا تھا۔ یہ سب کیا دھرا ان کا اپنا تھا۔

مغرب سے کچھ دیر پہلے چچا تیز گام کے بھانجے مبارک علی اُن کے سامنے موجود تھے۔ چچا نے انہیں

گلے لگا لیا اور خوب دُعائیں دیں۔

''ماموں! یہ سب لوگ کیوں آئے ہیں؟''

''وہ آ...... آ......آم کھانے کے لیے۔''

''آم کھانے کے لیے؟'' مبارک علی نے دہرایا۔

''جی ہاں آم کھانے کے لیے، لیکن......''

''لیکن کیا؟''

اس لیکن کے جواب میں چچا نے تمام داستانِ آم سنا دی۔ ساری بات جان کر مبارک علی نے کہا:

''ماموں! آپ کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''آیئے میرے ساتھ۔''

جب چچا تیز گام مبارک علی کے ساتھ گلی میں آئے تو گاڑی میں بہت سی آموں کی پیٹیاں تھیں۔

''یہ......یہ......آم......''

''ماموں یہ میں آپ کے لیے لایا ہوں، مجھے پتا ہے کہ آپ آموں کے رسیا ہیں، میں ان دنوں ملتان میں ہوں، یہ آم میں وہیں سے لایا ہوں۔'' مبارک علی نے کہا۔

''تم تو میرے لیے رحمت بن کر آئے ہو اور مزے دار آم لائے ہو، او جمن، او استاد آؤ اور آم اندر لے جاؤ، دیر مت کرو، جلدی آؤ۔'' چچا نے گلی ہی سے ہانک لگائی۔

کچھ ہی دیر میں آم پارٹی اپنے عروج پر تھی۔ مہمان تیزی سے مزے دار آم کھا رہے تھے اور چچا تیز گام کی تعریف کر رہے تھے۔ چچا حسبِ معمول اپنی تیزی پر قابو نہ رکھ سکے اور ترنگ میں آکر بولے:

''19 تاریخ کو پھر آم پارٹی ہو گی۔''

یہ اعلان سُن کر مہمان آم کھاتے جا رہے تھے اور چچا تیز گام زندہ باد کے نعرے لگاتے جا رہے تھے۔

☆☆☆☆

افضل مراد

احساس

کردار:

۱۔	فیضو	شاگرد
۲۔	دارو	
۳۔	حکیم جی	حکیم
۴۔	درازقد	مریض
۵۔	بڑھیا	مریضہ
۶۔	فیض کا باپ	
۷۔	مریض کی ماں	
	اور بہت سارے	

منظر نمبر 1 شفاخانے کا منظر

حکیم اور اس کا شاگرد دارو مصروف کار ہیں۔ فیض اور اس کا باپ شفاخانے کے اندر داخل ہوتے ہیں دونوں مودبانہ انداز میں کھڑے رہتے ہیں حکیم ان کی طرف بےتوجہی سے دیکھتا ہے اور کچھ کہے بغیر کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔ دارو انہیں ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہتا ہے شاید یہ گونگے اور بہرے ہیں۔ دارو کو جیسے یہ بات بری محسوس ہوتی ہے وہ کھڑے ہو کر کہتا ہے۔

دارو حکیم جی! مریض آئے ہیں ---

دونوں کی طرف دیکھ کر

حکیم اوہ ----

دارو ان کا خیال ہے کہ ---

حکیم (بات کاٹتے ہوئے) ہم بےوقوف ہیں حالاں کہ وہ خود ہیں

فیض کا باپ: حکیم جی پہلی بات یہ کہ ہم مریض نہیں اور دوسری بات

دارو حکیم جی دوسری بات!

حکیم ہاں دوسری بات یہ کہ ہم بےوقوف ہیں

باپ ایسی بات ہوتی تو میں اپنے بیٹے تلخو کو آپ کے پاس کیوں لاتا

حکیم پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہم تمہارے بیٹے ---

باپ بیٹا

حکیم ہاں --- ہم فیض کا ایسا علاج کریں گے کہ وہ عمر بھر یاد رکھے گا

دارو ہمارے حکیم جی بڑے نیک ہیں

باپ حکیم جی دراصل بات یہ ہے کہ میں اپنے فیضو کو آپ کی شاگردی میں دینا چاہتا ہوں تا کہ وہ آپ کی طرح

ذرا تن کر

حکیم وہ تو ٹھیک ہے لیکن ---

باپ لیکن کیا ----

حکیم ہم پہلے ہی ایک نالائق اور کم عقل شاگرد کو برداشت کر رہے ہیں

باپ اگر آپ فیض کو اپنی شاگردی میں رکھ لیں تو میں احسان مند ہوں گا۔۔۔۔

دارو رکھ لیں حکیم جی، ایک سے دو ہو جائیں گے۔ مزے اڑائیں گے۔۔۔اور کیا کام کریں گے

حکیم تو۔۔۔ہم فیض کو ایک مہینے کے لیے آزمائشی طور پر شاگرد رکھ لیں گے اگر وہ ہمارے معیار پر پورا اُترا تو۔۔۔

باپ بالکل درست ہے بڑی مہربانی آپ کی حکیم صاحب

اس دوران فیض اور دارو میں کھسر پھسر شروع ہو جاتی ہے جیسے وہ ایک دوسرے کے ہم خیال بن رہے ہیں

کٹ

منظر نمبر 2 تلخو کے گھر کا منظر (صحن)

فیض کی ماں اسے ناشتہ کرا رہی ہے فیض بڑے نازو انداز سے بیٹھا ہے باپ حقہ پی رہا ہے

فیض اماں وہ حکیم جی کا دوسرا شاگرد ہے نا دارو

ماں ہاں ہاں

فیض وہ بہت اچھا ہے۔ کچھ ہی دنوں میں میرا دوست بن گیا ہے

ماں دیکھو بیٹے وہاں شرارتیں مت کرنا

فیض شرارتیں کہاں۔ اماں ہم تو صرف بیٹھتے ہیں

باپ اور کام کون کرتا ہے۔۔۔؟

فیض حکیم جی۔۔۔

باپ اور تم دونوں ان کی کوئی مدد نہیں کرتے۔۔۔۔

فیض نہیں اماں حکیم جی کہتے ہیں نالائقو مجھے تنگ مت کرو اپنا کھیل کھیلو۔۔۔۔۔تب میں اور دارو۔۔۔

ماں بیٹے پوچھا کرو حکیم جی سے جب تک پوچھو گے نہیں تو سمجھو گے کیا۔۔۔۔
مختلف دواؤں جڑی بوٹیوں کے بارے میں پوچھا کرو

فیض اچھا میں چلتا ہوں

ماں خدا حافظ بیٹے

کٹ

منظر نمبر 3 شفاخانے کا منظر

حکیم اور دارو اِدھر اُدھر ٹہل رہے ہیں کچھ بے چینی کا تاثر ہے فیض داخل ہوتا ہے حکیم رک کر اس کے قریب جاتا ہے۔

حکیم نالائق---

فیض جی----

حکیم تمہیں وقت کی پابندی کا کوئی خیال نہیں

فیض جی---

حکیم کیوں دیر سے آئے----

فیض جی میں بڑا آدمی بننے کے بارے میں سوچ رہا تھا

حکیم صرف سوچنے سے انسان بڑا نہیں بنتا

فیض جی---

دارو چلیں پھر حکیم جی---

حکیم ہاں تھیلا اٹھا لو اور چلو

فیض کہاں حکیم جی---

حکیم آج ہم بولان کی وادیوں اور پہاڑوں میں جڑی بوٹیاں دیکھنے جا رہے ہیں اس سلسلے میں تم دونوں میری امداد کرو گے

فیض جی

تینوں نکل جاتے ہیں

کٹ

منظر نمبر 4 مختلف پہاڑی مناظر (آؤٹ ڈور)

حکیم آگے آگے ہوتا ہے اور فیض اور دارو اس کے پیچھے پیچھے چل رہے ہوتے ہیں حکیم مختلف موقعوں پر چلتے چلتے رک جاتا ہے زمین کی طرف غور سے دیکھتا ہے کوئی بوٹی اٹھا کر فیض اور دارو کو دکھاتا ہے جیسے کچھ سمجھا رہا ہو پھر وہ جڑی بوٹی تھیلے میں ڈال کر آگے بڑھتا ہے۔ ایک چھوٹے سے ڈھلوان کو پار کرتے ہوئے حکیم جب پیچھے دیکھتا ہے تو دارو اکیلا نیچے اتر رہا ہے چہرے سے تھکاوٹ کے آثار نمایاں ہیں دارو حکیم کے

قریب پہنچ جاتا ہے۔

حکیم فیض کو کہاں چھوڑ آئے؟

اِدھر اُدھر دیکھ کر

دارو ابھی تو میرے ساتھ ساتھ آ رہا تھا۔۔۔

حکیم بکومت۔۔۔

دارو جی

حکیم نالائق شاگرد پورا انسان گنوا دیا اور کہہ رہا ہے وہ میرے ساتھ تھا (بیٹھ کر) اُف میرے خدا اس کے ماں باپ کو کیا جواب دوں گا۔ دارو تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔

حکیم اور دارو اسی طرف دوبارہ نکلتے ہیں جہاں سے آئے تھے مختلف شاٹس میں فیض کو تلاش کرتے ہوئے دکھائے جاتے ہیں ایک نسبتاً نیچی جگہ پر فیض بے ہوش پڑا نظر آتا ہے دارو پکارتا ہے۔

دارو حکیم جی۔۔۔یہ۔۔۔۔یہ

حکیم کیا ہوا

دارو جی وہ فیض۔۔۔

حکیم کہاں ہے؟

دارو یہاں پڑا ہوا ہے

حکیم قریب جاتا ہے گھبراہٹ کے عالم میں فیض کی نبض دیکھتا ہے۔ سینے پر کان لگا کر تسلی کرتا ہے۔

دارو کیا ہوا ہے جی۔۔۔

حکیم بے ہوش ہوا ہے صرف۔۔۔ میں تو سمجھ رہا تھا۔۔۔

پھر وہ تھیلے سے کوئی جڑی بوٹی نکال کر فیض کو سنگھاتا ہے فیض ہوش میں آ جاتا ہے دارو سہارا دیکر اٹھاتا ہے۔

دارو کیا ہوا تھا تمہیں

فیض مجھے؟

حکیم تم یہاں بے ہوش پڑے تھے اور۔۔۔!

فیض ہاں مجھے یاد آیا میں نے ایک جڑی بوٹی توڑ کر اسے منہ لگایا تھا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔

غصے میں

حکیم   میں نے کہا تھا چبانا شروع کر دو کس نے اس کی اجازت دی تھی کہ ہر جڑی بوٹی کو اٹھا کر چبانا شروع کرو۔

فیض   جی غلطی ہو گئی

حکیم   ٹھیک ہے تم نے اپنی غلطی مان لی ہے اس لیے معاف کر دیتا ہوں اگلا سفر میں اکیلے ہی کروں گا

دونوں ملکر   اور ہم کیا کریں گے

حکیم   تم دونوں جاؤ اور شفا خانہ کھول کر بیٹھ جاؤ

حکیم اور اس کے دونوں شاگرد مختلف راستوں پر نکل جاتے ہیں۔

کٹ

منظر نمبر 5   شفا خانے کا منظر

فیض اور دارو حکیم صاحب کی طرح جڑی بوٹی پیسنے اور دوائیں دیکھنے کی مشق کرتے ہیں ایک بڑھیا داخل ہوتی ہے جس نے منہ پر کسی تکلیف کی وجہ سے ہاتھ رکھا ہوا ہوتا ہے۔

دارو   فیض مریض آئی ہے

فیض   دیکھ کر دوا تجویز کر دو

دارو   نہیں تم دیکھ لو۔۔۔

بڑھیا کی طرف دیکھ کر

فیض   اچھا۔۔۔دادی اماں خیریت تو ہے

بڑھیا منہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جیسے بولنے سے معذوری کا اظہار کر رہی ہو

فیض   ہم ابھی دوا تجویز کرتے ہیں آپ ٹھیک ہو جائیں گی

فیض مختلف دوائیں دے کر بڑھیا سے فیس لے لیتا ہے بڑھیا تشکرانہ انداز میں دیکھتی ہوئی نکل جاتی ہے

دارو   دے دی دوا۔۔۔

فیض   ہاں۔۔۔کیا یاد رکھیں گے حکیم جی۔۔۔کیسے اچھے شاگرد ہیں ان کے

کٹ

منظر نمبر 7   شفا خانے کا منظر

فیض اور دارو حسب معمول شفا خانے میں مصروف کار ہیں ان کے چہروں اور حرکات سے مکمل انہماک اور توجہ کا تاثر نمایاں ہوتا ہے اس دوران ایک دراز قد آدمی شفا خانے میں داخل ہوتا ہے دونوں اسے دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں۔ دارو کچھ کہنا چاہتا ہے مگر زبان اس کا ساتھ نہیں دے پاتی بالآخر وہ فیض کی طرف اشارہ کرتا کہ تم ہی کچھ کہو۔۔۔

فیض   کو۔۔۔کو۔۔۔کون ہو تم؟

قہقہہ لگا کر دونوں کی طرف دیکھتا ہے

آدمی   میں۔۔۔میں تمہاری طرح انسان ہوں۔

دارو   ہماری طرح کا؟

فیض   مگر لگتے تو نہیں۔۔۔

آدمی   کیا کہہ رہے ہو۔۔

فیض   میرا مطلب ہے انسان۔۔۔لگتے ہیں ہاں۔۔ہاں

آدمی   میرے دوست بات یہ ہے کہ میں اپنے اس دراز قد سے بیزار ہو گیا ہوں۔ لوگ مجھے تنگ کرتے ہیں میرا مذاق اڑاتے ہیں۔۔۔یہ لمبا قد میرے لیے ایک عذاب بن گیا ہے۔

گھبراتے ہوئے

دارو   لیکن ہم نے مذاق نہیں اڑایا؟

آدمی   اڑاؤ گے اگر میں کچھ عرصہ تمہارے قریب رہا۔ آج تمہارے شفا خانے میں پہلی بار آیا ہوں مجھے کوئی دوا دے دو تا کہ میں اپنے اس لمبے قد کی مصیبت سے جان چھڑا سکوں۔

فیض اور دارو ایک دوسرے کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔

فیض   بات یہ ہے کہ ایسی دوا بنانے پر خرچ بڑا آئے گا۔۔۔

آدمی   میں بڑی سے بڑی رقم دینے کو تیار ہوں۔ آپ صرف مجھے اس عذاب سے۔۔

دارو   تب تو آپ بالکل فکر نہ کریں۔

فیض   کل سے ہم تمہارا علاج شروع کر دیں گے۔

آدمی چلا جاتا ہے فیض اور دارو مختلف جڑی بوٹیوں کو ملا کر پیسنا شروع کر دیتے ہیں

کٹ

منظر نمبر 8　　　شفا خانے کا منظر (مونتاژ)

دراز قد آدمی کو مختلف شاٹس میں علاج کے عمل سے گزرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے فیض اور دارو دوائیں پیسنے اور دراز قد آدمی کو دینے میں مصروف ہیں۔ دراز قد آدمی اپنے قد کو ناپ کر دیکھتا ہے اور تاثرات سے مطمئن نظر آنے کا اظہار کرتا ہے فیض اور دارو اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

کٹ

سین نمبر 9　　　گلی کا منظر

فیض اور دارو شفا خانے کے سامنے آ کر دروازہ کھولنے لگتے ہیں انہیں دراز قد آدمی کی آواز سنائی دیتی ہے دونوں اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ آواز دوبارہ آتی ہے۔ فیض پوچھتا ہے۔

فیض　　کون ہے---؟

دارو　　اور کہاں سے بول رہا ہے

آدمی　　میں ہوں ذرا پیچھے تو دیکھو---

دونوں پیچھے دیکھتے ہیں اور حیران ہو جاتے ہیں دراز قد آدمی گھٹ کر مختصر آدمی کی صورت میں ان کے پاؤں کے ساتھ کھڑا ہے۔

خوشی کا اظہار

فیض　　دارو یہ دیکھو ہم لوگ کامیاب ہو گئے ہماری دواؤں نے اثر دکھا دیا۔ یہ دراز قد آدمی جو اپنے ڈیل ڈول کی وجہ سے بے زار تھا اب ٹھیک ہو گیا ہے۔

دارو　　حکیم صاحب کو جب پتہ لگے گا تو وہ کتنے خوش ہوں گے۔

آدمی　　خدا کے لیے میری بھی سنو:

فیض　　کہو کیا بات ہے

آدمی　　آپ لوگ مہربانی کر کے مجھے میرا اصل قد لوٹا دیں

فیض　　آخر کیوں؟

آدمی　　میں نے ناشکری کی۔ میں اپنے اس لمبے قد کو یاد کرتا ہوں تو اداس ہو جاتا ہوں۔ خدا کے لیے تم لوگ مجھے اس عذاب سے نکال لو۔

دارو　　کیا مطلب ہے تمہارا پہلے لمبا قد عذاب تھا اور اب

آدمی　　میں نے بیوقوفی کی ۔ اور اب اس کی سزا بھگت رہا ہوں ۔

فیض اور دارو سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں نہ سمجھ میں آنے والی صورت حال کا اظہار

فیض　　تم یوں کرو کہ ایک ہفتے بعد پھر شفاخانے آؤ ہم سوچیں گے

آدمی　　میں شکر گزار ہوں گا ۔ (چلا جاتا ہے)

دارو　　میری تو سمجھ میں نہیں آتا یہ کیسا آدمی ہے کسی حال میں خوش نہیں

کٹ

منظر نمبر 10　　شفاخانے کا منظر

حکیم جی سفر سے لوٹ کر آتے ہیں فیض اور دارو کو تاثرات بتا رہے ہیں فیض پوچھتا ہے

فیض　　حکیم جی اس مرتبہ بڑے دن لگائے آپ نے

حکیم　　ہاں بھئی ۔۔۔ یہ تو ہے ویسے ہمارا خیال ہے کہ کسی بھی بڑے کام میں تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں ۔

دارو　　جڑی بوٹیاں بھی بہت ساری لائے ہیں حکیم جی!

فیض　　ان پر تجربات کریں مل کر ۔۔۔

حکیم　　کیا مطلب ہے مل کر ۔۔۔ تم لوگ بیٹھ کر دیکھو اور میں کام کروں گا

فیض　　لیکن حکیم جی ہم نے تو

اتنے میں وہی بڑھیا داخل ہوتی ہے جس کو چند روز قبل فیض نے دوا تجویز کی تھی

حکیم　　آیئے اماں کیا حال ہیں

بڑھیا　　اشارے سے جواب دیتی ہے ٹھیک ہوں

حکیم　　شکر ہے شکر ہے

دبے دبے انداز میں

فیض　　یہ تو اب تک ٹھیک ہی نہیں ہوئی

دارو　　پتہ نہیں کیوں

بڑھیا　　بے بسی کے انداز سے حکیم کی طرف دیکھتی ہے حکیم مسکراتا ہے اور پوچھتا ہے

حکیم ہمارے دوست نواب دین کا کیا حال ہے؟

فیض حکیم جی یہ بول نہیں سکتیں

حکیم ہاں ---لیکن کیوں ---؟

فیض پتہ نہیں جی ---

بڑھیا اشارے سے حکیم جی کو سمجھاتی ہے فیض کی طرف اشارہ کرتی ہے فیض گھبرا جاتا ہے حکیم جیسے ان کی بات سمجھ رہے ہوتے ہیں اور کوئی دوا ان کو کھلا دیتے ہیں چند لمحوں میں بڑھیا کے تاثرات بدلتے ہیں اور وہ بولنے لگتی ہے۔

بڑھیا بھلا ہو آپ کا حکیم جی ---ورنہ آپ کے یہ ہونہار شاگرد

حکیم میں سمجھا نہیں

بڑھیا کیا بتاؤں حکیم جی میرے مسوڑے پک گئے تھے میں آپ کے پاس دوا لینے آئی مگر اس (فیض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) نے مجھے گنگ کرنے والی دوا دیدی۔

حکیم میں ان کی خبر لیتا ہوں کم بختوں نے میرے جیسے بڑے حکیم کو بدنام کر دیا (حکیم جی چھڑی لے کر دونوں شاگردوں کو مارنے لگتے ہیں بڑھیا اس صورت حال سے گھبرا کر نکل جاتی ہے۔ حکیم جی اسے جاتا دیکھ کر رک جاتے ہیں۔ بڑھیا دوبارہ دیکھتی ہے تو وہ مارنے لگتے ہیں۔ بڑھیا نکل جاتی ہے۔ حکیم جی ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں)

حکیم آئندہ خیال رکھنا

دونوں ملکر جی ---ہماری توبہ جو ہم نے آئندہ کسی کا علاج کیا

حکیم بکومت---

کٹ

منظر نمبر 11 پگڈنڈی کا منظر (آؤٹ ڈور)

فیض اور دارو منہ بنا کر ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر جا رہے ہیں دونوں کبھی کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔

دارو سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے

فیض ہاں تم تو ہاتھ باندھ کر بیٹھے رہے تھے

دارو بالکل

نقل اتارتے ہوئے

فیض بالکل ۔۔خود ہی مجھے مشورہ دیا کہ یوں کرو۔۔۔یوں کرو۔۔۔۔سمجھا تمہاری دوستی کو۔۔۔

دارو میں نے تو صرف مشورہ دیا تھا

چلتے چلتے دونوں کی نظر اس درازقد آدمی پر پڑتی ہے جو اب مختصر ہو کر بونا بن گیا

فیض رہنے دو اب

فیض دارو غضب ہو گیا

دارو کیا ہوا

فیض وہ بونا آدمی شفا خانے کی طرف جا رہا ہے اب تو ہماری شامت آئی ہے

دارو چلو چل کر دیکھتے ہیں

دونوں دوبارہ شفا خانے کی طرف جاتے ہیں

فیض چلو

کٹ

منظر نمبر 12 شفا خانے کا منظر

فیض اور دارو آ کر شفا خانے کی اوٹ سے دیوار سے کان لگا کر سنتے ہیں اندر سے مختصر آدمی کی آواز آ رہی ہے

آدمی حکیم جی میں نے زندگی میں یہ سب سے بڑی غلطی کی ہے میں نے یہ خواہش کر کے خود کو عذاب میں ڈال دیا ہے ناشکری کی ہے آپ خدا کے لیے کوئی ایسی دوا دے دیں کہ میں اپنی اصل صورت میں دوبارہ آ جاؤں۔

حکیم گھبراؤ مت۔۔۔اللہ پر بھروسہ رکھو۔۔۔میں کوشش کر کے دیکھوں گا

فیض اور دارو دیوار سے ہٹ کر زمین پر سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں چند لمحے گزر جاتے ہیں دونوں بوریت محسوس کرتے ہیں شفا خانے کے دروازہ کی طرف دیکھتے ہیں اتنے میں شفا خانے سے وہ آدمی دوبارہ اپنی اصل

صورت میں دراز قد کے ساتھ نکل کر خوشی خوشی روانہ ہوجاتا ہے۔ دونوں اسے دیکھتے ہیں خوشی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات نمایاں ہوتے ہیں دونوں شفاخانے کے اندر داخل ہوتے ہیں۔

کٹ

منظر نمبر 13 شفاخانے کا منظر

حکیم جی بے چینی کے ساتھ ٹہل رہے ہیں فیض اور دارو سہمے سہمے گھبرائے ہوئے انداز میں داخل ہوتے ہیں حکیم نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھتا ہے۔ دونوں ساکت ہوجاتے ہیں دونوں میں سے کسی کی ہمت نہیں بندھتی کہ کچھ کہہ سکیں حکیم دونوں کو قریب بلاتا ہے۔

حکیم اِدھر آؤ

دونوں آہستہ آہستہ حکیم جی کے قریب آجاتے ہیں حکیم جی ہاتھ اٹھاتے ہیں دونوں جھکتے ہیں مگر وہ مارنے کی بجائے کاندھے پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں

حکیم شاباش ہے میرے شاگردوں کو!

فیض جی ـــــ جی!

حکیم ہاں مجھے خوشی ہوئی کہ میرے شاگردوں نے اپنے غلط اقدام کے باوجود ایک شخص کو احساس دلایا

دارو کیسا احساس جی

حکیم یہی کہ اللہ تعالیٰ انسان کو جس شکل وصورت میں بناتا ہے اس پر شکر ادا کرنا چاہیے نہ کہ اسے عذاب سمجھ کر ناشکری کرنی چاہیے۔

تینوں کے چہرے پر خوشی کے تاثرات اُبھرتے ہیں۔

☆☆☆☆

نورینہ سائل

براہوئی سے ترجمہ: نورینہ سائل

دوستی

سلیم اور کلیم دونوں کلاس فیلو تھے سلیم امیر گھرانے کا اکلوتا بیٹا تھا لیکن کلیم کا تعلق غریب گھرانے سے تھا۔ کلیم اپنی کلاس کا بہت ذہین طالب علم تھا ان کے اسکول میں ہر سال ''ہفتۂ کھیل'' منایا جاتا تھا مختلف کھیلوں کے علاوہ دوڑ کا مقابلہ بھی ہوتا، دوڑ کے مقابلے میں سلیم اور کلیم نے بھی حصہ لیا لیکن دوڑ کے دوران میں کلیم بہت بری طرح گر پڑا لیکن پھر بھی وہ ہمت نہ ہارا اور وہ پھر کھڑا ہو کے دوڑنے لگا وہ دوڑ میں سلیم سے آگے نکل گیا۔ اگلے سال بھی دوڑ کے مقابلے میں اسکول کے بہت سے لڑکوں نے حصہ لیا جس میں سلیم اور کلیم بھی شامل تھے لیکن سب لڑکوں کو ڈر تھا کہ اس سال بھی کلیم یہ دوڑ جیت لے گا۔ لیکن دوڑ کے مقابلے سے ایک روز قبل سلیم اپنے چند دوستوں سے مشورہ کرنے لگا کہ اس سال یہ دوڑ کا مقابلہ ہمیں ہر حال میں جیتنا ہو گا کوئی ایسی ترکیب نکالو کہ کلیم اس مرتبہ اس دوڑ کے مقابلے میں حصہ نہ لے سکے۔

کاشف نے کہا کہ میرے پاس دو ترکیبیں ہیں۔ سلیم نے کہا جلدی بتاؤ وہ کیا ہیں کاشف نے کہا کہ پہلی ترکیب یہ ہے کہ ہم کچھ پیسہ دیکر کلیم کو بٹھا دیں گے۔ اگر وہ نہ مانا سلیم نے کہا پھر یہ کام مجھ پر چھوڑ دو کاشف نے کہا۔ کلیم بازار سے گھر کے لیے کچھ سودا وغیرہ خرید کر گھر کی جانب جا رہا تھا کہ اس کے قریب کار آ کے رک گئی۔ کار میں سلیم اور کاشف تھے۔ کلیم آؤ ہم تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آتے ہیں۔ کلیم نے کہا یار خیر تو ہے آج تم دونوں کو مجھ سے ہمدردی کا خیال کیسے آیا ویسے تو تم میرے جسم کا گوشت نوچنے کے لیے تیار ہو۔ نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہیں ویسے بھی تو ہم کلاس فیلو ہیں اور دوست بھی تو ہیں۔۔۔۔

کلیم نے کہا کہ کسی امیر کو جب کسی غریب سے کوئی کام پڑ جائے تو پھر امیر کو غریب کے سامنے جھکنا پڑتا ہے میرے خیال میں تم دونوں کا بھی ضرور کوئی کام یا مقصد ہو گا کلیم تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ کوئی وجہ تو ضرور ہے۔۔۔ دیکھو کلیم ہم تمہیں بہت پیسہ دیں گے لیکن تم اس مرتبہ دوڑ میں حصہ مت لینا سلیم نے آخر دل کی بات کہہ دی۔۔ کلیم نے سلیم کی بات سنی اور کہا کہ اللہ تعالٰی نے مجھے جو صلاحیت بخشی ہے میں اپنی اس صلاحیت کا

سودا نہیں لگا سکتا بھئی میں چلتا ہوں کل انشاءاللہ دوڑ کے میدان میں ملیں گے۔ کلیم نے صاف صاف الفاظ میں سلیم سے کہا۔

سلیم اور کاشف دونوں کلیم کی باتیں سن کر خاموش ہو گئے۔ کلیم سودا گھر چھوڑ کر پریکٹس کے لیے پارک کی طرف دوڑتا ہوا گیا۔ پارک میں رش کی وجہ سے وہ دوسرے گیٹ کی طرف روانہ ہوا۔ سڑک کے کنارے دوڑتا ہوا جا رہا تھا کہ اچانک ایک کار کلیم کی طرف بہت تیز رفتاری سے آئی تھی لیکن کلیم نے اپنی جان بچالی اور کار تیز رفتاری کی وجہ سے بے قابو ہو کر فٹ پاتھ پر چڑھ کر پارک کی دیوار سے ٹکرا گئی جس کی آواز سے پارک میں خاموشی چھا گئی۔ لوگ کار کی جانب دوڑتے ہوئے آئے کار میں بیٹھے ہوؤں کی فریاد آ رہی تھی کہ بچاؤ بچاؤ کلیم بھی دوڑتا ہوا کار کے قریب آیا۔ کار میں سلیم اور کاشف زخمی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ کلیم جلدی سے باقی لوگوں کے ہمراہ ان دونوں کو ہسپتال لے گیا جہاں رات بھر کلیم ان دونوں یعنی کاشف اور سلیم کے والدین کے ساتھ ان کی خدمت میں جاگ کر گزارتا رہا جب صبح ان دونوں کو ہوش آیا تو اپنے قریب کلیم کو پایا تو بہت شرمندہ ہوئے دونوں نے کلیم سے معافی مانگی اور کہا کہ کلیم ہم تم کو سزا دینے والے تھے لیکن ہم خود سزا میں پڑ گئے۔ کلیم نے کہا کہ پچھلی باتوں کو بھول جاؤ بس جلدی سے صحت یاب ہو جاؤ دیکھو تمہارے گھر والے تمہارے لیے بہت پریشان ہیں۔ چار دن ہسپتال میں گزارے۔ کلیم نے خوب خدمت کی ان دونوں کی لیکن کلیم دوڑ کے مقابلے میں حصہ نہ لے سکا ان کی وجہ سے۔ سال کے بعد پھر دوڑ کا مقابلہ ہوا اس مرتبہ کلیم نے میدان مار لیا۔ اس مرتبہ کاشف اور سلیم بہت خوش تھے۔

☆☆☆☆

عجب خان سائل

اُونٹ اور مگرمچھ

ایک اونٹ ہر روز کسی تالاب سے پانی پیا کرتا تھا ایک دن اونٹ پانی پی کر تالاب سے واپس ہوا تو اسے ایک مگرمچھ نے ٹانگ سے پکڑ کر کہا:

”میرے دوست خدا کے لیے مجھے یہاں سے کسی دریا کی طرف لے چلو کیونکہ تالاب کا پانی خشک ہونے لگا ہے اور تمہیں پتہ ہے کہ میں پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا مر جاؤں گا۔“

تو اونٹ نے کہا:

”نہیں نہیں میں تجھے دریا تک نہیں لے جا سکتا کیونکہ اگر میں تجھے وہاں تک چھوڑ آیا تو ہو سکتا ہے کہ تم مجھے کھا جاؤ۔“

”تم اونٹوں کے سردار ہوتے ہوئے بھی ایک مگرمچھ سے ڈرتے ہو اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں کچھ بھی نہیں کہوں گا اور نہ کوئی نقصان پہنچاؤں گا۔“ مگرمچھ نے اونٹ سے کہا۔

اس دوران مگرمچھ نے اونٹ کی بہت زیادہ تعریفیں شروع کیں اونٹ نے اپنی تعریف سنی تو بہت خوش ہوا اور جلدی راضی ہوا اور مگرمچھ کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر دریا کی طرف روانہ ہوا دریا کے قریب اونٹ نے مگرمچھ سے کہا اب اتر جاؤ وہ سامنے دریا ہے مگرمچھ نے کہا:

”پیارے دوست اتنی دور سے تم مجھے اپنی پیٹھ پر بٹھا کر یہاں تک لائے ابھی تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا ہے اور تم مجھے یہاں اتار رہے ہو اور اپنی ساری محنت ضائع کر رہے ہو تھوڑا اور آگے تک چھوڑ دو کیا ہوگا کیوں بے عقل ہو گئے ہو عقل سے کام کیوں نہیں لیتے ویسے سچ کہا ہے کسی نے کہ جتنے لمبے ہوں ان کی عقل گھٹنوں میں ہوتی ہے۔“

اونٹ نے مگرمچھ کی یہ باتیں سنی تو اسے بہت غصہ آیا اور مگرمچھ کو تیزی سے دریا کی طرف لے کر دوڑا یہاں تک کہ دریا میں اتر گیا گھٹنوں تک جب پانی پہنچا تو مگرمچھ سے کہا ”اب اتر جاؤ۔“

مگرمچھ جلدی سے اترا اور اترتے ہی اونٹ کی ٹانگ اپنے دانتوں میں پکڑ کر کہا:

”اب میں تجھے کھا جاؤں گا۔“

اونٹ پریشان ہوا اور کہا:

''یہ کہاں کا انصاف ہے میں نے تو تم سے نیکی کی ہے اور تم نیکی کا بدلہ یہ دے رہے ہو اور تم نے مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا کہ میں تمہیں کچھ نقصان نہیں دوں گا مگر۔۔۔''

مگرمچھ نہیں مانا اونٹ مجبور ہوا اور منت سماجت شروع کی آخر مگرمچھ نے کہا:

''اگر فیصلہ یہ درخت کرے تو میں مان جاؤں گا''

درخت ساری باتیں سن رہا تھا، درخت ویسے اونٹ سے بدلہ لینا چاہتا تھا کیونکہ اونٹ نے درخت کے سارے پتے توڑ کے کھائے تھے اس لیے درخت نے سوچا یہ اچھا موقع ہے اونٹ سے بدلہ لینے کا آج اس کا قصہ تمام کر دیتا ہوں۔ درخت نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

اور اونٹ کو قصوروار ٹھہرا دیا اور کہا:

مگرمچھ اونٹ کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہے کر سکتا ہے اونٹ نے فریاد کی لہٰذا ایک بار پھر اونٹ نے کہا اب کے بار اپنا فیصلہ لومڑی کے حوالے کرتے ہیں جو وہ فیصلہ کرے؟

مگرمچھ اس بات پر راضی ہو گیا، اس خیال سے کہ شاید لومڑی میرے ڈر سے میرے حق میں فیصلہ سنا دے لیکن اونٹ نے لومڑی کو سارا واقعہ سنا دیا۔ لومڑی بڑی چالاک تھی اس نے دل میں سوچا اور فیصلہ کر لیا کہ ہر حال میں اونٹ کی جان بچانی ہے۔ تو لومڑی کے دماغ میں ایک بات آئی اس نے کہا میں نہیں مانتی کہ دبلا پتلا اونٹ مگرمچھ کو کیسے اپنی پیٹھ پر بٹھا کر تالاب سے یہاں تک لایا ہے جب تک میں اپنی آنکھوں سے یہ نہ دیکھ لوں اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی اونٹ بیچارا سادہ تھا وہ سمجھ نہ سکا اس نے لومڑی سے کہا اگر واقعی تجھے یقین نہیں آتا تو میں مگرمچھ کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر واپس تالاب تک لے جاؤں تو پھر یقین کر لوگی۔ لومڑی نے کہا ہاں اگر ایسا کر سکتے ہو تو پھر ٹھیک ہے میں کوئی فیصلہ کر لوں گی۔

اونٹ مگرمچھ کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر تالاب کی طرف روانہ ہوا۔

آدھے راستے میں لومڑی نے اونٹ سے کہا بے وقوف مگرمچھ کو جلدی سے اپنی پیٹھ سے نیچے گرا دو اور بھاگو اونٹ نے لومڑی کی یہ بات سنتے ہی اچھلنا شروع کر دیا۔ جیسے ہی اونٹ اچھلا تو مگرمچھ اپنے وزن سے نیچے گر پڑا اور اونٹ کی جان بچ گئی۔ لومڑی کی چالاکی کام آ گئی۔

(براہوئی لوک کہانی)

☆☆☆☆

میر عاقل مینگل

بلوچی سے ترجمہ: **مہناز غنی**

بلی اور بڑھیا

بہت عرصہ پہلے کسی گاؤں میں ایک بوڑھی عورت رہتی تھی۔ دن بھر گھر سے باہر جا کر پشم سے بننے والی چیزوں کا مواد تیار کرتی تھی اور دائی کا کام بھی کرتی تھی۔

روز صبح سویرے روٹیاں بنا لیتی تھی اور تھوڑا سا کھا لیتی تھی اور کچھ رات کے لیے بچا کر رکھتی تھی۔ ایک دن جب وہ روٹیاں بنا رہی ہوتی ہے تو اس کے کسی ہمسائے کے گھر سے کوئی دودھ بھیجتا ہے۔ اس نے کھانا کھایا اور کچھ رات کے لیے بچا کر رکھ دیا۔ اور جب وہ بڑھیا کام سے واپس آ رہی ہوتی ہے تو ایک بلی بڑھیا کی جھونپڑی میں آ جاتی ہے اور سارا دودھ پی لیتی ہے تو اسی وقت بڑھیا اپنی جھونپڑی میں داخل ہو جاتی ہے۔ جیسے ہی بلی کی اس حرکت کو دیکھتی ہے آگ بگولہ ہو کر چاکو لے کر بلی کی دُم کاٹ لیتی ہے۔ تو بلی رو رو کر فریاد کرنے لگتی ہے ہائے میری عزت چلی گئی اُف اب میں کیسے دنیا والوں کو اپنا منہ دکھاؤں گی۔ بڑھیا کہتی ہے تم اسی کے قابل ہو چوری کی یہی سزا ہے تم نے مجھ بیچاری بوڑھی عورت کا رات کا کھانا کھایا تمہیں نہ مجھ پر ترس آیا نہ ہی چوری کرتے ہوئے تمہیں شرم آئی۔ اب تم اسی طرح رہو گی پوری زندگی بغیر دُم کے پھرو گی اور سب تم پر ہنسیں گیں۔ بلی کہتی ہے نہیں بڑھیا ایسا مت کہو مہربانی کر کے میری دُم دے دو توبہ ہے میری آج کے بعد میں چوری نہیں کروں گی توبہ توبہ مجھے میری دُم دے دو مجھے لالی کی شادی پر جانا ہے۔ بڑھیا بلی کی فریاد سن کر کہتی ہے ٹھیک ہے تم میرے لیے دودھ لے کر آؤ میں تمہیں دُم واپس کروں گی۔ بلی جاتی ہے۔ بکری کے پاس بکری بکری دودھ دو، دودھ بڑھیا کو دوں گی بڑھیا مجھے دُم دے گی دُم کو دُم پر باندھ کر لالی کی شادی پر جاؤں گی۔ بکری کہتی ہے پہلے جاو درخت سے شاخ لاؤ۔

بلی جاتی ہے درخت کے پاس، درخت درخت شاخ دو، شاخ دوں گی بکری کو، بکری مجھے دودھ دے گی دودھ دوں گی بڑھیا کو، بڑھیا مجھے دُم دے گی۔ دُم کو دُم پر باندھ کے لالی کی شادی پر جاؤں گی۔ درخت کہتا ہے۔ میرے لیے فاختہ کا گھونسلہ لاؤ۔ بلی جاتی ہے فاختہ کے پاس فاختہ فاختہ مجھے گھونسلہ دو، گھونسلہ دوں گی

درخت کو، درخت مجھے شاخ دے گا، شاخ دوں گی بکری کو، بکری مجھے دودھ دے گی دودھ دوں گی بڑھیا کو، بڑھیا مجھے دُم دے گی دُم کو دُم پر باندھ کر لالی کی شادی پر جاؤں گی۔ فاختہ کہتی ہے جاؤ مجھے دانہ دو۔ بلی جاتی ہے کسان کے پاس کسان۔ کسان دانہ دو۔ دانہ دوں گی فاختہ کو، فاختہ مجھے گھونسلہ دے گی، گھونسلہ دوں گی درخت کو، درخت مجھے شاخ دے گا شاخ دوں گی بکری کو، بکری مجھے دودھ دے گی دودھ دوں گی بڑھیا کو، بڑھیا مجھے دُم دے گی، دُم کو دُم پر باندھ کر لالی کی شادی پر جاؤں گی۔ کسان کہتا ہے جاؤ پانی لے کر آ ؤ پھر تمہیں دانہ ملے گا۔ بلی خدا تعالیٰ سے دعا مانگتی ہے اے اللہ بادل لاؤ، پھر بارش برساؤ، یا اللہ مجھ پر کوئی بھی ترس نہیں کھاتا آپ تو ترس کھاؤ یا اللہ بارش برساؤ یا اللہ بارش برساؤ۔

اللہ تعالیٰ بلی کی سن لیتا ہے اور بارش ہو جاتی ہے، کھیت پانی سے بھر جاتا ہے تو کھیت کہتا ہے جاؤ کسان کو بلاؤ۔ بلی جا کر کسان سے کہتی ہے جاؤ بیج بودو۔ جب کسان بیج بو دیتا ہے اور گندم، باجرہ پک کر تیار ہو جاتا ہے تو بلی باجرہ لے کر فاختہ کو دے دیتی ہے۔ فاختہ بلی کو گھونسلہ دے دیتی ہے۔ بلی گھونسلہ لے کر درخت کو دیتی ہے اور درخت بلی کو شاخ دیتا ہے بلی شاخ کو لے کر بکری کو کھلاتی ہے اور بکری جب دودھ دیتی ہے تو بلی دودھ لے کر بڑھیا کے پاس چلی جاتی ہے۔ بڑھیا دودھ دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہے اور بلی کی دُم کو دُم پر لگا دیتی ہے اور بلی کو روانہ کرتی ہے اور بلی ہنسی خوشی لالی کی شادی پر جاتی ہے اور وہاں پھر بلی چوری سے باز نہیں آتی گوشت، بوٹیاں اور ہڈیاں چرا کر رات کے وقت آ رہی ہوتی ہے کہ ڈاکو بلی پر حملہ کرتے ہیں اور بلی کو زخمی حالت میں پھینک جاتے ہیں۔ بلی کبھی چوری کی عادت کو ترک نہیں کرتی اور اسے چوری کا انجام مل جاتا ہے۔

تو بچو: یہ ہوا چوری کا انجام

☆☆☆☆

مہناز غنی

ملکہ اور مالکن

کہیں کسی زمانے میں کوئی تاجر ہوا کرتا تھا۔ تجارت کی وجہ سے اس کا اچھا خاصا گھر چل سکتا تھا۔ لیکن اس کی بیوی اسے بہت تنگ کرتی تھی۔ نہ وہ گھر کو اچھی طرح سے سنبھالتی تھی نہ ہی خود صفائی ستھرائی کا خیال رکھتی تھی اور نہ ہی اپنے شوہر کا خیال رکھ سکتی تھی۔ تاجر اپنی بیوی سے تنگ آ کر گھر چھوڑ کر کہیں دور رہنے لگا۔

لیکن اپنے مویشیوں کے لیے چارہ اور بیوی کے لیے پیسے بھیج دیتا تھا۔ اس کی بیوی اپنی نوکرانی کو کہتی تھی جانوروں کو چارہ دو۔ وہ سارا چارہ مویشیوں کے سامنے پھینک دیتی تھی تو پورے محلے کے جانور جمع ہو جاتے۔ کھانے کے لیے کوئی بھی سالن روٹی کچھ بھی نہیں بنتا تھا۔ جتنی بھی رقم ہوتی تھی تاجر کی بیوی نوکرانی کو تھما دیتی تھی اور پورے مہینے کے لیے بس ایک بوری مونگ پھلی منگواتی تھی۔

(دوسری طرف) اُس ریاست کے بادشاہ کی شادی ہوتی ہے شادی والے دن بادشاہ اپنی ملکہ سے لڑ پڑتا ہے۔ دو، تین پیسوں پر جب بادشاہ ملکہ سے لڑ رہا ہوتا ہے۔ تو اسی وقت ان کے محل میں ڈاکو گھس آتا ہے۔

ڈاکو چپکے سے بادشاہ کو اپنی ملکہ سے لڑتے ہوئے دیکھتا ہے۔ جب بادشاہ اور اس کی ملکہ سو جاتے ہیں تو ڈاکو سوچتا ہے یہ بادشاہ کتنا بے وقوف ہے دو، تین پیسوں کے لیے لڑ رہا ہے کتنی پیاری ملکہ ہے۔ اس بے وقوف بادشاہ کو سبق سکھانا ہی پڑے گا۔ ڈاکو کچھ سوچ کر ملکہ کو سوتے ہی میں اٹھا کر اسی تاجر کے گھر چھوڑ دیتا ہے اور تاجر کی بیوی کو اٹھا کر بادشاہ کے محل میں رکھتا ہے۔

صبح سویرے جب ملکہ کی آنکھ کھلتی ہے تو کسی اور جگہ خود کو پا کر حیران رہ جاتی ہے۔ ملکہ جب اِدھر اُدھر نظریں گھماتی ہے تو کسی نوکرانی کو دیکھتی ہے تو ملکہ نوکرانی کو اٹھاتی ہے اور وضو کے لیے پانی مانگتی ہے۔

نوکرانی جا کر پانی کا بندوبست کر لیتی ہے نوکرانی آدھی نیند کی حالت میں کچھ دیر بعد سوچنے لگتی ہے آج مالکن کو ہوا کیا ہے؟ انہیں تو کبھی نماز کا خیال تک نہیں آیا۔ جب ملکہ نماز سے فارغ ہوتی ہے تو دھوپ نکل چکی ہوتی ہے صبح کی کرنوں کے ساتھ ساتھ ملکہ کا صاف اور نورانی چہرہ اب بالکل صاف اور واضح دکھائی دیتا ہے۔

نوکرانی اتنی فرشتہ نما نیک صورت اور نیک سیرت عورت کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے لیکن اسے پوچھنے کی

ہمت نہیں ہوتی کہ آپ ہیں کون؟ جیسے ہی نوکرانی نیند کی اوٹ سے نکل کر ملکہ کے پاس آتی ہے تو ملکہ نوکرانی سے کہتی ہے جاؤ مونگ پھلی کے چھلکوں سے بھرے ہوئے گھر کو صاف کرو۔

نوکرانی پورے گھر کو چمکا دیتی ہے۔ ملکہ نوکرانی سے پوچھتی ہے آپ کا مالک کہاں ہے، نوکرانی سارا قصہ سنا دیتی ہے۔

جب سارا قصہ پتہ چل جاتا ہے تو ملکہ نوکرانی کو اسی دکان پہ بھیجتی ہے۔ کہتی ہے جاؤ دکان دار سے کہو پہلے ہمیں پیسوں کی ضرورت نہیں تھی اب ہمارے پیسوں کا حساب کر کے سارے پیسے دے دیں (ملکہ سارے پیسوں کا حساب لگا کر کہتی ہے) جب دکان دار پیسے واپس کرتے ہیں۔ تو ملکہ نوکرانی سے پورے مہینے کا راشن منگواتی ہے۔ اور باقی پیسوں کا اچھی طرح سے حساب کتاب کرتی ہے اسی طرح ہر مہینہ بچت سے ان کے پاس کافی رقم جمع ہو جاتی ہے اور ملکہ اسی رقم سے بہت ہی خوبصورت محل جیسا گھر بنواتی ہے ایک دن ایسا بھی آتا ہے ملکہ پوری ریاست کے امیر کبیر اور اسی بادشاہ اور تاجر کو بھی اپنے گھر دعوت پر بلا لیتی ہے۔ تاجر یہ سن کر بہت پریشان ہو جاتا ہے کہ میری بیوی نے پوری ریاست سے امیر کبیر راجہ مہاراجاؤں کو بھی بلایا ہے۔ اب کھانے پینے اور بیٹھنے کا اتنا انتظام کیسے ہوگا۔ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے کہ میری بیوی آج مجھے کہیں کا نہیں چھوڑے گی۔ آج میری عزت تو گئی ہی گئی (اسی غم و پریشانی کی کشمکش میں تاجر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے) وہاں ملکہ نوکرانی کو دروازے پر رکنے کو کہتی ہے تا کہ مالک کو گھر کا پتہ چلے۔ جب تاجر محل نما گھر کو دیکھتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے اور سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ میرا گھر تو معمولی سا تھا۔ پھر یہ محل کہاں سے آیا۔ اپنی نوکرانی کو وہاں کھڑا دیکھ کر سمجھ جاتا ہے۔ جب اپنا گھر اور انتظام دیکھتا ہے تو دنگ رہ جاتا ہے کہ یہ کس نے کیا ہوگا۔ میری بیوی تو کسی کام کی نہیں تھی۔

اپنی بیوی کی جگہ کسی نیک صورت اور خوش سیرت عورت کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کون ہو سکتی ہے۔ ملکہ اپنی کہانی سنا دیتی ہے پھر اس ملکہ کا بادشاہ بھی آتا ہے تو وہ بادشاہ کو کہتی ہے آپ مجھے طلاق دے دو میں اس نیک دل تاجر سے شادی کروں گی۔ آپ اچھے انسان نہیں ہو، میں یہاں بہت خوش ہوں۔ آپ تو شادی والے دن بھی چند پیسوں کے لیے مجھ سے لڑ پڑے تھے۔ پھر بادشاہ بہت پریشان ہو جاتا ہے۔ پریشانی میں اس کو طلاق دے دیتا ہے اور تاجر اور ملکہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوتی ہے۔ اور ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔

(بلوچی لوک کہانی)

☆☆☆☆

نادیہ ہاشم

جھگڑالو عورت اور ہوشیار شوہر

ایک عورت انتہائی خوبرو مگر پرلے درجے کی جھگڑالو تھی۔ ہر وقت اپنے میاں کے ساتھ جھگڑا کرتی اور شور ڈالتی رہتی تھی۔ بیوی کی روز روز کی بک جھک سے وہ سخت پریشان رہتا تھا اور بالآخر ایک دن تنگ آ کر اس نے بیوی کو طلاق دے دی۔ کچھ عرصہ بعد عورت نے کسی اور شخص کے ساتھ شادی کی۔ حسب عادت عورت اپنے نئے شوہر کے ساتھ بھی اسی طرح جھگڑا کرتی، فقرے کستی اور شور مچاتی رہتی تھی۔ شوہر نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر عورت کے خمیر میں شاید یہ بات رچ بس گئی تھی اس لیے شوہر کی تمام تر کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ اور اس نے بھی تنگ آ کر عورت کو طلاق دے دی۔

عورت چونکہ بہت ہی خوبصورت تھی۔ اس لیے ایک اور شخص نے اس سے شادی کی۔ رات کے وقت جب مرغے نے اذان دینی شروع کی تو اس نے فوراً تلوار نکال کر ایک ہی وار سے مرغے کی گردن اتار دی۔

باتونی بیوی نے شوہر سے پوچھا کہ تم نے مرغے کو مار دیا! تو اس نے کہا جہنم میں جائے۔ اس کی بے وقت اذان نے ہماری نیند خراب کر دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب کتے نے بھونکنا شروع کیا تو اس نے پھر تلوار سونت لی اور کتے کا سر بھی قلم کر دیا۔ بیوی نے کہا کہ تم نے کتے کو مار دیا! شوہر نے کہا بھاڑ میں جائے کم بخت۔ اس نے تو ہمارے کان کے پردے پھاڑ کر رکھ دیئے۔

کچھ دیر بعد جب گدھے نے اچانک ڈھینچو ڈھینچو کرنا شروع کیا تو اس نے تلوار نکال کر اس کا کام بھی تمام کر دیا۔ بیوی نے کہا کہ تم نے گدھے کو بھی مار دیا! تو اس نے کہا کہ گدھے کو یہ جرات کیونکر ہوئی کہ وہ ہمارے آرام میں خلل ڈال دے۔ اچھا ہوا ہم نے اس ناہنجار کا قصہ تمام کیا۔

جھگڑالو بیوی نے دل میں خیال کیا کہ اگر اس نے بھی زبان چلانے کی کوشش کی تو اس کا حشر بھی ان جیسا ہوگا۔ اسی خوف کے باعث بیوی کو کبھی یہ ہمت نہ ہو سکی کہ وہ اونچی آواز میں بات کر سکے۔ اسی طرح وہ ایک بہترین بیوی ثابت ہوئی اور وہ دونوں سکھ او چین کی زندگی بسر کرنے لگے۔

(بلوچی لوک کہانی)

نادیہ ہاشم

عقل مند وزیر زادی

ایک تھا بادشاہ۔ جسے ہر وقت اپنے دشمنوں اور مخالفین کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی فوج کو بہترین جنگی ساز و سامان اور جدید سے جدید تر اسلحہ سے لیس رکھتا تھا۔ ایک دن اس کے دل میں خیال آیا اور اس نے وزیر کو طلب کر کے کہا کہ اس کے سپاہیوں کے لیے پتھر کی وردیاں تیار کروائی جائیں اور اگر اس نے یہ کام چند ہفتوں میں نہ کیا تو اسے نہ صرف وزارت سے برخاست کیا جائے گا بلکہ قید میں رکھا جائے گا۔

وزیر نے جب بادشاہ سلامت کا یہ حکم سنا تو بہت پریشان ہوا اور یہ سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے؟ اس نے اپنی پریشانی کا ذکر کسی سے نہ کیا اور دل ہی دل میں سوچ و بچار کرنے لگا کہ اس آزمائش سے خود کو کس طرح اور کیسے بچائے؟۔

ایک دو دن اسی عالم میں گزرے۔ وزیر کی بیٹی نے محسوس کیا کہ ابو پریشان نظر آتے ہیں۔ ضرور کوئی اہم بات ہوگی۔ بالآخر اس نے ابو سے پوچھ ہی لیا کہ آپ کئی دنوں سے بہت پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ آخر معاملہ کیا ہے؟

وزیر نے ساری کہانی بیٹی کے گوش گزار کی کہ بادشاہ نے انہیں حکم دیا ہے کہ اگر وہ اس کے سپاہیوں کے لیے پتھر کی وردیوں کا انتظام نہ کر سکے تو انہیں نہ صرف وزارت کے منصب سے ہاتھ دھونا پڑے گا بلکہ انہیں پابند سلاسل کیا جائے گا۔

وزیر کی بیٹی بہت عقل مند تھی۔ اس نے کہا کہ یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے اور آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ آپ بادشاہ سلامت سے صرف اتنا عرض کریں کہ وہ پتھر کے دھاگوں کا انتظام کرے تاکہ پتھر کی وردیوں کے بنانے کا کام جلد از جلد شروع کیا جا سکے۔

اگلے دن وزیر نے بادشاہ سلامت سے دست بستہ عرض کی کہ حضور پتھر کی وردیوں کی تیاری کے لیے پتھر کے دھاگے درکار ہیں۔ حضور مہربانی فرما کر پتھر کے دھاگوں کا انتظام کریں تاکہ وہ فی الفور پتھر کی وردیاں تیار کروا سکیں۔ وزیر کی اس بات پر بادشاہ سلامت اپنی بغلیں جھانکنے لگے اور جب ان سے کوئی جواب بن نہیں پڑا تو اسے اپنی نادانی کا احساس ہوا۔ اور انہوں نے وزیر سے معذرت کی۔ اس طرح عقل مند بیٹی کی دانائی سے وزیر کی جان بچ گئی۔

(بلوچی لوک کہانی)

واحد بخش بُزدار

تین دُعائیں

ایک شخص روز و شب اللہ تعالٰی کی عبادت میں مصروف رہتا تھا اور وہ ہر وقت اللہ سے یہ التجا کرتا تھے کہ پروردگار میری دعاؤں کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔ بالآخر اللہ تعالٰی نے اس کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے اپنا ایک فرشتہ اس کے ہاں بھیج دیا۔ فرشتے نے اس سے کہا کہ اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے کہ آپ جو بھی تین دعائیں کریں گے۔ انہیں قبول کیا جائے گا۔

اس شخص نے فرشتے سے کہا کہ میں اپنی بیوی سے مشورہ کر کے آپ کو بتا دوں گا۔ لہٰذا آپ اگلی رات تشریف لے آئیں۔ اس شخص نے اپنی بیوی سے اس بارے میں مشورہ لیا کہ پہلی کون سی دعا مانگی جائے تو بیوی نے اس سے کہا کہ آپ سب سے پہلے میری خوبصورتی کی دعا کریں۔ پھر اس کے بعد مال و دولت کی استدعا کریں۔ اس طرح ہمارے سارے دکھ درد ختم ہو جائیں گے اور زندگی انتہائی آرام اور چین سے گزر جائے گی۔

اس شخص نے اپنی بیوی کے مشورے سے اتفاق کیا۔ اگلی رات جب اللہ کا فرشتہ اس کے ہاں پہنچا تو اس نے فرشتے سے کہا کہ اللہ تعالٰی کی بارگاہ میں میری پہلی دعا یہ ہے کہ میری بیوی ایک حسین و جمیل دوشیزہ بن جائے۔ جب رات گزر گئی اور صبح ہوئی تو وہ شخص یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ اس کی بیوی انتہائی خوبصورت اور حسین و جمیل دوشیزہ بن چکی تھی۔ جب بیوی نے یہ دیکھا کہ وہ بہت خوبصورت ہو گئی ہے تو اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ تو اب اس نا ہنجار اور گنوار شخص کے لائق نہیں ہے۔ یہ سوچ کر وہ سیدھا بادشاہ کے پاس پہنچی اور روتے ہوئے فریاد کی میں ایک شاہی خاندانی کی لڑکی ہوں اور یہ شخص ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے اور زبردستی مجھے اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے۔ اس لیے میں پناہ لینے کی غرض سے آپ کے پاس آ گئی ہوں۔

بادشاہ نے جب اس حسین و جمیل دوشیزہ کو دیکھا تو دل و جان سے اس پر فدا ہوا اور اس کے ساتھ خود شادی رچالی۔ وہ شخص انتہائی بے بسی اور پریشانی کے عالم میں خالی ہاتھ گھر لوٹ آیا۔ پریشانی اور بے چارگی کے عالم میں وہ گڑگڑا کر اپنی دوسری دعا مانگنے لگا کہ یا اللہ میری بیوی کو انتہائی بدصورت اور بدشکل بنا۔ دعا مانگنے

ہی اس کی بیوی بدصورت بن گئی۔ بادشاہ یہ دیکھ کر سٹپٹا گیا کہ ہو نہ ہو یہ عورت کوئی انسان نہیں ہے بلکہ کوئی چڑیل ہے جو کبھی انتہائی خوبصورت تو کبھی انتہائی بدصورت بن جاتی ہے۔

بادشاہ نے اسی وقت اسے شاہی محل سے نکال دیا۔ عورت گرتے پڑتے واپس اپنے شوہر کے گھر پہنچی۔ شوہر نے پہلے تو بہت ٹال مٹول کیا اور اسے اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کیا لیکن بیوی کی بے پناہ منت سماجت اور دادوفریاد کے بعد اسے اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ ہوا۔ اس شخص کے پاس اب تیسری اور آخری دعا رہ گئی تھی۔ جس میں اس نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ میرے مولا میری بیوی کو اپنی پہلی شکل وصورت عطا کر۔ اس طرح اس کی بیوی اپنی پہلی شکل وصورت کی مالک بن گئی۔

زندگی بھر اسے اس بات کا دکھ اور رنج رہا کہ اس کی تمام تر دعائیں اور خواہشیں بیوی کی برتری اور خوش فہمیوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

(بلوچی لوک کہانی)

☆☆☆☆

واحد بخش بُزدار

خونِ ناحق

کسی بادشاہ کا وزیر بہت ہی ظالم اور سفاک شخص تھا۔ ہر وقت دوسروں کی بدخواہی میں لگا رہتا تھا۔ شاہی اعمال سے لے کر رعایا تک سبھی اس سے بیزار تھے۔ اتفاق سے ایک دن کسی غلام سے غلطی سرزد ہوئی۔ وزیر نے اسے پکڑنے اور لانے کا حکم صادر کیا۔ غلام کو گرفتار کر کے قید میں رکھا گیا۔ غلام نے گڑگڑا کر استدعا کی کہ اس کی خطا معاف کی جائے۔ اس نے بہت فریاد و آہ و زاری کی کہ اسے اب کی بار معافی دی جائے۔ آئندہ وہ اس طرح کی غلطی نہیں کرے گا۔

بادشاہ کا دل پسیج گیا۔ لیکن وزیر نے بادشاہ سے عرض کیا کہ اگر آج اس غلام کو سزا نہ دی گئی تو کل سبھی نوکر چاکر بے پرواہ اور خودسر ہو جائیں گے۔ ہر کوئی غلط کام کرے گا اور نکل جائے گا۔ وزیر نے کہا کہ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ نہایت ہی بدبخت غلام ہے۔ اس کا علاج صرف قتل ہی ہے۔ جس سے دوسرے عبرت پکڑیں گے۔

بادشاہ نے وزیر کی بات مان لی اور حکم دیا کہ غلام کا سر قلم کیا جائے۔ لیکن قتل کرنے سے پہلے بادشاہ نے غلام سے اس کی آخری خواہش کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ اس بارے میں کیا کہنا چاہے گا؟ غلام بادشاہ کے قدموں میں گر پڑا اور عرض کی کہ میں ساری زندگی حضور کا نمک کھاتا رہا ہوں۔ آپ میری زندگی اور موت کے مالک ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا خونِ ناحق آپ کی گردن پہ رہے۔ مگر جو آپ کا حکم ہے وہ سر آنکھوں پر۔ البتہ میں آپ سے ایک استدعا کرنا چاہوں گا۔

بادشاہ نے کہا کہ عرض کرو۔ غلام نے انتہائی بے بسی سے کہا کہ مجھے اجازت دی جائے کہ میں وزیر کا سر تن سے جدا کروں۔ اور پھر آپ مجھے وزیر کے خون کے بدلے میں قتل کر دیں۔ اس طرح آپ کا حکم، حکم رہے گا اور میرا خونِ ناحق بھی آپ کی گردن پر نہیں رہے گا۔

بادشاہ، وزیر کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے پوچھا کہ غلام کی بات سن رہے ہو؟ وزیر خوف سے تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ وزیر نے خیال کیا کہ تیرہ بختی نے دبوچ لیا ہے تو اس نے بڑی لجاجت سے عرض کیا کہ بادشاہ سلامت

نوکر، چاکر، غلام و خدام سبھی تیری رعایا ہیں۔ تیری اولاد کی طرح ہیں۔ خطا کسی بھی انسان سے سرزد ہو سکتی ہے۔ مگر خطاؤں پر درگزر کرنا بادشاہی وصف ہے اور ایسے کام خدا کی بارگاہ میں عظیم نیکی شمار ہوتے ہیں۔ مجھ سے بھی غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ میری گزارش یہ ہے کہ غلام کی خطا بخش دی جائے۔ بادشاہ مسکرایا۔ غلام کی طرف دیکھا اور اپنے شاہی محل کی جانب چل پڑا۔

(بلوچی لوک کہانی)

☆☆☆☆

حافظ محمد ادریس

پشتو سے ترجمہ: سید ولی خیال مومند

ابن سعود کا انصاف

ایک دن سلطان ابن سعود (شاہ حجاز) کے دربار میں ایک خاتون آ کر پیش ہوئی اور ان سے عرض کی۔

خاتون: حضور! فلاں شخص نے میرے شوہر کو مار ڈالا ہے مجھے اس سے قصاص (بدلہ) دلوا دیں۔

ابن سعود: کیسے قتل کیا ہے

خاتون: وہ شخص ایک درخت پر چڑھ گیا تھا اسی درخت کے نیچے میرا شوہر بیٹھا تھا جب وہ شخص درخت سے گرا تو میرا شوہر اس کے نیچے آ کر مر گیا۔ آپ بادشاہ ہیں آپ مجھے اس کا بدلہ لینے دیں۔

بادشاہ: آپ کے بیاں سے ظاہر ہو گیا ہے کہ آپ کا شوہر اس شخص نے قصداً نہیں مارا ہے بلکہ اس سے خطا سرزد ہوئی ہے اس لیے بدلہ نہ مانگو، فدیہ لے لو۔

خاتون: میں ان پڑھ ہوں، میں قصداً اور خطا کو نہیں سمجھتی میں تو یہی چاہتی ہوں کہ میرے شوہر کے قاتل کو موت کی سزا دی جائے۔

بادشاہ: ٹھیک ہے، تم اگر فدیہ لینا نہیں چاہتی اور ہر حالت میں اس شخص کو قتل کرنے پر تلی ہوئی ہو تو ہم اس شخص کو اس درخت کے نیچے بیٹھا دیں گے۔ تم درخت پر چڑھ جاؤ اور اوپر سے چھلانگ لگا کر اس سے اپنا بدلہ لے لو۔

خاتون: کیوں صاحب: میں ایسا کیوں کروں اس میں تو میری جان کو بھی خطرہ ہے۔

بادشاہ: چونکہ تم بدلہ لینا چاہتی ہو اس لیے میں تمہیں ہو بہو ایسے ہی طریقے سے بدلہ لینے کا موقع دیتا ہوں جس طرح تمہارے شوہر کو قتل کیا گیا ہے۔

جب خاتون کو معلوم ہوا کہ بادشاہ انصاف کے سلسلے میں ثابت قدم ہے تو وہ قصاص کے بدلے خون بہا لینے پر راضی ہوئی۔

☆☆☆☆

حافظ محمد ادریس

پشتو سے ترجمہ۔ سید ولی خیال مومند

تین اور پانچ

ایک دفعہ دو آدمی سفر پر جارہے تھے ۔ ایک کے پاس پانچ روٹیاں اور دوسرے کے پاس صرف تین روٹیاں تھیں ۔ جب ان کو بھوک لگی تو دونوں راستے میں ایک درخت کے نیچے کھانا کھانے بیٹھ گئے ۔ اسی دوران ایک تیسرا آدمی بھی آیا اور انکے ساتھ کھانے میں شریک ہوا ۔ وہ شخص کافی امیر تھا جب کھانا ختم ہوا تو اس نے اپنے جیب سے آٹھ اشرفیاں نکالی اور دسترخوان کے اوپر رکھ کر چلا گیا ۔ جس شخص کے پاس پانچ روٹیاں تھیں اس نے اس میں پانچ اشرفیاں اپنے جیب ڈال دیں اور تین اشرفیاں دوسرے مسافر کو دینے لگا ۔ اس نے تین اشرفیاں لینے سے انکار کیا کہ ہم دو آدمی ہیں اور اشرفیاں آٹھ ہیں اس لیے چار آپ رکھ لیں اور چار مجھے دیں دوسرے نے کہا کہ میری پانچ روٹیاں تھیں اور آپکی تین، اس لیے پانچ اشرفیاں میری بنتی ہیں اور تین پر آپکا حق ہے۔

جب فیصلہ نہ ہوسکا تو دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خدمت میں حاضر ہوئے جب انہوں نے پوری کہانی سنی تو تین روٹیوں والے شخص سے کہا کہ تم تین اشرفیاں خوشی سے قبول کرو کیونکہ انصاف کی رُو سے تمہارا حق صرف ایک اشرفی بنتا ہے اس شخص نے کہ یہ تو عجیب فیصلہ ہے مجھے ذرا سمجھائیں تو سہی ۔ حضرت علیؓ نے فرمایا فرض کرو کہ ہم ہر ایک روٹی کے تین ٹکڑے کرتے ہیں تو آپ کی تین روٹیوں کے نو ٹکڑے بنتے ہیں اس طرح دوسرے شخص کی پانچ روٹیوں کے پندرہ ٹکڑے ہوئے اور ان سب ٹکڑوں کو ملا کر کل چوبیس ٹکڑے ہوئے جو آپ تینوں نے کھائے یعنی آپ میں سے ہر ایک کے حصے میں آٹھ آٹھ ٹکڑے آئے کیا آپ یہ بات مانتے ہیں اس شخص نے کہا کہ بالکل مانتا ہوں آگے کہیے ۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ آپ نے اپنے نو ٹکڑوں میں آٹھ خود کھا لیے تو باقی رہا ایک اور دوسرے شخص نے اپنے پندرہ ٹکڑوں میں آٹھ ٹکرے کھا لیے اور باقی سات بچ گئے اس طرح مہمان نے آپ کا ایک ٹکڑا اور دوسرے شخص کے سات ٹکڑے کھائے اس لیے انصاف کی رُو سے آپ کی ایک اشرفی بنتی ہے اور دوسرا سات اشرفیوں کا حقدار ہے اس فیصلے پر وہ شخص مطمئن ہوا اور ایک اشرفی لے کر چلا گیا ۔

سید ولی خیال مومند

چالاک ریتو

کہتے ہیں کہ کسی گاؤں میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ وہ بہت چالاک اور شریر تھا۔ وہ طرح طرح کی شرارتیں کیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اکثر لوگ اسے چالاک ریتو کے نام سے پکارتے تھے۔ ایک دن اسے عجیب قسم کی شرارت سوجھی۔ وہ گاؤں کے ایک سادہ لوح لڑکے کو ساتھ لے کر جنگل کی طرف چلا گیا۔ چلتے چلتے راستے میں اسے ایک چھوہارا پڑا ہوا ملا جو اس نے جلدی سے اٹھایا۔ آدھا خود کھایا اور آدھا ساتھی کو کھلایا۔ یہاں سے تھوڑا آگے چل کر اس نے ایک کسان کو دیکھا، جو کھیت میں ہل چلا رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی لڑکے سے کہا کہ جاؤ اور کسان سے ہل کا پھل مانگ کر لے آؤ۔ لڑکے نے معذرت کی۔ ریتو نے کہا اگر تم میرے لیے یہ چھوٹا سا کام بھی نہیں کر سکتے تو مجھے اپنا آدھا چھوہارا واپس کر دو۔ لڑکا مجبور ہو کر کسان کے پاس گیا اور اسے اپنی مجبوری بتا دی۔ کافی منت سماجت کے بعد اس سے پھل مانگ کر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ واپس آ کر اس نے پھل ریتو کے حوالے کیا۔ جب وہ یہاں سے آگے چل پڑے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بوڑھی عورت دہی سے بھرا ایک مٹکا سر پر اٹھائے بازار بیچنے جا رہی تھی۔ ریتو نے پھر اپنے ساتھی لڑکے سے کہا کہ جیسے بھی ہو، بڑھیا سے دہی کا مٹکا لے آؤ۔ لڑکے نے پھر انکار کیا تو ریتو نے کہا کہ تمھیں ہر حال میں یہ کام کرنا پڑے گا ورنہ مجھے وہ آدھا چھوہارا واپس کر دو۔ یہ سن کر اس کا ساتھی بڑھیا کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میں بھی بازار جا رہا ہوں۔ آپ بہت کمزور ہیں، میں چاہتا ہوں کہ یہ مٹکا بازار تک میں اپنے سر پر اٹھا کر آپ کی مدد کر سکوں۔ بوڑھی خوش ہوئی اور دہی کا مٹکا اس کے حوالے کر دیا اور وہ بازار کی طرف چل پڑے۔ راستے میں بڑھیا تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ذرا آگے کو نکل گئی تو وہ لڑکا پیچھے سے غائب ہو گیا اور ریتو کے پاس پہنچ کر دہی کا مٹکا اس کے حوالے کر دیا اور وہ دونوں نامعلوم منزل کی طرف چل پڑے۔ اس دوران انہیں راستے میں ایک اور آدمی ملا جو جلانے کی لکڑیاں اکٹھی کر رہا تھا۔ ریتو نے پھر اپنے ساتھی لڑکے کو کہا کہ جا کر اس آدمی سے کسی طرح رسی حاصل کر کے لے آؤ۔ اس نے پھر انکار کیا تو ریتو نے پھر چھوہارے والی بات دہرائی۔ المختصر اس نے چار و نا چار اس آدمی سے رسی چرا کر ریتو کو دے دی۔ چلتے چلتے آخر وہ لڑکا اپنے کیے پر پشیمان ہوا۔ اس نے عہد کیا کہ وہ ریتو کے

کہنے پر آئندہ کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا، ورنہ ایک نہ ایک دن لوگ اسے پکڑ کر اس کی پٹائی کریں گے اور اسے لوگوں کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑے گی، اس لیے وہ ریتو کے پاس گیا اور اس کی منت سماجت کر کے جان چھڑائی اور واپس گھر کی طرف روانہ ہوا۔ ریتو سب چیزیں لے کر جنگل کی طرف چل پڑا۔ وہ دہی کا برتن سر پر اٹھائے ہوئے پیدل جا رہا تھا۔ دن بھر سفر کرنے کے بعد وہ شام کو آرام کے لیے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ رات گزرنے کے بعد جب وہ اگلی صبح بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ ایک دیو اس کی طرف آ رہا ہے۔ ریتو دہی کا برتن لے کر فوراً درخت پر چڑھ گیا۔ ہل کا پھل اور رسی بھی اس کے پاس موجود تھی۔ وہ درخت کی شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا مگر دیو اسے درخت پر چڑھتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ جب دیو قریب آیا تو اس نے آواز دی کہ تم جو کوئی بھی ہو، فوراً درخت سے نیچے اتر آؤ۔ ریتو نے اوپر سے چیخ کر کہا کہ اگر تمھیں اپنی زندگی عزیز ہے تو یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ پچھتاؤ گے۔ دیو نے جواب دیا میں دیوؤں کا بادشاہ ہوں، تم میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ ریتو نے کہا ''اے دیوؤں کے بادشاہ! تمھیں میری طاقت کا اندازہ نہیں۔ اگر میں نے تمھیں اپنے ایک بال سے باندھ لیا تو اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکو گے۔ دیو نے کہا کہ چلو تم اپنا ایک بال نیچے پھینک کر دکھاؤ تاکہ پتہ چلے۔ ریتو نے اوپر سے رسی پھینک کر کہا کہ یہ لو میرا بال۔ دیو اسے دیکھ کر کافی ڈر گیا اور دل ہی دل میں کہا، اتنا بڑا بال تو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ دیو پھر بولا تم نے میرے دانتوں کی طاقت نہیں دیکھی۔ ریتو نے جواب دیا کہ تم کیا اور تیرے پتلے پتلے دانت کیا۔ تم نے میرے دانت نہیں دیکھے، اگر میرے دانت دیکھ لیے تو اپنے دانت بھول جاؤ گے۔ دیو نے کہا کہ میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ جب تک تیرے دانت اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں۔ ریتو نے کہا کہ جب بچپن میں میرے دودھ کے دانتوں کی جگہ موجودہ دانت نکل آئے تو میں نے اپنے دودھ کے دانتوں میں سے ایک دانت اپنے پاس محفوظ رکھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہل کا پھل نیچے گراتے ہوئے کہا، یہ دیکھو میرا دودھ کا دانت، دیو یہ دیکھ کر گھبرایا اور کہا کہ یہ کس بلا سے پالا پڑ گیا۔ اسے اپنی جان کی فکر لاحق ہوئی۔ وہ ابھی اس فکر میں غلطاں تھا کہ اوپر سے ریتو نے دہی کا مٹکا اس کے سر پر گرایا تو دیو پر کپکپی طاری ہوئی۔ اس نے دل میں کہا کہ یہ کیا مصیبت ہے۔ ریتو نے یہ دیکھ کر کہا، اے دیو مت ڈر، یہ میرا تھوک ہے اگر میں نے پیشاب کیا تو سیلاب آ جائے گا اور تم اس میں ڈوب مرو گے۔ دیو نے یہ سن کر ریتو کی منت سماجت شروع کی اور کہا خدارا ایسا نہ کرنا میں دیوؤں کا بادشاہ ہوں مگر تمھارا نوکر۔ مہربانی کر کے نیچے اتر آؤ۔ میں تمھیں اپنے دیس لے جاؤں گا۔ وہاں سارے دیو تمہارے

خدمت کریں گے۔ جب ریتو اچھی طرح سے مطمئن ہو گیا کہ دیو پوری طرح رعب میں آ گیا ہے تو ریتو آرام سے نیچے اتر آیا۔ اس نے خود سے کہا چلو کم از کم دیو دیس کی سیر تو کر لوں گا۔

ریتو دیو کے ساتھ روانہ ہوا۔ چند قدم آگے جا کر اسے زمین پر ایک مینڈک نظر آیا۔ اس نے دیو سے دو تین قدم پیچھے ہو کر مینڈک اٹھایا اور جلدی سے قمیص کے نیچے چھپایا۔ دیو کو اس کی اس حرکت کا پتہ نہ چلا۔ تھوڑا آگے جا کر ریتو بار بار اپنے بدن کو کھجلانے لگا۔ دیو نے پوچھا تو ریتو نے کہا کہ اس دن میری ماں نے میرے سر کے بالوں سے سارے جوئیں نکال کر مار دی تھیں مگر لگتا ہے کہ ان میں کچھ رہ گئی ہیں جو مجھے تنگ کر رہی ہیں۔ تم ذرا ٹھہرو میں اسے ڈھونڈ کر نکالتا ہوں اس نے اپنی قیمص کے اندر سے مینڈک نکال کر زمین پر پٹخ دیا۔ دیو یہ دیکھ کر مزید حیران ہوا مگر پھر بھی اس پر شک کرتے ہوئے اس نے ریتو سے کہا کہ بظاہر تمھارا بدن تو بہت چھوٹا سا نظر آتا ہے۔ ریتو نے جواب دیا کہ بظاہر میرا جسم چھوٹا نظر آتا ہے، مگر سب طاقت ہی طاقت ہے۔ اس نے زمین سے انڈے کی مانند سفید اور گول پتھر اٹھایا، اسے دیو کو تھما کر کہا کہ تم اس کو اپنے ہاتھ میں دبا کر اس میں سے پانی نکالو۔ دیو نے پورا زور لگایا اور پتھر ریزہ ریزہ ہوا مگر پانی نہ نکلا۔ ریتو نے کہا کہ تم میں بس اتنا ہی زور تھا صرف پتھر توڑ سکے۔ اس سے پانی نہیں نکال سکے۔ دیو نے کہا کہ اب تم پتھر سے پانی نکال کر دکھاؤ تاکہ میں تمہاری طاقت دیکھ سکوں۔ ریتو نے کہا کہ چلو سامنے والے درخت کے سائے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ آرام بھی کر لو گے اور میری طاقت کا تماشا بھی دیکھ لو گے۔

گھر سے نکلتے وقت ریتو نے مرغی کا ایک انڈہ بھی ساتھ لیا تھا، جو ابھی تک اس کی جیب میں پڑا تھا۔ اس نے پتھر کی جگہ جیب سے انڈا نکالا اور اسے زور سے دبایا۔ انڈہ ٹوٹا تو اس کا سارا مواد باہر نکل آیا - ریتو نے دیو سے کہا دیکھو پتھر سے پانی نکل آیا۔ پانی، دیو نے حیران ہو کر کہا۔ بے شک تم بہت طاقتور ہو۔ اس کے بعد دونوں آگے چل پڑے۔ جب وہ دیوؤں کے ملک پہنچے تو سردار دیو نے سب دیوؤں سے ریتو کا تعارف کرایا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ بہت طاقتور نوجوان ہے۔ اس کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑو۔ اس کا ہر حکم بجالاؤ۔ اگر کسی نے اس کے ساتھ گستاخی کی تو تم سب کو تباہ کر دے گا۔ وہ دیوؤں کے ساتھ رہنے لگا۔ سارے دیو اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔

ایک دن سب دیو جمع ہو کر شکار کے لیے نکلے۔ جاتے وقت انہوں نے ریتو سے کہا کہ ہم واپس آئیں گے تو بہت تھک چکے ہوں گے تم صرف جلانے کی لکڑی کا انتظام لینا تاکہ واپس آ کر ہمیں شکار کا گوشت پکانے

میں آسانی ہو۔ ایک دیو نے اسے اس کمرے کے بارے میں بتایا جہاں رسی پڑی تھی۔ سارے دیو شکار کے لیے جنگل کی طرف نکل گئے۔ ریتو گھر میں اکیلا رہ گیا۔ وہ کچھ دیر کے بعد اس کمرے میں چلا گیا جہاں لکڑیاں لانے کی رسی پڑی تھی۔ رسی دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہوئے کہ اتنی موٹی اور بھاری تھی جو اس سے پوری طرح اٹھائی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد وہ رسی کے ایک سرے کو کھینچتے کھینچتے جنگل تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ باری باری سب درختوں کے گرد رسی لپیٹنے لگا۔ جب دیو شکار سے واپس لوٹ آئے تو انھیں نہ تو گھر میں جلانے کی لکڑی نظر آئی اور نہ ہی ریتو۔ اس لیے چند دیو اس کا پتہ کرنے جنگل کو گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ریتو سو ڈیڑھ سو درختوں کے گرد رسی لپیٹ چکا تھا اور مزید درختوں کو باندھنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ انہوں نے یہ تماشا دیکھا تو ریتو سے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے، اس نے کہا کہ میں نے سوچا کہ تم کو روزانہ جنگل سے تھوڑی تھوڑی لکڑیاں کاٹ کر گھر لے جانے میں تکلیف اٹھانا پڑتی ہے، اس لیے میں آج ہی اس پورے جنگل کو رسی میں باندھ کر تمھارے گھر کیوں نہ لے جاؤں تا کہ عمر بھر تمھیں پھر یہ زحمت نہ اٹھانا پڑے۔ یہ سن کر دیوؤں کو فکر لاحق ہوئی ہمارا گھر تو بہت چھوٹا ہے اس میں اتنی زیادہ لکڑی سمونے کی گنجائش نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارا گھر لکڑی کے بوجھ تلے آ کر منہدم نہ ہو جائے۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر ریتو سے درخواست کی کہ صرف اتنی لکڑی اٹھا کر لے آؤ جو آج کا کھانا پکانے کے لیے کافی ہو۔ ریتو نے غصے میں آ کر کہا کہ لوگ مجھے اتنی تھوڑی سی چیز اٹھاتے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے یہ بات تو میری شان کے خلاف ہے یا تو پورا جنگل لے کر جاؤں گا یا پھر ایک تنکا بھی لے کے نہیں لے جاؤں گا۔ دیوؤں نے یہ بات مان لی۔ وہ خود ضرورت کے مطابق لکڑی اکٹھی کر کے لے گئے۔ اس طرح ریتو یہ بازی بھی اپنی چالاکی کی وجہ سے جیت گیا۔

وقت گذرتا گیا ایک دن دیوؤں نے اسے کنوئیں سے پانی لانے کو کہا جو گھر سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ ریتو پانی لینے گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ڈول کی بجائے بہت بڑا ڈرم کنوئیں کے کنارے پڑا ہے۔ وہ ڈرم کو دیکھ گھبرا گیا۔ ڈرم اتنا بھاری تھا کہ اسے بھر کر کنویں سے پانی باہر نکال لانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ کنویں کے کنارے بیٹھ کر سوچ میں ڈوب گیا۔ جب دیر ہوئی تو دیو وہاں آ گئے اور اس سے اب تک پانی نہ نکالنے کی وجہ پوچھی۔ ریتو نے فوراً جواب دیا میں کنویں کی گہرائی کا اندازہ لگا رہا تھا اب تم ذرا ہٹو۔ میں اس کنویں کو جڑ سے اکھاڑ کر تمھارے گھر لے کر چلتا ہوں تا کہ تمھیں آئے روز یہاں آنے کی مصیبت سے چھٹکارہ مل جائے۔ یہ سن کر دیوؤں نے کہا کہ خدارا ایسا نہ کرنا۔ اس سے ہمارے گھر کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ پانی کنویں سے ہم خود بھر

کر لے جائیں گے۔ ریتو نے ان کی بات مانی اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ جب دیوؤں کے سردار کو معلوم ہوا تو اس نے سب کو ڈانٹا اور سختی سے تاکید کی کہ آئندہ اس کی اجازت کے بغیر ریتو کو کسی کام کے لیے نہ کہا جائے۔

ریتو کو مکان میں الگ کمرہ دیا گیا تھا۔ ایک دن وہ اپنے کمرے میں موجود تھا کہ اس نے ساتھ والے کمرے میں دیوؤں کو آپس میں کھسر پھسر کرتے سنا۔ اس نے کان لگا کر انکی باتیں غور سے سنیں۔ وہ اس کی خدمت سے تنگ آ کر اس سے جان چھڑانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دیو نے تجویز پیش کی کہ رات کی تاریکی میں ہم ڈنڈے لے کر ریتو کو اتنا ماریں گے کہ اس کی ہڈی پسلی ایک ہو جائے۔ اس طرح وہ مر جائے گا اور ہماری گلوخلاصی ہو جائے گی۔ ریتو نے یہ سب باتیں سن لیں۔ جب رات ہوئی تو ریتو نے اپنی چارپائی میں ایک بڑے سائز کی لکڑی رکھی اور اسے چادر سے ڈھانپ کر خود کمرے کے ایک کونے میں چھپ گیا۔ رات کی تاریکی میں جب دیو ہاتھوں میں ڈنڈے لے کر اس کے کمرے میں گھس آئے تو انہوں نے ریتو کی چارپائی پر لگاتار ڈنڈے برسانا شروع کیے، یہاں تک کہ چارپائی کا بازو بھی ٹوٹ گیا - جب انہیں ریتو کی موت کا یقین ہو گیا تو وہ واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان کو یہ گماں تک نہ تھا کہ ریتو زندہ سلامت ہے۔ ان کے جانے بعد ریتو اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹ گیا۔ صبح جب دیو نیند سے بیدار ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ریتو ان سے پہلے جاگ چکا ہے۔ وہ ریتو کو زندہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ سب نے ریتو سے پوچھا کہ رات خیریت سے گزری، اس نے کہا کہ رات تو اچھی گزری لیکن رات کو مچھر بہت زیادہ تھے مچھروں نے رات اسے کئی جگہ کاٹا ہے معلوم نہیں رات چارپائی کو کیا ہو گیا ہے جب پہلو بدلا، تو پتہ چلا کہ چارپائی کا ایک بازو بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگوں نے مجھے اتنی کمزور چارپائی کیوں دی ہے یہ سن کر دیو حیران ہوئے اور دل ہی دل میں کہا کہ یہ تو عجیب قسم کی بلا ہے۔ جب دیو کے سردار کو اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے سب دیوؤں کو بلا کر سخت سست کہا اور انہیں بتایا کہ اگر ریتو کو تمھاری ان شرارتوں کا پتہ چل جاتا تو وہ تم سب کو نیست و نابود کر دیتا۔

ایک دن اس نے ریتو کو بلا کر اسے کہا کہ اب تک تم ہمارے علاقے کی کافی سیر کر چکے، اب تم اپنے وطن واپس جا سکتے ہو۔ جاتے وقت سردار دیو نے ریتو کو بہت سارا مال و دولت دیا اور ایک دیو بھی اس کے حوالے کیا تاکہ بقیہ عمر اس کی خدمت کرے۔ ریتو مال و دولت سمیٹنے کے بعد دیو کو ساتھ لے کر خوشی خوشی واپس اپنے وطن

لوٹ آیا۔ ایک دن وہ اور اس کی ماں ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے تھے، اسی اثناء میں خدمت گار دیو بھی وہاں گھس آیا۔ دیو نے اچانک ایک زوردار چھینک ماری، ہوا کے زور سے ماں اور بیٹا دونوں اڑ کر چھت کے شہتیر کے ساتھ لٹک گئے۔ دیو نے کہا یہ تم کیا کر رہے ہو۔ ریتو نے کہا کہ میں شہتیر نکال کر تمھاری مرمت کرنا چاہتا ہوں۔ دیو یہ سن کر ڈر کے مارے جنگل کی طرف بھاگنے لگا۔ راستے میں اس کو ایک گیدڑ نے دیکھا تو اس نے دیو سے تیز بھاگنے کی وجہ دریافت کی اور کچھ وقت کے لیے اپنے ہاں قیام کرنے کو کہا۔ دیو نے کہا کہ میں لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ اگر ریتو کو پتہ چلا تو میری چمڑی ادھیڑ دے گا۔ گیدڑ یہ سن کر حیران ہوا اور اس سے کہا، عجیب بات ہے تم ایک بڑے طاقتور دیو ہو اور ریتو جیسے چھوٹے اور کمزور آدمی سے ڈرتے ہو۔ میں گیدڑ ہوں، پچھلے دنوں وہ اس راستے سے گزر رہا تھا۔ میں نے ایک زوردار چیخ ماری تو وہ ڈر کر بھاگ نکلا۔ آؤ ہم دونوں جا کر اس کی اچھی طرح خبر لیں۔ دیو نے جواب دیا، مجھے تجھ پر اعتبار نہیں ایسا نہ ہو کہ تم مجھے وہاں اکیلے چھوڑ کر خود بھاگ جاؤ۔ گیدڑ نے کہا کہ اگر مجھ پر بھروسہ نہیں تو ایک رسی لے کر اس کا ایک سرا میں اپنے کمر سے لپیٹ کر خود کو باندھ لوں گا اور دوسرا سرا تمھاری کمر سے۔ دیو نے جواب دیا، یہ بالکل ٹھیک ہے۔ گیدڑ نے رسی لے کر اس طرح کیا اور دونوں ریتو کے گھر کی جانب چل پڑے۔

ریتو اپنے گھر کے باہر بیٹھا تھا۔ اس نے دور سے دونوں کو ایک رسی میں بندھا ہوا دیکھا تو اسے شک گزرا کہ گیدڑ اس کے خلاف ضرور کوئی سازش کر بیٹھا ہے۔ شاید دونوں مجھے مارنے کے لیے آ رہے ہیں۔ فوراً اسے ایک بات سوجھی، وہ دونوں جب ذرا قریب ہوئے تو ریتو نے پورے زور سے آواز دے کر کہا، اے گیدڑ میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ تین چار دیو پکڑ کر لے آؤ۔ تم میرے لیے صرف ایک دیو پکڑ کر لائے ہو۔ اب نہ تیری خیر ہے نہ اس دیو کی۔ دیو سخت گھبرایا اور بہت تیزی سے جنگل کی طرف بھاگنے لگا گیدڑ نے چیخ چیخ کر اسے رکنے کو کہا مگر دیو تھا کہ بھاگتا ہی جا رہا تھا آخر گیدڑ بے چارہ گھسٹتے گھسٹتے مر گیا اور ریتو کی تدبیر اور حاضر دماغی سے اس کی اور اس کی ماں کی جان محفوظ ہوئی۔

(پشتو لوک کہانی)

☆☆☆☆

اشرف سہیل

پنجابی سے ترجمہ: **اختر رضا سلیمی**

کوؤں کی اصلی بولی

یہ بہت پرانی بات ہے۔ ایک جنگل میں پرندے اور جانور اکٹھے رہتے تھے۔ اگرچہ جنگل سب کی ضرورتیں پوری کرتا تھا مگر کچھ ناشکرے پرندے اور جانور اُس سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ اتنے آرام پرست ہو گئے تھے کہ اب انہیں جنگل اچھا ہی نہیں لگتا تھا۔ ان میں سے کچھ نے تو جنگل کو خیر باد کہہ دیا تھا۔

جنگل سے ایک دریا بھی گذرتا تھا، جس کے کنارے کہیں تنگ اور کہیں چوڑے ہو جاتے تھے۔ دریا کے کنارے اُگے اونچے درختوں پر کوؤں کے گھونسلے تھے۔ دریا کے کنارے زیادہ تر کوّے ہی دکھائی دیتے تھے۔ ان دنوں کوؤں کے رنگ کالے نہیں ہوا کرتے تھے، بلکہ اُن کا رنگ عام جنگلی کبوتروں کی طرح تھا۔ اُن کی بولی بھی اس وقت ”کاں کاں“ نہیں ہوتی تھی بلکہ اُن کی آواز بہت میٹھی اور بلبل کی طرح سُریلی ہوتی تھی۔ اُن کے درمیان اتفاق بھی بہت تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جنگلی پرندوں کا راجا ”موز“ کوؤں کی بہت عزت کرتا تھا۔

پرندوں میں سے صرف کوّے ہی اتفاق سے رہتے تھے اور ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کوؤں کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اُن دنوں کوؤں کی عمریں بھی بہت طویل ہوتی تھیں اور وہ اپنے سے طاقت ور پرندوں کا شکار بھی بہت کم بنتے تھے۔

ایک موٹا تازہ کوا جس کا نام ”گھوگھل کوا“ تھا، اُسے انہوں نے اپنا سردار چُن لیا تھا۔ جب بھی جنگلی جانوروں کی کوئی کانفرنس ہوتی گھوگل کوا ہی، کوؤں کی نمائندگی کرتا۔ گھوگل اپنی جسامت کے لحاظ سے باز جیسا دکھائی دیتا تھا اور اُس کی چونچ بھی بہت بڑی تھی۔ دریا کا پانی سردیوں میں انتہائی کم ہو جاتا تھا جبکہ گرمیوں میں وہ اپنے پورے جوبن کے ساتھ جنگل سے گذرتا تھا۔ یہی دریا جنگل کے باشندوں کی ضرورتیں پوری کرتا تھا چاہے وہ درخت ہوں، پرندے ہوں یا جانور۔ ہاتھی تو یہاں آ کر خوب ایک دوسرے پر پانی پھینکتے اور مزے اُڑاتے۔ پرندوں نے بھی پانی کی سہولت کے پیشِ نظر کنارے پر موجود درختوں پر بسیرا کر رکھا تھا۔

سردیاں شروع ہوتے ہی دوسرے ملکوں سے پرندوں کی آمد شروع ہو جاتی۔ وہ یہاں دو تین مہینے

گزارتے اور گرمیاں شروع ہوتے ہی واپس اپنے وطن چلے جاتے۔ ان میں زیادہ تر ہنس ہی ہوتے۔

اِن غیر ملکی پرندوں کے ساتھ گھوگل کی بڑی یاری تھی۔ وہ ہر سال انہیں خوش آمدید کہتا اور انہیں کھانے کے لیے چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اور دیگر کیڑے مکوڑے پیش کرتا۔ گھوگل کو سفید ہنس بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ اُن کے خوبصورت اور ملائم پروں پر رشک کرتا تھا۔ پروں کے ساتھ ساتھ اُن کی زبان بھی اسے خوب لبھاتی تھی۔
(حالاں کہ اس کی وجہ ہنسوں کا اخلاق تھا)

اب کی بار جب غیر ملکی ہنس دریا پر آئے تو وہ باقی کوؤں کو ساتھ لے کر انہیں خوش آمدید کہنے دریا پر گیا۔ سب کوؤں نے مل کر ان مہمان پرندوں کی خوب خدمت کی۔ گھوگل نے تو ان ہنسوں کی زبان بھی تھوڑی بہت سیکھ لی تھی۔ ہنسوں نے گھوگل کو اپنی زبان میں باتیں کرتے سنا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ گھوگل ہنسوں کی زبان میں بات کر کے دوسرے کوؤں پر اپنا رعب بھی جھاڑتا تھا۔ گھوگل کی دیکھا دیکھی سارے کوے ہنسوں کی زبان بولنے لگے۔ یوں کوؤں نے اپنی سریلی زبان کا گلہ خود ہی گھونٹ دیا۔

آہستہ آہستہ یہ خبر سارے جنگل میں پھیل گئی کہ کوؤں نے اپنی سریلی زبان چھوڑ کر غیر ملکی پرندوں کی زبان بولنا شروع کر دی ہے۔ جب یہ خبر جنگل کے سردار راجا مور تک پہنچی تو اس نے گھوگل کو بلا بھیجا۔ گھوگل باقی کوؤں کو لے کر راجا مور کے دربار میں حاضر ہوا اور اپنی زبان کے بجائے ہنسوں کی زبان میں راجا سے نہ صرف مخاطب ہوا بلکہ ہنسوں کی زبان کی تعریف بھی کی۔ راجا مور سخت غصّے میں آ گیا۔ اُس نے فوراً کوؤں کو جنگل سے نکالنے کا حکم دے دیا اور گھوگل سے کہا جو لوگ اپنی ماں بولی چھوڑ دیتے ہیں وہ کسی کے دوست نہیں ہوتے۔

کوے جنگل چھوڑ کر بہت دور انسانی آبادی میں آ گئے۔ کیوں کہ جنگل کے تمام پرندے اُن سے نفرت کرنے لگے تھے۔ کوے اس نفرت کا سبب جانتے تھے۔ انہیں خبر تھی کہ اُن کی اپنی زبان چھن جانے کے باعث اُن کی پہچان ہی گم ہو گئی ہے۔

کوے، جنگلی پرندوں کے اس رویے کی وجہ سے چڑچڑے پن کا شکار ہو گئے اور وہ جنگل کی بجائے انسانی آبادیوں میں رہنے لگے۔ یہاں بھی کوئی اُن کے ساتھ محبت سے پیش نہیں آتا تھا۔ الٹا سب ان سے نفرت ہی کرتے تھے۔ اب انہیں وہ دن یاد آتے، جب وہ فخر سے سارے جنگل میں گھومتے پھرتے اور اپنی من مانیاں کرتے تھے جب کہ جنگل کے اکثر پنچھی صرف اپنے علاقوں تک محدود رہتے تھے۔ کوے کو اُن دنوں

جنگل کا سب سے عزت والا پرندہ مانا جاتا تھا اور ان کی اپنی نسل سے محبت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ اپنی زبان چھوڑنے کے بعد اُن کا رنگ بھی آہستہ آہستہ کالا ہوتا گیا اور پھر اُن کی زبان بھی ''کاں کاں'' تک محدود ہو گئی۔ اب کوؤں کی نئی نسل دوسروں سے پوچھتی پھرتی ہے کہ اُن کے بڑوں کی اپنی بھی کوئی زبان تھی؟ لیکن کوئی انہیں بتانے والا نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اب کوے جنگلوں میں نہیں رہتے۔ اب وہ شہروں اور دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ البتہ اُن کے بڑوں کی ایک عادت اب بھی اُن میں موجود ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں سے پیار کرتے ہیں۔ جہاں بھی وہ کسی کوے کو مصیبت میں دیکھتے ہیں، فوراً اُس کی مدد کو آ پہنچتے ہیں۔

پیارے بچو! کہیں تم بھی گھوگل کی طرح اپنی مادری زبان کو بُرا تو نہیں سمجھنے لگے ہو؟

☆☆☆☆

الیاس گھمن

دُھول

سکول جاتے ہوئے فرید کو اردگرد کے مناظر صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہر سُو خاکستری دُھند کا راج تھا۔ “مگر دُھند کہاں سے آئی؟ موسم سرما تو کب کا گُزر گیا۔” اُس نے سوچا۔ اس کے ساتھ ہی فرید کو اپنی سانسوں کے ساتھ اندر جا رہی مٹی کا بھی احساس ہوا۔ اُسے یاد آیا کہ علی الصبح جب وہ اپنے بستے میں کتابیں ڈال رہا تھا تو اُسے متعدد بار اپنی کتابوں کو جھاڑنا پڑا تھا، کیونکہ اُن پہ گرد جمی ہوئی تھی۔ فرید نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی تو اُسے سڑک کے دونوں طرف لگے بڑے بڑے درخت بھی پہلے جیسے سرسبز نہ لگے۔ وہ سکول پہنچا تو اُسے یہ دیکھ کر ہنسی آ گئی کہ بہت سے لڑکوں کے چہروں پہ گَرد کا اچھا خاصا پوڈر لگا ہوا تھا۔ ایک بار تو خیال آیا کہ ضرور وہ تمام طالب علم آج گھروں سے غُسل کر کے نہیں آئے۔ ایک ساتھی نے فرید کے اپنے چہرے پہ پڑی گرد کا مذاق اُڑایا تو اُسے اصل بات کی سمجھ آئی۔ اُس جیسے وہ سبھی طلباء جو مختلف ذرائع آمدورفت کو استعمال کرتے ہوئے شہر کی گلیوں اور سڑکوں پہ لمبا سفر کر کے سکول پہنچے تھے، اُن کے جسم اور کپڑے گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ اُس وقت تمام لڑکے شہر میں ہر طرف اُڑ رہی دُھول کی بابت ہی باتیں کر رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا؛ سرکاری محکموں نے جس طرح اندھا دُھند شہر کی گلیاں اور سڑکیں کھود ڈالی ہیں، یہ گرد وہاں سے اُڑی ہے، کسی نے اپنے باپ کا حوالہ دے کر کہا کہ شہر میں دُھول کا طوفان آنے کی وجہ عرصہ دراز سے بارش کا ایک قطرہ بھی نہ برسنا ہے۔

پہلا پیریڈ تاریخ وجغرافیہ کا تھا۔ کلاس روم میں آنے والے اُستاد صاحب اپنے جیبی رومال سے کُرسی صاف کرتے ہوئے ناگواری ظاہر کرتے بولے؛

“توبہ میری توبہ، ہر طرف دُھول ہی دُھول”۔

اپنا لیکچر شروع کرنے سے پہلے اُستاد صاحب فرید اور اُس کے ہم جماعتوں کو گرد وغبار کے نقصانات کے متعلق بتاتے رہے۔ پھر وہ پڑھانے لگے تو تاریخ کے اوراق میں لگے دُھول کے سیاہ کارنامے طلبا کے سامنے آنے لگے۔ اُنہوں نے کہا ٹیکسلا، ہڑپا اور موئن جو دڑو جیسے قدیم شہر مٹی کے ٹیلوں کی کھدائی کرنے سے

دریافت ہوئے۔ یہ پرانی تہذیبیں ایسے دفن ہو گئیں کہ اُس دور کے باشندوں کے رسم و رواج، رسم الخط بلکہ اُن کی زبان پہ بھی دُھول کی دبیز تہیں جمتی چلی گئیں۔ اِسی لیے تو آج تک اِن آثارِ قدیمہ سے برآمد ہوئی مُہروں کو پڑھا نہیں جا سکا۔۔۔۔۔ اب آگے دیکھو! یہ اُڑتی خاک کیا نئے چاند چڑھاتی ہے۔

ماسٹر صاحب کی باتیں سُن کر تمام طُلبا کو چُپ سی لگ گئی لیکن سب سے زیادہ فکر فرید کو ہو رہی تھی۔ چُھٹی کے بعد سکول سے واپس جاتے ہوئے فرید نے دیکھا کہ شہر کی تمام نئی اور نارنجی عمارتیں گرد و غبار سے اَٹی ہوئی ہیں اور راستے میں آنے والے باغ باغیچے اور بازار اُجڑے اُجڑے سے نظر آ رہے ہیں۔ وہ بُڑبُڑایا؛

”اِس منحوس دُھول نے تو تمام بستی کا حُسن ہی برباد کر کے رکھ دیا ہے۔“

فرید گھر پُہنچا تو اُسے میز پر کھانا سجاتے ہوئے امی جان دکھائی دیں۔ وہ کھانا کھانے میں مصروف ہوا تو امی جان بڑے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ کھانا کھا کر فرید بھی اُس ڈرائینگ روم میں آیا تو اُسے امی جان وہاں صفائی کرتے ہوئے نظر آئیں۔ پچھلے پہر اُنہیں جھاڑ پُونچھ کرتے دیکھ کر فرید کو زیادہ حیرانی نہ ہوئی، وہ دُھول کے حملوں سے جو واقف ہو گیا تھا۔ اِسی اثنا میں اُس کی نگاہ دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی فریم شدہ پُرانی تصویروں پر پڑی۔ اِن میں سے چند ایک کو ہی وہ جانتا تھا۔ اُس کے اُن آبا و اجداد کی تصاویر تھیں جو اُس کی پیدائش سے بھی برسوں پہلے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ کُچھ اور تصویروں میں نظر آنے والی ہستیوں کے ساتھ اپنے رِشتے کا اُسے قطعاً علم نہیں تھا اور نہ ہی اُن کے متعلق کبھی کسی نے فرید کو کُچھ بتایا تھا۔ پھر بھی اُسے وہ نورانی چہرے اچھے لگتے تھے۔ فرید نے دیکھا کہ اُن پُرانی تصاویر کے خد و خال گرد کی موٹی تہہ کے نیچے دُھندلا گئے تھے۔ اُس نے آگے بڑھ کر ایک طرف رکھی صافی اُٹھائی اور کُرسی کو گھسیٹ کر اُس دیوار کے قریب لے گیا۔ کُرسی پہ کھڑے ہو کر اُس نے ایک تصویر کے شیشے کو پُونچھنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر اُسے پریشانی لاحق ہو گئی کہ صاف ہونے کی بجائے شیشہ مزید میلا ہو گیا تھا۔

”تم جِس صافی کے ساتھ تصویر صاف کر رہے ہو یہ تو خود دُھول سے اَٹی پڑی ہے۔۔۔۔۔“

فرید کو اپنی کمر کے پیچھے سے امی جان کی آواز سُنائی دی تو وہ بہت شرمندہ ہوا۔ کُچھ سوچ کر اُس نے اپنی جیب میں سے صاف سُتھرا رومال نکالا اور اُس کا ایک کونا اُس شیشے پہ رگڑنے لگا۔ فرید نے دیکھا کہ رومال کا وہ ایک کونا تو اب میلا ہو گیا تھا مگر وہ جدھر جدھر بھی رگڑا گیا تھا وہاں سے تصویر کے شیشے کو صاف کر گیا تھا۔ فرید کے چہرے پہ ایک چمک سی آ گئی اور امی جان کی جانب سے روکے جانے کے باوجود بھی اُس نے رومال کے

ساتھ ہی وہ سارا شیشہ صاف کر دیا۔ صاف کپڑا لے کر ایسے ہی اُس نے باقی کی تصویروں کے شیشے بھی صاف کر دیئے۔

اِنگلش میڈیم سکول میں پڑھنے والے دِیگر بچوں کی طرح فرید کے لیے بھی مقامی رسم الخط کو پڑھنا کافی دُشوار تھا۔ اِس لیے اِن تصاویر کے نیچے لکھے نام وہ پہلے نہیں پڑھ سکا تھا یا کبھی ایسا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ آج پتہ نہیں کیسے وہ یہ مُشکل بھی حل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک نام تو بالکل اُس کے نام جیسا ہی تھا...... بابا فریدؒ۔ باقی شخصیتوں کے نام بھی حرف جوڑ جوڑ کر اُس نے پڑھ ہی لیے۔ سلطان باہوؒ، شاہ حُسینؒ، بُلھے شاہؒ، وارث شاہؒ، میاں محمد بخشؒ، خواجہ فریدؒ...... ہر نام کے ساتھ فرید کو اپنائیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ تصویروں پہ اَٹی گرد کی تہیں صاف ہوئیں تو فرید کو لگا جیسے اِن نورانی چہروں سے پُھوٹ پُھوٹ نکل رہی روشنی کی کرنوں سے اُس کا دِل و دماغ روشن ہو گیا ہو۔ اِس کے بعد تو فرید پر جیسا ایک جنون سا طاری ہو گیا، اِن مقدس ہستیوں اور اِن کے کارناموں کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا جنون۔ اپنے ابو کی کتابوں کی الماری سے لے کر سکول کی لائبریری تک جو بھی کتاب اُسے میسّر ہوئی وہ پڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ رات گئے تک اپنا لیپ ٹاپ کھول کر پنجابی زبان کے اِن مُحسنوں کے متعلق وہ تحقیق کرتا رہتا۔

آج پھر فرید اپنے ڈرائنگ روم میں آیا تو اُس کا انداز بدلا بدلا تھا۔ اب اُس نے مُصمم ارادہ کر لیا کہ وہ نا صرف اِن تصاویر کو دُھندلا ہونے سے بچائے گا بلکہ اِن صوفیاء سے جُڑی زبان و تہذیب کو بھی حملہ آور ثقافت کی دُھول سے بچا کر رکھے گا۔

پنجابی کہانی ''دُھوڑ'' کا ترجمہ

☆☆☆☆

فرخندہ لودھی

اُردو ترجمہ: خالد مصطفیٰ

خوبصورت پرندہ

سردیوں کا موسم تھا اور چھوٹے چھوٹے دن تھے۔ ایک چھوٹی سی لڑکی، جس کو سارے پیار سے مُنّی مُنّی کہتے تھے، ایک دن اپنے باغ میں اکیلی کھیل رہی تھی۔ کھیلتے کھیلتے دوپہر ہوگئی۔ اُسے اپنی امّی کے پاس جانے کا خیال تک نہ آیا کیونکہ باغ میں رنگ برنگے پُھول کھلے ہوئے تھے، نرم نرم دُھوپ تھی، پیاری پیاری ہوا چل رہی تھی، بس دل کرتا تھا کہ نرم گھاس پر لیٹ کر سو جائیں۔ وہ تھک گئی تھی تو تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گئی۔ سوچا ذرا آرام کرلوں پھر سوجاؤں گی۔ وہ آرام سے لیٹے ہوئے نیلے صاف ستھرے آسمان کو دیکھنے لگ گئی۔ آسمان کتنا خوبصورت تھا۔ رب نے کتنی اچھی اچھی پیاری پیاری چیزیں بنائی ہیں۔ نیلا آسمان، ہرے بھرے درخت، لال لال پھول، موتی بکھیرتا فوارہ، گیت گاتی چڑیاں، فاختائیں، بلبلیں......اللہ جی۔ آپ ہمارے ساتھ کتنا پیار کرتے ہیں۔ اللہ جی......اللہ جی آپ کتنے اچھے ہیں۔

اتنی دیر میں ایک پرندہ بالکل اُسی درخت کے اوپر آ بیٹھا جس کے نیچے مُنّی لیٹی ہوئی تھی۔ مُنّی پرندے کے نیلے رنگوں کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کسی پرندے کے پروں میں نیلے رنگ کے اتنے منظر ہوتے ہیں، اس کو آج تک پتہ نہ تھا۔ پرندہ پروں کو پھیلا کر اڑا اور دوسرے درخت پر بیٹھ گیا۔ اس کے پھیلے ہوئے پروں کے بیچ رنگوں کی دھاریاں سی تھیں۔ مُنّی بہت خوش ہوئی، اس کا دل کیا کہ وہ اس پرندے کا ایک پر لے لے۔ مُنّی پرندے کے نزدیک گئی اور بڑی محبت سے پوچھا۔ پیارے پرندے تمہارا نام کیا ہے؟ پرندے نے خوشی سے پر پھیلائے اور جواب دیا۔ میرا نام......؟ میرا نام جان کر کیا کروگی؟ ''تم اتنے خوبصورت ہو، تمہارا نام بھی خوبصورت سا ہوگا'' اس بات سے پرندہ بہت خوش ہوا اور کہا! میرا نام......میرا نام نیل کنٹھ ہے......تمہارا نام؟ مجھے سب پیار سے مُنّی کہتے ہیں۔ اچھا پیاری مُنّی خوش رہو میں تو اپنے گھر چلتا ہوں۔ یہ کہہ کر نیل کنٹھ اڑنے ہی لگا تھا کہ مُنّی چیخ کر بولی۔ کیا ہی اچھا ہو اگر میرے پاس تیرا ایک پَر ہو۔ تیرا خوبصورت پَر جب میں اپنی سہیلیوں کو اور امّی، باجی کو دکھاؤں گی تو وہ کتنی حیران ہوں گی۔ مجھے تم بہت پیارے لگتے ہو نیل کنٹھ۔

نیل کنٹھ نے کہا منّی تجھے میرے رنگین پَر اتنے خوبصورت لگتے ہیں ایک پَر لے کے کیا کرو گی میرے ساتھ میرے گھر چل میں تمہیں بہت سارے پَر دوں گا تم سب میں تقسیم کر دینا اور کچھ اپنے پاس رکھ لینا۔ منّی کو ویسے بھی سیر کا شوق تھا جلدی سے نیل کنٹھ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئی لیکن بولی: پیارے نیل کنٹھ! میرے تو پَر ہی نہیں، میں کس طرح اُڑ کے تمہارے ساتھ جا سکتی ہوں۔ تم آسمانوں پر اڑنے والے، میں زمین پر چلنے والی …… یہ تو مشکل ہوگا اور مجھے تیرے گھر کا راستہ بھی معلوم نہیں۔ نیل کنٹھ نے کہا: نہیں منّی دل چھوٹا نہ کر چلو ایک ترکیب کرتے ہیں میں تیرے سر کے اوپر اڑتا جاؤں گا تم زمین پر میرے ساتھ ساتھ چلتی جانا۔ میں جدھر جدھر مڑوں، مڑتی جانا جہاں جہاں سے میں گذروں گذرتی جانا۔۔۔ ٹھیک۔ منّی نے زور سے ہاں میں سر ہلایا اور کہا بہت اچھا نیل کنٹھ تم اڑو میں چلوں اور وہ دونوں نیل کنٹھ کے گھر کی طرف چل پڑے۔ منّی اپنے سر کے اوپر اڑتے پرندے کی طرف دیکھتی آسمان کی طرف منہ کیے چلی جا رہی تھی۔ چلتی گئی چلتی گئی راستے میں شہر آئے، گاؤں آئے، کھیت آئے، میدان آئے، دریا آئے، جنگل آئے، پہاڑ آئے لیکن منّی اپنے سر کے اوپر دیکھتی چلی گئی، نیل کنٹھ کے پیچھے پیچھے یہاں تک کہ شام ہونے لگ گئی۔ دن کا تیسرا پہر ہو گیا۔ اب منّی کو زور کی پیاس لگی اس نے آواز دے کر کہا: نیل کنٹھ، نیل کنٹھ، مجھے پیاس لگی ہے۔ نیل کنٹھ اڑتے اڑتے بولا: میرا گھر تھوڑی دور ہے تمہیں ٹھنڈے میٹھے چشمے کا پانی پلاؤں گا۔ منّی پھر چلنے لگی۔ کافی دور جا کر منّی دوبارہ رک گئی اور ہانپتے ہوئے بولی: پیارے پرندے! اب مجھ سے چلا نہیں جاتا، بہت تھک گئی ہوں۔ نیل کنٹھ نے کہا گھر جا کر تمہیں پکے پکے سیب کھلاؤں گا۔ بس تم چلتی رہو۔

اب نیل کنٹھ کا گھر نزدیک آ گیا۔ نیل کنٹھ نے اسے نیلے پَر دیے، جو منّی نے اپنی جھولی میں بھر لیے۔ پھر وہ اسے ٹھنڈے میٹھے چشمے پر لے گیا، جس کے صاف پانی کے اوپر سیبوں سے لدی ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ منّی نے اپنے ہاتھوں سے لال لال پکے پکے سیب توڑے اور پیٹ بھر کے کھائے اور جی بھر کے پانی پیا۔ بھوک ختم ہوئی پیٹ بھرا نظریں گھما کر دیکھا تو چاروں طرف اندھیرا تھا۔ شام ہو گئی تھی رات ہونے والی تھی۔ اب منّی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ امّی اور ابّو یاد آئے۔ گھر یاد آیا۔ منہ بگاڑ کے رونے لگی تو نیل کنٹھ پاس ہی سے بولا: کیوں منّی کیا بات ہے سیب میٹھے نہیں تھے۔ منّی آنکھیں ملتی ہوئی رو پڑی میں نے گھر جانا ہے۔ گھر تو بہت پیچھے رہ گیا منّی۔ رات ہونے والی ہے کیسے جاؤ گی۔ نیل کنٹھ نے کہا۔ منّی نے چیخ کے کہا تم مجھے لے کر آئے ہو تم ہی مجھے واپس چھوڑ کے آؤ۔ مجھے تیرے گھر کا راستہ معلوم نہیں پرندے نے جواب

دیا۔ تم مجھے لائے کیوں تھے؟ تم بغیر سوچے بغیر پوچھے آئی کیوں تھی؟ نیل کنٹھ نے کہا۔ منّی زور زور سے رونے لگی۔ میں کیا کروں ہائے امّی ہائے ابّو۔ منّی کی امی نے اسے یوں روتے دیکھا تو اسے اٹھا کر سینے کے ساتھ لگالیا اور پیار کرتے ہوئے پوچھا۔ کیا ہوا منّی میری جان؟

اصل قصہ یہ تھا کہ منّی باغ میں دیر تک کھیلتے کھیلتے سوگئی تھی۔ سوتے سوتے خواب دیکھنے لگی۔ امّی نے اسے زمین کے اوپر سوتا دیکھا تو اٹھا کر کمرے میں لے گئی اور پلنگ کے اوپر لٹا دیا، لیکن منّی خواب دیکھتی رہی۔ نیل کنٹھ نے جب اسے گھر پہنچانے سے نہ کردی تو وہ رونے چیخنے لگی کہ اب کیا ہوگا۔ اب کہاں جاؤں۔ ہائے امّی ہائے ابّو۔ منّی کی جب آنکھ کھلی اور اچھی طرح ہوش آیا تو امّی نے بتایا کہ وہ خواب میں ڈر گئی ہے۔ منّی نے دل ہی دل میں سوچا اللہ میاں! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے، یہ خواب تھا حقیقت نہیں تھی۔

☆☆☆☆

فرخندہ لودھی

پنجابی سے ترجمہ: اختر رضا سلیمی

بانسری والا

یہ اُس وقت کی بات ہے جب لوگوں کو تعلیم کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ قادر کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی اور اُس نے قرآن مجید کے علاوہ کوئی کتاب دیکھی تک نہیں تھی۔

قادر اپنے باپ کے ساتھ ڈھور ڈنگر بیلے میں لے جاتا اور پرندوں کے گیت اور جانوروں کی آوازیں سنتا، گرمیوں کی لمبی دوپہریں درختوں کے سائے تلے گزارنا مشکل ہو جاتا۔ اُس کا سارا علم اُن دو چار کہانیوں تک محدود تھا، جو اُس نے اپنے بڑے بزرگوں سے سن رکھی تھیں۔ ایک بار وہ اپنے ابا کے ساتھ میلہ دیکھنے گیا تو وہ حیران رہ گیا۔ اُس نے سوچا

"دنیا اتنی وسیع ہے۔"

اُس نے وہاں سے ایک بانسری خرید لی، جسے وہ روز بجایا کرتا مگر کب تک؟ آخر وہ اس سے بھی اُکتا گیا۔

اُس کا باپ تو محض ایک چرواہا تھا۔ بھیڑ بکریاں اور ڈھور ڈنگر پالتا اور اُن کا دودھ وغیرہ بیچ کر گھر چلاتا۔ وقت گزرتا چلا گیا، کچھ عرصے بعد بانسری دوبارہ اُس کے ہاتھ لگ گئی اور اُس نے اُسے دوبارہ بجانا شروع کر دیا۔ وہ بانسری سے مست نئے سُر نکالتا۔

گرمیوں کی ایک دوپہر، قادر کی بھینسیں ندی میں تیر رہی تھیں اور وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بانسری بجانے میں مشغول ہو گیا۔ وقت گذرنے کا اُسے احساس ہی نہ ہوا۔ اچانک اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو ایک اجنبی گھڑ سوار کھڑا تھا۔

"شاباش بھئی شاباش۔ تم تو بہت اچھی بانسری بجاتے ہو۔"

گھڑ سوار نے کہا اور ساتھ ہی پوچھنے لگا۔

"میرے ساتھ شہر چلو تو تمہیں بہت اچھی نوکری بھی مل جائے گی اور اپنے فن میں بہتری لانے کا بھی

موقع۔ کیا خیال ہے؟''

''نہیں نہیں بانسری تو میں اپنے ذوق کی تسکین کے لیے بجاتا ہوں۔ پیسے تو دودھ بیچ کر بھی کمائے جا سکتے ہیں۔'' قادر نے کہا۔

رفتہ رفتہ بانسری بجانے کے فن میں اُس کی مہارت کا چرچا دور دور تک پھیل گیا۔ اُس کے گاؤں والے بھی چاہتے تھے کہ قادر شہر جا کر اپنے فن کا مظاہرہ کر کے اپنے گاؤں کا نام روشن کرے۔ آخر کار قادر مان گیا۔

شہر جا کر اُس نے بانسری بجانے کے فن میں مزید مہارت حاصل کی اور مشہور فنکار بن گیا۔ اُس کے گاؤں والے نہ صرف اِس بات پر خوش ہیں بلکہ قادر پر فخر بھی کرتے ہیں۔

☆☆☆☆

زاہد حسن

سات پریوں کی کہانی

کسی گاؤں میں ایک غریب کسان رہتا تھا۔ غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر ایک روز اس نے شہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی بیوی نے اسے سات روٹیاں پکا کر دیں جنھیں اس نے ایک دستر خوان میں باندھا اور شہر چل پڑا۔ کئی گھنٹے مسلسل چلتے رہنے کی وجہ سے وہ تھک گیا تھا اس لیے وہ ایک اندھے کنوئیں کے پاس پہنچ کر آرام کرنے کے لیے رک گیا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اسے بھوک ستانے لگی تو اس نے اپنا دستر خوان نکال کر سامنے رکھ لیا اور اپنے آپ سے کہنے لگا۔

'' ایک کھاؤں دو کھاؤں تین کھاؤں یا ساتوں کی سات کھا جاؤں'

جس اندھے کنوئیں کے قریب وہ بیٹھا ہوا تھا اس کنوئیں میں سات پریاں رہتی تھیں۔ انھوں نے جب کسان کی باتیں سنیں تو سمجھیں کہ وہ ان سے مخاطب ہے۔

ایک پری بولی:

یہ تو کوئی عجیب مخلوق ہے جو پریاں کھاتی ہے۔

دوسری نے کہا:

اب اس سے جان کیسے چھڑائیں؟

آپس میں گفتگو کرنے کے بعد وہ سب اس نتیجے پر پہنچیں کہ سب سے بڑی پری اوپر جائے اور اسے کہے کہ اسے جو لینا ہے وہ لے اور ہماری جان چھوڑے۔

سب سے بڑی پری اوپر آ گئی اور کسان سے کہنے لگی:

تم ہم سے جو بھی مانگو گے ہم تمھیں دیں گے مگر خدا کے لیے ہمیں کھانا مت۔

پری کو دیکھ کر پہلے تو کسان ڈر گیا تھا مگر جب اس نے پری کی باتیں سنی تو وہ بھی شیر بن گیا اور اسے کہنے لگا:

تمھیں میں صرف اس شرط پر چھوڑ سکتا ہوں کہ تم مجھے سونے کا انڈا دینے والی مرغی لا دو۔

پری اسے فوراً سونے کا انڈہ دینے والی مرغی لا دیتی ہے اور کہتی ہے:

تم مرغی کو اپنے سامنے رکھ کر کہنا، چل مرغی اپنا کارنامہ دکھا تو یہ اپنا کارنامہ دکھا دے گی۔

کسان مرغی لے کر خوشی خوشی واپس اپنے گاؤں کی طرف چل پڑا۔

وہ گاؤں سے چوں کہ بہت دور آ چکا تھا اس لیے راستے ہی میں رات ہو گئی اور اس نے سوچا کہ کہیں کوئی اس سے مرغی ہی نہ چھین لے اس لیے اس نے قریبی گاؤں میں پہنچ کر ایک مکان کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔

اس مکان میں ایک بڑھیا رہتی تھی۔ جب کسان نے اس سے گھر رہنے کی اجازت مانگی تو بڑھیا نے اسے اپنے گھر رکھ لیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد جب وہ سونے کے لیے اپنے اپنے بستر پر لیٹے تو کسان نے بڑھیا کو اپنی مرغی کے کارناموں کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

کسان بڑھیا کو مرغی کا راز بتا کر خود تو سو گیا مگر بڑھیا جاگتی رہی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ کسان اب سو چکا ہے تو اس نے سونے کے انڈے دینے والی مرغی چھپا دی اور بالکل ویسی ہی مرغی لا کر اس کی جگہ پر رکھ دی۔

دوسرے روز جب کسان سو کر اٹھا تو اس نے بڑھیا کا شکریہ ادا کیا اور مرغی لے کر اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ جب وہ گھر پہنچا تو بیوی سے کہنے لگا آج میں ایک بڑا ہی نایاب تحفہ لایا ہوں۔

تو مجھے بھی وہ نایاب تحفہ دکھا۔ اس کی بیوی نے کہا

کسان اب مرغی کو اپنے سامنے رکھ کر بیٹھ گیا اور بولا:

چل اپنا کارنامہ دکھا!

اب وہاں سونے کا انڈہ دینے والی مرغی ہوتی تو اپنا کارنامہ بھی دکھاتی۔ جب اس کی مرغی نے سونے کا انڈہ نہ دیا تو اس کی بیوی اسے کہنے لگی:

تیرا تو بس دماغ خراب ہو گیا ہے، بھلا کبھی مرغی نے بھی سونے کے انڈے دیے ہیں۔

کسان نے اسے یقین دلانے کی بہت کوشش کی مگر اس کی بیوی نہ مانی۔

دوسرے روز کسان پھر اسی کنوئیں پر جا پہنچا اور کہنے لگا:

ایک کھاؤں، دو کھاؤں تین کھاؤں یا ساتوں کی سات ہی کھا جاؤں!

اس کی آواز سن کر پریوں کو بہت غصہ آیا کہ وہ پھر آ گیا ہے۔ سب سے بڑی بہن کنوئیں سے باہر نکلی اور کسان سے کہنے لگی:

اے لالچی انسان! تجھے ہم نے اس قدر قیمتی تحفہ دیا تھا مگر تمھاری حرص پھر بھی ختم نہیں ہوئی اور تم آج پھر آ

گئے ہو۔

کسان نے پری کی بات سن کر کہا:

تم نے میرے ساتھ فریب کیا ہے۔ مجھے ایک عام سی مرغی دے کر کہا کہ یہ سونے کے انڈے دیتی ہے۔

پری بہت سمجھدار تھی اس نے کسان سے پوچھا کہ وہ راستے میں کسی کے گھر رکا تو نہیں تھا۔

کسان نے اسے بڑھیا کے گھر ٹھہرنے والی بات بتا دی۔ پری نے سوچا کہ ضرور اسی بڑھیا نے سونے کا انڈہ دینے والی مرغی کسان سے چرائی ہوگی۔

پری نے اب کی بار کسان کو چھڑی لا کر دی اور اسے کہا کہ اس چھڑی کو لے کر پھر اسی بڑھیا کے گھر جاؤ اور اس سے اپنی مرغی واپس مانگو۔ اگر بڑھیا مرغی واپس کر دے تو بہت اچھا اور اگر وہ مرغی واپس نہ دے تو تم کہنا چل میرے ڈنڈے اپنا کمال دکھا۔ اور چھڑی اپنا کمال دکھانا شروع کر دے گی۔ جب بڑھیا تمھیں مرغی واپس دینے کے لیے راضی ہو جائے تو کہنا:

رک جا اب ڈنڈے۔

کسان چھڑی لے کر پھر اسی بڑھیا کے گھر پہنچ گیا اور اس سے اپنی مرغی کی واپسی کا مطالبہ کرنے لگا۔

جب بڑھیا نے مرغی کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو کسان نے کہا:

چل میرے ڈنڈے اپنا کمال دکھا!

کسان نے یہ بات کہی ہی تھی کہ ڈنڈا بڑھیا پر برسنا شروع ہو گیا۔ بڑھیا بہت چیخی چلائی مگر کسان بالکل خاموش رہا اور چارپائی پر بیٹھ کر اس کا تماشہ دیکھنے لگا۔

آخر بڑھیا کب تک ڈنڈے کی چوٹیں برداشت کرتی کچھ ہی دیر بعد وہ کسان سے کہنے لگی کہ اپنے ڈنڈے کو روکو، تمھاری مرغی میں ابھی واپس دیتی ہوں۔ یہ سن کر کسان نے کہا:

رک جا اب ڈنڈے!

اور ڈنڈے نے برسنا ختم کر دیا۔ بڑھیا نے کسان کو اس کی مرغی واپس کر دی اور وہ اسے ساتھ لیے اپنے گھر چلا گیا۔ گھر پہنچ کر جب کسان نے بیوی کو مرغی کے کارنامے دکھائے تو وہ بہت حیران ہوئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے کسان بہت امیر بن گیا اور وہ میاں بیوی ہنسی خوشی اسی گاؤں میں زندگی بسر کرنے لگے۔

(پنجابی لوک کہانی)

☆☆☆☆

زاہد حسن

نیک بادشاہ اور چڑیل ملکہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی بادشاہ کی چھ بیویاں تھیں۔ بادشاہ اپنی سبھی بیویوں کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ اسے اگر کوئی دکھ تھا تو وہ یہ کہ اس کی کسی بیوی سے بھی کوئی اولاد نہ تھی۔

ایک روز بادشاہ شکار کے لیے جنگل میں گیا ہوا تھا کہ وہاں اس کی ملاقات ایک انتہائی خوبصورت عورت سے ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی بادشاہ اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے اس حسینہ سے پوچھا کہ کیا وہ اس سے شادی کرے گی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بادشاہ اسے اپنے ساتھ محل میں لے آیا اور اس سے شادی کر لی۔

بادشاہ کو اپنی اس ساتویں بیوی کے بارے میں کچھ باتوں کا بالکل علم نہ تھا۔

پہلی بات تو یہ کہ وہ ایک چڑیل تھی۔

دوسری یہ کہ اسے گھوڑے کا گوشت کھانے کی عادت تھی۔

سو، ہر رات جب محل کے سبھی مکین سو جاتے تو وہ گھوڑوں کے اصطبل سے چھ گھوڑے کھول لاتی اور مزے لے لے کر کھاتی۔

گھوڑوں کے یوں اچانک غائب ہو جانے کی خبر بادشاہ تک بھی جا پہنچی تو اس نے اصطبل کے باہر پہرہ لگا دیا۔

مگر اس کے باوجود گھوڑے غائب ہوتے رہے، کیوں کہ چڑیل ملکہ اپنے جادو کے ذریعے خود کو غائب کر لیتی، اور وہاں سے چھ گھوڑے اڑا لاتی۔

بادشاہ کے اصطبل میں دن بدن گھوڑوں کی تعداد میں کمی آنا شروع ہو گئی اور گھوڑے چرانے والے کا کوئی اَتا پتہ نہیں چل رہا تھا۔

باوجود اس کے کہ بادشاہ چڑیل ملکہ سے بہت محبت کرتا تھا لیکن وہ دوسری ملکاؤں سے جلتی تھی۔ گھوڑوں کے غائب ہونے کی وجہ سے بادشاہ اکثر پریشان رہتا تھا۔ اس کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے چڑیل ملکہ نے ایک پلان بنایا کہ کس طرح وہ دوسری ملکاؤں سے اپنا پیچھا چھڑا سکتی ہے۔

ایک رات جب اس نے پھر اصطبل سے چھ گھوڑے چرائے تو انھیں کھانے کے بعد اس نے ان کی ہڈیاں ان چھ ملکاؤں کی چارپائیوں کے نیچے رکھ دیں اور گھوڑوں کے خون سے ان کے ہونٹ رنگ دیے۔

دوسرے روز سویرے وہ بادشاہ کو اپنے ساتھ لیے ان ملکاؤں کے کمرے میں جا پہنچی اور ان کے ہونٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بادشاہ سے کہنے لگی:

اب پتہ چلا کہ اصطبل سے گھوڑے کہاں جاتے ہیں، ذرا دیکھو تو ان کے ہونٹ، ابھی تک ان پر بیچارے گھوڑوں کا خون جما ہوا ہے۔ پھر اس نے ان کی چارپائیوں کے نیچے اشارہ کیا اور بولی:

یہ رہیں گھوڑوں کی ہڈیاں۔

جب بادشاہ نے چارپائیوں کے نیچے ہڈیاں اور ان کے ہونٹوں پر خون دیکھا تو اپنے ایک سپاہی کو بلا کر کہا کہ وہ انھیں جنگل میں لے جا کر ہلاک کر دے۔

جب سپاہی پانچ ملکاؤں کو ہلاک کر چکا تو چھٹی ملکہ بولی:

مجھے مت مارو، بادشاہ نہیں جانتا کہ میں حاملہ ہوں اور میرے پیٹ میں اس کا بچہ پل رہا ہے۔

مگر سپاہی نے کہا کہ اسے بادشاہ کی طرف سے سب کو مارنے کا حکم ملا ہے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کی اپنی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

سپاہی کی بات سن کر چھٹی ملکہ نے کچھ اس طرح التجا کی کہ سپاہی کے دل میں رحم آ گیا اور اس نے اسے چھوڑ دیا۔ ملکہ تشکر سے سپاہی کے قدموں میں گر پڑی اور اس سے وعدہ کیا کہ وہ یہاں سے اتنی دور چلی جائے گی کہ بادشاہ کو کبھی بھی اس بات کی خبر نہ ہو پائے گی کہ وہ ابھی زندہ ہے۔

چلتے چلتے ملکہ ایک دریا پر پہنچ گئی۔ وہ تھکی ہاری چلے جا رہی تھی کہ اس کی نظر دریا کے کنارے لال رنگ کے چمکیلے پتھروں پر پڑی۔ اس نے ایک پتھر اٹھا لیا اور اپنے سفر کو جاری رکھا۔ جب وہ ایک دوسرے ملک کی حدود میں پہنچ گئی تو اسے علی نام کا ایک آدمی ملا۔ ملکہ نے جب اسے اپنی درد بھری داستان سنائی تو وہ بولا۔

''میں ایک شادی شدہ مرد ہوں، اگر تم چاہو تو بہن بن کر میرے گھر میں رہ سکتی ہو؟''

ملکہ نے اس کی پیش کش خوشی کے ساتھ قبول کر لی اور اس کے گھر میں رہنے لگی۔ کچھ ہی مہینوں بعد خدا نے اسے ایک چاند سا بیٹا دیا۔

ملکہ کو علی کے گھر رہتے ہوئے پندرہ برس بیت گئے اور پھر اچانک اس ملک میں قحط پھیل گیا۔ لوگ دانے

دانے کوتر سنے لگے۔ ایک دن ملکہ علی کو اپنے پاس بلا کر کہنے لگی:

اس لال پتھر کو لے کر میرے ملک جاؤ اور بادشاہ کو یہ پتھر تحفہ کے طور پر پیش کرو۔

ملکہ کے کہنے پر علی اس کے ملک کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب اس نے بادشاہ کی خدمت میں پتھر پیش کیا تو وہ بہت خوش ہوا کیوں کہ بادشاہ پتھر کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ ایک قیمتی لعل ہے۔ علی کو پتھر کے عوض انعام میں بادشاہ نے ایک صد سونے کی اشرفیاں دیں، اور اسے کہا کہ وہ کچھ روز ان کے مہمان خانے میں رکے۔ علی وہاں رک گیا۔ کچھ روز کے بعد بادشاہ نے اسے اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ اس نے وہ پتھر کہاں سے حاصل کیا ہے علی نے بتایا کہ اس کی بہن نے دیا تھا۔ اس کی بات سن کر بادشاہ کہنے لگا:

مجھے بالکل ایسے ہی چھ پتھر اور چاہئیں، اگر تم جلد ہی ایسے پتھر نہ لا سکے تو تمھیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

بادشاہ کی بات سن کر علی واپس اپنے وطن کو لوٹ گیا اور اپنی منہ بولی بہن کو سارا قصہ سنایا۔

ملکہ نے اپنے بیٹے کو بلا کر اس دریا کا پتہ بتایا جہاں اسے وہ لعل ملا تھا اور کہا کہ وہاں سے چھ لال رنگ کے پتھر اٹھا لائے۔ شاہزادہ گھوڑے پر سوار ہو کر ماں کے بتائے ہوئے راستے پر روانہ ہو گیا۔

جب وہ دریا پر پہنچا تو کچھ ہی دیر بعد اسے لال رنگت کے پتھر دکھائی دیے۔ وہ پتھر اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اس کی نظر خون کے ان قطروں پر پڑی جو دریا میں گر رہے تھے شہزادہ یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ جو قطرے دریا کے پانی میں گر رہے تھے وہ پانی میں شامل ہوتے ہی پانی کا رنگ اختیار کر جاتے اور جو قطرے پانی سے باہر گرتے وہ لال رنگ کے پتھر بن جاتے۔

جس جگہ پر شہزادہ بیٹھا ہوا تھا وہاں قریب ہی ایک محل بھی تھا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اس محل کی طرف چل پڑا۔

جب وہ محل میں داخل ہوا تو وہ بالکل خالی تھا۔ شہزادہ اب ایک ایک کمرے میں جا کر دیکھنے لگا۔ جب وہ محل کے آخری کمرے میں پہنچا تو اسے وہاں چارپائی پر لیٹی ہوئی ایک عورت نظر آئی، دور سے دیکھنے سے یوں لگتا تھا جیسے کہ وہ سو رہی ہے۔ شہزادے نے جب کچھ اور قریب جا کر دیکھا تو اسے پتہ چلا کہ عورت کا سر اس کے دھڑ سے جدا ہے اور اس کی گردن سے خون بہہ رہا ہے۔ شہزادہ حیرانی سے ابھی یہ منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ

اچانک اسے یوں لگا جیسے محل میں زلزلہ آ گیا ہو اور اس کمرے میں جہاں وہ کھڑا تھا دھواں بھرنے لگا۔ یہ دیکھ کر شہزادہ ڈر گیا اور فوراً ایک دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ کچھ لمحوں کے بعد جب اس نے دروازے کی اوٹ سے جھانکا تو اس نے دیکھا کہ اس دھویں کے بادل سے ایک بھیانک جن نمودار ہوا جس کا چہرہ آنکھوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ جن سیدھا ایک الماری کے پاس گیا اور وہاں سے کریم کی شیشی نکال کر اس عورت کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے کریم عورت کی گردن پر لگائی اور اس کا سر دوبارہ اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ ایسا کرنے سے عورت فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی کچھ دیر اس کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد جن نے پھر اس کا سر اس کے دھڑ سے جدا کیا اور وہاں سے غائب ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی شہزادے نے الماری کا دروازہ کھول کر کریم کی شیشی نکالی۔ جب اس نے وہ کریم اس عورت کی گردن پر لگا کر اس کا سر اپنی جگہ پر رکھا تو وہ عورت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جب شہزادے نے پوچھا کہ وہ عورت کون ہے تو وہ بولی:

میں ایک ملک کی شہزادی ہوں، اور جن نے مجھے یہاں قید کر رکھا ہے۔ وہ روزانہ میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے باتیں کرنے کے بعد میرا سر دھڑ سے جدا کر کے پھر کہیں چلا جاتا ہے۔ اسے ڈر ہے کہ میں کہیں اس کی غیر حاضری میں بھاگ نہ جاؤں۔

''میں اس جن کو جان سے مار دوں گا'' شہزادی کی باتیں سننے کے بعد شہزادہ بولا۔

اسے کوئی بھی نہیں مار سکتا، کیوں کہ اس کی جان اس کے بدن میں نہیں ہے'' شہزادی نے کہا۔

تو پھر بتاؤ کہ اس کی جان کس چیز میں ہے؟ شہزادے نے پوچھا۔

''یہاں سے بہت دور ایک درخت ہے جس کی ہر شاخ پر سینکڑوں زہریلے سانپ ہر وقت اپنا پھن پھیلائے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس درخت کی چوٹی پر ایک پنجرہ لٹک رہا ہے جس میں ایک طوطا قید ہے۔ بس اسی طوطے میں جن کی جان ہے۔ تم اگر اس طوطے کو مار دو تو جن خود بخود مر جائے گا، شہزادی نے بتایا۔

اس کی باتیں سن کر شہزادہ فوراً وہاں سے اس درخت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کئی دن کی تلاش کے بعد شہزادہ آخر اس مقام پر پہنچ ہی گیا جہاں وہ درخت تھا۔ جب شہزادہ درخت کی طرف بڑھنے لگا تو سبھی سانپوں نے پھن پھیلا لیے۔ شہزادے نے بھی میان سے اپنی تلوار نکال لی اور اسے لہراتے ہوئے سانپوں پر حملہ کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے درخت کے نیچے سانپوں کا ڈھیر لگ گیا، مگر سانپ ختم ہونے ہی میں نہ آتے تھے شہزادے کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک سانپ کے خاتمے پر دو نئے سانپ کہیں سے آ نکلتے ہیں۔ بہت دیر

سانپوں سے لڑنے کے بعد آخر کار وہ تمام سانپوں کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اب اس کا راستہ صاف تھا اور وہ درخت پر چڑھنے لگا۔ جب اس نے طوطے کو پکڑنے کے لیے پنجرے میں ہاتھ ڈالا تو طوطا بہت پھڑ پھڑایا، مگر اب شہزادہ اسے کہاں چھوڑنے والا تھا۔ اس نے طوطے کو گردن سے دبوچا اور ایک ہی جھٹکے سے گردن کو اس کے دھڑ سے جدا کر دیا۔ طوطے کا دم نکلتے ہی جن کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر شہزادہ سیدھا محل میں پہنچا، شہزادی کی گردن پر کریم لگا کر اسے دوبارہ زندہ کیا اور اسے اپنے ساتھ لیے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب وہ گھر پہنچا تو اسے خیال آیا کہ وہ اپنے ساتھ لال پتھر لانا تو بھول ہی گیا ہے۔ جب اس نے اس بات کا ذکر علی سے کیا تو شہزادی بولی:

”آپ کسی برتن میں پانی بھر لائیے اور مجھے ایک چاقو بھی دے دیجیے، وہ لال رنگ کے پتھر آپ کو یہیں مل جائیں گے۔

علی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے چاقو اور ایک برتن میں پانی بھر کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ شہزادی نے چاقو سے اپنی انگلی پر نشتر لگایا اور انگلی کو پانی کے برتن کے اوپر رکھ دیا۔ جب اس کے خون کے قطرے پانی میں گرے تو وہ انتہائی خوبصورت لال رنگ کے پتھروں کی شکل اختیار کر گئے۔

علی نے ان میں سے چھ پتھر اٹھائے اور بادشاہ کے محل کی طرف روانہ ہو گا۔

بادشاہ ان پتھروں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور علی کو دل کھول کر انعامات سے نوازا۔

چڑیل ملکہ بھی اب سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ ان پتھروں کو پا کر بہت خوش ہوئی ہے، مگر حقیقی خوشی اسے تب نصیب ہو گی جب وہ شخص جو میرے لیے لعل لے کر آیا ہے مجھے وہ سات رنگ پھول بھی لا کر دے جن کی مہک میں سات خوشبوئیں پائی جاتی ہیں۔

بادشاہ نے علی کو بلا کر ملکہ کی فرمائش سنائی اور کہا کہ اگر وہ ان پھولوں کو حاصل کرنے میں ناکام رہا تو اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

علی نے گھر پہنچ کر بادشاہ کی نئی فرمائش کے بارے میں سب کو بتا دیا۔

بادشاہ نے کچھ بتایا بھی ہے کہ وہ پھول کہاں سے سے ملیں گے؟ ملکہ اور شہزادی نے یک زبان ہو کر پوچھا۔ اور علی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

مگر میں یہ جانتی ہوں کہ وہ پھول کہاں سے ملیں گے، شہزادی نے کہا۔ وہ پھول میری خالہ زاد بہن کے پاس ہیں۔ اس کا نام گلبدن ہے، اور جب وہ ہنستی ہے تو وہ پھول اس کے منہ سے گرتے ہیں۔ اسے بھی میری طرح کوئی جن اٹھا کر کوہ قاف کے پہاڑوں کے پیچھے لے گیا ہے۔

میں یہاں شہزادی کو اس کی قید سے آزاد کروانے آیا ہوں، مجھے جن کا کوئی خوف نہیں۔ شہزادے نے کہا۔

شہزادہ ابھی یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ جن بھی وہاں پہنچا۔ شہزادہ فوراً بڑھیا کی ہنڈیا کے پیچھے چھپ گیا۔

جن اپنی ناک کو اوپر اٹھا کر بڑھیا سے مخاطب ہوا۔

"آدم بو، آدم بو"

یہاں میرے علاوہ تو اور کوئی بھی نہیں تم مجھے ہی کھالو۔ بڑھیا نے کہا۔

مگر جن نے تو اسے اپنے لیے کھانا پکانے کے لیے قید کر رکھا تھا، اسے بھلا وہ کیسے کھا سکتا تھا۔ اس لیے وہ بڑھیا کی بات سُن کر خاموشی سے کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ اس نے ابھی پہلا ہی نوالہ لیا تھا کہ شہزادہ اچھل کر ہنڈیا کے پیچھے سے سامنے آ گیا اور اپنی تلوار نکال کر ایک ہی وار میں جن کا سر اس کے دھڑ سے جدا کر دیا۔

اس کے بعد شہزادہ غار میں گھس گیا اور شہزادی گلبدن کو اپنے ساتھ لے کر واپس اپنے وطن کو روانہ ہو گیا۔

جب وہ گھر پہنچے تو انھیں دیکھ کر سبھی بہت خوش ہوئے۔ شہزادی گلبدن کی نظریں اپنی خالہ زاد بہن پر پڑیں تو ہنستے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ جب وہ ہنسی تو اس کے منہ سے پھول جھڑنا شروع ہو گئے۔ علی نے وہ سارے پھول چن لیے اور جا کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیے۔

بادشاہ نے وہ پھول لے جا کر چڑیل ملکہ کو دیے اور علی سے کہا کہ وہ کچھ روز اس کے مہمان خانہ ہی میں ٹھہرے۔

چڑیل ملکہ نے بادشاہ پر یہی ظاہر کیا کہ وہ پھولوں کو پا کر بہت خوش ہوئی ہے، مگر دوسرے روز وہ اس سے کہنے لگی:

"لگتا ہے آپ کا آدمی ہر کام کر سکتا ہے، اسے کہیے کہ اب وہ میرے لیے ایسا موتی لائے جس پر گھوڑے کی تصویر بنی ہو۔ اگر وہ موتی حاصل کرنے میں ناکام ہو جائے تو اس کا سر قلم کروا دیجیے۔

بادشاہ نے اگلے روز علی کو پھر اپنے پاس بلوایا اور اسے وہ موتی لانے کا حکم سُنایا جس کی فرمائش چڑیل ملکہ

نے کی تھی۔ علی جب واپس گھر آیا تو بہت دکھی تھا۔ اس نے نہ تو کچھ کھایا اور نہ ہی کسی سے کوئی بات کی۔ بس چپ چاپ جا کر ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کو یوں خاموش دیکھ کر سبھی پریشان ہو گئے اور اس سے اس کی خاموشی کی وجہ پوچھنے لگے۔ علی نے انھیں بادشاہ کی نئی فرمائش کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

بادشاہ نے کوئی نشانی بھی بتائی ہے کہ وہ موتی کہاں سے ملے گا، شہزادے نے پوچھا؟

اس نے صرف یہ کہا کہ اگر ایک سال کے اندر اندر میں وہ موتی حاصل نہ کر سکا تو وہ میرے علاوہ میرے سارے خاندان کا بھی سر کٹوا دے گا، علی نے جواب دیا۔

شہزادی گلبدن ان کی بات بڑے غور سے سن رہی تھی۔ جب علی نے اپنی بات ختم کی تو وہ بولی:

یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ جب میں جن کی قید میں تھی تو میں نے وہاں ایک ایسے بزرگ کے بارے میں سُنا تھا جو زندگی کے سبھی رازوں سے آشنا ہے۔ تم اگر اس کے پاس پہنچ جاؤ تو وہ ضرور تمھاری مدد کرے گا۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ وہ بزرگ سال کے چھ مہینے سوتے اور چھ مہینے خدا کی عبادت میں گزارتے ہیں۔ میں نے ان کے سونے اور جاگنے کے موسموں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی مگر خدا کے لیے اگر وہ تمھیں سوئے ہوئے ملیں تو انھیں مت جگانا۔

شہزادے نے ضروریات سفر کا سامان باندھا اور سب کو الوداع کہہ کر ایک بار پھر سے کوہ قاف کی سمت روانہ ہو گیا۔

سات دن اور سات راتیں مسلسل سفر کرنے کے بعد آخر کار شہزادہ اس مقام پر پہنچ ہی گیا جہاں وہ بزرگ رہتے تھے۔ جب شہزادہ وہاں پہنچا تو وہ بزرگ گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ اسے شہزادی گلبدن کی ہدایت یاد تھی کہ سوئے ہوئے بزرگ کو ہرگز نہ جگائے۔

شہزادہ اس کی جھونپڑی میں ٹھہر گیا۔ وہ دن رات بزرگ کے پاؤں دباتا اور جب اسے بھوک لگتی تو جنگل سے شکار کر لاتا اور اس سے اپنی بھوک مٹاتا۔ ایک روز جب وہ شکار سے واپس لوٹا تو اسے بزرگ عبادت میں مصروف نظر آئے۔ یہ دیکھ کر شہزادہ خوشی سے جھوم اٹھا اور اپنے گھوڑے سے اتر کر بزرگ کے قدموں میں آ بیٹھا۔

بزرگ تین دن اور تین راتیں عبادت میں مصروف رہے۔ اس کے بعد انھوں نے آنکھیں کھول کر شہزادے کی طرف دیکھا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے

”بول بچے تو کیا چاہتا ہے، کون سی مشکل آپڑی ہے کہ تجھے اتنی دور میرے پاس آنا پڑا۔؟“

شہزادے نے احترام سے بزرگ کے ہاتھ چومے اور کہا:

آپ تو سبھی راز جانتے ہیں، بھلا مجھ جیسا غریب آپ سے کچھ مانگنے کی جسارت کیسے کرسکتا ہے۔

خود کو غریب مت کہو، بزرگ نے کہا۔ تم اس بادشاہ ہی کے بیٹے ہو جس نے تمھیں موت کے منہ میں بھیجا ہے۔ مگر تمھاری طرح وہ بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

اس کے بعد بزرگ نے شہزادے کو ساری کہانی سنائی کہ کس طرح بادشاہ نے ایک چڑیل کے ساتھ شادی رچائی اور کس طرح اس چڑیل نے اس کی ماں کو اپنے راستے سے ہٹایا۔

اور اب پھر اس چڑیل نے اپنے جادو کا جال بچھایا ہے۔ بزرگ نے کہا۔ وہ یہ بات جان چکی ہے کہ تم اور تمھاری ماں علی کے پاس رہ رہے ہو اور وہ اس قسم کے ناممکن کاموں پر بھیج کر آپ سب کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتی ہے۔

بزرگ کی باتیں سن کر شہزادے کا خون کھول اٹھا اور وہ بولا:

”چڑیل کو اس کے کیے کی سزا ضرور ملے گی“ یہ کہہ کر شہزادہ اٹھا اور بزرگ سے جانے کی اجازت مانگنے لگا۔

مگر بزرگ نے اسے روکتے ہوئے کہا:

میری باتیں غور سے سنو۔ جس طرح تم نے میری خدمت کی ہے اس کی مجھے بہت خوشی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس چڑیل کو قتل کرنا چاہتے ہو، مگر اس موتی کو حاصل کیے بغیر تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ کہہ کر بزرگ نے شہزادے کو ایک چھڑی اور ایک پتھر دیا اور کہا:

ان چیزوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور انھیں سنبھال کر رکھنا۔ تم مشرق کی طرف منہ کر کے اپنے سفر کا آغاز کرو۔

نو دن کے سفر کے بعد تم ایک سیاہ دریا پر پہنچو گے۔ تم اس دریا کے ساتھ ساتھ تب تک چلتے رہنا جب تک تم ایک درختوں کے جھنڈ تک نہیں پہنچ جاتے۔ اس جھنڈ کے پیچھے تمھیں ایک بڑا لال رنگ کا پتھر نظر آئے گا۔ تم خدا کا نام لے کر یہ پتھر اس لال رنگ کے پتھر پر پھینکنا تو وہ اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا، اور اس کے نیچے ایک اژدھا نظر آئے گا جس کے ایک ہزار منہ ہوں گے۔ تم اس چھڑی کی مدد سے اس کا سب سے بڑا منہ کھول

دینا، وہاں وہ موتی ملے گا جسے حاصل کرنے کے لیے چڑیل ملکہ نے تمھیں یہاں بھیجا ہے۔ تم اس موتی کو میرے پاس لے آنا اور اس کے بعد جو کرنا ہے وہ تمھیں میں بعد میں بتاؤں گا۔

شہزادے نے بزرگ کو الوداع کہا اور مشرق کی طرف روانہ ہوگیا۔

وہ بزرگ کی ہدایت پر عمل کرتا رہا اور ٹھیک اٹھارہ دنوں کے بعد اس نے وہ موتی لا کر بزرگ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ موتی کو دیکھ کر بزرگ نے کہا:

اب کی بار علی کی جگہ تم خود بادشاہ کے پاس جانا ۔ جب وہ تم سے موتی مانگے تو کہنا کہ پہلے وہ تمھاری کہانی سن لے۔ وہ کہانی سنانے کی اجازت دے دے گا اور تم اسے وہ کہانی سنانا جو میں نے تمھیں سنائی تھی، یہ کہہ کر بزرگ نے شہزادے کو موتی کا راز بتا دیا۔

شہزادے نے بزرگ کے ہاتھ چومے اور ان سے موتی لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

جب وہ گھر پہنچا تو اسے دیکھ کر سبھی نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس سے اس کے سفر کے بارے میں پوچھا۔

شہزادے نے انھیں سب کچھ بتا دیا، وہ بھی جو اس پر سفر میں بیتی تھی اور جو باتیں اسے بزرگ نے بتائی تھیں۔

پھر اس نے اپنی ماں سے پوچھا کہ اس نے ساری عمر کیوں اسے حقیقت سے بے خبر رکھا تھا۔ اس کی ماں نے اسے اپنے اس وعدے کی یاد دلائی جو اس نے بادشاہ کے اس سپاہی سے کیا تھا جس نے اسے زندہ چھوڑ دیا تھا۔

”اس کی ماں نے اپنی آدھی عمر غربت اور مصیبتوں میں کاٹی، اور چڑیل محل میں مزے اڑاتی رہی ۔ اب وقت آگیا ہے کہ چڑیل کو اس کے گناہوں کی سزا دی جائے ۔“ شہزادے نے کہا اور بادشاہ سے ملنے کے لیے محل کی طرف چل پڑا۔

تو علی نے تجھے بھیجا ہے ۔ کیا تم موتی بھی لائے ہو، بادشاہ نے شہزادے کو دیکھ کر کہا۔

شہزادے نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کہا:

موتی بھی آپ کو مل جائے گا، مگر اس سے پہلے میں آپ کو ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں:

ہاں ۔ ہاں کیوں نہیں، تم ضرور کہانی سناؤ، بادشاہ نے کہا۔

اور شہزادے نے شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی سنا دی۔ اس کی کہانی سن کر بادشاہ کا رنگ یوں سفید ہوگیا جیسے کسی نے اس کے بدن سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

یہ کہانی تمھیں کس نے سنائی ہے؟ بادشاہ نے پوچھا۔

میری ماں نے، شہزادے نے جواب دیا۔

میں تمھاری بات پر کس طرح یقین کرلوں کہ میری ملکہ دراصل ایک چڑیل ہے، بادشاہ نے کہا

شہزادے نے اپنی جیب سے موتی نکالا اور اسے بادشاہ کو دکھاتے ہوئے بولا:

یہ ہے وہ موتی جسے حاصل کرنے کی چڑیل ملکہ نے خواہش کی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس طرح وہ ہمیں اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائے گی، مگر اب اس کی زندگی میرے ہاتھوں میں ہے۔ اور یہ رہا آپ کا ثبوت۔ یہ کہہ کر شہزادے نے موتی کو فرش پر رکھ دیا اور اسے اپنی ایڑی سے اس زور سے رگڑا کہ موتی چور چور ہو گیا۔ اس کے بعد وہ بولا:

اب جائیے چڑیل ملکہ کے کمرے میں، آپ کو میری بات کی صداقت کا خود ہی یقین آ جائے گا۔

بادشاہ بھاگتا ہوا چڑیل ملکہ کے کمرے میں پہنچا۔ وہاں چڑیل ملکہ اپنے آخری سانس لے رہی تھی۔ اس کا چہرہ تو پہلے ہی کی طرح حسین تھا مگر اس کا بدن اب ایک گھوڑے کے بدن میں تبدیل ہو چکا تھا۔

یہ دیکھ کر بادشاہ سب کچھ سمجھ گیا اور وہ اپنے بیٹے سے گلے ملنے کے لیے اس کمرے کی طرف دوڑا جہاں وہ شہزادے کو چھوڑ کر گیا تھا۔ مگر شہزادہ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی جا چکا تھا۔ جاتے وقت اس نے سپاہیوں کو یہ پیغام بھی دے دیا تھا کہ وہ جلد ہی واپس لوٹ کر آئے گا۔

شہزادے نے اپنا وعدہ یاد رکھا، مگر اب کی بار وہ اکیلا نہیں آیا، بلکہ اس کی ماں، علی، شہزادی گلبدن اور اس کی خالہ زاد بہن بھی اس کے ساتھ تھیں۔

انھیں دیکھتے ہی بادشاہ آگے بڑھا اور ملکہ اور شہزادے کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ یہ دیکھ کر محل میں موجود سبھی لوگوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

کچھ دنوں کے بعد شہزادے کی شادی گلبدن کے ساتھ کر دی گئی۔ اس روز سارا ملک خوشیاں منا رہا تھا۔

وہ دن لوگوں کو اب بھی یاد ہے جب بادشاہ کو اپنی ملکہ واپس ملی تھی اور شہزادے کو شہزادی گلبدن جس کے حسن کا ثانی اب بھی کسی ملک میں نہیں۔

(پنجابی لوک کہانی)

قمر محمود عبداللہ

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شیراز طاہر

کالی سویٹر

پت جھڑ شروع ہوتے ہی وہ بکھر جاتا بلکہ ٹوٹ جاتا۔ تفکرات کی بھاری گٹھلی اُٹھائے آج پھر وہ جیسے زرد پتے نہیں غم کے کنکر چن رہا ہو۔ اگر چہ اس سزا میں وہ کبھی تنہا نہ ہوتا بلکہ آٹھ دس ہم مکتب ضرور ساتھ ہوتے اور وہ سب اس انوکھی سزا سے محظوظ ہوتے۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ مسل دیا گیا ہو۔ وہ سوچ رہا تھا میں نے سب سے زیادہ ان درختوں کے پتے چنے ہیں۔ نہ جانے کیوں یہ پیڑ ہر سال ننگے ہو جاتے ہیں۔

جب سے سکول میں نئے PTI نصیر صاحب آئے تھے عدنان کے سر پر بن گئی تھی۔ سکول یونیفارم نہ پہن کر آنے والے طلباء کیلیے انہوں نے یہ ’’ٹکنیک‘‘ تجویز کی تھی کہ وہ سکول کے احاطے سے زرد پتے چنیں۔

عدنان کے پاس سفید شرٹ اور خاکی پتلون تو تھی ہی کالی سویٹر نہ تھی۔ جس کی وجہ سے اُسے ہمیشہ ہی پتے چننے پڑتے۔ کالی سویٹر کی خواہش عدنان کے دل میں تھی۔ خواہشیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ اپنی مرضی کرتی ہیں۔ انسان ان کے پیچھے بھاگتا ہے۔ لیکن وہ سائے کی طرح آگے ہی آگے بھاگتی ہیں۔ چھونے بھی نہیں دیتیں۔ عدنان حسرت بھری نگاہوں سے کالی سویٹر پہنے ساتھیوں کو دیکھتا۔ بند گلے والی، کالرز والی، زپ والی، جیکٹ ٹائپ اور ’’V‘‘ گلے والی۔ ’’V‘‘ ٹائپ گلے والی سویٹر کا تو وہ دلدادہ تھا۔ میں نے بھی یہی ’’V‘‘ ٹائپ گلے والی سویٹر لینی ہے۔ کتنی خوبصورت ہے یہ ’’V‘‘ ٹائپ گلے والی۔ ویسے تو اس پر ہر وقت پڑھنے کی دھن سوار رہتی ---- پڑھنا ہے --- محنت کرنی ہے --- تا کہ غریب والدین کی خدمت کر سکوں۔ لیکن موسم سرما آتے ہی سویٹر کا بھوت اس کے سر پر سوار ہو جاتا۔ پھر جب سے نئے PTI صاحب آئے تھے۔ سویٹر عدنان پر بارسا بن گئی تھی اور وہ اس بار تلے دب کر رہ گیا تھا۔

ڈسپلن کی مستقل خلاف ورزی کے سبب ایک دفعہ PTI صاحب نے اُسے مرغا بننے کے لیے آگے آنے کا حکم دیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مداخلت کی۔

”جناب مزدور گھرانے کا بچہ ہے۔ بڑا لائق ہے اور محنتی ہے۔ مجبوری بھی دیکھا کریں۔“

..........غریب، مزدور، سر! ڈسپلن بھی تو مجبوری ہے.......... چلو دفع ہو جاؤ پتے چنو۔ PTI نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

اس خجالت اور شرمندگی کے سبب عدنان دل میں یہ پختہ عہد کرتا کہ آج گھر جا کر ضرور ابا سے سویٹر لانے کا کہوں گا۔ کالی سویٹر

”V“ گلے والی۔ لیکن گھر جا کر پھر غربت کی اونچی دیوار کو عبور کرنا اس کے لیے ناممکن ہو جاتا۔ اُسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ اسمبلی میں ذلت برداشت کرنا مشکل ہے یا پیوندگی بوسیدہ چادر میں لپٹے ابا کو سویٹر لانے کیلیے کہنا مشکل ہے۔ وہ اس خواہش کے اظہار کیلیے کئی دفعہ ابا کے سامنے گیا لیکن دل کی بات لبوں پر لانے کے بجائے آنکھوں میں آنسوں لا کر خاموش ہو گیا۔۔۔۔۔ اگر ابا کے پاس پیسے ہوتے تو اس بوسیدہ چادر کو پھینک کر اپنے لیے سویٹر نہ خرید لیں۔ کیا کریں بیچارے ہمارے لیے دال روٹی لائیں یا سویٹر۔۔۔ چن لو نگا پتے۔۔۔۔۔ پتے ہی تو اکھٹے کرنے ہیں۔ ماں والا طریقہ ٹھیک ہے۔ یہی گلابی سویٹر گھر آ کر اوپر پہن لو اور سکول جاتے وقت سفید شرٹ کے نیچے۔

بیٹا! سارا شہر چھان مارا ہے لنڈا بازار سے سکول کی سویٹر نہیں ملی۔

شدید کہر نے رہے سہے پتوں کو بھی جھاڑ دیا۔ سکول کے لان میں زرد پتوں کے بجائے اب گل داؤدی نے اپنے رنگ بکھیر دیئے۔ پتے چننے کی ”فلیک“ تو اب تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ لیکن اس یخ بستہ فضا نے عدنان کیلیے سویٹر کی خواہش کو اب ضرورت میں بدل دیا تھا۔ جوں جوں وہ اپنے ہم مکتب ساتھیوں کو مختلف ڈیزائن اور ورائٹی کی سویٹرز پہنے دیکھتا وہ لمبی سرد آہ بھر کر گم سم ہو جاتا۔ سکول میں سپورٹس کی تیاری کی وجہ سے وہ PTI صاحب سے بےخوف تھا لیکن سویٹر اس کے اعصاب سے چمٹی تھی۔

وہ پلے گراؤنڈ میں فٹ بال میچ دیکھ رہا تھا۔ کاشف نے کھیلتے کھیلتے اپنی سویٹر اتار کر بارا پنچھ کے اوپر پھینک دی۔ پھر میچ کے دوران عدنان کی نگاہیں اسی سویٹر کا تعاقب کرتی رہیں۔ اس نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ وہ اپنے پاس ایک ہی بینچ پر بیٹھنے والے ہم جماعت کاشف کی سویٹر اُٹھائے اور کچھ وقت کے لیے پہن لے۔ لیکن کاشف کے خفا ہو جانے کے ڈر سے اس خیال سے باز آ جاتا۔ پھر گھنٹی بند ہو گئی سب بچے اپنے اپنے کلاس رومز میں آ گئے۔ کاشف دوسرے کھلاڑی لڑکوں کے ساتھ تھوڑی تاخیر سے کلاس میں آیا اور بستہ اُٹھا کر چھٹی کر گیا

کیونکہ کل کے میچ کی تیاری کے سلسلے میں فٹ بال ٹیم کو جلدی چھٹی دے دی گئی۔ عدنان کی نظر سائیکل لیے کاشف پر پڑی جو سویٹر کے بغیر گھر جا رہا تھا۔ عدنان چھٹی کے بعد سیدھا پلے گراؤنڈ کی طرف بارا پنکھ کے پودے کے پاس کھڑا تھا۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ کاشف سویٹر اٹھانا بھول گیا تھا۔ خوبصورت ”V“ ٹائپ گلے والی سویٹر۔ عدنان کی جیسے قسمت جاگی ہو۔ کبھی سویٹر کو چومتا اور کبھی سینے سے لگاتا۔ بستے کو کندھے سے نکال کر نیچے رکھا۔ اور سویٹر پہن لی۔ دونوں ہاتھ سویٹر پر پھیرتا جیسے اسے یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ اس نے ”V“ ٹائپ گلے والی سویٹر پہنی ہے۔ دُنیا جہان کا خزانہ سمیٹ کر وہ گھر کی طرف چل دیا۔ چند قدم چلا تھا کہ اُس کے قدم بوجھل ہو گئے۔ ماں سے کیا کہو گئے؟ سویٹر کہاں سے لایا ہوں؟ وہ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کیلیے بار بار سر پہ ہاتھ مار رہا تھا۔۔۔ راستے سے ملی ہے۔۔۔۔۔ ہاں یہ ٹھیک ہے تو کیا ماں سے جھوٹ بولو گے؟۔۔۔۔۔ اب کی بار جیسے مارگلہ اس کے آگے حائل ہو گیا ہو۔ وہ وہیں ساکت کھڑا ہو گیا۔۔۔۔۔ دِل کی دھڑکن بڑھنے لگی۔۔۔۔۔ جھوٹ تو نہیں ہے یہ سچ ہے۔ میں نے کونسی چوری کی ہے۔ یہ واقعی مجھ ملی ہے۔ جواز تو اس نے تلاش کر لیا لیکن اس جواز پر ابھی مطمئن نہ تھا۔ ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ اس میں جھوٹ والی کون سی بات ہے۔ دِل کو نئے سرے سے تسلی دے کر وہ قدرے تیز قدموں کے ساتھ آگے بڑھا۔ گھر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ماں کو تو جھوٹ بول کر مطمئن کر لو گے۔ کیا کاشف اپنی سویٹر پہچان نہ لے گا؟ ہاں اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ خواہ مخواہ چور بنوں گا۔ چلو اِسے اتارتے ہیں ابھی بستے میں چھپا دُوں۔ ہفتہ دس دن بعد پہن لونگا۔ بات آئی گئی ہو جائے گی۔ کاشف بھی بھول جائے گا۔ لمبی سرد آہ بھر کر عدنان نے سویٹر اتار کر بستے کے اندر رکھ دی۔ اور ابھی ماں سے بھی اس کا ذکر نہ کرنے کا فیصلہ کر کے گھر میں داخل ہوا۔

اگلا سارا ہفتہ عدنان سویٹر کے پہننے کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ وہ طریقے سوچتا رہا۔ جن کو بروئے کار لا کر وہ کاشف کی سویٹر پہچاننے نہ دے۔ کاشف کے اپنی سویٹر پہچاننے کا خیال اس کے دماغ کے ”ٹوٹے“ کر رہا تھا۔ سویٹر کا ٹریڈ مارک اکھیڑ دیا جائے۔ سامنے اور پیچھے سے کچھ دھاگے کھینچ کر نکال دیئے جائیں تو یقیناً کاشف سویٹر کو پہچاننے سے قاصر رہے گا۔ اس منصوبے سے اس نے اتفاق کرتے ہوئے کچھ سکھ کا سانس لیا۔ اگلے دن سویٹر پہن کر جانے کے خیال سے اُسے اطمینان حاصل ہوا۔ اور اطمینان سے خوشی اور خوشی سے بوجھ ہلکا ہو گیا۔ بوجھ ہلکا ہوا ہی تھا کہ نیند کی ملکہ نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ یہ ملکہ بھی بڑی مطلبی اور

خودغرض ہے۔ درماندہ اور غم زدوں کے تو پاس سے نہیں گزرتی۔

عدنان سکول جاتے ہی کاشف سے ملا۔ کاشف نے واقعی سویٹر کو نہ پہچانا تھا۔ عدنان خوشی سے ناچ رہا تھا۔ وہ بارش مین بھیگ رہا تھا۔ کونسی سردی ہے؟ سویٹر جو پہن رکھی ــــــ وہ سٹاف روم کے باہر لگے قد آور آئینے کے سامنے کھڑا تھا جس پر لکھا تھا۔

Check Your Uniform وہ اپنی سویٹر سیدھی کر رہا تھا۔ وہ پہلے تو PTI کی نظروں سے بچ کر جاتا تھا۔ آج دو تین مرتبہ اس کے سامنے سے گزرا۔ پھر اسمبلی ہوئی۔ آج اس کے دل کی دھڑکنیں بالکل نارمل تھیں۔ ٹانگیں بھی نہیں کانپ رہی تھیں۔ چہرے پر بھی شرمندگی کے آثار نہ تھے۔ آج اس نے ”V“ ناپ گلے والی سویٹر پہن رکھی تھی۔ وہ فخر سے PTI کے سامنے سے گزرا۔ اس کے کانوں کی سماعتوں سے عدنان عدنان کی آواز ٹکرائی یہ آواز PTI صاحب کی نہ تھی۔ بلکہ اس کی ماں نے اس کی رضائی کھینچ کر نماز کیلیے بیدار کیا تھا۔

عدنان! ـــــ بیٹا اُٹھ فجر کی نماز جارہی ہے۔

عدنان نے نماز پڑھی ”اے اللہ ہمیں سیدھی راہ دکھا“ جیسے قاری صاحب کلاس میں نماز کا ترجمہ سکھا رہے ہوں ــــــ اس نے نماز فجر پڑھی لیکن نماز کے بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ساری نماز میں سیدھی راہ پر چلنے کا عہد کرتا رہا ہو ــــــ کالی سویٹر اُس کی نگاہوں میں گھومنے لگی۔ جیسے سویٹر سیدھی راہ کے راستے میں دیوار بن کر کھڑی ہوگئی ہو۔ وہ سویٹر کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا ہو۔ دِل F 16 کی طرح دُوڑنے لگا۔ شدید سردی میں بھی پسینے چھوٹ گئے۔

”آج ہی کاشف کی امانت اس کے حوالے کر دونگا۔ اس پر میرا کوئی حق نہیں۔“

پل بھر میں یہ فیصلہ کر کے عدنان پھول کی طرح ہلکا پھلکا ہوگیا۔ امانت واپس کرنے کی فکر میں اُس نے اچھی طرح ناشتہ بھی نہ کیا۔ سکول کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر اُس کے قدم ساکت ہو گے۔ دِل کی رفتار پھر تیز ہوگئی ــــــ پاگل خود چور بنو گے۔ جانتے نہیں کل

ہیڈ ماسٹر صاحب اسمبلی میں بتا رہے تھے کہ بچوں کے بستوں سے اشیاء چوری ہو رہی ہیں۔ میں نے دس لڑکوں پر مشتمل خفیہ ٹیم تشکیل دی ہے جو چور بچوں کا سراغ لگائے گی۔ جولڑکا چور ثابت ہوا اُسے سکول سے نکال دیا جائے گا۔ عدنان دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ رہا تھا جیسے چکی کی دو پاٹوں میں کچل دیا گیا ہو۔ سوچوں کے تیز

گھوڑے دوڑانے کے بعد اُس نے سکول کے گیٹ کے اندر قدم رکھا۔

”سویٹر چپکے سے کاشف کے بستے میں رکھ دونگا۔“ اِس فیصلے کے بعد وہ تیزی سے کمرہِ جماعت کی طرف بڑھا۔ کمرے میں کوئی اور طالبعلم نہیں تھا۔ موقعہ اچھا ہے۔ وہ تیزی سے اپنی نشست کی طرف گیا۔ لیکن کاشف کا بستہ بنچ میں موجود نہ تھا۔ اُس نے غصے سے پھر سُر پیٹا۔ کھڑکی سے پلے گراؤنڈ کی طرف جھانکا۔ کاشف فٹ بال کھیل رہا تھا۔ اُس کے اندر افراتفری کی لہر ابھی تھمی نہ تھی کہ گھنٹی بند ہوگئی۔ وہ اپنی لائن میں جا کھڑا ہوا۔ دعا کے بعد دسویں جماعت کے دولڑکے PTI صاحب کی طرف دُوڑتے ہوئے آئے ایک کے ہاتھ میں کالی سویٹر تھی۔ سر! کاشف کی سویٹر عدنان کے بستے میں سے ملی ہے۔ لڑکے نے پھولی سانس کے ساتھ کہا ۔عدنان کا رنگ فق پڑگیا۔ PTI کی گرج دار آواز ”اِدھر آؤ“ اُس پر بجلی بن کر برسی۔ آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا اور اس کی ہچکی بند ہوگئی۔ کاشف کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ جب کہ PTI صاحب کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ وہ بے بسی کی تصویر بنے سکول سٹاف کے سامنے کھڑا تھا۔ کاشف کو گراؤنڈ سے بلوایا گیا ۔کاشف کا چہرہ لال سُرخ تھا۔ وہ PTI صاب کی طرف دُوڑا۔ اور آٹھ دس لڑکے بھی اُس کے پیچھے بھاگے۔

”چلو تماشہ دیکھتے ہیں۔“

کاشف بیٹا یہ جرسی تمہاری ہے؟ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اُس سے پوچھا۔

جی ہاں سر۔ کاشف نے جواب دیا۔

.... سر! ایسے لڑکے سکول کے ماحول کو خراب کرتے ہیں۔ یہ پہلے بھی ڈسپلن میں بہت لوز تھا۔ اسے فارغ کریں“

PTI نے عدنان کو گھورتے ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہا۔

کاشف آگے بڑھا۔ اُس نے عدنان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”سر یہ سویٹر میں نے خود عدنان کو تحفہ دی ہے۔ آپ اِسے خواہ مخواہ چور ٹھرا رہے ہیں۔ یہ میرا دوست جو ہے۔“

کاشف نے یہ کہہ کر سارے سکول کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر صغیر خان

پہاڑی سے ترجمہ: **شیراز طاہر**

عرفان کی کہانی

طاہر اور عرفان کے گاؤں قریب قریب تھے۔ طاہر کا گاؤں ’ہاڑوٹ‘ نہر کے اس پار اور عرفان کا گاؤں نہر کے اس کنارے۔ عرفان کا ننھیال ’ہاڑوٹ‘ نہر کے اس پار طاہر کے گاؤں میں تھا۔ جہاں عرفان کبھی کبھار جایا کرتا۔ وہ طاہر کے بہت قریب ہو گیا۔ دونوں کی دوستی بھی پکی ہو گئی۔ کیونکہ دونوں کا سکول ایک ہی تھا۔ ہم جماعت تو نہ تھے۔ لیکن ننھیال آنے جانے سے دونوں ہر وقت سکول میں ایک ساتھ رہتے۔ عرفان اس سے ایک کلاس آگے تھا۔ تفریح کے وقت بھی دونوں ایک ساتھ رہتے۔ اکٹھا کھیلتے اور اکٹھے پروگرام بھی بناتے۔ دونوں نے اپنے اپنے گاؤں میں کرکٹ کی باقاعدہ ٹیمیں قائم کی ہوئی تھیں۔ طاہر کی ٹیم کا نام ’شاہین کلب‘ اور عرفان کی کرکٹ ٹیم کا نام ’عقاب الیون‘ تھا۔

طاہر اپنے سکول میں سب سے لائق لڑکا تھا۔ بلکہ اپنی کلاس کا مانیٹر بھی تھا۔ اس کی آواز بھی اچھی تھی۔ تقریر بھی بہت اچھی کرتا تھا۔ کبھی کبھی گانے بھی ثقافتی پروگراموں میں گا لیا کرتا تھا۔ بزم ادب کی تقریبوں میں وہ سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن عرفان جو بہت کم گو تھا۔ تلاوت بہت اچھی کرتا تھا اور نعت پڑھنے میں تو پورے سکول میں اس کا ثانی نہیں تھا۔ سکول میں عید میلاد النبی ﷺ کا جلسہ ہو یا قرآن خوانی۔ یا پھر کسی مسجد میں کوئی پروگرام ہو رہا ہو تو عرفان کو ضرور بلایا جاتا۔

طاہر دسویں کلاس پاس کرنے کے بعد راولپنڈی چلا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد واپس گاؤں آیا تو اسے عرفان دکھائی نہ دیا۔ اس نے کسی سے اس کے متعلق پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ مدرسے میں داخل ہو گیا ہے۔ اسے بہت حیرانی ہوئی کہ عرفان اتنا سیدھا سادہ بھولا نہیں تھا کہ اسے مدرسے میں داخل کرا لیا جاتا۔ وہ تو بہت ہونہار طالب علم تھا۔ اسے بہت دکھ ہوا۔ اس کے گھر والوں سے پوچھا، تو اسے تمام کہانی معلوم ہو گئی۔ چونکہ اس کا بھائی عدنان فیصل آباد میں ایم۔ بی۔ ایس کی پریکٹس کرتا تھا۔ گاؤں میں وہی ایک تو تھا جس نے پورے گاؤں کا نام روشن کر رکھا تھا۔ عدنان طالب علمی کے زمانہ سے ہی ایک چاک وچوبند اور محنتی طالب علم تھا۔ وہ

اسے فیصل آباد کسی مدرسے میں لے گیا ہے۔

ایک دن اس کے گاؤں کے ایک لڑکے نے بھی یہی داستان اس کو سنائی تو اس نے اس خالد نامی لڑکے سے بڑے تعجب سے پوچھا۔

عدنان تو بہت فیشن ایبل قسم کا لڑکا تھا۔ کوٹ پینٹ پہنتا تھا۔ ۔ اور ان باتوں سے بہت دور تھا۔ وہ اپنے بھائی کو مزید تعلیم دلوانے کی بجائے مدرسے میں کیوں چھوڑ آیا ہے۔

خالد بولا۔ ۔ طاہر بھائی تم نے اسے اب نہیں دیکھا۔ وہ تو پکا مولوی لگتا ہے۔ گاؤں میں اس کی قابلیت اور صلاحیتوں کے پہلے ہی بہت چرچے تھے۔ اب اوپر سے اس نے داڑھی رکھ لی۔ دین کی طرف راغب ہو گیا۔ تو لوگ اس کے اور بھی دل دادہ ہو گئے ہیں۔

لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ عدنان میں یہ تبدیلی کیسے آ گئی؟ طاہر نے جواب دیا۔

عدنان جہاں کلینک کرتا تھا۔ وہاں اس کے پاس اس کا ایک دوست بن گیا۔ وہ بہت شریف اور نیک آدمی تھا۔ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے تعلقات ایک مسعود نامی شخص کے ساتھ تھے۔ جو تبلیغی قسم کا آدمی تو نہیں تھا لیکن مذہبی ضرور تھا۔ دین کے متعلق ہر وقت باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ بھی عدنان کی دو چار دفعہ ملاقات ہوئی۔ آپ کو پتہ ہے کہ عدنان بالکل گوار قسم کا آدمی تھا۔ نماز روزے سے بہت دور تھا۔ ان کی تربیت اسے ایک دن مسجد میں لے گئی۔ ۔ اور وہ بھی پتلون اور شرٹ میں بلکہ ٹروزر میں۔ عدنان نے نماز پڑھی۔ ۔ اور پھر ان کے ساتھ واعظ سننے بیٹھ گیا۔ پہلے تو وہ اس لیے بیٹھا رہا کہ مسعود جو کچھ دن پہلے اس کا نیا نیا دوست بنا تھا۔ خوش ہو جائے گا لیکن کچھ دیر کے بعد اسے ان باتوں کا اثر ہونے لگا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے اندر تبدیلی آ رہی ہے۔ باتیں اس کے دل پر اثر کرنے لگیں۔ جوں جوں واعظ سنتا اس کی آنکھوں میں آنسو آتے جاتے۔ اور اس کا بے اختیار رونے کو جی کرتا۔ پھر وہ اتنا رویا کہ بس۔ ۔ روتا چلا گیا۔ ۔ طاہر متعجب سن رہا تھا اور اسے خالد کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی عدنان کی اس عجیب تبدیلی پر۔ مگر خالد کہہ رہا تھا۔

بعد میں تشکیل شروع ہوئی۔ تو عدنان کا دل چاہا کہ وہ بھی چار ماہ کے لیے اپنا نام لکھوائے پھر وہ کچھ سوچ کر چپ ہو گیا کہ چلو چالیس دن پھر چپ ہو گیا۔ آخر وہ سہ روزے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے اسے بجلی کا جھٹکا سا لگا ہو۔ مسعود اس وقت اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور حیران بھی۔ جب عدنان نے ارادہ کیا تو مسعود نے

اس کی قبولیت کے لیے دعا کی۔ شاید وہ قبولیت کا وقت تھا۔ اللہ نے عدنان کے ارادے اور مسعود کی دعا کو قبول کر لیا۔ بلکہ اُسے قبول کیا۔ وہ بہت سے دوسرے لوگوں کے لیے بھی ایک ذریعہ بن گیا۔ اب وہ عدنان نہیں تھا۔ بوشرٹ اور پتلون والا عدنان۔ شلوار قمیض پہنتا، سر پر ٹوپی۔ کبھی سفید پگ یا صافہ، ہاتھ میں تسبیح۔ وہ پہلے بھی خوبصورت تھا۔ لیکن اب تو جیسے اس کے چہرے سے نور ٹپک رہا ہو۔۔ طاہر ہمہ تن اس کی باتیں سن رہا تھا اور محو حیرت تھا۔

خالد پھر بولا۔۔ اس تبدیلی نے عرفان کو بھی اسی راہ پر لگا دیا۔ وہ بھی مدرسہ چلا گیا۔۔ بلکہ عدنان نے اپنے تمام گھر والوں کو مذہبی سا بنا دیا ہے۔ اس کے ماں باپ آپس میں باتیں کرتے کہ ہم نے عدنان کو ڈاکٹر بنایا تھا۔ مگر یہ تو پکا مولوی بن گیا۔

عرفان کا دل بھی پہلے پہل مدرسہ میں نہیں لگا۔ نیچے سونا۔ لنگر سے روٹی لے کر کھانا۔ صبح صبح اٹھنا۔ وہ سوچتا۔ مدرسہ سے بھاگ نکلے۔ پھر اس کا دل آہستہ آہستہ بہلنے لگا۔ قرآن حفظ کرنے لگا دو سال میں اس نے قرآن حفظ کر لیا۔ یہ جہاد کا زمانہ تھا۔ عرفان کا مدرسہ اس کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس مدرسہ سے بہت سے نوجوان جہاد کے لیے نکلتے تھے۔ کشمیر کے جہاد کے لیے۔۔ افغانستان کے جہاد کے لیے۔۔ اس کا دل بھی آیا کہ وہ بھ جہاد کرے۔۔ لیکن اس نے عالم بننے کی ٹھان لی عالم بننے کے بعد بھی اب وہ پورا مرد تھا۔ اس کا دل جہاد کی طرف مائل رہا۔ جہاد کی باتیں زور پکڑ گئیں۔۔ وہ بھی ایک کیمپ میں اٹھ گیا۔ پہلے میران شاہ۔ پھر خوست، وہاں چار ماہ رہا۔ ٹریننگ لی۔

عدنان کو اس بات کا علم ہوا تو وہ بہت گھبرایا۔ اور پریشان ہوا۔ پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ جہاد اللہ کا حکم ہے۔ اس نے گھر والوں کو بھی خبر نہیں دی کہ عرفان کہاں ہے۔ جب بھی گھر سے کوئی پوچھتا تو وہ کہہ دیتا۔۔ بس ٹھیک ہے۔

جب عرفان افغانستان کے جہاد سے واپس گھر آیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ وہ بہت دن گھر رہا۔ طاہر سے بھی ملا۔ گپ شپ ہوئی لیکن طاہر کو وہ کچھ زیادہ اچھا نہیں لگا۔ بڑے بڑے بال افغانی ٹوپی کمانڈو جیکٹ۔ گھٹنوں سے اوپر شلوار۔ طاہر تو روشنی کا آدمی تھا۔ وہ اسے اسی رنگ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے اس کا بچپن یاد آ رہا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں چلا گیا تھا۔ وہ بھی جہاد کا حامی تھا۔ لیکن وہ اس جہاد کو کسی اور طرح سے لے رہا تھا۔۔ امریکہ۔۔۔ روس کی جنگ اور شاید دنیا کی اس میں مختلف دلچسپیاں وغیرہ وغیرہ جبکہ عرفان کے نزدیک

یہ جہاد اللہ کا حکم تھا۔

عرفان واپس چلا گیا۔ اب وہ بہت عرصہ کے بعد واپس گھر آتا۔ طاہر اس سے پوچھتا تو وہ بتاتا کہ وہ اب مجاہدین کو ٹریننگ دے رہا ہے۔ پھر ایک دفعہ طاہر کو پتہ چلا کہ عرفان پکڑا گیا ہے اور جیل میں ہے۔ گاؤں کے ہر شخص نے اس کا افسوس کیا اور اس کے گھر والوں کو حوصلہ دیا کہ اللہ خیر کرے گا۔ وہ اللہ کا بندہ ہے۔۔۔ اور اللہ اس کی مدد کرے گا۔ پھر ایک دفعہ یہ خبر آئی کہ عرفان کی تنظیم نے سری نگر اسمبلی کے چار ممبران کو اغوا کر لیا ہے اور اس کے بدلے میں عرفان کی رہائی چاہتے ہیں۔ انڈیا والوں نے اس کی رہائی کا بندوبست کیا اور اسے بخریت گھر چھوڑ گئے۔

ایک دن طاہر بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک گاؤں میں یہ اعلان کیا جا رہا تھا کہ کمانڈر عرفان چار دن کے بعد اپنے علاقے میں واپس آ رہا ہے۔ یہ خبر پورے علاقے میں پھیل گئی۔ ہر زبان پر عرفان کا ذکر تھا۔ اس کے استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس کی تنظیم تو تھی ہی سب لوگ اس کے استقبال میں مشغول تھے۔ آخر عرفان آیا۔ تو وہ خوف زدہ نہیں تھا بلکہ خوش خوش تھا۔ اس کا بہت بڑا جلسہ کیا گیا۔ گاؤں میں یہ سب سے بڑا جلسہ تھا۔ اس کے بعد وہ گھر گیا۔۔ اس کے گھر کے ارد گرد بھی لوگوں کا بہت ہجوم تھا۔

روزانہ اخبار میں کوئی نہ کوئی خبر عرفان کے بارے میں ضرور چھپتی۔ دیکھتے دیکھتے عرفان بہت بڑا لیڈر بن گیا۔ اب تو لوگ بھی اس کی طرح کا لباس پہنتے ٹوپی لگاتے۔ اس کی طرح باتیں کرنے میں فخر محسوس کرتے۔ عدنان ایک ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے اپنی شہرت رکھتا تھا۔ اب عرفان بھی ایک مشہور آدمی بن گیا۔۔ بی بی سی نے بھی اس کی خبریں اور بہادری کی داستانیں ریڈیو سے نشر کیں۔۔ وہ گھر میں کچھ عرصہ رہ کر واپس چلا گیا۔۔ پھر کبھی کبھی آتا۔۔ پہلے تو اس کے پاس ایک عام سی گاڑی ہوا کرتی تھی۔ پھر ڈبل ڈور۔ اور اب پیجارو اس کے نیچے تھی۔ لوگ کہتے عرفان ایجنسی کا آدمی ہے۔ پتہ نہیں یہ سچ تھا یا جھوٹ۔ لیکن وہ ہر وقت بنا ٹھنا رہتا تھا۔ وہ جب بھی گاؤں آتا سب سے ملتا۔ غمی خوشی میں شریک ہوتا۔ کوئی غریب ملتا تو اس کی مدد کرتا۔

اس کی تنظیم نے ایک مفت میڈیکل کیمپ علاقے میں لگا دیا۔ لوگوں کو مفت روٹی تقسیم ہونے لگی۔ پانی کے لیے کئی ہینڈ پمپ لگوائے۔ سکول کا ایک نیا کمرہ۔۔ اور نئی مسجد بھی بنوائی۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی قدر و منزلت بڑھنے لگی۔ اب وہ کبھی کبھی ٹی وی پر بھی نظر آنے لگا تھا۔ کشمیر کی کسی نہ کسی میٹنگ میں وہ بھی شریک ہوتا۔ اس کے ساتھ بڑے بڑے لیڈر فوجی آفیسر بھی بیٹھے نظر آتے تھے۔ اخباروں میں اس کا بیان آتا۔ کئی

رسالے اس کا انٹرویو لیتے۔ عرفان وہ عرفان نہیں تھا بلکہ اپنے علاقے کی ایک بہت بڑی پہچان بن گیا تھا۔

بہت عرصہ عرفان گھر واپس نہیں آیا جب آیا تو اس نے بتایا کہ حالات ٹھیک نہیں تھے۔ ایک دن طاہر جب 'ہاڑوڈ' نہر کے پاس سے گزر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ 'ہاڑوڈ' کے اردگرد فوج ہی فوج تھی۔ اور ساتھ پولیس کی بھاری نفری بھی اور سادے سادے کپڑوں میں کچھ اجنبی لوگ بھی نظر آرہے تھے۔ طاہر نے کسی سے پوچھا تو اسے پتہ چلا کہ چھاپہ پڑ رہا ہے۔ اور آپریشن ہو رہا ہے۔ تمام گاؤں کے لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا گیا تھا۔۔ اور دوسری جانب عورتیں اکٹھی کر لی گئی تھیں۔۔ سب کی شناخت کی جا رہی تھی۔ بہت دیر تک یہ پوچھ گچھ اور عمل جاری رہا۔ ہر ایک سے عرفان کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا۔۔ طاہر کو تب پتہ چلا کہ یہ سب عرفان کو ڈھونڈ رہے ہیں، لیکن کیوں؟

کسی نے بتایا کہ عرفان دہشت گرد ہے۔ بہت بڑا دہشت گرد۔ طاہر نے دیکھا کہ فوج کے چند سپاہی اس کے باپ اور ماں کو لے کر آرہے تھے وہ خود موجود نہیں تھا۔ اس کی جگہ اس کے ماں باپ کو گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ طاہر کو اچھا نہیں لگا کہ یہ کہاں کا انصاف ہے لیکن وہ مجبور تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کل تک تو عرفان مجاہد تھا۔ آج دہشت گرد۔۔ کل وہ ہیرو تھا۔۔ آج مجرم۔ کل تک وہ تمام سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والا ایک اچھا آدمی تھا۔ آج گناہ گار؟ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اے اللہ وہ کل صحیح تھا یا آج، کل تک جو لوگ جہاد کرتے تھے۔۔ آج وہ دہشت گرد کیوں ہو گئے۔ اس گھمسن گھیری میں پڑے وہ سوچتا رہا۔۔ لیکن اسے سمجھ میں نہیں آئی۔ کل تک جو اخبار مجاہد لکھتے تھے۔۔ وہ دہشت گرد لکھنے لگے۔ ٹی وی ریڈیو کا بھی یہی حال تھا۔ آخر خبر آئی کہ عرفان پکڑا گیا۔۔ پھر خبر آئی کہ وہ ملک بدر ہو گیا۔ یا کسی جیل میں چلا گیا۔ لاپتہ ہو گیا۔۔ جہاں بہت سے لوگ پہلے بھی لاپتہ تھے۔ عرفان جو اس کا دوست تھا۔ 'عقاب الیون' کا سربراہ تھا۔ نعت گو تھا۔ قاری تھا۔ گاؤں کی جان تھا۔ وہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ نہیں کبھی نہیں۔۔ کبھی نہیں۔۔ مگر آج بھی وہ جب عرفان کے بارے میں سوچتا ہے تو اسے یقین نہیں آتا۔۔۔ کہ یہ سب کیا تھا؟

☆☆☆☆

حمزہ حسن شیخ

سرائیکی سے ترجمہ: حمزہ حسن شیخ

مچھلی کا شکار

’’بھئی شکار پر کب جا رہے ہیں؟‘‘ اختر نے پوچھا تو میں چونک پڑا۔

’’کس شکار پر؟‘‘

’’ارے میاں آج کل مچھلیوں کا موسم ہے تو یقیناً مچھلیوں کا شکار ہی ہوگا۔‘‘ اس نے جواب دیا تو مجھے یاد آیا کہ میرے اکثر دوست سردیوں کے موسم میں مچھلی کے شکار پر جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ بہت عرصے سے جاری ہے۔ لیکن مجھے صرف ایک دفعہ جانے کا موقع ملا۔ میں تو اتنا شوقین نہیں البتہ اختر شکار کا بہت دلدادہ ہے۔ وہ ہر وقت شکار کا موقع ڈھونڈتا رہتا جب بھی کوئی پارٹی شکار کے لیے جاتی تو وہ ساتھ ہولیتا۔ میں تو صرف مچھلی کے شکار پر جاتا لیکن اختر ہر قسم کے شکار کا شغل رکھتا تھا۔ مقررہ دن ہم بھی دریا کے کنارے جا پہنچے۔ تمام دوست وہاں پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ سارے انتظامات مکمل کر لینے کے بعد ہم نے بھی ڈوریاں دریا میں ڈال دیں۔ میں نے سوچا تھا کہ کانٹا ڈالتے ہی سارے مچھلیاں اس میں پھنس جائیں گی مگر یہاں معاملہ الٹ ہوگیا۔ خدا خدا کر کے ایک مچھلی ہاتھ لگی۔ میں نے کیچوا کانٹے میں لگا کر دوبارہ ڈوری دریا میں ڈال دی۔ آج اختر اور میرا مقابلہ تھا۔ اختر جلا بھنا ابھی تک خالی ہاتھ بیٹھا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ ڈوری بھاری ہوگئی ہے جس کا مطلب تھا کہ مچھلی کانٹے میں پھنس چکی ہے۔ اس نے خوب زور لگایا لیکن ڈوری نہ نکلی اس نے مجھے مدد کے لیے بلایا۔ میں نے بھی خوب زور لگایا مگر نتیجہ وہی رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے ڈوری مچھلی نے پکڑ لی ہو۔

’’میرے خیال میں کافی بڑی مچھلی ہاتھ لگی ہے۔‘‘ اختر نے چہکتے ہوئے کہا۔

’’یار کوئی ڈولفن ہوگی‘‘ اس کی خوشی دیدنی تھی۔

’’بھلا اس چھوٹے سے دریا میں ڈولفن کا کیا کام۔‘‘

’’یار واقعی یہ مچھلی بہت بڑی ہے۔‘‘ میں نے خیال ظاہر کیا۔

’’لگتا ہے وہیل مچھلی کانٹے میں پھنس گئی ہے۔‘‘ اختر نے دوبارہ خوشی سے کہا۔

’’ہاں ہاں ویسی جو کراچی کے ساحل پر پکڑی گئی تھی۔‘‘ میں نے کہا، ہاں ہاں اسی طرح۔‘ اختر نے کہا۔ میں اپنی ڈوری چیک کرنے کے لیے واپس پلٹا۔ اختر صاحب نے دوبارہ زور لگایا۔ مچھلی ہوتی تو باہر نکلتی۔ ڈوری تو پتھر سے اٹکی تھی بس صاحب آگے کیا ہوا، ڈوری اختر صاحب کے زور سے ایک دم پتھر سے نکلی، پلک جھپکتے ہوا میں بلند ہوئی اور سیدھا اختر صاحب کے ماتھے پر لینڈ کر گئی۔ لوہے کی اس کنڈی نے اختر صاحب کے ماتھے کا کام تمام کر دیا۔ سارے دوست شکار بھول کر اختر کی مرہم پٹی میں لگ گئے۔ پروگرام کینسل کر کے گھر پہنچے۔ گھر داخل ہوتے ہی آواز سنائی دی۔

’’ہاں بھئی کتنی مچھلیاں پکڑ کر لائے ہو۔‘‘ میرے ہاتھ میں صرف ایک مچھلی دیکھ کر طنزاً کہا گیا۔

’’بس صرف ایک مچھلی۔‘‘

’’کیا بتائیں ایک وہیل ہاتھ آئی تھی۔‘‘ میں نے شرارت سے کہا، اختر نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

’’ارے بھئی تمہارے ماتھے پر کیا ہوا۔‘‘ گھر والوں نے زخم اب دیکھا تھا۔

’’جی......‘‘ اختر ہکلایا۔

’’جی یہ مچھلی نے کاٹا ہے۔‘‘ میں نے کہا تو اختر شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ سب کھلکھلا کر ہنس دیے جبکہ اختر دوبارہ شکار پر کبھی نہیں گیا۔

☆☆☆☆

خدیجہ کبریٰ

سرائیکی سے ترجمہ: خورشید ربانی

چالاک گیدڑ

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ہر چیز انسان کی طرح باتیں کرتی تھی، ایک بڑا جنگل تھا جس میں شیر بادشاہ تھا اور ہاتھی، گھوڑے، خچر اور چیتے اس کے وزیر اور مشیر تھے، ہر طرف بھائی چارے، محبت اور اخوت کی فضا قائم تھی، ہر کوئی ایک دوسرے کی عزت کرتا تھا، قدرت کا نظام امن وسکون سے چل رہا تھا کہ ایک سال بارش نہ ہوئی اور جوہڑوں، کنوؤں کا پانی بھی خشک ہو گیا، قحط کے باعث ہر طرف پریشانی اور مایوسی پھیل گئی اور جانور بھوک پیاس سے مرنے لگے۔

اس صورت حال میں شیر نے اپنی رعایا کو اکٹھا کیا اور کہا

’’آپ سب سوچ سمجھ کر مشورہ دیں کہ اگر آئندہ قحط پڑے تو ہمارے پاس اس کے توڑ کا انتظام کیا ہونا چاہیے۔‘‘

سب سے پہلے بندر اٹھا اور کہنے لگا

’’بادشاہ سلامت! ہمیں یہ جنگل چھوڑ دینا چاہیے‘‘ کچھوے نے کہا ’’میں تو اتنا لمبا سفر نہیں کر سکوں گا اور رستے ہی میں مر جاؤں گا اس لیے میرا خیال ہے کہ ایک سال سو کر گزارنا چاہیے۔‘‘

سانپ نے کہا ’’میں تو اتنا زیادہ نہیں سو سکتا‘‘

سارا دن مشورے ہوتے رہے، ہر جانور نے اپنا اپنا راگ الاپا اور اپنی اپنی تجویز پیش کی، آخر میں گیدڑ اور بھیڑیے نے کہا

’’ہمیں اپنا وطن نہیں چھوڑنا چاہیے، بندہ گھر میں لاکھوں کا ہے اور باہر بے مول، ہم سارے مل کر ایک تالاب بناتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ بارش دے، یوں تالاب بھر جائے گا اور ہم سارا سال پانی پیتے رہیں گے۔‘‘

شیر کو یہ تجویز پسند آئی، جب سب نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ تالاب بنایا جائے تو فیصلہ کیا گیا کہ ہر

کوئی اپنے حصے کا کام کرے گا۔ شیر نے کہا کہ چونکہ یہ تجویز بھیڑیے اور گیدڑ کی ہے اس لیے کام کا آغاز بھیڑیا کرے گا اور انجام تک گیدڑ پہنچائے گا، صبح ہوتے ہی بھیڑیے نے کام شروع کردیا، باری باری سب جانور تالاب کی کھدائی میں شریک ہوتے رہے۔ آخر میں گیدڑ کی باری آئی لیکن باوجود ہزار کوشش گیدڑ کا کہیں نام ونشان نہ ملا، گیدڑ کے غائب ہوجانے پر شیر نے کہا کہ باقی کا کام بھی دوسرے جانور کرلیں، تالاب بن گیا اور اللہ نے اس قدر زوردار بارش عطا کی کہ تالاب بھر گیا۔

شیر نے کہا اب اس تالاب سے پانی وہی پی سکے گا جس نے اس کی کھدائی میں حصہ ڈالا ہے، گیدڑ کو بھی معلوم ہوگیا کہ تالاب پر جانے سے مجھے منع کردیا گیا ہے، گیدڑ صبح سویرے جلدی جلدی تالاب پر گیا اور جی بھر کے پانی پی کر واپس آ گیا، وہ روزانہ سویرے سویرے جاگتا اور تالاب سے پانی پی کر آ جاتا۔ ایک دن گیدڑ نے سوچا کیوں نہ آج نہانے کا مزا لیا جائے، سو پانی پینے کے بعد وہ نہایا اور واپس آ گیا، شیر اور ہاتھی جب پانی پینے گئے تو یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ تالاب کا پانی گدلا ہوچکا ہے، شیر دوسرے جانوروں پر غصے ہوا کہ پانی کو خراب کیوں کیا، سارے جانور پریشان تھے کہ کس نے ایسا کیا ہے اور اس چور کو کیسے گرفتار کیا جائے۔ کچھوے نے کہا ’’میں تالاب میں بیٹھ کر چور پکڑوں گا‘‘ کچھوے نے اپنے جسم کو درخت کے پتوں سے ڈھانپا اور تالاب کے قریب بیٹھ گیا اور بے قراری سے چور کا انتظار کرنے لگا۔ صبح سویرے اسے کچھ آہٹ محسوس ہوئی تو وہ تالاب کے کنارے پہنچ گیا، کچھوے نے چونکہ ہر طرف درختوں کی گوند بھی مل رکھی تھی جس کے باعث وہ پتھر جیسا نظر آتا تھا، گیدڑ نے دیکھا کہ تالاب پر کوئی نہیں ہے، آرام سے تالاب پر آ گیا اور کنارے پر پتھر دیکھ کر اسی پر بیٹھنے کی کوشش کی، جیسے ہی اس نے اپنی دو ٹانگیں اس پر رکھیں وہ چمٹ گئیں، گیدڑ نے چھڑانے کی کوشش کی تو اسے پتہ چلا کہ یہ پتھر نہیں بلکہ کچھوا ہے۔

اس نے کچھوے کی منت کی، اسے دوستی کا واسطہ دیا کہ مجھے چھوڑ دے، کچھوے نے کہا تم غدار ہو، چور ہو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا، گیدڑ نے دھمکی دی کہ اگر تو نے مجھے نہ چھوڑا تو میں پچھلی ٹانگوں سے تیرا سر پھوڑ دوں گا، کچھوے کو گھسیٹتے ہوئے گیدڑ نے جب پچھلی ٹانگیں کچھوے کے سر پر ماریں تو وہ بھی چمٹ گئیں، اب گیدڑ سخت پریشان ہوا اور کچھوے کو پھر دھمکی دی کہ میں اپنے دانتوں سے تیرا سر پھوڑوں گا، کچھوے نے کہا یہ بھی کر کے دیکھ لو۔ گیدڑ نے تنگ آ کر جب اپنا منہ کچھوے کے سر پر مارا تو وہ بھی کچھوے سے چمٹ گیا۔ کچھوا گیدڑ کو گھسیٹ کر شیر کے پاس لے گیا، سارے جانور جمع ہوئے لیکن کسی نے بھی گیدڑ کی حمایت نہ کی۔

سب نے یہی کہا کہ گیدڑ نے بد دیانتی کی ہے، چوری کی ہے لہٰذا اس کو موت کی سزا دی جائے، شیر نے گیدڑ سے کہا کہ تمہیں موت کی سزا سنائی جاتی ہے لیکن تیرے ساتھ اتنی رعایت ہوگی کہ تو اپنی سزا کا طریقہ خود بتا، اس کے لیے تجھے کل تک کی مہلت دیتے ہیں۔ گیدڑ نے شکریہ ادا کیا اور سوچنے لگا کہ ایسا طریقہ ہونا چاہیے کہ زندگی بچ جائے۔

دوسرے دن پھر سارے جانور جمع ہوئے، گیدڑ کو بھی شیر کے دربار میں لایا گیا۔ شیر نے گیدڑ سے پوچھا ’’تم نے کیا سوچا ہے؟‘‘ گیدڑ نے کہا کہ ’’ہاں میں نے سوچ لیا ہے‘‘ شیر نے پوچھا ’’کیا طریقہ سوچا ہے‘‘ گیدڑ نے کہا ’’ایک مرتبہ بندر نے چوہے کو مارا تھا، وہ یوں کہ اس نے چوہے کی دم پکڑی، اسے گھمایا اور دور پھینک دیا، یوں چوہا درخت سے جا ٹکرایا اور مر گیا، مجھے بھی یہی موت منظور ہے۔ ایک بات اور بھی ہے کہ آپ سب ذرا دور کھڑے رہنا تاکہ جب بھیڑیا مجھے پھینکے تو میں آپ پر نہ آ گروں‘‘ شیر نے کہا ’’ٹھیک ہے۔‘‘

سارے جانور دور چلے گئے تاکہ گیدڑ کو مرتے ہوئے دیکھ سکیں۔ رات کو شیر نے گیدڑ کو جو گوشت کھانے کو دیا تھا، گیدڑ نے اس میں چربی الگ کر لی اور گوشت کھا لیا، صبح سویرے اس نے چربی اپنی دُم پر مل لی یوں اس کی دُم کچھ مضبوط ہو گئی، بھیڑیے نے گیدڑ کو دُم سے پکڑا اور اپنے سر کے اوپر سے گھما کر پھینک دیا، گیدڑ کسی درخت سے ٹکرانے کے بجائے زمین پر جا گرا اور اٹھ کر بھاگ گیا، اور پھر کبھی تالاب پر پانی پینے نہ آیا۔ مدتیں گزر گئیں، تالاب بنانے والے جانور مر چکے ہیں لیکن ان کی نسلوں کو تالاب کی کہانی معلوم ہے۔

تمام جانور تالاب سے پانی پیتے ہیں لیکن کچھوؤں کو گیدڑ ابھی تک یاد ہے، اس لیے وہ نسل در نسل آج تک راتوں کو جاگ کر تالاب پر پہرہ دیتے ہیں تاکہ کوئی جانور تالاب کا پانی خراب نہ کر سکے۔

☆☆☆☆

خدیجہ کبریٰ

سرائیکی سے ترجمہ: خورشید ربانی

مال، جان کا صدقہ ہوتا ہے

ایک نوجوان حضرت موسیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا:

''میں نے سنا ہے کہ آپ جانوروں کی بولیاں بھی جانتے ہیں، پرندوں کی زبان بول اور سمجھ سکتے ہیں، جب وہ آپس میں باتیں کرتے ہیں تو آپ جان لیتے ہیں وہ کیا کہہ رہے ہیں، مہربانی کر کے مجھے بھی یہ زبانیں سکھا دیں تا کہ میں بھی جانوروں کی باتیں سنوں اور اللہ تعالیٰ کی شان پر صدقے اور قربان ہوں کیونکہ انسان کی زبان تو جھوٹ، چغلی، دھوکہ اور فریب میں لگی رہتی ہے، میں جانتا ہوں کہ چرند پرند خدا کا ذکر کس طرح کرتے ہیں اور اپنے پیٹ کا دوزخ کیسے بھرتے ہیں۔''

حضرت موسیٰ چونکہ خدا کے پیغمبر اور نبی تھے، انہوں نے نوجوان کے دل کی رضا جان لی اور اسے سمجھایا کہ تم ان باتوں سے باز رہو، یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے، اس راہ میں ہر جگہ مشکلات ہیں، تم یونہی خدا کا ذکر کرتے رہو، تمہیں اس کی رضا حاصل ہو جائے گی۔

نوجوان باوجود سمجھانے اور منع کرنے کے اپنی ضد پر اڑا رہا۔ کہتے ہیں جس کو بھی کسی کام سے روکو وہ اپنی ضد پر رہتا ہے، یہ اس کی فطرت ہے، آدمؑ اور حواؑ کو جس درخت کے قریب جانے سے منع کیا گیا وہ اسی کے پاس گئے اور اس کا پھل کھایا۔ یہاں بھی معاملہ وہی تھا نوجوان رو رو کر کہنے لگا میں بڑی آس اور امید کے ساتھ آیا ہوں، مجھے مایوس نہ کریں، میرا دل نہ توڑیں، خدا کے نبیؑ نے کہا کہ ''تیرے دل میں یہ بات شیطان نے ڈالی ہے، وہ تیری دنیا اور آخرت خراب کرنا چاہتا ہے۔'' لیکن نوجوان نہ مانا تو حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی مالک اسے ہدایت دے، اللہ سائیں نے موسیٰ کلیم اللہ سے کہا کہ آپؑ اسے سکھا دیں باقی اپنے قول و فعل کا یہ خود ذمہ دار ہو گا۔ حضرت موسیٰ نے نوجوان سے کہا کہ میں تجھے یہ ساری زبانیں سکھا تو دیتا ہوں لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ تو اس کے بعد مصیبتوں اور مشکلوں میں گھر جائے گا شیطان تجھے اپنا چیلا بنا لے گا۔ نوجوان نے

کہا مجھے سارے جانوروں کی بولیاں نہ سکھائیں لیکن دو جانوروں کی بولیاں سکھا دیں ایک تو اس کتے کی جو میرے گھر کے دروازے پر پہرہ دیتا ہے اور دوسرا اس مرغ کی بولی سکھا دیں جسے میری گھر والی نے پالا ہے، موسیٰؑ کلیم اللہ نے اسے کہا کہ اچھا جاؤ خدا کے حکم سے ان دونوں کی بولیاں تمہیں عطا کر دیں۔

وہ نوجوان بہت خوش ہوا اور گھر واپس آ گیا، دوسرے دن صبح سویرے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تا کہ یہ جان سکے کہ کتا اور مرغ آپس میں کیا باتیں کرتے ہیں، اسی اثنا میں اس کے گھر کی نوکرانی نے کوڑا کرکٹ گھر سے باہر آ کر پھینک دیا، اس کوڑے میں روٹی کا ایک ٹکڑا بھی تھا جسے مرغ نے اٹھا لیا، کتے نے یہ دیکھ کر مرغ سے کہا

"یار تم بہت لالچی ہو، گھر میں رہ کر تم تو دانے بھی کھا لیتے ہو مگر ایک روٹی کا ٹکڑا جو باہر آ گیا اسے بھی تم نے جھپٹ لیا۔"

مرغ نے کہا

"آپ پریشان نہ ہوں، صبر کریں اللہ تعالیٰ اس خشک ٹکڑے سے بہتر کوئی چیز تمہیں دے گا، صبح ہوتے ہی ہمارے مالک کا گھوڑا مر جائے گا تم اس کا گوشت کھا لینا۔"

نوجوان نے کتے اور مرغ کی باتیں سنیں تو فوراً اصطبل میں گیا اور گھوڑے کو منڈی لے جا کر بیچ دیا۔ اگلے روز وہ پھر دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور ان کی باتیں سننے لگا۔ نوکرانی نے حسب معمول کوڑا باہر پھینکا تو مرغ نے اس میں سے روٹی کا خشک ٹکڑا تلاش کیا اور چلتا بنا۔ کتے نے دیکھا تو کہنے لگا

"یار تم بہت مکار ہو، کل بھی مجھ سے جھوٹ بولا کہ مالک کا گھوڑا مرے گا اور تم گوشت کھا لینا، گھوڑا تو مرا نہیں البتہ مالک اسے فروخت کر آیا ہے۔"

مرغ کہنے لگا

"گھوڑے نے مرنا تو تھا مگر مالک کا مقدر اچھا تھا کہ اس نے اسے فروخت کر دیا۔"

کتے نے کہا

"نہیں بھائی، تم جھوٹے ہو، اپنے کھانے کے لیے مجھ سے دھوکہ کرتے ہو۔"

مرغ بولا

“نہیں یار میں سچ کہہ رہا ہوں، اب تم دیکھنا مالک کا اونٹ کل مرے گا پھر تم مزے کرنا، کئی دن تم گوشت کھاتے رہنا۔”

یہ سب باتیں وہ نوجوان سنتا رہا جب اس نے اونٹ کے مرنے کی بات سنی تو اونٹ کو بھی منڈی لے جا کر فروخت کر دیا اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔ حضرت موسیٰؑ نے تو کہا تھا کہ تمہیں نقصان ہوگا لیکن میں نے تو نفع کما لیا ہے۔ اس نے سوچا کہ شاید مجھے ڈرانے کے لیے موسیٰؑ نے ایسا کہا ہو۔ یہی خیال کرتا وہ گھر واپس آ گیا اور تیسرے دن کی صبح کا انتظار کرنے لگا۔ سویرے سویرے پھر وہ دروازے کے پیچھے لگ کر ان کی باتیں سننے لگا۔ بھوک سے کتا غرایا اور مرغ سے کہنے لگا تم دنیا جہاں کے جھوٹے ہو، گناہ کرتے ہوئے تمہیں خدا کا خوف بھی نہیں آتا۔ کہتے ہیں جھوٹ بولنے والے کے منہ میں ہمیشہ مٹی پڑتی ہے، مرغ کتے کی باتیں سن کر کہنے لگا:

“اس میں میرا کوئی قصور نہیں، تم غصہ نہ کرو، میں نے سچ کہا تھا اگر مالک نے گھوڑے اور اونٹ کو فروخت کیا ہے تو جو خرید کر لے گیا ہوگا وہ دونوں وہیں مر گئے ہوں گے، اچھا تم پریشان نہ ہو، کل مالک کے نوکر نے مر جانا ہے، مالک اس کے لیے گوشت کی خیرات کرے گا، تم بھی جی بھر کے کھا لینا اور میں بھی کھا لوں گا۔”

مرغ کی بات سن کر نوجوان نے اپنے نوکر کو بھی ایک سردار کے ہاتھ فروخت کر دیا اور اچھی خاصی رقم وصول کر کے خوش ہوا کہ اگر مجھے کتے اور مرغ کی بولی نہ آتی میں یہ فائدہ حاصل نہ کر سکتا۔

چوتھے دن کتے نے مرغ کے پیچھے دوڑ لگا دی کہ آج تمہیں نہیں چھوڑوں گا، تم نے مجھے بے وقوف بنایا، مجھے دھوکہ دیا۔ مرغ کہنے لگا مجھے خدا کی قسم ہے، میں نے جھوٹ نہیں کہا، ہمارا مالک اسے جہاں بیچ کر آیا ہے وہ وہاں مر چکا ہے۔ آج میں تمہیں ایک کام کی بات بتاتا ہوں، کتے نے پوچھا وہ کیا؟ مرغ نے کہا کل ہمارے مالک کی باری ہے، وہ خود مر جائے گا، اب دیکھنا اسے بچانے کون آئے گا؟ یہ مال تو اس کی جان کا صدقہ تھا لیکن اس لالچی آدمی کو کیا معلوم تھا۔ آج اس کی اپنی باری ہے۔ اس کے رشتہ دار جانور قربان کریں گے، دیگیں پکیں گی، تم بھی جی بھر کے کھانا اور میں بھی پیٹ بھر کر کھاؤں گا۔ گھوڑا، اونٹ اور نوکر تو مالک کی جان کا صدقہ تھے، ان کو بیچ کر وہ نقصان سے بچتا رہا، اب اس کو اپنی جان دینی پڑ گئی ہے۔

نوجوان چھپ کر یہ ساری باتیں سن رہا تھا، اپنی موت کا جان کر اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو بھاگ کر حضرت موسیٰؑ کے پاس پہنچ گیا اور رو رو کر منتیں کرنے لگا کہ مجھے

ملک الموت سے بچالیں۔ میں ہر چیز خدا کی راہ میں قربان کردوں گا، اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھوں گا، وہ اتنا رویا کہ اللہ کے نبیؑ کو اس پر رحم آ گیا، حضرت موسیٰؑ نے کہا دیکھو تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ تیری موت کا وقت آ گیا ہے۔ میں اسے نہیں ٹال سکتا، میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ مرتے وقت تجھے ایمان نصیب ہو جائے، تجھے احساس ہو گیا ہے۔ اللہ سائیں تجھے معاف کرے۔ یہ باتیں سن کر اسے خون کی قے آئی اور وہ گر پڑا۔ لوگ اسے اٹھا کے گھر لے گئے جہاں وہ اس دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔

☆☆☆☆

شوکت مغل

سرائیکی سے ترجمہ: خورشید ربانی

حرام، حلال کو کھا جاتا ہے

کسی گاؤں میں ایک غریب آدمی رہتا تھا، اس کا پانچ، چھ سال کا ایک بیٹا بھی تھا، دونوں باپ بیٹا گائے کا دودھ فروخت کر کے گزر اوقات کرتے تھے، بیٹا ہر روز صبح سویرے گائے کو چرانے کے لیے گاؤں سے دور پہاڑوں میں چلا جاتا اور شام کو واپس آ جاتا۔

اس کا والد گائے کو چارہ ڈال کر دودھ دوہتا، گائے کا دودھ چونکہ زیادہ نہیں تھا اس لیے وہ اس میں پانی ملا کر فروخت کرتا، یوں ان کو گزر بسر کے لیے معقول رقم مل جاتی۔ بیٹا جب والد کو دودھ میں پانی ملاتے ہوئے دیکھتا تو سوچتا کہ اس کا ابو ایسا کیوں کرتا ہے، اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ ابو سے پوچھے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ وقت گزرتا رہا، بیٹے نے بچپن اور لڑکپن کی حدیں پار کر لیں، اب وہ جوان ہو چکا تھا اور اُسے اس بات کا اندازہ بھی ہونے لگا تھا کہ اس کا والد دودھ میں پانی ملا کر بے ایمانی کرتا ہے۔

ایک دن حسبِ معمول وہ گائے کو چرانے گیا ہوا تھا کہ اچانک پہاڑ کے نشیب میں سیلابی ریلہ نمودار ہوا، پانی کو کسی قدر تیزی سے اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر اس نے گائے کو محفوظ مقام پر لے جانے کی کوشش کی مگر وہ ہٹ دھرمی سے وہیں کھڑی رہی، جب اس سے کچھ نہ بن پڑا اور پانی اس کے قریب آ گیا تو اس نے اپنی جان بچانے ہی میں عافیت جانی اور بھاگ کر ایک ٹیلے پر چڑھ گیا اور گائے سیلابی ریلے میں بہتے بہتے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی، سیلابی پانی کا زور کم ہوا تو شام ہو چکی تھی، وہ پریشانی اور اُداسی کے ساتھ گھر آ گیا اور اپنے والد کو بتایا کہ جو پانی ہم دودھ میں ملاتے تھے، وہ آج اکٹھا ہو گیا اور ہماری گائے کو بہا کر لے گیا۔ بیٹے کی بات سن کر اس کو احساس ہوا کہ انسان جو کرتا ہے اس کا پھل اُسے ضرور ملتا ہے۔

☆☆☆☆

عصمت اللہ شاہ

سرائیکی سے ترجمہ: **خورشید ربانی**

باتوں کے زخم

پرانے زمانے کی بات ہے، کسی گاؤں میں ایک لکڑہارا رہتا تھا وہ روز جنگل جاتا، لکڑیاں کاٹتا اور شام کو گھر لے آتا اور پھر انہیں خشک ہونے کے لیے رکھ دیتا، جب کافی ساری لکڑیاں جمع ہو جاتیں تو شہر جا کر انہیں بیچ آتا، یوں اس کی گزر بسر آسانی سے ہو جاتی، جنگل میں کئی سالوں سے کام کرنے کے سبب اس کی جنگل کے بادشاہ شیر سے دوستی ہو گئی۔

شیر اس کا ہر طرح سے خیال رکھتا، جنگل کے دیگر موذی جانوروں سے اسے تحفظ فراہم کرتا اور لکڑیاں کاٹنے اور جمع کرنے میں بھی مدد دیتا، یوں وقت گزرتا رہا اور ان کی دوستی گہری ہوتی گئی۔ ایک دن لکڑہارے نے شیر سے کہا

”یار! ہماری دوستی کو اتنے سال ہو گئے ہیں لیکن تو کبھی میرے گھر نہیں آیا تو میری دعوت قبول کر اور کسی دن میرے گھر آ۔“

شیر نے یہ سن کر جواب دیا

”یار! تمہاری بات ٹھیک ہے، میرا دل بھی چاہتا ہے کہ تمہارے گھر آؤں، تمہارے بچوں سے ملوں لیکن تم خود بتاؤ کہ میں جنگل کا باسی اور تم شہر کے، میں تمہارے گھر کیسے آ سکتا ہوں۔“

لکڑہارا کہنے لگا

”کچھ نہیں ہوتا، تم ایک مرتبہ میرے گھر آؤ تو سہی، میں تمہیں بکری کا بچہ کھلاؤں گا، تیری بہت خدمت کروں گا، بس ایک مرتبہ ہی آ جاؤ۔“

شیر نے کوشش تو کی کہ لکڑہارے کو سمجھا سکے لیکن لکڑہارے کی ضد کے سامنے ہار مان لی اور آئندہ جمعرات کو آنے کا وعدہ کر لیا۔

لکڑہارے نے شیر کی رضامندی کے بعد گھر جا کر اپنی بیوی کو بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی، دونوں میاں

بیوی مہمان کی خدمت کے لیے تیاری کرنے لگے، جمعرات کے دن شیر وعدہ کے مطابق لکڑہارے کے گھر پہنچ گیا تو وہ دونوں بہت خوش ہوئے اور شیر کی خدمت خاطر میں لگ گئے۔ دوسری طرف علاقے کے حاکم کو پتا چلا کہ شیر لکڑہارے کے گھر آیا ہوا ہے تو اس نے لکڑہارے کو بلا لیا اور غصے سے کہا

”تمہیں شیر کو اپنے گھر لانے کی جرات کیسے ہوئی، تم نے ہم سے کیوں نہیں پوچھا؟ ابھی جاؤ اور شیر کو گھر سے نکال دو ورنہ میرے آدمی شیر کو بھی مار دیں گے اور تمہیں بھی۔“

لکڑہارا یہ سن کر کانپنے لگا اور روتا ہوا گھر واپس آ گیا۔ شیر نے اپنے دوست کو پریشان دیکھ کر پوچھا

”یار! خیریت تو ہے، کیوں رو رہے ہو؟“

لکڑہارے نے کہا کہ

”کیا بتاؤں؟ بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ تمہیں گھر سے نکال دوں، اس کے بندے بھی پہنچنے والے ہیں۔“

شیر نے کہا

”تم فکر نہ کرو، میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ لیکن تم نے میری بات نہیں مانی، اب اگر میری وجہ سے تمہیں مشکل پیش آ رہی ہے تو میں جا رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر شیر اٹھ کھڑا ہوا، اتنی دیر میں بادشاہ کے آدمی بھی پہنچ گئے اور آتے ہی شیر کو مارنا شروع کر دیا، شیر بھاگ کھڑا ہوا تو سپاہیوں نے اس کا پیچھا کیا، اتنے میں لکڑہارے کی آواز آئی ”مارو، مارو اس موذی کو مارو۔“

شیر بھاگ کر جنگل پہنچ گیا، کچھ دنوں کے بعد لکڑہارا جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔ شیر بھی وہاں آ گیا اور درخت کے نیچے کھڑے ہو کر لکڑہارے سے کہا

”یار! تم درخت سے نیچے اترو، ایک ضروری بات کرنی ہے“

لکڑہارا نیچے اترا تو شیر نے کہا

”میرے کندھے پر کلہاڑی مارو“

لکڑہارا کہنے لگا

”یہ کیسے ہو سکتا ہے تم میرے دوست ہو، میں تمہیں کیسے مار سکتا ہوں۔“

شیر دھاڑا اور غصے سے کہا

”میں نے تمہیں جو کچھ کہا ہے وہ کرو ورنہ میں تمہاری آنتیں نکال دوں گا“

یہ سن کر لکڑہارے نے کانپتے کانپتے شیر کے کندھے پر کلہاڑی ماردی جس کے باعث خون بہنے لگا، شیر نے کوئی بات نہ کی اور سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔

کئی دنوں کے بعد لکڑہارا جب لکڑیاں جمع کر رہا تھا شیر آ گیا اور سلام دعا کے بعد لکڑہارے کو اپنا کندھا دکھا کر پوچھا

”یہاں کوئی زخم ہے“

لکڑہارے نے کہا ”نہیں“ ”زخم تو بھر چکا ہے“

یہ سن کر شیر نے ٹھنڈی آہ بھری اور کہا

”تم نے دیکھ لیا کہ تمہاری کلہاڑی کا زخم بھر گیا ہے لیکن تم نے جو بات کی تھی اس کا زخم ابھی تازہ ہے“

لکڑہارا یہ سن کر شرمندہ ہوا اور معافی مانگنے لگا شیر نے اس کی کوئی بات نہ سنی اور کہا

”یہاں سے چلے جاؤ اور پھر کبھی اس طرف نہ آنا۔ اگر تم یہاں دوبارہ نظر آئے تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

لکڑہارا اپنی بات پر بہت پچھتایا اور پھر کبھی جنگل نہ گیا۔

☆☆☆☆

عصمت اللہ شاہ

سرائیکی سے ترجمہ: **خورشید ربانی**

پانی، پھل، روشنی اور سونے کی جگہ

ایک مرتبہ ایک بادشاہ اپنے وزیروں کے ہمراہ جنگل میں شکار کرنے گیا، کافی دیر تک گھومنے پھرنے کے باوجود انہیں کوئی شکار نہ ملا تو بادشاہ نے سب سے زیادہ عقل مند وزیر سے کہا کہ کوئی بات چھیڑو تا کہ وقت گزارنے میں آسانی ہو، وزیر نے باادب ہو کر عرض کی

”بادشاہ سلامت! سیانے لوگ کہتے ہیں کہ دریا جیسا پانی، آم جیسا پھل، دیے جیسی روشنی اور سونے کے لیے پلنگ سے بہتر کوئی چیز نہیں۔“

وہ یہ باتیں کر رہا تھا کہ راستے میں ایک چرواہا انہیں ملا، چرواہے نے وزیر کی باتیں سن کر بادشاہ سے کہا

”یہ سب باتیں جھوٹ ہیں“

بادشاہ اور وزیر چرواہے کی باتیں سن کر رک گئے، بادشاہ نے چرواہے سے پوچھا

”میاں! تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ یہ باتیں درست نہیں“

چرواہے نے کہا

”میں مثالوں سے ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ باتیں غلط ہیں۔“

بادشاہ نے پوچھا وہ کیسے؟ چرواہے نے مودب ہو کر کہا

”بادشاہ سلامت! فرض کریں آپ جنگل میں اکیلے سفر کر رہے ہوں، آپ کو پیاس بھی لگی ہو اور آپ اتنے تھک چکے ہوں کہ ایک قدم چلنا بھی دشوار ہو تو سینکڑوں میل دور بہنے والے دریا کا آپ کو کیا فائدہ ہو گا، یہ بات درست ہے کہ دریا کا پانی صاف اور شفاف ہوتا ہے لیکن پانی تو وہی اچھا ہے جو آپ کے کام آ جائے اور آپ کے پاس ہو۔ اس لیے یہ بات درست نہیں کہ دریا کے پانی جیسا پانی کوئی نہیں، حقیقت یہ ہے کہ پانی وہی قیمتی ہے جو آپ کے پاس ہے۔“

بادشاہ نے اس کی بات مان لی اور کہا

''اب یہ بتاؤ آم والی بات کیوں غلط ہے؟''

چرواہے نے کہا

''بادشاہ سلامت! آپ خود سوچیں اور بتائیں کہ آم بھی کوئی پھل ہے، کچا ہو تو ترش (کھٹا) ہوتا ہے، ترش آم کون کھاتا ہے اور جب پک جائے تو بھی کھانے کے قابل نہیں ہوتا۔ اصل پھل تو گندم ہے جسے ہم سارا سال کھاتے رہتے ہیں، امیر غریب سب لوگوں کی خوراک ہے، سب کا پیٹ پالتی ہے، اس لیے یہ بات غلط ہے کہ آم جیسا پھل کوئی نہیں، میں تو کہتا ہوں گندم جیسا پھل کوئی نہیں۔''

بادشاہ نے کہا

''یہ بات بھی ٹھیک ہے، اب بتاؤ کہ دیے کی روشنی جیسی کوئی روشنی نہیں، یہ بات کیسے غلط ہو سکتی ہے۔''

چرواہے نے کہا کہ:

''دیے کی روشنی کیا چیز ہے؟ آپ ایک اندھے آدمی کے سامنے ہزاروں چراغ روشن کر لیں، اسے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ بادشاہ سلامت! آپ دعا کریں اللہ آنکھوں کی روشنی دے، آنکھوں کا نور ہو تو اس سے زیادہ اچھی روشنی کوئی نہیں ہو سکتی۔''

بادشاہ کو چرواہے کی دلیل پسند آئی اور کہا کہ

''اس میں کوئی شک نہیں تم ٹھیک کہتے ہو، اب سونے کے لیے پلنگ سے زیادہ آرم دہ چیز کی مثال پیش کرو۔''

چرواہے نے کہا

''پلنگ میں آرام نہیں بلکہ حقیقی سکون تو خوشی میں ہے، سکھ میں ہے، آپ خود سوچیں کہ اگر آپ کی طبیعت ناساز ہو، آپ کے جسم پر پھوڑے نکلے ہوں تو کیا آپ کو پلنگ پر نیند آ جائے گی؟ ہرگز نہیں، اگر انسان خوش ہو، سکون اور سکھ میں ہو تو اسے پتھروں پر بھی نیند آ جاتی ہے۔ اس لیے یہ بات غلط ہے کہ سونے کے لیے آرام دہ چیز پلنگ ہے یا اس سے زیادہ پرسکون جگہ کوئی نہیں، میں تو کہتا ہوں کہ سکھ اور صحت سے اچھی چیز کوئی نہیں۔''

بادشاہ چرواہے کی بات سن کر بے حد خوش ہوا اور اسے انعام و اکرام سے نوازا۔

☆☆☆☆

نسیم اختر

کڑبل خان اور ماموں دیہہ

کڑبل خان ملتان شہر کا ایک زورآور پہلوان تھا۔ اُس کے باپ دادا کابل کے رہنے والے تھے۔ کڑبل خان کا خاندان ''نانی وال'' کہلاتا ہے جو کہ ملتان کا ایک نامی گرامی پہلوان خاندان سمجھا جاتا ہے۔ کڑبل خان ایک لمبا چوڑا، قد آور اور بھاری بھرکم جثے والا بندہ تھا۔ اُس نے اپنی حیاتی میں بڑے زورآور کام کیے تھے۔ اُسے دیکھ کر بچے، بڑے، بوڑھے سارے ڈر جاتے تھے۔ ملتان میں آج بھی بھاری، طاقتور آدمی کو کڑبل کہا جاتا ہے۔ سرائیکی زبان میں دو محاورے اسی کے نام سے تخلیق ہوئے:

''کڑبل کڑبل پوون'' (خوف طاری ہونا)

''کڑبل کڑبل تھیون'' (شور مچ جانا)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مائیں بچوں کو ڈرانے کے لیے کہتی تھیں کہ کڑبل آرہا ہے۔ جسے سُن کر روتا ہوا بچہ چُپ کر جاتا تھا۔

بڑے کہتے ہیں کہ ایک دن کڑبل خان ملتان کے قلعے میں سے گزر رہا تھا کہ ایک اَنجان آدمی اُس کے سامنے آ گیا اور کہنے لگا کہ تم کون ہو؟ کڑبل خان نے جواب دیا: ''میں کڑبل ہوں'' اُس آدمی نے پوچھا: ''میرے ساتھ لڑو گے''؟ کڑبل نے کہا: ''ابھی آ جاؤ''۔

کڑبل خان اُس کے ساتھ کشتی لڑنے لگ گیا۔ پر کڑبل خان کو وہ آدمی پہلوان نہیں لگا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اِس کو چت کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کڑبل خان نے پہلے تو چھوٹے موٹے داؤ مارے پر وہ آدمی بچ گیا۔ پھر کڑبل خان نے بڑے داؤ لگائے، وہ آدمی پھر بھی داؤ میں نہ آیا۔ کڑبل خان نے اب پورے داؤ مار کر اُسے چت کرنے کی کوشش کی۔ بڑے تر لے مارے پر کڑبل خان اُس کی پیٹھ نہ لگا سکا۔ بڑی دیر تک دونوں پہلوان لڑتے رہے۔ کڑبل خان جو بڑے بڑے پہلوانوں کو منٹوں میں چت کر دیتا تھا۔ اپنے سارے داؤ آزمانے کے باوجود اُسے نہ گرا سکا۔

کڑبل کے لیے یہ بڑی حیرانی اور شرم کی بات تھی، کافی دیر تک لڑنے کے بعد دونوں میں سے کوئی بھی نہ

گرا، آخر دونوں تھک ہار کر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ کڑ مل خان نے اُس سے پوچھا: ’’تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو‘‘ اُس آدمی نے کہا: ’’ میں ایک دیہہ ہوں اور ’’ماموں‘‘ میرا نام ہے۔ یہ سُنتے ہی کڑ مل خان کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ وہ خود بھی حیران تھا کہ آج تک ایسا پہلوان مجھے نہیں ملا۔

مائیں آج بھی بچوں کو کڑ مل خان اور دیہہ ماموں کی کہانی سُناتی ہیں۔ ماموں دیہہ آج ایک ایسے طاقتور آدمی کا نام بن گیا ہے جو اپنی طاقت کے حوالے سے بے مثال ہو۔

اس لیے تو کہتے ہیں:

چل چلیئے ملتان، اَتھاں وڈے وڈے پلھوان
کھاوِن گریاں تے بدام، مارن مُکّیں کڈھن جان

(سرائیکی لوک کہانی)

☆☆☆☆

نسیم اختر

کھلونا

آج کئی دنوں کے بعد وقاص کے زخموں کی چلچلاہٹ میں تھوڑا آفاق ہوا تو اُسے پھر سے وہی سب کچھ یاد آ گیا کہ اتوار کے روز وہ اپنے گھر کے قریبی پارک میں کھیلنے گیا تھا مگر کھیلتے کھیلتے اُسے گلاب کی کیاری میں پڑی بہت ہی خوبصورت جیپ نظر آئی ۔ جسے اُٹھانے کے لیے وہ فوراً لپکا ۔ اُٹھانے ہی والا تھا کہ وہ کھلونا نما جیپ پھٹ گئی اور پھر بہت سارے بچے زخمی ہو گئے ۔ وقاص چونکہ اُس کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا اس لیے اُسے زیادہ زخم آئے تھے ۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں تھا، جہاں اِردگرد اُس کے امی، ابو، چھوٹا اور گڑیا پریشان کھڑے تھے ۔ وقاص سب کو دیکھ کر خوش ہوا مگر جب زخموں کا احساس ہوا تو وہ بلک بلک کر رونے لگا ۔ ڈاکٹر نے فوراً انجکشن لگایا اور وقاص کو نیند آ گئی ۔ جمعرات کا دن تھا، جب ہسپتال کے بیڈ نمبر 16 پر نظمیں پڑھتے پڑھتے اُسے نیند آ گئی ۔ کچھ دیر بعد بڑبڑاتے ہوئے آنکھ کھولی:

‘‘نہیں نہیں میں کبھی بھی کھلونے کو ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا ۔ اماں بس میں ایک دفعہ ٹھیک ہو جاؤں، میں کبھی بھی پارک میں نہیں جاؤں گا، اماں آپ ڈاکٹر انکل سے کہیں نا کہ مجھے جلدی ٹھیک کر دیں ۔ میرا ہاتھ بھی واپس لگا دیں، آپ نے کہا تھا نا میرا ہاتھ دوبارہ لگ جائے گا اور میں پھر سے ڈرائنگ کر سکوں گا ۔ اماں کمپیوٹر پر گیم کھیلتے ہوئے تو دونوں ہاتھ کام کرتے ہیں ورنہ گیم ہار جاتے ہیں’’ ۔

‘‘میرا بیٹا کیوں پریشان ہو رہا ہے بس کچھ دنوں کی بات ہے اللہ کے فضل سے ٹھیک ہو جاؤ گے ۔ سارے گھاؤ بھر جائیں گے اور ہم ہسپتال سے گھر چلے جائیں گے ۔ پتہ ہے وقاص! روز گڑیا پوچھتی ہے کہ بھیا کب آئے گا؟ ہم مل کر کھیلیں گے ۔’’

‘‘مگر اماں اُسے بتا دینا کہ اب ہم باہر پارک میں کھیلنے نہیں جائیں گے ہم اپنے سارے کھلونے بھی باہر پھینک دیں گے کیونکہ کھلونے پھٹ جاتے ہیں اور بہت سارے بچے زخمی ہو جاتے ہیں’’ ۔

‘‘میرا بچہ صرف یہ خیال رکھنا ہے کہ کسی اور کے کھلونے کو ہاتھ نہیں لگانا ۔ آپ پارک میں ضرور جانا مگر اپنے اردگرد موجود مشکوک لوگوں پر نظر رکھنا ۔ کیونکہ یہ ہماری بھی ذمہ داری ہے کہ جو ظالم لوگ بم بلاسٹ کرتے ہیں اور انسانی جانوں سے کھیلتے ہیں ہم سب مل کر اُنھیں کیفرِ کردار تک پہنچائیں’’ ۔

(سرائیکی لوک کہانی)

فضل الرحمٰن میمن

سندھی سے ترجمہ: فہیم شناس کاظمی

عقل اور بخت

ایک بار عقل اور بخت کی آپس میں تکرار ہوگئی۔ عقل نے کہا ”میں طاقتور ہوں“ بخت نے کہا ”میں زبردست ہوں“ آخر انہوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ کسی آدمی کے ذریعے اپنا زور آزماتے ہیں۔ خود بخود پتہ چل جائے گا کہ کون طاقتور ہے۔

ایک چرواہا کسی بڑے زمیندار کی بکریاں چراتا تھا۔ رات دن بکریوں کے ساتھ رہتا تھا اس کی ساری عادتیں بکریوں جیسی ہوگئی تھیں وہ پانی بھی بکریوں کی طرح اوندھا ہو کر پیتا تھا اور کھانا بھی انہی کی طرح کھاتا تھا۔

اس ملک کے بادشاہ کی بیٹی بہت خوبصورت اور دلکش تھی اسے شہزادی کی شادی کرنی تھی۔ آس پاس کے سارے ملکوں کے بادشاہ شہزادی سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے۔ بادشاہ نے سوچا اگر کسی ایک ملک کے شہزادے یا بادشاہ سے اس کی شادی کروں گا تو دوسرے ملکوں کے حکمران ناراض ہو جائیں گے۔ ہمارا مقصد تو نیک کام ہے کسی سے لڑائی جھگڑا کرنا نہیں کیوں نہ ایسی چال چلی جائے کہ ”لعل بھی مل جائے اور محبت بھی رہ جائے“ سو اس نے وزیر سے مشورہ کرنے کے بعد ملک بھر میں اعلان کرا دیا کہ ”فلاں دن فلاں میدان میں گڑوی گھمائی جائے گی اور جس شخص پر گڑوی ٹھہرے گی اسی سے شہزادی کی شادی کی جائے گی۔

عقل اور بخت چرواہا کے ساتھ ساتھ اس میدان میں پہنچے۔ بخت نے عقل سے کہا ”اب میرا کمال دیکھو میں چرواہے کا ساتھی بن رہا ہوں پھر مان لینا کہ کون طاقتور ہے۔

عقل نے کہا ”دیکھا جائے گا تم اپنا کام دکھاؤ“

میدان میں جب سب جمع ہو گئے تو بادشاہ نے گڑوی گھمانے کا حکم دیا۔ گڑوی گھومتی ہوئی سیدھی چرواہے کے سامنے آ کر رکی جس کا منہ سر مٹی تھا کپڑے پھٹے پرانے تھے۔ دوسرے ملکوں کے بادشاہ اور شہزادے حیران تھے کہ اتنی حسین و جمیل شہزادی کی شادی اس غریب سے ہوگی۔ خود بادشاہ بھی حیران و پریشان

تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ گڑوی دوبارہ گھمائی جائے۔ گڑوی دوبارہ گھمائی گئی اور خدا کی قدرت سے وہ پھر چرواہے کے سامنے آ کر رُکی۔ بادشاہ نے تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر اسے اپنا داماد قبول کر لیا۔ چرواہے کو غسل کے بعد بہترین کپڑے پہنائے گئے اور بنا سنوار کے اسے بادشاہ کے پاس لایا گیا اور بادشاہ نے اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دی۔ نکاح کے بعد چرواہے کو کھانا ملا جو اس نے اپنی عادت کے مطابق بکریوں کی طرح اُلٹا لیٹ کر کھایا، تمام لوگ اسے حیران ہو کر دیکھتے رہے۔ کھانے کے بعد کنیزیں اسے شہزادی کے پاس چھوڑ آئیں وہ وہاں بھی چرواہوں والی آوازیں دیتا رہا۔ بچاری شہزادی کو بہت دُکھ ہوا وہ اُداس اور خاموش بیٹھی اس کی سب حرکتیں دیکھتی رہی۔ پھر اس نتیجے پر پہنچی کہ چرواہے میں ذرہ برابر بھی عقل نہیں ہے۔ کیوں نہ اس سے تین سوال پوچھوں اگر غلط جواب دے گا تو اسے پھانسی چڑھوا دوں گی اور میری جان آزاد ہو جائے گی یہ سوچ کر اس بے چاری شہزادی نے چرواہے سے کہا

”تم سے سوال پوچھتی ہوں اگر تم نے درست جواب دیئے تو ٹھیک، ورنہ تم کو پھانسی کی سزا ملے گی۔“

چرواہے نے بلا سوچے سمجھے شہزادی کی بات تسلیم کر لی

شہزادی نے پوچھا

”بتاؤ۔۔۔ پیٹ کس کا اچھا ہے۔ پانی کس کا اچھا ہے، پھول کون سا اچھا ہے۔۔۔؟

چرواہے نے کہا

”پیٹ مچھلی کا اچھا، پانی لکڑی کا اچھا، پھول گوبھی کا اچھا۔“

چرواہے کے اُلٹے جواب سن کر شہزادی غصے سے آگ بگولا ہو گئی اور فی الفور وزیر کو بلا کر حکم دیا کہ

”اس بے وقوف کو لے جا کر پھانسی پر چڑھا دو۔“

عقل اور بخت دونوں یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ اب یہ مرے گا۔ عقل نے بخت سے کہا

”تم نے اس کے ساتھ بھلائی کی کہ اس کی شادی شہزادی سے کرائی۔۔ مگر ایسا بخت کس کام کا کہ شادی کی رات ہی اسے پھانسی چڑھا دیا جائے۔۔ اب ہمت کرو اور اس کی مدد کرو۔“

بخت نے کہا

”میری جتنی طاقت تھی وہ میں نے دکھا دی اب یہ جانے اور اس کا مقدر“

اس پر عقل نے کہا کہ

''میں اس کی جان بچا کر دکھاتا ہوں ۔۔اب تم میرا ہنر دیکھو''

یہ کہہ کر عقل چرواہے کے دماغ میں جا کر بیٹھ گئی اور چرواہا یکدم ہوش وحواس میں آ گیا اس نے وزیر سے پوچھا

''آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں''

وزیر نے اسے شہزادی کے حکم سمیت ساری بات بتائی ، جس پر چرواہے نے سوچا کہ اگر اب ہمت نہ کی اور عقل سے کام نہ لیا تو مارا جاؤں گا ۔ کیوں نہ کسی طریقے سے جان بچائی جائے ، اس نے وزیر سے کہا

''محترم وزیر ! شہزادی کا حکم سر آنکھوں پر مگر مرنے سے پہلے مجھے ایک بار بادشاہ سے ملوا دو ! پھر تم مجھے خوشی سے پھانسی چڑھا دینا ۔''

وزیر نے اس کی بات مان لی اور اسے بادشاہ کے حضور پیش کر دیا ۔

بادشاہ نے پوچھا'' ۔۔۔کیا بات ہے ۔۔۔کیسے آنا ہوا''

چرواہے نے کہا

''بادشاہ سلامت ! آپ نے اپنی خوشی سے شہزادی سے میری شادی کرائی ہے اور شادی کی رات ہی کسی کو پھانسی چڑھانا کہاں کا انصاف ہے''

بادشاہ نے جواب طلب نظروں سے وزیر کو دیکھا ۔ وزیر نے سر جھکا کر کہا

''بادشاہ سلامت آپ ہمیشہ سلامت رہیں ۔ شہزادی صاحبہ کا حکم ہے کہ یہ احمق ہے اسی لیے اسے پھانسی چڑھایا جائے ۔

بادشاہ نے شہزادی کو طلب کیا اور اس سے واقعہ پوچھا ۔

شہزادی نے بادشاہ کو بتایا

''قبلہ حضور ! اس طرح ہم نے شرط رکھی اور اس نے میرے سوالوں کے درست جواب نہیں دیئے اس لیے ہم نے پھانسی کا حکم دیا ۔''

بادشاہ نے حکم دیا کہ

''وہ سوال ہمارے سامنے پوچھے جائیں اگر درست جواب دے تو ٹھیک ۔۔۔ ورنہ اسے پھانسی چڑھا دینا ۔''

شہزادی نے پہلا سوال کیا ” پیٹ کس کا اچھا ہے؟

چرواہے نے کہا

” پیٹ دھرتی کا اچھا ہے جس میں سب کچھ سما جاتا ہے“

شہزادی نے دوسرا سوال کیا ” پانی کس کا اچھا ہے“

چرواہے نے کہا

” پانی بارش کا اچھا ہے جس پر سانس لینے والی ساری مخلوق کی زندگی کا انحصار ہے ۔ ’’

شہزادی نے تیسرا سوال کیا ” پھول کس کا اچھا ہے“

چرواہے نے جواب دیا

” کپاس کا پھول سب سے اچھا ہے جو ساری مخلوق کا تن ڈھانپتا ہے ۔ ’’

یہ جواب سن کر بادشاہ نے کہا

” بیٹی یہ سب باتیں تو عقل مندوں کی ہیں ۔ شہزادی نے شرمندہ ہو کر اپنے شوہر سے معافی مانگی اور پھر وہ خوش گوار زندگی گزارنے لگے ۔

یہ دیکھ کر بخت نے عقل سے کہا

” اے عقل ۔ تم بلاشبہ مجھ سے طاقتور ہو میں کچھ بھی نہیں ہوں“

وہ دونوں راضی خوشی اچھے دوستوں کی طرح ساتھ ساتھ رہنے لگے

☆☆☆☆

فضل الرحمٰن میمن

سندھی سے ترجمہ: فہیم شناس کاظمی

کامیابی کا راز

بہت عرصہ پہلے کسی ملک پر ایک بادشاہ کی حکومت تھی جسے کامیابی کے راز کی تلاش تھی۔۔۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ تین سوالوں کے جوابات تلاش کر لے گا تو اسے کامیابی کا راز مل جائے گا اور وہ کبھی بھی ناکام نہیں ہوگا۔ وہ تین سوال یہ ہیں۔

۱۔ کسی کام کو شروع کرنے کا اہم وقت کون سا ہے؟

۲۔ سب سے اہم کام کون سا ہے؟

۳۔ کون سب سے اہم آدمی ہے؟

یہ سوچ کر بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ وہ ملک بھر میں اعلان کرا دے جو بھی ان تین سوالوں کے جواب دے گا اسے پانچ ہزار درہم انعام دیا جائے گا۔

بہت سے لوگ آئے مگر کوئی بھی صحیح جواب نہ دے سکا۔ بادشاہ نے اپنے دربار میں دانشمندوں، مفکروں اور علماء کو بلایا اور ان سے اپنے سوالوں کے جوابات پوچھے مگر کوئی بادشاہ کو مطمئن نہیں کر سکا۔ کیونکہ ان میں سے اگر کوئی ایک جواب دیتا تھا تو دوسرا اس کی مخالفت میں دلائل دیتا تھا۔ کوئی ایک مشورہ دیتا تھا تو دوسرا کوئی اور بات کرتا تھا۔ اس طرح بادشاہ کسی کے جواب سے بھی مطمئن نہ ہو سکا۔

اب بادشاہ بالکل ناامید ہو چلا تھا کیونکہ کوئی بھی ایسا آدمی نہیں رہا تھا جو اس کے سوالوں کے جواب دے۔ آخر کار بادشاہ کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اسے اپنے سوالوں کے جواب ملنے کی امید نظر آئی۔

محل سے کچھ فاصلے پر جنگل میں ایک بزرگ دانشمند درویش رہتا تھا جس کی شہرت سارے ملک میں تھی۔ بادشاہ نے اس سے مشورہ کرنا چاہا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ درویش کسی امیر آدمی سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ آخر کار بادشاہ کو اس مسئلے کا حل نظر آیا اس نے میلے کچیلے اور پیوند لگے کپڑے پہنے اور درویش سے ملنے روانہ ہو گیا۔ جب وہ درویش کی جھونپڑی کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ درویش اپنی جھونپڑی کے سامنے زمین کھود رہا

ہے۔ درویش بہت بوڑھا اور کمزور تھا اور بہت مشکل سے سانس لے رہا تھا وہ دو چار کدالیں مار کر سانس لینے کے لیے رک جاتا تھا اس دوران بادشاہ اپنے بہروپ میں وہاں پہنچا اور اس سے عرض کی سائیں بابا۔۔۔ میں دور سے اپنے سوالوں کے جواب لینے حاضر ہوا ہوں۔ میرے سوال یہ ہیں کہ کسی کام کو شروع کرنے کا اہم وقت کون سا ہے؟ سب سے اہم کام کون سا ہے؟ اور سب سے اہم آدمی کون ہے؟ کیا آپ ان سوالوں کے جواب دے کر میری مدد فرمائیں گے؟

درویش نے بادشاہ کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور اپنا کام جاری رکھا۔ بادشاہ نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر کہا ”سائیں بابا! تم کمزور ہو اور تھکے ہوئے نظر آ رہے ہو اپنی کدال مجھے دو میں زمین کھودتا ہوں۔

درویش نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا اور کدال اسے دے دی۔ بادشاہ نے زمین کھودنا شروع کی۔۔۔ کچھ دیر کے بعد اس نے پھر درویش سے اپنے سوالوں کے جواب پوچھے۔ درویش سوالوں کے جواب دینے کے بجائے اس سے بولا ”لاؤ کدال مجھے دو“۔ بادشاہ خاموشی سے زمین کھودتا رہا۔

بادشاہ نے ہمت نہیں ہاری صبر سے کام لیتے ہوئے وہ زمین کھودتا رہا اسے امید تھی کہ آخر کار اسے اپنے سوالات کے جواب ضرور ملیں گے۔۔۔ اسی طرح کام کرتے ہوئے اسے شام ہو گئی تو اس نے کھدائی ختم کی اور درویش سے کہا

”مہربانی فرما کر اب مجھے سوالوں کے جواب دے دیں۔“ درویش نے پھر کچھ نہیں کہا اور ایک سمت منہ پھیر کر اشارہ کیا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ ایک بڑی داڑھی والا آدمی دوڑتا آ رہا ہے جس کے سیدھے ہاتھ میں خنجر ہے جب وہ آدمی ان کے نزدیک پہنچا تو گر کر بے ہوش ہو گیا اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ بادشاہ اسے اٹھا کر جھونپڑی میں لایا۔ اسے زمین پر لٹا کر اس کی مرہم پٹی کی تکلیف میں کمی ہونے سے وہ آدمی جلد ہی سو گیا۔

رات ہو چکی تھی بادشاہ بھی بہت تھک گیا تھا۔ درویش نے اسے رات وہیں گزارنے کو کہا۔ بادشاہ نے اس کی مہمانی خوشی سے قبول کی۔ درویش نے اس کو کھانا دیا اور سونے کے لیے گھاس پھونس کا بستر دیا۔ صبح بادشاہ جاگا تو دیکھا کہ وہ داڑھی والا آدمی جاگ رہا ہے۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ اس نے کہا کہ اب میں خود کو بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں۔۔۔ تمہاری مہربانی ہے۔۔۔ تم مجھے معاف کر دو۔۔۔ میں یہاں تم کو مارنے کے لیے آیا تھا کیونکہ تم نے میرے بھائی کو قتل کیا تھا دکھ اور صدمے کی وجہ سے میں تمہارا جانی دشمن بن گیا تھا۔۔۔ میں تمہیں قتل کرنے کے ارادے سے رستے میں چھپا بیٹھا تھا اور تمہاری

واپسی کا انتظار کر رہا تھا مگر جب تم واپس نہیں آئے تو میں اپنی چھپنے والی جگہ سے باہر نکلا۔ تمہارے محافظوں نے مجھے پہچان کر خوب مارا جس سے میں زخمی ہو کر کسی طرح ان کی گرفت سے بھاگ نکلا اور بچ کر یہاں پہنچ گیا اگر تم ہمدردی نہ کرتے اور مجھے سنبھالتے نہیں تو میں مر جاتا اس لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں اور اب تم مجھے اپنے وفادار نوکروں میں سے ایک سمجھو یہ کہہ کر اس نے بادشاہ کو سلام کیا اور چلا گیا۔

جب وہ چلا گیا تو بادشاہ نے پھر درویش سے اپنے سوالوں کا جواب پوچھا۔ درویش نے کہا ''تمہیں اپنے سوالوں کے جواب پہلے ہی مل چکے ہیں۔''

''بہت ضروری وقت وہ تھا جب تم نے میری مدد کرنی چاہی۔ بہت ضروری کام زمین کی کھدائی تھی اور میں تمہارے لیے بہت اہم آدمی تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو تم واپس چلے جاتے اور رستے میں مارے جاتے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ ضروری کام اس داڑھی والے آدمی کی مرہم پٹی تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو تم کو ایک وفادار نوکر نہ ملتا۔''

تم بہت اچھی قسمت والے بادشاہ ہو۔ بادشاہ یہ سن کر بہت خوش ہوا اور درویش کو سلام کر کے واپس اپنے محل چلا گیا۔

☆☆☆☆

لیلارام روچندانی

سندھی سے ترجمہ: **فہیم شناس کاظمی**

عقل مند بادشاہ

ایک ساہوکار شخص تھا جس کے پاس بے شمار مال و دولت تھی اس کے چار بیٹے تھے ایک بار وہ شخص بیمار ہوا بہت علاج معالجہ کیا گیا مگر اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی زندگی بچنا محال ہے تو اس نے سوچا کہ میرے پاس جو ملکیت ہے وہ ابھی سے بیٹوں میں تقسیم کردوں۔ میرے مرنے کے بعد دولت کی وجہ سے آپس میں لڑتے نہ رہیں۔ یہ سوچ کر اس نے چار دیگچے منگوائے اور اپنی تمام ملکیت کے چار حصے کر کے ان دیگچوں میں رکھے اور ان دیگچوں کو اپنی چارپائی کے چاروں پائیوں کے نیچے دبا دیا۔

جب سکرات کا وقت آیا تو اس نے چاروں بیٹوں کو بلا کر کہا

”بیٹو! مال و دولت ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے ہمیشہ خون خراب ہوتا ہے میں نے اپنی ملکیت کے چار حصے کر کے چارپائی کے چاروں پائیوں کے نیچے دبا دی ہے تم سب میرے سامنے چارپائی کا ایک ایک پایہ منتخب کرلو، میرے مرنے کے بعد ان کے نیچے سے جو کچھ برآمد ہو وہ اس کا ہے۔

بیٹوں نے والد کے سامنے قرعہ اندازی کی اور اپنا اپنا پایہ چن لیا۔ جب ساہوکار کا انتقال ہوگیا تو چاروں بھائیوں نے اپنا اپنا پایہ کھود کر دیگچہ برآمد کیا۔ ایک دیگچے میں ہیرے جواہرات تھے دوسرے میں سونا چاندی تیسرے میں صرف مٹی تھی اور چوتھے میں صرف دو چار سوکھی ہڈیاں تھیں جن کے حصے میں سونا چاندی ہیرے جواہرات آئے وہ بہت خوش ہوئے اور جن کے حصے میں مٹی اور ہڈیاں آئیں تھیں وہ سخت ناراض ہوئے اور بولے

”ہم ملکیت سے ضرور حصہ لیں گے اس دھول مٹی کو ہم کیا کریں گے، اس پر دوسرے بھائی بولے۔ ہم نے بابا کہ سامنے اپنے پائے منتخب کیے تھے۔ اب کیا ہوسکتا ہے۔ آخر وہ بحث و تکرار کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ضرور اس میں کوئی راز ہے۔ اس لیے کسی عقل مند سے اس کا فیصلہ کرایا جائے۔

سب بھائی اس بات پر راضی ہوئے اور عقل مند کی تلاش شروع کردی مگر انہیں کوئی نہیں ملا جس پر وہ

اپنے ملک کے بادشاہ کے پاس انصاف حاصل کرنے چل پڑے۔

جب بادشاہ کے شہر کے نزدیک پہنچے تو انہوں نے دور سے شہزادے کو آتا دیکھا انہوں نے شہزادے سے بادشاہ کے بارے میں پوچھا تو شہزادے نے کہا

’’بادشاہ بیٹھا تو ہے مگر پاگل ہوگیا ہے۔‘‘

یہ بات انہیں بہت عجیب لگی۔۔ سوچا کہ واپس لوٹ جائیں مگر پھر آگے چل پڑے۔ جب محل کے قریب باغ میں انہیں شہزادی ملی انہوں نے شہزادی سے بادشاہ کا پوچھا تو شہزادی نے کہا۔

’’بادشاہ بیٹھا تو ہے مگر اندھا ہو کر بیٹھا ہے‘‘

اس بات نے سب بھائیوں کو بہت پریشان کیا اور سوچا ضرور اس میں بھی کوئی راز ہے ابھی تھوڑا سا ہی آگے بڑھے تھے کہ انہیں ملکہ ملی ایک کھڑکی میں بیٹھی نظر آئی۔ بادشاہ کے بارے میں پوچھنے پر ملکہ نے کہا کہ ’’وہ ایک سال پہلے مر گیا ہے‘‘ ملکہ کی اس بات نے انہیں اور حیران و پریشان کردیا۔ محل کے دوسرے ملازمین نے بتایا کہ بادشاہ زندہ سلامت اور ٹھیک ٹھاک موجود ہے وہ چاروں بھائی بادشاہ کے دربار میں پہنچے اور بادشاہ سے فیصلے کے لیے عرض گزاری۔

بادشاہ نے ان کی بات سن کر کچھ دیر سوچا اور پھر راز حل کرتے ہوئے بولا

’’تمہارے والد نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے ہیرے جواہرات والا اپنے جواہرات سنبھالے، سونے چاندی والا اپنی متاع سنبھالے جسے مٹی کا حصہ ملا ہے وہ اپنے والد کی زمین سنبھالے اور جسے ہڈیاں ملی ہیں وہ تمام چوپایہ مال کا مالک ہے۔‘‘

بادشاہ کا یہ فیصلہ سن کر چاروں بھائی بہت خوش ہوئے اور بادشاہ کا شکر بجالائے اور عرض کی بادشاہ سلامت اگر آپ کی اجازت ہو تو عرض کریں۔ بادشاہ نے کہا ’’کہو کیا بات ہے‘‘ ایک نے عرض کی

’’حضور ہم جب آپ کی سمت آرہے تھے تو ہمیں پہلے شہزادہ ملا جس نے کہا کہ بادشاہ بیٹھا ہے مگر وہ پاگل ہے، پھر شہزادی ملی جس نے کہا بادشاہ بیٹھا ہے مگر وہ اندھا ہے پھر ملکہ ملی اس نے کہا بادشاہ کو مرے ہوئے بارہ مہینے ہوگئے ہیں۔ جب ہم یہاں پہنچے تو دیکھا کہ آپ ماشاءاللہ زندہ سلامت موجود ہیں۔ آخر ان سب باتوں کا کیا مطلب ہے۔‘‘

بادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا

"بلاشبہ انہوں نے سچ کہا ہے مگر تم ان کی بات نہیں سمجھے۔ شہزادے نے جو مجھے پاگل کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ابھی اس کی شادی نہیں کرنا چاہتا بلکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ ابھی پڑھے لکھے اور زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے۔ اس کے بعد اس کی شادی کراؤں مگر شہزادہ سمجھتا ہے کہ وہ بالغ ہو گیا اور پھر بھی اس کی شادی نہیں کرا رہا۔ شاید سمجھتا نہیں اس لیے پاگل ہو گیا ہے۔

شہزادی نے کہا کہ بادشاہ اندھا ہو گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شہزادی سمجھتی ہے کہ وہ سولہ سال کی ہو گئی ہے۔ بادشاہ مجھے روز دیکھتا ہے مگر اس کے باوجود میری شادی نہیں کرا رہا! مگر حقیقت میں مجھے اس کے لائق کوئی مناسب رشتہ ملے تو اس کی شادی کروں اس لیے وہ سمجھتی ہے کہ میں اندھا ہو گیا ہوں۔

ملکہ نے اس لیے کہا کہ مجھے مرے ہوئے سال ہو گیا ہے کہ بارہ ماہ سے میں بادشاہت کے کاموں میں اس قدر مصروف ہوں کہ ایک ساعت کے لیے بھی رانی سے ملاقات نہیں کر سکا ہوں اس لیے وہ سمجھتی ہے کہ "بادشاہ مر گیا ہے۔"

بادشاہ کی یہ عقل مندی کی باتیں سن کر چاروں بھائی بادشاہ کی عقل اور دانائی کی تعریف کرنے لگے۔ اپنے انصاف پر مبنی فیصلہ سن کر ان کے دل کو تسلی ہوئی اور وہ بادشاہ کو درازیٔ عمر اور سلامتیٔ بادشاہت کی دعائیں دیتے ہوئے گھر لوٹ آئے اور آپس میں ہنسی خوشی رہنے لگے۔

☆☆☆☆

محمد ابراہیم جویو

سندھی سے ترجمہ: **فہیم شناس کاظمی**

کوا اور چڑیا

ایک تھا کوا اور ایک تھی چڑیا۔۔۔ ایک دن کوے کے دل میں خیال آیا کہ یہ چڑیا ہے جو لوگوں کے گھروں میں گھونسلے بنا کر رہتی ہے تو بھی کوئی اسے الف ب نہیں کہتا جبکہ مجھے کوئی دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔۔۔ ہو نہ ہو یہ فساد اس چڑیا کا پھیلایا ہوا ہے۔ جو لوگوں کو میرے خلاف بھڑکاتی ہے ان کے کان بھرتی ہے۔۔۔ بس اب چڑیا کی خیر نہیں۔ اب وہ رہے گی یا میں۔

یہ ٹھان کر کوا چڑیا کی تاڑ میں بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد چڑیا گھونسلے سے نکلی اور اس کے برابر آ بیٹھی۔۔۔ کوے نے موقع دیکھ کر بات شروع کی

”بی بی چڑیا۔۔۔ تم دانہ چگنے میں بہت تیز ہو آج ہم آپس میں شرط لگا کر دانہ چگتے ہیں۔ یہ گندم جو گھر کی مالکن نے سوکھنے کے لیے دھوپ میں رکھی ہے اگر تم اسے کھا جاؤ تو میں تم کو مان جاؤں گا، کہ میں ہارا اور تم جیتیں، اگر تم ہار گئیں تو پھر تم میرے بس میں ہوگی کہ میں تم کو کھا جاؤں۔“

بی بی چڑیا بھولی بھالی ہونے کی وجہ سے مکار کوے کی باتوں میں آ گئی اور اس نے شرط قبول کر لی اور اگلے ہی لمحے اڑان بھر کے گندم کے ڈھیر پر جا بیٹھی اور تیزی سے چونچ چلانے لگی۔ دو تین چونچوں میں ہی اس کا پیٹ بھر گیا اور وہ منہ پھیر کر وہیں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ جس پر کوے نے پوچھا

”بی بی چڑیا۔۔۔ کیا ہوا۔۔ کچھ تو ہمت کرو۔۔“

چڑیا نے دو چار چونچیں اور ماریں مگر آخر وہ چڑیا تھی اس کا پیٹ اپھر گیا۔ وہ خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی۔۔۔

کوے کے جوش دلانے پر چڑیا نے ایک بار اور دو تین چونچیں چلائیں اور پھر۔۔۔ بڑی مشکل سے گندم سے اڑ کر کوے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

کوا خوشی سے دُم ہلاتا ہوا چڑیا کے پاس آ بیٹھا اور بولا:

''بی بی چڑیا۔۔۔!تم شرط ہار چکی ہو اور میں جیت گیا ہوں۔۔۔اب میں تم کو کھاؤں گا۔''

چڑیا نے موت اپنے سامنے دیکھی تو سکتے میں آ گئی۔۔۔دل ہی دل میں ہمت کی اور کچھ سوچ کر کوے سے بولی۔

''بے شک میں شرط ہار گئی ہوں تم مجھے کھا سکتے ہو مگر پہلے اپنی گندی چونچ دریا سے دھو کر آ ؤ پھر تمہیں کھانے میں مزا آ ئے گا۔''

کوے نے چڑیا کی بات مانی اور خوشی سے دریا کو روانہ ہوا اور چند لمحوں میں دریا پر پہنچ گیا جو وہاں سے نزدیک ہی بہہ رہا تھا۔ کوے نے دریا سے کہا۔۔۔

''دریا ارے دریا مجھ کو پانی دے کہ پانی سے چونچ دھو کر میں چڑیا کو کھاؤں۔''

دریا نے کہا

''پانی میں تم کو کس میں دوں، بھینس ہے تم جا کر بھینس سے سینگ لے آ ؤ تو اس میں تم کو پانی دوں پھر تم چونچ دھو کر چڑیا کو کھانا۔''

یہ سن کر کوا بھینس کے پاس گیا اور بولا

''بھینس ارے بھینس۔۔۔مجھے سینگ دو۔۔۔سینگ دریا کو دوں۔۔۔دریا پانی دے۔۔۔پانی سے میں چونچ دھو کر چڑیا کو کھاؤں۔۔''

بھینس نے کہا

''سینگ تو میں تم کو دوں مگر تم پہلے گھاس والے سے مجھے گھاس لا دو۔۔۔میں گھاس سے پیٹ بھروں پھر میں تم کو سینگ دوں۔ تم سینگ دریا کو دو۔۔دریا تم کو پانی دے اور تم پانی سے چونچ دھو کر چڑیا کھاؤ۔''

کوا اُڑا اور گھاس والے کے پاس گیا اور کہا

''گھاس والے ارے گھاس والے، مجھے گھاس دو۔۔۔گھاس میں بھینس کو دوں، بھینس مجھے سنگ دے، سینگ میں دریا کو دوں۔۔۔دریا مجھ کو پانی دے اور پانی سے چونچ دھو کر میں چڑیا کھاؤں۔''

گھاس والے نے کوے سے کہا

''تم مجھے لوہار سے درانتی لا دو، درانتی سے گھاس کاٹ کر میں تم کو دوں، تم گھاس بھینس کو دو۔۔۔بھینس تم کو سینگ دے۔۔۔سینگ تم دریا کو دو۔۔دریا تم کو پانی دے، پھر پانی سے چونچ دھو کر تم چڑیا کو کھاؤ۔''

یہ سن کر کوا لوہار کے پاس گیا اور لوہار سے بولا:

"لوہار ارے لوہار مجھے درانتی دے، درانتی میں گھاس والے کو دوں، گھاس والا گھاس دے، گھاس بھینس کو دوں، بھینس سنگ دے، سینگ میں دریا کو دوں، دریا مجھ کو پانی دے، پانی سے میں اپنی چونچ دھو کر چڑیا کو کھا سکوں۔"

لوہار نے کہا:

"میں تمہیں اچھی اور تیز سی درانتی دیتا مگر میری بھٹی بجھی پڑی ہے تم مجھے کہیں سے انگارہ لا دو تو میں بھٹی جلا کر تمہیں درانتی بنا دوں پھر تم درانتی گھاس والے کو دو، گھاس والا گھاس دے، گھاس تم بھینس کو دو، بھینس تم کو سینگ دے، سینگ تم دریا کو دو، دریا تم کو پانی دے، پانی سے تم چونچ دھو کر مزے سے چڑیا کھاؤ۔"

کوا انگارے کی تلاش میں اُڑا۔۔۔ اُڑتے اُڑتے تھک گیا بہت دیر بعد اسے زمین پر ایک جگہ آگ نظر آئی اس آگ پر ایک بڑھیا دیگچے میں دال پکا رہی تھی۔۔۔ وہ مضطرب اور بے تاب ہو کر زمین پر اُترا اور بڑھیا سے تھوڑے فاصلے پر آ کر بیٹھ گیا، اور ہمت کر کے بڑھیا سے بولا:

"بڑھیا ارے بڑھیا! مجھے انگارہ دو، انگارہ میں لوہار کو دوں، لوہار اپنی بھٹی جلائے، درانتی بنائے، درانتی میں گھاس والے کو دوں، گھاس والا گھاس دے، گھاس میں بھینس کو دوں، بھینس مجھے سینگ دے، سینگ دریا کو دوں۔۔ دریا مجھے پانی دے، پانی سے میں چونچ دھو کر چڑیا کو کھاؤں۔"

بڑھیا نے کہا:

"انگارہ تو میں تم کو دوں مگر تم انگارہ لے کے کیسے جاؤ گے۔"

کوا تو چڑیا کو کھانے کے جنون میں پاگل ہو رہا تھا بلا سوچے سمجھے بولا:

"تم انگارہ اٹھا کر میرے پروں کے درمیان میری پیٹھ (پشت) پر رکھ دو، لوہار کی دوکان زیادہ دور نہیں، میں پل بھر میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

بڑھیا نے چمٹے سے انگارہ اٹھا کر کوے کی پشت پر رکھ دیا۔ کوا انگارہ لے کر اڑا۔ تیز ہوا سے انگارہ دہکنے لگا وہ اور تیز اُڑا، انگارہ اور دہکنے لگا، "کہاں انگارہ کہاں کوے کے پر"

ابھی کوا پوری طرح فضا میں بھی نہیں پہنچا تھا کہ اس کے پروں میں آگ لگ گئی۔ کرے تو کیا کرے بھاگے تو کہاں بھاگے۔۔۔ کیسے اپنی جان بچائے اسی بدحواسی میں اس کی نظر نیچے دریا پر پڑی وہ اپنے جلے جسم

کے ساتھ دریا میں کود گیا، پانی سے جسم کی آگ تو بجھ گئی اور سارا جلنے سے بچ گیا مگر ڈوبنے لگا ’’آگ سے بچا تو پانی میں پھنسا‘‘ دریا بھی ساون کے موسم کا۔۔۔ اپنی جوشیلی سرکش روانی میں کوے کو دو تین غوطے آئے اور وہ ڈوبنے لگا کہ اسے دور ایک مچھیرا نظر آیا جو اپنی کشتی میں بیٹھا مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ یہ مچھیرا بہت شریف آدمی تھا، اسے کوے پر رحم آیا سو اس نے کوے کو اپنی کشتی میں بٹھا لیا۔ کوا سمٹ کر کشتی کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ چڑیا کو کھانے والی بات وہ کب کی بھول چکا تھا۔ اسے اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اب وہ اُڑنے سے معذور تھا کئی مہینے بعد جب اس کے پر نکلے تو وہ اُڑ کر ایک طرف چلا گیا۔ پھر کبھی کوے نے چڑیا کو تنگ نہیں کیا۔ بی بی چڑیا آج بھی لوگوں کے گھروں میں گھونسلے بنا کر مزے سے رہتی ہے اور کوے کا وہی حال ہے جو کل تھا کوئی اسے اپنے گھر دیکھنا پسند نہیں کرتا۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ

سندھی سے ترجمہ: **فہیم شناس کاظمی**

بخت آور بادشاہ

ایک تھا بادشاہ۔ اس نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ صبح ہم شکار پر جائیں گے اور شکار کا اصول یہ ہوگا کہ جس کے سامنے سے شکار گزرے وہ ہی اس کو شکار کرے۔ دوسرے دن صبح سویرے بادشاہ اپنے لاؤلشکر سمیت جنگل کی طرف روانہ ہوا اچانک ایک ہرن درختوں کے جھنڈ سے نکلا اور بادشاہ کے سامنے سے ہو کر آگے بڑھ گیا۔ بادشاہ نے بھی اپنا گھوڑا ہرن کے پیچھے لگا دیا آگے ہرن پیچھے بادشاہ۔ اسی کشمکش میں وہ ایسی جگہ جا نکلے جہاں چاروں طرف سناٹا تھا اور جنگل بھی وہاں بہت گھنیرا تھا۔ ہرن چھلانگیں مارتا ہوا جنگل میں گم ہوگیا۔ بادشاہ حیران و پریشان کھڑا ہوگیا کہ اب کیا کرے۔ پھر بادشاہ نے گھوڑے کو بھگایا مگر دور دور تک اسے کوئی بستی نظر نہیں آئی۔ گھوڑا بھی سارے دن کا بھوکا پیاسا اور تھکن کا مارا ہوا تھا وہ بھی سست ہوگیا۔ غصے میں بادشاہ نے اس کو دو تین چابک مارے ان میں سے کوئی چابک گھوڑے کو ایسی جگہ لگا کہ وہ گرا اور مر گیا۔ اب بادشاہ اور زیادہ پریشان ہوگیا۔۔۔ آخر اس نے ہمت کی اور پیدل ایک سمت کو چل پڑا۔ سورج ڈوبنے کو تھا۔ بھوک پیاس نے بادشاہ کو بے حال کر دیا تھا اتنے میں اچانک اسے ایک جانب چمک دیکھنے میں آئی تو اس کے چہرے پر کچھ رونق آئی۔ وہ چمک ایک تالاب کی تھی جیسے تیسے بادشاہ تالاب تک پہنچا پانی پیا اور لیٹ گیا اور چند لمحوں میں گہری نیند سو گیا۔

دوسرے دن صبح بادشاہ نیند سے اٹھا، اِدھر اُدھر دیکھا تو صرف بیابان ہے نہ رستہ نہ منزل۔۔۔ اس نے سوچا اس بیابان میں ایک تالاب ہے۔ ضرور کوئی نہ کوئی جانور بھی یہاں آتا ہوگا۔ سو وہ تالاب کے ساتھ اُگی گھنی گھاس میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر نہ گزری ہوگی ہرنوں کا ایک ٹولا پانی پینے آیا۔ پانی پی کر تالاب کے ساتھ اُگی گھاس چرنے لگا۔ ایک ہرن جب گھاس چرتے چرتے بادشاہ کے برابر پہنچا تو اس نے اس کی ٹانگ پکڑ لی اور اسے قابو کر کے اسے ذبح کیا پھر چچی جھوٹی لکڑی کو گھسا کر آگ جلائی گوشت بھونا اور پیٹ بھر کے کھایا۔ اس طرح روز گزارا کرنے لگا۔ کچھ عرصے میں بادشاہ کی حالت جنگلیوں جیسی ہوگئی اس کے کپڑے بھی پھٹ گئے جنگل میں گھومتے گھومتے اسے ایک رستہ ملا تو اس نے ایک ہرن پکڑا اور اسے اٹھا کر دو چار کوہ سفر کرنے کے بعد

اسے ایک شہر نظر آیا۔ شہر میں داخل ہوا تو اسے بڑھئی نظر آیا جو لکڑی کا کام کر رہا تھا۔ بادشاہ نے اس کے پاس جا کر سلام کیا بڑھئی نے سلام کا جواب دیا اور کہا ”یار یہ ہرن بیچنا ہے کیا؟ بادشاہ نے کہا ”یا تو تم مجھے یار نہ کہتے اگر یار کہا ہے تو پھر مول تول کیا پوچھتے ہو! اگر تمہیں ضرورت ہے تو ہرن حاضر ہے بڑھئی نے بہت اصرار کیا کہ پیسے لے لو مگر بادشاہ نے پیسے لینے سے صاف انکار کر دیا اور جب وہاں سے جانے لگا تو بڑھئی نے کہا؛

”اللہ تمہیں کسی مشکل میں نہ ڈالے مگر کسی وقت خدا نہ کردہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ تو میں فلاں محلے میں رہتا ہوں آواز دو گے تو حاضر ہو جاؤں گا۔“

بادشاہ پھر اسی تالاب پر واپس لوٹ آیا دوسرے دن بھی ہرن پکڑ کر سوچا آج شہر میں دوسرے رُخ سے جاؤں۔ ہرن بیچ کر کپڑے خریدوں یہ ارادہ کر کے شہر کے دوسرے رُخ سے وہ شہر میں داخل ہوا تو کیا دیکھا ایک ملنگ بیٹھا ہے۔ بادشاہ نے ملنگ کو سلام کیا جس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا ”یار ہرن بیچنا ہے تو دام بتاؤ؟“ بادشاہ نے جواب دیا ”فقیر سائیں، یا تو یار مت کہتے اگر یار کہتے ہو تو پھر دام کیا۔ تمہیں ضرورت ہے تو ہرن حاضر ہے یہ کہہ کر بادشاہ نے ہرن فقیر کے حوالے کیا اور وہاں سے چل پڑا فقیر نے کہا ”اللہ تمہیں کسی مشکل میں نہ ڈالے پھر بھی کبھی کوئی کام ہو تو مجھے یاد کرنا۔“

تیسرے دن بھی بادشاہ نے اسی طرح ہرن پکڑا اور شہر میں تیسرے رُخ سے داخل ہوا تو اسے ایک سوداگر ملا۔ بادشاہ نے اسے سلام کیا۔ اس نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ”یار بتاؤ کیا ہرن بیچ رہے ہو!“ بادشاہ نے کہا یاروں سے کہاں حساب کتاب لوں یہ ہرن تم لے لو“ جب وہ واپس لوٹنے لگا تو سوداگر نے کہا:

”خدا نہ کرے تم کوئی دکھ کی گھڑی دیکھو مگر پھر بھی کسی مشکل میں پڑ جاؤ تو ہم حاضر ہیں میرا نام فلاں ہے اور میں فلاں محلے میں رہتا ہوں۔“

چوتھے دن بھی بادشاہ نے اسی طرح کیا اس بار اسے بادشاہ کا بیٹا ملا جس نے اس سے یار کہہ کر ہرن لیا اور اسے اپنا دوست بنا کر چلا گیا، بادشاہ واپس تالاب پر آ کر لیٹ گیا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا کہ کھوجی قاتل کی تلاش میں تالاب تک آ پہنچے۔ اور بادشاہ کو پکڑ لیا ”کہ تم خون کر کے یہاں آ چھپے ہو!“ بادشاہ نے اسے اللہ کا امر سمجھا، چپ چاپ ان کے ساتھ چل پڑا۔ بادشاہ کو اس بادشاہی میں لایا گیا جہاں وہ ہرن دے جاتا تھا۔ تو اسے یاد آیا کہ بیری نے وہی قدموں کے نشان دیکھے ہیں جو میرے ہرن دینے والے راستے کے ہیں اسے قید کر دیا گیا اور بتایا گیا کہ کل تم کو پھانسی دے دی جائے گی۔ بادشاہ بہت پریشان ہوا منت زاری کرنے لگا بلند آواز میں دعائیں مانگنے لگا کہ اسی ساعت میں وہاں کے بادشاہ کا وہاں سے گزر ہوا اس نے جو اس کی چیخ

وپکار سنی تو وہ قید خانے چلا آیا اور دروغہ جیل سے بولا ''مجھے چیخ وپکار کرنے والے قیدی کے پاس لے چلو۔ دروغہ نے بادشاہ کو قیدی بادشاہ کے پاس پہنچایا جس کے سامنے بادشاہ نے خود کو جیل کا دروغہ ظاہر کیا اور بادشاہ نے قیدی بادشاہ کا قصہ سنا اور کہا کہ اگر تمہیں اپنے کسی دوست یار سے ملنا ہو تو بتاؤ اسے بلا دوں۔ قیدی بادشاہ نے کہا کہ ''مجھ پردیسی کو یہاں کون پہچانتا ہے ہاں شہر کے فلاں کونے پر ایک ملنگ بیٹھا ہے اسے بلا دو بادشاہ نے ملنگ کو فوراً بلوایا۔ ملنگ قیدی بادشاہ کے پاس پہنچا تو قیدی بادشاہ نے ملنگ سے کہا۔

''یار ہمارے تو یہ حال ہیں'' اس کا حال دیکھ کر ملنگ سمجھ گیا اور کہا:

''اللہ کرے گا صبح بادشاہ تم کو چھوڑ دے گا اگر اس نے تمہیں آزاد نہ کیا تو ہم بھی شہر غرق کر دیں گے۔ اب مزے سے رات گزارو۔''

بادشاہ نے قیدی بادشاہ سے پوچھا کہ ''اگر کوئی اور یار ہے تو اس سے بھی ملوا دوں'' اس پر قیدی بادشاہ کو بڑھئی یاد آیا اس نے اسے بلوانے کو کہا بڑھئی بادشاہ کے حکم پر قیدی بادشاہ سے ملا تو اس قیدی نے کہا یار ہماری طرف سے خدا حافظ۔ کل بادشاہ مجھے پھانسی دے دے گا۔ میں نے کہا کہ یار سے رخصت ہولوں'' بڑھئی نے کہا ''یار خدا کرے گا صبح بادشاہ تم کو چھوڑ دے گا اگر نہ چھوڑا تو محلات کے ستون میں نے بنائے ہیں اور ان کی ایک ایسی کیل ہے جو میں نکال لوں تو سارے محل گر پڑیں گے تم اللہ کو یاد کرو۔

''صبح ہم تم سے پہلے یہاں موجود ہوں گے'' یہ کہہ کر بڑھئی چلا گیا۔

بادشاہ نے قیدی بادشاہ سے پوچھا اور کوئی دوست جس سے تم ملنا چاہو تو بتاؤ تو اس نے سوداگر کا نام بتایا جسے فوراً بلایا گیا۔ سوداگر یار کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ قیدی بادشاہ نے کہا ''یار مر تو ویسے ہی رہا ہوں سوچا تم سے رخصت ہولوں'' سوداگر نے کہا:

''ہم تمہارے یار کس لیے ہیں اب تم بے خوف ہو جاؤ کل میں دنیا کی سب سے بڑی بولی لگاؤں گا اگر بادشاہ راضی نہ ہوا تو اپنے دونوں گھوڑے بھی داؤ پر لگا دوں گا جن پر بادشاہ عاشق ہے اگر اس پر بادشاہ نہیں مانا تو میں اپنی بیوی سے بھی ہاتھ اٹھا لوں گا جس پر بادشاہ عاشق ہے اگر اس پر بادشاہ نہ مانا تو پھر اللہ مالک ہے۔''

یہ کہہ کر سوداگر چلا گیا۔

بادشاہ نے قیدی سے پوچھا ''اور بھی کوئی یار ہے تو بتاؤ اسے بھی بلایا جائے'' جس پر قیدی نے شہزادے کا نام لیا۔ شہزادے کو فی الفور بلایا گیا۔۔ شہزادے نے اپنے دوست کی اس حالت پر دکھ کا اظہار کیا اور کہا ''یار خدا

کرے گا بادشاہ تم کو صبح چھوڑ دے گا نہیں تو ہمارے ہاتھ اور بادشاہ کی گردن۔۔ پھر جو مقدر رہوا‘‘ شہزادہ یہ کہہ کر چلا گیا۔

صبح دربار منعقد ہوا بادشاہ نے قیدی بادشاہ کو بلایا اسی اثنا میں سوداگر اپنے دونوں گھوڑوں اور بیوی سمیت آ پہنچا ایک گھوڑے پر سونے کے تھیلے تھے اور دوسرے گھوڑے پر اس کی حسین و جمیل بیوی۔ دوسری جانب بڑھئی محل کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ شہزادہ بھی اپنے لشکر سمیت دربار میں آ پہنچا۔ ملنگ بھی اپنا عصا رنبے کی طرح زمین گاڑ کر بیٹھ گیا۔

بادشاہ سب باتیں پہلے سے جانتا تھا صرف بختاور بادشاہ کا نصیب آزما رہا تھا۔ سوداگر نے بادشاہ سے عرض کی ’’یہ قاتل مجھے سونے کے بدلے میں تول دو‘‘ بادشاہ نے انکار کیا سوداگر نے اپنے دونوں گھوڑے پیش کیے۔ بادشاہ نہیں مانا تو سوداگر نے اپنی بیوی پیش کی۔ بادشاہ نے اس کی یہ بات بھی نہیں مانی اور بڑھئی کو بلایا یہاں آ کر بڑھئی نے کہا اعلیٰ حضرت! پہلے میرے یار کو آزاد کرو ورنہ محل کی چھت ابھی زمین پر ہو گی۔‘‘

بادشاہ نے چاروں سے بات کی بحث کی اور پھر قیدی کو آزاد کر دیا۔ سوداگر کو گلے ملا اور سوداگر کی بیوی کو اپنی بہن بنا لیا۔ اسے دوپٹہ دیا اور کہا ’’پہلے واقعی میری نیت بد تھی مگر آج سے تم میری بہن ہو۔ اس کے بعد فقیر سے معافی مانگی، بڑھئی کو انعام دیا اس کے بعد اپنے بیٹے کو گلے لگایا اور کہا بلاشبہ تم بہادر اور سچے ہو۔

اس کے بعد بادشاہ نے بختاور بادشاہ سے اپنی بیٹی کی شادی کی جب دولہا دلہن سیج پر بیٹھے تو بختاور بادشاہ نے دلہن سے کہا

’’شہزادی میرا یہ قصہ ہے میں صرف آج کی رات یہاں ہوں کل اپنے وطن روانہ ہو جاؤں گا۔۔۔ اگر تم میرے ساتھ چلو تو کیا کہنے نہیں تو ہماری طرف سے خدا حافظ۔‘‘

شہزادی پہلے تو حیرت زدہ ہو گئی پھر ہوش حواس بحال کر کے بولی ’’ٹھیک ہے میں تمہاری نوکر ہوں۔۔۔ جہاں تم وہاں میں‘‘ جس پر بختاور بادشاہ نے کہا

’’میں تمہارے والد کا ہم منصب ہوں تم فکر نہ کرو۔ قسمت مجھے یہاں لائی ہے ورنہ خود کون آتا ہے۔‘‘

صبح کو بختاور بادشاہ نے اپنے سسر کو اپنی ساری داستان سنائی جس سے وہ بہت خوش ہوا اور اس نے بختاور بادشاہ اور شہزادی کو اپنے محافظوں کے ساتھ ہنسی خوشی اپنے وطن روانہ کیا۔

☆☆☆☆

حبیب الرحمان مشتاق

انا پرست راجا

کسی زمانے میں ایک ہندو راجہ گلگت پر حکمرانی کرتا تھا جس کا نام شری اگورتھم تھا۔ راجہ صاحب کی ایک بیٹی کے علاوہ کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے وہ اپنی بیٹی سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ جب اس کی بیٹی تین سال کی تھی تو رانی صاحبہ یعنی بچی کی ماں چل بسی۔ یوں راجہ صاحب نے اپنی بیٹی کی ایک ماں بن کر پرورش کی اور جوان کیا۔ راجہ صاحب اپنی اکلوتی اولاد سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ اس کے بغیر کھانا بھی نہیں کھاتے تھے اور جہاں کہیں دورے پر چلے جاتے، اپنی لاڈلی بیٹی کو ساتھ لے جایا کرتے تھے۔

راجہ کی بیٹی حسین و جمیل ہونے کے ساتھ ساتھ جوان بھی ہو چکی تھی، اس لیے پورے علاقے میں اُس کے حسن کا چرچا عام تھا۔ راجہ صاحب جب اپنی بیٹی کو لے کر دُور دراز کے علاقوں میں دوروں پر یا سیر و تفریح کے لیے چلے جاتے تو اس علاقے کے بچے، بوڑھے، جوان، مرد اور عورتیں صرف اور صرف راجہ کی خوبصورت بیٹی کو دیکھنے کے لیے آتے تھے جبکہ راجہ یہی سمجھتا تھا کہ میری ساری رعایا میرے استقبال کو آ گئی ہے

ایک دفعہ راجہ صاحب حسب معمول دورے پر کسی گاؤں میں تھے اور ساتھ میں اُس کی بیٹی بھی تھی، وہاں کے چند معتبر حضرات نے راجہ صاحب کی خدمت گزاری کے لیے چند نوجوان دے دیئے جو کہ راجہ صاحب کی ہر قسم کی پُر تعیش ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مامور کئے گئے تھے۔ اُن میں سے ایک لڑکا نہایت ہی خوبصورت نوجوان تھا جو کہ کسی غریب کسان کا بیٹا تھا۔ راجہ صاحب کی بیٹی کی نظر جب اُس نوجوان پر پڑی تو وہ اُس پر فریفتہ ہونے لگی اور مختصر دنوں میں اُس نوجوان کی چال ڈھال، گفتگو، سلیقہ مندی اور بھرپور جوانی سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اسے اپنا ہمسفر چُن لیا۔ نوجوان چونکہ ایک غریب کسان کا فرزند تھا اس لیے پہلے پہلے تو بڑی احتیاط برتی مگر شہزادی صاحبہ کے حُسن کے جلوؤں کی تاب نہ لا سکا اور وہ بھی اسے دل دے بیٹھا۔

کچھ دنوں کے بعد جب راجہ صاحب اپنے شاہی محل واپس لوٹے تو دیکھا کہ اُس کی بیٹی کھوئی کھوئی سی اور اکثر تنہائی کے عالم میں گُم سُم دکھائی دینے لگی ہے۔ راجہ صاحب نے وجہ پوچھی مگر بیٹی نے ڈر کے مارے کچھ نہیں بتایا۔ یوں کئی روز گذر گئے مگر شہزادی کی صحت روز بروز ابتر ہونے لگی۔ ایک دن جب راجہ صاحب نے

بہت اصرار کیا تو بیٹی نے اصل واقعہ بیان کیا۔ راجہ صاحب چونکہ امیر خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ اُس کی بیٹی کی کسی رئیس یا شہزادے سے شادی ہو اس لیے اسے سخت غصہ آ گیا اُس نے اپنی بیٹی کو یہ ضد چھوڑنے کا مشورہ دیا مگر بیٹی چونکہ پہلے ہی دل دے چکی تھی اس لیے اس کے باپ کی کوئی نصیحت اُس کے دل پر اثر انداز نہیں ہو سکی اور وہ اس غم میں اندر سے گھٹنے لگی اور اُس کی صحت روز بروز ابتر ہوتی چلی گئی۔ مگر راجہ صاحب کو بیٹی کی پسند سے زیادہ اپنی انا اور جاہ و حشمت عزیز تھی اور یوں ایک دن راجہ نے اپنی بیٹی سے آخری بار کہا کہ وہ یہ ضد چھوڑ دے جبکہ بیٹی نہ مانی۔ یہ جنوری کا مہینہ تھا۔ راجہ نے شدید طیش میں آ کر اپنی بیٹی کو سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ شاہی محل سے تھوڑی دُور دریائے گلگت میں ایک بہت بڑی چٹان بالکل پانی کے درمیان موجود ہے۔ راجہ نے حکم دیا کہ چپو والی کشتی کی مدد سے اس چٹان تک رسائی حاصل کر کے وہاں لوہے کا ایک پنجرہ بنایا جائے۔ حکم کی تعمیل کی گئی اور اُس چٹان کے چاروں طرف گہرے سوراخ کر کے اُن میں لوہے کی سلاخیں گاڑھی گئیں اور پنجرہ تیار کیا گیا۔ راجہ نے اپنی بیٹی کو اُس پنجرے میں قید کر لیا۔ یوں گلگت کی یخ بستہ سخت سردی کے موسم میں شہزادی کو پنجرے میں صرف ایک جوڑا کپڑوں میں بھوک اور پیاس کے عالم میں تنہا چھوڑ دیا گیا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی ایک دن بھی نہیں گذرا تھا کہ راجہ شام کے وقت اپنے محل سے ملحق باغ میں ٹہل رہا تھا۔ باغ میں ہر طرف ہری ہری لمبی گھاس اور بیل بوٹے تھے جنہیں تازہ پانی دیا گیا تھا۔ وہاں سے اچانک ایک کالا سانپ نمودار ہوا اور راجہ کو ڈس لیا۔ راجہ وہیں پر گر گئے اور انہیں بے ہوشی کے عالم میں شاہی محل پہنچا کر علاج وغیرہ شروع کیا گیا مگر اُس سانپ کا زہر راجہ کے بدن میں اس قدر پھیل چکا تھا کہ ہر دوا بے اثر ہو گئی اور راجہ کی موت واقع ہو گئی۔

راجہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی لوگ چپو کی کشتیاں لے کر دریا میں کود پڑے اور بر وقت شہزادی تک پہنچ گئے۔ اُسے سردی کی شدت کی وجہ سے نمونیا ہو گیا تھا لوگوں نے اسے جلدی جلدی پنجرے سے باہر نکالا اور شاہی محل لایا گیا جہاں وہ شاہی طبیبوں کی معمولی علاج کے بعد ٹھیک ہو گئی اور اپنے من پسند نوجوان کے ساتھ شادی کر کے ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگی۔ دریا کے بیچ میں پائی جانے والی وہ بڑی چٹان اب بھی دریائے گلگت میں موجود ہے اور اُس کے چاروں طرف کئے گئے گہرے سوراخ دُور سے بھی نظر آتے ہیں۔ اُس چٹان کو اگور تھم گری یعنی راجہ اگور تھم کی چٹان کہا جاتا ہے۔

(شنا لوک کہانی)

حبیب الرحمان مشتاق

چڑیل

گئے وقتوں کی بات ہے کہ ایک بادشاہ کے چار بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا سنِ بلوغت کو پہنچنے والا تھا اور باقی تین بیٹے یکے بعد دیگرے چھوٹے تھے کہ اُن کی ماں فوت ہو گئی۔ بادشاہ نے چند مہینوں کے بعد اپنے بچوں کی صحیح تربیت اور بہتر پرورش کے لیے ایک ماں کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے نئی شادی کا فیصلہ کیا اور ایک دن بڑے دھوم دھام سے بادشاہ کی دوسری شادی ہوئی مگر بدقسمتی سے جس عورت سے بادشاہ کی شادی ہوئی، اُس پر جنات کا اثر تھا۔ بادشاہ نے شہر بھر کے طبیبوں کو بُلوایا اور خوب علاج کروایا مگر وہ عورت ٹھیک نہیں ہو سکی۔ اس کشمکش میں سال کا عرصہ گذر گیا اور اُس عورت نے ایک بچی کو جنم دیا جو کہ چڑیل تھی مگر کسی کو علم نہیں تھا اور جس دن اُس بچی نے جنم لیا اُسی دن سے شاہی گھوڑوں کے اصطبل میں روزانہ ایک گھوڑا مرا ہوا پایا جانے لگا۔ کچھ دنوں کے بعد بادشاہ کو شدید تشویش ہونے لگی۔ اور اُس نے اپنے بڑے بیٹے کو اس واقعے کی تحقیقات کے لیے نگرانی پر مامور کیا۔ بادشاہ کا بڑا بیٹا انتہائی ذہین، چست اور چالاک تھا وہ رات بھر اصطبل کے عقب میں اندھیرے میں چُھپ کر اپنے تیر و کمان کس کر چوکس بیٹھا رہا۔ آدھی رات کو اُس نے دیکھا کہ اُس کی شیر خوار بہن آئی اور اُس نے ایک گھوڑے کی گردن پر جھپٹ کر اُس کا خون چوسنا شروع کر دیا۔ بھائی کو اُس وقت اپنی بہن کے چڑیل ہونے کا پتہ چل گیا مگر اُس نے رحم کھاتے ہوئے اپنے تیر کا نشانہ اُس کے ہاتھ پر لگا دیا۔ چڑیل کا ہاتھ زخمی ہو گیا اور وہ فوراً بھاگ کر شاہی محل میں داخل ہو گئی۔ صبح جب یہ ماجرا اُس نے اپنے والدِ محترم کو سُنایا تو اس نے بالکل یقین نہیں کیا اور اپنے بڑے بیٹے پر یہ الزام عائد کیا کہ تم نے اس شیر خوار بچی کا ہاتھ جان بوجھ کر اس لیے زخمی کر دیا ہے کہ یہ تمہاری سوتیلی بہن ہے اور بادشاہ نے سزا کے طور پر اپنے بیٹے کو ملک بدر کر دیا۔ بیٹا پریشانی کے عالم میں گھر سے نکلا اور دردر کی ٹھوکریں کھاتا ہوا کسی اور ملک جا نکلا۔ وہاں محنت مزدوری شروع کر دی اور چند سالوں کے بعد اس قابل ہو گیا کہ اُس کا گذارہ صحیح چل سکے۔ اُس دوران بادشاہ کے بیٹے نے وہیں پر شادی کر لی، اُس کے بچے بھی ہوئے اور وہ معمول کی زندگی گزارنے لگا۔ یوں کئی سال بیت گئے۔ ایک دن شہزادے کو اپنا ملک بہت یاد آنے لگا۔ اپنے باپ اور بھائیوں کی جدائی تڑپانے لگی اور اُس

نے واپس اپنے ملک جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اُس نے روانگی سے قبل اپنی بیوی سے کہا کہ میں نے اپنے کمرے میں ایک گلاس دودھ رکھا ہوا ہے اور دیوار پر اپنی تلوار لٹکائی ہے۔ تم انہیں دیکھتے رہنا۔ اگر مجھ پر کوئی مصیبت ٹوٹ پڑی تو گلاس کا دودھ کالا ہو جائے گا اور تلوار کی دھار پر سُرخی آجائے گی۔ ایسے میں تم میرے یہ سدھائے ہوئے دونوں کتوں کو آزاد کر کے میرے پیچھے بھیج دینا۔ میں جہاں بھی ہوں گا، یہ میرے نقشِ قدم ڈھونڈتے ہوئے مجھ تک پہنچ جائیں گے۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنی بیوی کو خدا حافظ کہا اور اپنے ملک کی طرف روانہ ہوا۔ اُس کا گھوڑا تازہ دم اور اچھی حالت میں تھا اس لیے اُسے راستے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔ جب وہ اپنے باپ کے شاہی محل میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ وہاں کوئی آدم زاد موجود نہیں ہے، سارا محل ویران ہے۔ وہ پریشانی کے عالم میں اندر داخل ہوا تو اپنے چھوٹے بھائی کو فقیر جیسے حلیے میں اداس اور غمگین حالت میں پایا۔ بھائی سے ملا تو وہ بغل گیر ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور بتانے لگا کہ ہماری چڑیل بہن ماں باپ، بھائیوں اور دیگر تمام ملازمین کو کھا چکی ہے اور مجھے صرف اور صرف اپنے دانت تیز کروانے کے لیے زندہ رکھا ہے۔ ابھی وہ تھوڑی دیر کے لیے شہر کی طرف گئی ہے، نہ جانے کس آدم کا خون چوس کر آئے گی۔ میرے بھائی تم نے یہاں آ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ میری مانو تو فوراً یہاں سے بھاگ نکلو ورنہ وہ تم کو بھی کھا جائے گی۔ یہ ماجرا سن کر بڑے بھائی پر گویا سکتہ طاری ہو گیا۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ بھی نہیں کر پایا تھا کہ اُس کی چڑیل بہن پہنچ گئی اور بھائی سے دُعا سلام کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا گھوڑا باہر مرا ہوا پڑا ہے۔ بھائی سمجھ گیا کہ اس کے گھوڑے کا خون کس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ جب اس کی چڑیل بہن خاطر تواضع کی غرض سے کچن میں چلی گئی تو شہزادے نے فرار ہونے کی کوئی ترکیب سوچی اور جب کچن سے واپس آئی تو کہا کہ ہائے میری بہن! مجھے اپنے ملک کے دریا کا پانی پیے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ اگر تم دریا کا پانی چھنی میں بھر کے لاؤ تو میں شکر گزار رہوں گا۔ چڑیل بھی بڑی چالاک تھی، اُس نے کہا کہ میرے آتے آتے تم نکل جاؤ گے اس لیے یہ ڈھول لے لو اور اسے پیٹتے رہو تا کہ میں آواز سن کر مطمئن رہ سکوں۔ یوں بھائی ڈھول پیٹنے میں مشغول ہو گیا اور چڑیل اپنے دوسرے بھائی کو ساتھ لے چھنی میں پانی لینے چلی گئی۔ اتنے میں کسی بل سے ایک چوہا نمودار ہوا اور اُس نے شہزادے سے کہا کہ تم یہاں سے فوراً بھاگو۔ باقی ڈھول والا کھاتہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ اب چوہا اپنی اُچھل کود کے ذریعے ڈھول پیٹتا رہا اور شہزادے سے کہنے لگا کہ جاتے جاتے یہ چند چیزیں ساتھ لے جاؤ سرسوں کا تیل، چھری، نمک کا ٹکڑا اور کنگھی۔ یہ چڑیل تمہارا پیچھا کرتے ہوئے جیسے ہی تمہارے قریب آئے سرسوں

کا تیل پیچھے کی طرف پھینکو۔ اس تیل کا ایک سمندر بن جائے گا جب سمندر پار کرے تو چُھری پھینکو جس سے ایک پہاڑ بن جائے گا جو چھری کے دھار کی طرح ہوگا جس سے اس کے پاؤں بُری طرح زخمی ہو جائیں گے۔ اس کے بعد نمک پھینکو۔ نمک کا پہاڑ بنے گا اور اس کے پاؤں کے زخم اُسے نمک کے پہاڑ پر چلنے نہیں دیں گے اور اگر تمہارا پیچھا کرنے میں یہ پھر بھی کامیاب ہو جائے تو تم آگے کی طرف کنگھی پھینکو۔ اس سے تمہارے لیے سفیدے کے درختوں کا ایک جنگل بن جائے گا، ۔ جو کہ ستاروں کے جھرمٹ کی طرح ہوگا۔ تم درخت پر نکل جانا۔ اگر چڑیل اسے اپنے دانتوں سے کاٹ دے تو فوراً دوسرے پر چڑھ جانا۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح کی رکاوٹوں سے اس چڑیل کا حوصلہ پست ہو جائے۔ وہ ہمت ہار بیٹھے اور تمہاری جان بخشی کا کوئی راستہ نکل آئے۔

شہزادے نے یہ ساری چیزیں لے لیں اور چوہے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رُخصت ہوا۔ گھوڑا تو اس کی چڑیل بہن کب کا کھا چکی تھی اس لیے وہ پیدل ہی سفر پر روانہ ہوا۔ دوسری طرف چڑیل جیسے ہی دریا سے چھنی میں پانی بھرتی ہے تو پانی نیچے گر جاتا ہے۔ اُسے ڈھول کی آواز بھی ہلکی ہلکی سنائی دے رہی ہے وہ جلدی جلدی جانا بھی چاہتی ہے مگر پانی لیے بغیر کیسے جا سکتی تھی۔ اس پریشانی میں تھی کہ ایک ہنس وہاں نمودار ہوا، اُس نے کہا کہ چھنی میں موٹی ریت بھر دو، پانی اندر رُک جائے گا۔

چڑیل نے ویسا ہی کیا اور پانی لے کر گھر پہنچی تو دیکھا کہ چوہا ڈھول بجا رہا ہے۔ اُسے دیکھ کر چوہا فوراً اپنے بل میں گھس گیا اور چڑیل نے بھائی کے خون کی پیاس میں اُس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ شہزادے نے اپنی بیوی سے جو کچھ گھر سے نکلتے وقت کہا تھا وہ بھول چکی تھی مگر اُس کے بیٹے نے اچانک آ کر کہا کہ امی! ابو کے کمرے میں جو دودھ گلاس میں رکھا ہوا تھا وہ کالا ہو چکا ہے۔ بیوی چونک گئی اور کمرے میں آ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ نہ صرف دُودھ کالا ہوا ہے بلکہ تلوار کی دھار پر سُرخی بھی ظاہر ہو چکی ہے۔ اُس نے فوراً گھر کے دونوں کتوں کو زنجیروں سے آزاد کر دیا اور کہا کہ اپنے مالک کو ڈھونڈ کے لے آؤ۔ کتے گھر سے نکلے اور سرپٹ دوڑتے ہوئے چند لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اِدھر چڑیل نے پیچھا کرتے ہوئے بھائی کا سراغ لگا لیا اور جب اُس کے قریب پہنچنے لگی تو بھائی نے سرسوں کا تیل پھینک دیا۔ اُس کے بعد چُھری۔ پھر نمک اور آخر میں کنگھی پھینک دی اور گھنے جنگل کے درخت پر چڑھ گیا۔ مگر چڑیل بڑی شاطر اور خونخوار نکلی۔ اتنا زخمی ہونے کے باوجود وہ اپنے شکار کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنے دانتوں سے جب ایک درخت کاٹ دیتی تو بھائی دوسرے درخت کا سہارا لیتا۔ اس

طرح سارا جنگل صاف ہونے لگا۔ بس دو چار درخت ہی بچے تھے کہ شہزادے کے دونوں کتے پہنچ گئے۔ اُس نے جب دُور سے دیکھا تو ایک عجیب سا حوصلہ ملا اور اُس نے دونوں کتوں کو آواز دی۔ کتوں نے اپنے مالک کی آواز کو پہچان لیا اور فوراً حاضر ہو گئے۔ شہزادے نے کتوں سے کہا کہ تم اس چڑیل کو اس طرح چیڑ پھاڑ کے کھاؤ کہ اس کے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرے۔ چڑیل بہن اُس وقت کتوں کا خونخوار چہرہ دیکھ کر گھبرائی اور گڑگڑا کر اپنے بھائی سے معافی مانگنے لگی مگر بھائی نے کہا کہ اگر میں تم پر آج رحم کھا لوں گا تو تم جب تک زندہ رہو گی نہ جانے کتنے لوگوں کا خون چوسو گی جن کا گناہ میرے سر ہو گا۔ اس لیے میں تمھیں ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر شہزادے نے اپنے کتوں کو اشارہ کیا اور کتوں نے اُس چڑیل کی بُوٹی بوٹی نوچ لی۔ یوں شہزادے کی جان بچ گئی وہ خیریت سے اپنے گھر پہنچ گیا اور اپنے بچوں کے ساتھ بغل گیر ہو گیا۔

(شنا لوک کہانی)

☆☆☆☆

شاہد ندیم

جادو کا پیالہ

کاشر ایک غریب کسان تھا۔ اس کی آمدنی اتنی کم تھی کہ اکثر اس کی بیوی بچوں کو فاقہ کرنا پڑتا۔ لیکن وہ ایک ایماندار آدمی تھا۔ وہ جوا کھیلنے اور چوری کرنے سے پرہیز کرتا تھا۔

ایک دن وہ بہت غمگین ایک بڑے درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ اس نے زور سے چلا کر کہا یا خدا تو نے مجھے غریب کیوں بنایا ہے۔ میرے بچوں کو کیوں بھوکا سونا پڑتا ہے۔ جیسے ہی اس نے یہ بات ختم کی، اس کو قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ ایک فقیر تھا وہ اس کے پاس رکا اور اس سے پوچھا، بیٹے تمھیں کیا تکلیف ہے؟ کاشر نے بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ اپنی کہانی بتائی اور کہا۔ میں اب یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے تو کوئی راستہ بھی نظر نہیں آتا ہے۔ فقیر محبت سے مسکرایا اور اپنے تھیلے میں کچھ تلاش کرنے لگا۔

امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو، بیٹے یہ پیالہ لو، تمہاری ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ کاشر کے فقیر سے یہ پوچھنے سے پہلے کہ ایک عام سے پیالے سے اسکے تمام مسائل کس طرح حل ہو سکتے ہیں۔ وہ غائب ہو چکا تھا۔ اس نے پیالہ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور سوچنے لگا، کہ اس خالی پیالے کی جگہ اس کے ہاتھ میں مزیدار گوشت ہوتا۔ اس نے اتنا سوچا تھا کہ پیالہ گرم گرم گوشت سے بھر گیا۔ اس نے ایک لقمہ کھا کر دیکھا۔ اس نے تمام زندگی اتنا لذیذ گوشت نہیں کھایا تھا۔ اس کے بعد اس کو احساس ہوا۔ یہ جادو کا پیالہ ہے، وہ بھاگا ہوا گھر گیا۔ اور اپنی بیوی بچوں کو خبر سنائی وہ بہت خوش ہوئے اور یکے بعد دیگرے اس پیالے کو سب نے آزمایا۔ بیوی نئے کپڑے چاہتی تھی۔ بچے کھلونے چاہتے تھے۔ اور وہ سب اچھا کھانا چاہتے تھے۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ اس فقیر کے شکر گزار تھے۔ جس نے اتنی خوشی دی تھی۔ ان سب کے جوش و خروش نے اور خوشی نے ہمسائی ماسی کی توجہ مبذول کرائی۔

اگلے روز جب کاشر کی آنکھ کھلی۔ اس نے ناشتہ طلب کیا۔ لیکن پیالے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ اس روز پورے خاندان کے لیئے بڑی خوفناک بات تھی۔ اس نے کئی مرتبہ کوشش کی۔ لیکن پیالہ خالی رہا۔ وہ جنگل میں واپس گیا اور فقیر کی تلاش شروع کر دی خوش قسمتی سے وہ ایک بڑے درخت کے نیچے بیٹھا مل گیا۔ اسکی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولے بغیر پوچھا۔ کہ اب کیا بات ہے۔ کاشر نے بہ مشکل آپنے آنسو

روکتے ہوئے کہا۔ کہ یہ پیالہ بے کار ہے۔ اب یہ کام کا نہیں رہا۔ میرے بچوں کے لیے صبح ناشتہ نہیں ملا۔ فقیر نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اور اسکی طرف دیکھا اور کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے کہا مجھے پیالہ دکھاؤ۔ کاشر نے اسے پیالہ دکھایا، یہ وہ پیالہ نہیں ہے۔ تم نے جادو کے پیالے کا کیا کیا ہے۔ کیا تم دو پیالے لینے کیلئے مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ کاشر نے کہا ایسا نہیں ہے۔ میں ایک ایماندار آدمی ہوں۔ فقیر نے سوچتے ہوئے کہا تو پھر یقیناً کسی نے اصلی پیالہ چرا لیا ہے۔

کاشر نے تھوڑی دیر سوچا اور وہ ایک دم حقیقت جان گیا۔ ماسی۔۔۔۔ اسکا خیال صحیح تھا۔ جب کاشر باہر گیا ہوا تھا۔ اس کی بیوی بچوں کو کھانا کھلانے میں مصروف تھی تو ماسی نے ایک دھات کے عام پیالے سے وہ پیالہ بدل لیا تھا۔ فقیر نے اسے ایک اور پیالہ دیا اور کہا جاؤ۔ اور ہر شخص کو بتا دو کہ تمہیں ایک اور جادو کا پیالہ مل گیا ہے۔ ماسی کو یہ پیالہ بھی چرانے دو۔

کاشر بڑا حیران تھا؟ لیکن کیوں؟ فقیر نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے سختی سے کہا۔ ایسا ہی کرو جیسا میں نے کہا ہے۔ کاشر نے تھوڑی دیر انتظار کیا۔ لیکن فقیر نے اپنی آنکھیں یا منہ نہیں کھولا۔ کاشر واپس گھر آیا۔ اور بیوی کو بتایا۔ کہ اسے ایک اور جادو کا پیالہ مل گیا ہے۔ سب لوگ بہت خوش ہوئے اور ماسی بھی بہت خوش ہوئی۔ وہ پھر انہیں مبارک باد دینے آئی۔ کاشر جان بوجھ کر باہر چلا گیا۔ اور اسکی بیوی نے بچوں کو کھانا کھلانا شروع کر دیا۔ ماسی نے یہ پیالہ بھی چرا لیا۔

کاشر اور اس کے گھر والے یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ ماسی چیخ رہی ہے۔ انہوں نے دیوار سے جھانکا اور دیکھا کہ دو جادو کی چھڑیوں سے ماسی کو بری طرح سے مار پڑ رہی ہے۔ یہ دونوں چھڑیاں پیالوں میں سے نکلی تھیں۔ مار کے دوران اس نے چیخ کر کہا کہ میں نے نکالا تھا۔ وہ پلنگ کے نیچے جا کر گھس گئی۔ لیکن چھڑیوں نے وہاں بھی اسکا پیچھا نہ چھوڑا۔ اس نے فریاد کرتے ہوئے کہا۔ کہ اپنے پیالے واپس لے لو۔ خدا کے واسطے دونوں پیالے واپس لے لو۔

کاشر نے چھڑیوں والے پیالے پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور اسے مار پڑنی بند ہو گئی۔ وہ دونوں پیالے اپنے ساتھ لے آیا۔ اس نے اچھی طرح یاد رکھا کہ کون سا پیالہ چھڑیوں والا ہے اور کون سے پیالے سے چیزیں ملتی ہیں۔

اس کے بعد کاشر اور اس کے کنبے نے ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا اور اس تحفہ کے لئے خدا کا شکریہ ادا کیا۔

(کشمیری لوک کہانی)

انجم جاوید

گنجے کی کہانی

کہتے ہیں کسی گاؤں میں ایک بیوہ عورت رہتی تھی جس کا ایک کم عمر لڑکا تھا اس گاؤں کے لڑکے اسے بہت تنگ کرتے اور ہنسی مذاق میں اسے گنجا۔ گنجا کہہ کر پکارتے تھے وہ لڑکا اس روز روز کے مذاق سے تنگ آ کر ایک دن اپنے ماں سے کہنے لگا کہ گاؤں کے لڑکوں نے مذاق اڑا اڑا کر میرا جینا حرام کر دیا ہے میں کیا کروں۔ اس کی ماں نے بہت سوچا آخر اسے خیال آیا کہ کیوں نہ میں اپنے لڑکے کو اپنے بھائیوں کے پاس جو دوسرے کسی گاؤں میں رہتے تھے بھیجوں اس نے اپنے بیٹے سے مشورہ کیا اور آخر ایک دن وہ اپنے لڑکے کو لے کر اپنے بھائیوں کے گھر گئی اور وہاں چھوڑ آئی۔۔ وہاں بھی لڑکے کو ماموں زاد بھائی چھیڑتے رہے مگر اب کیا ہو سکتا تھا لڑکا مجبور ہو کر ان کا ہنسی مذاق برداشت کرتا رہا۔

ایک دن کی بات ہے کہ گنجے کے تینوں ماموں آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ گنے کا موسم آ گیا ہے اور لڑکے گنے مانگ رہے ہیں جبکہ ہمارے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ ہم ان کے لیے گنے خرید سکیں۔ گنجا ان کی باتیں سن کر بولا ماموں۔۔ تم فکر نہ کرو بس اتنا کرو کہ میری کمر (پیٹھ) پر کوئی مضبوط سا گدا باندھ کے مجھے لے جاؤ اور جب کسان کھیت سے گنے کاٹ رہے ہوں گے مجھے ان کے سامنے مارنا شروع کر دینا وہ تم لوگوں سے مجھے مارنے کی وجہ پوچھیں گے تم کہہ دینا کہ لڑکا گنے مانگ رہا ہے تو اس طرح سے کسان تم کو گنے دے دیں گے۔ گنجے کی یہ بات سن کر ماموں کھل اٹھے اور ایسا ہی کیا جس وقت وہ گنے کے کھیت کے قریب پہنچے انہوں نے اپنے بھانجے گنجے کو مارنا شروع کر دیا۔ کسان فوری جمع ہو گئے وجہ پوچھی ماموں نے کہہ دیا کہ لڑکا گنے مانگ رہا ہے جبکہ ہمارے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لڑکے کو مت مارو جتنے گنے تم لے جا سکتے ہو لے جاؤ انہوں نے موقع غنیمت جانا اور بہت سارے گنے کاٹے اور جمع کر کے گھر لے آئے۔ گھر آنے کے بعد انہوں نے اچھے اچھے رس بھرے گنے اپنے لڑکوں کو کھانے کے لیے دے دیئے اور دو گنے گنجے کو بھی دے دیئے گنجے کو غصہ تو آیا مگر اس نے خاموشی سے وہ گنے کلوٹی (گاؤں کی وہ مخصوص مٹی کی الماری جس میں غلہ رکھتے ہیں) میں سنبھال کر رکھ لیے۔

کچھ دن گزرے کہ عید سر پر آ گئی۔ گنجے کے تینوں ماموں سخت پریشان ہوئے کہ عید قریب آ گئی ہے

بچوں کے لیے عید کے نئے کپڑے کیسے خریدیں گے۔ اس موقع پر گنجے نے اپنے تینوں ماموؤں سے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ جو گنے آپ نے مجھے دیئے تھے میں نے سنبھال کر رکھ لیے تھے اب چونکہ گنے کا موسم ختم ہو چکا ہے ہم وہ گنے بازار میں جا کر بیچیں گے ہمیں زیادہ رقم ملے گی اس سے میرے ماموں زاد بھائیوں کے کپڑے سل جائیں گے یہ بات سن کر ماموں خوشی سے کھل اٹھے اور بھانجے کے ساتھ شہر آ گئے۔ شہر پہنچتے ہی گنجے نے اپنے تینوں ماموں کو بازار میں بیٹھا کر کہا آپ یہاں بیٹھیں میں سامنے دکاندار سے گنے بیچ کر رقم لے آؤں۔ گنجا دکاندار کے پاس گیا اور اس سے کہنے لگا کہ میں تین آدمی بیچنے آیا ہوں اگر تم کو ضرورت ہیں تو تم خرید لو۔ دکاندار نے پوچھا وہ آدمی کون سے ہیں اور کہاں ہیں؟ گنجے نے بتایا کہ وہ تین آدمی جو سامنے درخت کے سائے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر تم کہو تو میں تمہارے سامنے ان کی رضامندی معلوم کر لیتا ہوں تم کو اطمینان ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر بھانجے نے گنے اپنے ہاتھ میں لہراتے ہوئے دور سے ماموں کو آواز دی کہ ماموں بیچ دوں۔۔۔ ماموں بیچ دوں۔۔۔ تینوں یہ سمجھے کہ ان کا بھانجا ان سے گنے بیچنے کی اجازت مانگ رہا ہے انہوں نے خوشی خوشی آواز لگائی۔ ہاں بھانجے جی۔ بیچ دو۔

یہ آواز سنتے ہی دکاندار کی بھی تسلی ہوئی کہ تینوں کو کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس نے گنجے کو تینوں افراد کے تین سو روپے دیئے۔ گنجے نے تین سو روپے پکڑے ماموں کی نظر سے اوجھل ہوا اور سیدھا بھاگ کر اپنی ماں کے پاس جا پہنچا۔ اب دکاندار ان آدمیوں کے پاس گیا اور کہا کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو میرے ساتھ آؤ اور کام کرو۔ وہ حیران پریشان ہوئے کہ دکاندار کیا کہہ رہا ہے؟ اُلٹا انہوں نے دکاندر سے سوال کر لیا کہ ہمارا بھانجا کدھر گیا اور اس نے جو گنے بیچے اس کی رقم کتنی دی ہے؟ اور کس کے پاس یہ رقم ہے؟ اب حیران ہونے کی باری دکاندار کی تھی اس نے کہا کہ کون سے گنے؟ کون سی قیمت؟ میں نے تو اس گنجے سے تم تینوں کو تین سو روپے میں خرید لیا ہے اور تمہاری رضامندی سے، تم خود چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ بیچ دو بیچ دو۔ اب تم میرے ملازم ہو اور تمہیں میرے ساتھ کام کرنا ہوگا یا میری رقم دینی ہوگی۔ ان تینوں کو اپنے بھانجے کی اس چالاکی اور دھوکے پر شدید تکلیف ہوئی اور سخت غصہ آیا مگر اب ہو کیا سکتا تھا!

دوسری طرف گنجا اپنے گھر پہنچا جاتے ہوئے راستے میں اس نے دو خرگوش ایک ہی سائز اور رنگ کے خرید لیے گھر پہنچ کر اس نے ساری صورت حال اپنی ماں کو بتائی اور اسے ایک ترکیب بتائی اسے اندازہ تھا کہ اس کے ماموں دکاندار سے کسی طرح جان چھڑا کر اسے مارنے کے لیے ضرور آئیں گے۔ گنجے نے یہ ہوشیاری کی کہ ایک خرگوش ٹوکری کے اندر بند کر دیا جبکہ دوسرا خرگوش ساتھ لے گیا اور گھر کے قریب ہی کھیتوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جس وقت اس کے تینوں ماموں دکاندار سے جان چھڑا کر اس کے گھر آئے اور سخت غصے

میں اپنی بہن اور گنجے کی ماں سے کہا کہ گنجا کہاں ہے ہمارے ساتھ اس نے اچھا سلوک نہیں کیا اور دھوکے سے ہمیں دکاندار کو بیچ کر رقم لے کر چلا آیا ہے۔ ماں نے اپنے بھائیوں کو تسلی دی اور کہا کہ میرے لڑکے نے اچھا نہیں کیا میں خود اسے بری طرح سے ماروں گی۔ اس کم بخت لڑکے نے بہت غلط حرکت کی ہے مگر آپ تسلی رکھیں، بیٹھیں روٹی کھانا چاہیں تو حاضر کرتی ہوں۔ لڑکا ساتھ دوسرے گاؤں گیا ہوا ہے مگر آپ فکر نہ کریں میں اس خرگوش کو بھیجتی ہوں یہ اسے بلا کے لے آئے گا یہ کہہ کر گنجے کی ماں نے اپنے بھائیوں کے سامنے ٹوکری سے خرگوش نکالا اور اس کے کان میں کھسر پھسر کر کے اسے چھوڑ دیا۔ خرگوش جیسے ہی آزاد ہوا اس نے موقع غنیمت جانا اور لمبی لمبی چھلانگیں مارتا گھر سے نکل گیا۔

کچھ دیر ہی گزری ہوگی کہ گنجا اپنی بغل میں دوسرے خرگوش کو دبائے گھر آ پہنچا جیسے ہی وہ گھر آیا اس کی ماں غصے سے کہنے لگی تم کو ایسی کیا ضرورت پڑ گئی تھی کہ تم نے اپنے بہت پیار کرنے والے ماموؤں کو بیچ دیا اتنی گری ہوئی حرکت پر ان سے معافی مانگو ورنہ میں تم کو گھر میں گھسنے نہ دوں گی اور میں نے اسی لیے خرگوش کو بھیج کر تم کو بلایا ہے کہ تمہارے ماموں تم سے سخت ناراض ہیں اور تم سے ضروری بات بھی کرنا چاہتے ہیں۔۔ اُدھر ماموں خرگوش کی کارکردگی دیکھ کر بے حد حیران ہوئے اور انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہمیں گنجے کو مار کر کیا ملے گا۔ لہٰذا ہم اس کو مارنے کی بجائے اس سے خرگوش مانگ لیتے ہیں جو ہمارے کام بھی آئے گا۔ یہ سوچ کر ماموؤں نے اپنے بھانجے (گنجے) سے کہا کہ گو کہ تم نے ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور ہمیں بڑا دھوکا دیا ہے اور ہم نے یہی سوچا ہے کہ تم ہمارے بھانجے ہو ہماری بہن کی اکلوتی اولاد ہو لہٰذا بجائے سزا دینے کے ہم تمہیں معاف کرتے ہیں مگر ایک شرط پر کہ یہ خرگوش تم ہمیں دے دو۔ گنجے نے یہ سنتے ہی کہا کہ ماموں آپ کا حکم سر آنکھوں پر مگر مجبوری ہے میں یہ خرگوش آپ کو یوں نہیں دے سکتا کہ میں جب گھر سے باہر ہوتا ہوں تو میری ماں گھر میں اکیلی ہوتی ہے اسے جب بھی میری ضرورت پڑتی ہے یہ خرگوش کو بھیج دیتی ہے اور میں جہاں بھی ہوں خرگوش وہاں پہنچ کر مجھے ماں تک لے آتا ہے۔ یہ خرگوش بہت قیمتی ہے اور میں نے بہت مہنگا خریدا تھا۔ خیر دونوں میں بحث ہوئی آخر ماموں نے گنجے کو کسی طرح سے راضی کر ہی لیا۔ گنجے نے کہا کہ اس کی قیمت بہت زیادہ ہے تاہم آپ کو میں یہ پانچ سو روپے میں دے دوں گا۔ ماموں نے خوشی خوشی اسے پانچ سو روپے دیئے۔ خرگوش لیا اور اپنے گھروں کو واپس چل دیئے۔ راستے پر پڑتے ہی ان میں سے ہر ایک ماموں نے خرگوش کے کانوں میں اپنے اپنے پیغامات اپنی بیو یوی کے نام دیئے کہ خرگوش تم جا کر میری زنانی (بیگم) کو کہنا کہ وہ کھانا تیار کر کے رکھے ہم لیٹ پہنچیں گے جس وقت انہوں نے اپنے اپنے پیغامات دے کر خرگوش کو چھوڑا اس نے شکر ادا کیا اور چھلانگیں مارتا ہوا کھیتوں میں سے بھاگتا چلا گیا۔

تینوں ماموؤں آدھی رات کو جب اپنے اپنے گھروں میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی بیگمیں گہری نیند سوئی ہوئی ہیں اور گھر میں کوئی روٹی سالن کا انتظام نظر نہیں آیا ان کو بڑا غصہ آیا انہوں نے اپنی اپنی بیگموں کی خوب کلاس لی ڈانٹا کہ جب ہم نے خرگوش کے ذریعے پیغام بھجوا دیا تھا تو پھر تم نے روٹی سالن تیار کیوں نہیں کیا اور بجائے ہمارا انتظار کرنے کے گہری نیند کیوں سوئی ہوئی ہو؟ بیگموں نے حیرانی سے پوچھا کہ کون سا خرگوش؟ یہاں تو کوئی خرگوش نہیں آیا اور کیا تم لوگ پاگل ہو گئے ہو بھلا ایک خرگوش بھی کوئی پیغام دے سکتا ہے؟ یہ بات سنتے ہی وہ تینوں سمجھ گئے کہ ان کو اب کی بار بھی بھانجے نے بے وقوف بنا دیا ہے۔ ان کو اپنے بھانجے (گنجے) پر سخت غصہ آیا اور انہوں نے طے کیا کہ اب ہر صورت بھانجے کو مارے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ اُدھر بھانجے (گنجے) کو بھی یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ جب بھی میرا راز کھلے گا میرے ماموں بھاگے آئیں گے اور مجھے مارے بغیر نہ چھوڑیں گے اس نے بڑا غور کیا اور آخر کار ایک ترکیب ایجاد کی۔ اس نے ایک بکرا کاٹا اور اس کا سارا لہو اس کی ایک آنت کے اندر بھر کے اس آنت کو ماں کے گلے کے ساتھ باندھ دیا اور ساری ترکیب اپنی ماں کو بھی سمجھا دی کہ جس وقت ماموں اس کا معلوم کرنے آئیں گے تو ان کے ساتھ کس طرح سے پیش آنا ہے۔ گنجا اپنی ماں کو ساری بات سمجھا کر خود گھر سے باہر چلا گیا۔ اُدھر گنجے کے ماموں غصے سے بھرے ہوئے گنجے کے گھر آ پہنچے۔ انہوں نے بہت ہی غصے کے ساتھ گنجے کے بارے میں معلوم کیا۔ گنجے کی ماں نے حسب پروگرام انہیں روکھا جواب دیا اور اپنا رویہ بھی سرد رکھا اس بات پر گنجے کے ماموں کو اور غصہ آ گیا اور وہ اپنی بہن کے ساتھ الجھ گئے۔ بہن اور بھائیوں کے درمیان تلخ کلامی ہونے لگی اتنے میں ترکیب کے مطابق گنجا بھی گھر کے اندر آ پہنچا اور جب اس نے ماں کو ماموؤں سے لڑتے دیکھا تو وہ اپنی ماں پر غصہ کرنے لگا کہ آپ ماموؤں سے کیوں جھگڑا کر رہی ہیں، میرے ماموں تو بہت اچھے ہیں۔ اس پر ماں نے بیٹے کو بھی کھری کھری سنا دیں۔ گنجے نے کہا کہ آپ نے ماموؤں سے خوامخواہ جھگڑا کیا ہے میں تو آپ کو نہیں چھوڑوں گا یہ کہہ کر گنجے نے ماں کو پکڑا اور چُھری ماں کے گلے کے ساتھ لگی بکرے کی آنت کے اندر گھونپ دی پلک جھپکتے میں خون نکل آیا اور گنجے کی ماں نے دو چار جھٹکے لیے اور سانس کھینچ لیا۔ یہ دیکھ کر ماموؤں کے ہوش اُڑ گئے، ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ انہوں نے گھبرا کر گنجے سے کہا۔ بھانجے یہ تم نے کیا کر دیا اتنا غصہ کہ تم نے ہماری بہن اور اپنی ماں کو مار دیا۔

ماموؤں کی یہ گھبراہٹ، پریشانی دیکھ کر گنجے نے ان کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ آپ فکر نہ کریں یہ کام تو میں کئی بار کر چکا ہوں جب بھی والدہ سے مری لڑائی ہوتی ہے تو میں ان کو اسی طرح سے قتل کر دیتا ہوں اور پھر سے زندہ بھی کر دیتا ہوں۔ یہ بات سن کر وہ سخت حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم ایک فرد کو جان سے مار دو اور پھر زندہ بھی کر لو۔ بھانجے نے ان کو بتایا کہ دراصل جس چھری سے میں نے ماں کو مارا ہے یہ

جادو کی چُھری ہے اور اسی کی مدد سے پھر سے ماں کو زندہ کر دیتا ہوں۔ ماموں سخت حیران، پریشان ہو کر بولے اچھا تو ہمارے سامنے تم ماں کو زندہ کر کے دکھاؤ۔ بھانجے نے یہ سنتے ہی وہی خون آلود چُھری لی اور اس کی مدد سے زمین پر پڑی ماں کی نخنے ٹھکورے (بجائے) ترکیب کے مطابق گھٹنے بجاتے ہی ماں کلمہ پڑھتی ہوئی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ یہ کرشمہ دیکھ کر تینوں ماموں بے حد حیران ہوئے اور آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ یہ چُھری تو کمال کی ہے اس سے تو ہم اپنی لڑاکو بیویوں کو ڈرا سکتے ہیں، مار سکتے ہیں اور مار کر پھر زندہ کر سکتے ہیں۔ ہو نہ ہو کسی نہ کسی طرح سے یہ چھری گنجے سے لے کر اپنے قابو میں کی جائے۔ یہ سوچتے ہی انہوں نے گنجے سے کہا کہ تم نے ہمارے ساتھ تو بہت دھوکے کیے ہیں ہم تمھیں ایک شرط پر معاف کر سکتے ہیں کہ تم ہمیں یہ چھری دے دو۔ یہ سنتے ہی گنجے نے شور مچانا شروع کر دیا کہ میں یہ چھری کسی صورت بھی آپ کو نہیں دے سکتا۔ یہ بہت قیمتی چھری ہے جو میں نے ایک بڑے جادوگر کو ایک ہزار روپے دے کر حاصل کی ہے۔ ماموؤں نے منت سماجت شروع کر دی اس کی ماں بھی کہنے لگی کہ مجھے میرے بھائی بہت عزیز ہیں تم ان کو چھری دے دو۔ آخر انہوں نے رقم دی اور گنجے سے چھری لے کر خوش خوش گھر کی طرف چلے اور راستے بھر پلان بناتے رہے کہ ان کی بیگمیں (زنانیاں) روز ناراض (رسدیاں) ہوتی ہیں اب اس چھری سے ان کی خبر لیں گے۔ گاؤں پہنچتے ہی سب سے پہلے بڑی بھائی نے کہا کہ یہ جادو کی چھری سب سے پہلے میں لے کر جاؤں گا۔ وہ چھری گھر لے گیا اور گھر پہنچنے کے بعد اس نے خواہ مخواہ میں بیگم سے تلخ کلامی شروع کر دی۔ تنگ آ کر اس کی عورت بھی اس کو سوال جواب کرنے لگی۔ بات بڑھ گئی تو اس نے بیگم کو پکڑا اور چھری سے کاٹ دیا اس کی بیگم تڑپی اور زمین پر لیٹ گئی۔ اب آیا ناں مزہ یہ کہہ کر بڑے بھائی نے چھری پھر سے اٹھائی اور اپنی عورت کو زندہ کرنے کے لیے خون آلود چھری سے اس کے گھٹنے بجانے شروع کر دیئے۔ اس کی بیگم نے نہ اٹھنا تھا نہ اٹھی وہ بار بار کوشش کرتا رہا۔ چھری سے گھٹنے بجاتا رہا ساتھ ہی پریشان ہو کر چیخنے بھی لگا۔ اری زندہ بھی ہو۔۔ وہ کہاں سے زندہ ہوتی آخر تھک ہار کر بڑے ماموں نے سمجھ لیا کہ اب کی بار پھر اس کے بھانجے نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ دوسرے دن دوسرا بھائی آ گیا اس نے آتے ہی پوچھا کہ بھائی کیا ہوا؟ اور بھابھی کہاں ہیں نظر نہیں آ رہی؟، بڑے بھائی نے بات چھپاتے ہوئے کہا۔ میں نے ترکیب کے مطابق اسے قتل کر کے پھر سے زندہ کیا۔ بس اس بات پر وہ ناراض ہو گئی اور مجھے بتائے بغیر چپکے سے ناراض ہو کر اپنے والدین کی طرف چلی گئی۔ دو لائنوں کا خط لکھ کر تکیے کے نیچے رکھ گئی تھی۔ دوسرے بھائی نے چھری لی اور اپنے گھر جا کر اس نے بھی بیگم سے خواہ مخواہ کی تلخی کی پھر جھگڑا کیا اور اسے قتل کر دیا جب اس نے زندہ کرنا چاہا تو اس کے ساتھ بھی وہی ہوا جو بڑے بھائی کے ساتھ ہوا تھا وہ بھی گنجے کو بُرا بھلا کہتا خاموش ہو گیا اور بیوی کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا۔

اگلے دن تیسرا بھائی چھری لینے آیا اس نے بھی پوچھا تو منجھلے بھائی نے یہی جواب دیا کہ میں نے تجربہ کیا اسے قتل کر کے پھر سے زندہ کیا بس وہ اتنی سی بات پر ناراض ہو کر میکے چلی گئی ہے۔ چھوٹے بھائی نے چھری لی اور گھر پہنچ کر تلخی کا ماحول پیدا کر کے اپنی بیوی کو ماردیا پھر زندہ کرنے کے لیے گھنٹے بجانے لگا لیکن نہ اس نے اٹھنا تھا نہ اٹھی وہ گھبرا گیا اور بھاگتا ہوا منجھلے بھائی کے پاس گیا اور اسے ساری صورت حال بتائی اس نے کہا کہ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا ہے وہ دونوں مل کر بڑے بھائی کے پاس گئے اس نے بھی یہی جواب دیا کہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ سن کر تینوں غصے سے پھٹ گئے کہ ایک بار پھر گنجے نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا۔ اب ہم کسی بھی صورت اسے نہ چھوڑیں گے۔

اِدھر گنجا اپنی ماں سے کہنے لگا کہ اب تو میرے ماموں مجھے مارے بغیر نہ چھوڑیں گے اسی لیے میں کچھ عرصے کے لیے کسی ایسے ملک میں جا کر پناہ لے لیتا ہوں جہاں میرے ماموں نہ پہنچ سکیں۔ گنجے نے ایک سو روپیہ اپنے پاس رکھے باقی ساری رقم ماں کے حوالے کی اور گھر سے رخصت ہو گیا۔ اِدھر اس کے ماموں بھی غصے سے بھرے ہوئے ہاتھ میں لاٹھیاں اٹھائے پہنچ آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی بہن سے شدید غصے میں گنجے کے بارے میں معلوم کیا کہ گنجا کدھر ہے۔ گنجے کی ماں نے انہیں بتایا کہ وہ میرے پاس سے رخصت ہو کر ابھی ابھی کسی دوسرے ملک کو روانہ ہوا ہے۔ ماموں بھی گنجے کے پیچھے پیچھے اسی راہ سے سفر کرتے ہوئے بھانجے کو ڈھونڈنے روانہ ہوئے۔

گنجا آگے کسی جگہ پہنچا تو اسے ایک گیدڑ مل گیا اس نے کیا کیا کہ گیدڑ کو پکڑ کر چاندی کا ایک روپیہ گیدڑ کی دُم کے ساتھ چپکا دیا جبکہ باقی ننانوے روپے دُم کے نیچے ڈھیری لگا کر بچھا دیئے اتنے میں وہاں ایک گھڑ سوار آ پہنچا اس نے گنجے کو گیدڑ کی کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے دیکھ کر پوچھا کہ تم اس گیدڑ کو کیوں مار رہے ہو۔ گنجے نے جواب دیا کہ بھائی! یہ گیدڑ بہت قیمتی ہے اس کے پیٹ میں سے پیسے نکلتے ہیں۔ گھڑ سوار یہ سن کر از حد حیران ہوا اسے یقین نہیں آ رہا تھا مگر جب اس نے زمین پر پڑے سکے دیکھے تو مچل اٹھا گنجے سے کہنے لگا کہ مہربانی کرو کچھ رقم مجھے بھی گیدڑ کے پیٹ میں سے نکالنے دو۔ گنجے نے کہا چلو ٹھیک ہے مگر جب تک تم اس گیدڑ کے پیٹ میں سے سکے نکالتے رہو گے تب تک تیرے گھوڑے پر میں سواری کروں گا۔ گھڑ سوار نے کہا کہ مجھے یہ شرط منظور ہے۔ گنجے نے ایک روپیہ جو گیدڑ کی دُم کے ساتھ اٹکا تھا وہ بھی اور زمین پر پڑے سکے سمیٹ کر اپنی جیب میں ڈالے اور گیدڑ کو اس آدمی کے حوالے کر کے اس کے گھوڑے پر بیٹھا اور اسے چابک ماری۔ گھوڑے نے رفتار پکڑی اور گنجے کو لیتا ہوا دور چلا گیا۔ اِدھر گھڑ سوار نے گیدڑ کو پکڑ کر تھاپڑے (مدتھ) مارنا شروع کیا، مارتا رہا آخر تھک گیا مگر گیدڑ کے پیٹ میں سے ایک بھی سکہ نہ نکلا۔ تھک ہار کر آخر اس کی عقل میں یہ بات آئی

کہ اس گنجے نے دھوکا دیا ہے اور دھوکے سے میرا گھوڑا بھی لے کر نکل گیا ہے۔ میں نے بھی کتنا لالچ کیا ہے اس لالچ کی وجہ سے آج میرے ہاتھوں سے میری سواری، میرا گھوڑا نکل گیا وہ اسی پریشانی میں بیٹھا ہوا سوچ وبچار میں گم تھا کہ گنجے کے ماموں وہاں آ پہنچے۔ انہوں نے پوچھا کہ بھائی تم کون ہو اور راہ میں کس پریشانی میں بیٹھے ہو؟ تمہارے ساتھ کیا ماجرا ہوا ہے جس کی وجہ سے تم پریشان نظر آ رہے ہو۔ اس گھڑسوار نے ساری حقیقت ان کو بتائی۔ یہ کہانی سنتے ہی تینوں سمجھ گئے کہ یہ حرکت کسی اور کی نہیں گنجے کی ہی ہے۔ انہوں نے اپنی بھی داستان مختصراً اس گھڑسوار کو سنا کر کہا کہ ہم اسی کے پیچھے جا رہے ہیں چاہو تو تم بھی ہمارے ساتھ چلو تمہارے گھوڑے کا بھی سراغ مل جائے گا وہ گھڑسوار بھی ان کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ دوسری طرف گنجا گھوڑے پر سفر طے کرتا ہوا ایک نئے شہر میں جا پہنچا اور وہاں ایک کرائے کا مکان لے کر رہنے لگ گیا۔ کچھ دنوں بعد اس کے تینوں ماموں اور گھڑسوار بھی لوگوں سے پوچھتے۔ معلومات لیتے اسی شہر میں آ گئے اور انہوں نے پتہ لگا لیا کہ گنجا کس مکان میں رہتا ہے۔ دراصل ویسے تو ہو سکتا ہے کہ گنجے کا پتہ آسانی سے نہ پتہ چلتا مگر اس کے ساتھ گھوڑے کی شناخت ایسی تھی جو کئی بندوں کے ذہن میں رہی اور اسی نشانی کو بتاتے ہوئے یہ لوگ گنجے کے مکان تک پہنچ ہی گئے۔ انہوں نے گنجے کو پکڑنے کے لیے رات کا وقت طے کیا اور ایک رات آخر وہ گنجے کے گھر پہنچ گئے۔ وہ بے خبر سویا ہوا تھا انہوں نے موقع غنیمت جانا اور چارپائی پر اسے سوتے میں ہی رسیوں سے باندھ دیا۔ اب انہوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا کہ گنجے کو چارپائی سمیت اٹھا کر لے جاتے ہیں اور کسی گہری جھیل میں ڈبو دیتے ہیں۔ یہ سوچ کر انہوں نے گنجے کی چارپائی اٹھائی اور جھیل کی طرف چل دیئے۔ جب وہ جھیل تک پہنچے تو وہ تھک بھی گئے اور ان کو بھوک بھی لگ گئی۔ انہوں نے گنجے کی چارپائی جھیل کے کنارے رکھی اور خود گاؤں میں روٹی کھانے چلے گئے کہ پہلے روٹی کھا لیں پھر اس کو جھیل میں ڈال دیں گے۔ انہیں اطمینان تھا کہ گنجا چارپائی سے اچھی طرح سے بندھا ہوا ہے۔ لہٰذا بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔۔ ادھر گنجا چارپائی سے بندھا سخت پریشان تھا کہ آخر کس طرح سے جان چھڑاؤں کہ وہاں ایک چرواہا آ پہنچا اس کے پاس جانوروں کا بہت بڑا ریوڑ تھا جس وقت اس نے گنجے کو بندھا دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا کہ تمہاری یہ حالت کس نے کی ہے؟ اور تمہیں کیوں باندھا ہوا ہے؟ گنجے نے فوری جواب دیا کہ دراصل میرے ماموں میری شادی کرنا چاہتے ہیں میں اس رشتے پر راضی نہیں ہوں۔ اب وہ مجھے اس طرح سے باندھ کر لے جا رہے ہیں اور میری مرضی کے خلاف زبردستی میری شادی کر دیں گے۔ یہ بات سن کر چرواہا بہت حیران ہوا اور کہنے لگا کہ کمال ہے تم شادی نہیں کرنا چاہتے۔ تمہاری زبردستی شادی کرا رہے ہیں جبکہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں اور مجھے کوئی رشتہ نہیں دیتا۔ گنجے نے کہا کہ بھائی میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں اگر تم واقعی شادی کرنا چاہتے ہو تو

مجھے جلدی سے کھولو، میرے کپڑے تم پہن لو، تمہارے میں پہن لیتا ہوں اور تم میری چارپائی پر لیٹ جاؤ۔ اس چرواہا نے ایسا ہی کیا اور گنجے کو فوری طور پر کھول کر دونوں نے آپس میں کپڑے بدل کر پہن لیے اور گنجے نے چرواہے کو چارپائی سے ویسا ہی باندھ دیا جیسے چند لمحے قبل وہ بندھا تھا۔۔ اور خود چرواہے کے ریوڑ کو ہانکتا ہوا ایک طرف چل دیا۔۔ اتنے میں گنجے کے ماموں روٹی وغیرہ کھا کر پلٹے اور آتے ہی انہوں نے ایک نعرہ لگایا اور چارپائی اٹھا کر جھیل میں پھینک دی۔ چارپائی پلک جھپکتے ہی جھیل کے پانی میں ڈوب گئی۔ یہ دیکھ کر تینوں ماموں بے حد خوش ہوئے کہ اچھا ہوا آج اس خبیث، شیطان گنجے سے جان چھوٹ گئی اور اسے اپنے کیے گئے دھوکے کی سزا بھی مل گئی۔ وہ واپس گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ چند قدموں کے فاصلے پر وہی گنجا جسے وہ جھیل میں پھینک آئے تھے بکریاں، دُنبے کا ایک بڑا ریوڑ لیے گھوم رہا ہے اور خوشی سے بانسری بجا رہا ہے۔۔ ان کو حیران دیکھ کر گنجے نے کہا آپ سب حیران کیوں ہوتے ہو؟ جہاں تم لوگوں نے مجھے پھینکا تھا وہاں سے مجھے یہ بکریاں، دُنبے ملے ہیں۔ کاش آپ مجھے اور زیادہ زور سے زیادہ گہرائی میں پھینکتے تو میں بھینسوں کا ریوڑ لے کر آتا۔ یہ سنتے ہی انہوں نے گنجے سے کہا کہ اب تک جو ہوا سب معاف۔۔ اب تم ایسا کرو کہ ہمارے ساتھ جھیل پر جاؤ اور ہمیں وہاں زور سے پھینکو تاکہ ہم بھینسوں کا ریوڑ لے آئیں۔ گنجا مان نہیں رہا تھا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا لیکن انہوں نے بہت زور دیا تو گنجا ان کو لے کر جھیل پر آ گیا سب سے پہلے گنجے نے اپنے بڑے ماموں کو جھیل میں پھینک دیا۔ جب وہ ماموں ڈوبنے لگا تو اس نے شور مچانا، ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیئے۔ باقی افراد گنجے سے پوچھنے لگے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے؟

گنجے نے کہا کہ یہ کہہ رہا ہے کہ ریوڑ زیادہ بڑا ہے میرے قابو میں نہیں آ رہا لہٰذا تم لوگ بھی آؤ۔ یہ سنتے ہی باقی ماموں اور گھڑسوار بھی ایک ایک کر کے جھیل میں چھلانگ لگا گئے اور اس طرح سے چاروں کے چاروں گہری جھیل میں ڈوب گئے۔ اب گنجے نے بھی سکون کا سانس لیا اور بکریوں کے ریوڑ کو ہانکتا ہوا اپنے گھر واپس جا پہنچا۔ اس کی ماں اسے زندہ وسلامت واپس آتے دیکھ کر جہاں خوش ہوئی وہاں اسے بکریوں کا ریوڑ دیکھ کر مزید خوش ہوئی۔ اس نے بیٹے کو گلے سے لگا لیا مویشیوں کو باڑی میں منتقل کیا اور دونوں ماں بیٹے اطمینان سے اپنا وقت گزارنے لگے۔

(ہندکو لوک کہانی)

☆☆☆☆

بشیر احمد سوز

پیر مانک کی ڈھیری

روایت ہے کہ مہاراجہ اشوک کی دو بہنیں تھیں۔ دونوں خوبصورت بھی تھیں اور ذہین بھی۔ ایک کا نام متیاں اور دوسری کا نام ستیاں تھا۔ اشوک اپنی بہنوں کے ساتھ ہری پور کے ایک مشہور اور تاریخی گاؤں مانکرائے میں آباد ہوا۔ اس گاؤں میں جا بجا مٹی کے ٹیلے یا ہموار سطح سے ذرا بلند مٹی کے بڑے بڑے ڈھیر ہیں۔ ایک ٹیلے پر اشوک کا قلعہ تھا جس میں اُس کی رہائش بھی تھی لوگ اسے پیر مانک شہید (شریف) کی ڈھیری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ قلعہ خوبصورتی اور فنِ تعمیر کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ پیر مانک شہید کی اس ڈھیری کے سامنے دو اور ٹیلے تھے جو اشوک کی دونوں بہنوں کے نام سے موسوم ہیں۔ لوگ انہیں آج بھی متیاں کی ڈھیری اور ستیاں کی ڈھیری کہتے ہیں۔ متیاں اور ستیاں اگرچہ مہارانیاں تھیں مگر اُن میں غرور و تکبر نام کو نہ تھا۔ یہی حال اُن کے بھائی کا بھی تھا۔ لوگوں سے محبت اور اُن کی مشکلات و مصائب میں اُن کی دستگیری کرنا تینوں بہن بھائیوں کا شیوہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر دلعزیز تھے۔ قوموں کا عروج و زوال ایک فطری اور قدرتی امر ہے۔ چشمِ فلک نے تخت و تاج کے مالک دربدر دیکھے۔ عنانِ حکومت کب ایک ہی ہاتھ میں رہا ہے۔ ہندوستان میں شاہانِ سلطنت اور راجوں مہاراجوں کے بخت کے ستارے ٹوٹتے بکھرتے رہے۔ چنانچہ اس قلعہ میں بسنے اور اجڑنے والوں کے واقعات سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ البتہ یہ بات مسلّم ہے کہ اس قلعہ میں جو بھی مقیم رہا وہ کوئی معمولی حیثیت کا حامل نہ تھا۔ طاقت و سطوت اور مال و منال کا مالک تھا۔ کئی بادشاہوں اور مہاراجوں کے خفیہ خزانے اس قلعہ کی وسعتوں میں پنہاں ہیں۔ امتدادِ زمانہ سے یہ خزانے پیوندِ زمیں ہوتے رہے اور آنے والوں کو اس کی خبر تک نہ ہوئی۔

پیرانِ کہنہ سال کا کہنا ہے کہ مہاراجہ اشوک کے زمانے کے لوگ جو مانکرائے اور اس کے گرد و پیش میں آباد تھے بڑے ذہین اور محنت کش تھے۔ قلعے کی دیواروں اور اُن لوگوں کے گھروں کے پتھر جو اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے زبانِ حال سے پکار پکار کر اُس عہد کے کاریگروں اور اہلِ حرفہ کے فن کا پتہ دیتے ہیں۔

پیر مانکرائے کی ڈھیری سے قلعے کے آثار کم و بیش معدوم ہو چکے ہیں البتہ اس ڈھیری نے اپنے دامن

میں نہ جانے کتنے راجوں مہاراجوں کے خزانے سمیت رکھے ہیں۔ اب وہاں گھنے درخت ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عہدِ قدیم میں انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں اس ڈھیری کی کھدائی کر کے حتی المقدور خزائن نکال لیے ہیں، یہاں تک کہ قلعے کی دیواریں بھی مسمار کر دی ہیں۔

اگرچہ انگریزوں نے اس ڈھیری سے قیمتی خزانے نکال لیے تھے، تاہم بہت زمانے بعد بھی لوگوں کو یہاں سے پرانے سکّے اور مٹی کے برتن ملے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی ماہرین آثارِ قدیمہ کو یہاں سے قیمتی سکے اور نوادرات ملی ہیں۔ گاؤں کے کئی کسانوں کو اس قلعے کے قریب کھیتوں سے ہل چلاتے وقت پرانے وقتوں کے ٹوٹے ہوئے برتن اور سکے ملے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں اس علاقے پر عذابِ الٰہی نازل ہوا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ جس وقت عذاب نازل ہوا لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے، جو مرد و زن جس حالت میں تھا وہیں برباد ہوا۔ لوگوں کے گھربار اور مال مویشی سبھی کچھ برباد ہو کر رہ گئے۔ اس عذابِ الٰہی سے یہاں کے مکینوں کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔

ایک زمانے بعد مانکرائے میں لوگوں کی آبادکاری کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ اس وقت یہ گاؤں دیکھنے کے لائق ہے۔ دریائے دوڑ سے نکلنے والے نالے اور کٹھے اس گاؤں کی شادابی اور حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ چاروں اطراف گھنے اور سایہ دار درخت، باغات اور لہلہاتی فصلوں سے اس تاریخی گاؤں کا حسن دوبالا ہے۔

مانکرائے کی ڈھیری پر قلعہ کے بجائے عیدگاہ تعمیر کی گئی ہے۔ راجہ میر افضل خان جو اس علاقہ کی ایک مقتدر شخصیت تھی نے یہ عیدگاہ اپنے ذاتی خرچ سے تعمیر کرائی۔

بعض بزرگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس ڈھیری میں سات بادشاہوں کے خزانے دفن ہیں اور ان خزانوں کی رکھوالی ایک بہت بڑا اژدھا کرتا تھا۔ اس اژدھا کی جسامت اور ضخامت کے بارے میں کوئی مستند بات نہیں بتا سکتا لیکن اتنا بتایا جاتا ہے کہ یہ اژدھا کبھی کبھی رات کے وقت دریائے دوڑ سے آنے والے بڑے نالے میں پانی پینے آتا تھا۔ اس زمانے میں روایتی پن چکیاں یعنی ''جندر'' ہر گاؤں میں موجود تھے۔ لوگ انہی پن چکیوں سے اپنا اناج پیسواتے تھے، عام طور پر رات کے وقت قرب و جوار سے لوگ ان پن چکیوں پر آتے تھے، کیونکہ دن کے وقت مقامی لوگوں کی بھیڑ ہوتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار کچھ لوگ ایک ''جندر'' پر اپنا غلہ پیسوا رہے تھے کہ اچانک پانی کے بہاؤ میں کمی آنے لگی یہاں تک کہ پن چکی چلتے چلتے رُک گئی۔ پن چکی کے

مالک کو تشویش ہوئی کہ خدایا یہ کیا ماجرا ہے پانی کا جھرنا رُک کیوں گیا؟ لوگ بھی پریشان ہوئے کہ اتنی دُور سے دوبارہ آنا بھی کوئی آسان نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ چل کر معاملہ کی نوعیت کو سمجھا جائے کہ ایسا کیوں ہوا؟ وہ ہاتھوں میں مشعلیں اور لالٹینیں لے کر اُس نالے کے کنارے کنارے چلنے لگے گھُپ اندھیرے میں وہ بڑے غور غور سے دیکھتے رہے کہ کسی نے نالے میں بند نہ باندھ دیا ہو یا رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر اپنے کھیتوں کو سیراب کرنے کے لیے پانی کا رُخ نہ موڑ دیا ہوا۔ انہی خیالوں میں غرق وہ لوگ آگے بڑھتے جا رہے تھے مگر وہ سراغ نہ پا سکے۔ بہت دور نکل جانے کے بعد اچانک اُن میں سے ایک شخص کی نظر ایک اژدھے پر پڑی۔ اُس نے سب کو اس جانب متوجہ کیا۔ رات کی تاریکی میں تو سب نے یہی سمجھا کہ کسی نے ایک تناور درخت اس نالے میں گرا کر پانی کو روکنے (ڈک لگانے) کی کوشش کی ہے۔ جونہی وہ سب آگے بڑھے کہ مل جل کر اس درخت کو نالے سے نکالا جائے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایک بہت بڑا اژدھا اس نالے کے ٹھنڈے پانی میں لوٹ پوٹ ہو رہا ہے۔ ایک لمحے کے لیے سب پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ وہاں سے الٹے قدم چلے آئے۔ ذرا فاصلے پر جا کر وہ رُک گئے اور باہم مشورے کرنے لگے، کسی نے کہا کہ سخت گرمی میں اژدھا کچھ دیر ہی کے لیے پانی میں آ گیا ہے ذرا دیر میں چلا جائے گا۔ کسی نے کہا کہ اگر یہ رات بھر یہیں پڑا رہا تو ہمیں اگلے دن پھر سارے کام کاج چھوڑ کر آنا پڑے گا۔

آخر میں سبھی نے یہ فیصلہ کیا کہ آؤ چل کر اسے بھگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ سبھی اس پر کمر بستہ ہو گئے۔ اور اژدھا سے ذرا فاصلہ پر رُک کر انہوں نے اژدھے کو پتھر مارنے شروع کر دیے اُن کا یہ حیلہ کارگر ثابت ہوا اور اژدھا آہستہ آہستہ اپنا منوں بوجھ لیے چُپ چاپ وہاں سے چلا گیا اور پانی کے بہاؤ میں ایک بار پھر تیزی آ گئی۔

☆☆☆☆

بشیر احمد سوز

پتھر کے انسان

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے مہاراجہ اشوک ایک وسیع وعریض سلطنت کا فرماں روا تھا۔ اپنے دورِ حکومت میں دُور دراز کے علاقوں کی خبر گیری اور حالات سے آگاہی کی غرض سے اُس کے سفر کی کہانیاں تاریخ کے اوراق پر بکھری پڑی ہیں۔ ایک بار اُس کا گزر سرحد کے شمال مشرقی علاقوں سے ہوا۔ جب وہ مانسہرہ سے گزرا تو اُس نے اپنے کچھ ‘‘فرمان’’ چٹانوں پر کندہ کرائے۔ جو درحقیقت نوعِ انسانی کے لیے اُس کے پند ونصائح مانے جاتے ہیں۔ جنہیں ‘‘اشوک کے کتبے’’ کہا جاتا ہے۔ یہ مانسہرہ شہر سے ذرا ہٹ کر کشمیر روڈ کے کنارے آج بھی موجود ہیں۔

اس تاریخی مقام سے تھوڑے فاصلے پر ایک پہاڑی سلسلہ ہے جسے لوگ بریڑی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر ایک پتھر دکھائی دیتا ہے۔ یہ پتھر بہت دُور سے نظر آتا ہے۔ قریب سے دیکھیں تو اس کی ساخت انسان کو حیران کر دینے کا باعث بنتی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ کسی مافوق الفطرت مخلوق نے اس پتھر کو یہاں لا کر رکھ دیا ہے۔ اس پتھر کے آس پاس کئی اور بھی پتھر ہیں جو زمین میں اس طرح گڑھے ہوئے ہیں جیسے کسی نے زمین میں کیلیں گاڑ دی ہوں۔ ان میں کچھ پتھر تو گول مٹول سے ہیں اور کچھ لمبوترے۔ اگر اس پہاڑ کو شمال کی جانب سے دیکھا جائے تو بڑے پتھر کے اردگرد تین اطراف میں تین ایستادہ پتھر نظر آتے ہیں۔ انہیں دیکھنے سے پتہ چلتا کہ گویا پہاڑ پر تین آدمی کھڑے گرد وپیش کا نظارہ کر رہے ہیں۔ انہی گول گول اور لمبے لمبے پتھروں سے منسوب ایک کہانی ہے جو عبرت انگیز بھی ہے اور دلچسپ بھی۔

کہا جاتا ہے کے کنٹ نامی گاؤں میں جو اس پہاڑی سے صرف چند کوس کے فاصلے پر ہے ایک بڑھیا رہتی تھی۔ یہ بڑھیا بیوہ تھی۔ خاوند کو مرے کافی عرصہ بیت چکا تھا۔ اس کی صرف ایک لڑکی تھی۔ جو بہت خوبصورت تھی۔ لڑکی جتنی حسین تھی اتنی سمجھدار اور عاقل بھی تھی۔ لڑکی کا نام بریڑی تھا۔ بریڑی اس کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی اس لیے اس کی پرورش میں اس کی ماں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ گویا وہ ماں کی آنکھوں کا نور تھی۔ ماں کا سارا وقت ہی بریڑی کی دیکھ بھال میں گزرتا تھا۔ ماں کے پیار کا یہ عالم تھا کہ بریڑی کی ہر بات

اور خواہش کو پورا کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی۔ بریڑی کی ماں اُسے لوگوں کی نظروں سے بچا بچا رکھتی تھی تا کہ وہ لوگوں کی نظر بد سے بچی رہے۔ بریڑی بھی نیک اور سعادت مند تھی۔ وہ بھی صبح و شام اپنی ماں کا خیال رکھتی تھی۔ ماں کی کسی بات کو رد کرنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ گھر کا سارا کام کاج بریڑی ہی کرتی تھی۔ ڈھور ڈنگر چرانا، لکڑیاں کاٹ کر لانا اور پانی ڈھونا اس کی ماں کے سر تھا۔ اس کے علاوہ مویشوں کے لیے چارا گھاس پھونس لانے کا کام بھی اس کی ماں نے اپنے ذمے لے رکھا تھا کیونکہ اس کی ماں بریڑی کو گھر کی چار دیواری سے باہر بھیجنے کے بالکل خلاف تھی۔ حالاں کہ ایسے کام دیہاتوں میں عام طور پر جواں سال لڑکیاں ہی کرتی تھیں۔ بریڑی کی ماں حتی المقدور بریڑی کو دنیا کی نظروں سے بچا رکھنے کی کوشش کرتی رہی مگر دیہاتی زندگی میں ایسا ہونا ناممکن تھا۔ بریڑی کی ماں کے لیے بھی ایسا کرنا مشکل تھا۔

بریڑی شباب کے زینے تیزی سے چڑھ رہی تھی۔ جوں جوں ماہ و سال گزرتے اُس کے حسن کے گلاب اور بھی شگفتہ اور تر و تازہ ہونے لگتے۔ پورے گاؤں میں بریڑی کے حسن و جمال کے چرچے ہونے لگے۔ پھر صبح و شام اُس کے رشتے آنے لگے۔ جو بھی رشتہ آتا بڑھیا کے چہرے پر نقاہت اور مردنی کے آثار نمایاں ہونے لگتے۔ بلکہ اُس کی گفتگو میں بھی درشتگی اور کرختگی دیکھ کر لوگ مایوس پلٹ جاتے۔ اس کی بڑی وجہ ماں کا اپنی اکلوتی بیٹی سے بے پناہ پیار اور لگاؤ تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کی بیٹی ایک پل کے لیے بھی اُس کی نظروں سے اوجھل ہو۔ وفورِ محبت میں وہ یہ بھی بھول جاتی کہ چند سالوں بعد بریڑی کی جوانی ڈھلنا شروع ہو جائے گی اور اس حقیقت سے بھی انحراف کر جاتی کہ اس کی موت کے بعد بریڑی کا کیا بنے گا۔ گویا بیٹی کی محبت میں وہ خود غرضی کی دلدل میں اُترتی چلی جا رہی تھی۔

رفتہ رفتہ بریڑی کے حسن کے چرچے قریب اور دُور کے گاؤں میں بھی ہونے لگے۔ اب تو دُور دُور سے اُس کے رشتے آنے شروع ہو گئے۔ پہلے پہل تو اُسے گھر آنے والا ہر آدمی زہر لگتا تھا۔ پھر اُسے کچھ کچھ گھبراہٹ ہونے لگی۔ شروع شروع میں تو اس کی بات نہ سے شروع ہوتی اور نہ پر ختم ہوتی تھی۔ مگر اب وہ کچھ سوچنے پر بھی مجبور ہو گئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ اس کے دشمن بن جائیں اور اس کی بیٹی کو بھگا لے جائیں۔ کبھی کبھی تو گھبراہٹ کے عالم میں گاؤں چھوڑ دینے کا بھی ارادہ کر لیتی تھی تا کہ لوگوں کا یہ سلسلہ بند ہو جائے۔

پھر اُسے اپنا یہ فیصلہ بدلنا پڑتا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ کسی دوسری جگہ جا کر آباد ہونا بھی مشکل کام ہے۔ انہی دنوں اُسے ڈراؤنے خواب آنے لگے۔ اُسے ایسے لگتا تھا جیسے کچھ مضبوط اور طاقت ور لوگ زبردستی بریڑی

کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ ایسے ڈراؤنے خواب دیکھتے وقت وہ گہری نیند سے اچانک جاگ اٹھتی اور چیخنے لگتی۔ دن کو بھی اکثر اُسے ان خوابوں کا خیال آ جاتا تو پہروں پریشان رہتی۔ اب اُس کا گھر سے باہر جانا بھی نسبتاً کم ہو گیا تھا۔ ماں کی پریشانیاں بیٹی سے کب چھپ سکتی تھیں۔ بریڑی تو تھی بھی بڑی سمجھدار۔ بہت جلد بھانپ گئی کہ اُس کی ماں کی پریشانی کی اصل وجہ وہ خود ہے۔ لیکن پھر بھی ایک دن اُس نے ماں سے پوچھ ہی لیا کہ ماں جی! ”آج کل تم بہت پریشان اور کھوئی کھوئی سی رہتی ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ پہلے تو کبھی تمہاری ایسی حالت نہیں ہوئی“۔

بریڑی کی ماں کے دل پر گویا منوں بوجھ تھا۔ بریڑی کے پوچھنے پر وہ یک دم بولی۔ ”لوگ تیرے رشتے کے لیے مجھے صبح شام پریشان کرنے لگے ہیں، لیکن تم جانتی ہو کہ میں تمہیں کسی صورت بھی اپنے سے جُدا نہیں کر سکتی۔ اس بڑھاپے میں تُو ہی تو میرا واحد سہارا ہے۔ اب تُو ہی بتا کہ میں لوگوں کو کیا جواب دوں“۔

لیکن ماں جی! بریڑی نے شرماتے شرماتے کہا۔ ”آج میرے سر پر تیرا سہارا ہے، خُدا تجھے لمبی زندگی دے۔ لیکن کل کلاں میرا کیا بنے گا جب تُو مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ ابا جی کے مرنے کے بعد اگر تو زندہ ہے تو صرف میرے لیے، لیکن بعد میں میرا کیا بنے گا۔ تُو نہیں ہو گی تو میرا جینا بھی مشکل ہو جائے گا۔ میں تو اس دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکوں گی۔ مجھے تو خود ایسے لگتا ہے کہ تیرے بعد۔۔۔۔۔

ماں نے بریڑی کی باتیں سُنیں تو پریشان ہو کر زاروقطار رونے لگی۔ کیونکہ بریڑی کی باتوں میں اُسے سچائی کی جھلک دکھائی دے رہے تھی۔ اس سے پہلے تو بڑھیا کو بریڑی کی محبت کے سوا کچھ سجھائی نہ دیتا تھا لیکن آج بریڑی نے اُسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اُس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اُس کے مرنے کے بعد بریڑی کا کیا بنے گا۔ وہ تو صرف اپنی محبت کے حصار میں مقید تھی۔ جہاں صرف اور صرف بریڑی ہی اُسے دکھائی دیتی تھی۔

بریڑی کی باتیں سننے کے بعد اُس کی ماں نے نظر بھر کر بیٹی کی طرف دیکھا اور کہنے لگی ”میں تیری باتوں کو اچھی طرح سمجھ گئی ہوں، اور یہ بھی جان چکی ہوں کہ تیری میری جدائی کا وقت آن پہنچا ہے۔ بس ٹھیک ہے بیٹی تُو اپنا گھر بسانے کی خواہش رکھتی ہے تو مجھے تیری بات مان لینی چاہیے۔ آج کے بعد جو بھی تیرا اچھا رشتہ آئے گا، میں ہاں کر دوں گی“۔

اس بات کو کچھ ہی دن گزرے تھے کہ دُور کے ایک گاؤں کے خان کے گھر سے کچھ لوگ بریڑی کے

رشتے کے لیے آئے۔ بریڑی کی ماں نے فوراً ہاں کر دی۔ ادھر ہاں ہوئی اُدھر شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ دونوں گھرانوں میں مال و دولت کے لحاظ سے کوئی میل نہ تھا۔ ایک جانب خان کا گھر اور دوسری طرف غریب بڑھیا جس کے پاس چند گزارے کے کھیت اور ایک کچا مکان۔ لیکن بریڑی تو اس بڑھیا کی کل کائنات تھی وہ تو چاہتی تھی کہ بریڑی کی شادی کے انتظامات یوں کرے کہ پورے گاؤں میں یہ شادی مثالی ہو۔ چنانچہ اُس نے اپنی حیثیت اور طاقت سے بڑھ کر بریڑی کا جہیز بنایا۔ اس تیاری میں اُسکے مال مویشی، زمینیں اور یہاں تک کہ مکان بھی بک گیا۔ ایک سال تک بڑھیا بیٹی کے جہیز کا سامان تیار کرتی رہی۔ شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ دوسرے گاؤں سے بارات بڑی دھوم دھام سے آئی۔ شہنائیوں اور ڈھول باجے کی آوازیں کوسوں دُور سے سنائی دے رہی تھیں۔ ادھر بریڑی کی ماں نے بھی باراتیوں کے استقبال اور کھانے پینے کے عمدہ انتظامات کر رکھے تھے۔ جونہی بارات گاؤں کی چوپال کے پاس پہنچی میزبانوں نے پھولوں کے ہار اُن کے گلے میں ڈال کر اُن کا استقبال کیا اور ان پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں۔ قبل ازیں اس کا رواج نہ تھا۔ گاؤں کے لوگ بڑھیا کی تیاریوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ مہمانوں کی خوب آؤ بھگت ہوئی اور نہایت پُرتکلف کھانا دیا گیا۔ کھانے اور دوسری رسومات سے فارغ ہونے کے بعد دُلہن کی رُخصتی کا وقت آن پہنچا تو ایک سجی سجائی ڈولی میں اُسے بٹھایا گیا۔ وہ چندے آفتاب چندے ماہتاب ڈولی میں بیٹھی تو گاؤں کی جواں سال لڑکیوں اور عورتوں نے رُخصتی کے گیت گانے شروع کر دیئے۔ عین اُس وقت کسی کو خیال آیا کہ ڈولی کے چاروں اطراف لٹکے ہوئے پردوں کو جوڑ دینا ضروری ہے کیونکہ پہاڑوں سے اترے وقت ہوا کے جھونکوں سے یہ پردے اڑتے نہ رہیں۔ چنانچہ بریڑی ہی کے سامان سے سوئی دھاگے نکال کر دو تین عورتیں پردے سینے لگیں۔ لیکن شاید وہ جلدی میں وہ سویاں دھاگے واپس سامان میں رکھنا بھول گئیں۔ روایت کے مطابق دعا کے لیے سب نے ہاتھ اٹھائے اور اگلے ہی چند لمحوں میں بریڑی کی ڈولی گھر کے بڑے دروازے سے باہر جا چکی تھی۔ بریڑی کی سکھیاں سہیلیاں رو رہی تھیں اور اُس کی ماں کی حالت دیکھنے والی تھی۔ بے چاری بڑھیا کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ گھر کے بڑے دروازے کے باہر بیٹھ کر دور تک بارات کو دیکھتی، دعائیں کرتی اور آنسو بہاتی رہی۔

معلوم نہیں یہ اُن کا رواج تھا کہ بارات جس رستے آئے اُس رستے واپس نہیں جانی چاہیے یا رستے کی طوالت اُن کے پیش نظر تھی کہ باراتیوں نے واپسی کے لیے پہاڑی رستے کا انتخاب کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے

بارات پہاڑی پگڈنڈیوں پر اوپر کی جانب چڑھتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ لگ رہا تھا کہ باراتی اس راستے سے واقف نہیں ہیں۔ رستہ مشکل اور پیچیدہ بھی تھا۔ عام رواج تو یہ تھا کہ بارات کے ساتھ جہیز کا سامان اٹھانے والے بارات سے پیچھے چلتے ہیں لیکن اُس دن شاید پُر پیچ رستوں کی وجہ سے کچھ لوگ سامان اٹھائے بارات سے آگے چل رہے تھے۔ بریڑی ڈولی کے پردوں کے درمیان ایک چاک سے ساری بارات کا نظارہ کر رہی تھی کہ اُس کی نظر مٹھائی کے اُس ٹوکرے پر پڑی جو ایک باراتی کے سر پر تھا۔ اُس نے دیکھا کہ جس کپڑے سے مٹھائی ڈھانپی گئی تھی وہ پھٹا ہوا تھا۔ اُسے یہ دیکھ کر بڑی شرم آئی اور دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی کہ جب یہ مٹھائی اُس کے سسرال پہنچے گی تو وہ مٹھائی پر پڑا کپڑا دیکھ کر کیا سوچیں گے کہ کیسے بے سلیقہ لوگ ہیں۔ وہ خاص طور پر بریڑی اور اُسکی ماں کو طعنہ دیں گے کہ دونوں ماں بیٹیاں پھوہڑ ہیں جو اس کپڑے کا چاک تک نہ سی سکیں۔ بات بہت چھوٹی سی تھی مگر بریڑی کے دل میں کانٹا بن کر اُتر گئی تھی۔ اُسے ایک پل بھی چین نہیں آ رہا تھا۔ اس ایک بات سے اُسے اپنا سارا قیمتی سامان اور سال بھر کی تیاری بے وقعت اور بے کار نظر آنے لگی تھی۔ وہ اندر ہی اندر تلملا رہی تھی مگر بے بس تھی۔ اُس کے بس میں ہوتا تو وہ چیخ چیخ کر بارات کو رکوا دیتی اور اس کپڑے کی سلائی کا انتظام کرتی۔ کبھی وہ خود کو کوستی اور کبھی بوڑھی ماں کو بُرا بھلا کہتی۔ پھر وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر بے قصور گردانتی کہ میں تو دلہن بنی بیٹھی تھی یہ تو سارا قصور میری ماں کا ہے۔ اُس کے پھوہڑ پن اور بے تو جہی کے نتیجے میں یہ سب کچھ ہوا ہے اور جو کچھ آگے چل کر اُس کے سسرال میں ہوگا اس کی ذمہ دار صرف اور صرف اس کی ماں ہے۔ وہ دل ہی دل میں ماں کو کوسے جا رہی تھی۔ غصے اور پریشانی کے عالم میں وہ بھول بیٹھی کہ اس کی بیوہ ماں نے اس کی خاطر گھر بار بیچ دیا، مال مویشی اور زمینیں بیچ کر سب کچھ بیٹی پر لٹا دیا۔ وہ بھول بیٹھی کہ اُس کی بوڑھی ماں نے اپنے تن کے علاوہ ہر شے بیٹی کی خوشیوں پر قربان کر دی۔ بس ڈولی میں بیٹھے غصے کی ایک لہر آتی اور اس کی تمام تر خوشیوں کو چکنا چور کر جاتی۔ بارات برابر پہاڑی رستوں پر اوپر کی جانب بڑھ رہی تھی کسے معلوم تھا کہ ڈولی میں بیٹھی دلہن لہو کے گھونٹ پی پی کر وقت کاٹ رہی ہے۔ اسی اثنا میں بارات پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچی۔ باراتی بُری طرح تھک چکے تھے۔ پیاس سے لوگوں کا بُرا حال ہوا جا رہا تھا۔ پسینے میں تر بتر باراتیوں نے ذرا دم لینے کا فیصلہ کیا۔ لوگ رُک گئے۔ تنومند نوجوانوں نے اپنے دُکھتے کندھوں سے ڈولی اتار کر ایک جانب رکھ دی۔ بارات کے رُکنے کی دیر تھی کہ بریڑی نے جھٹ سے ڈولی کے پردوں سے ایک باراتی کو آواز دی۔ باراتی دوڑتا آیا کہ خُدا خیر کرے کہیں دلہن کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی۔ جب وہ بریڑی کے

قریب آیا تو بریڑی نے اُسے کان میں آہستہ سے کہا ”جاؤ میرا سرخ رنگ کا بکس کھولو، اس میں سینے پرونے کا سامان ایک پوٹلی میں بندھا ملے گا۔ اُس میں سے سوئی اور دھاگا نکال لاؤ۔ اور ہاں مٹھائی کا ٹوکر بھی اٹھا لاؤ۔ میں نے ٹوکرے پر پڑا کپڑا سینا ہے“۔

باراتی دلہن کی بات سنتے ہی بھاگا گیا اور بکس کھول کر سوئی دھاگہ تلاش کرنے لگا۔ وہ کافی دیر تک سوئی دھاگے کی تلاش میں رہا۔ بالآخر وہ پوٹلی ہی اٹھا لایا اور کہنے لگا ”دلہن بی بی اس پوٹلی میں تو سوئی دھاگہ نہیں“۔ بریڑی نے خود پوٹلی چھان ماری اسے بھی سوئی دھاگہ نہ ملا تو اُس کا غصہ دوچند ہو گیا۔ اُسے ایک بار پھر ماں پر شدید غصہ آیا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ رخصتی کے وقت گاؤں کی دو تین عورتوں نے ڈولی کے پردے سینے کی خاطر میرے سامان سے سوئی دھاگے نکالے تھے۔ شاید وہ کپڑے سینے کے بعد سوئی دھاگے واپس سامان میں رکھنا بھول گئی ہیں۔ جہیز میں سوئی دھاگے کا ہونا کوئی اتنی بڑی نہ تھی۔ مگر بریڑی نے اسے بھی اپنی عزت اور غیرت کا مسئلہ جانا۔ بے شک اُس زمانے میں لڑکیوں کے جہیز میں سینے پرونے کے سامان کو جہیز کی تکمیل کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اور اس سے یہ تاثر لیا جاتا تھا کہ بیاہی جانے والی لڑکی گھر گرہستی کے سبھی طریقوں سے واقف ہے۔ پس اُس نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا۔ اور دل میں ٹھان لی کہ جب تک باراتیوں میں سے کوئی جا کر میرے گھر سے سوئی دھاگے نہیں لائے گی، بارات نہیں اٹھے گی۔ اُس نے اپنے اس فیصلے سے باراتیوں کو بھی آگاہ کر دیا۔

چنانچہ بارات کے ہمراہ آنے والے نائی کو بریڑی کے گھر سے سوئی دھاگے لانے کے لیے بھیج دیا گیا اس دوران باراتیوں کو خوب آرام کا موقع مل گیا۔ نائی بے چارہ پہاڑ کی چوٹی سے بھاگم بھاگ بریڑی کے گھر پہنچا۔ بریڑی کی ماں نائی کو دیکھ کر پریشان ہو گئی کہ خُدا خیر کرے کہ نائی کیوں واپس چلا آیا ہے۔ نائی نے ذرا دیر دم لیا پھر بریڑی کی ماں کو سارا قصہ سنانے کے بعد سوئی دھاگوں کا مطالبہ کیا۔ بریڑی کی ماں نے نائی کی زبانی جب ساری باتیں سُنیں تو سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اُسے اپنی بیٹی کے اس رویے پر بہت غصہ بھی آیا کہ اُس نے ذرا سی بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُسے یہ بھی خیال آیا کہ بریڑی کے لیے اُس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہے اور بریڑی ہے کہ ماں کے گھر میں ایک سوئی بھی چھوڑنے کی روادار نہیں۔ آج پہلی بار بڑھیا کو اپنی بیٹی پر غصہ آیا اور اُسے بیٹی سے نفرت سی ہونے لگی۔ وہ جلدی سے اُٹھی اور سوئی دھاگے نائی کے حوالے کر کے اُسے رخصت کیا اور ساتھ ہی کہنے لگی۔

’’جا کر میری بیٹی سے کہنا کہ تُو نے پہلے ہی میرے پاس کچھ نہیں چھوڑا۔ سوئی دھاگہ کہیں بھول چوک سے رہ گیا تھا سو وہ بھی تجھ سے نہیں دیکھا گیا‘‘۔

یہ کہتے ہی اُس کی ماں زور زور سے رونے لگی اور ساتھ ہی ساتھ بلند آواز میں اُس نے کچھ ان الفاظ میں بد دعا دی۔ ’’خُدایا میری بیٹی اور اس کے ساتھ جتنے بھی باراتی ہیں انہیں پتھر بنا دے‘‘۔

نائی جب سوئی دھاگے لے کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو وہ یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ سارے باراتی جہاں جہاں کوئی بیٹھا یا کھڑا تھا پتھر بن چکے تھے۔ بریڑی کے جہیز میں شامل سارا سامان بھی جا بجا پتھروں کی صورت میں بکھرا پڑا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا ڈولی کے پاس گیا کہ دُلہن کو اس حادثے سے آگاہ کرے۔ جب وہ ڈولی کے قریب پہنچا تو اس نے کئی بار دلہن دلہن کہہ کر بریڑی کو پکارا۔ مگر کوئی جواب نہ پا کر اُس نے مجبوراً ڈولی کے پردے ہٹا کر اندر دیکھا تو اُس پر سکتہ طاری ہو گیا جب اُس نے دیکھا کہ بریڑی بھی پتھر بن چکی ہے۔ اس طرح اُس کی ماں کے دل سے اٹھی ہوئی بددُعا رنگ لائی اور بریڑی سمیت سارے باراتی پتھر بن گئے تھے۔ یہی بگڑی ہوئی بارات آج بھی اُس پہاڑی پر عبرت کا نشان بنی ہوئی لوگوں کو دعوت نظارہ دیتی ہے۔

اس بات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ بارات ہندوؤں کی تھی یا مسلمانوں کی۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہ جگہ ہندوؤں کے لیے بڑی متبرک رہی ہے وہ دُور دُور سے یہاں عبادت اور پوجا پاٹ کے لیے آیا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو کر رہ گیا۔ تاہم اس واقعے کے نتیجے میں ایک نئی رسم نے جنم ضرور لیا ہے کہ لڑکی کی طرف سے بارات کے ساتھ جانے والے لوگوں کو بارات سے آگے بڑھنے نہیں دیا جاتا۔ بعض اوقات تو طرفین میں لڑائی شروع ہو جاتی ہے اگر کوئی بارات سے آگے چلنا شروع کر دے۔ اس کے علاوہ یہ بھی رواج ہو گیا ہے کہ دُلہن کو لے جاتے وقت براتی کسی مقام پر بھی دم لینے یا ستانے کے لیے نہیں رک سکتے بلکہ دُلہن کو جتنا جلد ممکن ہو سکے اُس کے سسرال پہنچایا جاتا ہے۔

☆☆☆☆

Quarterly **Adabiyaat** Islamabad

April to June 2013

Issue No. 99

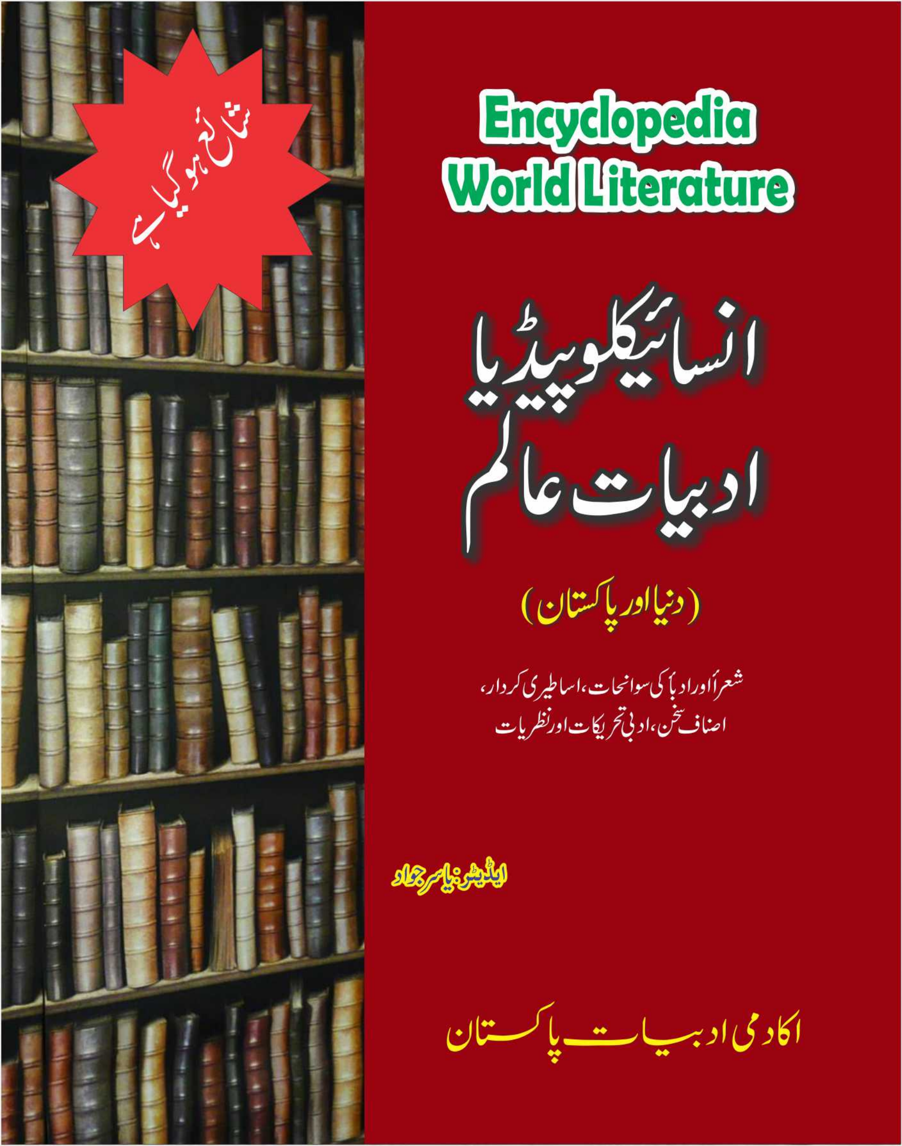

شائع ہو گیا ہے

Encyclopedia
World Literature

انسائیکلوپیڈیا
ادبیات عالم

(دنیا اور پاکستان)

شعرأ اور ادبأ کی سوانحات، اساطیری کردار،
اصناف سخن، ادبی تحریکات اور نظریات

ایڈیٹر: یاسر جواد

اکادمی ادبیات پاکستان

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

Patras Bukhari Road, Sector H-8/1,
Islamabad, Pakistan
Website: www.pal.gov.pk - email: adabiyaat@pal.gov.pk